سلسلۂ نصابیات علم معاشیات جامعۂ عثمانیہ

اصول معاشیات

بی۔ اے۔ کے لئے

مؤلفہ

مولوی محمد الیاس صاحب برنی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

پروفیسر معاشیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

۱۳۴۱ھ مطابق ۱۳۳۲ف مطابق ۱۹۲۲ع

۱۱۰۰

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

ناظر مذہبی کتب درسیہ جامعہ عثمانیہ کی تنقید

فن معاش کے بعض جزئیات ایسے بھی ہیں جن کی
تطبیق اسلامی احکام سے نہیں ہوتی۔ پڑھنے والے کو
یہ کتاب محض فن کی حیثیت سے پڑھنی چاہیے اور
احکام اسلام کو اس سے بالاتر سمجھنا چاہیے فقط۔

عمادی

تمہید

معاشیات میں ایک کتاب علم المعیشت چھ سات سال قبل شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکی ہے۔ مگر اس کتاب کے مخاطب عام ناظرین ہیں۔ اور اسی مناسبت سے اس میں مضمون اور بیان اختیار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اصول معاشیات اسی کا نصابی اڈیشن ہے جو خاص کر طلبہ کے درس کے واسطے مقصود ہے۔ عام دلچسپی کے مباحث میں بقدر مناسب تخفیف کر کے جابجا طلبہ کے مفید مطلب مضامین اضافہ کر دیئے گئے ہیں نتیجہ یہ کہ دونوں کتابوں میں بہت کچھ مشابہت اور کافی فرق نظر آتا ہے مقابلہ کرنے سے اسکا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مزید تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی ؛

محمد الیاس برنی

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد
اکتوبر ۱۹۲۲ء

فہرست مضامین

حصۂ اول

مقدمہ

باب اول

صفحہ ۱

معاشیات

(۱) علوم عمرانی اور معاشیات
(۲) وسعت معاشیات
(۳) احتیاجات وافادہ
(۴) مبادلہ پذیری
(۵) مفہوم دولت
(۶) اقسام دولت
(۷) اشکال دولت
(۸) قابلیت وخدمت کا فرق
(۹) ملک پذیری
(۱۰) معاشی جدوجہد
(۱۱) علم معاشیات
(۱۲) مباحث معاشیات
(۱۳) نوعیت بحث
(۱۴) معاشی قوانین
(۱۵) معاشیات کا دیگر علوم سے تعلق
(۱۶) طریق معاشیات
(۱۷) معاشیات کی تاریخ
(۱۸) معاشیات کی قدیم تصانیف
(۱۹) معاشیات کی موجودہ ضرورت

باب دوم

صفحہ ۲۹

معاشی تاریخ انگلستان

(۱) معاشی طریق
(۲) جاگیرداری طریق
(۳) جتھے
(۴) تجارتی جتھے
(۵) حرفتی جتھے
(۶) کالی موت
(۷) رمنے
(۸) قومی طریق
(۹) قانون کارآموزی
(۱۰) قانون اجارہ داری

(۱۱) قانون مفلسی
(۱۲) قانون غلہ
(۱۳) قانون جہازرانی
(۱۴) تجارت
(۱۵) صنعتی انقلاب
(۱۶) ایجادات
(۱۷) طریق عدم مداخلت یا کاروباری آزادی
(۱۸) کارخانہ جات
(۱۹) خلاصہ

صفحہ ۴۹

حصۂ دوم
پیدائش دولت

باب سوم
پیدائش کا مفہوم

(۱) انسان کے کارنامے
(۲) پیدائش کی ماہیت
(۳) پیدائش کا منشا
(۴) خلاصہ

صفحہ ۵۱

باب چہارم
عاملین پیدائش

(۱) زمین
(۲) محنت
(۳) اصل
(۴) اصل کی سرگزشت
(۵) اصل کی کارگزاری
(۶) خلاصہ

صفحہ ۵۶

باب پنجم
زمین

(۱) زمین کا مفہوم
(۲) زمین کے خواص
(۳) کاشت کے دو طریق اور انکے جداگانہ فوائد
(۴) زرخیزی کا مفہوم
(۵) زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل
(۶) قانون تقلیل حاصل
(۷) معاشی ترقیات کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر
(۸) شہروں کی افزونی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر

(۹) شہروں میں پارک کی ضرورت
(۱۰) ٹریم کار کا شہر کی آبادی اور زمین کی قدر و قیمت پر اثر
(۱۱) اضافۂ قیمت زمین کی مقدار

باب ششم

صفحہ ۷۳

محنت

(۱) محنت کا مفہوم
(۲) محنت کے اقسام
(۳) محنت کے خواص
(۴) کارگزاری اور اس کے لوازم

باب ہفتم

صفحہ ۹۳

اصل

(۱) اصل دولت کا فرق
(۲) پیدائش اصل کی شرط
(۳) افزونی اصل کے اسباب
(۴) اصل کے خواص
(۵) اصل کے اقسام

باب ہشتم

صفحہ ۱۰۱

طریق پیدائش

(۱) اصول تقسیم عمل کی تشریح
(۲) تقسیم عمل کے فوائد
(۳) تقسیم عمل کی مضرت
(۴) مشین کا رواج
(۵) مشین کے فوائد
(۶) مشین کا اثر مزدوروں پر
(۷) پیدائش بر پیمانۂ صغیر و کبیر
(۸) پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد
(۹) کفایت داخلی و خارجی
(۱۰) قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل
(۱۱) تخصیص صنائع
(۱۲) صنائع تضمینی و تفصیمی
(۱۳) کمپنیاں
(۱۴) آجر و منیجر اور تخمین و مخمن

حصۂ سوم
تقسیم دولت

باب نہم
صفحہ ۱۱۸

دولت کے حصہ دار

باب دہم
صفحہ ۱۲۰

لگان

(۱) لگان کی ماہیت
(۲) قانون تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے
(۳) پیدائش لگان کے شرائط
(۴) اقسام لگان
(۵) لگان مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا
(۶) لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدائش کا جزبن سکتا ہے
(۷) قیمت پیداوار اور لگان کا تعلق
(۸) زرعی ترقیات کا لگان پر اثر
(۹) ملک اراضی اور کاشت
(۱۰) زمینداری لگان
(۱۱) سرکاری مالگزاری
(۱۲) زمین کو قومی ملک بنانے کی تجویز

باب یازدہم
صفحہ ۱۴۷

اجرت

(۱) اجرت کا مفہوم
(۲) قوانین اجرت
(۳) مسئلۂ اجرت فنڈ
(۴) مسئلۂ معیار زندگی
(۵) مسئلۂ پیدآوری محنت
(۶) مسئلۂ پیدآوری مختتم
(۷) اقسام اجرت
(۸) فرق اجرت کے اسباب
(۹) ارزانی وگرانی محنت
(۱۰) اضافۂ اجرت اور اس کے نتائج

باب دوازدہم
ترقیات مزدوراں

صفحہ ۱۸۷

(۱) انجمن اتحاد مزدوراں
(۲) بیمہ فنڈ
(۳) حفظان صحت
(۴) تخفیف اوقات
(۵) اضافۂ اجرت
(۶) اسٹرائک یا ہرتال
(۷) شراکت منافع

باب سیزدہم
سود

صفحہ ۲۰۰

(۱) اصل کا مفہوم
(۲) شغل اصل
(۳) مسائل سود
(۴) توقع پسندی
(۵) پیدا آوری
(۶) شرح سود
(۷) اقسام سود
(۸) زر و سود کا تعلق
(۹) سود کا حاضر و مستقبل

باب چہاردہم
منافع

صفحہ ۲۲۹

(۱) آجر کی کارگزاری
(۲) منافع کی ماہیت
(۳) شرح منافع

باب پانزدہم
ترکیب عاملین پیدائش

صفحہ ۲۴۵

(۱) تقسیم دولت کا خلاصہ
(۲) قانون تقلیل و تکثیر و مستقر اور حاصل کا تعلق
(۳) ترکیب عاملین کا اصول
(۴) تنظیم کا ہر سہ عاملین سے تعلق

(۵) ضروری نتائج

باب شانزدہم صفحہ ۲۶۱

دولتمند و افلاس

(۱) سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم
(۲) اشتراک کی تشریح و تنقید
(۳) تقسیم دولت کی موجودہ حالت
(۴) تجاویز اصلاح
(۵) اشتراک سرکاری

باب ہفدہم صفحہ ۲۹۳

امداد باہمی

(۱) امداد باہمی کی مختلف شکلیں
(۲) قرض امداد باہمی
(۳) خرید بامداد باہمی
(۴) فروخت بامداد باہمی
(۵) بود و باش بامداد باہمی

باب ہیجدہم صفحہ ۲۹۵

ٹکس

(۱) مالیات
(۲) مفہوم ٹکس
(۳) تقرر ٹکس
(۴) اصول ٹکس
(۵) اقسام ٹکس
(۶) اشکال ٹکس
(۷) انکم ٹکس
(۸) ہاؤس ٹکس
(۹) محصول چنگی
(۱۰) فیس اسٹامپ و رجسٹری و لیسنس

حصہ چہارم

مبادلۂ دولت

باب نوزدہم صفحہ ۳۲۹

قیمت

(۱) بحث مبادلہ کی اہمیت
(۲) قانون تقلیل افادہ

(۳) قانون طلب — (۴) تغیر پذیری طلب
(۵) بازار — (۶) قدر و قیمت
(۷) مسئلہ قیمت — (۸) مصارف پیدائش
(۹) طلب مشترک و طلب مرکب — (۱۰) رسد مشترک و رسد مرکب

باب بستم — صفحہ ۳۹۸

مقابلہ و اجارہ

(۱) مقابلہ — (۲) اجارہ
(۳) ٹکس یا امداد کا اجارے پر اثر

باب بست و یکم — صفحہ ۴۱۴

(۱) مبادلہ کی دقتیں (۲) زر کا مفہوم (۳) زر کے کام

باب بست و دوم — صفحہ ۴۲۱

زر فلزاتی

(۱) عمدہ زر کے خواص (۲) سکہ (۳) اصول اجرائی سکّہ

باب بست و سوم — صفحہ ۴۴۱

زر کاغذی

(۱) زر کاغذی کا رواج — (۲) زر کاغذی کے اقسام
(۳) زر کاغذی کی خوبیاں — (۴) زر کاغذی کے نقائص

باب بست و چہارم — صفحہ ۴۵۹

تجارت بین الاقوام

(۱) قوم کا معاشی مفہوم — (۲) تجارت بین الاقوام اور اسکی صورتیں
(۳) قدر و قیمت بین الاقوام — (۴) اقسام تجارت

(۵) آزاد تجارت
(۶) تجارت ماموں
(۷) تفریق اقوام
(۸) زراعت اور صنعت و حرفت
(۹) قوم کے معاشی وسائل اور انکا استعمال
(۱۰) طریق تامین کی تفصیل
(۱۱) محصول تامین و محصول مال

باب بست و پنجم

صفحہ ۵۰۰

مبادلات خارجہ

(۱) دادوستد بین الاقوام کی مدیں
(۲) توازن درآمد و برآمد اور توازن دادوستد
(۳) ہنڈی کی تشریح
(۴) ہنڈی کے نرخ کے اصول
(۵) ہنڈی دلال
(۶) مطالبات خارجہ کی ادائی کے طریقے

باب بست و ششم

صفحہ ۵۴۰

بنک

(۱) بنک کا ماضی و حاضر
(۲) چک کی تشریح
(۳) بنک کا چٹھا
(۴) نوٹ چک ہنڈی یا سرکاری تمسک اور کارخانوں کے حصے

باب بست و ہفتم

صفحہ ۵۶۶

قدر زر و مسئلۂ گرانی

(۱) زر کے کام
(۲) قیمت اشیاء اور قدر زر کا تعلق
(۳) انڈکس نمبر
(۴) مسئلۂ مقدار زر
(۵) چاندی سونے کی قدر و قیمت
(۶) رسد و طلب زر
(۷) اضافۂ مقدار زر کے نتائج
(۸) سونے کی پیداوار

حصۂ پنجم

باب بست و ہشتم

صفحہ ۵۸۰

صرفِ دولت

(۱) صرف کا مفہوم
(۲) صرف کے مباحث
(۳) نفع الصرف
(۴) افادۂ اتم
(۵) معیارِ زندگی
(۶) مسئلۂ آبادی

ضمیمۂ اصطلاحات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ اوّل

مقدمہ

باب اوّل

معاشیات

(۱) علومِ عمرانی اور معاشیات (۲) وسعتِ معاشیات (۳) احتیاجات و افادہ (۴) مبادلہ پذیری (۵) مفہومِ دولت (۶) اقسامِ دولت (۷) اشکالِ دولت (۸) قابلیت و خدمت کا فرق (۹) ملک پذیری (۱۰) معاشی جدّ و جہد (۱۱) علمِ معاشیات (۱۲) مباحثِ معاشیات (۱۳) نوعیت بحث (۱۴) معاشی قوانین (۱۵) معاشیات کا دیگر علوم سے تعلق (۱۶) طریقِ معاشیات (۱۷) معاشیات کی تاریخ (۱۸) معاشیات کی قدیم تصانیف (۱۹) معاشیات کی موجودہ ضرورت۔

علوم عمرانی اور معاشیات

(۱) انسان مدنی الطبع مخلوق ہے۔ لوگ مل جل کے رہتے ہیں۔ اسی طرح زندگی خوب سہولت و راحت سے بسر ہوتی ہے۔ تمام دنیا میں بیشمار گاؤں قصبے اور بڑے بڑے شہر آباد ہیں۔ اور پھر اُن کے درمیان بکثرت سلسلۂ آمدورفت جاری ہے۔ آپس کے میل جول میں گوناگوں تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ ان تعلقات پر باقاعدہ نظر کرنا اور اُنکی تشریح و توجیہ اوّل علمِ تمدّن سے شروع ہوئی۔ مگر ایسے وسیع مضمون کا ایک علم میں سمانا دشوار تھا۔ بالآخر بنظرِ سہولت یہ کام چند عمرانی علوم میں تقسیم ہو گیا۔ لوگوں کو کیا کیا احتیاجیں ہیں وہ

حصّہ اوّل باب اوّل

کیونکر پوری ہوتی ہیں۔ لوگ حصولِ معاش کے واسطے کس طرح جد و جہد کرتے ہیں۔ باہمی مدد سے کس طرح کار و بار چل رہے ہیں اور کیونکر ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ گویا کوئی جماعت کیونکر پرورش پاتی اور زندہ رہتی ہے۔ اور مرفہ الحالی کی کمی بیشی کے کیا اسباب ہیں۔ یہ تحقیقات اکنامکس یا معاشیات کا فریضہ ہے۔ اس علم کو جماعت انسانی سے وہی تعلق ہے جو عضویات اور علمِ طب کو بدنِ افراد سے ؂

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ معاشیات میں انسان کی کوششوں اور کاموں کے ایک خاص پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔ اس کو تمام انسان کاروبار میں مصروف اور اپنی اپنی ضروریات حاصل کرنے میں کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح بعض اور علوم انسانی گروہ کے افعال پر دوسرے نقطۂ خیال سے نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً علم الاخلاق۔ مذہب یا عقل کی عینک لگا کر لوگوں کے باہمی سلوک کی بھلائی بُرائی دیکھتا ہے۔ علمِ قانون کی نظر سے تمام لوگ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کے معاوضہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ علمِ سیاست کے خیال سے سب آدمی سلطنت کے نظم و نسق اور حکومت کی کل چلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ علمِ معاشرت انسانی جماعتوں کے مختلف طرزِ بود و باش ان کے عجیب رسم و رواج اور عادات و روایات کا منظر دکھاتا ہے غرضیکہ معاشیات۔ اخلاقیات۔ قانون۔ سیاسیات اور علمِ معاشرت۔ یہ چند علومِ عمرانی ایک ہی چیز یعنی گروہِ انسان کے افعال کو مختلف نظروں سے دیکھتے اور ان کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ چونکہ انسانوں کے باہمی تعلقات ان تمام علوم کا مشترک موضوع ہے ان کو اصطلاحاً علومِ متجانسہ بھی کہتے ہیں۔ گویا ایک ہی جنس یعنی علمِ تمدن کی مختلف نوعیں اور شاخیں ہیں ؂

یہ سب علوم آپس میں اس قدر ملے جلے ہیں کہ ایک بھول بھلیاں معلوم ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا محال ہے۔ جس طرح کہ ہوا میں گرد و نواح کی چیزوں سے سردی۔ گرمی۔ نمی خشکی۔ آواز اور بو پھیلتی ہے۔ علومِ متجانسہ کے آثار بھی ایک دوسرے علم کی بحث میں اسی طرح پیوستہ نظر آتے ہیں جو کچھ تفریق کی جاتی ہے وہ بیشتر وضعی ہے کسی قطعی اصول کی پابند نہیں۔ تاہم سہولت مطالعہ سخت مقتضی ہے کہ علمِ تمدن سا وسیع علم اور پیچ در پیچ مبحث چند کم و بیش جداگانہ علوم میں تقسیم کیا جاوے۔ چنانچہ اسی وجہ سے تفریق باوجود ناقص ہونے کے برقرار رکھی گئی۔ اور تجربے سے بہت مفید ثابت

حصّۂ اوّل
باب اوّل

ہوتی جاتی ہے ؛

معاشیات میں بعض علومِ غیر متجانسہ مثلاً نفسیات ۔ اور سائنس کی تحقیقات سے بھی بطور مُسلّمہ مقدمات کام لیا جاتا ہے ۔ معاشیات کے علومِ متجانسہ اور غیر متجانسہ سے جو کچھ تعلقات ہیں ۔ ہم آئندہ اُن کی مزید توضیح کریں گے ۔ علاوہ بریں معاشی مباحث اور مسائل پر غور و خوض کرنے سے خود بخود تفصیل اور تمثیل پیشِ نظر ہو جائیگی ؛

وسعت معاشیات

(۲) کسی علم کی وسعت پر نظر کرنے میں تین امروں پر توجہ کرنا چاہئے :۔ اس کا نفسِ مضمون کیا ہے ۔ بحث کی نوعیت کیا ہے ۔ نیز یہ کہ اگر اس علم کا بعض دیگر علوم سے تعلق ہے تو کیا ہے ۔ معاشیات کے متعلق ان تینوں امروں کی مختصر تشریح یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے ؛

احتیاجات و افادہ

(۳) اوّل معاشیات کے نفسِ مضمون کو لیجئے ۔ انسانی جماعتوں کی احتیاجیں کیا ہیں اور کیونکر پوری ہو رہی ہیں ۔ معاشیات میں اسی دشوار سوال کا جواب دینا اصل مقصود ہے ۔ گویا اس کے مباحث کا مرکز اور محور انسانی احتیاجات ہیں ۔ ان ہی کو معاشیات کی جان سمجھنا چاہئے ۔ چنانچہ آئندہ مطالعے سے واضح ہوگا کہ اگر انسان احتیاجات کا پتلا نہ ہوتا تو یہ علم فضول تھا ۔ معاشیات میں احتیاج کا مفہوم نہایت وسیع ہے ۔ اس سے بحث نہیں کہ احتیاج حقیقی ہے یا وہمی ۔ دائمی ہے یا عارضی ۔ قدرتی ہے یا رسمی ۔ طبعی ہے یا غیر طبعی ۔ قوی ہے یا ضعیف ۔ قدیم ہے یا جدید ۔ اختیاری ہے یا اضطراری ۔ جائز ہے یا ناجائز ۔ بھلی ہے یا بُری ۔ احتیاج کسی قسم کی بھی ہو اُس کا لحاظ کیا جاتا ہے کوئی نظر انداز نہیں ہوتی ۔ اور احتیاج پورا کرنے کی صلاحیت جو چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ اصطلاحاً افادہ کہلاتی ہے ۔ مثلاً پانی پیاس بجھاتا ہے ۔ آگ گرمی اور روشنی دیتی ہے چھتری دھوپ اور بارش کی تکلیف سے بچاتی ہے ۔ عمدہ لباس اور زیور جسمانی آرائش کی خواہش پوری کرتے ہیں ۔ پھولوں کی مہک اور باجوں کے سُریلے راگ دماغ کو فرحت اور دل کو سُرور بخشتے ہیں ۔ بوسیدہ قلمی کتابیں ۔ پھٹی پُرانی تصویریں ۔ ٹوٹے پھوٹے برتن محققین آثارِ قدیمہ کے نزدیک بیحد قابلِ قدر ہوتے ہیں ۔ دوا مرض کھوتی ہے ۔ افیون اور کوکین جیسی مُضرِ صحت چیزوں سے بھی نشہ کے شائقین کو ایک خاص لذّت حاصل ہوتی ہے ۔ حتّیٰ کہ زہر بھی جاں ستانی یا خودکشی کی افسوسناک احتیاج پوری کر دیتا ہے

غرضکہ معاشی نقطۂ نظر سے انسان کو گوناگوں احتیاجوں نے گھیر رکھا ہے اور وہ اکثر اوقات براہِ راست یا بالواسطہ ان ہی کے پورا کرنے میں کوشاں اور منہمک رہتا ہے۔ بیشمار چیزیں اُس کو اس کام میں مدد دیتی ہیں یعنی احتیاجوں کو پورا کرتی ہیں۔ اور اُن کی یہ صلاحیت اور خاصیت کہ احتیاجوں کو پورا کرسکیں اصطلاحاً افادہ کہلاتی ہے۔ صفتِ افادہ کی اہمیت آگے چل کر دولت کے بیان میں ظاہر ہوگی ؁

مبادلہ پذیری

(۴) معاشیات میں افادے کے علاوہ چیزوں کی ایک اور صفت بھی خاص توجہ چاہتی ہے یعنی مبادلہ پذیری۔ چند چیزیں تو ایسی ہیں کہ ہمارے کام آتی ہیں لیکن ہم اُن کا دوسری چیزوں سے کسی طرح مبادلہ نہیں کرسکتے کیونکہ وہ ہمارے قبضے اور تصرف سے باہر ہیں۔ مثلاً چاند۔ سورج۔ ہوا۔ سمندر۔ اور بعض چیزوں کے مُبادلے کو ہم فضول اور بےحاصل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بکثرت دستیاب ہوتی ہیں اور کسی کی خاص مِلک نہیں۔ مثلاً لبِ دریا پانی۔ جنگلوں میں خودرو پَھل پھول اور لکڑی۔ لیکن بیشتر چیزوں کا ہم مبادلہ کرسکتے ہیں اور ایسا کرنا ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً غلہ۔ کپڑا۔ مویشی۔ مکان اور ہر قسم کا سامان جس کی تجارت پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی ہی چیزوں کو معاشیات کے مباحث سے خاص تعلق ہے۔ اور ان کی یہ صفت کہ مُبادلہ ممکن ہو اور ضروری بھی سمجھا جائے اصطلاحاً استبدال یا مبادلہ پذیری کہلاتی ہے۔ ذیل میں اس کے متعلق چند ضروری نکات بیان کرتے ہیں:-

اوّل افادے اور مُبادلے کے باہمی تعلق کو ملاحظہ کیجئے۔ افادے کیواسطے تو مُبادلہ شرط نہیں مثلاً چاند۔ سورج۔ ہوا اور بادل میں گرچہ بہت کچھ افادہ موجود ہے تاہم ان کا مُبادلہ ممکن نہیں۔ لیکن مُبادلے کے واسطے افادہ لازمی ہے۔ کیونکہ اگر اشیائے متبدّلہ سے فریقین کی احتیاجیں ہی رفع نہ ہوسکیں گی تو پھر اُن کے مُبادلے کی تکلیف کوئی فضول کیوں گوارا کرنے لگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ صرف کارآمد چیزوں کا لین دین ہوتا اور ہوسکتا ہے۔ ردی اور نکمی چیزوں کا مُبادلہ کون کرتا ہے۔ المختصر مُبادلہ افادے کی شرط نہیں ہے۔ لیکن افادہ مُبادلے کے واسطے لازمی ہے ؁

یہاں پر ایک اور نکتہ سمجھنا بھی ضرور ہے وہ یہ کہ چیزوں میں افادے کی محض موجودگی مُبادلے کے واسطے کافی نہیں بلکہ یہ بھی شرط ہے کہ انسان کو افادے کا علم

حصۂ اول
باب اول

اور چیزوں پر دسترس ہو۔ مثلاً جبتک کہ مشہور دوا کُنین کے خواص معلوم نہیں ہوئے تھے وہ محض نکمّی چیز سمجھی جاتی تھی کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ اور نہ اُس وقت کوئی اُس کا مُبادلہ کرتا تھا حالانکہ فی نفسہ وہ افادہ اس میں اُس وقت بھی موجود تھا جسکے دریافت ہونے پر وہ بعد کو قابلِ مُبادلہ ہوگئی۔ اُس وقت کہیں مُبادلے کی نوبت آسکتی ہے۔ مثلاً چاندی سونا جو نہایت ہی گہری کانوں میں دبا پڑا ہوگا ہمارے نزدیک ایسا ہی بیکار ہے جیسے مریخ کی خیالی دولت۔ گوایسے چاندی سونے میں اِفادہ موجود ہے مگر دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے نزدیک مٹی بلکہ اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا مُبادلہ ممکن نہیں۔ پس علم ودسترس بغیر محض اِفادے کی موجودگی مُبادلے کی بنا نہیں ہوسکتی ❊

مُبادلے کے واسطے افادے کے علاوہ ایک اور شرط بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کم ازکم مابین فریقین اشیائے مطلوبہ کی مقدار محدود ہو اور وہ کسی کی مِلک ہوں۔ تو دتملیک میں تعینِ مقدار مُضمر ہے۔ کسی چیز کا غیر محدود مقدار میں دستیاب ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی خاص شخص کی مِلک نہیں اور ہر کسی کو بلاتعرض دیگرے میسر ہوسکتی ہے مثلاً ہوا۔ دھوپ۔ چاندنی۔ یا خود رو جنگل میں لکڑی اور لبِ دریا پانی۔ گنگا کے کنارے نہ پانی کی کمی اور نہ وہ کسی کی مِلک۔ جو جتنا چاہے پانی بہائے۔ پیئے اور گھر لیجائے۔ مبادلے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر دُور اُفتادہ مقامات میں خوش اعتقاد ہندو دل کھول کر گنگاجلی کی قیمت اس وجہ سے دیتے ہیں کہ وہاں گنگا تو بہتی نہیں۔ صرف اتنا ہی تھوڑا سا پانی جو بھیجنے والے کے پاس ہے دستیاب ہوسکتا ہے۔ لہذا بوجہ تعینِ مقدار وتملیکِ گنگاجلی قابلِ مُبادلہ ہو جاتی ہے تحقیق طور پر سُنا ہے کہ سیب انار۔ انگور جیسے قیمتی میوے افغانستان میں اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو چاہے ہر روز دام ڈالے بغیر گرد ونواح کے درختوں سے جی بھر کر کھالیتا ہے گویا چونکہ کثرتِ پیداوار کے سبب سے اِن میں تعینِ مقدار اور تملیک کی صفت کم پائی جاتی ہے ان کا مُبادلہ بھی کم ہوتا ہے۔ مُبادلے کی اس شرط کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے ع لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر ❊

مفہوم دولت

(۵) دولت کا مفہوم ان چند مباحث میں سے ہے جن پر معاشیات میں

حصۂ اوّل
باب اوّل

بہت کچھ لکھا جا چکا ہے - مگر ابتک کوئی قطعی تصفیہ نہ ہوسکا - بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کی دولت شمار کرنے نہ کرنے پر ابھی تک اختلافِ رائے موجود ہے - تاہم غالبًا اس اصطلاح کے بہترین معنی مسٹر کینس نے اپنی لاجواب اور مشہور کتاب اسکوپ انڈ میتھڈ آف اکنامکس (وسعت وطریقِ معاشیات) میں بیان کئے ہیں - ان کے نزدیک دولت میں وہ تمام چیزیں اور صرف وہی چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور مبادلہ پذیری کی دونوں صفتیں موجود ہوں - دولت کی اس قدر مختصر مگر جامع تعریف کی تشریح اِفادہ و مُبادلہ پذیری کے مذکورۂ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہوگی ❖

اقسامِ دولت

(۶) دولت کی مذکورۂ بالا تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشیات میں دولت سے مُراد شخصی دولت ہے لیکن بہ مقتضائے ضرورت خود معاشیات نے اس کے اصطلاحی معنوں میں کچھ کچھ ترمیم بھی کی ہے - مثلاً انسان کے ذاتی خصائل و اوصاف جیسے شرافت - وجاہت - عزت - اعتبار - ہر دلعزیزی جو کاروبار میں بالواسطہ مدد دیتے ہیں ذاتی دولت کہلاتے ہیں - اسی طرح پہاڑ جنگل اور دریا جو مُلک کی آب وہوا اور زرخیزی پر اپنا قوی اثر ڈالتے ہیں - خوشگوار موسم - دلکش مناظر - مُہذّب سوسائٹی - روشن خیال حکومت وغیرہ جو معاشی ترقیات کے لوازمات ہیں - قومی دولت کہلاتے ہیں - چنانچہ ہندوستان میں گنگا اور انگلستان میں دریائے ٹیمس قومی دولت کا بیش بہا حصہ شمار ہوتا ہے - ہمالیہ پہاڑ بھی ہندوستان کی خاص قومی دولت ہے - معاشی حالات پر اس کا گوناگون اثر پڑتا ہے - علاوہ بریں ساتوں سمندر جو بذریعۂ باد برشکال وجہازرانی دنیا کی معاشی بہبودی میں بہت مدد دیتے ہیں - اقوامی دولت کہلاتے ہیں - اگرچہ ان تینوں آخری دولت کی قسموں میں سوائے اِفادے کے استبدال نہیں پایا جاتا - تاہم معاشیات کو مجبورًا اُن کا لحاظ کرنا پڑا - کیونکہ براہِ راست یا بالواسطہ خاص معاشی دولت کی پیدائش میں ان سے قابلِ قدر بلکہ اکثر ناگزیر امداد ملتی ہے - نیز ہوا - چاند سورج جن کا اِفادہ اظہر من الشمس ہے - عالمی دولت کہلاتے ہیں ❖

اشکالِ دولت

(۷) دولت کا اصلی مفہوم اور اُس کے دوسرے اقسام بیان کرنیکے بعد اب اُن چیزوں کی تفصیل باقی ہے جو معاشی دولت میں شامل ہوسکتی ہیں - اُنکی

حصّہ اوّل

باب اوّل

حسب ذیل چار قسمیں ہیں :-

۱ - مادّی اشیا منقولہ یا غیر منقولہ مثلاً غلہ ۔ کپڑا ۔ گھوڑا ۔ مکان ۔ باغ اور ہر قسم کی ملک و جائداد ۔

۲ - مادّی اشیا کی ملکیت اور استعمال کے حقوق مثلاً کتاب کا حقِ تصنیف ۔ آلات کا حقِ ایجاد ۔ دخیلکار / کاشتکار کا حقِ کاشت ۔ کسی کارخانے کی نیکنامی ۔ جدید قانون نے چیزوں کے علاوہ ان کے بعض متعلقہ حقوق کو جداگانہ طور پر قابلِ بیع و شریٰ بنا دیا ہے ۔ گویا ان میں افادہ و استبدال جمع ہو گیا ہے ۔ لہذا یہ حقوق بجائے خود بھی دولت ہیں ۔

۳ - ذاتی خدمات خواہ اُن کا نتیجہ مادّی شکل سے نمایاں ہو یا نہ ہو ۔ مثلاً لوہار ۔ بڑھئی ۔ معمار ۔ درزی ۔ باورچی اور حجام کا کام ۔ یا تعلیم جو مدرسوں میں جاری ہے ۔ اور یا مثلاً گانا ۔ بجانا ۔ ورزشی کرتب اور کھیل تماشے جو عموماً تھیٹر اور سرکس میں دکھائے جاتے ہیں ۔

۴ - ذاتی خدمات لینے کا حق ۔ مثلاً ریلوے کمپنیوں کا اپنے ملازموں پر ۔ تھیٹریکل کمپنی کا ایکٹروں پر ۔ ٹرسٹیانِ کالج کا پروفیسروں پر ۔ جب کبھی ہم ان حقوق کے ذریعے نہ کہ براہِ راست ان خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس حق کے معاوضے میں حقداروں یعنے مالکان کمپنی یا ٹرسٹیانِ کالج کو کچھ روپیہ کرایہ یا فیس کے طور پر ادا کرتے ہیں ۔

پہلی شکل میں تو دولت کو ہر کوئی پہچانتا ہے ۔ البتہ تیسری شکل میں شناخت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے ۔ جب ہم خدمات کا بخوشی معاوضہ دیتے ہیں ۔ خواہ نتیجہ مادّی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو مثلاً کھانا پکانا ۔ کپڑا سینا ۔ پنکھا جھلنا ۔ پڑھانا لکھانا ۔ گانا بجانا ۔ تو گویا خدمت میں بھی صفاتِ افادہ و استبدال موجود ہیں اور وہ بھی دولت کی ایک شکل ہیں ۔ رہے دولت کے ملک اور استعمال کے حقوق سو وہ بھی افادہ و استبدال کی موجودگی سے دولت ہیں ۔ ان اجمالی اُصول کی تفصیل کاروباری دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے ۔

(۸) خدمت کے سلسلے میں ایک نکتے کی توضیح ضرور ہے اور وہ یہ کہ قابلیت اور خدمت دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ خدمت کے واسطے قابلیت شرط ہے مگر قابلیت سے خدمت لازم نہیں آتی۔ مثلاً عمدہ گانے کے واسطے خوش گلوئی اور بلند آوازی شرط ہے۔ اعلیٰ معلّم یا مصنّف ہونے کے لئے عالم ہونا ضروری ہے لیکن ہر خوش گلو اور بلند آواز شخص گانا نہیں جانتا اور نہ ہر صاحبِ علم مصنّف یا معلّم ہوتا ہے۔ مگر قابلیت دولت شمار نہیں ہو سکتی کیونکہ اگرچہ وہ خدمت کی شرط اور بِنا ہے لیکن بذاتِ خود اس میں دولت کے صفات نہیں پائے جاتے نہ استبدال نہ افادہ مثلاً کوئی شخص گو وہ اپنے فن میں کیسا ہی کامل کیوں نہ ہو کوئی طبیب خواہ وہ کیسا ہی حاذق کیوں نہ ہو کوئی وکیل ہر چند وہ قانون داں کیوں نہ ہو ہم ان میں سے کسی کو بھی محض قابلیت کی وجہ سے کچھ نہیں دیتے۔ البتہ جب وہ اپنی قابلیت عمل میں لاکر ہماری خدمت کرتے ہیں یعنی طبیب مرض کا علاج کرتا ہے اور وکیل مقدمے کی پیروی تو ان خدمات کے صلے میں ہم اُن کو بلا عذر و حجت بھر مٹھی فیس دیتے ہیں۔ محض قابلیت نہ صرف فریقِ ثانی کے واسطے بلکہ خود صاحبِ قابلیت کے واسطے بھی افادے سے خالی ہے۔ مثلاً کسی کو اپنے اچھے گویئے ہونے سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جبتک کہ وہ گائے نہیں۔ البتہ یہ اختیار ہے کہ اوروں کو بھی سنائے یا خود ہی لطف اُٹھائے۔ علیٰ ہٰذا نری علمیت کس کام کی جبتک کہ وہ عالم کو غور و فکر کی طرف مائل نہ کرے البتہ یہ امر اختیاری ہے کہ عالم اپنے خیالات کے لطف میں دوسروں کو بھی بذریعۂ تحریر یا تقریر شریک کرے یا نہ کرے۔ ادیب فلسفی۔ شاعر جب ہر ایک اپنی قابلیت سے کام لیتا ہے تو کہیں اُس کو اور سامعین یا ناظرین کو لطف آتا ہے یعنی افادہ حاصل ہوتا ہے۔ ہر کام میں قابلیت اور خدمت کا یہی تعلق نظر آتا ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ خداداد یا اکتسابی قابلیت سے کام نہیں لیتے وہ دیدہ و دانستہ بڑی دولت ہاتھ سے کھو دیتے ہیں

افادے کی طرح دولت کی دوسری صفتِ استبدال بھی قابلیت میں مفقود ہے۔ گویا اپنے گانے سے سامعین کو محظوظ کر سکتا ہے۔ دوسروں کو فنِ موسیقی بھی سکھاتا ہے۔ مگر اپنی خوش گلوئی اور بلند آوازی کسی قیمت پر منتقل یا فروخت

حصہ دوم
باب اول

نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایسا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہے۔ مصور تصویر [illegible]
بیچتا ہے۔ اور شاگردوں کو اس فن لطیف کی تعلیم بھی دے سکتا ہے
اس کے ہاتھ کی صفائی اور قوت متخیلہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بیشمار قیمت ادا کرے
بھی دوسروں کے قبضے و تصرف میں نہیں آسکتیں۔ [illegible] پروفیسر طلبہ کو
دیتا ہے تو طلبا اپنے پروفیسر کے برابر بلکہ اس سے زیادہ علم حاصل کرلیں
کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پروفیسر نے اپنی علمیت طلبہ کو فیس کے عوض [illegible]
دے دی۔ علم کو دولت لازوال اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ انسان سے جدا
نہیں کیا جاسکتا۔ بعض قابلیتیں سراسر خداداد ہوتی ہیں کہ جو کبھی دوسرے کو ذریعے
سے میسر نہیں آسکتیں۔ مثلاً ذہن و ذکا، حسن و ظرافت۔ خوش گلوئی اور ہاتھ کی صفائی
اور بعض قابلیتیں ایک سے دوسرے میں اس طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں جیسے
چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مگر مبادلہ کسی کا بھی ممکن نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ قابلیت اور خدمت معاشی نقطۂ نظر سے دو جداگانہ چیزیں
ہیں۔ اور خدمت کی طرح قابلیت کو ہم دولت اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ نہ اس میں
افادہ ہے نہ استبدال۔

مبادلہ پذیری
[illegible]

(۹) قابلیت تملیک جو عموماً مادی چیزوں میں موجود اور غیر مادی میں مفقود
ہوتی ہے۔ اصطلاحاً تملک کہلاتی ہے۔ گو مبادلے میں انتقال اکثر شامل
ہوتا ہے مگر لازمی نہیں۔ مبادلہ انتقال بغیر بھی ممکن ہے۔ مادی اشیا کے مبادلے
میں انتقال موجود ہوتا ہے مثلاً کتاب کے بدلے میں قلم، مکان کے بدلے میں
باغ۔ روپے کے بدلے میں غلہ اور کپڑا۔ مگر خدمات کے مبادلے میں کبھی انتقال
ممکن ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ جن خدمات کا نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہوتا ہے مثلاً معمار،
بڑھئی اور لوہار کا کام۔ ان کے مبادلے میں انتقال مانا جاسکتا ہے گویا کہ ایسی خدمات
مادی اشیا میں بشکل نتیجہ مقید رہتی ہیں۔ مگر جن کا نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہوتا ہی نہیں مثلاً
تھیٹر میں گانا بجانا یا سرکس میں جرأت اور طاقت کے کرتب دکھانا تو وہ بوجہ سریع الزوال
ہونے کے ناقابل تملیک ہیں اور اسی وجہ سے مبادلے میں ان کا انتقال ممکن نہیں۔
اگر ایسی خدمات کا مبادلہ کسی مادی چیز سے کیا جائے تو انتقال محض یکطرفہ ہوگا اور

حصّہ اوّل
باب اوّل

اگر ان کا آپس میں ایک دوسرے سے مُبادلہ ہو تو کسی جانب بھی انتقال نہیں ہو سکتا مثلاً جب ہم تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں تو ایکٹروں کی خدمات کے صِلے میں ہم ٹکٹ کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اس حالت میں صِرف یکطرفہ انتقال ہوتا ہے جب ہم تماشے سے واپس ہوتے ہیں تو کمپنی کا بکس تو ٹکٹ کے داموں سے بھرا ہوتا ہے اور سب تماشائی خالی جیب ہاتھ ہلاتے چلے جاتے ہیں۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم روپیہ کھو آئے نہیں۔ بلکہ جو چیز ہم نے مُبادلے میں لی وہ بوجہ سریع الزوال ہونیکے ناقابلِ انتقال تھی۔ اور پیدا ہوتے ہی ناپید ہو گئی۔ اگر سوال کیا جائے کہ لوگ تماشا دیکھنے کیوں جاتے ہیں۔ تو جواب ملیگا کہ لُطف اُٹھانے کے لئے۔ اس سے ثابت ہے کہ کسی ایسی چیز کا مُبادلہ ضرور ہوتا ہے جس میں اِفادہ و استبدال موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر جو دولت ہے۔ مگر مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر چونکہ اس کا انتقال ممکن نہیں اس وجہ سے تماشائی خالی ہاتھ نظر آتے ہیں۔

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص گانا اچھا جانتا ہے اور دوسرا شخص بانسری یا ہارمونیم بجانا اور وہ باری باری اپنے کمال سے ایک دوسرے کو محظوظ کریں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن کا یہ فعل مجنونانہ یعنی عبث اور بے حاصل ہے۔ نہیں۔ بلکہ ہر ایک کو دوسرے کی خدمت سے بے حد لُطف حاصل ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر دونوں کی خدمت میں اِفادہ موجود ہے اور باری باری گا بجا کر وہ اپنی خدمات کے استبدال کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ پس وہ اپنی دولت کا ایسا ہی مُبادلہ کرتے ہیں جیسا کہ قلم کا کتاب سے۔ یا مکان کا باغ سے یا روپے کا غلّے اور کپڑے سے فرق صِرف اتنا ہے کہ بوجہ سریع الزوال ہونے کے اُن کی دولت کے مُبادلے میں انتقالِ مِلک ممکن نہیں۔

معاشی جد وجہد

(۱۰) دولت کی ماہیت۔ اُس کے اقسام اور اُس کی مُختلف شکلیں واضح کر دینے کے بعد ہم معاشیات کا موضوع سمجھانے میں ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن معدودے چند خاص کاموں کے علاوہ جو انسان مذہبی اثر سے بامیدِ نفعِ آخرت کرتا ہے۔ باقی جس قدر کام ہیں وہ براہِ راست یا بالواسطہ ہماری ایک نہ ایک موجودہ یا آئندہ احتیاج رفع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

حصّہ اوّل

باب اوّل

یا دوسرے لفظوں میں ہمارے اکثر کام کسی نہ کسی طرح دولت سے متعلق ہوتے ہیں
ایسے تمام کام اصطلاح میں معاشی جدوجہد کہلاتے ہیں۔

علمِ معاشیات

(11) افادہ و استبدال سے دولت کی ماہیت اور دولت کے ذریعے سے معاشی جدوجہد کے معنی سمجھانے کے بعد اب ہم علمِ معاشیات کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ معاشیات وہ علم ہے جو انسان کی تمام معاشی جدوجہد سے بحث کرتا ہے اور اس مُجمل تعریف کی تفصیل یہ ہے کہ معاشیات انسان کی معاشی جدوجہد سے بحث کرتا ہے اور معاشی جدوجہد سے مُراد انسان کے وہ کام ہیں جو دولت سے متعلق ہوں۔ اور دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ و استبدال موجود ہو۔ یعنی جن میں احتیاج پوری کرنے کی صلاحیت پائی جائے اور جن کا مُبادلہ ہوتا ہو۔

معاشیات کی ایک مختصر تعریف علمِ دولت بھی ہے۔ مگر بیانِ مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ معاشیات کا اصلی موضوع انسانی احتیاجات اور اُن کے پورا کرنے کی جدوجہد ہے اور دولت سے جو احتیاج پورا کرنے کا آلہ ہے۔ اس کا تعلق محض بالواسطہ ہے۔ اس مختصر تعریف نے موضوعِ معاشیات کے متعلق زمانۂ گزشتہ میں نہایت بے بنیاد غلط فہمی پیدا کر دی کہ گویا یہ علم دولت پرستی یا کم از کم کفایت شعاری کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ اسی مغالطے کی بدولت اس علم کی راہِ ترقی میں تعصب اور مُخالفت کی ایسی رُکاوٹیں پیدا ہو گئیں کہ سالہا سال کی کوشش سے بمشکل رفع ہو سکیں۔ معاشیات میں دولت کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو غذا اور دوا کی علمِ طب میں ہے۔ گویا وہ موضوع سے متعلق ضرور ہے لیکن بذاتِ خود موضوع نہیں۔

مباحثِ معاشیات

(12) یہ تو معلوم ہو گیا کہ معاشیات کا موضوع کیا ہے۔ اس سلسلے میں مختصراً یہ بتانا بھی ضرور ہے کہ معاشی جدوجہد چار صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ یا تو وہ دولت کی پیدائش سے متعلق ہوگی۔ یا تقسیم یا مُبادلہ۔ یا صرف دولت سے۔ اور اِن چار صورتوں میں حسبِ ترتیبِ مذکورۂ بالا ایک رشتۂ تعلق بھی قائم ہے۔ اوّل دولت پیدا کرتے ہیں پھر جو لوگ اس کام میں شریک ہوتے ہیں وہ اسے آپس میں

بانٹ لیتے ہیں۔ بعدہٗ بمقتضائے احتیاجات اپنی چیز کا دوسروں کی چیزوں سے مُبادلہ کرتے ہیں۔ اور بالآخر اُس کو کام میں لاتے ہیں مثلاً کاشتکار اپنے ہل بیل کھاد اور بیج لگا کر کچھ مزدوروں کی مدد سے زمیندار کے کھیت میں غلہ پیدا کرتا ہے۔ جب جنس تیار ہوتی ہے تو وہ زمیندار۔ مزدور اور کاشتکار کے درمیان لگان۔ اُجرت اور منافع کی صورت میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ اس میں سے ہر ایک اپنا کُل حصّہ یا اُس کا ایک جزو بازار میں فروخت کر کے حسبِ ضرورت کپڑا۔ جوتہ اور ضروری سامان خریدتا ہے جن کو وہ اپنے گھر لاکر استعمال کرتا ہے۔

اکثر کتبِ معاشیات میں معاشی جدّ وجہد کی اِن ہی چار صورتوں یعنی پیدائش۔ تقسیم۔ مُبادلہ اور صرفِ دولت کی بحث نظر آتی ہے۔ واضح ہو کہ مباحث کی مذکورۂ بالا ترتیب سے علمی بیان میں سہولت ہوجاتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عملاً صرفِ دولت بنفسہٖ پیدائش پر مقدّم ہے اور مُبادلہ تقسیمِ دولت پر۔ آئندہ مطالعے اور تحقیق سے یہ نکتہ خود واضح ہوجائیگا۔ یہاں صرف اِشارہ ضروری سمجھا گیا۔

نوعیتِ بحث

(۱۴) وسعتِ معاشیات کے پہلے جزو یعنی نفسِ مضمون کی مختصر تشریح اوپر پیش ہوئی۔ اب اُس کے دوسرے جزو یعنی نوعیّتِ بحث کو دیکھئے کہ کس نقطۂ نظر سے مضمون کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ عُلما میں مدّت سے یہ بحث جاری ہے کہ معاشیات آیا محض علم ہے یا فن یا دونوں کا مجموعہ اور آیا من حیث العلم وہ علمِ معیاری ہے یا علمِ ایجابی یا دونوں کا مرکّب۔ اس بحث پر بعید اختلافِ رائے پھیلا ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو موانع علومِ متجانسہ کی تفریق میں پیش آتے ہیں۔ وہی بدرجۂ اولیٰ یہاں سدِّ راہ بنتے ہیں۔ اور اس سُوال کا جواب بھی کسی متفق علیہ اصول کے بجائے کم وبیش اپنی اپنی رائے سے دیتے ہیں۔ بحثِ معاشیات پانچ جداگانہ درجوں میں منقسم ہوسکتی ہے:۔

۱۔ معاشی جدّ وجہد کا صحیح وکامل بیان۔

۲۔ معاشی جدّ وجہد کی توجیہ اور معاشی قوانین کی تحقیق۔

۳۔ کسی ایک معیار کا تعیّن جس سے معاشی معاملات کی بھلائی بُرائی دریافت ہوسکے۔

۴ - مذکورۂ بالا معیار کے ذریعے سے بہبودی اور مرفہ الحالی کے مفید و معاون اصول منتخب کرنا۔

۵ - اصول منتخبہ پر کاربند ہونے کے طریق و تدابیر تجویز کرنا۔

ان میں سے بحث کے پہلے دو درجے علمِ ایجابی کے ماتحت ہیں۔ بعد کے دو علمِ معیاری سے متعلق ہیں۔ اور پانچواں فنِ معاشیات میں داخل ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ بحث کے مذکورۂ بالا تینوں حیثیتوں کا لحاظ لابُد اور ناگزیر ہے۔ علمِ ایجابی بغیر تو علمِ معیاری اور فن کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور ہر حالت میں معاشیات کا علمِ ایجابی ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ محض علمِ ایجابی بذاتِ خود کچھ کارآمد اور نتیجہ خیز نہیں جبتک کہ اس کا علمِ معیاری اور فن سے اتصال نہ ہو۔ بھلا معاشی جد و جہد کے بیان و توجیہ اور قوانینِ اساسی کی تحقیق سے کیا فائدہ اگر اُس کے بعد بہبودی اور مرفہ الحالی کے اُصول نہ قرار دیئے جائیں اور نیز اُن پر عمل پیرا ہونے کی تدبیریں نہ نکالی جائیں۔ ان علوم اور فن کا گہرا تعلق اور باہمی لزوم کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ جو کچھ اختلافِ رائے ہے وہ اُن کی نسبتی اہمیت۔ ترتیب اور تسمیہ سے متعلق ہے۔ مدت تک بحث کی یہ تینوں حیثیتیں بلا تفریق معاشیات میں شامل رہیں۔ لیکن ایک جدید گروہ نے ان تینوں کی تفریق مفید بلکہ ضروری خیال کرکے اصولِ تقسیمِ کار کے مطابق معاشیات کو علمِ ایجابی تک مخصوص کرکے علمِ معیاری اور فن کو بہ ترتیب فلسفۂ تمدن اور مالیات کے تحت میں مُحوّل کردیا۔ مثلاً مسئلۂ ٹکس کو فرض کیجئے:۔

۱ - ٹکس کی ماہیت اور ادا کرنے والوں پر اُس کا گوناگوں اثر دریافت کرنا معاشیات کا ذاتی کام ہے۔

۲ - ٹکس کے ایسے اُصول قرار دینا کہ وہ مُلک کے حق میں سراسر مفید ہوسکے فلسفۂ تمدن سے متعلق ہے۔

۳ - اور ٹکس کے مذکورۂ بالا اُصول پر کاربند ہونے کی تدابیر نکالنا مالیات کے ذمے ہے۔ آئندہ ٹکس کے بیان میں اس مثال کی تشریح ہوگی۔ یہاں اجمالاً اشارہ کافی ہے۔

واضح ہو کہ بحث کی اس جدید تفریق و تقسیم کی تائید میں چند کافی معقول اور قابلِ لحاظ

حصّۂ اوّل
باب اوّل

وجوہات پیش کی جاتی ہیں جن میں سے ایک صفائی بیان اور سہولتِ تفہیم بھی ہے۔ گویا علمی بحث پیش کرنے میں یہ تفریق بہت مفیدِ مطلب ہے۔ اور علومِ متجانسہ کی طرح علمی حیثیت سے تفریق کے بعد بھی ان تینوں کے رشتے اور تعلّق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح علمائے معاشیات بلاتکلف حسبِ ضرورت علومِ متجانسہ کے قوانین اور اُن کے اثروں کا معاشی مباحث میں پورا لحاظ کرتے ہیں۔ اسی طرح بمقتضائے ضرورت مذکورۂ بالا حیثیتیں بھی معاشی مباحث میں ایک جا پیش کی جاتی ہیں چنانچہ حامیانِ تفریق نے بھی معاشی کتابوں میں جابجا یہی طریق اختیار کیا ہے۔ لیکن اس سے اُن پر ترکِ تفریق کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آخری دو حیثیتوں کا لحاظ بطورِ علومِ متجانسہ کرتے ہیں اور ان کو قدیم گروہ کی طرح خود معاشیات کا جزو تسلیم نہیں کرتے۔ بعض علما نے فنِ معاشیات اور مالیات میں بھی تفریق کرکے اوّل کو آخر کا ماخذ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ فرق کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ معاشیات اپنی حدِ ذات میں نہ کفایت شعاری کی تلقین کرتا ہے نہ فضول خرچی کی ممانعت۔ نہ دولتمند بننے کا راز بتاتا ہے نہ مفلسی دور کرنے کی تدبیر۔ وہ علمِ ایجابی ہے اور محض معاشی جدّ وجہد کی تشریح و توجیہ اور اساسی قوانین کی تحقیق اسکا کام ہے۔ البتّہ فلسفۂ تمدّن اور مالیات کو اُصولِ مرفہ الحالی اور اُن پر کاربند ہونیکی تدابیر ضرور بتاتا ہے۔ اگر ایک ہی شخص یہ تینوں کام انجام دینا چاہے تو اس کی تین جداگانہ حیثیتیں ہوں گی۔ یعنی جہاں وہ عالمِ معاشیات کہلائیگا وہاں فلسفۂ تمدّن اور ماہرِ مالیات بھی مانا جائیگا۔ اور محض پہلی حیثیت میں آخری دو کام باوجود نہایت موزوں ہونے کے اُس کے حلقۂ فرائض سے باہر ہیں۔ چونکہ علمِ ایجابی شرطِ اوّل اور علمِ معیاری و فن غرض و غایت ہیں نہ صرف علمی میدان میں یہ تینوں دوش بدوش چلتے ہیں بلکہ علمی بزم میں بھی زانو بزانو بیٹھتے ہیں۔ ان کے قریبی تعلقات سب کو تسلیم ہیں جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں صرف ترتیب اور تسمیہ پر اختلافِ رائے ہے۔ ایک گروہ انکی تفریق غیرضروری بلکہ بےمعنی قرار دے کر تینوں کو معاشیات میں شامل کرتا ہے۔ دوسرا ایسی تفریق مُفید بلکہ ضروری سمجھ کر اُن کو معاشیات۔ فلسفۂ تمدّن۔ اور مالیات میں تقسیم کرتا ہے۔ اور یہی رائے آجکل زیادہ مقبول اور معمول بہ بنی ہوئی ہے۔

حصۂ اوّل
باب اوّل

اس علم کی ایک تقسیم معاشیاتِ نظری اور معاشیاتِ عملی بھی ہے۔ قسمِ اوّل میں علمِ ایجابی داخل ہے قسمِ دوم فنِ معاشیات یا مالیات کا دوسرا نام ہے۔ اور بحیثیت علمِ معیاری معاشیات ہر دو قسم میں مختلف درجوں سے مشترک شمار ہوتا ہے۔

معاشی قوانین

(۱۴) معاشیات کے نفسِ مضمون اور نوعیت بحث پر غور کرنے کے بعد معاشی قوانین کی حالت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہر علم میں قانون سے مُراد یہ واقعہ ہے کہ کسی سبب یا چند اسباب سے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ یا یکساں نتائج پیدا ہوں مثلاً جب ہم کوئی چیز ہوا میں اُچھالتے ہیں تو وہ بالآخر زمین پر گرتی ہے۔ اسی واقعہ کو قانونِ کششِ مرکزی سے تعبیر کرتے ہیں جس کا منشا یہ ہے کہ زمین ہر چیز اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن اگر اُڑتے ہوئے پرند اور غبارے اور درختوں میں لگے ہوئے پھل اور میز پر رکھی ہوئی کتابیں زمین پر نہیں گرتیں تو کیا اس سے قانون کی صحت پر حرف آسکتا ہے۔ نہیں۔ ان چیزوں پر قانون برابر عمل کر رہا ہے لیکن اسباب مُزاحم یکساں نتیجہ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ تقریباً ہر قانون کی ایسی مُزاحمت ممکن ہے۔ چنانچہ ہر قانون کے عمل میں موانع کی عدم موجودگی فرض کرلیجاتی ہے۔ گویا قوانین مشروط ہوتے ہیں۔ مادی علوم میں تو ہر قانون کے اسباب اور نتائج اور موانع کی پوری تحقیق اور تفریق ممکن ہے۔ اسی وجہ سے یہ قوانین خوب معین ہوتے ہیں۔ لیکن علومِ عمرانی کے قوانین کی حالت مختلف ہے۔ چونکہ یہ علوم گروہِ انسانی کے افعال سے بحث کرتے ہیں اور انسان اور کائنات کی مانند فطرت کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ارادے کا مختار ہے اور اُس کے ارادے کو کسی پہلو قرار نہیں۔ عمرانی قوانین کو اپنے عمل میں انسانی ارادے سے سابقہ پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے قوانین کم و بیش غیر معین ہوتے ہیں اور مادی علوم کے قوانین سے کہیں زیادہ مشروط۔ اس پر طُرّہ یہ کہ معاشی قوانین ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو بحیثیت مجموعی بے بُنیاد اور خلافِ حقیقت نہ سہی لیکن نادر الوجود یا حقیقت سے بعید ضرور ہو سکتے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ ایسے مفروضات میں اسبابِ زیرِ بحث ہمیشہ واقعی اور حقیقی

حصہ اوّل
باب اوّل

ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بہت سے اسباب میں سے چند منتخب ہوتے ہیں۔ اور اُنکے
عمل کی حالتیں بھی بغرض سہولت نہایت سادہ فرض کرلی جاتی ہیں۔ بس اپنی
تعیّنات کی حد تک مفروضات اقرب الحقیقت کہلا سکتے ہیں۔ ورنہ ان میں کبھی
بے بنیاد اور خیالی اسباب سے ہرگز بحث نہیں کی جاتی۔ پس ان مفروضات
کی بنا پر معاشی قوانین کو محض خیالی یا خلافِ حقیقت قرار نہیں دے سکتے۔ معاشیات سی
پیچیدہ علمی تحقیقات میں ایسے مفروضات ناگزیر ہیں۔ جبکہ بیشمار موافق اور مخالف
اسباب میں تصادم ہوتا رہتا ہے اور اختلافِ حالات کی کوئی انتہا نہو تو تعینِ قوانین
کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں کہ اوّل اوّل خصوصیّات اور فروع کو
نظر انداز کرکے صرف چند عام اسباب اور سادہ حالات کے مفروضات پر
اکتفا کیا جائے۔ ایسے مفروضات پر جو قوانین مبنی ہیں وہ بشکلِ اوّل گو معاشی واقعات
کی ہو بہو تصویر نہ سہی لیکن سادہ خاکہ ضرور شمار ہو سکتے ہیں۔ مزید براں باقیماندہ مختلف
خاص خاص اسباب و حالات کا لحاظ کرتے کرتے ان میں ایسی ترمیم بھی ممکن ہے
کہ وہ بہت کچھ حقیقی حالات کے مطابق بن جاویں اور واقعات کی تفصیلی تشریح
کرسکیں۔ واضح ہو کہ جو قوانین کثیر و گوناگوں اسباب کے ماتحت ہوں۔ اُن کے تعین
کا یہی علمی طریقہ ہے اور اس کو اصطلاحاً طریقِ تسہیل کہتے ہیں مثلاً سرکاری عدم مداخلت
معاشی قوانین کا عام مفروضہ ہے۔ یعنی یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ کاروبار میں
سرکار کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو رہی۔ علیٰہذا تقسیمِ دولت کے قوانین
میں آزاد مقابلے کا مفروضہ داخل ہے۔ اور مُبادلے کے قوانین بالخصوص
مسئلہ قدر و قیمت میں معیارِ قیمت کی حیثیت سے زر کی قدر معیّن فرض کرلیتے ہیں
قوانین جانے بغیر ان کے اساسی مفروضات کی تفصیل سراسر قبل از وقت ہوگی۔
یہاں تمثیلاً مجمل اشارہ کافی ہے۔ آئندہ خود غور کرکے قوانین کے اساسی مفروضات
کا پتہ چلانا اور ان میں حسبِ ضرورت ترمیم کرکے قوانین کو واقعات پر منطبق کرنا
طالبِ علم کے حق میں بیحد مفید کوشش ثابت ہوگی۔ آئندہ مباحث میں بشرطِ ضرورت
جابجا مفروضات کی طرف اشارہ ہوتا رہیگا۔

معاشیات کا دیگر علوم سے تعلق

(۱۵) وسعتِ معاشیات کے دو جزو مختصراً اوپر بیان ہوئے۔ اوّل معاشیات کا

اس مضمون - دوسرے معاشی بحث کی نوعیت - اسی ضمن میں بعض ضروری نکاتِ متعلقہ کی طرف بھی اشارہ ہوگیا - اب وسعت کے متعلق اس قدر تحقیق باقی ہے کہ معاشیات کا اور علوم سے کیا کیا تعلق ہے علوم عمرانی کے باہمی تعلقات مجملاً شروع میں بیان ہو چکے ہیں - معاشی مباحث میں ان تعلقات کو ملحوظ رکھنے کے البتہ مختلف مدارج ہیں - علمِ ابجابی کی حد تک تو معاشیات میں اور دوسرے علومِ عمرانی بس اس قدر ملے رہتے ہیں جیسے روٹی میں نمک - پھر جوں جوں ان کی چاشنی بڑھتی ہے معاشیات علم ابجابی کے دائرے سے نکل کر علم معیاری بلکہ فن کی حد تک وسعت پیدا کرتا ہے - یوں کہئے کہ نظری معاشیات میں علوم عمرانی کی جھلک ہی جھلک پڑتی ہے - اور عملی معاشیات میں ان کا رنگ صاف چمک اٹھتا ہے - مثلاً تقسیم دولت کی تشریح و توجیہ کے علاوہ جب شرح سود - اجرت اور منافع پر انصاف کی نظر ڈالتے ہیں اور نتائج پر غور کرتے ہیں تو باہمی امداد اور اشتراک کی بحث چھڑ جاتی ہے جس سے اخلاقیات کا بھی قریبی تعلق ہے - علیٰ ہٰذا اصولِ غیر مداخلت اور محصول کی بحث میں سیاسیات و قانون جلد آ ملتے ہیں - ان کے علاوہ علوم عمرانی کے خلط ہونے کی اور بھی صورتیں ہیں - معاشیات میں وسعتِ نظر پیدا ہونے کے بعد ان آمیزشوں کا خود بخود پتہ چلنے لگتا ہے ٭

معاشیات کو بعض اور علوم سے بھی ایک طرح کا تعلق ہے - مثلاً تاریخ منطق - نفسیات - طبعیات اور ریاضی - تاریخ کیا ہے گزشتہ حالات کی یادداشت - پس اس کی معلومات سے معاشی مسائل کی تحقیق - تصدیق اور تمثیل میں بہت مدد ملتی ہے طریقِ تحقیق کا سارا دارومدار منطق پر ہے - اس تعلق کو ہم عنقریب بعنوان طریقِ معاشیات جداگانہ طور پر واضح کریں گے - اب نفسیات کو لیجئے - معاشیات میں ایک خاص نقطۂ نظر سے انسانوں کے افعال مطالعہ کئے جاتے ہیں - بیشتر انکی احتیاجات - اور تکمیل احتیاجات سے بحث ہوتی ہے - اور انسان کے افعال - احتیاجات - اور اُن کی تکمیل کو نفسیات سے بھی خاص تعلق ہے - بلکہ ان کی تشریح و توجیہ کرنا اسی کا کام ہے - پس غور کرنے سے واضح ہوگا کہ معاشیات اور نفسیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے - معاشیات نے نفسیات کے قوانین کو بلاتکلف

حصۂ اوّل
باب اوّل

اپنے مباحث میں بطورِ مسلّمات قبول کرکے اُن پر معاشی تحقیقات کی بنا قائم کی ہے۔ مثلاً محنت۔ مبادلہ۔ قانون تقلیلِ افادہ۔ احتیاج کی بست وکشاد۔ ان مباحث کا اصلی مرکز نفسیات ہے۔ لیکن معاشیات نے ان معلومات سے اپنے مباحث میں کام لیا ہے۔ علیٰ ہذا قانونِ تقلیل حاصل جس پر مسئلہ لگان کا بیشتر دارومدار ہے۔ دراصل طبعیات سے متعلق ہے۔ پس اس کی تشریح وتوجیہ اسی کا وظیفہ ہے۔ لیکن معاشیات میں وہ بطور مسلّمات داخل ہوکر بعض اہم مباحث کا سنگِ بنیاد بن گیا ہے۔

معاشی قوانین کے تحت میں مفروضات کی طرف اشارہ ہوچکا ہے۔ یہاں مسلّمات کی نوعیت بیان ہوئی۔ بعض مصنفوں نے معاشی مفروضات اور مسلّمات کی باقاعدہ فہرستیں مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً بجہٹ۔ سینیر۔ کرنس۔ کوسا۔ سجوک۔ اور جانسن۔ ان میں سے چند اہم مفروضات اور مسلّمات کا اوپر حوالہ دیا جاچکا ہے۔ اپنے غور وتجسس سے ان کا پتہ چلانا نہ صرف خاص دلچسپی رکھتا ہے بلکہ مسائل سلجھانے میں از حد کارآمد ثابت ہوگا۔

معاشیات کے بعض قوانین اور نتائج اپنی دقّت اور پیچیدگی کی وجہ سے عبارت میں پورے طور پر ادا نہیں ہوتے۔ اس صورت میں ریاضی کے طریق پر ان کو بیان کرنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں رسد وطلب۔ قدر وقیمت۔ وغیرہ جیسے متقابل مباحث میں ریاضی کی نسبتیں داخل ہیں۔ اسکے علاوہ معاشیات کے اعلیٰ مباحث میں ریاضی کی مدد سے اور بھی کام نکلتے ہیں جنکی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مثلاً اسٹیٹسٹکس جس میں علم اور فنِ اعداد وشمار دونوں داخل ہیں۔ معاشیاتی ریاضی کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جیونس۔ اجورتھ۔ کسٹیڈ پرائس اور مارشل کی تصانیف میں معاشیات اور ریاضی کا تعلّق خاص طور سے صاف نظر آتا ہے۔

طریق معاشیات

(۱۶) معاشیات کی وسعت اوپر بیان ہوئی۔ یعنی نفسِ مضمون۔ نوعیت بحث اور دوسرے علوم سے تعلّق۔ اسی سلسلے میں معاشیات کا طریق تحقیق بھی مختصراً بیان کرتے ہیں۔ واضح ہوکہ علمی تحقیق کے دو طریق ہیں یا تو متعدد فروع سے

کسی اصل واحد کا پتہ لگانا یعنی تفصیل سے اجمال پیدا کرنا۔ یا کوئی اصول تسلیم کر کے اُس سے متعدد فروع اخذ کرنا یعنی اجمال سے تفصیل نکالنا۔ اصطلاحی زبان میں اوّل کو استقرا اور دُوم کو استخراج کہتے ہیں۔ معاشیات کی تحقیقات میں یہ دونوں طریق اس طرح ملے جُلے نظر آتے ہیں جیسے شیر وشکر۔ قدیم علما معاشیات کو کسی ایک طریق کا پابند ثابت کرنے کی فضول کوششیں کرتے رہے۔ تجربے سے تحقیق کے واسطے دونوں طریق کا اجتماع واتحاد اس طرح پر لازمی ثابت ہوا جیسے کہ تراش کے واسطے قینچی کے دو پھلوں کا ملنا۔ معاشیات کے جن مباحث میں عملی حیثیت غالب ہے مثلاً اضافہ اصل۔ مسئلۂ آبادی۔ پیدائش اور صرف دولت۔ ان میں طریق اوّل زیادہ موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ اور جن مباحث پر اُصول کا رنگ گہرا چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً مبادلہ یا تقسیم دولت وہاں طریق دُوم بیشتر کارآمد اور مستعمل ہے۔ لیکن یہ دونوں طریق نہ صرف اس طرح پر بحیثیت مجموعی تحقیقِ معاشیات کے واسطے ضروری ہیں بلکہ خود ہر طریق کا عمل بغیر دوسرے کی شرکت اور معاونت کے ناقص اور ناکامل رہتا ہے۔ چنانچہ نتائجِ استقرائی علمی حیثیت سے بے سود ہیں جبتک استدلال استخراجی سے انکی توجیہ نہ کی جائے۔ علیٰ ہذا نتائجِ استخراجی عملاً بیکار ہیں جبتک کہ بطریقِ استقرا واقعات سے اُن کی صحت ثابت نہ ہو جائے۔ المختصر دونوں مذکورۂ بالا منطقی طریق معاشیات کی تحقیقات میں لابُد اور ناگزیر ہیں۔ البتہ حسبِ حال مسئلۂ زیرِ تحقیق کبھی طریقِ استقرا کا استعمال مقدّم ہوتا ہے کبھی طریقِ استخراج کا۔ لیکن ہر حال میں ان کا اتّفاق لازمی ہے۔ واضح ہو کہ طریقِ معاشیات کی بحث فی نفسہٖ بہت دقیق ہے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے واسطے معاشی اُصول ومسائل کا تفصیلی علم شرطِ مقدّم ہے۔ یہاں بطورِ اشارہ صرف مختصر اور سلیس بیان پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوا۔

طریقِ بحث میں ضمناً معاشیات اور منطق کا تعلق بھی کچھ بیان ہو گیا۔ علاوہ بریں معاشیات کے اہم اور اساسی تصوّرات کا مفہوم قرار دینے اور اصطلاحات کی تعریف بیان کرنے میں منطق سے بہت ضروری مدد ملتی ہے۔ مثلاً قانون۔ رجحان۔ معمول اوسط۔ سبب۔ نتیجہ۔ تخفیف اور اضافہ۔ ان تصوّرات سے معاشی مباحث میں ازحد

کام پڑتا ہے اور ان کا تعین اور تشخیص منطق کے سوا اور کون کرسکتا ہے۔

معاشیات کی وسعت

(۱۷) معاشیات کی وسعت و طریق کے بارے میں مدتوں سخت اختلاف رائے پھیلا رہا جس کی تفصیل سے ضخیم کتابیں لبریز ہیں۔ اس باب میں جدید تحقیقات کا ماحصل اوپر بیان ہوا۔ ان اختلافات کے اسباب کا معاشیات کی تاریخ سے خوب پتہ چلتا ہے جس کا مختصر بیان یہاں برمحل اور مفید مطلب ہوگا۔ لفظ اکانمی سے جو اس علم کے معروف نام پولٹیکل اکانمی میں داخل ہے۔ تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ اکانمی ایک یونانی لفظ ہے۔ اس کے اصلی معنے ہیں خانہ داری کا انتظام یعنی ضروریات خانہ داری کی بہم رسانی اور آمد و خرچ کا حساب۔ اصطلاحاً اس کو تدبیرِ منزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یورپ میں صدیوں پہلے سے انقلابِ فرانس تک حکومت لوگوں کے کاروبار اور معاشی معاملات میں بلاتکلف اسی طرح مداخلت کرتی تھی جیسے کوئی بڑا بوڑھا اپنے گھر کے کاموں میں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مثلاً ایسے قانون وضع کئے گئے تھے کہ دستکار اور مزدور ایک قصبے سے دوسرے قصبے جاکر بغیر اجازت محنت مزدوری نہیں کرسکتے تھے۔ نیز پیشہ وروں کو اپنے کاروبار جاری کرنے کے واسطے اجازت درکار ہوتی تھی۔ سامان تیار کرنے اور اس کے استعمال میں بھی قانون غیرضروری دخل درمعقولات کرتا تھا۔ تجارتِ خارجہ میں قیمتی دھاتوں کی برآمد قطعاً ممنوع تھی۔ اور ایسے ہی بہت سے قاعدے قانون جاری تھے جنہوں نے معاشی جد و جہد کو پابند کر رکھا تھا۔ تاریخ انگلستان میں اڈورڈ سوم کے عہد سے ایسے قوانین کا صاف پتہ چلنے لگتا ہے۔ اور ترقی کرتے کرتے ملکہ الیزبتھ کے زمانے میں یہ قوانین معاشی جد و جہد کیواسطے ایک وسیع اور مستقل نظام العمل مرتب کردیتے ہیں۔ یہ ملکہ اپنی رعایا کی معاش کا اسی طرح تفصیلی انتظام کرنا چاہتی ہے جس طرح کہ ماں باپ اپنے بال بچوں کی روزی کے لئے فکر کرتے ہیں۔ چونکہ انتظام خانہ داری اور معاشی معاملات کی سرکاری نگرانی میں بہت کچھ مشابہت نظر آتی ہے۔ لہذا محض اکانمی یا تدبیرِ منزل سے مشابہت اور ساتھ ہی فرق ظاہر کرنے کے لئے لفظِ پولٹیکل بڑھا کر اس علم کا نام پولٹیکل اکانمی قرار دیا۔ جس کو تدبیرِ مدن کہہ سکتے ہیں چونکہ کفایت شعاری

اور منفعت طلبی معاشی معاملات کے حسنِ انتظام کی لازمی خصوصیت ہے۔ لفظ اکانمی میں کفایت شعاری کا خیال بتدریج چلتے چلتے بالآخر ایسا پیوست ہوگیا کہ لوگ اصلی معنے یعنی انتظام خانہ داری یا معاشی معاملات کی نگرانی بھلا بیٹھے اور مدت تک اچھے اچھے اس مغالطے میں مبتلا رہے کہ یہ علم کفایت شعاری۔ دولت پرستی اور خود غرضی کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں بعض پاک طینت عالموں نے اس پر بہت زہر اگلا اور دل کھول کر اسے صلواتیں سنائیں۔ اور نا واقفیت۔ غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی معذور تھے۔ بعد کو اس کا مبحث اور موضوع بہت کچھ صاف ہوگیا۔ یعنی وہ انسانی زندگی کے ایک خاص اور اہم شعبے کا مطالعہ قرار پایا۔ تاہم چونکہ لفظ پولٹیکل اکانمی سے مغالطے کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ بنظرِ مزید احتیاط اب یہ علم زیادہ تر اکنامکس کے سیدھے سادے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اوپر بیان ہوا کہ کسی زمانے میں حکومت معاشی معاملات میں بکثرت جا و بیجا مداخلت کیا کرتی تھی۔ اس طرزِ عمل کو اصطلاحاً تجاریت اور اس کے حامیوں کو تجاریئین کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے تک معاشیات محض بحیثیتِ فن بیشتر سرکاری معاشی مسلک سے تعلق رکھتا تھا ابھی اس میں علمی رنگ پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن انقلابِ فرانس کے بعد فرانس میں حکما کا ایک زبردست گروہ فطرآئین نام پیدا ہوا جس نے سرکاری مداخلت کی بڑے زور سے مخالفت کی اور اس کو بجائے مضر ترقی و بہبود ثابت کیا۔ اس کے برعکس یورپ بھر میں اصولِ غیر مداخلت کی اس شد و مد سے منادی کی کہ گھر گھر چرچا ہو کر وہ بہت ہر دلعزیز ہوگیا اور بالآخر حکومت کو بھی عام رائے کے مطابق اپنا مسلک بدلنا پڑا اور روز بروز معاشی جد و جہد قانونی پابندیوں سے آزاد ہونے لگا۔ چنانچہ جب آدم اسمتھ نے اس اصول کی انگلستان میں اشاعت کی تو قانونِ غلہ جو درآمد غلے کو روکتا تھا اور مدت سے نہایت ضروری اور مفید خیال کیا جاتا تھا۔ منسوخ کر دیا گیا اور درآمد و برآمدِ غلے میں پوری آزادی مل گئی۔ اصولِ غیر مداخلت کے اثر سے کاروبار میں سرکاری نگرانی گھٹتے گھٹتے تقریباً مفقود ہوگئی۔ اس وقت معاشیات نے بھی محض سرکار کے معاشی مسلک کی بحث سے آگے بڑھ کر علمی تحقیقات کے میدان میں قدم رکھا۔

حصّہ اوّل
باب اوّل

اور اصلاح و نگرانی معاشی جدّوجہد تجویز کرنے کے بجائے خود معاشی جدّوجہد کی تشریح و توجیہ اُس کا فریضہ قرار پایا۔ حتّٰی کہ ایک خاص نقطۂ نظر سے تمدّن کا مطالعہ کرنے کی بدولت بالآخر معاشیات کو ایک جداگانہ علم عمرانی کا رتبہ حاصل ہو گیا۔

کچھ تو انسان بالطبع نگرانی کا محتاج ہے اور کچھ کلوں کے ایجاد نے ملک کی معاشی حالت میں ایسا انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور اس انقلاب کی ہم مناسب موقع پر کافی تشریح کریں گے کہ سرکاری نگرانی کی ضرورت پھر بشدّت محسوس ہونے لگی۔ غیر مداخلت کا مسلک بالکل متروک تو نہیں ہوا لیکن اس میں مناسب ترمیمیں ضرور کر دی گئیں۔ اور بمقتضائے ضرورت سرکار نے پھر معاشی معاملات کی نگرانی کے واسطے قوانین پاس کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ قانونِ بنک۔ قانون کارخانہ جات وغیرہ اسی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ البتّہ اتنا فرق ضرور ہے کہ قدیم زمانے میں سرکاری مداخلت عام مسلک تھا اور بیئتہً معاملات میں اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس کے برعکس آجکل سرکار کا عام مسلک غیر مداخلت ہے۔ صرف خاص خاص صورتوں میں بطورِ استثنا مداخلت کرتی ہے۔ لیکن اقتضائے حالات پھر توسیع مداخلت کے طالب و موید نظر آتے ہیں۔ سرکار کے موجودہ معاشی مسلک کو تجارتیت اور فطرآئینی کا ایک معتدل مرکب سمجھنا چاہئے۔ جس کو سرکاری نگرانی کہنا موزوں ہوگا۔ اس تیسرے دور میں معاشیات کے علم و فن میں امتیاز پیدا ہو کر دونوں جدا ہو گئے۔

اوپر کی بحث سے بظاہر معلوم ہوگا کہ تاریخی لحاظ سے معاشیات اوّل بشکلِ فن نمودار ہوا اور ترقّی کرتے کرتے اس نے علم کی شان حاصل کر لی اور بالآخر اس میں علم و فن کی دو جداگانہ حیثیتیں پیدا ہو گئیں۔ یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم سے فن پیدا ہونا چاہئے نہ کہ فن سے علم لیکن یہ بحث بعینہ ایسی ہے جیسے کہ "انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی"۔ واقعہ یہ ہے کہ اوّل انسان تجربۃً اپنی احتیاجوں کو پورا کرنے کی تدبیریں نکالتا ہے۔ اور کامیاب ہونے پر وہی تدبیریں فن و علم کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ کچھ عرصے تک فن و علم ایسے ملے جلے رہتے ہیں جیسے دودھ میں مکھن۔ لیکن ترقّی کے ساتھ ساتھ ان میں تفریق شروع ہونے لگتی ہے۔

اور بالآخر علم فن سے بالکل ممیز اور ممتاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فن طب اور علم الابدان نجوم اور ہیئت کے تاریخی رشتے سے یہ امر بخوبی روشن ہے۔ اسی طرح معاشیات میں بھی ترقی ہوتے ہوتے فن سے جدا گانہ ایک علم ایجاد کی شان پیدا ہو گئی۔ اور جس حیثیت انسان کے افعال کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا اس کا اصلی مقصد قرار پایا۔

معاشیات کے موضوع اور اس کی وسعت کے متعلق جو جو تبدیلیاں ظہور میں آئیں ان کی جھلک اس کے اردو ناموں میں بھی نظر آتی ہے۔ علم انتظام مدن اصول سیاست مدن علم ثروت۔ اصول تونگری جیسے مختلف خطابات اس کو دیئے جا چکے ہیں۔ اور علم الاقتصاد یا اقتصادیات تو ملک میں خاصا رواج پا چکا ہے۔ مدتوں کی مسلسل تحقیقات اور غور و فکر کے بعد پولیٹیکل اکانمی کے قدیم معنوں اور اکنامکس کے جدید مفہوم میں جو نمایاں فرق نمودار ہو گیا ہے اس کی نہایت مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے اور اس کی تفصیل سے بہت سی مستند تصانیف لبریز ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے مروجہ نام اقتصادیات اور جدید اصطلاح معاشیات میں تقریباً وہی تعلق ہے جو بلحاظ معنی و مفہوم پولیٹیکل اکانمی اور اکنامکس میں قرار پا چکا ہے۔ اقتصادیات میں وہی میانہ روی۔ اعتدال ضبط اور خوش انتظامی کی ہلکی ہلکی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ گویا پولیٹیکل اکانمی کے قدیم معنوں کا عمدہ ترجمہ ہے۔ لیکن جب خود علم کا مفہوم ترقی کر کے بہت کچھ بدل جائے تو پھر ترجمے میں قدیم معنوں پر اکتفا کرنا اور مفہوم کی ترقی نظر انداز کر دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس علم کی جدید مستند تصانیف کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اب خاص طور پر صرف یہ تحقیق کرنا مقصود نہیں کہ کاروبار زندگی میں کن قواعد کی پابندی عام مرفہ الحالی کے واسطے مفید ہے۔ ملک کے دولتمند بننے کی کیا کیا تدابیر ہیں اور سرکار کو اس باب میں کیا کوشش اور انتظام کرنا چاہئے۔ ایسے اکثر علمی مباحث تو اکنامکس ایک شعبۂ فنانس یعنی فن مالیات کے سپرد ہیں۔ خود علم کا مبحث اس سے کہیں وسیع اور اعلیٰ ہے۔ یعنی دنیا کی معاشرت و تمدن کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا کہ لوگ اپنی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔ ان کو کیا کیا ذرائع معاش حاصل ہیں۔ اور وہ ان سے کیونکر کام لیتے ہیں۔ ضروریات زندگی

حصۂ اوّل
باب اوّل

کیا ہیں اور وہ کس طرح میسّر ہوتی ہیں - ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں - غرضکہ انسان اپنی روزی کمانے اور دیگر بیشمار ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے اور برتنے میں جو کوشش اور تدبیریں کرتا ہے - اور جن اسباب و نتائج کو اُن سے تعلق ہوتا ہے - اوّل اُن سب کا مطالعہ کرنا - بعدہٗ اُن کو چند جامع اُصول و قوانین کے تحت میں لانا - اور بالآخر اُن سے مسائل مرتب کرنا تاکہ معلومات میں علمی حرکت و قوت پیدا ہو جائے - یہ سب کام اکنامکس نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے جدید مفہوم کے لحاظ سے اس کا اُردو نام علم المعیشت تجویز کیا گیا ہے اور بنظر اختصار اسکو اکثر معاشیات سے بھی تعبیر کرتے ہیں ؎

معاشیات کی قدیم تصانیف

(۱۸) بعض معاشی مسائل کا قدیم زمانے سے مذہب - اخلاق اور فلسفے کی کتابوں میں ذکر چلا آتا ہے - مثلاً سُود - محنت - صنعت - تجارت - حصولِ دولت وصرفِ دولت - مگر یا تو پند و موعظت کے پیرائے میں کہ ایسا کرنا اچھا ہے اور ایسا کرنا بُرا - یا زیادہ سے زیادہ سطحی فن کی حیثیت سے مثلاً پیشوں کی قسمیں اور دولت کمانے کے طریق - اس حد تک یہ مسائل بہت مجمل بلکہ تشنہ رہتے ہیں - اور اُن کے باہم کسی خاص فن یا علم کا رشتہ نظر نہیں آتا ؎

دوسرے دور میں چند معاشی اُصول و مسائل ایک ابتدائی فن کی حیثیت سے گھر کی چاردیواری میں نشوونما پاتے ہیں - انتظام خانہ داری کے متعلق قاعدے قانون بنتے ہیں - ایک مختصر سا فن نمودار ہوتا ہے جس کو یونانی لوگ اکانمی ہندوستان کے آریئے گھر شاستر اور اہلِ عرب تدبیرِ منزل کہتے تھے ؎

سلطنتوں کے عروج کے ساتھ ساتھ فنِ حکومت پر کتابیں لکھنی شروع ہوئیں جس میں سیاسیات اور معاشیات - تانے بانے کی طرح متّصل نظر آتے ہیں - اور پھر اخلاقیات کا بھی رنگ جھلکتا ہے - تمام ملک کو ایک گھر - باشندوں کو ایک کنبہ اور حکومت کو منتظم سرگروہ تصوّر کرکے تدبیرِ منزل کے طرز پر ان تدابیر سے بحث کی کہ جو مُلک کو مرفہ الحال اور سلطنت کو دولتمند بنا سکیں - ملکی پیداوار صنعت و حرفت - تجارت - سرکاری مداخل و مخارج - بیشتر ان اُمور کی علمی بحث شروع کی گئی - یہاں سے فنِ معاشیات کی ابتدا سمجھنی چاہئے ؎

ہندوستان میں سنسکرت کی قدیم کتابوں سے ایک خاص بحث ارتھ شاستر کا پتہ چلتا ہے جس میں فنِ حکومت کی جھلک صاف نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کسی زمانے میں ارتھ شاستر پر بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں جس میں سے ایک ارتھ شاستر اب بھی دستیاب ہوتا ہے۔ اس کا مصنف چانکیا عرف کوتلیا ہے جو کہ مگدھ کے مشہور راجہ چندر گپت موریا کا نامور وزیر تھا اور جس کی اولوالعزمی اور حُسنِ تدبیر سے سلطنتِ مگدھ کو بہت کچھ عروج حاصل ہوا۔ اس کتاب میں جا بجا فن اور کہیں کہیں علم کے رنگ میں معاشی مباحث نظر آتے ہیں۔ کتاب میں متعدد قدیم مصنفوں کا بھی ذکر اور حوالہ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں فنِ حکومت پر تصنیف و تالیف کا خاصا رواج تھا۔

عربی میں بھی فن کی حیثیت سے معاشیات کے مباحث جا بجا موجود ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ ابو الفضل جعفر بن علی الدمشقی کی تصنیف کتاب الاشارہ الی محاسن التجارہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہوگی۔ اس کے بعد علامہ ابنِ خلدون کے مقدمۂ تاریخ کا پانچواں حصہ خاص طور پر معاشی معاملات سے متعلق ہے۔ اسکے مباحث میں خاصی علمی چاشنی موجود ہے۔ اہلِ عرب نے خود اس بحث کا نام "علمِ معاش" تجویز کیا تھا جس کو جدید اہلِ مصر پولیٹیکل اکانمی کے لفظی ترجمہ اقتصاد سیاسی سے تعبیر کرنے لگے۔ جرجی زیدان کی جدید تالیف آداب اللغتہ العربیہ سے اس فن کی اور نایاب کتابوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ فارسی میں ابو الفضل کی مشہور تصنیف آئینِ اکبری میں بھی فنِ معاشیات کی معلومات کا معقول ذخیرہ موجود ہے بعض فارسی کتبِ اخلاق میں بھی معاشی مباحث کا سرسری ذکر نظر آتا ہے +

حاصلِ کلام یہ کہ گرچہ اس وقت یہ علم ہم کو یورپ سے حاصل ہو رہا ہے اور بہت کمال کی حالت میں با فراط مل رہا ہے۔ تاہم قدیم زمانے میں حسبِ اقتضائے وقت ایشیا میں بھی اس علم پر کافی غور و خوض ہو چکا ہے۔ جس کی یادگاریں مستند اور قابلِ قدر تصنیفیں موجود ہیں اور خدا جانے ایسی کتنی تصانیف دستبردِ زمانہ سے تلف ہو گئیں۔ ان کتابوں کے حوالے

موجود ہیں مگر خود اُن کا کہیں پتہ نہیں ۔

یورپ میں اوّل اوّل ۱۶۱۵ء میں ایک فرانسیسی مونشیرٹن نامی کی کتاب پولٹیکل اکانمی کے عنوان سے شائع ہوئی جس کو باقاعدہ فنِ معاشیات کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہئے ۔ اسی زمانے میں اطالیہ میں بھی انٹونیو سرا نے ایک کتاب فنِ معاشیات کے متعلق شائع کی ۔ اس میں سونے چاندی کی بابت بحث کیگئی ہے ۔ اٹھارھویں صدی کے وسط سے ایسی کتابیں شائع ہونے لگیں جن میں علمی رنگ نمودار ہو کر بتدریج پھیلنے لگا ۔ فرانس میں ۱۷۵۵ء میں کنٹیلن کی اور ۱۷۵۸ء میں کوئسنے کی کتابیں شائع ہوئیں ۔ آخری کتاب کی بہت قدر ہوئی ۔ انگلستان میں ۱۷۶۷ء میں سرجیمس اسٹوارٹ نے اور نو سال بعد ۱۷۷۶ء میں آدم اسمتھ نے اپنی اپنی کتاب شائع کی ۔ آدم اسمتھ کی کتاب نے وہ رسوخ پایا کہ لوگوں نے مصنف کو بادِ معاشیات کا خطاب دے دیا ۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ آدم اسمتھ کی کتاب وسعتِ نظر کی بدولت انگلستان میں ہمیشہ علمِ معاشیات کی سنگِ بنیاد تسلیم ہوگی ۔ تاہم اس مشہور اور قابل یادگار تصنیف میں فن اور علم کا رنگ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے ۔ خالص علمی رنگ میں جو کتاب سب سے اوّل ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی وہ ایک فرانسیسی جین بپٹسٹ سے کی تصنیف تھی ۔ اس میں معلومات تو کچھ ایسے زیادہ نہ تھے لیکن بیان کی صفائی وسلاست اور مضامین کے تسلسل و ترتیب نے اس میں خاص کشش اور علمی شان پیدا کر دی ۔ چنانچہ تقریباً یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور آج تک کتابوں میں اکثر وہی ترتیب مروّج ہے ۔

اُنیسویں صدی کے ابتدا سے معاشیات نے ایک علم کی حیثیت سے ترقی شروع کی ۔ یورپ کے تمدّن وتہذیب میں اُس کو جو غیر معمولی نشو و نما حاصل ہوا اور ایک ہی صدی کے اندر اندر مساعدتِ وقت سے اس نے جو عروج پایا محتاج بیان نہیں ۔ معاشیات کے میدان میں جرمنی سب سے پیش پیش نظر آتا ہے ۔ اس کے بعد فرانس انگلستان ۔ آسٹریا اور امریکہ کا نمبر ہے ۔ معاشیات کی وسعت ۔ اس کے طرق اور معاشی مسلک کے مقاصد پر اسقدر اختلاف رائے پھیلا کہ متعدد فرقے بن گئے ۔ جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ۔ تحقیق سے کچھ

اختلاف مٹ رہے ہیں تو کچھ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علومِ عمرانی میں اتحادِ خیال کس قدر دشوار ہے۔ بیسویں صدی کے شروع سے اور بالخصوص جنگِ یورپ کے زمانے سے معاشیات پر بکثرت کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور اخبار و رسائل پر بھی معاشیات کا رنگ بہت غالب نظر آتا ہے۔

معاشیات کی موجودہ ضرورت

(۱۵) ترقّیٔ تہذیب کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کو سُلجھانے کے لئے ناخنِ علم ناگزیر ہیں۔ زندگی کے متعدد شعبوں میں سے صرف ایک معاشی جدّوجہد ہی پر ذرا غور کیا جائے کہ اب اس کا حلقۂ اثر شہروں صوبوں بلکہ ملکوں سے بڑھ کر تمام عالم پر محیط ہو گیا ہے زمانۂ حال کی ایجادات تار، مطبع، ریل، دُخانی جہاز، اور طرح طرح کی دُخانی اور برقی کلوں نے تمام دُنیا کو کیسے کیسے قوی تعلقات اور مضبوط رشتوں سے جکڑ دیا ہے۔ کبھی ہماری ضروریات انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں اور اُن کو پورا کرنے کے وسائل کیسے سیدھے سادے اور مختصر تھے۔ ہر قصبہ اور شہر اپنے اپنے باشندوں کی ضروریات کا بیشتر کفیل ہوتا تھا۔ اور رسدِ ضروریات کے واسطے اپنے مُلک سے باہر کوئی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا مگر آج مہذب و متموّل طبقوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ دُنیا کا وہ کونسا مُلک ہے جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز اُن کے محل یا کوٹھی کے سامان میں داخل نہیں۔ آپ ایک غریب اور جاہل گنوار کے جھونپڑے میں بھی کم از کم روس یا برما کا مٹی کا تیل۔ امریکہ یا جرمنی کی لالٹین۔ جاپان یا آسٹریا۔ ناروے یا سویڈن کی دیاسلائی اور انگلستان کا کپڑا ضرور موجود پائیں گے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سوئٹزرلینڈ کی سستی گھڑیوں۔ امریکہ کے سگریٹ۔ انگلستان کے قلم چاقو کا رواج بھی اسکول جانے والے دیہاتی بچّوں میں پھیل رہا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک طرف تو ہماری ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف اُن کے پورا کرنے کے وسائل وسیع ہو رہے ہیں۔ اور یہ ترقّیٔ تہذیب اور فراوانیٔ آبادی کا مُقتضا ہے۔ اس عالمگیر رجحان کو روکنا ممکن نہ مُفید۔ البتّہ اُس کو چند اُصول کا پابند بنانا ضرور ہے۔ جس کی تفصیل تجارتِ بین الاقوام کے سلسلے میں پیش کی جاویگی۔

حصّہ اوّل
باب اوّل

دُنیا کا کوئی مہذّب مُلک ایسا نہیں جو اپنی تمام ضروریات کو خود پورا کر سکے۔ اور دوسرے مُلکوں کا کم و بیش دست نگر نہ ہو۔ کسی مُلک میں مصنوعات کی درآمد ہے جیسے ہندوستان میں۔ اور کسی میں پیداوارِ خام کی مانگ ہے جیسے انگلستان میں لیکن دُنیا کے تمام مہذب ممالک اپنی ضروریات پوری کرنے میں ایک دوسرے کے اس طرح محتاج ہیں جیسے کسی زمانے میں دیہات کے پیشہ ور ایک دوسرے کے محتاج ہوتے تھے۔ رسدِ ضروریات کے وسائل نہ صرف وسیع ہو گئے ہیں بلکہ ان کی حالت میں بھی انقلابِ عظیم نظر آتا ہے۔ ذرا جُلاہے کے کرگھے کا مانچسٹر یا بمبئی کی ملوں۔ موچی کی دُکان کا نارتھمپٹن یا کانپور کی فکٹریوں اور لوہار کی بھٹّی کا ٹیڈس یا ٹاٹا ورکس کے کارخانوں سے مُقابلہ تو کرو۔ کوئی بھی نسبت ہے۔ حالانکہ ان کے کام وہی یکساں ہیں ؛

مزید براں سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو عام مُلکی اور قومی بہبودی و مرفہ الحالی کے سنگِ بُنیاد ہیں۔ اور جن کو حل کرنا علم اور تجربے کی مدد کے بغیر مُحال ہے۔ سکّہ۔ نوٹ بنک۔ قرضِ عامہ۔ مشترک سرمایہ دار کارخانے۔ سرکاری اور کاروباری تمسّک دستاویزات قابلِ بیع و شریٰ۔ تجارتِ درآمد و برآمد۔ محصول۔ مالگزاری۔ سرکاری مداخل و مخارج۔ سالانہ موازنہ۔ وہ چند جدید اہم مسائل ہیں جن کو حل کرنے میں آج دُنیا کے بہترین دماغ براہِ راست یا بالواسطہ مصروف ہیں۔ اور یہی وہ مسائل ہیں جو تمام مہذب سلطنتوں کی سیاسیات کی روحِ رواں بنے ہوئے ہیں ؛

پس جبکہ ہماری زندگی کا معاشی شُعبہ اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہو گیا ہو اور اُس کا اثر ہماری بہبود پر اس درجہ حاوی ہو۔ معاشیات جاننے کی ضرورت ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مُلکوں کی طرح ہندوستان میں بھی روز بروز اس کا چرچا پھیلتا جاتا ہے۔ گویا خود زمانہ اس علم کا متقاضی ہے ؛

بابِ دُوم

معاشی تاریخِ انگلستان

(۱) معاشی تاریخ (۲) جاگیرداری طریق (۳) جتھے (۴) تجارتی جتھے (۵) حرفتی جتھے
(۶) کالی موت (۷) [illegible] (۸) قومی تجارت (۹) قانونِ کار آموزی (۱۰) قانونِ اجارہ داری
(۱۱) قانونِ مفلسی (۱۲) قانونِ غلہ (۱۳) قانونِ جہازرانی (۱۴) تجاریت (۱۵) صنعتی انقلاب
(۱۶) ایجادات (۱۷) طریقِ عدمِ مداخلت یا کاروباری آزادی (۱۸) کارخانہ جات
(۱۹) خلاصہ

معاشی تاریخ

(۱) تاریخ کیا ہے۔ گزشتہ حالات و واقعات کی یادداشت۔ ہمیشہ سے ماضی و حال میں بیخ و بن کا سا تعلق چلا آتا ہے۔ جدید حالات قدیم اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں بالخصوص علومِ عمرانی میں تو تاریخ کے بغیر تحقیق محال ہے۔ چنانچہ معاشیات کے اصول و مسائل کی تفہیم و تصدیق میں معاشی حالات کی تاریخ سے بیحد مدد ملتی ہے۔ حتّٰی کہ جرمنی کے سربرآوردہ معاشئین تو معاشی تاریخ ہی کو اس علم کا جزوِ اعظم اور سنگِ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ معاشیات میں تاریخ کی کس کس اعتبار سے کس قدر ضرورت ہے۔ یہ ایک اہم اور معرکۃ الآرا بحث ہے۔ تاہم اس کا قریبی تعلق سبکو تسلیم ہے۔ یورپ نے حال میں معاشیات کو خاص ترقی دی ہے۔ اور ہندوستان کو بھی اس وقت وہیں سے یہ علم حاصل ہو رہا ہے۔ یورپ کی تاریخ میں موجودہ معاشیات کے سرچشمے بکثرت ملتے ہیں لیکن یورپ کی معاشی تاریخ کے واسطے بسوط تالیف درکار ہے۔ بخوفِ طول یہاں صرف انگلستان کی مختصر سی معاشی سرگزشت پیش کرتے ہیں۔ تاکہ معاشی مباحث میں ماضی و حال کا تعلق کسی قدر واضح ہو جائے۔ ہندوستان کی معاشی تاریخ کے پہلو معاشیاتِ ہند کی کتابوں میں اپنے

موقع محل پر نظر آئیں گے۔ بحالتِ موجودہ تو صرف معاشیاتِ علی میں تاریخِ ہند سے سابقہ پڑتا ہے۔ بمعاشیاتِ نظری میں ہندوستان نے کوئی ایسا حصّہ نہیں لیا کہ اُس کے اُصول و مسائل کی تحقیق میں اُس کی تاریخ سے کوئی قابلِ لحاظ مدد ملے۔ آئندہ ممکن ہے کہ ہندوستان بھی کوئی خاص نظامِ کاروبار قائم کر کے علم میں اضافہ کرے۔ اُس وقت سے اُس کی تاریخ کو بھی معاشیاتِ نظری سے تعلق پیدا ہو جائیگا۔ ذیل میں انگلستان کی مختصر معاشی سرگزشت ملاحظہ طلب ہے ؛

جاگیرداری طریق

(۲) آٹھ نو صدی عیسوی تک تو انگلستان کا تمدّن بہت ابتدائی حالت میں رہا۔ زراعت۔ گلّہ بانی اور ماہی گیری ذریعۂ معاش تھا۔ موٹا جھوٹا کپڑا بھی بن لیتے تھے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ اس کے بعد دس گیارہ صدی عیسوی سے سولھویں صدی تک ایک دوسرا دور نظر آتا ہے۔ اس کے طریقِ معاش قابلِ مطالعہ ہیں۔ مُلک میں ایک تو علاقہ شاہی ریاست یا صرف خاص کا تھا۔ اسکے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی جاگیریں تھیں جو فوجی خدمات کے صِلے میں اور آئندہ فوجی امداد کے معاہدے پر تقسیم کی گئی تھیں۔ بوقت جنگ ہر جاگیردار حصۂ رسد فوج دیتا تھا۔ تمام زمین اوسطاً پانچ ہزار ایکڑ کے حساب سے مقطعوں میں تقسیم تھی۔ کسی جاگیر میں صرف دو چار مقطعے تھے اور کسی میں سو پچاس یا اس سے بھی زیادہ۔ جاگیردار خود تو زراعت کرنے سے رہے۔ بلکہ اُن کے ماتحت سپاہی بھی جن کو تھوڑی تھوڑی زمین مِل جاتی تھی دوسروں ہی سے کاشت کراتے تھے۔ یہ لوگ خود بس لڑائی بھڑائی کے واسطے تیّار رہتے تھے۔ اور اُس بدامنی کے زمانے میں یہی کام مقدّم بھی سمجھا جاتا تھا ؛

مِلک زمین کا طریق تو مختصراً معلوم ہوا۔ اب کاشتکاری کو لیجئے۔ اُس دور میں کاشتکاروں کی حالت غلاموں سے کچھ یوں ہی سی بہتر تھی۔ ہر کاشتکار اپنے زمیندار سے مستقل طور سے وابستہ تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ایک زمیندار کو چھوڑ کر وہ دوسرے زمیندار کے ہاں جا کے کاشت کرے۔ بلکہ جس جاگیر میں پیدا ہوتا تھا وہیں عمر بسر کر دیتا تھا۔ نسلاً بعد نسل یہی سلسلہ جاری رہا۔ کاشتکار پر واجب تھا کہ فصل پر حسبِ دستور کچھ پھل پھول اور غلّہ ترکاری زمیندار کے ہاں پہنچاتا رہے۔ اُس کو زمیندار کے

مختلف کام کاج بھی بطور بیگار کرنے پڑتے تھے۔ بالخصوص زمیندار لوگ اپنے طور پر کچھ کاشت کرا لیتے تو کھیتی باڑی کا تمام کام اُن کے کاشتکار مفت انجام دیتے تھے۔ المختصر اُس زمانے میں کاشتکار کچھ اپنے ہاں کی پیداوار زمیندار کی نذر کرتا تھا کچھ اُس کا کام کاج کرتا تھا۔ البتہ کوئی لگان بشکل زر اُس کو ادا کرنا نہیں پڑتا تھا۔

اُس زمانے کی عام حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ کیجئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ جس انگلستان میں آج ۸۰ فی صدی لوگ رونق سے بھرے پرے شہر اور قصبوں میں آباد ہیں۔ اور صنعت وحرفت اور تجارت کی دھوم پڑی ہوئی ہے۔ وہاں اُس زمانے میں نوّے فیصدی لوگ چھوٹے چھوٹے دیہات میں پڑے رہتے اور زراعت پر زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ذرائع آمد و رفت تھے۔ نہ بیداری و اولوالعزمی تھی۔ نہ کچھ ایسی دولت تھی۔ جو جہاں پیدا ہوتا وہیں عمر گزار دیتا۔ ہر شخص آبائی پیشے پر قناعت کر لیتا۔ ادنےٰ ضروریات کے سوا بہت کم چیزیں میسر تھیں۔ تجارت برائے نام جاری تھی۔ تبادلے سے کام چلتا تھا۔ زر کا پتہ بھی نہ تھا۔ ہر طرف جمود اور پسماندگی نظر آتی تھی۔ یہ حالت انگلستان تک محدود نہ تھی بلکہ مدتوں تمام یورپ پر تقریباً چودھویں صدی عیسوی تک طاری رہی کیونکہ اُس زمانے میں جاگیردار اور کاشتکار ملک کے دو خاص اور بڑے طبقے تھے۔ اس دورِ معاش کو جاگیرداری طریق سے تعبیر کرتے ہیں۔

جتھے (۴) بالآخر صنعت وحرفت میں کچھ جان پڑنی شروع ہوئی۔ دیہات چھوڑ چھوڑ کر لوگ کاروبار کے لئے قصبوں میں بسنے لگے۔ جاگیرداروں کو اپنے قدیم کاشتکاروں کی یہ ترنگ ناگوار گزری۔ اور اسی بنا پر اُن کی قصبوں سے چل گئی۔ اتفاق دیکھئے۔ اُسی زمانے میں جاگیرداروں میں خود بادشاہ سے کشیدگی تھی۔ اُنکو بادشاہی اقتدار پر حسد تھا۔ اور بادشاہ اُن کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں قدرتاً بادشاہ قصبوں کا حامی بن گیا۔ اُن کے واسطے طرح طرح کی رعایت مراعات منظور کیں۔ اُدھر قصبات کے لوگ بھی بادشاہ کے طرفدار ہو گئے اور جان مال سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ یہیں سے گوناگوں تسباقی جتھوں کی ابتدا ہوتی ہے اور بادشاہ بذریعۂ فرامین

حصۂ اوّل
باب دوم

بطورِ اعانت و عنایت خاص حقوق عطا کرتے ہیں ؎

تجارتی جتھے

(۴) اوّل اوّل قصبوں میں تجارت کو عروج ہوا۔ پس وہاں کے لوگوں نے تجارتی رعایات اور حقوق طلب کئے نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قصبوں میں تجارتی جتھے قائم ہو گئے۔ چند ضروریاتِ حیات کے سوا بیشتر چیزوں کی تجارت کے اِجارے مل گئے۔ خرید و فروخت کے متعلق ایسے مفصل اور باریک باریک قواعد مقرر ہوے کہ آج سرافے میں بھی ان کی مثال نظر نہیں آتی۔ غرض یہ تھی کہ تاجروں میں اِتحاد بڑھے اور تجارت کو خوب ترقی ہو۔ کب اور کہاں بازار لگائے جائیں۔ کیا کیا سامان کس قیمت پر فروخت کیا جاوے۔ ان سب باتوں کے متعلق قواعد مقرر تھے خود جتھوں کی طرف سے نگران کار متعین تھے۔ جو لوگ قواعد کی خلاف ورزی کرتے وہ یا تو جرمانہ بھگتتے یا جتھے سے خارج کر دئیے جاتے تھے ؎

حرفتی جتھے

(۵) جوں جوں قصبات کو ترقی ہوئی طرح طرح کی صنعتیں پھیلتی گئیں اور تجارتی جتھوں کو قائم ہوے ایک صدی نہ گزری تھی کہ حرفتی جتھے بھی نمودار ہو گئے ہر قسم کے دستکاروں نے اپنے اپنے جتھے بنا لئے تاکہ اپنی صنعت کو فروغ دیں اور اس سے خود ہی پورا فائدہ اٹھائیں۔ کاروبار کے متعلق ادنیٰ ادنیٰ باتوں کی ہدایت اور خبرگیری کی جاتی تھی۔ مثلاً اوزان اور پیمانے درست رہیں۔ ناقص مال تیار نہ ہو خرید و فروخت کرتے وقت جتھے کے لوگ آپس میں مقابلہ نہ کریں۔ بلکہ ہر حال میں اتفاق اور اتحاد سے کام لیں۔ اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کریں ؎

بارھویں صدی عیسوی تک تو انگلستان میں زر کا نام بھی نہ تھا۔ تمام کاروبار تبادلے پر چلتے تھے۔ البتہ تیرھویں صدی میں انگلستان سے دیگر ممالکِ یورپ کو اُون کا جانا شروع ہوا اور اُس کے مبادلے میں باہر سے چاندی آنے لگی تو زر کا رواج پڑا۔ دیہات میں اب تک رعیت اپنے زمینداروں کے ہاں گوناگوں خدمات انجام دیتی تھی۔ اب اُن کے بدلے وہ زمینداروں کو رقم ادا کرنے لگے۔ اور زمینداروں نے بھی اس تبدیلی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کیونکہ انہیں اپنے کاموں کے واسطے اُجرت پر مزدور مل جاتے تھے۔ خدمت کے بدلے رعیت سے رقم لے لی اور اُجرت پر مزدوروں سے کام کرا لیا ؎

حصۂ اوّل
باب دوم

کالی موت

(۶) ۱۳۴۸ء کا ذکر ہے۔ انگلستان میں سخت وبا پھیلی اور موت کا ایسا سیلاب آیا کہ دیہات میں تقریباً نصف آبادی صاف ہوگئی۔ اس خوفناک سانحے کو "کالی موت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مزدوروں کی بیحد قلت ہوئی تو قدرتاً اُجرت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اب زمینداروں کو فکر پڑی اور اُنھوں نے رعیت پر زور ڈالا کہ حسبِ دستور قدیم رقم ادا کرنے کے بجائے وہ پھر خدمات انجام دیں۔ ۱۳۵۱ء میں اور اُس کے بعد بھی کئی مرتبہ "قانونِ مزدوراں" نافذ ہوا کہ مزدور قدیم اُجرت پر کام کریں اور اضافہ طلب نہ کریں لیکن مزدوروں نے ایک نہ سُنی۔ اُن کا جوش و خروش یہاں تک بڑھا کہ ۱۳۸۱ء میں گاؤں گاؤں شورش برپا ہوگئی جو بدقت تمام فرو ہوسکی اور بالآخر رعیت کی حیثیت رہی۔ رسمی خدمات سے بالکل پیچھا چھوٹ گیا۔ اور حالت اس قدر سدھر گئی کہ پندرھویں صدی مقابلتہً اُن کے حق میں دورِ زرّیں معلوم ہوتی تھی۔

رمنے

(۷) اِدھر تو اور ممالکِ یورپ میں انگریزی اُون کی طلب بڑھی اُدھر کالی موت سے مزدوروں کی سخت قلت ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداروں نے مزروعہ کھیت بھی بھیڑوں کے رمنے بنا دیئے۔ جدھر دیکھو دیہات میں بھیڑ ہی بھیڑ نظر آنے لگیں۔ کہیں کہیں بقدرِ ضرورت زراعت باقی رہ گئی۔ کاشتکار اپنا مال بازار میں فروخت کرکے لگان و اُجرت کے لیئے زر ادا کرنے لگے۔ زر کے رواج سے قدیم دستور ٹوٹ گئے اور کاشتکاروں کو آزادی ملی۔

دیہات کے ساتھ ساتھ قصبات میں بھی تدریجی انقلاب جاری تھا۔ حکومت کے اقتدار بڑھنے سے جتھوں کا اثر گھٹ گیا۔ جان و مال کی حفاظت سے اب اُن کو کچھ سروکار نہیں رہا۔ تجارت پھیلی تو اُن کے اجارے اور خاص حقوق لوگوں کی نظر میں کھٹکنے لگے۔ ہر طرف سے اعتراض شروع ہوئے کہ کاروبار میں ہر شخص کو شریک ہونے کا موقع ملنا چاہیئے۔ جتھے اجارہ لینے والے کون ہیں۔ کاروباری حقوق سلب ہوتے ہی تجارتی جتھے بیجان ہوگئے۔ اُن کی حیثیت محض اخلاقی اور تمدنی انجمنوں کی سی رہ گئی۔ حرفتی جتھوں کا بھی تھوڑے عرصے کے بعد یہی حشر ہوا۔ اوّل تو خود مُلک میں صنعت و حرفت کا دور دورہ پھیلا دوسرے اُسی زمانے میں دیگر ممالک بالخصوص فرانس کے ہوشیار اور ماہر صنّاع و دستکار مذہبی تشدد اور

حصۂ اول
باب دوم

سخت گیری سے تنگ آکر انگلستان میں جوق جوق آباد ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں جتھوں کی کیا چلتی۔ ان کے حقوق بھی رخصت ہوئے۔ سولھویں صدی کے آخر میں ہر شخص مرضی کے موافق صنعت و حرفت میں مصروف تھا۔

جتھوں کا زور ٹوٹنا تھا کہ کاروبار اور صنعت و حرفت میں قومیت کا رنگ نمودار ہونا شروع ہوا۔ قومی مفاد اور عروج نصب العین قرار دے کر کاروبار کا رخ بھی اسی طرف پھیر دیا۔ وقت نے ہر طرح پر اس مسلک کی مساعدت کی۔ مدت کی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے بعد ہنری ہفتم جیسا مدبر اور اولوالعزم بادشاہ نصیب ہوا تو ملک ہر ترمیم و اصلاح میں اُس کا ساتھ دینے کو ہمہ تن آمادہ ہو گیا۔ اس نے قومیت کے مسلک کو بہت ترقی دی۔ ہر کام قومی نقطۂ نظر سے قرار پانے لگا۔ حُسنِ اتفاق سے اُس کے جانشین ہنری ہشتم اور ملکہ الیزبتھ بھی تدبر اور عالی حوصلگی میں کسی طرح کم نہ تھے اور انھوں نے بھی ملک کو اسی قومیت کے مسلک پر چلایا۔ ہر کسی کے سر میں یہی خیال سما گیا کہ جو کچھ ہے قومی عروج و اقتدار ہے۔ انفرادی ترقی کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ چھاپے کی ایجاد سے علم و ادب کے چشمے جاری ہوئے۔ امریکہ دریافت ہوا تو سب کی نظریں سمندر پار پڑنے لگیں۔ ہندوستان کا راستہ کھلا تو سمندِ عزم کو ایک اور تازیانہ ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ملک اور حکومت میں بے حد اتحاد و ارتباط بڑھ گیا۔ بادشاہ قوم کے لیڈر اور ہیرو شمار ہونے لگے۔ اور انھوں نے اپنی توم پرستی اور قوم پروری سے پورا پورا اعتماد حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت صنعت و حرفت کی ترقی میں ہمہ تن مصروف ہو گئی۔ اس حالت کو تاریخ میں قومی طریق سے تعبیر کرتے ہیں۔

قومی طریق

(۸) آجکل حکومتوں کا عام مسلک یہ ہے کہ صنعت و حرفت اور کاروبار میں بلا ضرورت کوئی مداخلت نہ کریں۔ سب کام آزادی اور مسابقت سے چلتے ہیں موجودہ ترقی کی حالت میں یہی مسلک مناسب حال بھی معلوم ہوتا ہے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انگلستان اور تمام ممالکِ یورپ میں حکومت کا کاروباری مسلک بالکل اس کے عکس تھا۔ مثلاً ٹیوڈر خاندان کے بادشاہوں نے انگلستان میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے واسطے کاروبار میں طرح طرح سے حصہ لیا۔ اس باب میں

اُن کی دلچسپی اور عملی کوششوں کی تفصیل کی جائے تو آج مُبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر تاریخ بتا رہی ہے کہ صنعت و حرفت کی ترقی کو انھوں نے اپنی حکومت کا نصب العین بنالیا تھا۔ اور ان ہی کے زمانے سے انگلستان میں دولت کے چشمے جاری ہوئے ؛

یوں تو شروع سے انگلستان کے تقریباً تمام اولوالعزم بادشاہوں نے قوم کے معاشی معاملات میں مداخلت اور امداد کی لیکن ملکہ الیزبتھ کی توجہ اور سرگرمی سب پر سبقت لے گئی۔ مثلاً سب سے پہلے ولیم اوّل نے ملک میں جاگیرداری طریق کی بنا ڈالی۔ اڈورڈ اوّل نے جاگیرداروں پر اپنا تسلط بڑھایا۔ اور صنعت و تجارت پر بھی سرکاری نگرانی قائم کی۔ اڈورڈ سوم کے زمانے میں تجارت کو کچھ آزادی مل گئی لیکن کالی موت سے سخت تباہی پھیلی۔ مزدوروں کی قلت ہوئی تو اُجرت بڑھی تعیّنِ اُجرت کی غرض سے قانونِ مزدوراں پاس ہوا جس سے مزدوروں میں سخت برہمی پھیلی اور جس کی بدولت آگے چل کر رچرڈ ثانی کے عہد میں خوب شورش اور بلوے ہوئے۔ اڈورڈ سوم کی ملکہ نے بہت سے نورباف اپنے وطن فرانس سے بُلا بُلاکر مشرقی انگلستان میں آباد کئے۔ چنانچہ اُس زمانے میں پارچہ بافی کو بہت نمایاں ترقی ہوئی۔ بحیثیت مجموعی اڈورڈ سوم کا عہد معاشی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ٹیوڈر خاندان کے دور میں انگلستان پر قومیت کا خوب گہرا رنگ چڑھا۔ مذہب حکومت معاشرت اور تجارت ہر شعبۂ زندگی میں قومیت ہی نصب العین بن گئی۔ اگرچہ ہنری ہفتم اور ہشتم کے زمانے میں بھی قومیت کو بہت تقویت پہنچی تاہم ملکہ الیزبتھ نے کمال کو پہنچا دیا وہ اپنی سرگرم اعانت اور خبرگیری کے اعتبار سے بلا مُبالغہ مادرِ قوم بن گئی۔ سو سے زیادہ ایسے قوانین پاس ہوئے جن کا معاشی اور معاشرتی حالات سے قریبی تعلق تھا۔ یہ سچ ہے کہ بعض قوانین سے مُلک کو بہت فائدہ پہنچا تو بعض مُضر بھی ثابت ہوئے۔ اور اُس کم علمی اور ناتجربہ کاری کے زمانے میں ایسا ہونا عجب نہیں تاہم ان سب کا مقصدِ واحد یہی تھا کہ ہر طرح پر قوم کو عروج اور عظمت حاصل ہو۔ اور وسیع حد تک اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔ ملکہ الیزبتھ کے قوانین نے سولھویں صدی کو تاریخِ انگلستان میں نمودار اور درخشاں بنادیا۔ اور اُن کے اثر قومی زندگی میں اس قدر

گھر بیٹھے کہ بعد کی تاریخ میں بہت کچھ اُن کی تفصیل نظر آتی ہے منجملہ گوناگوں معاشی قوانین کے جن کا زراعت، صنعت و حرفت۔ تجارت اور کاروبار سے قریبی تعلق تھا۔ چند خاص طور پر اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ مثلاً قانونِ کارآموزی۔ قانونِ اجارہ داری اور قانونِ مفلسی۔

قانونِ کارآموزی

(۹) یوں تو اڈورڈ سوم کے زمانے سے متعدد قوانین جاری تھے جن میں آجر اور مزدور، کام اور اُجرت۔ دستکاری اور کارآموزی وغیرہ کے قواعد منضبط تھے۔ لیکن یہ قوانین ناکامل اور بے ترتیب تھے۔ ملکہ الیزبتھ نے حالاتِ زمانۂ مذکورہ کے لحاظ سے ان سب کے بجائے ایک مکمل اور جامع قانون نافذ کیا جو قانونِ کارآموزی کہلایا۔ اس امر پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ کوئی صنعت و دستکاری اپنے طور پر شروع کرنے سے قبل کسی آجر کے پاس سات سال تک کام سیکھنا لازم ہوگا۔ اس کا منشا صنعت و حرفت کو باقاعدہ ترقی دینا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں کام کاج، مزدوری اور اجرت وغیرہ کے متعلق اور بھی بہت سے قواعد منضبط تھے جن کے بعد آجر اور مزدور میں معاہدے اور مسابقت کی بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی۔ ترقیٔ کاروبار کے ساتھ ساتھ بندشیں ٹوٹ کر آزادی پھیلتی گئی۔ حتّٰی کہ سنہ ۱۸۲۵ء میں جبکہ کارخانے جاری ہو رہے تھے یہ قانون بالکل ہی منسوخ ہوگیا۔ تاہم بطورِ خود طریقِ کارآموزی بعد کو بھی قائم رہا۔ اور بعض پیشوں میں تھوڑا بہت اب بھی جاری ہے۔ لیکن اب کارآموزی کے بجائے صنعتی تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے۔

(۱۰) اجارہ داری

(۱۰) اجارے سے مُراد یہ ہے کہ کسی شخص یا خاص جماعت کو کسی صنعت و حرفت یا تجارت کا نرالا حق مل جائے اور دوسرے لوگ اُس میں شرکت نہ کرسکیں۔ یوں تو ٹیوڈر بادشاہوں کے عہد سے پہلے بھی بذریعۂ قانون اجارے عطا کرنے کا رواج تھا لیکن ان کے دور میں اجارے کا طریق بہت پھیلا اور ملکہ الیزبتھ نے تو اسے انتہائی حد کو پہنچا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صورتوں میں اجارے ہر طرح پر بجا اور درست ہوتے تھے مثلاً ملکہ نے سنہ ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان سے بلاشرکت غیرے تجارت

کرنے کا منشور عطا کیا۔ اگر اجارہ نہ ملتا تو کمپنی ایک دور دراز ملک سے تجارت شروع کرنے کی شاید ہی جرأت کرتی۔ اور اوّل اوّل اس منصوبے پر ہرگز اس طرح بیدریغ روپیہ صرف نہ کر سکتی۔ ایسے بیش خرچ اجاروں پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن نوبت بایں جا رسید کہ معمولی سامان کی تیاری اور تجارت کے بھی اجارے ملنے لگے مثلاً الیزبتھ کے زمانے میں نمک۔ لوہا۔ سیسہ۔ شورہ۔ گندک۔ بوتل۔ گلاس۔ چمڑہ۔ کاغذ۔ تیل اور سرکہ۔ ایسی معمولی چیزوں کے بھی لوگوں نے اجارے حاصل کر لئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ملکہ نے اپنی داد و دہش کی یہی سبیل نکال لی تھی کہ جس کی امداد مقصود ہوئی اس کو کوئی اجارہ عطا کر دیا۔ چونکہ اس سے کاروبار میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ لوگوں میں شکایت اور ناراضی پھیلی۔ ملکہ نے رعایا کا یہ رنگ دیکھ کر یہ طریق ترک ہی نہیں کیا بلکہ خود ہی بہت سے نامناسب اجارے توڑ دیئے۔ ملک بہت خوش اور ممنون ہوا۔ خاص خاص حالتوں میں بعد کو بھی اجارے قائم رہے۔ لیکن بتدریج ان میں تخفیف ہوتی گئی۔ اب صرف بشکل حقِ ایجاد یا حقِ تصنیف قانوناً میعادی اجارہ مل سکتا ہے۔ ورنہ کاروباری آزادی کا دور ہے۔ اگر عملاً اجارہ میسر آبھی جاتا ہے تو اس کے بیشتر اسباب معاشی ہوتے ہیں نہ کہ سرکاری رعایت وغیرہ ؛

قانونِ مفلسی

(۱۱) بہت غور و خوض کے بعد یہ قرار پایا کہ اپاہج۔ بیکاروں اور مفلسوں کو امداد پہنچانے کا باقاعدہ انتظام ہونا ضرور ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۶۰۱ء میں قانونِ مفلسی پاس ہوا۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے محتاج خانے قائم ہوئے۔ خوشحال لوگوں سے خاص ٹیکس وصول ہو ہو کر غربا کی امداد میں صرف ہونے لگا۔ بعد کو اس قانون کے عملدرآمد میں طرح طرح کی بدنظمیاں نمودار ہوئیں اور ملک میں اس کے برے نتائج پھیلے۔ لوگ بلا ضرورت بھی امداد کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ اور کاہلی کو ترقی ہوئی کماؤ اور کارگزار لوگوں کو نکمّوں اور کاہلوں کی خاطر سے ٹیکس کا زیر بار ہونا پڑتا تھا۔ اوّل سنہ ۱۸۳۴ء میں اس قانون کو ترمیم کر کے مروجہ خرابیاں رفع کرنے کی کوشش کی گئی بعد کو مزید ترمیمات ہوتی رہیں۔ اب بھی ملک میں غربا کے واسطے بہت سے خیراتی شفاخانے مدارس اور محتاج خانے موجود ہیں۔

حصہ اوّل
باب دوم

اس سلسلے میں دو قانون اور قابلِ ملاحظہ ہیں۔ قانونِ غلّہ اور قانونِ جہاز رانی انگلستان کی معاشی تاریخ میں اِن کے بھی نہایت عمیق اور وسیع اثر نظر آتے ہیں ۔

قانونِ غلّہ

(۱۳) متعدد قوانینِ غلّہ وقتاً فوقتاً پاس ہوتے رہے۔ ان سب کا منشا یہ تھا کہ مُلک میں زراعت کو ترقّی ہو۔ اور ضمناً کاشتکار و زمیندار کو بھی فائدہ پہنچے۔ سب سے اوّل اڈورڈ چہارم کے عہد میں یہ قانون پاس ہوا کہ بیرونی غلّے کی درآمد پر بہت زیادہ محصول لگانا چاہیئے تاکہ مُلک کی زراعت کو بیرونی غلّے کی ارزانی سے نقصان نہ پہنچے۔ ولیم اور میری کے عہد میں زراعت کو مزید ترقّی دینے کی غرض سے یہ قانون نافذ ہوا کہ غلّے کی برآمد پر سرکاری امداد ملنی چاہیئے تاکہ انگلستان کا غلّہ دوسرے مُلکوں میں جاکر ارزاں فروخت ہو اور زراعت ترقّی کرے۔ حاصلِ کلام یہ کہ ایک زمانے میں انگلستان کو زراعت بہت عزیز تھی۔ اور اُس کے تحفّظ اور ترقّی کے خیال سے بیرونی غلّے کی درآمد روکی جاتی تھی بلکہ اپنے مُلک سے برآمدِ غلّہ کی کوشش ہوتی تھی۔ البتّہ قحط سالی میں برآمد ممنوع تھی۔ بلکہ بحالتِ مجبوری درآمدِ غلّہ کی ہنگامی اجازت ہو جاتی تھی۔ چارلس دُوم کے زمانے میں غلّے کے محصولِ درآمد کا خاص انتظام ہوا۔ جارج سوم اور جارج چہارم کے زمانے میں بھی قانونِ غلّہ پر خاص توجّہ رہی۔ لیکن ملکہ وکٹوریا کے عہد میں ۱۸۴۶ء میں قانونِ غلّہ منسوخ ہو گیا۔ اور غلّے کی درآمد پر خفیف سا محصول باقی رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ فصلیں خراب ہونے کی وجہ سے غلّہ بہت گراں ہو رہا تھا اور درآمدِ غلّہ کے بغیر چارہ نہ تھا۔ دوسرے مُلک میں صنعت و حرفت پھیل رہی تھی اور زراعت کا اتنا خیال نہ تھا۔ تیسرے مُلک میں ایک لیگ قائم ہو گئی تھی جس نے قانونِ غلّہ مُلک کے حق میں مُضر ثابت کر کے اُس کو منسوخ کرانے کا باقاعدہ بیڑا اُٹھایا تھا رچارڈ کبڈن اس لیگ کا بانی اور روحِ رواں تھا۔ اس لیگ نے تحریر و تقریر کے ذریعے سے مُلک پر اس قدر اثر ڈالا کہ تنسیخِ قانونِ غلّہ کے تعلّق سے رچارڈ کبڈن کا نام یادگارِ زمانہ بن گیا ۔

قوانینِ جہاز رانی

(۱۴) انگلستان میں قوانینِ جہاز رانی چودھویں صدی کے آخر سے اُنیسویں صدی کے وسط تک تقریباً پانسو برس جاری رہے۔ پہلا قانونِ جہاز رانی رچارڈ دوم کے

۱۳۸۱ء میں نافذ کیا۔ بعد کو اس میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوتی رہیں حتیٰ کہ حالات بدل جانے کی وجہ سے وہ اس قدر ناقابلِ عمل ہو گیا تھا کہ ملکہ وکٹوریا کے عہد ۱۸۴۹ء میں ملک کے اصرار سے منسوخ کردیا گیا۔ قوانین جہازرانی کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان میں جہاز بکثرت بنیں۔ لوگ جہازرانی سیکھیں۔ سمندر پر انگلستان کا تسلط رہے اور تجارت بھی اپنے ہی ہاتھ میں رہے۔ ازروئے قانون صرف انگریزی جہاز جن پر انگریز ملاح کام کرتے ہوں۔ انگلستان کے بندرگاہوں میں داخل ہونے اور مال لے جانے کے مجاز تھے۔ صرف خاص خاص حالتوں میں دوسرے ملک کے جہازوں کو اجازت مل سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان قوانین نے اصلی مقصد کو وسیع حد تک پورا کر دکھایا۔ انگلستان میں ان کی بدولت تجارتی جہازوں کے بیڑے تیار ہوگئے۔ مگر بین الاقوامی تجارت پھیلنے کے بعد ان قوانین کی رکاوٹیں بھی معلوم ہونے لگیں۔ دوسرے ملکوں میں شکایت پیدا ہوگئی۔ خود انگلستان کے تاجروں نے مخالفت شروع کردی۔ بالآخر قانونِ جہازرانی منسوخ ہوگیا۔

(۱۴) معاشیات میں تاریخی اعتبار سے طریقِ تجاریت کے دو مفہوم نظر آتے ہیں۔ عام طور پر تو اس سے وہ حالت مراد ہے جبکہ انگلستان میں سونے چاندی کی بہت قدر دانی جاتی تھی اور تجارتِ خارجہ میں یہ کوشش کی جاتی تھی کہ برآمد درآمد سے بڑھی رہے تاکہ زائد معاوضہ بشکل سیم وطلا وصول ہو اور ملک میں ان کی مقدار بڑھے۔ اس مقصد کے واسطے بحالتِ ضرورت برآمد پر سرکار سے امداد ملتی تھی اور درآمد پر بھاری محصول لگائے جاتے تھے تاکہ توازنِ تجارت اپنے موافق رہے اور سونا چاندی وصول ہو۔ ۱۳۸۱ء سے ۱۸۱۶ء تک ان دھاتوں کی برآمد ممنوع رہی۔ اسی سلسلے میں انگلستان کی یہ بھی کوشش رہتی تھی کہ اس کی نوآبادیوں میں پیداوارِ خام کے علاوہ مصنوعات تیار نہوں تاکہ انگلستان ان سے پیداوارِ خام لے کر اپنی مصنوعات کو وہاں رواج دے۔ حاصلِ کلام یہ کہ بالعموم تجاریت سے تجارتِ خارجہ کا یہ مسلک مراد لیتے ہیں کہ توازنِ تجارت اپنے موافق رہے۔ یعنی برآمد درآمد سے بڑھی رہے اور زائد معاوضہ بشکلِ سیم وطلا وصول ہو۔ سترھویں صدی میں انگلستان میں اس مسلک کا بہت دور دورہ تھا۔

حصّہ اول
باب دوم

اور یہ علمی طور پر ثابت کرنے کی کوشش ہوتی رہی کہ جہاں تک ہوسکے تجارتِ خارجہ کے ذریعے سے ملک میں سونے چاندی کی مقدار بڑھانا مفید بلکہ ضرور ہے۔ طریقِ تجاریت کا یہ مفہوم بہت مروّج ہے ؎

لیکن معاشی تاریخ کی جدید تحقیق سے تجاریت کا ایک اور وسیع مفہوم نظر آتا ہے۔ اس سے وہ حالت مراد لیتے ہیں کہ قومی ترقی اور اقتدار کی غرض سے حکومت معاشی معاملات مثلاً زراعت۔ صنعت و حرفت۔ تجارت اور جہازرانی وغیرہ میں امداد و اصلاح کی نیت سے دخل دیتی تھی۔ گویا طریقِ تجاریت اپنے مفہوم اور عمل میں طریقِ عدمِ مداخلت کا عکس تھا۔ اس اعتبار سے قانونِ مزدوراں۔ قانونِ کارآموزی قانونِ اجارہ داری۔ قانونِ مفلسی۔ قانونِ غلّہ اور قانونِ جہازرانی وغیرہ سب اسی طریق کے اجزا قرار پاتے ہیں۔ یہ طریق گویا آجکل کے سرکاری اشتراک کے ہم پلہ تھا۔ البتہ مقصد میں قدرے فرق تھا۔ وہ یہ کہ موجودہ اشتراک کا منشا خاص طور پر مزدوروں کی امداد اور اعانت ہے اور طریقِ تجاریت قوم اور ملک کو حریفوں سے کہیں زیادہ آزاد اور ذی اقتدار رکھنا چاہتا تھا۔ تجاریت کے نقطۂ نظر سے معاشیات بھی ریاست و حکومت کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا۔ پس تاریخی حیثیت سے تجاریت کا اصل مقصد قومی ترقی اور اقتدار تھا۔ اور اس مقصد کے واسطے وقتاً فوقتاً متعدد تدبیریں اختیار کی گئیں۔ امریکہ کی آبادی اور ہندوستان سے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد سترھویں صدی میں تجارتِ خارجہ کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ اور حالاتِ زمانۂ مذکورہ لحاظ سے اوّل یہ مسلک مفید نظر آیا کہ برآمد درآمد سے بڑھی رہے۔ [illegible] میں سونا چاندی وصول ہو۔ ترقی برآمد میں سرکاری امداد سے بھی کام لیتے تھے [illegible] درآمد کو محصول سے قابو میں رکھتے تھے۔ یہ بھی مقصود تھا اور وسیع حد تک اب [illegible] ہے کہ سامانِ خام باہر سے آئے اور مصنوعات اپنے ملک سے برآمد ہوں [illegible] بات پر امریکہ سے جھگڑا ہوا حتّٰی کہ اٹھارھویں صدی کے آخر [illegible] اور یہی شکایت ہندوستان میں سُنی جاتی ہے کہ انگلستان [illegible] ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی ہو بلکہ اُس کی خواہش [illegible] معاوضے میں اُس کی مصنوعات خریدتے رہیں [illegible]

خاص مسلک قوم کے واسطے مفید اور ضروری قرار پایا تو تجاریت میں بھی وہی مفہوم قوی ہوگیا حتّٰی کہ اسکے قدیم وسیع معنے یعنی قومی ترقی و اقتدار کی غرض سے سرکاری امداد و نگرانی نظر انداز ہو کر جدید محدود مفہوم باقی رہ گیا یعنی تجارت خارجہ کا یہ مسلک کہ توازنِ تجارت اپنے موافق رہے اور سونا چاندی درآمد ہو۔

اوپر کے بیانات سے واضح ہوا کہ انگلستان میں سرکار زندوں معاشی معاملات میں بہت عملی حصہ لیتی رہی۔ منشا یہ تھا کہ ملک اور قوم کو فائدہ پہنچے اور ترقی ہو۔ ناتجربہ کاری کی بدولت سرکاری مداخلت سے جب کبھی بیجا ہوئیں نقصان بھی پہنچے۔ مگر بحیثیت مجموعی نتائج اچھے نکلے۔ تجاریت کا طریق اپنا دستور دکھا کر سترھویں صدی کے آخر میں ختم ہو گیا۔ اور اقتضائے وقت سے اٹھارھویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہوا جس سے انگلستان میں کایا پلٹ ہو گئی۔

صنعتی انقلاب (۱۵) پندرھویں صدی تک انگلستان کی معیشت بہت ادنیٰ تھی۔ عوام کے چھوٹے چھوٹے مکانات جن میں دودکش کے بجائے سوراخوں سے دھواں نکلتا۔ شاہی عمارات کے سوا کہیں شیشہ گاہ مشکل سے نظر آتا۔ بالعموم صرف بیماروں کے سر تلے تکیہ رہتا۔ ورنہ لوگ یوں ہی پڑے رہتے۔ لباس بھی موٹا جھوٹا تھا۔ خشک پھلی عام غذا تھی۔ ٹیوڈر بادشاہوں بالخصوص ملکہ الیزبتھ کے عہد سے خاصی ترقی شروع ہوئی۔ امن و امان کی بدولت صنعت و حرفت میں جان پڑی۔ تجارت پھیلی۔ تاہم اٹھارھویں صدی کے آغاز تک موجودہ عظمت و اقتدار کا کوئی قرینہ واضح نہیں ہوا تھا۔ اوّل تو انگلستان جیسے چھوٹے ملک میں زراعت کے بل بوتے پر کسی بڑی ترقی کا ہونا محال تھا۔ دوسرے اُس وقت تک غریب کاشتکار چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کاشت کرتے تھے۔ اور فنِ زراعت سے بہت کم واقف تھے۔ رہیں صنعتیں اُن کا تمام تر دارومدار دستکاری پر تھا۔ آلات و اوزار بہت سادہ تھے۔ بالعموم دستکار اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ حسبِ قانونِ کار آموزی لوگ دستکاروں کے پاس وقتِ معینہ تک رہ کر کام سیکھتے اور بشرحِ معین اُجرت پاتے تھے۔ دستکار ہمیشہ دوسروں کے پاس اُجرت پر کام کرتے رہتے۔ مثلاً اونی کپڑا [illegible] صنعت تھی۔ ہر دستکار کے کارخانے میں عموماً چار پانچ کرگھے

حصّہ اوّل
باب دوم

لگے رہتے ۔ کتائی ۔ بنائی اور رنگائی یہ سب کام وہیں انجام پاتے ۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ دو چار کار آموز اور ایک آدھ اُجرتی دستکار اُسی کے گھر میں رہتا سہتا اور کھاتا پیتا تھا ۔ بہت مروّت اور محبت میں بسر ہوتی ۔ مدّتوں علیحدگی کی نوبت نہ آتی ۔ علاوہ بریں قانونِ مفلسی بھی مزدوروں اور دستکاروں کی نقل وحرکت میں مُزاحمت کرتا تھا ۔ بازار بہت محدود تھے اور فیشن بھی بہت کم بدلتا تھا ۔ مدّتوں ایک ہی چیز قُرب وجوار کے واسطے بنتی رہتی ۔ سڑکوں کی حالت خراب ہونے سے دُور دراز کی تجارت بہت دُشوار تھی ۔ اُون کے کپڑے کے علاوہ آہنگری اور کوئی دو خاص پیشے تھے ۔ مگر ان میں ترقی کی بہت کم گنجائش نظر آتی تھی ۔ آدم اسمتھ کے زمانے تک سوتی کپڑے کا بہت کم رواج تھا ۔ بنک انگلستان کی ابتدا تھی ۔ اور تجارتِ خارجہ میں قانونی بندشوں سے بہت رُکاوٹ ہوتی تھی ۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ فرانس اور انگلستان میں لڑائی ٹھنی ہوئی تھی کہ امریکہ اور ہندوستان پر کس کا اقتدار اور تسلّط رہے ۔ فرانس کا رقبہ اور آبادی انگلستان سے زیادہ ہے ۔ ایسی حالت میں اٹھارھویں صدی کے وسط تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ عنقریب کیونکر انگلستان کا ستارہ چمکیگا اور اُس کی تجارت وحکومت دُور دُور پھیل جائیگی ۔

ایجادات

(۱۶) ملکہ الیزبتھ کے عہد میں اوّل اوّل بیکن صاحب نے اپنے فلسفے میں اس پر زور دیا کہ تحقیقات میں طریقِ استقرائی سے کام لینا چاہئے ۔ اور خاص مادّی چیزوں کا ملاحظہ بہت مُفید اور ضروری ہے ۔ اس تعلیم نے مادّی تحقیقات کا خاص شوق پیدا کر دیا جس کی بدولت عجب عجب ایجادات ظہور میں آنے شروع ہوئے ۔ اب تک سلسلہ جاری ہے ۔ بلحاظِ اہمیت قدیم ایجادات میں جیمس واٹ کے دُخانی انجن کا نمبر سب سے اوّل ہے جس کی بدولت دستکاری کی جگہ کلوں سے کام لینے کا رواج پھیلا ۔ یعنی ہاتھوں کے عوض لوگ کلوں سے کام لینے لگے ۔ انجن اور کلوں کے بغیر کس طرح ممکن تھا کہ انگلستان اپنے خدا داد لوہے اور کوئلے سے اس قدر عظیم الشان کام لیتا اور اُس کی صنعت وحرفت اور حکومت [illegible] میں پہلا انجن تیار ہوا جس سے پانی کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا ۔ [illegible] کارخانے میں انجن نے کام شروع کیا ۔ اسی دوران میں لوہا [illegible]

نئے نئے سہل اور سستے طریق نکلے دو شخص کورٹ اور روبک نامی نے اس میں خاص جدت دکھائی۔ ترقی ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچی کہ متعدد اقسام کی کلیں ایجاد ہوئیں جو انجنوں سے چلتی ہیں۔ لوہا اور کوئلہ بکثرت کام آنے لگا اور دولت کے سرچشمے نئے نکلے۔

دخانی انجن ایجاد ہو جانے کے بعد کلوں کا ایجاد ہونا ضرور تھا جن کے چلانے میں انجن کام دیں۔ ۱۷۵۰ء تک سوت کی کتائی اور کپڑے کی بنائی۔ یہ دونوں کام دستکاری میں داخل تھے۔ اس کے بعد کلیں ایجاد ہونی شروع ہوئیں حتّٰی کہ اٹھارھویں صدی کے ختم پر کتائی اور بنائی میں بجائے ہاتھ پیر کے جابجا انجنوں سے کام ہونے لگا جو بھاپ یا پانی کے زور سے کلوں کو چلاتے تھے۔ ہار گریوز، کرامپٹن اور آرک رائٹ ان تین شخصوں نے ابتدا میں کتائی کی کلوں میں بہت جدت دکھائی۔ ان میں سے پہلے دو معمولی جولاہے تھے اور آخری شخص ایک غریب حجام تھا۔ خدا کی قدرت۔ ابتدا میں ان کی ایجادوں سے کتائی کے فن کو اس قدر ترقی ہوئی کہ آج تک ان کے نام تاریخ میں دہرائے جاتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی ایک پادری صاحب کارٹ رائٹ نامی نے ۱۷۸۵ء میں کپڑا بننے کی کل ایجاد کی جس کا صدی کے آخر میں استعمال شروع ہو گیا۔ ان ایجادات نے اس قدر رواج پایا کہ تھوڑی ہی مدت میں دستی کرگھے بند ہو گئے۔ اور جولاہوں پر بیکاری کی سخت مصیبت آئی۔ لیکن اس کے بعد اور اور طرح پر بخوبی تلافی ہو گئی۔

انیسویں صدی کے شروع سے طرح طرح کے ایجادات نمودار ہوئے مثلاً چھاپے خانوں میں انجن اور کلوں سے کام ہونے لگا۔ چنانچہ سب سے اول ٹائمز اخبار ۱۸۱۴ء میں اس طرح پر چھپنا شروع ہوا۔ گیس کی روشنی نکلی اور شہروں میں پھیلنے لگی۔ برتن بنانے اور کپڑا دھونے میں بھی ایجادات سے ترقی ہوئی۔ ڈیوی کا مشہور سیفٹی لیمپ بھی اُسی زمانے میں ایجاد ہوا جس سے کان کنی میں بڑی مدد ملی۔ المختصر ہر طرف ایجادات کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن ان سب میں وہ ایجادات بہت اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ جن سے آمدورفت، نقل و حمل اور خبر رسانی میں سرعت اور سہولت پیدا ہو گئی۔

پہلے ... دخانی کشتیاں تیار ہوئیں۔ ترقی ہوتے ہوتے ...

شہ اول
ب دوم

دخانی جہاز نے بحرِ اٹلانٹک کو عبور کیا۔ ۱۸۱۴ء میں اسٹیفنسن نے جو کبھی ایک غریب مزدور تھا۔ اپنا مشہور ریلوے انجن ایجاد کیا جس نے بڑے سفر کی مشکل آسان کر دی۔ سب سے اوّل ۱۸۳۰ء میں لورپول اور مانچسٹر کے درمیان باقاعدہ ریل جاری ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں برقی تار پر خبر رسانی شروع ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں ڈاک کے ٹکٹ نکلے۔ اس سے قبل تمام خطوط بیرنگ یعنی محصول طلب جاتے تھے۔ مرسل الیہ خواہ محصول دے کر خط قبول کر لیتا خواہ واپس کر دیتا۔ شرح محصول بہت زیادہ تھی۔ اب یہ طریق نکلا کہ خود مرسل ڈاک کا ٹکٹ لگا کر محصول ادا کرنے لگا اور شرح میں بہت تخفیف ہو گئی۔ ۱۸۵۱ء میں کیبل یعنی بحری تار لگانا شروع ہوا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۶ء تک بحرِ اٹلانٹک میں جا پہنچا۔ صدی کے آخر میں ٹیلیفون ایجاد ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع سے بلا تکلف بے تار کی خبریں اڑنے لگیں۔ موٹر اور ٹرام کار نکل پڑے۔ برقی روشنی پھیلی اور جنگ یورپ میں ہوائی جہازوں نے وہ عروج پایا کہ عجب نہیں عنقریب ریل اور جہازوں کو نیچا دکھا دیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ ایک طرف تو کلوں کے رواج سے صنعت و حرفت میں کایا پلٹ شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے جہاں بکثرت سامان اچھا اور سستا تیار ہونے لگا۔ کوئلے اور لوہے کی افراط نے کلوں میں اور بھی روح پھونک دی۔ دوسری طرف ذرائع آمد و رفت۔ نقل و حمل اور خبر رسانی میں اس قدر وسعت و سرعت پیدا ہوئی کہ گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ دور دراز ملکوں کا سفر کرنا۔ مال لانا لے جانا اور خیر خبر رکھنا ایک سہل بات ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ دوسرے ممالک مثلاً ہندوستان۔ آفریقہ۔ امریکہ۔ آسٹریلیا اور مصر میں انگریزوں کے قدم جمتے گئے۔ ان ملکوں سے سامانِ خام لانا اور وہاں اپنی مصنوعات پہنچانا انگلستان نے اپنا مسلک قرار دیا۔ نتیجہ جو کچھ ہوا اظہر من الشمس ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انگلستان صنعت و حرفت اور حکومت کا مرکز بن گیا اور اس قدر دولت پیدا کی کہ ملک نہال اور مالا مال ہو گیا۔

ق عدم مداخلت یا
روبا سی آزادی

(۱۷) جوں جوں ایجادات سے صنعت و حرفت اور تجارت کو ترقی ہوئی قدیم قوانین جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ سدِّ راہ محسوس ہوئے وہ سکون کے مقتضی تھے

اور یہاں کاروبار میں تموّج شروع ہو رہا تھا۔ انوکھی چیزیں چلیں اور نت نئے طریق نکلے۔ اوّل قوانین مزاحم ہوئے لیکن بالآخر سیلابِ ترقی اُن کو بہا لے گیا اور کچھ عرصے کیواسطے کاروباری میدان بالکل صاف ہو گیا۔ سرکار نے مداخلت کیا نگرانی بھی ترک کر دی۔ اوّل آدم اسمتھ نے اپنی مشہور تصنیف دولتِ اقوام میں جو کہ ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی سرکاری مداخلت کی علمی پیرائے میں سخت مخالفت کی۔ اقتضائے وقت بھی اس رائے کا مؤید ہو گیا۔ جنگِ نپولین میں تمام یورپ کی بری گت بنی تھی۔ البتہ انگلستان اُس کی دستبرد سے محفوظ رہا۔ اسی دوران میں یہاں ایجادات کو ترقی ہوئی۔ ہندوستان اور امریکہ سے انگلستان کی تجارت برقرار رہی۔ ختمِ جنگ پر دیکھا تو یورپ میں صنعت و حرفت تجارت اور جہازرانی سب انگلستان کے ہاتھ میں تھی۔ ساتھ ہی اس زمانے میں قحط نمودار ہوئے اور ابتدا میں کلوں کے رواج نے بہت سے مزدور اور صنّاعوں کو بیکار کر دیا جس کی وجہ سے عام بے چینی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم قوانین کی ترمیم اور تنسیخ کی ضرورت بشدّت محسوس ہونے لگی۔ بالآخر ۱۸۱۱ء سے پارلیمنٹ نے بتدریج یہ کام شروع کیا اور ۱۸۶۰ء تک تقریباً وہ تمام قوانین منسوخ یا ترمیم ہو گئے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ملک کو پوری آزادی مل گئی۔ مگر تھوڑے ہی تجربے کے بعد پھر سرکاری مداخلت اور نگرانی کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ قانونِ کارخانجات۔ قانونِ بنک وغیرہ نمودار ہوئے لیکن نئے قوانین کا منشا اور مسلک بالکل علیحدہ ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

کارخانہ

(۱۸) جب تک صنعت و حرفت میں دستکاری کا دور رہا۔ صنّاع اپنے اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ خود سامانِ خام خریدتے۔ خود ضروری آلات و اوزار رکھتے۔ اپنے ہی مکان یا قریب کی دکان پر بیٹھ کر کام کرتے۔ اُن کے ہاں کچھ کارآموز اور صنّاع بھی رہتے جو ہاتھ بٹاتے۔ یہ بھی ان ہی کے فرقے میں شمار ہوتے تھے۔ مال اکثر قرب و جوار کے خریداروں کی فرمائش پر تیار ہوتا تھا۔ پارچہ بافی میں یہ بھی طریق تھا کہ سامانِ خام دے کر بشرحِ معیّن کپڑا تیار کرا لیا۔ اس صورت میں پارچہ بافوں کو خریداروں کی بھی فکر نہیں رہتی تھی۔ ساتھ ساتھ کئی پیشے چلاتے تھے مثلاً کاشتکاروں کی بہو بیٹیاں فرصت کے وقت سوت کات لیتیں۔ جولاہے موقع پا کر گھر کے

حصّہ اوّل
باب دوم

خرچ کے لائق غلّہ ترکاری بو لیتے۔ غرضکہ سہل اور سادہ طرز پر کاروبار چلتا تھا۔

انجن اور کلوں کے رواج نے صنعت و حرفت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ خود صنّاع اور کاریگروں کے پاس اتنی گنجائش کہاں جو بیش قیمت انجن اور کلیں خریدیں۔ اُن کے واسطے بڑے بڑے کارخانے بنائیں۔ یا مزدور رکھیں۔ اور بڑے پیمانے پر کاروبار چلائیں نتیجہ یہ نکلا کہ دولتمندوں میں آجروں کا ایک طبقہ نمودار ہوا جنھوں نے اپنا اصل لگا لگا کر کارخانے قائم کر دیئے اور صنّاع و کاریگر مقابلے کی تاب نہ لاکر ان کے کارخانوں میں اُجرت پر کام کرنے لگے۔ یہیں سے آجر اور مزدوروں کی تفریق شروع ہوئی جو آج اس قدر نمایاں اور اہم نظر آتی ہے۔ کلوں کے رواج سے اوّل اوّل صنّاعوں پر بہت مصیبت پڑی۔ ان کی دستکاری کی قدر اُٹھ گئی۔ معمولی مزدور کارخانوں میں کلوں کے ذریعے سے کہیں بہتر مصنوعات تیّار کرنے لگے۔ کلوں نے صنّاعوں کی مہارت اور ہنرمندی بیکار کر دی۔ کارخانوں میں معمولی مزدور بلکہ عورتیں اور بچّے کام کرتے اور وہ سامان تیّار ہوتا کہ اچھّے اچھّے صنّاع کان پکڑتے۔ بے ہنر اور غریب مزدوروں کا تو بھلا ہوا مگر شروع میں قدیم ہنرمند دستکاروں کو بہت مصیبت اُٹھانی پڑی البتّہ بعدہٗ کارخانوں کی ترقی سے انہیں بھی مُناسبِ حال کام ملنے لگا اور نقصان کی تلافی ہو گئی۔ کلوں کے رواج سے صنعت و حرفت کے مرکز بھی بدل گئے۔ قدیم زمانے سے انگلستان کے شرقی و جنوبی اضلاع صنّاع اور دستکاروں کا وطن تھا۔ لیکن لوہے اور کوئلے کی یہاں قلّت تھی اور ان کے برعکس غربی و شمالی اضلاع میں اِفراط نکلی نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر کارخانے اُسی طرف قائم ہوئے اور صنعت و حرفت اُدھر سے ڈھل کے اِدھر آگئی۔ قدیم مرکز ایسے ویران ہوئے کہ بعض ابتک پورے طور پر نہیں پنپے۔

اوّل تو کارخانے قائم ہونے سے محنت مزدوری کا طریق بالکل بدل گیا۔ آجر اور مزدوروں کے دو جداگانہ فرقے بن گئے۔ اصل محنت سے الگ ہو چلا۔ قدیم دستکاروں کی ہنرمندی کا امتیاز مٹ گیا کارخانوں میں صدہا غریب مرد۔ عورت اور بچّے مزدوری کرنے لگے۔ صنعت و حرفت کارخانوں کے قبضے میں آگئی۔ اور کارخانوں نے اپنے واسطے نئے نئے مرکز قرار دیئے۔ اس انقلاب سے صنّاع

باب دوم

اور مزدور عجب حیرانی اور پریشانی میں پڑ گئے ۔ قدیم سکون و اطمینان بالکل غائب ہوگیا۔ کسی حالت کو قرار نہ تھا۔ سیلاب ترقی نے سب فرقوں کو تہ و بالا کر دیا اور آج تک اس کا تموج جاری ہے ۔ اس کی تفصیل کے واسطے جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہوگی ۔

المختصر یہ کہ ترقی کی اُمنگ میں رسم و رواج اور قدیم قوانین کو توڑ پھوڑ کے لوگ دولت کمانے پر پل پڑے ۔ ہر شخص منفعت طلبی کا مجسمہ بن گیا۔ ہر طرف نفسی نفسی اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوا۔ تمام مُلک اس صدا سے گونج اٹھا۔ نئے آجر روزافزوں ترقی میں سرگرداں تھے ۔ قدیم دستکار اور صناع بیکاری سے پریشان تھے اور غریب مزدور کارخانوں میں حیران ۔ صدہا مرد ۔ عورت ۔ لوڑھے بچے بلا مبالغہ بھیڑ بکریوں کی طرح کارخانوں میں بھرے رہتے اور سب طرح کا کام وقت ناوقت کرتے ۔ متواتر قحطوں نے غربا کو اور بھی لاچار کر دیا۔ آجروں کی بن آئی ۔ خوب کام لینا اور حسب مرضی اُجرت دینا۔ اس ابتری سے تھوڑے ہی عرصے میں صحت ، اخلاق اور معاشرت کو اس قدر نقصان پہنچا کہ شور برپا ہوگیا اور بالآخر سرکار کو قانونِ کارخانجات نافذ کرنا پڑا تاکہ کارخانہ دار مزدوروں پر جبر و دستی نہ کرسکیں اور صحت و اخلاق محفوظ رہے ساتھ ہی مزدوروں کے حواس دُرست ہوئے تو اُنھوں نے بھی اتحادی انجمنوں کی بنا ڈالی تاکہ وہ متحد ہوکر آجر کے مُقابل اپنے حقوق کی حفاظت کرسکیں اور آج ان انجمنوں کو وہ اقتدار حاصل ہے کہ آجر بلکہ مُلک بھی ان کا رعب مانتا ہے ۔ صنعت اور کاروبار کی ترقی کے ساتھ ساتھ زر ۔ ہُنڈی ۔ بنک ۔ محدود کمپنی اور اس کے حصص و تمسکات ۔ کروڑگیری یعنی محصول درآمد و برآمد ۔ حق اختراع و ایجاد اور گوناگوں معاشی اُمور کے متعلق وقتاً فوقتاً قوانین پاس ہوئے ۔ حتّٰی کہ اب ان کا ایک جداگانہ وسیع نظام نظر آتا ہے ۔

خلاصہ

(۱۹) اٹھارھویں صدی کے وسط تک تو انگلستان کا مستقبل کچھ اُمید افزا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے بعد حالات نے ایسی مُساعدت کی کہ صدی ختم ہونے تک کایا پلٹ ہوگئی ۔ اوّل تو جنگ نپولین کے دوران ہی میں انگلستان کی صنعت و حرفت بڑھ چلی ۔ دوسرے نپولین کی شکست کے بعد ۱۸۱۵ء سے لے کر ۱۸۵۵ء تک چالیس سال انگلستان کو اپنی مُلکی اور قومی ترقی کا خوب موقع ملا۔

کوئی جنگ خلل انداز نہ ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دوسرے ممالکِ یورپ تو نپولین کی دستبرد سے ہیجان پڑے ہوئے تھے۔ اور انگلستان میں نت نئی ایجادیں اور صنعتیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اور انگریزی جہازوں کا امریکہ اور ہندوستان کی تجارت پر پورا قبضہ تھا۔ اس اجمال کی سبق آموز تفصیل تواریخ میں قابلِ ملاحظہ ہے۔ المختصر انگلستان کو صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی میں یورپ کی دوسرے اقوام پر سبقت حاصل کرنے کا شروع میں خاص موقع مل گیا۔ البتہ اس کے بعد بہت سے حریف پیدا ہو گئے۔ خصوصاً جرمنی اور امریکہ کاروبار میں مدِّمقابل بن گئے۔ جدید طریقوں میں مبتدی ہونے کی وجہ سے انگلستان کو کافی تلخ تجربے ہوئے جس سے بعد کے پیرووں کو عبرت اور سہولت حاصل ہوئی۔

انگلستان کے تجربے سے ثابت ہوا کہ یکایک بڑے بڑے منصوبوں پر پیشقدمی کرنے میں ناکامی کا سخت اندیشہ رہتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو ان کی برداشت کم ہوتی ہے اور عجلت سے مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی خیالات و رجحانات کی بہت کچھ ترمیم و اصلاح ممکن ہے۔ اور اس زمانے میں تو خیالات کا تغیّر ہر طرف بسُرعتِ تمام جاری ہے۔ تاہم خیالات کے نشو و نما میں وقت لگتا ہے اور استحکامِ خیال کے بغیر کسی نظامِ تمدن کا چلنا محال ہے۔ پس ہمیشہ جدید منصوبے تجویز کرنے میں ترقیٔ خیالات کی قوت و رفتار کا ملحوظ رکھنا ضرور ہے ورنہ منصوبے بارِ خاطر بن کر مُنہ کے بل گریں تو عجب نہیں۔ نصب العین ضرور خیالات کے آگے رہے مگر نہ اس قدر آگے کہ خیالات حیران ہو کر اس کا تعاقب چھوڑ دیں۔

حصہ دوم

پیدائش دولت

باب سوم

پیدائش کا مفہوم

(۱) انسان کے کارنامے (۲) پیدائش کی اہمیت (۳) پیدائش کا مفہوم (۴) خلاصہ

انسان کے کارنامے

۱۔ انسان کے کارناموں پر تو نظر ڈالئے کہ اس نے پہاڑ کاٹے، سمندر پاٹے، ریگستان کو ... قبرستان کو ... جنگل میں منگل منائے، سمندر سے موتی رولے، زمین کے خزانے کھود ... کرۂ ارض کی طنابیں کھینچیں، وقت میں قیامت کی وسعت پیدا کی، اور آگ پانی ... عقل سے تمام دنیا کو مسخر کیا۔ چیزیں اتنی بنائیں کہ ان کا حد نہ حساب اور ہر ایک ایسی انوکھی کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے اور ابھی تجسس ہو کر ٹھہرنے کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ جس قدر اس کی استطاعت بڑھتی ہے اس کی ہوس بھی زیادہ ہوتی ہے۔ غرضکہ تمام عالمگیر تلاطم اور انقلابات ... کے باعث یہی انسان ضعیف البنیان جو جثہ، جرات، طاقت، تیز رفتاری، دور بینی اور دیگر صفات جسمانی میں حیوانوں سے کہیں دبے ہوئے اپنی بقا اور پرورش کے لئے بیرونی امداد کے سب سے زیادہ محتاج لیکن خدا نے ان کو عقل کا ایسا اسم اعظم عطا کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے دماغ ایسے زبردست آلے دیئے ہیں کہ ساری دنیا قدموں سے لگی پڑی ہے۔

پیدائش کی اہمیت

۲۔ جس انسان نے تمام عالم کو تہ و بالا کر دیا ہو اس کی قوت کا کیا ٹھکانا ہوگا اور کون چیز پیدا کرنے پر وہ قادر نہ ہوگا لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے۔ اگر سچ پوچھو تو اس کو پیدائش میں برائے نام بھی دخل نہیں۔ وہ نہ ایک ذرہ پیدا کر سکتا ہے نہ ناپید۔ بلکہ انسان کی تمام کارگزاریوں کا لب لباب یہ ہے کہ ... موجودہ چیزوں کا صرف مقام بدل دیتا ہے۔ مثلاً موتی اور معدنیات نکالنا، یا موجودہ

حصّۂ دوم
باب سوم

اشیا کے اجزا کو نئی ترکیب دیدیتا ہے مثلاً لکڑی، لوہا، بید اور وارنش سے کرسی بنانا۔ اور یا عاملینِ قدرت کی وساطت کُلّی سے صورت بھی بدل دیتا ہے۔ مثلاً زراعت۔ کسان کا کام صرف اتنا ہے کہ بوقتِ مُعیّن اور بطریقِ مخصوص زمین، کھاد، تخم اور پانی ایکجا کر دے۔ پودے اُگانا، پھول کھِلانا، پھل لگانا اور اُن کو پکانا۔ یہ سب کام عاملینِ قدرت مثل گرمی، سردی، ہوا اور روشنی کے متعلق ہیں۔ غریب کسان کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ وہ تو کھیتی بو کر بزبانِ حال قدرت سے کہہ دیتا ہے مصرع سپردم بتو مایۂ خویش را۔ کبھی ابرِ رحمت اور موافقتِ موسم کی دعائیں مانگتا ہے۔ کبھی آفاتِ سماوی سے پناہ چاہتا ہے۔ اکثر کھیت سے گونیں بھر بھر غلّہ اُٹھاتا ہے اور کبھی ساری لاگت خاک میں مِلا کر دستِ حسرت ملتا رہجاتا ہے۔ عمل پیدائش میں کسان کی بے بسی بھی کس قدر قابل رحم اور عبرت آموز ہے۔ حالانکہ پیدائش کا سب سے اہم حصّہ اسی کے متعلق ہے۔ اور یہ جو ایک دانہ غلّے سے بہت سے دانے نکلتے ہیں اور چھوٹے سے تخم سے تناور۔ دیرپا اور بارآور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ مانا ہم نے کہ عاملینِ قدرت اُن کو ظہور میں لاتے ہیں لیکن کیا وہ اُن کو نیست سے ہست کرتے ہیں؟ اُن کی تخلیق پر قادر ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حسبِ قوانینِ قدرت صرف مادّے کی صورت بدل کر نمودار کر دیتے ہیں اور یہ پھل پھول سے لدے پھندے پودے اور درخت کیا ہیں۔ مادّے کے بیشمار اجزا عاملینِ قدرت کی مدد سے بطریقِ نامعلوم ہزار بار رنگ روپ بدل کر بردہ زمین سے نکلتے ہیں گویا آسمان سے اُترے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ پیدائش سے مُراد تخلیق نہیں بلکہ چند خاص قسم کی تبدیلیاں ہیں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔

پیدائش کا منشا

۳۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیدائش کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کا جواب ہے افادہ حاصل کرنا یا بڑھانا۔ مقدمے میں بیان ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں کم و بیش افادہ ضرور موجود ہے لیکن ہم یا تو اس سے سراسر بےخبر ہیں۔ یا باوجود واقفیت بوجہ عدم دسترس اس سے مستفید نہیں ہو سکتے یا اگر ہوں بھی تو کمتر۔ ہر ایک چیز سے پورا پورا افادہ حاصل کرنا اور موجودہ محرومی کے اسباب رفع کرنا پیدائش کی اصلی غرض اور منشا ہے۔ صرف چند سال سے ہم نے گلی کوچوں کی خاک سے المونیم کے برتن بنانے سیکھے ہیں۔ موتیوں اور قیمتی دھاتوں کی قدر و قیمت سے تو واقف تھے مگر سمندر اور کانوں کی تہ سے ان کا نکالنا بیحد مشکل تھا۔ جو تن آج ریشم کو بھی ماند کر رہا ہے۔ مدتوں ہم اُس سے صرف رسی ڈور بٹا کیے۔ اور ظاہر ہے

کہ افادہ پہلے ہی سے ہر چیز کی ذات میں مضمر ہوتا ہے کچھ پیدائش اُس کو عدم سے وجود میں نہیں لاتی۔ البتہ انسان کا قابو اور دسترس افادے پر ضرور بڑھا دیتی ہے اور بس۔

۴۔ بالفاظِ عقد پیدائشِ دولت کی چند صورتیں ہیں نقلِ مقام۔ تبدیلِ ترکیب۔ تغیرِ صورت۔ یا ان افعال میں سے کسی دو یا تینوں کا اجماع۔ پیدائش کا منشا افادہ بڑھانا یا نکالنا ہے جو کہ پہلے سے چیزوں میں مستتر ہوتا ہے۔

باب چہارم

عاملینِ پیدائش

(۱) زمین (۲) محنت (۳) اصل (۴) اصل کی سرگزشت (۵) اصل کی کارگزاری (۶) خلاصہ۔

زمین ۱۔ پیدائش کا مفہوم تو بیان ہو چکا۔ اب دیکھیں کہ کون خاص خاص وسائل پیدائش کے واسطے لابدی ہیں۔ کن عاملین کی کارگزاری پر پیدائش کا دارومدار ہے اور ان میں ہر ایک اپنے اپنے طور پر کہاں تک اس کام میں حصہ لے رہا ہے۔ سب سے اوّل تو زمین ہے کہ وہ ہر چیز کا مبدع اور منبع ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو خلقت کہاں رہے اور نباتات وجمادات کہاں سے آئیں۔ غرضکہ اگر زمین نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو دنیا اسی کے وجود سے وابستہ ہے۔ پس عاملینِ پیدائش میں سے یہ کس کو سبقت حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ صرف لابد اور ناگزیر ہے بلکہ جتنی ضروریاتِ زندگی ہیں شائد ہی کوئی ایسی ہو کہ اُس کی پیدائش میں زمین مدد نہ دیتی ہو۔ ہماری خوراک، ہمارا لباس، ہمارے مکانات اور موجودہ زمانے کے لاتعداد تنعمات، اگر اُن کی اصلیت پر غور کرو اور ان کی ابتدا کا سُراغ لگاؤ تو وہ یقیناً زمین ہی پر ختم ہوتا ہے۔

محنت ۲۔ زمین مواد ضرور مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن اُس کو دولت بنانا انسان کا کام ہے۔ زمین کی پیداوار بغیر انسان کی محنت کے دولت نہیں بن سکتی جیسا کہ مقدمے میں واضح

حصّہ دوم
باب چہارم

کیا جا چکا ہے۔ کہ اگر سونے کے پہاڑ اور جواہرات کے انبار ہوں۔ لیکن انسان کے ہاتھ نہ آسکیں تو یقیناً مٹی اور کنکر سے بھی زیادہ نکمّے ہیں۔ کوئی ان کو دولت نہیں شمار کر سکتا۔ ورنہ یہ بے شمار جگمگاتے ستارے جن میں خدا جانے کیسے کیسے عجائبات بھرے پڑے ہیں سب ہی ہماری دولت ہیں۔ اور شاید ہی کوئی چیز احاطہ دولت سے خارج ہو سکے۔ لیکن اس بات سے کوئی بھی ایک لمحے کے واسطے متفق نہیں ہو سکتا۔ دولت کیواسطے افادہ اور مبادلہ پذیری لازمی ہے۔ اور مقدّمے کی مفصّل بحث سے ظاہر ہوگا کہ ان کے واسطے انسانی دسترس لابُدی ہے جو چیز انسان کے کام نہ آسکے اُس سے افادے کے کیا معنی اور جو انسان کی دسترس سے باہر ہو اُس میں مبادلہ پذیری کیونکر ممکن ہے۔ وہی خودرو جنگل جن میں وحشی قومیں نہایت قابلِ رحم افلاس کی زندگی بسر کرتی ہیں جب مہذب قوموں کے ہاتھ آجاتے ہیں تو محنت کے ذریعے سے اتنی پیداوار اُگلتے ہیں کہ دُنیا مالامال ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بحیثیتِ دولت، وہ جنگل دونوں حالت میں یکساں ہے۔ اگر فرق ہے اور یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے، تو اس کا باعث کیا ہے، یہی محنت۔ ورنہ وہی جنگل، اُسی کی پیداوار۔ نہ جنگل بدلا، نہ پیداوار۔ آسمان سے برسی البتہ جب سے محنت کا دخل ہوا۔ اُس جنگل کو کچھ ایسا پارس پتھر چھو گیا کہ سونا ہی سونا ہو گیا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ دولت کی پیدائش کے واسطے زمین اور محنت دونوں لابُدی ہیں۔ اور یہ طے کرنا کہ ان میں سے کون زیادہ ضروری ہے اور کون کم۔ بعینہ ایسا سوال ہے کہ اولاد کی پیدائش میں زیادہ حصّہ کس کا ہوتا ہے ماں کا یا باپ کا۔ بھاپ زیادہ تر پانی سے پیدا ہوتی ہے یا آگ سے۔ قینچی کا اوپر والا پھل کپڑا کترتا ہے یا نیچے والا۔ اور ان سوالات کا صحیح جواب صرف ایک ہے کہ دونوں یکساں لابُدی اور ناگزیر ہیں۔ اور بس۔

• اصل

سم۔ ایک لطیفہ سُنیئے کہ زمین اور محنت کے عقد سے ایک بچّہ پیدا ہوا جو ایسا بلند اقبال نکلا کہ آج چار دانگ عالم میں اُس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ امیر غریب سب اس کے دستِ نگر ہیں۔ جدھر گزرتا ہے خلقت نہال ہو جاتی ہے۔ پیدائش کے میدان میں وہ کمال دکھا رہا ہے کہ والدین بھی اُس کے توسّل کے طالب نظر آتے ہیں۔ اُس کی دستگیری سے اُن میں چستی اور طاقت آتی ہے۔ اُس کے تقرب سے ان کی

بہت کچھ قدر و پرستش کی جاتی ہے۔ اگر ساتھ چھوٹ جاوے تو کس میرسی میں والدین کو
ہاتھ پیر ہلاتا بھی دیکھ ہوتا ہے۔ محض شعبہ ہائے پڑھانے کی غرض سے [illegible] میں تمام
[illegible] صاحب موصوف دراصل حضرت اصلی ہیں۔ دور [illegible] مغربی قوموں
نے [illegible] کر کے ان کو اپنی طرف اس قدر مائل کر لیا ہے کہ اب وہ
زیادہ تر ان ہی کے پاس مقیم رہتے ہیں اور اپنے کمالات سے ان کو فیض پہنچا پہنچا کر
[illegible] سے بہت با معزز و ممتاز بنا رہے ہیں۔ صاحب موصوف کی ولادت
اور [illegible] کا تھوڑا سا حال بیان کر کے ہم ان کی کارگذاریوں کی ضروری تشریح کریں گے۔

اصل کی سرگذشت

[illegible] زمانہ میں انسان خود رو درختوں کے پھلوں سے اپنا پیٹ پالتا
اور پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتا ہوگا۔ زمین اور محنت کے میل کا یہ سب سے پہلا موقع
ہوگا۔ اول اول وہ صرف ہاتھ سے کام لیتا ہوگا۔ بلند درختوں کے پھل اور پتے توڑنے
میں دقت پیش آتی ہوگی۔ بالآخر فرصت کے وقت فراغت سے بیٹھ کر تدبیر سوچتے سوچتے
اس نے کسی سیدھی لمبی اور پتلی لکڑی کے سرے پر چھوٹی سی بالشت بھر لکڑی گھاس
سے ترچھی باندھ کر لگی بنالی ہوگی کہ جس درخت سے چاہے پھل گرا لے۔ یہی لگی غالباً
اصل کی ابتدا ہوگی۔ جب پھل توڑنے میں آسانی ہوگئی تو اس کے پاس فرصت کا
وقت زیادہ نکل آیا اور اس نے جال، تیر، کمان اور سخت پتھروں کے تیز دھار کے
آلے بنا کر چھوٹے موٹے چرند و پرند کا شکار شروع کردیا۔ ان ایجادات کا بھی اصل
میں اضافہ ہوا۔ اب روز غذا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔ ایک دن شکار
اور پھل جمع کر کے کئی دن کام چلاتا ہوگا۔ فرصت کے دنوں میں لاکھ تدبیریں کر کے
اس نے رفتہ رفتہ چند تربیت پذیر وحشی جانوروں مثلاً گائے، بھینس، گھوڑے، بکری
کو پکڑ پکڑ کر پالو بنایا ہوگا۔ ان کا دودھ پیتا اور گوشت کھاتا ہوگا، ان پر سوار ہو کر جنگل جنگل
گھومتا ہوگا اور ان کی کھال کا لباس بناتا ہوگا بالآخر خانہ بدوشی سے تنگ آکر کوئی اچھا سا
سرسبز اور زرخیز قطعہ پاکر وہیں رہ پڑتا ہوگا۔ ہل بنا، گھوڑے بیل کی مدد سے زمین جوت
کھیتی شروع کردی۔ رہنے سہنے، پیداوار رکھنے اور بیل مویشی باندھنے کے لئے
کچھ کچے جھونپڑے بنا لیے۔ گویا انسان نے گاؤں بسانا شروع کیا۔ پالو جانور اور
آلاتِ کاشتکاری بھی اصل میں داخل ہوئے۔ کھانا، لباس، مکان، بیل، مویشی، کھیتی کا

حصّہ اوّل
باب چہارم

سامان۔ اب ضروریات اس قدر بڑھ گئیں کہ اُن کا مہیا کرنا ایک آدمی کے قابو سے باہر ہوگیا لہٰذا تقسیمِ عمل کے زرّیں اصول پر کاربند ہونا پڑا۔ کسان، گھسیارے، جولاہے، بڑھئی، لوہار۔ حجام اور موچی غرضکہ چند فرقے پیدا ہوگئے اور معاشی ترقی آجکل کے پسماندہ گاؤں کی حالت تک آپہنچی۔ ہر پیشے کے آلات اور اوزار، اصل میں اضافہ ہوئے۔ کسان کا اصل ہل، بیل، لوہار کا ہتوڑا اور دھونکنی، بڑھئی کا آرہ، بسولہ، جولاہے کا چرخہ اور کرگہ، گھسیارے کا جالی کھرپا اور حجام کا اُسترہ، قینچی اور موچی کی رانپی سوتاری۔ وہی اصل جو اوّل لگی کی شکل میں نمودار ہوا ہوگا اب کتنی مختلف شکلیں اختیار کرتا جاتا ہے۔ لیکن کام سب کا ایک ہے یعنی دولت کی پیدائش میں ہاتھ بٹانا۔ یہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ زمین اور محنت ہی نے مل کر اور فرصت کا وقت نکال کر اس کو پیدا کیا۔ اب خدا کی رحمت دیکھئے کہ اصل کی نسل مچھلی سے زیادہ بڑھی اور امر بیل سے زیادہ پھیلی۔ آج نہ اُس کی قسموں کا شمار نہ اُس کے تصرف سے کوئی پیشہ آزاد۔ درزی کی سوئی اور حجام کے اُسترے سے یورپ کے بے انتہا قیمتی انجنوں، مشینوں اور آلات تک اصل ہی کا خاندان پھیلا ہوا ہے۔ مثل آدمیوں کے اتنا فرق ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی قوی ہے کوئی ضعیف۔ کوئی معزز کوئی حقیر۔ لیکن ہیں سب ایک ہی نسل سے اور ہر ایک اصل کے لقب کا پورا پورا مستحق ہے۔ یہ تو اصل کی خاندانی سرگزشت تھی۔ اب اُس کی کارگزاریوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

اصل کی کارگزاری

۵۔ اگر مغرب و مشرق کی معاشی حالت کا موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک جوانِ رعنا ہے تو دوسرا پیرِ فرتوت۔ ایک دریائے مواج ہے تو دوسرا چشمۂ تنک آب۔ ایک مالا مال ہے تو دوسرا خستہ حال۔ آخر اس قدر فرق کی وجہ؟ ایشیا کی زمین بحیثیتِ مجموعی یورپ کی زمین سے زیادہ زرخیز۔ یہاں کی آب و ہوا پیداوار زرعی کے واسطے زیادہ موزوں۔ یہاں کے باشندے کم خرچ اور بیشتر محنتی اور جفاکش اور اس پر نتیجہ یہ کہ ایشیا یورپ کا محتاج، دست نگر، خوشہ چین۔ اس معمے کا راز صرف یہی اصل ہے۔ ایشیا کے پاس دو عامل زمین اور محنت بدرجۂ اولیٰ موجود مگر ایک اصل کے نہ ہونے سے بے بس اور ناچار۔ یورپ کی معاملہ فہم و دور اندیش اور باریک بیں قوموں نے اصل کی قوّت کا صحیح اندازہ کرکے

حصہ دوم
باب چہارم

اپنی تمامتر توجہ اس کے غور و پرداخت اور ترقی پر صرف کر کے آج وہ اقتدار پایا ہے کہ گھر بیٹھے دنیا کی دولت پر حکومت کرتے ہیں اور خلقت پر احسان دھرتے ہیں۔ لکڑی، لوہا، کوئلہ، پانی، زمین، سواری اور کارکنوں کی بڑی جماعت سب ہندوستانی لیکن ریل کے منافع کا مالک انگلستان اور اس پر بھی ہم شاد و فرحاں متشکر و ممنون۔ ریل کی تعریف میں رطب اللسان۔ اور کچھ بیجا بھی نہیں کیونکہ یہاں اصل ملتا تو معلوم۔ اگر انگریزی اصل سے بھی ریلیں نہ بنتیں تو جو کچھ تھوڑا بہت آرام اور فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جس کی ہم مناسب موقع پر تشریح کریں گے۔ ہندوستان اس سے بھی محروم رہتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی پسماندگی کی حقیقی وجہ دریافت کیجیے تو وہ نہ زمین کی کمی ہے۔ نہ محنت کی خامی۔ بلکہ وہ اصل کی قلت ہے جس نے کاروبار مردہ کر دیا۔

خلاصہ

۴ اصل کی احتیاج خود ہندوستان کہاں تک اور کیونکر پوری کر سکتا ہے اور اصل کی قلت کا وہ کس حد تک خود ذمہ دار ہے۔ یہ طولانی بحث یہاں بے محل ہے۔ یہاں حالات بیان کرنے سے یہ اظہار مقصود تھا کہ عمل پیدائش دولت میں ہر سہ عاملین کا کیا کیا حصہ ہے اور مقابلۃً ہر ایک کا کیا رتبہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پیدائش دولت کے واسطے زمین لابدی، محنت شرطِ لازمی اور اصل سب سے زیادہ کارگر آلہ ہے اور یہی تینوں مل جل کر دنیا میں دولت پیدا کر رہے ہیں۔ اب ہم پانچویں۔ چھٹے اور ساتویں باب میں علی الترتیب زمین، محنت اور اصل کے حالات سے جداگانہ مفصل بحث کریں گے۔

حصۂ دوم
باب پنجم

باب پنجم

زمین

(۱) زمین کا مفہوم (۲) زمین کے خواص (۳) کاشت کے دو طریق اور اُن کے جداگانہ فوائد (۴) زرخیزی کا مفہوم (۵) زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل (۶) قانونِ تقلیلِ حاصل (۷) معاشی ترقیات کا زمین کی قدر وقیمت پر اثر (۸) شہروں کی افزونی کا زمین کی قدر وقیمت پر اثر (۹) شہروں میں پارک کی ضرورت (۱۰) ٹریم کار کا شہر کی آبادی اور زمین کی قدر وقیمت پر اثر (۱۱) اضافۂ قیمت زمین کے حقدار۔

زمین کا مفہوم

۱ - معاشیات میں لفظِ زمین سے عموماً تو یہی زمین مُراد ہوتی ہے مگر اصطلاحاً اس میں چند دیگر عاملین قدرت مثل پانی، ہوا، گرمی، روشنی کے جو وجودِ خلقت اور پیدائش دولت کے واسطے لازمی ہیں شامل کر لیئے جاتے ہیں۔ مثلاً دریا کھیتی باڑی کو شاداب کرتے ہیں۔ کشتیوں میں مال ڈھوتے ہیں۔ پن چکیاں چلاتے ہیں۔ سمندر جہاز رواں کرتے ہیں۔ آبشار بجلی پیدا کرتے ہیں۔ ہوا بھی علاوہ شرطِ زندگی ہونے کے بادبان سے کشتی کھیتی ہے۔ پنکھا گھما کر مشینیں چلاتی ہے۔ ہندوستانی کسان کا غلّہ برساتی ہے۔ گرمی اور روشنی کی ضرورت بھی اظہر من الشمس ہے۔ پس ایسی چیزوں کو عاملین پیدائش میں شامل نہ کرنا کس طرح ممکن ہے۔ اور ہر ایک کو جداگانہ شمار کرنا بھی نامناسب طوالت معلوم ہوتی ہے۔ ان کو محنت تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ وہ انسان کے کام سے مخصوص ہے اصل بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ محنت اور زمین کے اتفاقِ عمل سے پیدا ہوا ہے۔ اور انسان کی مرضی کا مُطیع ہوتا ہے۔ اور ان چیزوں کو پیدا کرنا تو درکنار قابو میں لانا بھی محال ہے۔ جب آندھی چلتی ہے، طوفان آتا ہے، گرمی پڑتی ہے تو انسان کو فوراً اپنی بے بسی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور کچھ نہیں بن پڑتا۔ البتہ لفظِ زمین میں ان کو اصطلاحاً شامل کرنا

حصّۂ دوم
باب پنجم

کچھ نامناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اوّل تو یہ سب زمین سے قریب تر متعلق ہیں اور طریقِ عمل میں بھی زمین سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ ان سب کے اعمال براہِ راست قدرت کے اُن قوانین کے تابع ہیں اور محنت و اصل کے مانند ان پر انسان کو تصرف حاصل نہیں۔ بعض مصنّفین نے زمین کے بجائے لفظِ قدرت ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور بلحاظِ جامعیت یہ اصطلاح زمین سے بہتر ہے۔ مگر چونکہ ان تمام عاملینِ قدرت میں سب سے کثیر اور اہم کام زمین کا ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے زمین عاملینِ پیدائش میں جداگانہ شمار کی جاتی ہے۔ ایک نیا لفظ داخل کرنے کے بجائے زمین ہی میں ان چیزوں کا شمار کر کے اصطلاحی معنے میں وسعت پیدا کر دینا زیادہ قرینِ اصول معلوم ہوتا ہے اور اب زمین کے مذکورۂ بالا اصطلاحی معنے معاشیات میں بالعموم تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔

زمین کے خواص

۴ - (ا) ہم عاملینِ پیدائش کے بیان میں بتا چکے ہیں کہ زمین وجودِ خلقت اور پیدائشِ دولت کے واسطے لابدی ہے۔ اب یہاں چند اور خواص اور اُن کے معاشی اثر واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(ب) زمین کی دوسری قابلِ توجہ خصوصیت تعیّنِ مقدار ہے۔ خدا نے جتنا کرۂ ارض بنانا چاہا بنا دیا۔ کچھ سمندروں سے پوشیدہ کر دیا۔ کچھ پہاڑوں سے گھیر دیا۔ کچھ ناقابلِ آبادی برفستان اور ریگستان بنا دیا۔ اور باقی ہموار میدانوں میں دریا بہائے بار آور درخت اُگائے اور موسم خوشگوار بنائے تاکہ انسان وہاں بود و باش اختیار کر سکے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی سمندر ساحل سے ہٹ کر زمین چھوڑ دے جنگل میں اور پہاڑوں پر آدمی جا بسیں۔ امریکہ کی طرح اب بھی کسی نامعلوم برِّ اعظم کا پتہ لگ جائے لیکن یہ سب کچھ اسی ایک زمین کے اجزا کا تغیّر و تبدّل ہوگا۔ خود زمین کی وسعت میں ایک انچ اضافہ ممکن نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جس چیز کی مانگ بڑھتی ہے۔ اُس کی پیداوار بھی بڑھائی جاتی ہے۔ جب سے روئی ولایت جانے لگی ہندوستان میں اُس کی کاشت بہت وسیع ہو گئی اور مصر میں بھی یہی حال ہے۔ جب سے افیون چین میں جانا شروع ہوئی۔ اُس کی کاشت بھی بہت

حصّہ دوم
باب پنجم

رواج پاگئی۔ یہی حال مصنوعات کا ہے۔ گھڑیاں۔ بائیسکل۔ اسٹیل ٹرنک، گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر زمین کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اسکی صورت اوّل تو لاانتہا۔ دوسرے بوجہ ترقی آبادی روز افزوں اور اسپر یہ لطف یہ کہ مقدار معیّن۔ اس کا اضافہ ناممکن۔ نتیجہ ظاہر کہ زمین روز بروز نایاب اور بیش قیمت ہوتی جاتی ہے*

(ج) زمین کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر منقولہ ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ جہاں مانگ زیادہ ہوتی ہے اور قیمت اچھی اُٹھتی ہے۔ وہیں چیز لے جاکر فروخت کرتے ہیں چنانچہ تمام تجارتِ داخلہ اور خارجہ اسی اصول کی تشریح ہے۔ اگر یہ اصول نہ ہوتا تو جو چیز جہاں پیدا ہوتی بس وہیں بکتی۔ بلاد تجارت ہر ایک بستی تک محدود ہوتا حالانکہ آجکل گوشت پھل اور ترکاریاں اور ایسی ہی جلد خراب ہوجانے والی چیزیں بھی ہزارہا میل جاکر فروخت ہوتی ہیں۔ انگلستان کے لیئے گوشت اور مچھلی زیادہ تر آسٹریلیا مہیا کرتا ہے۔ صدہا من پھل اور میوے مثل آم و سیب ہندوستان سے جاتے ہیں اور دیرپا چیزیں مثل غلہ اور معدنیات کی دوررسی کا تو ذکر کیا ہے۔ لیکن زمین اٹل ہے۔ گاؤں والے زیادہ قیمت کی ہوس میں غلہ اور ترکاریاں تو شہر لاکر بیچتے ہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو صدہا بیگے ناکارہ بنجر زمین اٹھاکر شہر لے آتے اور بے شمار دولت رولتے۔ گاؤں میں زمین کی کمی نہیں اور گنجان شہروں میں بیحد نایاب ہوتی ہے۔ لیکن جو قطعۂ زمین جہاں ہے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک قصبات میں عموماً زمین روپیہ گز ملتی ہے اور ہندوستان ہی کے بعض شہروں میں چار سو روپے گز تک فروخت ہوچکی ہے۔ ایک دو آنے روپے کے نفع پر ہندوستان کا غلہ اور روئی ولایت پہنچتی ہے۔ لیکن صدہا روپے گز کے منافع پر قرب وجوار سے زمین نہیں لائی جاسکتی۔ تیسری خصوصیت عدم منقولیت بھی زمین کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے*

(د) چوتھی خصوصیت تعیّنِ پیداوار ہے یکونت سے زیادہ

پیدائش ضروریات ناگزیر یعنی خوراک و لباس کے واسطے زمین درکار ہے۔ غلہ، پھل اور ترکاریاں جو انسان و حیوان کی غذا ہیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایندھن اور عمارت کی لکڑی اس سے اُگتی ہے۔ لباس کی اکثر اشیاء زمین سے ملتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ زمین کی قوت پیدائش محدود رکھی گئی ہے۔ ایک قطعۂ زمین مقدارِ معیّن سے زیادہ غلہ یا ترکاری پیدا نہیں کرسکتا ہر ایک کسان اس کی تصدیق کریگا۔ قانون تقلیل حاصل کے تحت میں اس امر کی مزید تشریح کریں گے لیکن اس کا اثر زمین کی قدر و قیمت پر جو پڑتا ہے ظاہر ہے:

(۲) پابندی وقت زمین کے عمل پیدائش پر وقت کی پابندی بھی لازم کی گئی ہے کہ ہر چیز اپنے ہی فصل و موسم میں پیدا ہوسکے۔ مثلاً جوار باجرا اور مکا فصلِ خریف میں گیہوں جو اور چنا فصلِ ربیع میں۔ اس کے خلاف ممکن نہیں۔ علاوہ اس کے ہر چیز کی پیدائش کے واسطے جتنا وقت درکار ہے وہ بھی معیّن ہے۔ اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ فصلِ خریف دو مہینے میں تیار ہوتی ہے۔ ربیع چھ مہینے میں۔ نیشکر، تمباکو آلو اور کپاس نو نو مہینے میں۔ انسان وقت بے وقت محنت کرکے اصل سے شب و روز کام لے کر پیداوار بڑھا سکتا ہے۔ مگر زمین پر اُس کا کچھ بس نہیں چلتا۔ وہ تو قدرت کے تعیّن اوقات کی پابند ہے۔ اگر سائنس کے جدید انکشافات سے پیدائشِ زمین کے اوقات میں کچھ ردّ و بدل ہوتا بھی ہے تو اتنا قلیل کہ قابلِ لحاظ نہیں ہوسکتا۔

(۳) علاوہ مذکورۂ بالا ایک سے ایک سخت پابندیوں کے جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں خود عملِ پیدائش میں انسان کا حصہ نقلِ مقام و تبدلِ ترکیب پر ختم ہوجاتا ہے۔ کھیت جوتنا کسان کا کام ہے لیکن کھیت کو نشوونمو دینا عالمینِ قدرت کے ہاتھ ہے۔ کسان ناچار محض ہے۔ پس بلحاظ عمل پیدائش بھی زمین انسان کے تصرف سے بہت کچھ آزاد ہے حالانکہ اس کی پیداوار سب سے زیادہ ضروری ہے۔

حصۂ دوم
باب پنجم

حاصلِ کلام یہ ہے کہ زمین پر قدرت نے عجیب و غریب پابندیاں لازم کرکے انسان کے اختیار اور قابو سے اُس کو بالکل باہر کردیا ہے۔ اوّل تو اُس کو ابدی قرار دیا پھر اُس کی ضرورت روز افزوں بناکر اُس کی مقدار محدود کردی۔ اس کو غیر منقولہ بنایا اس کی قوتِ پیدائش کو محدود کیا۔ اس پر پابندیِ وقت کی سخت قید لگائی اور عمل پیدائش کا بیشتر حصہ باطنِ قدرت کے تصرف میں دے کر انسان کو بے بس اور ناچار کردیا۔ ان خصوصیات کی اصلی مصلحت تو خدا جانے۔ لیکن ایک بیّن نتیجہ جو ان سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ زمین کی قدر و قیمت دِن دونی رات چوگنی ہوتی چلی جاتی ہے اور علم معاشیات میں ایک اہم ترین حل طلب مسئلہ پیش ہورہا ہے کہ اس اضافۂ قیمت کا حقدار کون ہے مالکِ زمین یا گورنمنٹ۔ اور اگر دونوں تو کس اصول کے مطابق کس نسبت سے یہ اضافہ ان میں تقسیم ہونا چاہئے۔ اضافۂ قیمتِ زمین کا مسئلہ بہت غور طلب ہے اور اس سے جزواً جزواً حسبِ موقع بحث کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔

کاشت کے دو طریقے اور اُنکے جداگانہ فوائد

۴۔ یوں تو زمین سکونت اور کان کنی کے کام بھی آتی ہے لیکن اُس کا سب سے بڑا حصہ زراعت کے کام میں آتا ہے۔ کاشت کی دو قسمیں ہیں۔ **کاشتِ عمیق و کاشتِ وسیع**۔ ایک قطعۂ زمین خوب جوتے۔ بہت سا کھاد ڈ‌الے۔ جتنا تخم بویا جاسکے بوئے۔ اچھی طرح پانی دے اور کافی محنت و اصل اُس پر صرف کرکے **بیشترین مقدار** پیداوار حاصل کرے۔ اس کو کاشتِ عمیق کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کھیت کو کچھ یوں ہی جوت کر اور تھوڑا سا کھاد ڈال کر **کمترین مصارف** سے کچھ پیداوار حاصل کرے تو اس کو کاشتِ وسیع کہتے ہیں۔ کاشتِ عمیق میں نسبتِ مصارف تو زیادہ موافق نہیں ہوتی مگر مقدار پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کاشتِ وسیع میں اس کے برعکس مقدار پیداوار کم ہوتی ہے مگر نسبتِ مصارف بہت موافق ہوتی ہے۔ مثلاً اگر دس بیگھے زمین سے بصرف تین روپے من پچاس من غلہ پیدا ہوا اور پندرہ بیگھے زمین سے بصرفِ دو روپے من کل تیس من پیدا ہو تو پہلی کاشتِ عمیق اور دوسری وسیع کہلائیگی۔

یہاں یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جب پیداوارِ زمین کی زیادہ مانگ ہو اور قیمت اچھی اُٹھتی ہو تو کاشتِ عمیق سے زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسری صورت میں کاشتِ وسیع زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر اُنہیں کھیتوں کی پیداوار

[illegible]

پانچ روپے من کے نرخ سے فروخت ہو تو پہلے کھیت سے حساب [illegible] روپے [illegible]
کل سو روپے منافع ہوگا اور دوسرے کھیت سے حساب تین روپے [illegible]
نوے روپے لیکن اگر قیمت گھٹ کر صرف چار روپے من ہو جائے تو [illegible] منافع
حسب ترتیب پچاس روپے اور ساٹھ روپے ہوگا اور قیمت بہت ہی [illegible]
مثلاً ڈھائی روپے من تو حسب ترتیب پچیس روپے گھاٹا اور پندرہ روپے منافع [illegible]
غرضکہ زیادتی قیمت کاشت عمیق کی ممد و معاون ہے اور کمی قیمت کاشت وسیع کی
ان دونوں نتائج کو مد نظر رکھ کر حسب ترتیب قیمت کے اثر موافق و مخالف سے
تعبیر کریں گے اور دونوں کا مشترکہ نام صرف اثر قیمت ہوگا چنانچہ ناخواندہ کسان بھی
تجربے کی مدد سے اسی اصول پر کاربند ہوتا ہے شہر و قصبات کے گرد و نواح
میں عموماً کاشت عمیق ہوتی ہے اور دور افتادہ گاؤں میں کاشت وسیع طریق پر
اس اثر کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہر دو قسم کی کاشت کے وسط مصارف میں فرق کم ہو مثلاً
تین روپے اور دو روپے من اور اوسط پیداوار میں فرق زیادہ ہوگا مثلاً پانچ من اور
دو من بیگھے تو اثر موافق بہت خوبی ظاہر ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اوسط مصارف میں
فرق زیادہ ہو مثلاً چار روپے اور دو روپے من اور اوسط پیداوار میں کم مثلاً پانچ من
اور تین من بیگھے تو اثر موافق ضعیف ہوگا یا اثر مخالف حسب حالت ضعیف یا خوب نمودار
ہوگا۔ کسی مقام میں دونوں قسم کی کاشت کے اعداد مصارف و پیداوار [illegible]
ہونے پر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کونسی کاشت کس حد تک مفید تر ہوگی

علاوہ اثر قیمت کے طریق کاشت ایک اور قوی اثر کے تحت [illegible] ایک
کسان کو پیداوار کا کچھ حصہ زمیندار یا سرکار کو دینا پڑتا ہے۔ اس [illegible]
شکلیں ہو سکتی ہیں خواہ وہ بشرح منافع ہو یا پیداوار کل یا وسعت زمین مثلاً پچاس
فی صدی منافع یا ۲۰ فی صدی پیداوار یا دو روپے بیگھہ۔ مذکورہ بالا دو کھیتوں کی
مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ شرح منافع کا کوئی اثر۔ اثر قیمت سے [illegible]
نہیں پڑیگا۔ بشرح ۵۰ فی صدی مثال بالا میں لگان ادا کرنے کے بعد منافع [illegible]
اور ۴۵ روپے حسب ترتیب رہ جائیگا گویا حسب سابق کاشت عمیق ہی زیادہ [illegible]
ہوگی اور اسی طرح بحالت کمی قیمت لگان ادا کرنے کے بعد بھی کاشت وسیع مفید

حصہ دوم باب پنجم

ہوگی۔ لیکن لگان بشرح پیداوار کے اثر کا عمل درآمد ذرا پیچیدہ ہے۔ یہ اثر قیمت کے اثر موافق کے مخالف اور قیمت کے اثر مخالف کے موافق کام کرتا ہے۔ گویا کاشت عمیق کا منافی اور کاشت وسیع کا معاون ہے۔ اگر لگان بشرح پیداوار کا اثر قیمت کے اثر مخالف سے ملا دیا جائے تو دونوں یکساں اثر مل کر بہت قوی ہو جاتے ہیں لیکن اگر قیمت کے اثر موافق سے مقابلہ آپڑے تو جو اثر قوی تر اور غالب ہوگا بندوبست کا طریقہ اُس کے مطابق ہوگا۔ لگان بشرح دست کا اثر بھی بعینہ لگان بشرح پیداوار کا سا ہے پس معلوم ہوا کہ کاشت کے دو طریق ہیں۔ اور قیمت پیداوار و لگان کے مختلف اثروں کے تابع ہیں۔ قانون تقلیل حاصل اور لگان کی بحث میں واضح ہوگا کہ منافع زراعت کو محصل زائد کہتے ہیں؀

زرخیزی کا مفہوم

۴۔ زرخیزی زمین کی کوئی خاص صفت نہیں۔ بلکہ اس سے زمین کی کئی حالتیں مُراد ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو زرخیزی طریق کاشت سے متعلق ہے۔ کاشت عمیق میں وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے جو بلا لحاظ نسبت مصارف بڑی مقدار پیدا کرے مثلاً کسی کھیت میں ۴۰ یا ۵۰ من بیگہ غلہ پیدا ہو۔ صرف مصارف پیدائش خواہ زیادہ مثلاً ۲۰ یا ۵۰ روپے من تک ہوں اس کے برعکس کاشت وسیع میں زرخیز زمین سے مُراد یہ ہے کہ بلا لحاظ مقدار پیداوار مصارف کا اوسط کمتر ہو۔ مثلاً کسی کھیت میں صرف دو یا تین روپے من کے صرف سے غلہ پیدا ہو، اوسط پیداوار خواہ ایک یا دو من فی بیگہ ہو۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ بعض زمینیں تو ان میں سے صرف کسی ایک طریق کاشت میں زرخیز ثابت ہوتی ہیں اور بعض دونوں حالتوں میں۔ زمین کی زرخیزی فصل سے بھی متعلق ہوتی ہیں۔ بعض زمینیں نیشکر کی کاشت کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں اور بعض تمباکو، کپاس، سن یا ایسی ہی کسی خاص چیز کے واسطے اگر فصل مناسب کے علاوہ کوئی چیز کاشت کی جائیگی تو نتیجہ حسب دلخواہ نہ ہوگا گویا ایک ہی قطعۂ زمین بعض فصلوں کے لحاظ سے زرخیز ہے اور بعض کے لحاظ سے نہیں۔ پنجاب میں گیہوں عمدہ پیدا ہوتا ہے۔ برار کی روئی نرم اور لمبے ریشے کی ہوتی ہے۔ مشرقی بنگال کا سن جو جوٹ کہلاتا ہے، تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح پھل مثلاً آم، انار، سیب، ناشپاتی وغیرہ کے واسطے بھی خاص خاص مقام مشہور ہیں کبھی بلا لحاظ مقدار پیداوار

یا وسطِ معارف، یا موزونی فصل محض پیداوار کی قیمت بہت بڑھ جانے سے زمین زرخیز شمار ہونے لگتی ہے پس معلوم ہوا کہ زرخیزی صفتِ اضافی ہے اور وہ کبھی **طریقِ کاشت کبھی نوعیتِ فصل** اور کبھی **اضافۂ قیمت** سے متعلق ہوتی ہے۔

۵ - زرخیزی کی نوعیت سمجھانے کے بعد اب ہم مختصراً وہ وسائل بتانا چاہتے ہیں جو زرخیزی پیدا کرنے اور بڑھانے کے واسطے عموماً اختیار کیے جاتے ہیں اور تجربے سے مفید ثابت ہوئے ہیں۔

عمدہ زمین کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ نہ اتنی سخت ہو کہ نازک پودے جڑ نہ پکڑ سکیں اور پانی جذب ہونے کے بجائے سطح پر بہتا ہوا گزر جائے۔ اور نہ اتنی نرم اور بے دم ہو کہ جڑ مضبوط نہ جمے۔ پودے گر گر پڑیں اور نہ پانی رکے سب رس رس کے نکل جائے۔ بلکہ وہ اتنی تو نرم ہو کہ نازک جڑیں اس میں جگہ کر سکیں مگر اتنی سخت بھی ہو کہ جڑوں کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ وہ پودے سنبھال سکیں۔ پانی جو زمین سے پودے کو غذا پہنچاتا ہے کھیت میں باسانی پھیل سکے لیکن پودے کی غذا بہا کر باہر نہ لیجا سکے ورنہ یا تو پودے نہیں جمیں گے یا بعدہٗ خشک ہو کر رہ جائیں گے۔ کھیت جوتنے کا اصلی مقصد یہی صفت پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سخت سطح اور ڈھیلے ٹوٹ کر حسبِ ضرورت نرم ہو جائیں۔ ریتیلی زمینیں بھی نئی مٹی ہل کے ذریعے سے ملا کر سخت کی جاتی ہیں۔

زمین کی دوسری ضروری صفت یہ ہے کہ اس میں وہ تمام اجزا جو پودے کی غذا ہیں پوری مقدار میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے اجزا کی مقدار کم ہوگی یا ایک جزو بھی غائب ہوگا تو پودوں کی نشوونما پر مضر اثر پڑے گا اور پیداوار علاوہ مقدار میں کم ہونے کے ادنیٰ قسم کی ہوگی۔ کھاد کے ذریعے سے زمین میں پودوں کی غذا بڑھائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں تو نادان کسان تھوڑے بہت تجربے کے بھروسے پر جیسا کھاد میسر آتا ہے کوڑے سے اٹھا کر کھیت میں ڈال دیتا ہے۔ مگر یورپ والوں نے اس میں بھی بہت تحقیق سے کام لیا ہے۔ اوّل ہر قسم کے پودوں کی غذا کے اجزا دریافت کیے۔ مثلاً آلو کے پودے کی نشوونما کن کن چیزوں سے ہوتی ہے اور نسبتہً وہ کن کن مقداروں میں درکار ہیں۔ غرضکہ بہت سے مروجہ پودوں کی خوراک کے اجزا اور ان کی ترکیب سائنس اور مشاہدات کی مدد سے دریافت کر لی گئی ہے اور

بذریعہ طریق سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین میں کیا کیا اجزا کس مقدار میں موجود ہیں۔
چنانچہ جرمنی وغیرہ کے مثل ترقی یافتہ ممالک میں کسان اپنے کھیت کی تھوڑی سی مٹی کسی
کے کارخانے میں بھیج دیتا ہے اور جو چیز بونی مقصود ہوتی ہے اُس سے اطلاع
دیتا ہے۔ کارخانے میں زمین کے موجودہ اجزا اور پودے کی غذا کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی
مناسب کھاد اسی طرح تجویز کی جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں مریض یا کمزور کیواسطے
ڈاکٹر دوا یا غذا تجویز کرتے ہیں۔ کارخانے میں ہر قسم کی کھادیں تیار ہوتی ہے اور
فرمائش آنے پر بہ احتیاط بکسوں میں بند کر کے روانہ کر دی جاتی ہے چنانچہ دواسازی کے ساتھ
کھاد سازی بھی یورپ میں ایک فن ہو گیا ہے اور اسکے باقاعدہ کارخانے قائم ہیں لیکن بعض مختلف الخواص
مٹیوں کے ملانے سے بھی کھاد کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے مثلاً اگر دو زمینوں میں سے ہر ایک میں انہیں اجزا کی بہت
کثرت ہو جن کی دوسری میں قلت ہے۔ تو اُن کی مٹی ملانے سے زمین زرخیز
بن جائیگی۔ چنانچہ چونا، کھریا، چکنی مٹی، ریت، کا چورا زمین میں ملانے سے اکثر زرخیزی
پیدا ہو جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ مختلف الخواص مٹی ملانے کا طریقہ کھاد
سے بھی زیادہ مروج ہوگا۔

معلوم ہوا کہ انسان زمین کی زرخیزی بڑھا کر اور نیز نگہداشت کر کے نباتات
کو بیش بہا مدد پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اس کے مدارج مختلف ہیں۔ نازک بیل
پودے بحالت کس مپرسی اپنا وجود بھی بمشکل قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانی امداد
سے حیرت انگیز ترقی کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ نباتی باغات اور نمائش گاہوں
میں ایسے خوش رنگ۔ لذیذ اور بڑے بڑے پھل پھول اور ترکاریاں دیکھنے میں
آتی ہیں کہ اُن کی شناخت میں دھوکا ہوتا ہے۔ غلے، ایکھ، کپاس اور دوسری
مزروعہ چیزوں کے پودے بھی انسان کی مدد کے خواستگار ہیں۔ یہ چیزیں
خودرو بھی پائی گئی ہیں مگر اُس قدر ادنیٰ قسم کی کہ اُن کو اپنے مزروعہ ہمجنسوں سے کوئی
نسبت ہی نہیں۔ مستقل جڑ اگا ہیں بھی بقدر نگہداشتِ انسانی توجہ کی مستحق ہیں مگر جنگلات
کے درخت انسانی امداد سے بالکل مستغنی ہیں۔ وہاں بقا ئے اصلح کا قانون
جاری ہے اور ہر ایک درخت اور پودا اپنا خود نگہبان ہے۔ اور اگر انسان چاہے بھی
تو بھلا جنگل کے اُن بلند اور گنجان درختوں کی نشو و نما میں کیا قابلِ لحاظ اضافہ کر سکتا ہے

حصہ دوم
باب پنجم

جن کی زوردار ضربیں پتھر چیر کر پانی کے سوتے سے طراوت اور اردگرد کی صدہا گز وسیع زمین سے خوراک وصول کرتی ہیں۔

قانون تقلیل حاصل

۴۔ زراعت کے متعلق زمین کی ایک عجیب خاصیت تجربے سے معلوم ہوئی ہے جس کا نام قانون تقلیل حاصل ہے۔ یہ قانون ترقی زراعت پر ایک لازمی حد قائم کرتا ہے۔ اور مسئلہ لگان کے اصول بھی اسی قانون سے اخذ کیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس کی ضروری تشریح یہاں پر برمحل معلوم ہوتی ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ قدرت نے ہر زمین کی قوت پیدائش معین اور محدود کر دی ہے۔ فن زراعت کے اصول کے مطابق جوت کر، کھاد ڈال کر، ہم زمین کی قوت پیدائش میں اضافہ ضرور کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ زمین کی پیداوار ہم ڈیوڑھی، دوگنی یا سہ گنی کر لیں۔ مگر اس کو دس بیس یا پچاس گنی حسب دلخواہ بڑھانا ممکن نہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو ہر ایک کسان چھوٹا سا کھیت لے کر جتنی چاہے پیداوار حاصل کر لیا کرتا۔ اس کو بڑے بڑے کھیت جوتنے بونے اور ان کی نگہداشت کرنے کی زحمت اٹھانی نہ پڑتی۔ اور نہ پھر زراعت کے واسطے زمین کی اس قدر مانگ ہوتی۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو قطعات صدہا برس سے کس مپرسی کی حالت میں ویران پڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ زیر کاشت آرہے ہیں۔ اگر زمین کی قوت پیدائش لامحدود ہوتی تو موجودہ کھیت کافی ہوتے اور غیر مزروعہ زمینوں پر کاشت پھیلانے کی ضرورت کیا تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک زمین خواہ کیسی زرخیز کیوں نہ ہو اور خواہ فن زراعت کا سارا کمال اس پر صرف کر دیا جائے، صرف ایک خاص حد تک کاشت کی متحمل ہو سکتی ہے اگر اس حد سے تجاوز کر کے اضافہ پیداوار کی ہوس میں زیادہ محنت اور حاصل صرف کیا جائے تو یقیناً وہ سب اکارت جائیگا۔ اگر کسی کسان سے سوال کیا جائے کہ وہ اپنے کھیت کو بجائے دو مرتبہ جوتنے کے چار مرتبہ نرالے اور دس مرتبہ پانی دینے اور ایک من تخم بونے کے بجائے بیس مرتبہ جوت کر چالیس مرتبہ نرا کر سو مرتبہ پانی دے کر اور دس من بیج بو کر دس گنی پیداوار حاصل کیوں نہیں کرتا تو وہ صاف جواب دیگا کہ زمین میں اتنی پیداوار کی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے سے ساری لاگت خاک میں مل جائیگی۔ جو پیدا ہوتا وہ بھی نہ ہو سکیگا۔ دس گنی پیداوار کے واسطے

حصۂ دوم
باب پنجم

ایسے ایسے دس کھیتوں کی ضرورت ہے ؎

یہ تو بخوبی ذہن نشین ہو گیا کہ زمین کی قوتِ پیدائش محدود ہے۔ اب اس خاصیت کی شان سنیئے۔ بغرضِ سہولتِ بیان ہم کھیت کو جوتنے، بونے، نرانے، اور پانی لگانے کو ہم آگے جرعوں سے تعبیر کریں گے اور ہر جرعے کی لاگت دس روپے قرار دیں گے۔ اگر کھیت ایک مرتبہ جوتا گیا تو گویا ایک جرعہ صرف ہوا۔ اسی طرح بونے، نرانے وغیرہ کے متعلق ہر فعل ایک جرعہ کہلائیگا۔ فرض کرو کہ کسی مناسب ترکیب سے کسان نے ایک کھیت پر دس جرعے صرف کیئے۔ یا بالفاظ دیگر سو روپیے لاگت لگائی اور تیس من غلہ پیدا ہوا اوسط ۳ من فی جرعہ پڑا۔ تجربۃً اسی کھیت پر بارہ جرعے صرف کیئے اور پیداوار ۳۷ من ہو گئی۔ گویا دو جدید جرعوں کا ماحصل ۳½ من فی جرعہ ہوا۔ اضافے کی امید پر سہ بارہ پندرہ جرعے صرف کیئے اور پیداوار پچاس من ہوئی آخری تین جرعوں کا اوسط چار من فی جرعہ پڑا۔ اب تو کسان کو چسکا لگ گیا اور چوتھی مرتبہ اس نے سولہ جرعے صرف کیئے۔ مگر قدرت نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور اس مرتبہ پیداوار صرف ۵۲ من ہوئی یعنی سولھویں جرعے کا ماحصل صرف دو من ہوا۔ معلوم ہوا کہ پندرھویں جرعے پر قوتِ پیدائش کمال پر پہنچ گئی۔ اور سولھویں جرعے سے انحطاط شروع ہوا۔ پس اصطلاحاً کہیں گے کہ پندرھویں جرعے تک تو قانونِ تکثیرِ حاصل جاری رہا مگر سولھویں جرعے سے قانونِ تقلیلِ حاصل کا عمل شروع ہوا۔ زراعت میں قانونِ تکثیرِ حاصل کچھ زیادہ قابلِ توجہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کا اثر کمتر ظہور میں آتا ہے اور محض عارضی ہوتا ہے۔ البتہ مصنوعات میں اس کا اثر بہت اہم ہوتا ہے اور مناسب جگہ پر ہم اسکی تشریح کریں گے یہاں ہمکو صرف قانونِ تقلیلِ حاصل سے بحث کرنی مقصود ہے کیونکہ اسکا اثر زراعت پر ہر حالت میں یقینی اور دوامی ہوتا ہے اور اسکا مسئلہ لگان اور قیمت زمین سے بہت قریبی تعلق ہے؛

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانونِ تقلیلِ حاصل جاری ہونے کے بعد بھی کسان جرعوں میں اضافہ کریگا یا نہیں اور اگر کریگا تو کہاں تک۔ اسکا جواب قیمتِ پیداوار پر منحصر ہے عام اصول یہ ہے کہ خواہ قانونِ تقلیلِ حاصل جاری ہو یا نہ ہو کسان اپنے جرعوں میں اسوقت تک برابر اضافہ کیئے جائیگا جب تک کہ ہر جدید جرعے کی پیداوار کی قیمت جرعے کی لاگت سے زیادہ ہو حتی کہ کسی جدید جرعے کی پیداوار کی قیمت اس کی لاگت کے برابر آ پہنچے تو کسان اضافہ فوراً بند کر دیگا اور

حصہ دوم
باب پنجم

یہ آخری جرعہ اصطلاحاً جرعۂ مختتم اور اسکی پیداوار حاصل مختتم کہلائیگی۔ کاشت کی اس حالت کو تمام کاشت سے تعبیر کرتے ہیں صاف ظاہر ہے کہ جرعۂ مختتم کسی خاص حد پر قائم نہیں ہوتا بلکہ پیداوار کی قیمت بڑھنے گھٹنے پر حسب ترتیب یہ بھی آگے بڑھتا اور پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔ اضافۂ قیمت کے زور پر کبھی قانون تقلیل حاصل کی حد سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور کمیٔ قیمت کے باعث کبھی اس کی حد سے پیچھے چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ اور آباد ممالک میں اس قانون کا اثر بہت قوی اور وسیع پایا جاتا ہے اور پسماندہ غیر آباد ممالک میں اس کے عمل کی نوبت تک نہیں آتی۔ آخر میں ہم یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون تقلیل حاصل کا تعلق مقدار پیداوار سے ہے نہ کہ قیمت پیداوار سے۔ جب کسی جرعے کی پیداوار اپنے ماسبق جرعے کی پیداوار سے مقدار میں گھٹ گئی تو قانون کا عمل شروع ہوا قیمت پیداوار سے قانون کو کچھ سروکار نہیں۔ البتہ جرعۂ مختتم تمام وکمال قیمت کے تابع ہوتا ہے۔ قیمت کی بیشی کمی جرعۂ مختتم کو قانون تقلیل حاصل کی حد سے گیند کی طرح کبھی اس طرف پھینک دیتی ہے کبھی اُس طرف۔

چونکہ جرعۂ مختتم کی لاگت حاصل مختتم کے برابر ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی کھیت میں جتنے جرعے صرف ہوں انکی مرتبہ حاصل مختتم پیداوار کلی سے منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ ماحصل زائد کہلائیگا۔ یہ کبھی کسان کا خالص حصہ ہوتا ہے اور کبھی زمیندار و کاشتکار میں باہم تقسیم ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ بھی اس کی مستقل شریک بن گئی ہے۔ اگر کسی کھیت میں دس جرعے صرف ہوں اور پیداوار مقدار کلی بارہ من ہے اور حاصل مختتم کی مقدار ایک من تو گویا دس من مصارف کاشت ہوئے اور باقی دو من ماحصل زائد کہلائیں گے۔ اور یہی ماحصل زائد بہ ترمیمات خاص جن کی تشریح مناسب موقع پر کی جائیگی معاشی لگان کہلاتا ہے۔

معاشی ترقی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر

۷۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زمین کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے مستقل اسباب تو خواص زمین کے تحت میں واضح ہو چکے چند اسباب جو ترقیات جدید کا نتیجہ ہیں بیان کیئے جاتے ہیں۔ جو قطعات شہر اور قصبات سے بہت دور واقع تھے اور بوجہ فاصلہ و قلت ذرائع آمد و رفت ان کی پیداوار منڈی تک لانا نہایت دشوار اور صرف طلب تھا۔ وہ بیکار پڑے ہوئے تھے نہ کوئی اُن کو

حصہ دوم
باب پنجم

جو تالاب تھا نہ اُن کی کچھ قیمت اُٹھ سکتی تھی، کس مپرسی کی حالت میں لاوارثی پڑے ہوئے تھے۔ جب سے ہندوستان میں ریل کے قدم آئے اور اس کا جال تمام ملک میں پھیل گیا۔ افتادہ زمینوں کے دن پھرے اور جس ویران میدان میں اس کا گذر ہوا بشرط صلاحیت تختۂ عدن بن گیا۔ از کار رفتہ زمینوں سے دولت اُبل پڑی۔

اب تک کھیتوں کی آبپاشی کا دار و مدار بارش یا کنوؤں کے پانی پر تھا بمقابلہ چاہی زمینوں کے بارانی کی قیمت بہت کم تھی۔ بارش کا کیا بھروسہ ہو نہ ہو لہٰذا ایسی زمینوں کی پیداوار بھی اتفاقی تھی لیکن جب سے شمالی ہندوستان میں بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں، راجپوتانہ، بنگال اور دکن کے پہاڑوں میں گھرے ہوئے میلوں وسیع قدیم تالابوں سے کام لے کر تمام ملک پر پانی کا جال پورا کیا گیا۔ آبپاشی بہت کچھ بارش اور کنوؤں سے مستغنی ہو گئی ہے۔ اور جہاں چھوٹی سی نالی بھی گذر گئی ہے۔ غیر چاہی زمینوں کی قیمت چاہی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ غرضکہ ریلوں اور نہروں کی بدولت ملک کا بہت سا ناکارہ حصّہ قابلِ کاشت بنکر بہت کچھ قیمتی ہو گیا۔

جنگلات کی پیداوار سے بھی روز افزوں منافع حاصل ہو رہا ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ کچھ عرصے میں جنگلات گورنمنٹ ہند کا نہایت مستقل اور کثیر آمدنی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ علمِ معدنیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ کان کنی کا حلقہ بھی وسیع ہو رہا ہے میسور اور حیدرآباد میں سونا نکلتا ہے، لوہا اور کوئلہ بنگال کے اکثر حصّوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مٹی کے تیل کے ذخیرے بھی دریافت ہوئے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ جستجو کرنے پر ہندوستان میں بہت سی نامعلوم معدنیات سے بیشمار منافع حاصل ہوگا۔ غرضکہ مزروعہ زمین جنگلات و معدنیات سب روز بروز بیش بہا ہو رہی ہیں۔ سکنی زمینوں سے ہم شہروں کے تحت میں جداگانہ بحث کریں گے۔

ہروں کی
رزوں کا
بن کی قدر
ت پر اثر

۸ - کسی زمانے میں زیادہ تر لوگ دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبات میں رہتے تھے ذرائع آمد و رفت کم اور دقّت طلب تھے۔ بالعموم لوگ اپنے وطن یا اس کے گرد و نواح میں عمر بسر کر دیتے تھے۔ جہاں بادشاہ، امرا، اور حکام کا قیام رہا وہاں البتہ شہر آباد ہو گئے۔ لیکن جب سے ایجادات جدیدہ نے فیکٹریوں، ریلوں، عظیم الشان

کارخانوں کی بنا ڈالی اور ریل نے آمدورفت کو ایک کھیل بنا دیا، ڈاک اور تار نے
نا واقفیت کا پردہ اٹھا دیا تب سے بڑی بڑی تجارت گاہوں، صنعت و حرفت کے
مرکزوں کی بنیاد قائم ہوئی۔ چنانچہ یورپ اور امریکا کے بڑے بڑے شہروں کے بانی
اکثر معاشی اسباب بنے۔ لندن برطانیۂ عظمیٰ کا دارالسلطنت سہی لیکن اس کی عظمت
کے حقیقی اسباب اس کے معاشی خصوصیات میں مضمر ہیں۔ خود ہندوستان کے
نامور شہر کلکتہ، بمبئی، مدراس، ناگپور، دہلی، لاہور، تجارت اور صنعت و حرفت کی وجہ سے
اس قدر رونق دار اور آباد ہیں۔ ورنہ محض بحیثیت دارالسلطنت ان کو موجودہ عروج
ہرگز میسر نہ ہوتا۔ آبادی اب اس قدر کثیر اور نقل پذیر ہو گئی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی مہذب
ملک ہوگا جہاں کے کم از کم دو چار باشندے بڑے شہروں میں مصروفِ کاروبار
نہ پائے جائیں۔ خود ہندوستانی جیسے گھر گھسنے لوگ چین، جاپان، افریقہ اور امریکا تک
تلاشِ معاش میں چکر لگا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشی ترقیات کے ساتھ شہروں کی
وسعت اور تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

اگر ایک مینار پر چڑھ کر کسی شہر کا منظر دیکھو تو بوجہ گنجانی آبادی وہ بھڑوں کا سا
چھتا نظر آئیگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہر کے گرد و نواح میں زمین خالی پڑی ہے
تو پھر لوگ شہر کے اندر تنگ و تاریک مکانات میں رہنے پر کیوں جان دیتے ہیں۔
شہر سے باہر ہوادار مکان بنا کر آرام سے کیوں نہیں رہتے۔ شہری لوگ کچھ دیوانے
تو ہوتے نہیں۔ ضرور کوئی زبردست مصلحت ہوگی کہ وہ شہر کی کوٹھری کو بیرونِ شہر کی
کوٹھی پر ترجیح دیتے ہیں۔ بازاروں، کارخانوں، دفتروں، عدالتوں، کالجوں اور ریلوے
اسٹیشن کے قرب و جوار میں شرحِ کرائۂ مکانات بہت زیادہ ہوتی ہے اور باوجود
زیادتی کرایہ لوگ ایسے ہی مکانات کے طالب نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ بتانا دشوار
نہیں۔ لوگ اپنے کاروبار کی جگہ سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ اور کفایتِ وقت
و سہولتِ آمدورفت کو زیادتی کرائے پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاہی زمانے کے محلات
جن کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہوگا دہلی کے اندرونی محلوں میں سنسان اور
غیر آباد پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی اگر برائے نام ہی کرایہ دے تو مکان کی صفائی، روشنی،
آبادی غنیمت سمجھی جاتی ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن کے قریب سراؤں کی کوٹھریاں

اور ہوٹلوں کے لیے معمولی مکانات صدہا روپیہ ماہوار کرایہ کما رہے ہیں۔ یہی حال بازاروں کا ہے۔ جو بازار کسی غیر آباد حصے میں بے موقع بنا ہے کہ وہاں کوئی بھولا بھٹکا خریدار آ نکلے تو آ نکلے ورنہ ساری خرید و فروخت پڑوس کے غریب لوگوں تک محدود ہے۔ وہاں وسیع دکانیں نہایت قلیل کرائے پر چلتی ہیں۔ یہاں کے دکاندار محض بوجہ مجبوری تھوڑی سی خردہ فروشی کو بیکاری سے غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بازار عام گزرگاہ شہر کے آباد حصے میں واقع ہے جہاں خریداروں کا دن بھر ہجوم رہتا ہے چھوٹی سے چھوٹی دکان بھی دس گنے کرائے پر اٹھتی ہے۔ اور اس پر بھی لوگ ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ دکاندار اپنی تجارت کے فروغ پر ایسے پچاس کرائے بھی قربان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دہلی میں چاندنی چوک اور کشمیری دروازے کی دکانوں کا جو کرایہ ہے۔ دوسرے بازاروں میں اس کا نصف بھی نہیں پس معلوم ہوا کہ شہر کی گنجانی اور تنگی بے وجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ زبردست معاشی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شہر کی زمین کی قدر و قیمت کا باعث موقع محل ہے۔ موقع کی اہمیت کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے بیشتر واضح ہوگا۔ مدراس میں ساحل کے قریب قریب نہایت کشادہ، ہموار اور صاف سڑک کئی میل تک چلی گئی ہے۔ اس کو بیچ لائن کہتے ہیں۔ مناظر کی دلکشی اور ساحل کی خوبصورتی کے لحاظ سے نیپلس کے بعد دنیا بھر میں وہ دوسرے درجے کی خیال کی جاتی ہے۔ شہر کے حکام، معززین، تاجر، عالم، صدہا یوروپین عورتیں اور بچے شام کے وقت چہل قدمی کے لیے جمع ہوتے ہیں عجیب سماں ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے سمندر کی ریتی پر خوب دوڑ لگاتے اور لوٹتے ہیں۔ مگر ریتی ایسی صاف کہ کیا مجال کپڑا میلا ہو۔ جہاں ذرا جھٹکا کپڑا صاف۔ قریب ہی منتہائے نظر تک سمندر لہریں مارتا ہے اور غروب آفتاب کا منظر کچھ عجب بارعب اور شاندار ہوتا ہے۔ سڑک پر بینڈ بجتا ہے۔ جگہ جگہ بنچیں پڑی ہیں۔ کہیں دوستوں کی ٹولی خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ کہیں لوگ کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ بعض لوگ کسی کے انتظار میں یا دم لینے کو بیٹھے ہوئے ہیں اور تمام مجمع نہایت صاف و پاکیزہ۔ پانچ بجے شام سے آٹھ بجے رات تک یہی حال بندھا رہتا ہے خصوصاً چاند کی بارھویں سے سولھویں شب تک جبکہ سمندر میں

اب ہم
اس شاندار تماشے میں محو رہتے ہیں۔ تحقیق طور پر سُنا ہے کہ یہاں کے قرب و جوار میں چار سو روپے گز تک زمین فروخت ہونے کی نوبت آگئی۔ بالآخر پرائیویٹ خرید و فروخت بند کر کے گورنمنٹ نے وہ کل قطعہ اپنے قبضے میں لے لیا اور اب وہ سرکاری ملک تصور ہوتا ہے۔ امریکا کے مشہور شہر نیویارک میں جہاں سُنا ہے بوجہ کثرت آمد و رفت صدر اسٹیشن سے شب و روز ہر چوتھے منٹ پر ایک ٹرین گزرتی ہے نیز وال اسٹریٹ اور براڈوے بازاروں کے قرب و جوار میں بارہ ہزار روپے اور لندن کے مشہور بازار لمبارڈ اسٹریٹ میں تقریباً ۷ ہزار روپے مربع گز کی شرح سے زمین فروخت ہو چکی ہے چھوٹے سے چھوٹے مکان کے واسطے کچھ نہیں تو دو سو گز زمین تو ہو۔ اور اُس کی قیمت کیا ہوئی۔ چوبیس بلکہ چونتیس لاکھ روپے۔ گویا وہاں کے جھونپڑے یہاں کے محلات سے بدرجہا قیمتی ہوتے ہیں۔ کیا وہاں کی زمین سونے کی ہے۔ زمین تو ہمارے ہاں کی روپے گز والی قصباتی زمین سے کسی طرح بہتر نہ ہوگی۔ جو کچھ قیمت ہے وہ قیمت موقع کی ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ شہری زمینوں کی قیمت میں قیمتِ زمین اور قیمتِ موقع دو جداگانہ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اور قیمتِ موقع میں اضافے کی بیحد گنجائش ہے۔ موقع کا اثر تو مزروعہ زمینوں کی قیمت پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ قصبات کے قرب و جوار کے کھیت دیہات کے کھیت سے زیادہ قیمتی خیال کئے جاتے ہیں مگر سکنی زمین کے مقابلے میں مزروعہ زمین کی قیمتِ موقع کی کچھ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اور اسی وجہ سے صرف شہر کی زمینوں کے ساتھ قیمتِ موقع کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شہر اور پارک
۹۔ گنجانیِ آبادی اور افزونیِ قیمتِ زمین کا اثر شہر کی ساخت پر یہ پڑتا ہے کہ گلی کوچے تنگ، اور عمارتیں کئی کئی منزل بلند بنائی جاتی ہیں۔ امریکا میں سات سات منزل تک عمارت اُٹھ چکی ہے۔ روشنی اور پاک و صاف ہوا جو زندگی کے واسطے لازمی ہیں۔ کافی میسر نہیں آتیں۔ باشندوں کی صحت کو مضرت پہنچتی ہے۔ کچھ دنوں سے یہ طریق بہت مروج ہو چلا ہے کہ ہر شہر میں ایک یا زیادہ وسیع پارک بنائے جاتے ہیں جہاں دن بھر کے تھکے ماندے لوگ شام کو آکر دل بہلاتے ہیں۔ سبزے سے آنکھیں ٹھنڈی کرتے ہیں۔ پاک صاف ہوا کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ اکثر جگہ ہفتے میں

حصہ دوم
باب پنجم
۱

ایک یا دو روز بند بھی رہتا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کی تفریح سے دن بھر کے کام کاج کی تکان دور کر کے تازہ دم گھر جاتے ہیں۔ یورپ میں تو شہر شہر پارکوں کی کثرت ہے۔ لیکن اب ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں بھی ان کی ضرورت محسوس ہو چلی ہے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس، بنگلور ایسے مقامات میں جہاں انگریزی آبادی کی کثرت ہے۔ مدت سے کئی کئی پارک موجود ہیں۔ الٰہ آباد میں ایک پارک تیار ہو چکا ہے۔ اور دوسرا زیر تجویز ہے۔ لکھنؤ کا مختصر سا امین آباد پارک بھی بہت پُرفضا ہے۔ اب اس کی توسیع کی جا رہی ہے۔ جس قدر شہروں کی آبادی زیادہ گنجان ہوگی پارک کی ضرورت بڑھتی گی۔ عرفِ عام میں پارک شہر کے پھیپھڑے کہلاتے ہیں اور آبادی کی صحت کے واسطے وہ اسی قدر ناگزیر ہیں جس قدر جسم انسان کے واسطے پھیپھڑے ؛

ٹریم کار کا شہر و ملک کی آبادی اور صحت پر اثر

۱۰۔ ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ٹریم کار کا شہر کی حالت پر بہت مفید اثر پڑ رہا ہے۔ موٹر تو قیمتی بہت، بائیسکل کی معمولی قیمت بھی معمولی لوگوں پر گراں، اور شہر کی تنگ گلیوں اور سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ میں اس کا چلانا خطرناک۔ گھوڑا گاڑی کا کرایہ زیادہ اور ہمیشہ وقت پر ملنا دشوار۔ لیکن ٹریم کار کا حسبِ قاعدہ ہر چوتھے پانچویں یا دسویں منٹ اپنے راستے سے گزرنا یقینی، کرایہ نہایت واجبی، تیز رفتار حسبِ دلخواہ، اور پھر کافی مطیع۔ ستون کے قریب ذرا ہاتھ کا اشارہ کیا کہ کھٹ سے رک گئی۔ اطمینان سے چڑھے کہ چل دی۔ منزل مقصود پر حسب ہدایت چلانے والے نے بلا مہلت روک دی۔ اور چند پیسے دے کر چشم زدن میں میلوں دور، کارخانے، دفتر، کالج، عدالت و دکان، جہاں ضرورت ہوئی پہنچ گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگ کاروباری جگہ کے قرب کے اس قدر خواہشمند نہیں جتنا کہ ٹریم کار جاری ہونے سے پہلے تھے۔ اب بجائے زیادہ گنجان ہونے کے شہر کی آبادی گرد و نواح میں پھیلنے لگی ہے بیرون شہر کی زمینوں میں صرف فاصلے کا نقص تھا سو وہ ٹریم کار نے رفع کر دیا ورنہ بحیثیت آب و ہوا تو یقیناً شہر کی زمینوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ لوگ وہاں بشوق آباد نہ ہوں جس طرح نالیوں سے کسی تالاب کا پانی بہتا ہے۔ ٹریم سے شہر کی آبادی ہر چہار طرف پھیل رہی ہے مضافاتِ شہر کی زمینوں کی قیمت بڑھ رہی ہے اور اندرونِ شہر زمینوں کی قیمت کی رفتارِ ترقی سست پڑ گئی۔ شہر کی گنجانی اور قیمتِ زمین کے

باب پنجم

بعد اضافے کا تشویشناک مسئلہ ٹریم کار نے حسب دلخواہ حل کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کا رواج دوسری سواریوں سے شہر کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔

اضافۂ قیمت زمین کی مقدار

۱۱۔ چونکہ اضافۂ قیمتِ زمین کے اسباب زیادہ تر قدرتی خصوصیات اور معاشی ترقیات ہیں اور مالک کی ذاتی کوشش کو اس میں بہت ہی کم دخل ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اضافۂ قیمتِ زمین کا حقدارِ کلی کون سمجھا جائے۔ اگر کل نہیں تو اضافے کا ایک معقول حصّہ ضرور گورنمنٹ کو ملنا چاہیئے تاکہ تمام ملک کی ترقی اور بہبودی پر صرف کیا جا سکے۔ اسی اصول پر زمینداروں سے مالگزاری اور مکانداروں سے ہاؤس ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ تقسیمِ اضافے کی بحث ہم آئندہ بالتفصیل کریں گے اب زمین کا بیان ختم کرتے ہیں ؛

باب ششم

محنت

(۱) محنت کا مفہوم (۲) محنت کے اقسام (۳) محنت کے خواص (۴) کارگزاری اور اس کے لوازم ؛

محنت کا مفہوم

۱۔ محنت کے اصطلاحی معنوں میں قدیم معاشیین کی کوتہ نظری اس قدر جذب ہو گئی ہے کہ باوجود تحقیق نقص اب تک اکثر مصنّفین پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور محنت کی وہی قدیم ناقص تعریف دہرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مارشل تک نے نہ معلوم کیوں دولت کی تعریف میں محض تقلید پر اکتفا کیا مگر ساتھ ہی اتنا ضرور کیا کہ مروّجہ تعریف کے نقص وخامی کی پوری توضیح کر دی اور کم از کم دوسروں کو اصلاح اور ترمیم کی جرأت دلائی۔ آج سے پچاس برس پہلے تک بہت سے مسائل ناواقفیت اور غلط فہمیوں کے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ آدم اسمتھ کے زمانے تک دولت میں صرف مادّی چیزیں شامل تھیں اور قیمتی دھاتیں مثل سونا چاندی بوجہ دیرپا ہونے کے

بالخصوص اعلیٰ قسم کی دولت مانی جاتی تھیں۔ دولت کے اسی مفہوم کے مطابق محنت سے صرف وہی کام جسمانی یا دماغی مُراد تھے جن کے معاوضے میں کچھ مادّی آمدنی ہو سکے اس میں شک نہیں کہ اب تک محنت کی عام شکل یہی ہے اور آئندہ بھی رہیگی۔ لیکن دولت کے جدید معنے جن کو ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں مدِنظر رکھتے ہوئے محنت کا مفہوم وسیع تر بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یعنی محنت میں وہ کام بھی شمار کرنے چاہئیں جن کے بدلے میں، مادّی آمدنی کے بجائے کوئی لطفِ مسرت جیسی افادے والی دولت حاصل ہو۔ ہم نے مانا کہ اس آخری قسم کی محنت کا حلقۂ عمل تنگ اور مختصر ہے اور ہونا چاہئیے ورنہ نظامِ عالم منقلب ہو جائے۔ لیکن اصولاً محنت کے معنوں میں صرف قسمِ اوّل کے کاموں کو شامل اور قسمِ دوم کو خارج کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ملازم تنخواہ کے لالچ سے خدمت کرتا ہے لیکن ماں باپ کو اولاد کے پالنے میں جو لطف آتا ہے وہ اُس دولت کا افادہ ہے جو بشکلِ مخدومیت بمعاوضۂ محنتِ خدمت حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ ماں باپ کیا لا یعقل ہیں کہ بیکار اپنی جان کھپاتے اور دولت لٹاتے ہیں۔ پھر ملازم کے کام کو محنت شمار کرنا اور والدین کی جانفشانی کو نظرانداز کرنا سراسر بیجا اور خلافِ اصول معلوم ہوتا ہے کھیل کود اور ورزشیں بھی جن کے معاوضے میں قدرت، تفریح، صحت و قوت عطا کرتی ہے۔ فی نفسہٖ محنت ہیں اور مروّجہ محنت سے اس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں کہ ان کا لحاظ کرنا لازمی ہے۔ بیکار پڑا رہنا اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے کہ وہ بشکلِ قیدِ تنہائی ایک سخت سزا تجویز کیا گیا ہے۔ اگر محض جی بہلانے کی غرض سے بیکار آدمی کہیں آئے جائے تو یہ فعل گو بظاہر بے سود نظر آتا ہے مگر درحقیقت وہ ایک تکلیف سے نجات دے کر دل کو آرام پہنچاتا ہے اور محنت میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ اگر کوئی سوال کرے کہ جو لوگ مُفت بیگار میں بہزار ناخوشی کام کرتے ہیں اُن کو تو کوئی بھی معاوضہ نہیں ملتا یعنی نہ مزدوری نہ لُطف۔ ان کا کام محنت کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سطحی دھوکا ہے۔ بیگار نہ کرنے پر جو سزا کی تکلیف پہنچتی اُس سے نجات ملنا گویا کام کا معاوضہ ہے۔ اور بیگاری بھی محنت کرتے ہیں۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب محنت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے، تو آخر وہ

کون کام ایسا ہیں جو محنت نہیں جواب صاف ہے۔ جن کاموں کا معاوضہ نہ ملے وہ محنت
نہیں۔ مثلاً راستہ بھٹکنا، چیز گم کرنا، بات بھولنا، حادثات سے مجروح یا ضائع ہونا۔

یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ جس طرح متقدمین تفریط پر اڑے تھے ہم بھی
افراط کی جانب بڑھے ہیں۔ تاکہ دونوں منتہی دیکھنے سے ناظرین میں وسعت نظر
پیدا ہو اور وہ عقل سلیم سے کام لے کر خیر الامور اوسطہا کے اصول پر خود طے کر سکیں
کہ محنت کا مفہوم کیا ہے اور کس قسم کے کام اس میں شمار ہونے چاہئیں۔ عام قاعدہ
ہے کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے متعلق ہیں ان کے اصول و قوانین کم و بیش
تخمینی اور مذبذب ہوتے ہیں۔ ان میں بھلا علم ہندسہ یا طبیعیات کے اصول و قوانین کا سا
استحکام اور تیقن کہاں۔ یہ دشواری علم معاشیات میں بوجوہات معلومہ خاص طور پر پیش آتی
ہے۔ تحقیق جدید جس قدر وسعت مفہوم کی مقتضی تھی وہ ہم نے بیان کر دی اور محنتی و غیر محنتی
کاموں میں جہاں تک ممکن تھا حد فاصل قائم کر دی لیکن قطعی طور پر ان دونوں قسم کے
کاموں کی کوئی جداگانہ فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ اکثر کام تو محنت ہوتے ہیں۔ بعض
کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے اور معدودے چند محنت سے خارج
کئے جا سکتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا یہ سب مفہوم محنت کی ایک علمی بحث تھی۔ عملاً اس کی اہمیت
کچھ زیادہ نہیں۔ معاشیات میں ہم کو بیشتر ایسی ہی محنت کے اصول و نتائج سے
سروکار ہوتا ہے جس کو عام طور پر سب محنت سمجھتے ہیں یعنی وہ کام جن کا کچھ مادی
معاوضہ ہاتھ آئے۔ والدین عشاق اور شوقین لوگوں کے مشاغل سے ہم کو معدودے چند
مفید مطلب باتیں تحقیق ہوئی ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ بیان کی جائیں گی۔ یہاں وہ اصلی
بحث سے متعلق نہیں ہیں محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں ان کا
ذکر بھی کرنا ضروری معلوم ہوا۔

پس بالفاظ مختصر محنت سے وہ تمام جسمانی اور دماغی کام مراد ہیں جو بغرض
۸ حصول معاوضہ کئے جاویں۔ اکثر یہ معاوضہ بشکل مادی اور کمتر بشکل حظ و لطف وغیرہ
مطلوب ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک محنت کو معاشی جد و جہد سے تعبیر کرنا نہایت
مختصر، جامع اور صحیح تعریف ہوگی۔ معاشی جد و جہد کی تشریح مقدمے میں موجود ہے سعی حاصل

حصّہ دوم
باب ششم
محنت کے
اقسام

اور یہی غیر حاصل سے یہ مفہوم بخوبی ادا ہوتا ہے بجائے غیر مانوس الفاظ کے۔

۲۔ مدت سے محنت کی دو قسمیں چلی آتی ہیں۔ پیدا آور اور غیر پیدا آور یہ تفریق بھی محض قدیم ناواقفیت اور تنگ نظری کی یادگار ہے۔ وہ محنت ہی کیا جو غیر پیدا آور ہو اس سے گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ مگر چونکہ یہ بحث تاریخی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے اور ترقی خیالات کا تمام سلسلہ اس سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ ہم اسکا نسبتاً بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

سترھویں صدی میں تجارتیین کا زمانہ معاشیات کا دور اول خیال کیا جاتا ہے ان معاشیین کے نزدیک صرف سونا چاندی ٹھیٹ دولت تھی اور جس محنت کا معاوضہ براہ راست چاندی سونا ملتا تھا وہ تو پیدا آور تھی اور باقی غیر پیدا آور۔

انقلاب فرانس کے زمانے میں جب فطرآئین کا گروہ نمودار ہوا تو اس نے معاوضے میں سیم و طلا کی شرط تو اڑا دی لیکن صرف زراعت کو محنت پیدا آور اور باقی کو غیر پیدا آور قرار دیدیا اور وجہ تفریق یہ قائم کی کہ تمام پیداوار کا مخزن و منبع زمین ہے۔ باقی تمام پیشے اسی زمین کی پیداوار میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں اپنی ذات سے پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

دولت کی تعریف اور پیدائش دولت کے مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ صنعت کی مدد بغیر زمین کی پیداوار دولت نہیں کہلا سکتی۔ اس کی کافی تشریح کی جا چکی ہے پس جب پیدائش دولت کے واسطے صنعت شرط لازمی ہے تو وہ محنت غیر پیدا آور نہیں ہو سکتی صنعت بھی مثل زراعت محنت پیدا آور ہے۔

حمالی و باربرداری کسی زمانے میں محنت غیر پیدا آور مانی جاتی تھی۔ کیونکہ کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ وہی کی وہی چیز باقی رہتی ہے۔ پھر باربرداری کیونکر محنت پیدا آور ہو سکتی ہے۔ لیکن مفہوم پیدائش کی بحث میں ثابت ہو چکا ہے کہ پیدائش کی ایک حالت محض نقل مقام ہوتی ہے۔ کان کنی اور باربرداری میں فرق ہے۔ صرف یہی نہ کہ ایک معدنیات کو غار سے سطح زمین پر لاتی ہے۔ گویا حرکت عمودی ہوتی ہے اور دوسری ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں پہنچاتی ہے۔ گویا حرکت افقی ہوتی ہے صرف حرکات کی سمت میں فرق ہے۔ ورنہ نتیجہ دونوں

کاموں کا ایک ہی ہے یعنی ایک ایسے مقام سے جہاں چیز ناکارہ پڑی ہے یعنی صفتِ دولت سے معرّا ہے ایسی دوسری جگہ لیجانا جہاں وہ کار آمد ہو کر دولت بنجائے۔ دونوں کاموں سے محض بذریعۂ نقلِ مقام دولت پیدا ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ کہ کان کنی تو محنتِ پیدآور ہو اور باربرداری نہ ہو۔ اگر زمین کی پیداوار زمین ہی پر چھوڑ دی جائے اور مصنوعات کارخانوں میں انبار ہوتے رہیں اور منڈی تک نہ لائے جائیں تو کسی طرح یہ دولت نہیں شمار ہو سکتے۔ نقلِ مقام اُن کے دولت بننے کی شرطِ لازمی ہے اور خصوصاً اس زمانے میں تو باربرداری پیدائشِ دولت میں بحیثیت دوسرے کے بدرجۂ اولیٰ محنتِ پیدآور کہلانے کی مستحق ہے۔

کسی زمانے میں تجارت اور باربرداری دونوں کام ایک ہی شخص کے متعلق تھے۔ تاجر اپنے ذاتی اہتمام اور نگرانی سے مال شہر بشہر لیئے پھرتے تھے۔ مگر معاشی ترقیات کی بدولت اب یہ دونوں کام جدا ہو گئے۔ تاجر اپنی دُکان سے مال روانہ کرتے ہیں اور دُکان پر وصول کرتے ہیں۔ باربرداری کا کام اب ریلوے کمپنی نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ باربرداری تجارت سے اس قدر وابستہ ہے جیسے چولی سے دامن اور جسم سے روح۔ باربرداری کا باعث اور غرض تجارت نہیں تو اور کیا ہے۔ پس جب باربرداری محنتِ پیدآور قرار پاچکی تو اُس کی روحِ رواں یعنی تجارت اُس سے بڑھ کر محنتِ پیدآور ۲۱
سمجھنی چاہیئے۔ زراعت، صنعت، باربرداری اور تجارت درحقیقت ایک ہی عملِ پیدائش کے لازمی حصے ہیں اور ہر ایک بطورِ خود محنتِ پیدآور ہے۔

لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدماتِ عامّہ بھی محنتِ پیدآور ہو سکتی ہیں۔ ۲۲
مثلاً جج جو فیصلے لکھتا ہے، ڈاکٹر شگاف دیتا ہے، طبیب دوا تجویز کرتا ہے، پروفیسر لڑکے پڑھاتا ہے، اڈیٹر اخبار، رسالے چھاپتا ہے، مصنف کتابیں لکھتا ہے۔ ان کاموں سے کیا دولت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں اوّل تو مقدمے سے ان خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے۔ لہذا محنتِ پیدآور ہیں۔ کیونکہ افادے اور مبادلہ پذیری کے ہوتے ہوئے غیر پیدآور ہونے سے اجتماعِ ضدّین لازم آتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تقسیمِ عمل کے اصول پر کام کی بیشمار قسمیں تو پیدا ہو گئیں لیکن وہ ایک دوسرے سے یوں منسلک ہیں کہ کسی ایک کا بھی باقی سے جدا کرنا محال ہے۔

شغم اگر انسان تمام پیشیوں کے باہمی تعلق پر غور کرے تو وہ ہر ایک کو باقی تمام کا جزوِ ضروری پائیگا۔
تحقیق ہوا ہے کہ جو روٹی ہم کھاتے ہیں اس کی تیاری سے براہ راست اور بالواسطہ
تین سو پیشے متعلق ہیں۔ حتیٰ کہ ادیب و شعرا اور تمام علوم کے حکما جو ملک میں پاکیزہ خیالات
عمدہ جذبات اور بیداری پیدا کرتے ہیں۔ طرح طرح کے مفید معلومات پھیلاتے ہیں
وہ بھی روٹی کے اہتمام میں کم و بیش شریک ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی کا تعلق
قریبی ہے اور کسی کا بعید کسی کا ظاہر کسی کا پوشیدہ۔ مگر سلسلۂ تعلق میں سب تسبیح کے
دانوں کی طرح پروئے ہوئے ہیں جدا ایک بھی نہیں۔

(۲۱) تفصیل بالا سے واضح ہوا کہ تمام قسم کی محنت پیدا آور ہے۔ اگر کوئی کام غیر پیدا آور
ہے تو محنت ہی کہاں رہا پس محنت پیدا آور اور غیر پیدا آور کی تفریق سراسر بے معنی ہے۔
لیکن کسی زمانے میں جبکہ پیدائش کا مفہوم صاف نہ تھا محنت کی یہ تفریق بہت اہم
خیال کی جاتی تھی یہ خیال کرنا بیجا ہوگا کہ مذکورۂ بالا خامیوں سے متقدمین کی علمیت پر کچھ
الزام آتا ہے کوئی علم دنیا میں کامل ہو کے نہیں آتا بلکہ صدہا سال کی مسلسل کوشش سے
بتدریج ترقی پاتا ہے۔ اور خواہ کسی درجے پر پہنچ جائے لیکن جو متقدمین کسی علم کی بنا
ڈالتے ہیں اور جہالت کی ابتدائی تاریکی سے نکال کر دنیا سے متعارف کرتے ہیں ان کا
نمبر کسی دوسرے کو کب نصیب ہوسکتا ہے جن علما کی تنگ نظری کا ہم نے ذکر کیا
ہے انھوں نے اپنی قابلانہ تحقیق سے اس علم میں بیش بہا معلومات کا اضافہ کرکے اگر
سچ پوچھو تو دنیا پر احسان کیا ہے۔ اُن کے علمی خیالات میں جو آجکل خامیاں نظر آتی ہیں
آئندہ چل کر موجودہ خیالات میں اس سے بڑھ کر نقص نکالے جائیں گے۔ یہ تو ترقیٔ علم
کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس سے کسی کی قابلیت پر حرف نہیں آتا۔

محنت کی ایک تقسیم اور بھی کی گئی ہے محنت بامہارت و بے مہارت
دونوں قسموں کے کچھ خواص مقرر نہیں۔ صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ جس کام کے
سیکھنے میں کچھ وقت اور ذہانت درکار ہو وہ بامہارت کہلاتا ہے۔ اور جو بلا غور جلد آجائے
وہ بے مہارت لیکن ان دو قسموں کے درمیان کوئی بیّن اور مستقل حدِ فاصل قائم نہیں
ہوسکتی۔ علمی اخلاقی اور معاشی پس ماندگی اور ترقی کے مطابق ان کے حلقوں میں کام داخل
یا خارج ہوتے رہتے ہیں چنانچہ گاؤں کی محنت بامہارت قصبے میں بے مہارت اور

حصۂ دوم باب ششم

قصبے کی با مہارت شہر میں بے مہارت شمار کی جاتی ہے۔ درزی کی محنت فرض کرو گاؤں میں معمولی کُرتہ پاجامہ، قصبے میں اچکن انگرکھا۔ اور شہروں میں فیشن ایبل کوٹ، پتلون، محنت با مہارت سمجھے جاتے ہیں اس طرح گاؤں میں ہل، چرخہ۔ قصبے میں صندوق، چوکی، اور شہروں میں خوشنما میز کرسی، بڑھئی کی محنت با مہارت مانی جاتی ہے عام شناخت تو وہی ایک ہے۔ سیدھا سادہ آسان کام بے مہارت اور دقیق و دشوار با مہارت۔ البتہ ترقی کے ساتھ آسانی اور دشواری کے معیار بدل جاتے ہیں اور اسی کے مطابق کام داخل خارج ہوتے رہتے ہیں۔ محنت کا مفہوم اور اس کے اقسام بیان ہو چکے۔ اب ہم ضروری خواص بتانا چاہتے ہیں۔

محنت کے خواص

۳۔ (۱) جب کوئی شخص مکان تعمیر کراتا ہے، باغ لگاتا ہے، ہاتھی گھوڑے وغیرہ جانوروں کے سدھانے میں روپیہ صرف کرتا ہے۔ یا کوئی قیمتی مشین خریدتا ہے تو وہ جس چیز پر روپیہ صرف کرتا ہے اُس کا پورا مالک ہوتا ہے اور اُس کے استعمال یا فروخت سے اپنی لاگت وصول کر سکتا ہے لیکن جو روپیہ انسان کی تعلیم اور تربیت پر صرف کیا جاتا ہے اُس کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ ماں باپ محض فطری محبت کے جوش میں اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر ہزار ہا روپیہ لٹا دیتے ہیں۔ لیکن اُن کو اس مصارف کی واپسی کا کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا اگر اولاد اہل ہو تو شاید اپنی کمائی سے بوڑھے والدین کی خدمت کرے ورنہ والدین تمام عمر کی کمائی اور محنت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً جب سے رسم غلامی بند ہوئی اور شخصی آزادی نے زور پکڑا۔ ہر کوئی خود مختار بن بیٹھا کسی کی ملک ہونا تو درکنار اب انسان سوائے قانون کے کسی کا مطیع نہیں رہا۔ جب یہ حالت ہے تو غیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی کی تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کریں۔ چنانچہ حیوانات، نباتات، مکانات، آلات اور دیگر مادی سامان کی اصلاح و ترقی میں روپیہ جس قدر بے دریغ صرف کیا جاتا ہے تعلیم و تربیت کے خرچ میں اُسی قدر بخل کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصارف اول الذکر کی بنا منفعت طلبی ہے۔ اور آخر الذکر کی محبت و انسانی ہمدردی، اور ان دو جذبات کی قوت اور وسعت عمل میں زمین آسمان کا

فرق ہے۔ محبت اور ہمدردی سے پاک جذبات تو کمتر دلوں میں بستے ہیں۔ مگر منفعت طلبی و ذاتی خواہش کسی دل میں کمی نہیں۔ پس جن مصارف میں منفعت طلبی داخل ہے اُن کی کثرت ہے اور جو محض ہمدردی پر مبنی اُن کی قلت۔

جو روپیہ غیروں کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اُس کی واپسی میں قانون سے مدد لی جا سکتی ہے مگر وہ مدد بھی پوری کارگر نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص وظیفے سے تعلیم حاصل کر کے اس کی واپسی میں تساہل کرے، تو اُس سے روپیہ وصول کرنا بہت دشوار ہے۔ البتہ وہ حیران و پریشان کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی وظائف کی واپسی زیادہ تر نیک نیتی اور خوش معاملگی پر منحصر ہے نہ کہ جبر اور قانونی کارروائی پر۔ اگر وظائف جائداد کی ضمانت پر دیئے جائیں تو جب جائداد ہوتے ہوئے وظیفے کی حاجت کیا۔ وظیفے کی غرض تو نادار اور ذہین طلبہ کی امداد ہے۔ جائداد کی ضمانت سے گویا وظیفے کی اصلی غرض فوت ہوتی ہے۔ اور اگر ضامن طلب کئے جائیں تو وظیفہ چاہنے والے حیثیت کے لوگوں کو ضامن میسر آنا معلوم۔ غرضکہ وظیفہ عاریتہً محض اعتماد پر دیا جاتا ہے یا مفت بطور ہمدردی۔ مثل اور مصارف کے وظائف کا دینا کبھی کاروباری حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کا تو ذکر کیا ہے انگلستان سے بیدار اور ترقی یافتہ ملک میں جہاں گورنمنٹ اور قوم کی جانب سے بیشمار روپیہ عوام کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے نادار طلبہ کو تعلیم میں خاص دقتیں پیش آتی ہیں اور وہاں بھی زیادہ تر والدین ہی کو تعلیمی مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان انسان ہے اور ذاتی منفعت کا شوق محبت و ہمدردی کے جذبات پر غالب ہے۔ ممکن نہیں کہ تعلیم و تربیت پر روپیہ ایسی بے تکلفی سے خرچ کیا جائے جیسا کہ پرورش حیوانات۔ باغات اور تعمیر عمارات و خرید آلات پر۔ اور وجہ صرف وہی ہے جو بیان کی گئی کہ انسان آزاد ہے اور اپنے فعل کا مختار۔ وہ اپنی محنت بمعاوضہ اُجرت فروخت کر دیتا ہے مگر خود اپنی ملک رہتا ہے۔ مشین کی طرح وہ محنت خریدنے والے کے ہاتھ خود نہیں بک جاتا۔

حصہ دوم
باب ششم

اور نہ اُس کی محنت پر خریدار کو مشین کے کام کی طرح پورا اقتدار ہے۔ جب مزدور اس قدر آزاد اور مختار ٹھہرا تو اُس کی تعلیم و تربیت میں منفعت کی غرض سے روپیہ لگانا بعینہٖ ایسا ہے کہ کوئی کسان جس کو زمیندار جب خواہ بٹائی سے بے دخل کرسکے۔ اپنے کھیت کی درستی میں لاگت لگائے۔

مذکورۂ بالا خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت میں سخت دقت پیش آرہی ہے۔ اس کا زیادہ تر دارومدار والدین کی کوشش پر ہے۔ مگر بہت سے بچے کم عمری میں والدین کے ظلِ عاطفت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہت سے والدین اس قدر نادار ہوتے ہیں کہ تعلیم تو درکنار اولاد کا روٹی کپڑا ہی بارِ گراں ہوتا ہے بہت سے والدین اس قدر بے مہر اور دولت پرست ہوتے ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر کافی روپیہ صرف کرنا گوارا نہیں کرتے بہت سے اس قدر کم عقل اور ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں کہ محبت میں اندھے ہو کر اولاد کو بیجا صرف ... اور بدالطوار بنا دیتے ہیں اور جو تھوڑے باقی بچے وہ البتہ دُنیا کے حالات سے باخبر، اولاد کے سچے بہی خواہ اور روپے کے صحیح مصرف سے واقف ہوتے ہیں ... اپنی اولاد کو خاص اہتمام سے تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ دُنیا میں عزت و ناموری کی زندگی بسر کرسکے۔

(ب) تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کرنے میں ایک اور مشکل بھی ... ہے۔ وہ یہ کہ اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کے واسطے بہت سا وقت اور روپیہ درکار ہے۔ پھر اگر کوشش میں کمی رہ جائے یا استعداد ناقص ہو یا حالات ناساعد پیش آجائیں تو وقت اور صرف سب اکارت جاتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے اکثر کی تو ہمت ہی نہیں بندھتی اور کوشش کرنے والوں میں بھی صرف تھوڑے سے تو منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔ باقی سب تھک کر منزل و منزل پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر خوش قسمتی سے کوئی بصد کوشش بہت سا بیش بہا وقت اور مقدارِ کثیر صرف کر کے کمال حاصل کرتا ہے اور کسی کام کے قابل بنتا ہے تو اُس کی زندگی کا ایک لمحہ اعتبار نہیں خواہ سالہا سال قابلیت سے فیض پہنچائے۔ فائدہ اُٹھائے خواہ اسکو اچھوتا

اپنے ساتھ قبر میں لے جائے۔

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
یعنی تعددو دن بہار جانفزا دکھلا گئے

گویا انسانی تعلیم و تربیت مثل ایک لبِ دریا کاشت کے ہے کہ جس کے طغیانی سے تباہ ہو جانے کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے۔

(ج) محنت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مزدور سے جدا نہیں کی جاسکتی یعنی جہاں محنت درکار ہوتی ہے مزدور کا اپنی ذات سے وہاں موجود ہونا لازمی ہے۔ برخلاف اس کے دیگر عاملین پیدائش یعنی زمین و اصل اکثر اپنے مالک سے جدا رہتے ہیں۔ زمیندار کی زمینیں بہت سے گاؤں میں صرف کاشت رہتی ہیں۔ اور زمین تو غیر منقولہ ہے۔ اصل کو دیکھئے کہ وہ مالک سے جدا رہکر ہر جگہ کام کرسکتا ہے۔ اُن یوروپینوں کا کڑوڑہا روپیہ کا قیمتی اصل ہندوستان میں لگا ہوا ہے جنہوں نے سوا نقشے کے ہندوستان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مگر خاص محنت اُن کی ذات سے وابستہ ہے جسم سے سایہ جدا ہوسکتا ہے۔ مگر مزدور سے محنت جدا نہیں ہوتی۔ اس خصوصیت کا اثر محنت کی مقامی نقل و حرکت پر بہت پڑتا ہے۔ کبھی گھر کی محبت کبھی آمد و رفت کی دقت۔ کبھی نئے ممالک کی آب و ہوا کی ناموافقت کبھی زبان و معاشرت کی نا۔ تفہیمیت کبھی خریدار محنت یعنی آجر کی سخت گیری و تند مزاجی۔ کبھی خود پیشے کی ناخوشگواری۔ اور اسی قسم کی بہت سی مزاحمتیں نقل محنت میں پیش آتی ہیں اور مزدور وطن چھوڑنے کی وجہ سے دور افتادہ مقامات میں جانے اور اعلےٰ اُجرت حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ محنت نہ تو مانند زمین قطعاً غیر منقولہ ہے ورنہ اصل کی مانند سریع الانتقال منقولہ ضرور ہے مگر مزدور کے ساتھ۔ اور برخلاف زمین و اصل کے مزدور کی ذات سے جدا نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ خصوصیت محنت کی نقل و حرکت میں مزاحم ہوتی ہے۔

(د) مزدور کی چوتھی کمزوری یہ ہے کہ اُس کو محنت کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس کی دو وجہ ہیں۔ اوّل تو وہ اس قدر خوشحال نہیں کہ کچھ روز بھی بیکار بیٹھ کر فراغت اور اطمینان سے بسر اوقات کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ بیکاری کے نام سے وہ سہم جاتا ہے۔ اکثر کی تو حالت یہ ہے کہ کچھ کمایا تو روزی ورنہ روزہ۔ دوسرے اگر مزدور کو کچھ استطاعت بھی ہو۔ تو بیکار پڑے رہنے سے اس کی کاریگری اور مہارت کو بٹہ لگتا ہے۔ ہاتھ میں وہ پہلی سی صفائی اور تیزی نہیں رہتی۔ کام سے دل اُچاٹ سا ہو جاتا ہے۔ مزدور اگر کام چھوڑ بیٹھے تو اُسکی حالت بھی کچھ دنوں میں ایسی ہو گی جیسے کہ بیکار پڑے پڑے مشین کو زنگ لگ جاتا ہے۔ گویا مزدور کے واسطے یہ ضروری اور مفید ہے کہ وہ اپنے کام سے لگا رہے۔ البتہ کبھی کبھی آرام لینا دوسری بات ہے۔ اس خامی کا نتیجہ یہ ہے کہ آجر کے مقابل مزدور کمزور بلکہ بے بس ہو جاتا ہے۔ اُجرت کے معاملے میں پوری آزادی سے ردّ و قدح نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ملتا ہے اکثر اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ البتہ کچھ روز سے اس فرقے میں جان پڑنی شروع ہوئی ہے اور خصوصاً انجمنہائے اتحادِ مزدوراں مزدوروں کی بہت حمایت کر رہی ہیں اور اُن کی مالی حالت سدھارنے کی تدابیر نکالنے میں بہت سرگرمی سے مصروف ہیں۔ چنانچہ ہم آگے چل کر اس واقعے کی مختصر تفصیل پیش کریں گے ؂

مس۔ زراعت حسبِ قوانینِ قدرت پیدا ہوتی ہے بلند ... بھی ایک معمول پر چلتی ہے مگر محنت کی حالت جداگانہ ہے۔ اس میں مزدور کی مرضی کو بھی دخل ہے۔ مزدور اگر چاہے تو باوجود تاکید و نگرانی کام سست کرے بگاڑ دے، اور چاہے تو بحالت آزادی کام جلد سے جلد اور عمدہ سے عمدہ کر دکھائے۔ مزدور کو سرزنش اور جرمانے کے ذریعے سے قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترقی اور انعام کے لالچ سے کام کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن فی نفسہٖ مرضی کا عمل محنت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ سنگر مشین ایک سا بخیہ کرتی ہے۔ لیکن وہی درزی ایک ہی کپڑے کا عمدہ سے عمدہ اور خراب سے خراب لباس قطع کر سکتا ہے۔ گویا محنت مزدور کی مرضی کے تابع ہے۔ چنانچہ مقولہ ہے کہ

مزدور بخوشی دل کند کار بیش۔ اور یہی وجہ ہے کہ قانوناً اسکا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔

(۳) محنت پر بھی قدرت نے وقت کی پابندی کئی طرح پر لازم کردی ہے۔ اول تو طوالت عمر کا حال سنئے یورپ کی مردم شماری کے تازہ ترین اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ ایک چہارم بچے چھ سال کی عمر تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان کو شامل کر کے سو برس کی عمر تک مرنے والوں کی تعداد نصف کے قریب ہوتی ہے۔ ایک ثلث (۲۵) اور ۶۰ سال کے درمیان مرجاتے ہیں اور ۶۰ سال سے تجاوز کرنے والوں کا اوسط صرف ایک فی صدی پڑتا۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اس مختصر عمر کا کتنا حصہ محنت میں صرف ہوتا ہے۔ ابتدائی چھ سات سال تو بچپن کے کھیل کود کی نذر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تعلیم شروع ہوئی۔ اگر استعداد مناسب ہو کوشش کافی کی جائے، اور حالات بھی مساعد ہوں تو آجکل کم از کم بیس سال۔ اور زیادہ سے زیادہ تیس سال کی عمر تک تکمیل تعلیم و تحصیل فن سے فارغ ہو کر انسان کام کے قابل بنتا ہے۔

مزدور کل تو ہے نہیں کہ رات دن چلے اور تھکنے کا نام نہ لے۔ کھانا، پینا، سونا بہر تفریح اس کی قیام صحت کے واسطے لازمی ہیں۔ اگر قانون قدرت کی خلاف ورزی کریگا جلد سزا پائیگا اور پچھتائیگا تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ بالعموم صحت کو مضرت پہنچائے بغیر تندرست انسان آٹھ گھنٹے روزانہ سے زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ ہفتہ وار ایک روزہ تعطیل اور متفرق تعطیلات کا مجموعہ تین ماہ اور بعض محکموں مثلاً تعلیمات میں چار مہینے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ علالت اور اتفاقی ضروریات کی رخصتوں کا اوسط بھی سال میں ایک مہینے سے کم نہیں پڑتا۔ مذکورۂ بالا حساب سے کل وقت جو جزواً جزواً محنت میں صرف ہوتا ہے سال میں ڈھائی ماہ کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتا بلکہ بعض پیشوں میں اس سے بھی کم بیس پچیس سال کی عمر میں لوگوں نے کام شروع کیا۔ پچاس سال کے بعد سے ضعف پیری کے ہاتھوں جلد ناکارہ بن کر بحالت ملازمت مستحق پنشن قرار پاگئے۔ ورنہ اندوختہ پر بیکاری کی زندگی بسر کرنے لگے۔

غرضکہ اوقات کی مذکورہ پابندی نے محنت کی مقدار بہت گھٹا دی، اور معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ صرفِ محنت کی بیشمار راہیں پیدا ہوگئیں۔ گویا یہ ہمہ محنت ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور بیکار مزدور روزگار کے جویا نظر آتے ہیں۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں باعثِ تشویش بنا ہوا ہے۔ اجرت اور ترقیِ آبادی کے تحت میں ہم بھی اس سے مزید بحث کریں گے۔

کارگزاری اور اس کے لوازم

۴۔ سخت محنت خواہ جسمانی ہو یا دماغی بلا اکراہ و تکان دیر تک برداشت کرنا، کام میں سمجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور ہوشیاری دکھلانا۔ غرضکہ طاقت، چستی، استقلال، تندہی اور ہوشیاری ایسے صفات جو عمدہ مزدور کا باعثِ امتیاز ہوتی ہیں بمجموعہٗ کارگزاری کہلاتی ہیں۔ مہارت اور کارگزاری دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جو قابلیت کسی ایک کام سے مخصوص ہو مثلاً جراحی، مصوری، انجنیری، یا درزی کی فیشن ایبل تراش، مہارت کہلاتی ہے۔ مگر جو صفات ہر ایک کام کی عمدگی کے واسطے عموماً لازمی ہیں۔ وہ کارگزاری میں شامل ہیں۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا حالات خاص طور پر کارگزاری کی ترقی کیواسطے مناسب اور مساعد ہیں۔

(۱) سب سے مقدم آب و ہوا اور موسم کا اثر ہے۔ انتہا درجے کی گرم اور سرد آب و ہوا اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا کارگزاری پر مضر اثر ڈالتا ہے۔ منطقۂ حارہ میں سخت محنت خصوصاً جسمانی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جاتی اور نہ اتنی اس کی ضرورت بھی ہے۔ بوجہ کثرتِ نباتات زمین کی پیداوار سے بلا محنت غذا حاصل ہو جاتی ہے۔ گرمی میں اتنا کپڑا کافی کہ بدن ڈھک جائے گھنے درختوں کے ٹھنڈے سائے سے زیادہ آرام کہاں مل سکتا ہے۔ [illegible] رکھنے کو ایک جھونپڑا کافی۔ گرم اور خشک ممالک کی زندگی بھی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ بوجہ قلتِ پیداوار۔ وہاں کی ضروریات بھی احتیاجِ زندگی سے آگے کم بڑھ سکتی ہیں۔ چنانچہ منطقۂ حارہ کی معاشی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آتی ہے اور غالباً کبھی قابلِ لحاظ تغیر واقع نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح پر منطقۂ باردہ میں بوجہ شدتِ سردی و کثرتِ برف، نہ زمین سے پیداوار ہوتی ہے، نہ باشندوں کو محنت کا موقع ملتا ہے۔ مہینوں جھونپڑوں میں بند رہکر

حصہ دوم
باب ششم

خدا جانے جانوروں کے گوشت پر کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ریگستان اور برفستان کبھی زراعت، صنعت وحرفت، تجارت اور دیگر معاشی ترقیات کے مرکز بن سکیں۔ موسم جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی کیواسطے مُضر ہے۔ ہندوستان میں تین موسم ہوتے ہیں۔ کبھی تڑاقے کی گرمی۔ کبھی کڑاکے کا جاڑا۔ اور کبھی موسلادھار بارش۔ طبیعت ایک موسم کی عادی نہیں ہونے پاتی کہ دوسرے کی پیروی لازم ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوئی کہ تیسرا موسم آپہنچا۔ غرضکہ تمام سال اسی ردوبدل میں ختم ہو جاتا ہے۔ طبیعت کو کبھی سکون اور یکرنگی میسر نہیں آتی نتیجہ کمزوری اور اضمحلال ہوتا ہے۔ چنانچہ علاوہ دیگر اسباب کے تغیرات موسم بھی ہندوستانیوں کی آرام طلبی کا باعث خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ تو عام تجربہ ہے کہ تبدیلی موسم کے زمانے میں کم از کم ہفتہ عشرہ طبیعت کند اور کسلمند ضرور رہتی ہے۔ اور بارش و سرما کے وسطی زمانے میں بوجہ گرمی و رطوبت ملیریا اور ہیضہ اکثر مقامات میں بلا ناغہ ہر سال پھیلتا ہے۔ چونکہ طبیعت پورے طور پر عادی نہیں ہوتی۔ ہر موسم کی شدت سے [illegible] ہوتی ہے۔ جون جولائی میں ہاتھ سے پنکھا اور گلاس نہیں چھوٹتا۔ ہر شخص کسی تاریک کوٹھری میں دن بھر خاموش پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ صبح کی خنکی میں سب ضروری کام کر لئے جاتے ہیں یا غروب آفتاب کے قریب لوگ گھر سے نکلتے ہیں۔ دوپہر کو شہر بھر میں ہُو کا عالم ہوتا ہے۔ بارش میں سوائے زراعت کے کھلے میدان کے اکثر کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ہوا کی خرابی محنت کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ البتہ جاڑے کے چار مہینے کام کاج کے واسطے نہایت مناسب ہیں۔ اسی موسم میں عدالتیں، دفاتر، اسکول، کالج، فیکٹریاں، کارخانے، منڈیاں اور بازار آباد اور مصروف نظر آتے ہیں۔

اس کے برعکس منطقہ معتدلہ خصوصاً شمالی حصے کے ممالک میں خوشگوار آب وہوا اور یکرنگ موسم بدن کو چست اور طبیعت کو قوی و بشاش رکھتے ہیں۔ [illegible] پسینہ آئے۔ نہ بدن ٹھٹھرے۔ بہت دیر تک محنت کی تکان محسوس [illegible] موسمی تغیرات نہ طبیعت کو پراگندہ کریں نہ محنت میں حارج ہوں۔ سال [illegible] یکساں [illegible] ہے پیداوار زمین کی نہ اس قدر [illegible]

حصہ دوم
باب ششم

کرسکے مشہور ہے کہ اس قدر قوت کہ مجبوراً بن بیٹھے - بلکہ اس کی مقدار ایسی مناسب ہوتی ہے کہ عمل پیدائش میں محنت اور سرمایہ کو بھی حصہ لینے کا کافی موقع مل جاتا ہے - حاصل کلام یہ کہ منطقۂ معتدلہ کارگزاری کی نشوونما اور معاشی ترقیات کیو سطے نہایت موزوں ہے - منطقۂ حارہ کا اثر اور منطقۂ باردہ [illegible] کا تاریخی واقعات اس اصول پر بالاتفاق شاہد ہیں ۔

(ب) آب وہوا اور موسم کا اثر گو دیکھنے میں تمام عالم نباتات تک پہنچتا ہے سب سے اول غور کرنا چاہیے کہ وہ زمین سے پیدا ہوتی ہیں [illegible] جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے پیداوار زمین کی نوعیت بیشتر آب وہوا اور موسم سے وابستہ ہے - ہندوستان کا میوہ افغانستان میں نہیں پھلتا اور گیہوں کا [illegible] سب دکن میں و برار کی عمدہ روئی ہندوستان بھر میں نہیں ہوتی - جوٹ کی کاشت مشرقی بنگال تک محدود ہے - کھجور ریگستان کی نعمت ہے - اور ایسا ہی حال تمام نباتات کا ہے - ہماری خوراک نباتات سے مرکب ہے اور نباتات کے خواص مختلف - بعض میں مادۂ نشوونما بہت زیادہ بعض پر متوسط - بعض میں بہت کم - اسی طرح پر بعض مفید اور معاونِ صحت ہیں - بعض مضر اور مخرب - افغانستان میں میوے کی وہ کثرت کہ کھائے نہیں چکتا اور قریب ہی راجپوتانے میں جوار باجرہ نعمتِ عظمیٰ سمجھا جاتا ہے اور ان دونوں غذاؤں کا فرق باشندوں کی حالتِ جسمانی سے صاف ظاہر ہے - مدراس اور بنگال کی غذا عام طور پر چاول مچھلی ہے - یہ دونوں پانی کی مقدار بڑھا کر خون کو رقیق اور اُسکی حرارت کو کم کر دیتے ہیں - لیکن چونکہ گندھک کا جزو غالب ہے دماغ کو خاص طور پر تقویت پہنچاتے ہیں - چنانچہ بنگالی نہایت ذہین و طباع دیکھنے میں آئے ہیں مگر جسمانی محنت سے کمتر مانوس ہوتے ہیں - برعکس اس کے پنجاب کی خوراک گیہوں اور گوشت دونوں چیزیں خون میں فولادی ذرات پیدا کر کے حرارت بڑھاتی ہیں جسم کو قوی کرتی ہیں - چنانچہ بالعموم پنجابی لوگ ذہین تو کچھ ایسے ہی، مگر اکھڑ، غصیل، جفاکش خاص طور پر ہوتے ہیں - [illegible] اور خشکیات کی کثرت سے دکن میں اکثر لوگ ضعیف و ناکارہ ہو جاتے ہیں -

زب دیکھنے میں کیسے دُبلے پتلے مگر چونکہ اُن کی غذا عموماً گرم خشک ہوتی ہے اُن کے پٹھے فولاد سے مضبوط اور دل شیر کا سا قوی ہوتا ہے۔ اسکے برعکس سرد تر چیزوں کی کثرتِ استعمال سے بنیوں کے جسم خمیر کے مانند پھول کر کس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ صحت و قوت کا دارومدار خاص طور سے خوراک پر ہے۔ اور خوراک مقامی آب وہوا اور موسم سے مخصوص ہوتی ہے۔ پس آب وہوا کارگزاری پر بذریعۂ خوراک بھی بہت قوی اثر ڈالتی ہے۔ اور کسی مُلک میں عمدہ نباتات کی کثرت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ؛

ریل اور جہازوں نے ہر ایک پیداوار تمام دنیا میں پھیلا دی ہے گوشت جیسی جلد سڑنے والی چیز کو طرح طرح کے مصالحے لگا کر اور پھل جیسی گلنے والی چیز کو شہد و شراب میں ڈال کر ہزاروں میل لے جاتے ہیں اور مہینوں رکھ کر کھاتے ہیں۔ علم نباتات کے زور سے غیر ملکوں کی چیزیں بھی بو سکتے ہیں۔ چنانچہ ولایت میں غیر ملکوں کے پھل اور ترکاریاں بند مکانات میں عارضی گرمی کی مدد سے پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر ان ترکیبوں سے قدرتی پیداوار کی سی کثرت کہاں ہو سکتی ہے۔ صرف امرا دولتمند اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ عوام کو تو خواب و خیال میں بھی وہ چیزیں میسر نہیں آتیں ؛

(ج) خوراک کے بعد لباس اور مکان قابلِ غور ہیں۔ سرد ممالک میں ان کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر حسبِ ضرورت میسر نہ آسکیں تو [illegible] کا اندیشہ قوی ہو جاتا ہے۔ گرم ممالک میں کپڑا صرف بقدرِ ستر پوشی درکار [illegible] اگر گھنے درختوں کی کثرت ہے تو اُن کے سائے میں جنت [illegible] ورنہ دھوپ سے بچنے کے لئے جھونپڑے کافی ہیں۔ [illegible] کے برابر محفوظ اور مضبوط مکان کی ضرورت نہیں لیکن اگر مو[illegible] لباس و مکان اس قدر ضروری نہیں کہ اگر میسر نہ آسکیں تو صحت خراب ہو جائے۔ جب بارش نہ ہوتی اور سردی [illegible]

حصہ دوم
باب ششم

حمام اور مفلس ہمارے قصبوں اور شہروں کی سڑکوں کے کنارے [illegible]
دھرم شالوں [illegible] مسافر خانوں کے پختہ چبوتروں پر خواب راحت کا وہ لطف
اٹھاتے ہیں جو امرا کو نرم بستروں پر خواب ہی میں میسر ہو سکتا [illegible] ان کو تہبند کی
ضرورت ہے اوڑھنے کی۔ وہی ایک کپڑا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ ہر حال میں
[illegible] غریب لوگ بھی مکان اور لباس میں زیادہ صرف کرنے پر مجبور ہیں۔
[illegible] کرتا اور ٹوپی وہ بھی روئی نہیں بلکہ [illegible] گاڑھے [illegible]
[illegible] کا [illegible] لباس اور ایک چھوٹا سا پختہ یا کچا مکان [illegible]
ہے جو تا دم مرگ [illegible] یا تہوار پر پہنتا ہے۔ اگر کوئی شخص
[illegible] ہے راستے بھر ہاتھ میں لٹکا کر لے جاتا ہے اور صرف [illegible]
کے قریب [illegible] پاؤں میں ڈال لیا کرتا ہے۔ شہروں کی حالت
[illegible] مختلف ہے۔ وہاں پر غربا جن کا کوئی ٹھکانا نہیں [illegible] جیسے [illegible]
کر انکم [illegible] بچا لیتے ہیں تاکہ کرایہ دے کر کسی پینی بیڈ [illegible]
[illegible] شدت سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ اب ان پینی بیڈ [illegible]
کیفیت سنئے۔ یہ عموماً زمین دوز کوٹھریاں یا تہ خانے ہوتے ہیں جن میں پیال
یا [illegible] کوئی گھاس بچھی ہوتی ہے۔ اکثر ان میں سردی ہوا کی آمد و رفت
کے واسطے کافی دریچے بھی نہیں ہوتے۔ شام کو صد ہا غریب پینی بیڈ روم
کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ بوڑھے بچے جوان مرد عورت کی کوئی تفریق
نہیں ہوتی سب اسی گھاس پیال کے اوپر [illegible] کی طرح ایک دوسرے سے
[illegible] ہوئے سو رہتے ہیں۔ صبح کو منتشر ہو جاتے ہیں۔ خیال کرو
[illegible] ملک کے غربا کی رات [illegible] کس قدر راحت سے
[illegible] اور اس فرق کا باعث آب و ہوا [illegible] تم نہیں [illegible] ہے۔ اب مزدور
[illegible] جسم کو گرم [illegible] کے واسطے لازم ہے
[illegible] بھی سردی [illegible] کے واسطے ضروری
[illegible] قدر پختہ ہونا چاہئے [illegible] ہوا کو
[illegible] کے [illegible] لباس [illegible] سے [illegible] تعلق ہے

آب و ہوا اور موسمی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ کہیں وہ ضروری ہوتے
ہیں اور کہیں راحت کا سامان خیال کئے جاتے ہیں۔ کہیں اُن پر کمائی کا
معقول حصہ صرف کرنا پڑتا ہے اور کہیں بہت کم۔ لیکن ہر ملک کی ضروریات
کے مطابق کافی مکان و لباس ملنا کارگزاری کے واسطے ضروری ہے۔
اگر کمی ہوگی تو صحت میں کمی، نشو و نما ادھورا اور کارگزاری ادنےٰ درجہ
کی ہو جائے گی۔

(۵) اُمنگ آزادی اور سیاحت بھی کارگزاری کے لئے ازحد
موزوں و موافق ہیں۔ اُمنگ تو ترقی کا منبع ہے۔ آزادی کام کو آسان
اور خوشگوار بنا دیتی ہے۔ علم النفس سے ثابت ہے کہ آدمی جو کام شوق
سے کرتا ہے اس میں تکان بہت کم ہوتا ہے۔ چنانچہ تفریح کھیل کود اور
مزدوری کے کاموں کا طبیعت پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ
بطور ٹہل ہندی چار میل جانا اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ کسی ضروری کام سے
دو میل جانا۔ غلام جو کوڑے کے ڈر سے کام کرتا ہے اور آزاد مزدور
جو کمائی کے شوق میں جان کھپاتا ہے ان کی کارگزاری میں زمین و آسمان
کا فرق ہوتا ہے۔ رہی سیاحت اس سے اوّل تو معلومات میں اضافہ،
خیالات میں وسعت اور حوصلے میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ ہر قسم کے
حالات آنکھ سے دیکھ کر انسان بُرائی بھلائی اور اُن کے اسباب سمجھنے لگتا ہے
چنانچہ سفر تعلیم کا لازمی جزو مانا جاتا ہے۔ انسان کتنا ہی کتابی علم حاصل کرلے
جب تک سفر کے تجربوں اور مشاہدات سے اپنے علم کی تصدیق اور
اصلاح نہیں کریگا اُس کی تعلیم ناقص رہیگی اور وہ تالاب کے مینڈک
سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہوگا۔

دوسرے ایک عجیب بات یہ ہے کہ وطن میں انسان کی ہمیشہ نسبتاً کم
قدر کی جاتی ہے ہندی مثل ہے "گھر کا جوگی جوگنا، آن گاؤں کا سدھ"
اسی مضمون کی ضرب الامثال تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں جس سے
صاف ظاہر ہے کہ یہ انسان کا عام تجربہ ہے اور کسی ملک و قوم کی خصوصیت نہیں

احباب و اعزا پر قابلیت و کمال کا اثر اور رعب اتنا نہیں پڑ سکتا جتنا کہ
اغیار اور ناواقف لوگوں پر۔ چنانچہ بالعموم بڑے بوڑھے ترقی یافتہ نوجوانوں
کو جتایا کرتے ہیں کہ تم پڑھ لکھ کر قابل بن گئے تو ہم لوگوں کے لئے تمہاری
لغزشیں تو وہی ہیں جو بچپن میں تھیں۔ ہم تو ابھی تک نہیں بھولے ہیں اور نا سمجھی کی
باتیں سب یاد ہیں۔ دوست احباب کو بھی ترقی و امتیاز کا ناگوار معلوم ہوتا
ہے اور وہ بھی کسی کا قدیم سطح سے بلند ہونا گوارا نہیں کرتے اور مقابلے میں نالش
کرتے ہیں۔ ان وجوہات سے قابل آدمی اپنے وطن میں کما حقہ نہیں
ابھر سکتا اور غیر جگہ ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔
وکیل، طبیب وغیرہ پیشہ ور اکثر اپنے وطن سے دور جا کر ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں
ہمیشہ وطن سے دور جا کر کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر شہر اور قصبے
کے معزز پیشہ ور جماعتوں میں سربرآوردہ لوگ باہر والے ہوتے
ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر وطن میں بھی ان کو یہی ترقی و امتیاز نصیب
ہو سکتا تو احباب و اعزا کو چھوڑ کر دور کیوں جاتے۔ سفر کے متعلق عربی
مشہور مقولے ہیں " السفر وسیلۃ الظفر والسفر کا لسقر"
انقلابات زمانہ سے سفر نے ظفر کے تو صدہا نئے راستے نکال لئے
اب وہ سقر نہیں رہا جو جنت سے بڑھ کر لطف اور راحت میں ہو گیا۔
(۳) عام معاشرتی اور اخلاقی حالت کا بھی کارگزاری پر نہایت اہم اثر
پڑتا ہے۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے
اور بچوں کی طبیعت موم کی طرح نرم ہوتی ہے جس سانچے میں چاہو
ڈھال لو۔ پس جس فرقے کا طرز معاشرت ہمت افزا و جہد پرور ہے وہ
لوگ بالعموم بلند خیال عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ
تجارتی مرکزوں کے مصروف کار اور پسماندہ قصبوں کے کاہل پسند باشندوں
کی حالت کے موازنے سے معاشرت کا اثر بخوبی واضح ہوتا ہے
ہندوستان کے سکون پسند نو وارد کو انگلستان کی چہل پہل سب سے زیادہ
حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ جیسے دیکھو چیونٹی اور شہد کی مکھی کے مانند

اپنے کام میں پوری مستعدی اور توجہ سے مصروف ہے۔ کام جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہفتے میں ایک روز اتوار کو آرام کے واسطے مخصوص اور اس روز کام کرنا قانوناً ممنوع ہے ورنہ کام کے شوق میں لوگ صحت کو کھو بیٹھتے۔ ہندوستان میں اس گرمجوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا اور خود ہمارے یورپین کو یہاں کی سہل انگاری افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری دیکھ کر عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اور کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں بہبودی کی امنگ اور کاروبار کا شوق پیدا ہونا ہندوستان کی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔

فراہمی کا اس زمانہ میں ہر قسم کے کام اور پیشوں کے واسطے تعلیم کس قدر ضروری ہے اور ہوتی جاتی ہے ہر ایک سمجھدار آدمی خود اندازہ کر سکتا ہے افراد گویا جسم قوم کے مختلف اعضا اور ہر عضو کا کام جداگانہ مخصوص ہے اگر کسی عضو کو معطل کیا جائے یا اس کے مخصوص کام کے عوض اس سے دوسرا کام لینے کی کوشش کی جائے تو ممکن نہیں کہ جسم قوم کی صحت و قوت کو ضرر نہ پہنچے۔ کیونکر ممکن ہے کہ سب آدمی زباندان مورخ فلسفی مہندس طبیعی یا عالم الٰہیات بن جائیں اور اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ نظامِ عالم کی درہمی و برہمی نہیں تو اور کیا ہے۔ بہت سے بدقسمت نوجوان اپنا قیمتی وقت اور بہت سا روپیہ مروجہ تعلیم میں ضائع کر کے ناکام و نامراد رہ جاتے ہیں لیکن ان میں بہت سے صنعت و حرفت کے واسطے ایسی موزوں طبیعت اور اس قدر وافر استعداد رکھتے ہیں کہ اگر ان کو ٹکنیکل تعلیم (صنعتی تعلیم) میسر آ سکتی تو بہت بڑی کامیابی اور نام و نمود حاصل کرتے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ یورپ کا عروج و اقتدار ادنیٰ مزدوروں، دستکاروں، پیشہ وروں اور تاجروں کی کارگزاری کا نتیجہ ہے یہی وہ طبقے ہیں جو بجا طور سے قومی پشت و پناہ کہلاتے ہیں۔ حکومت اور سوسائٹی میں ان کا رعب و افسروں میں رسوخ و احترام ان کی اہمیت کا بدیہی ثبوت ہے لیکن ہمارے سلسلۂ تعلیم میں ان ضروریات کو خدا جانے کیوں اس قدر نظر انداز کیا گیا ہے۔ لبرل تعلیم (غیر صنعتی تعلیم) تو بھلی بری میسر آ بھی جاتی ہے لیکن ٹکنیکل تعلیم بالکل نایاب ہے۔

باب ہفتم

اصل

(۱) اصل و دولت کا فرق (۲) پیدائش اصل کی شرط (۳) افزونی اصل کے اسباب (۴) اصل کے خواص (۵) اصل کے اقسام

۱ اصل کی پیدائش اور کارگزاری کا مختصر حال عاملان پیدائش کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے لیکن تھوڑی سی مزید تشریح یہاں بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بلحاظ ماہیت اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں لیکن بلحاظ طریق استعمال ان میں بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز کو ہم عامل پیدائش بنائیں یعنی اس کو اس کام میں لائیں کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو تو وہ اصطلاحاً اصل کہلاتی ہے۔ اور اگر اسی چیز کو ہم ماحصل پیدائش مانیں اور اس طرح صرف کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونے کے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہو تو وہ دولت کہلاتی ہے۔ مثلاً مسکونہ مکان دولت ہے لیکن اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جائے یا وہ کرایہ پر دیا جائے تو اصل ہو جائیگا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی اصل شمار ہوتی ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی دولت۔

لیکن نہ صرف دولت کے وسعت مفہوم کی وجہ سے اصل کا تعین دشوار ہے۔ بلکہ یہ سوال بھی کہ مزید دولت کی پیدائش میں علاوہ زمین و محنت کون چیزیں معاون ہیں فی الحقیقت اس قدر مبہم ہے کہ اس کا کوئی قطعی جواب ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک گروہ نے تو یہ غلطی کی کہ صرف آلات، پیداوار خام، اور زر نقد کو جو اجرت میں صرف ہو اصل قرار دیا کیونکہ پیدائش سے ان ہی تین چیزوں کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ دوسرا گروہ فیاضی پر اس قدر جھکا کہ اس نے دولت اور اصل کو مرادف قرار دے دیا کیونکہ انسان جس قدر چیزیں استعمال کرتا ہے وہ برشتۂ قریب یا بعید پیدائش دولت میں ضرور مدد دیتی ہیں

[illegible] دوم ہفتم

مثلاً خوراک، لباس، مکان اور دوسرے ضروریات قیامِ صحت وقوت کے واسطے لازمی ہیں اور صحت وقوت محنت کے واسطے ضروری۔ لہٰذا مذکورۂ بالا چیزیں بھی بالواسطہ پیدائشِ دولت میں معین ہونے کی وجہ سے اصل میں شامل ہیں۔ لیکن تیسرے اعتدال پسند گروہ نے افراط و تفریط دونوں کو ترک کرکے یہ فیصلہ کیا کہ اصل کے معنے کو صرف اُن چیزوں تک محدود کرنا جن کا پیدائش سے بہت قریب کا تعلق ہے۔ یا اس قدر وسعت دینا کہ تمام دولت داخل ہو جائے دونوں غلط اصول ہیں۔ گو اصل کا مفہوم اس قدر محقق اور متعین نہیں ہو سکتا کہ اصل اور غیر اصل دولت کی کوئی کامل فہرست تیار ہو سکے لیکن جو چیزیں عرفِ عام کے مطابق پیدائشِ دولت میں شریک مانی جائیں اُن کو اصل اور باقی کو دولت شمار کرنے کا اصول ہماری عملی ضروریات کے واسطے کافی طور پر دلالت کرسکتا ہے؛

اصل و دولت میں ایک فرق یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کے استعمال سے کچھ آمدنی ہو تو وہ اصل ہے ورنہ دولت۔ لیکن آمدنی کے معنے میں بھی عدمِ تعین کی دقت پیش آتی ہے۔ اگر آمدنی صرف مادی معاوضے تک محدود کی جاتی ہے تو اصل کا مفہوم نہایت تنگ ہو جاتا ہے۔ اگر ہر قسم کا معاوضہ شامل کرتے ہیں تو پھر اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس حالت میں بھی سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ آمدنی سے مراد وہ کل معاوضے لینے چاہئیں جو عرفِ عام کے مطابق آمدنی کہلا سکیں اور جن چیزوں کے کام میں لانے سے ایسی آمدنی حاصل ہو وہ اصل ہیں باقی دولت۔ اصل و دولت کے فرق کی بحث بھی اسی واقعے کی مثال ہے کہ جو علوم انسان کے افعالِ ارادی سے بحث کرتے ہیں اُن کے اصول کبھی پورے طور پر مقرر اور متعین نہیں ہو سکتے کم و بیش کسر ضرور باقی رہتی ہے اور اخلاقی معاشرتی اور معاشی مسائل پر جو اس قدر اختلافِ رائے کی کثرت ہے اس کا باعث یہی عدمِ تعین ہے؛

گو کوئی قطعی معنے تحقیق نہ ہو سکے لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا اور ہماری ضرورت کے واسطے اتنی معلومات کافی ہے کہ اصل و دولت میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک عاملِ پیدائش مانا جاتا ہے اور مزید دولت پیدا کرتا ہے۔ دوسرا حاصلِ پیدائش ہوتا ہے اور ہماری احتیاجیں پوری کرتا ہے۔ ایک ہی چیز مختلف اوقات میں حسبِ طریقِ استعمال اصل و دولت دونوں ہو سکتی ہے؛

حصّہ دوم
باب پنجم

پیدائش اصل کی شرط

۲۔ عاملین پیدائش کے بیان میں یہ تو واضح ہو چکا کہ اصل زمین، محنت کے اتفاقِ عمل کا نتیجہ ہے، گویا ان سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جس قدر دولت پیدا ہو اگر کُل صرف کر دی جائے تو کچھ نہ بچیگا اور باوجودِ اتفاقِ عمل زمین و محنت اصل پیدا نہ ہو سکیگا۔ اس کی مثال بعینہ یہ ہے کہ بچہ انڈے سے اور انڈا جوڑے کے اتفاقِ عمل سے پیدا ہوتا ہے پس اگر انڈا کھا لیا جائے تو باوجود جوڑے کے اتفاقِ عمل کے بچہ پیدا نہ ہو سکیگا گویا جو انڈا کھا لیا جائے وہ محض دولت ہے اور جس کو سے کر بچہ نکالا جائے وہ اصل ہے پس ظاہر ہے کہ پس اندازی بغیر اصل کا پیدا ہونا ممکن نہیں اور یہ ایسا صریح واقعہ ہے کہ کوئی اس سے ناواقف نہیں۔ آمدنی بچا بچا کر لوگ جائداد خریدتے ہیں، کارخانے چلاتے ہیں تجارت کرتے ہیں۔ اگر کُل کمائی ضروریات میں صرف کر دی جائے اور کچھ پس انداز نہ ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی میسر نہیں آسکتی۔ پس ثابت ہوا کہ زمین اور محنت کا اتفاقِ عمل اصل کا منبع اور پس اندازی پیدائش اصل کی شرط لازمی ہے۔

افزونی اصل کے اسباب

۳۔ اصل کی ماہیت اور پیدائش کا حال بیان کرنے کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ افزونی اصل کے واسطے مساعد حالات کیا ہیں۔ بالفاظِ دیگر اصل کیونکر کسی ملک میں بڑھتا ہے:

(۱) پس انداز کی مقدار آمد و خرچ کی باہمی نسبت سے متعلق ہوتی ہے۔ محض آمد کی زیادتی یا خرچ کی کمی سے جداگانہ کچھ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ جس شخص کی آمد و خرچ حسبِ ترتیب ایک ہزار اور نو سو روپیہ ہو وہ صرف سو روپے بچا سکتا ہے حالانکہ پانسو روپے آمدنی والا تین سو روپے کے خرچ سے اپنے سے دوگنی آمدنی والے سے دوگنا پس انداز کرتا ہے:

محض بچت کے لالچ سے ضروریاتِ جائز کو بھی نظر انداز کر کے دولت اندوزی زندگی کا مقصد قرار دینا ہرگز پسندیدہ اور قرینِ عقل نہیں۔ ایسی کفایت شعاری نہ صرف عقلاً و اخلاقاً مذموم ہے بلکہ کارگزاری گھٹا کر معاشی لحاظ سے بھی سخت مضر ہے اور بالآخر خود افزائش اصل میں حارج ہوتی ہے۔ تخفیفِ مصارف کی حالت میں قیام و ترقی کارگزاری کی مانع نہ ہونی چاہئے ورنہ خود مطلب کا فوت ہونا یقینی ہے۔ لیکن تمام دولت کو محض عشرت پرستی پر لٹانا اس سے کہیں زیادہ معیوب ہے اور

رسوم
شادی غمی

اور یہی اعتراض ہے۔ اعتدال ہر حالت میں بہتر ہے۔

اس معاشی شعبے کی مناسب اصلاح اور ترمیم سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ ہر قوم کی معاشرت کا معیار کچھ مقرر سا ہوتا ہے۔ اگر کوئی معیار سے بالاتر چلے تو امتیاز و وقعت پاتا ہے لیکن اگر اس سے نیچے گرے تو سبکی اور تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ افلاس کی مجبوری سے اس ذلت کو گوارا کیا جاتا ہے یا مصلحان قوم جن کے اعلیٰ خیالات رواج کے اثر سے بالاتر ہیں عمدہ مثال قائم کرنے کی غرض سے باوجود بیش قرار استطاعت کے مروجہ معیار سے تنزل کرتے ہیں۔ مگر عوام میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں کہ وہ بے نام ذلت کو برداشت کر سکیں جب تک دم میں دم رہے تباہی کی حد تک رسم و رواج کا ساتھ دیتے ہیں چنانچہ بہت سے متوسط الحال شرفا کی خستہ حالی کا باعث شادی و غمی کی رسمیں ہوتی ہیں۔

قصہ مختصر افزونی اصل کی پہلی شرط یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مقدار پیداوار بڑھائی جائے اور مصارف حد مناسب کے اندر رکھے جائیں۔ افزائش پیداوار کے وسائل تو بکثرت اس کتاب میں جا بجا مذکور ہیں اور تحدید مصارف کی ترکیب درستی معاشرت اور اصلاح رسوم ہے۔

(ب)۔ اضافہ اصل کی دوسری شرط امن و حفاظت ہے۔ پس انداز کرنے والے کو یہ اطمینان ہونا ضروری ہے کہ اس کا اندوختہ اس سے بجبر نہیں چھینا جائیگا۔ وہ اس کا مالک رہیگا اور حسب دلخواہ اس سے کام لے سکیگا۔ بد امنی کے زمانے میں ہر ایک کا عملدرآمد یہی ہونا چاہئے کہ "ہرچہ داری بخور امروز غم فردا مخور" برعکس اسکے جن ملکوں میں امن و امان کا تسلط ہے وہاں مستقبل بعید کیواسطے بھی اہتمام پیش نظر رہتا ہے۔ اسی طرح سپاہی اور ملاح جن کا پیشہ ہی جانبازی ہے۔ فضول خرچی کے واسطے ضرب المثل ہیں اور جو لوگ غیر مخدوش کاموں میں مصروف ہیں بالعموم کچھ پس انداز کرتے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ فطرت انسانی پر مبنی ہے اور ہر جگہ اس کی مثال موجود ہے۔ چنانچہ انگلستان میں موجودہ کثرت اصل کا بڑا باعث یہی ہے کہ وہاں صدہا برس سے

حصہ دوم
باب ششم

کوئی خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ اور چونکہ بہت قدیم زمانے سے کم و بیش آئینی حکومت چلی آتی ہے لوگوں کا اندوختہ شاہی دست برد سے بھی محفوظ رہا۔ سرمائے کی ضبطی کا اندیشہ لوگوں کے دل سے قطعاً محو ہوگیا اور اطمینان کی بدولت اصل میں دن دوگنا رات چوگنا اضافہ ہونے لگا حتیٰ کہ آج انگلستان کا عکس دُنیا پر چھایا نظر آتا ہے۔

انسان بالطبع امتیاز کا شائق ہے اور ہر ملک و قوم میں وسائلِ امتیاز مختلف پائے جاتے ہیں کہیں جرأت، بہادری اور جسمانی طاقت کا دور دورہ ہے۔ مثلاً عرب، ترکی اور افغانستان یا روہیلکھنڈ اور پنجاب میں، کہیں علم کا جھنڈا لہرا رہا ہے جیسے جرمنی، فرانس، امریکہ اور انگلستان یا بنگال میں اور کہیں دولت کا سکہ رواں ہے جیسے یورپ امریکا، چین یا جنوبی مشرقی قوم یہودیوں، مارواڑیوں اور بوہروں میں۔ لیکن بالعموم ترقیٔ تمدن اور امن و امان کا خاصہ ہے کہ پہلے امتیاز کے مقابلے میں دوسرے کا اثر قوی کرتا ہے۔ یورپ و امریکا میں تو تجارت کے اقتدار کا ذکر کیا ہے خود ہندوستان میں اس طبقے کا رسوخ ہر طرف بکثرت پھیل رہا ہے۔ اہلِ قلم و اہلِ سیف ہنوز تک تجارت کو بنیوں کا ادنیٰ کام خیال کرتے تھے۔ اب اس کے روز افزوں اقتدار سے چونک کر حیران و ششدر نظر آتے ہیں۔ میونسپلٹی سے لے کر امپیریل کونسل تک تمام نیابتی انجمنوں میں، قومی جلسوں اور کانفرنسوں کی ملکی بہبودی کے تمام منصوبوں اور تجویزوں میں، پبلک اور سرکاری حلقوں میں غرضکہ ہر طرف دولت کا رسوخ پیش پیش اور غالب نظر آتا ہے۔ ایسے حالات بھی جو امن و امان کے نتیجے ہیں اضافۂ اصل کے بیحد معاون ہیں۔

(ج) اصل سے کام لینے اور فائدہ اُٹھانے میں جو آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں اُن کا اثر بھی اضافۂ اصل پر قابلِ لحاظ پڑ رہا ہے گو دفینہ بھی اڑی پر کام آتا ہے اور اس کی یہی صفت پس اندازی کے واسطے کافی سفارش ہے۔ لیکن اگر اندوختہ سے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوسکے تو کیا اچھا ہو مصرع "چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار" اس زمانے میں ہر شخص کا خانوں اور تجارت کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر

بذریعہ شراکت اصل اپنے اندوختہ سے بلا دقت و اندیشہ کافی نفع اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ ریلوں، بنکوں اور کمپنیوں کے حصّے خرید کر اندوختہ سے نفع اٹھانے کا عام رواج ہو چلا ہے۔ غریب مزدوری پیشہ لوگ بھی چند روپے سیونگ بنک میں جمع کر کے نہ صرف اندوختہ کی نگہداشت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں بلکہ حسب قواعد کچھ سود بھی پاتے ہیں۔ سیونگ بنکوں کی روز افزوں ترقی سے ثابت ہے کہ پس اندازی کی عادت غربا اور مزدوروں میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔

(د) انسانوں کے فطری خواص کو بھی افزونی اصل میں بہت بڑا دخل ہے۔ پس اندازی کی طاقت قوتِ متخیلہ اور قوتِ ارادی پر منحصر ہے۔ نہ صرف مستقبلِ قریب بلکہ بعید کی احتیاجات کا پورا پورا اندازہ کرنا اور اُنکی بہم رسانی کے واسطے موجودہ احتیاجات میں ترمیم کر کے پس انداز کرنا یہ دو قوتیں سب میں یکساں نہیں پائی جاتیں۔ بعض لوگ جو کوتہ بین کہلاتے ہیں مستقبل کو صاف طور پر دیکھنے سے فطرۃً معذور رہتے ہیں۔ حاضر کے سوا انکو کچھ نظر نہیں آتا۔ بعض لوگ دوربین تو ہوتے ہیں لیکن اُنکی قوتِ ارادی اسقدر قوی نہیں ہوتی کہ موجودہ احتیاجات کی جو بوجہ قرب کے زیادہ دلکش ہوتی ہیں اصلاح کر کے کچھ بچا سکیں۔ اس کمزوری کے اسباب اخلاقی لحاظ سے اچھے بُرے دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً تن پروری، عیش پرستی، یا سخاوت و فیاضی۔ لیکن معاشی طور پر افزائش اصل میں اس سے رُکاوٹ ضرور پیدا ہوتی ہے۔

پس اندازی کی مذکورہ بالا طاقت کے محرک ذاتی اغراض اس قدر نہیں ہو سکتے جتنا کہ اولاد کی محبت یا ترقی یافتہ ممالک میں قوم پرستی۔ معاشی دنیا میں جن لوگوں نے جھنڈے گاڑے ہیں اور جن کا آج ڈنکا بج رہا ہے اُنہوں نے ملک اور قوم کی ترقی و اقتدار کی خاطر سے یہ سب کارگزاریاں دکھائی ہیں۔ محض اپنی زندگی کے واسطے وہ اس قدر جدّ و جہد ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ہر کوئی صاحب اولاد اپنے دل سے دریافت کر سکتا ہے

حصۂ دوم
باب ہفتم

کہ پس اندازکرنے کی بڑی غرض اولاد کے مستقبل کی بہبودی ہوتی ہے۔
حاصل کلام یہ کہ قوتِ متخیلہ اور قوتِ ارادی پس اندازی کے دست وبازو
دوسروں کی محبت وخیر طلبی اس کی زبردست محرک ہوتی ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ معاشرتی اور معاشی حالات ان خواص کو قوی او ضعیف کردیتے ہیں
لیکن بایں ہمہ انکا جداگانہ اثر قابلِ لحاظ ہوتا ہے؛
حاصل کلام یہ ہے کہ پیدائش اصل کے واسطے زمین ومحنت کا اتفاق عمل لابدی
درپس اندازی شرطِ لازمی ہے۔ پس اندازی کی مقدار آمد وخرچ کی باہمی نسبت، ملکی امن وامان،
حصولِ منفعت کی آسانی اور فطری خواص سے کم وبیش متعلق ہے؛

اصل کے خواص

۴۔(ا) یوں تو ہر چیز حتیٰ کہ کرۂ ارض کی بھی ایک حد ہے لیکن اصل کی مقدار
اس معنی میں محدود اور معین نہیں کہی جا سکتی جس معنے میں زمین کہی جاتی ہے
کہ اس کی مقدار بڑھ ہی نہ سکے۔ اصل میں اضافے کی بہت گنجائش ہے۔
چنانچہ واقعہ ہے کہ اصل کی مقدار بہ نسبت سابق عہد ہا گنی ہوگئی ہے اور
برابر بڑھ رہی ہے؛
(ب) زمین کی قوتِ پیدائش قدرت نے معین کردی ہے محنت
بھی ایک حد تک قوانینِ قدرت کی پابند ہے۔ کچھ عرصے میں تھک کر
انسان کام چھوڑنے پر مجبور ہوجاتا ہے لیکن اصل سب سے زیادہ آزاد
ہے اور اُس کی قوتِ پیدائش بھی دوسرے عاملوں سے زیادہ ہے۔
اصل سے سالہاسال دن رات برابر عملِ پیدائش جاری رکھا جاسکتا ہے حتیٰ کہ وہ
فرسودہ ہوکر بیکار ہوجاوے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں خود دُنیا فانی ہے؛
(ج) زمین تو قطعاً غیر منقولہ ہے جس کی وجہ سے اس کی قدر وقیمت میں
حسبِ موقع زمین آسمان کا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ محنت منقولہ مگر مزدور کی ذات
سے لاینفک۔ نتیجہ شرح مزدوری میں اختلاف۔ لیکن اصل پانی کی مانند سیال۔
جہاں ضرورت ہوئی فوراً پہنچ گیا۔ شرحِ سود میں کوئی قابلِ لحاظ فرق ممکن نہیں۔
یہ جو کمپنیوں اور بنکوں کی شرح سود میں تین فی صدی سے لیکر عموماً دس بارہ فیصدی
تک اختلاف پایا جاتا ہے، محض سطحی دھوکا ہے۔ اس کی اصلیت

حصّہ دوم
قسمِ اوّل

تقسیمِ دولت کے بیان میں واضح کی جائیگی۔

س کے
قسام

۵۔ معاشیین نے یوں تو کئی اصول پر اصل کی مختلف قسمیں قرار دی ہیں۔ لیکن اُن سب میں مل کی تقسیم خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ مل نے دو قسمیں قرار دیں۔ اصلِ دائر و اصلِ قائم۔ جو اصل عمل پیدائش میں اوّل ہی مرتبہ اپنا کام پورا کرے وہ اصلِ دائر کہلاتا ہے۔ مثلاً پیداوارِ خام تیل کوئلہ اور اُجرت جو مصنوعات کے بنانے میں صرف ہو۔ اور جو اصل عمل پیدائش میں عرصے تک اپنا کام سرانجام دیتا رہے وہ اصلِ قائم کہلاتا ہے مثلاً انجن مشین آلات عمارت کارخانہ جو ایک مرتبہ مہیا ہونے پر عرصے تک مصنوعات کی پیدائش میں مدد دیتے رہتے ہیں۔

اصلِ دائر و قائم کی تفریق میں ایک خاص اہمیت مضمر ہے جس کو ہم مختصراً واضح کئے دیتے ہیں۔ فرض کرو جوتے کی دو فیکٹریاں ہیں۔ ایک میں نسبتہً اصلِ دائر کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ دوسرے میں اصل قائم کی۔ اب اگر جوتے کی تجارت سرد ہو کر مقدارِ منافع بہت گھٹ جائے تو پہلی فیکٹری اس سرد بازاری کی متحمل نہ ہو سکیگی اور غالباً کاروبار بند کرنے پر مجبور ہوگی لیکن دوسری فیکٹری ان حالاتِ نامساعد میں بھی کام جاری رکھ سکیگی اور ایسا کرنا بالکل غیر مفید بھی نہ ہوگا۔ وجہ غور کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اصلِ دائر میں تو جلد جلد گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور جب نقصان کا اندیشہ صریح ہو تو بھلا کون اپنا روپیہ خطرے میں ڈالے گا۔ لیکن اصلِ قائم میں ایک مرتبہ روپیہ لگتا ہے اور مدتوں وہ اصل کام دیتا ہے جب ایسا اصل موجود ہو تو اُس کو بیکار ڈالنے سے کیا فائدہ۔ اگر تھوڑے مصارفِ نقد یعنی اصلِ دائر پر بھی کچھ منافع ملتا رہے۔ تو اصلِ قائم کا منافع نظر انداز کر کے کاروبار جاری رکھنا بہتر ہوگا مثل مشہور ہے۔ بیٹھے سے بیگار بھلی۔ علاوہ اس کے ایسے زمانے میں جبکہ دوسری مقابل کی فیکٹریاں بند ہوں، کاروبار سے حیثیت اور ساکھ بڑھنے کی اُمید ہو سکتی ہے اور اسی دوران میں جبکہ میدان خالی ہو عمدہ تجارتی تعلقات پیدا کر لینے کا اچھا موقع ملتا ہے اگر دونوں فیکٹریوں کی اصلِ دائر و قائم کی مقدار حسبِ ترتیب دس ہزار و چار ہزار اور چار ہزار و دس ہزار ہے اور کم سے کم قابلِ لحاظ شرح منافع ۲۔ فی صدی ہو تو دونوں فیکٹریاں کم از کم اصلِ دائر پر بشرح مذکور حسبِ ترتیب دو سو روپے اور اسی روپے منافع تک بحالتِ مجبوری کام جاری رکھ سکتی ہیں۔ گویا بمقابلہ فیکٹری اوّل

فیکٹری دوم کمتر مقدار منافع پر کام کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دوسری بھی عرصۂ دراز تک ان ناموافق شرائط پر کام نہیں چلا سکتی۔ البتہ دو چار مہینے کی عارضی کساد بازاری جس استقلال سے یہ برداشت کر سکتی ہے پہلی نہیں کر سکتی۔

اصل کی مذکورۂ بالا تقسیم سے معاشی مباحث میں اکثر جا بجا کام لیا گیا ہے جس کی حسبِ موقع ہم آئندہ تشریح کریں گے۔

باب ہشتم

طریق پیدائش

(۱) اصولِ تقسیم عمل کی تشریح (۲) تقسیم عمل کے فوائد (۳) تقسیم عمل کی مضرت (۴) مشین کا رواج (۵) مشین کے فوائد (۶) مشین کا اثر مزدور پر (۷) پیدائش بر پیمانۂ صغیر و کبیر (۸) پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد (۹) کفایت داخلی خارجی (۱۰) قوانین تکثیر حاصل (استقرار حاصل) (۱۱) تخصیص صنائع (۱۲) صنائع تضمینی و تضمیمی (۱۳) کمپنیاں (۱۴) آجر و نجر اور تخمین و مخمن۔

اصولِ تقسیم عمل کی تشریح

۱۔ اصولِ تقسیم عمل کوئی جدید تحقیق نہیں۔ ہزارہا سال سے انسان کا اس پر عملدرآمد چلا آتا ہے۔ وحشی قوموں میں بھی اس کا برابر رواج ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ متمدن اقوام میں تہذیب و ترقی کی بدولت اس اصول کا دائرۂ عمل نہایت وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس اصول کا اثر اول اول پیشوں پر پڑا جبکہ کھیتی کرنا، کپڑا بُننا، جوتہ سینا، اور ایسے ہی ضروری کام مختلف لوگوں نے جداگانہ اپنے اپنے ذمے لے لئے اور کسان، جلاہے، موچی وغیرہ قدیم فرقوں کی بنا پڑی۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا، تقسیم عمل کا رواج بھی پھیلتا گیا۔ پیشوں کی آخر تقسیم کے بعد ہر پیشے کے کام میں تقسیم شروع ہوئی۔ اور اس طرح کام سے کام نکلنے لگے جیسے پیاز کی گٹھی میں پرت کے نیچے پرت نکلتے ہیں۔ کام کی اتنی مختلف اور بیشمار قسمیں ہو گئیں گویا کہ عملِ پیدائش کا عالیشان پہاڑ کٹتے کٹتے محض سنگریزوں کا انبار بن گیا۔

حصّہ دوم باب ہشتم

کپڑا سینا یا جوتہ بنانا جیسا سادہ کام دس دس بارہ بارہ حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ کام کا ہر جزو مقررہ لوگوں کے سپرد ہوتا ہے اور سوائے مخصوص جزو کے وہ کسی دوسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے ؛

کسی ایک چیز پر اپنی تمامتر توجّہ اور محنت صرف کرنا تاکہ کمال حاصل ہو اصولِ تخصیص کہلاتا ہے۔ اور اس طریقے سے کمال حاصل کرنے والے اپنے کام کے ماہر کہلاتے ہیں اور ہر ایک ماہر کی رائے اور مشورہ اس کے کام کے متعلق مستند اور قابلِ ترجیح مانا جاتا ہے۔ اصولِ تخصیص کا علم تو اور قوموں کو بھی مدت سے تھا چنانچہ یک در گیر و محکم گیر اور اسی مضمون کی ہدایات دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں مگر کبھی اس اصول پر اس قدر اہتمام سے عملدرآمد نہیں کیا گیا جیسا کہ کچھ عرصے سے یورپ اور امریکا میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے ہونہار دل و دماغ سے بھی بحر العلوم و عقلِ کُل ہونے کا خبط جلد رفع ہو جانا چاہئے مصرع ہر کسے را بہرِ کارے ساختند۔ اپنی خداداد استعداد اور قوتوں کا صحیح اندازہ کر کے ہر شخص کو موزوں اور مناسب کام منتخب کر کے اُس میں کمال حاصل کرنا چاہئے تاکہ کوشش کا کوئی خاص نتیجہ نکلے ؛

تقسیمِ عمل کے فوائد

۲ - (۱) عملِ پیدائش کی اعلیٰ تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شخص سے پورا پورا کام اور صرف وہی کام لیا جاوے جس کے واسطے وہ موزوں ہے کسی کام کے کُل حصّے یکساں نہیں ہوتے بلکہ بعض نسبتاً دشوار اور بعض آسان ہوتے ہیں۔ اگر ایسا کُل کام کمزور آدمی سے لیا جاوے تو یقیناً خراب ہو جائیگا اور اگر قوی آدمی سے لیا جائے تو آسان کاموں کے کرنے میں اُس کا وقت ضائع ہوگا۔ اس لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر کام کے دشوار اور آسان حصّے جدا جدا کر دئے جائیں۔ اور ہر مزدور کے مناسبِ حال کام اُس کے سپرد کیا جاوے۔ چنانچہ اس طریق سے جو پیشے اب تک محض مردوں سے مخصوص تھے عورتیں اور بچّے بھی اب ان میں ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ کام بھی عمدہ ہوتا ہے اور محنت بھی ضائع نہیں ہوتی علاوہ بریں جو کام بحیثیتِ مجموعی نہایت دقیق اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے اور جس کے انجام دینے کے لئے بہت سمجھ درکار ہوتی ہے جب چھوٹے چھوٹے

حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو ہر حصّہ جداگانہ اس قدر سہل ہو جاتا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی بلا تکلّف اُس کو کر سکتا ہے۔ غرضکہ تقسیم عمل کا اوّل نتیجہ یہ ہے کہ کام آسان ہو کر کفایت کے ساتھ عمدہ طور پر سر انجام پا سکتا ہے۔

(ب) یہاں یہ نکتہ ظاہر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ تقسیم عمل آجر اور مزدور دونوں کے واسطے حسب ترتیب بلحاظ کفایت مصارف و اضافۂ اُجرت مُفید ہے۔ مثلاً کسی گھر میں ایک مرد، چار لڑکے، دو عورتیں اور تین لڑکیاں ہیں۔ اگر یہ دونوں صرف طاقت طلب کام ملتا ہے تو غالباً دس آدمیوں کے کُنبے کا گزارہ ایک مرد کی کمائی پر ہوگا۔ کیونکہ بموجب حالت مفروضہ سہل کام لڑکے، عورتوں اور لڑکیوں کے کرنے کے قابل نایاب ہے۔ اور آجر خواہ کتنی ہی زیادہ اُجرت دے بسر اوقات فراغت سے نہ ہو سکیگی۔ لیکن اگر وہی دشوار کام بہت سے حصّوں میں تقسیم کر کے بعض کام عورتوں اور بچّوں کے قابل آسان نکال لئے جائیں تو گھر کے اکثر لوگ کام سے لگ جائیں۔ اور اگر مرد کی شرح اُجرت بہ نسبت سابق کم کر دی جائے اور عورتوں بچّوں کو مرد سے بھی کمتر اُجرت دی جائے تو کام بھی بمقدار اور عمدگی میں پہلے سے کم نہ ہوگا۔ آجر کو بشکل اُجرت صرف کرنا پڑیگا اور ساتھ ہی اس کے مزدور کے گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق کہیں زیادہ ہو جائیگی مصرع
چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔ البتہ اس نتیجے کے واسطے یہ شرط لازمی ہے کہ کام کی مقدار اس قدر ہو کہ سب لوگ پورے طور پر مصروف رکھے جا سکیں۔ اگر کام کی مقدار قلیل ہے تو ایک آدمی کا کام چند سے لینا سراسر فضول ہے۔

(ج) تجربہ شاہد ہے کہ مشق سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اوّل اوّل جب ہم گھوڑے یا بائیسکل پر چڑھتے ہیں تو کس قدر خوف معلوم ہوتا ہے اور گر گر پڑنا لازمی ہوتا ہے لیکن اسی مشق کی بدولت سرکسوں میں لوگ گھوڑوں اور بائیسکلوں پر وہ کرتب دکھلاتے ہیں کہ کرامات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی مشق کی بدولت درزی کیسے موزوں اور ٹھیک کپڑے تراشتا ہے اور مصوّر کیسی تصویر بناتا ہے کہ

جان ڈالنی باقی رہجاتی ہے۔ دماغی کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ اوّل اوّل وکیل وطبیب کو بہت غور و خوض اور ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کچھ تجربے کے بعد دماغ اس قدر مشاق ہو جاتا ہے کہ تشخیص مرض یا مشورۂ قانونی میں بہت کم اہتمام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پس جب مدت تک آدمی ایک ہی چھوٹے سے کام کو بشیار مرتبہ دہراتا رہیگا تو اُس کو جو کمال حاصل ہوگا ظاہر ہے۔ چنانچہ ادنیٰ اور اعلیٰ کارخانوں کا عام فرق تقسیم عمل کی قلت و کثرت ہوتی ہے۔ عام دُکانوں پر ایک ہی درزی کپڑے تراشتا اور سیتا ہے لیکن سکوشتھ اینڈ لارڈ یا یاڈھم پائل اپنے اعلیٰ سلائی کے کارخانوں میں لباس کے مختلف پارچے بلکہ ایک ہی چیز کے مختلف اجزا کے تراشنے اور سینے۔ اسے جدا جدا ہوتے ہیں۔ بالعموم ایک کپڑے کی تیاری میں کچھ نہیں تو پانچ سات کاریگروں کا ہاتھ لگتا ہے اور نتیجہ ظاہر ہے؛

(۵) جب کوئی شخص متواتر ایک ہی کام دہراتا رہتا ہے تو بصورت دیگر جو وقت کام بدلنے میں ضائع ہوتا وہ بچ جاتا ہے۔ اور کام کی مجموعی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ خصوصاً بڑے بڑے کاموں میں اس وقت کی کفایت کا اثر نمایاں ہوتا ہے؛

تقسیم عمل کے فوائد کا کچھ اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکیگا۔ آڈم اسمتھ اپنے زمانے کے آلپین سازی کے کارخانے کا چشم دید حال لکھتا ہے کہ جو آلپین بلا مشق دن بھر میں ایک بھی بمشکل تیار ہو سکتی ہے تقسیم عمل کی بدولت حیرت انگیز سہولت اور سرعت سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے بنانے کا طریق یہ ہے کہ ایک شخص تار کھینچتا ہے۔ دوسرا اُس کو سیدھا کرتا ہے تیسرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتا ہے۔ چوتھا نوک نکالتا ہے۔ پانچواں گھنڈی بٹھانے کے لئے دوسرے سرے کو درست کرتا ہے تین چار مسلسل ترکیبوں سے گھنڈی تیار ہوتی ہے۔ گھنڈی جمانا، آلپین نکھارنا، اور اُن کو کاغذ میں ترتیب سے لگانا سب جدا جدا کام ہیں۔ گویا آلپین سازی کا طریقہ تقریباً اٹھارہ کاموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جس کارخانے کا آڈم اسمتھ نے حال لکھا ہے وہ نہایت ادنیٰ درجے کا تھا لیکن تقسیم عمل کے ذریعے

دس آدمی دن بھر میں تقریباً اڑتالیس ہزار آلپین بنا لیتے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تخمیناً چالیس پیشے گھڑی سازی سے اور سَو سے زیادہ کپڑے کی تیاری سے متعلق ہیں۔

لیکن ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ تقسیم عمل مفید ہونے کے واسطے شرط لازمی ہے کہ کام کی اس قدر کثرت ہو کہ سب لوگ برابر مصروف رہ سکیں۔ جس قسم کام کی قلت ہو گی یہ طریق غیر مفید اور ناقابل عمل ثابت ہوگا۔

تقسیم عمل کی مشکلات

۴۲ - تقسیم عمل میں جو سب سے بڑا نقص نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مزدور کی واقفیت اور مہارت نہایت کم اور محدود ہو جاتی ہے۔ اور فی نفسہ یہ ایک ناپسندیدہ حالت ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اوّل تو مہارت میں جو کمال پیدا ہوتا ہے اور جو محض بصورت تخصیص ممکن ہے، اس نقص کی مضرت کے مقابلے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ علاوہ اسکے تخصیص سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ انسان اپنے کام کے علاوہ دُنیا کی تمام باتوں سے بیخبر ہو جائے۔ بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سب باتیں کچھ کچھ اور چند باتیں پوری پوری جانے۔ خصوصاً علمی تخصیص کا یہی طریق ہے کہ بہت سے علوم سے ابتدا کر کے بڑھتے بڑھتے ایک علم پر آ رہے اور اُسی میں کمال حاصل کرے۔ چونکہ تمام علوم میں باہمی رشتہ اور تعلق ہے اس لیئے جو شخص ایک ہی علم سے ابتدا کر کے ایک ہی پر اکتفا کریگا وہ نہ صرف کم علم بلکہ اپنے علم میں بھی ادھورا رہ جائیگا۔ اگر کوئی شخص سوائے طب یا قانون کے کچھ نہ پڑھے اور دُنیا کے حالات سے باخبر نہ ہو تو وہ نیم حکیم خطرۂ جان و نیم وکیل خطرۂ آبرو و دولت سے بھی بدتر ہوگا۔ لہذا تخصیص سے قلت واقفیت لازم نہیں آتی۔ رہی مزدوروں کی حالت کہ ان کا حلقۂ مہارت تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کاروبار میں دوسروں کے بیشتر محتاج ہو جاتے ہیں تو جو کام آسان اور سیدھے سادے ہیں اُن پر تو یہ اعتراض عائد نہیں ہو سکتا۔ اور جو کام دشوار و مہارت طلب ہیں وہ اکثر مشین سے متعلق ہوتے ہیں اور ایسے کاموں میں بوجہ کمی مہارت مزدور کو مضرت کا جو اندیشہ ہو سکتا ہے اسکے دفعیئے کا بھی قابل اطمینان طریقہ نکال لیا گیا ہے جس کا مفصل حال مشین کی بحث میں بیان کیا جائیگا۔

مشین کا رواج

۴۳ - مشین اور آدمی کے کام میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مشین ایک ہی کام کو

ایک طریق پر دوبارہ رہتی ہے۔ لیکن انسان کے کام میں اُس کی مرضی کو بھی دخل ہے اور وہ جب چاہے کام میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ پس جب تقسیم عمل سے کام کے بہت سے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں تو ایسے ٹکڑے جن کو صرف دُہرانا کافی ہے مشین کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جن ٹکڑوں میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کرنا پڑتا ہے وہ انسان اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ مثلاً سنگر مشین یکساں بخیہ کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن کپڑے کو اس طرح پر گھماتے رہنا کہ تمام جوڑوں پر بخیہ ہو جائے ہاتھ کا کام ہے یا ریلوے انجن کا کام صرف دوڑنا ہے لیکن رفتار کی کمی بیشی اور روکنا چلانا ڈرائیور کے متعلق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تقسیم عمل اور استعمال مشین میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ مشاہدے سے ظاہر ہو گا کہ مصنوعات اور وسائل آمد و رفت میں مشین بہت مستعمل اور کار آمد ہے۔ اور اس کے برعکس تعمیرات میں کمتر اور زراعت میں بہت ہی کم رائج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کاموں میں اوّل تو تقسیم عمل کی گنجائش زیادہ نہیں۔ اور علاوہ اس کے ایسے کام کے ٹکڑے جن کی محض تکرار درکار ہو اور جن کو مشین کر سکے معدودے چند نکالے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں کام اب تک بیشتر انسان کے ہاتھ پر منحصر ہیں۔ حالانکہ مصنوعات میں بہت سی چیزیں ہیں جن کی ساخت میں انسان شاید برائے نام ہاتھ لگاتا ہو اور آمد و رفت پر تو ریل جہاز، ٹریم کار اور موٹر نے پورا پورا قبضہ کر لیا ہے۔

مشین کے فوائد

۵۔ (۱) جو کام ہزارہا آدمی مل کر نہیں کر سکتے تھے، مشین دو چار آدمیوں کے سہارے سے کر سکتی ہے۔ انجنوں کی طاقت کا تخمینہ گھوڑے کی طاقت کے حساب سے کیا جاتا ہے اور ایک گھوڑے کی طاقت چھ قوی آدمیوں کی طاقت کے برابر مانی جاتی ہے اب اندازہ کرنا چاہیئے کہ دس پندرہ بلکہ بیس ہزار گھوڑوں کی طاقت کے انجن جو چند چلانے والوں کی مدد سے ہر طرف کام کر رہے ہیں کس قدر بیشمار آدمیوں کی جگہ کام کرتے ہیں ایک ریل ہی کو دیکھو کہ کس تیز رفتاری سے کتنا وزن ایک انجن اور دو تین چلانے والے ہزارہا میل کا فاصلہ لئے پھرتے ہیں۔ کیا بلا انجن کے ایسا کرنا ممکن تھا؟ چنانچہ مشین نے انسان کا اقتدار اور تصرف فطرت پر اس قدر بڑھا دیا ہے کہ وہ بہت کم باتوں کو محال سمجھتا ہے۔

(ب) مشین اس قدر نازک کام کرتی ہے کہ اُس کا انسان کے وہم و گمان میں بھی لانا مشکل ہے۔ ایک انچ کو دس ہزار مساوی حصوں میں تقسیم کرنا مشین کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

(ج) مشین نہ صرف سخت سے سخت اور نازک سے نازک کام کرتی ہے بلکہ جو کام کرتی ہے جلد سے جلد کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی بیشمار مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں تقسیم عمل کے بیان میں ایک قدیم آلپن سازی کے کارخانے کا حال آدم اسمتھ سے نقل کر چکے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ دس آدمی ۴۸ ہزار پن روز بنا لیتے تھے اب مشین کی مدد سے ایکہزار آدمی فی ہفتہ ۲۵ ٹن پن تیار کرتے ہیں۔ فی پونڈ چار ہزار سے زیادہ پن بنتے ہیں۔ لہذا روزانہ اوسطاً فی کس تین ہزار پن ہوتا ہے۔ حالانکہ بلا تقسیم عمل ہاتھ سے دن بھر میں ایک پن بھی بمشکل تیار ہو سکیگی۔

(د) جو کام دستی محنت کے زمانے میں خاص خاص لوگوں کا حصہ مانا جاتا تھا اور برسوں کی کوشش سے آتا تھا اب معمولی عورتیں اور بچے چند مہینوں کی مشق سے کرنے لگتے ہیں۔ سنگر مشین چلانا کیا دشوار ہے۔ اور اُس کی سلائی کے سامنے بڑے بڑے کاریگروں کی دستی سلائی ہیچ ہے۔ اس سہولت اور وسعتِ کام۔ کے فوائد مستہلک اور مزدور دونوں کے حق میں تقسیم عمل کے فوائد میں واضح ہو چکے ہیں۔

(س) مشین کے ذریعے سے اس قدر یکساں چیزیں تیار ہو سکتی ہیں کہ اُن میں سے کسی دو میں تفریق کرنا محال ہے۔ اس سے ایک تو تجارت کو بہت فروغ ہوتا ہے۔ صرف ایک نمونہ دیکھ کر اُسی قسم کی ہزار چیزوں کی فرمائش بے تکلف دے سکتے ہیں، کیونکہ ہم کو اطمینان ہے کہ مشین کی بنی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔ دوسرے خود مشین کے رواج میں اس سے بیحد مدد ملتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی پرزہ خراب ہو جائے تو اس نمبر کا بعینہ ویسا نیا پرزہ کارخانے سے منگا کر مشین درست کی جا سکتی ہے۔ اس کی مرمت میں کوئی دردِ سر نہیں اُٹھانا پڑتا ہے۔

تیسرا شبہ

اس تقسیم عمل پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ حلقہ مہارت کو تنگ کر کے مزدور کو دوسروں کا محتاج بنا دیتا ہے اس کے دو جواب دیئے جا چکے ہیں۔ سیدھے سادھے آسان کام تو اس اعتراض سے بری ہیں۔ رہے دشوار اور مہارت طلب کام وہ آجکل مشین سے زیادہ تر متعلق ہیں اور اب مختلف مشینوں کی ساخت میں اس قدر مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جو شخص گھڑی سازی کی مشین جانتا ہے تھوڑی سی مشق سے بلا دقت بندوق اور سینے کی مشین بنانے کے کارخانے میں مشین چلا سکتا ہے اور باوجود تخصیص کام بدلنے میں دقت نہیں ہوتی۔ البتہ جو مہارت محض ہاتھ کے کام سے متعلق ہو اس پر یہ اعتراض بظاہر بجا معلوم ہوتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کسی چیز کی تجارت کے فروغ اور تنزل کا اثر بنانے والوں پر دونوں حالتوں میں یکساں پڑتا ہے خواہ وہ کل چیز بنالے یا ایک جزو پس تنگی مہارت سے مضرت کا اندیشہ زیادہ تر وہمی ہے عملاً کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

مشین کے مذکورہ بالا فوائد کے متعلق یہاں یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کام کی کثرت شرط لازمی ہے۔

مشین کا اثر مزدوروں پر

۴- آیا مشین کا رواج بحیثیت مجموعی ادنیٰ مزدوری پیشہ لوگوں کے حق میں مضر ہے یا مفید۔ اس پر بہت کچھ بحث ہو چکی ہے جس کا ماحصل ہم بیان کئے دیتے ہیں:-

(۱) پہلی شکایت یہ ہے کہ مشین کام سہل بنا کر شرح اجرت بہت گھٹا دیتی ہے جواب دیا جاتا ہے کہ مشین مصارف پیدائش میں تخفیف کر کے شرح قیمت بھی کم کر دیتی ہے۔ لہذا جو نقصان مزدور کو بشکل تخفیف اجرت پہنچتا ہے اس کی تلافی ضروریات کی ارزانی سے ہو جاتی ہے۔ یعنی آمدنی کے ساتھ خرچ بھی گھٹ جاتا ہے اور بالجملہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا جواب الجواب یہ ہے کہ جو قیمتی سامان اور تعیشات اکثر مشین سے تیار ہوتے ہیں اور جن کی قیمت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے وہ مزدوروں کی ضروریات سے بالاتر ہیں۔ اور بالعموم مشین کی بنی چیزیں اُس کی ضروریات کا اس قدر جزو قلیل ہوتی ہیں کہ ان کی

قیمت کی بچت کمی اُجرت کا معاوضہ نہیں ہوسکتی۔ البتہ اگر تخفیف اجرت کے ساتھ ساتھ مزدور کی تمام ضروریات کی قیمت بھی نسبتہً گھٹ جائے تو بیشک نقصان نہ ہوگا۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ مشین کا عمل زیادہ تر مصنوعات میں بیشتر پایا جاتا ہے اور زراعت و عمارت جن سے مزدوروں کی ضروریات کا خاص تعلق ہے مشین کے حلقۂ عمل سے باہر ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مشین سے خوشحال لوگوں کو ارزانی مصنوعات کی صورت سے فائدہ پہنچتا ہے اور مزدوروں کی اجرت کی تخفیف سے نقصان۔ یہاں ہم یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مشین نے عورتوں اور بچوں کے واسطے بھی طرح طرح کے نئے کام پیدا کر دیئے ہیں اور اگر شرح اجرت گھٹ بھی جائے تو گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق زیادہ ہوگی کم نہ ہوگی اور مزدوری پیشہ لوگ خوشحال رہیں گے۔

(ب) دوسری شکایت یہ ہے کہ مشین بہت سا کام تھوڑے وقت میں کرکے اکثر مزدوروں کو بیکار کر دیتی ہے۔ جواب دیا گیا ہے کہ مشین مصنوعات کی قیمت گھٹا کر ان کی تجارت اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ پہلے سے زیادہ مزدور کام سے لگ جاتے ہیں۔ آج کروڑہا لوگ کتابیں، رسالے اور اخبار چھاپنے میں مصروف ہیں چھاپے کی ایجاد سے پہلے کتنے خوشنویس کتابیں لکھتے ہوں گے۔ پس ثابت ہوا کہ مشین بجائے کام چھین لینے کے مزدوروں کے واسطے کام بڑھاتی ہے۔ اس جواب پر بھی یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ مشین کے رواج کا اثر تو فوراً مزدوروں پر پڑتا ہے اور ہزارہا بیکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن قیمت کی تخفیف سے پیداوار میں اضافہ ہونے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ گویا باپ دادا کی بیکاری کی مصیبت کا پھل بیٹوں پوتوں کو ملتا ہے۔ یہ شکایت بجا بھی سہی لیکن اکثر حسبِ ضرورت عام مستقبل بہبودی پر موجودہ ذاتی منفعت قربان کر دینے سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے۔ جو سپاہی وطن کی حفاظت اور ملکی فتوحات میں مارے جاتے ہیں انکی آئندہ نسلیں آزادی اور حکمرانی کا لطف اٹھاتی ہیں۔ مشینوں کی فوری مضرت اور مستقبل فوائد کو اس روشنی میں دیکھنا چاہئے ہوگا۔

دوسری شکایت کا ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ مشین سے اگرچہ مزدور

حصہ دوم
باب ہشتم

بیکار ہو جاتے ہیں تو بوجہ تخفیفِ مصارف کچھ اصل بھی ضرورت سے زائد بچ رہتا ہے۔ اور چونکہ محنت اور اصل میں کششِ مقناطیسی ہے، بیکار مزدوروں کے واسطے نئے نئے کارخانے جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اصل تو نہایت سریع الانتقال گویا پانی کی مانند سیال ہے۔ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ مگر محنت جو مزدور کی ذات سے لاینفک ہے، اصل کے ہمراہ ہر جگہ نہیں جا سکتی۔ نہیں معلوم کہ اصل کہاں کام سے لگایا جائے۔ مثلاً اگر ولایت کا اصل ہندوستان میں کام کرے تو اس سے ولایت کے بیکار مزدور کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں کم و بیش تشویش پیدا کر رہا ہے۔ ہر جگہ بیکار مزدوروں کے چھوٹے بڑے گروہ موجود ہیں۔ اُن کو کام سے لگانے کی بہت تدبیریں نکالی جاتی ہیں۔ بہترین دماغ اس مسئلے کے حل کرنے میں مصروف ہیں مگر مستقل طور پر بیکاری کے نیست و نابود کر دینے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔
ریاکاری و بیکاری بھی نظامِ عالم کے لازمی جزو معلوم ہوتے ہیں۔

پیدائش برپیمانۂ صغیر و کبیر

۷۔ اگر کسی شہر میں سو موچی جداگانہ کام کر کے پانسو جوڑے جوتے ماہوار بنائیں اور کسی ایک فیکٹری میں بھی پانسو جوڑے ماہوار تیار ہوں۔ تو گو تعداد پیداوار برابر ہے لیکن طریق پیدائش میں بہت نتیجہ خیز فرق موجود ہے۔ اسی وجہ سے اوّل کو پیدائش برپیمانۂ صغیر و دوم کو پیدائش برپیمانۂ کبیر کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بحالتِ اوّل محنت اور اصل بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں منتشر ہوتے ہیں اور بحالتِ دوم محنت و اصل کی معقول مقدار یکجا فراہم ہو کر عمل پیدائش میں صرف ہوتی ہے۔ جس زمانے میں صرف چند آلات اور اوزاروں سے کام لیا جاتا تھا۔ لوگ جدا جدا یا دو چار مل کے کام کرتے تھے۔ مگر جب سے ایجاد کی بدولت بڑے بڑے طاقتور انجن اور قیمتی مشینیں رائج ہوئیں ہزارہا لوگ مل جل کر یکجا کام کرنے لگے چنانچہ آجکل کی ملیں، فیکٹریاں، کمپنیاں اور کارخانجات پیدائش برپیمانۂ کبیر کی عمدہ مثالیں ہیں۔

پیدائش برپیمانۂ کبیر کے فوائد

۸۔ (۱) بہت سے کام اس قدر عظیم الشان اور اہتمام طلب ہیں کہ سوائے پیدائش برپیمانۂ کبیر کے اور کسی طرح سرانجام نہیں پا سکتے۔ مثلاً انجن، مشین، آہنی پُل ریل اور جہاز سازی کے کارخانے، ریلوے اور ٹریم کمپنیاں، نہریں کاٹنا اور کان کنی۔

(ب) تقسیمِ عمل اور استعمالِ مشین کے متعدد فوائد کم و بیش صرف پیدائش بر پیمانۂ کبیر میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کام کی کثرت حصولِ فوائد کی لازمی شرط ہے۔

(ج) کفایتِ محنت۔ اگر دس چھوٹے چھوٹے کارخانے ملاکر ایک بڑا کارخانہ بنا دیا جائے تو دس کلرکوں کے بجائے غالباً دو ہی ہوشیار کلرک تمام حساب و کتاب پہلے سے بہتر حالت میں رکھ سکیں گے۔ اور صرف ایک قابل منیجر بہ نسبت سابق کہیں عمدہ انتظام کریگا۔ اس فائدے کی بہترین مثال ڈاک خانہ ہے کہ صرف چند ڈاکیئے شہر بشہر کے خطوط تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور بوجہ کفایتِ محنت صرف ایک یا دو پیسے میں دور سے دور خط جا سکتا ہے۔ اگر دکانوں یا کارخانوں کی مانند کئی کئی ڈاک خانے لوگ ایک ہی شہر میں بطورِ خود جداگانہ قائم کریں، تو مصارف بہت زیادہ اور کام کی حالت غالباً ابتر ہوگی۔ علاوہ ازیں مزدور اور کاریگر بھی بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرنا بمقابلہ چھوٹے کارخانوں کے زیادہ پسند کرتے ہیں لہذا پیدائش بر پیمانۂ کبیر میں اچھی سے اچھی محنت میسر آسکتی ہے۔

(د) کفایتِ مشین۔ دو دو ہزار گھوڑوں کی طاقت والے پانچ انجنوں سے دس ہزار گھوڑے کی طاقت والا ایک انجن زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے۔ اور لطف یہ کہ کوئلہ بھی کم خرچ ہوتا ہے۔ جگہ بھی کم گھرتی ہے۔ چلانیوالوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ اور دوسرے ہر قسم کے مصارف انجن میں کفایت رہتی ہے۔ علاوہ اس کے بوجہ مستقل کثرتِ کار بڑے کارخانے نہایت اعلیٰ اور بیش بہا مشین لگاکر پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس چھوٹے کارخانے معمولی مشین پر قناعت کرتے ہیں۔

(ہ) کفایتِ زمین۔ صنعت و تجارت کے گنجان مرکزوں میں جہاں زمین بہت قیمتی اور کرایہ بہت گراں ہوتا ہے۔ جگہ کی کفایت ایک بڑی کفایت مانی جاتی ہے۔ دس گنا بڑا کارخانہ بنانے کے واسطے دس گنی زمین اور عمارت درکار نہیں ہوتی کیونکہ انجن گھر، مشین گھر، دفاتر اور گوداموں میں

اتنی جگہ نہیں گھیرتی جتنی کہ دس گنی چھوٹی ایسی دس عمارتوں میں؛

(س) کفایتِ اصل۔ جتنا زیادہ کاروبار چلانے کے لیئے زیادہ سے زیادہ بیس پچیس گنا اصل کافی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر سال بھر میں چھوٹے کارخانے دو مرتبہ مال تیار کرتے ہیں تو بڑے کارخانے اس کا ہر مرتبہ دوگنا مال سال میں دس مرتبہ تیار کر لیتے ہیں۔ اور خریدار بھی خوشی بخوشی نیا استادہ مال بڑے کارخانے سے بکثرت خریدتے ہیں۔ جب کسی چیز کا ایک سانچہ تیار ہو جاتا ہے۔ یا کسی کتاب کی کاپی پریس میں کمپوز ہو جاتی ہے۔ تو اُن سے ہزارہا بلکہ لاکھوں ویسی ہی چیزیں اور کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اسی کام کے لیئے بہت سے جداگانہ سانچے یا کاپیاں کمپوز کرانا مزید محنت و اصل کو ضائع کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کتاب کی کم کاپیاں چھپوائی جائیں تو شرح مصارف زیادہ اور جتنی زیادہ کاپیاں چھپیں شرحِ مصارف کمتر ہوگی۔ اسی طرح بجلی طاقت اور روشنی جتنی زیادہ مقدار میں تیار ہوگی ارزاں پڑیگی۔ کفایتِ اصل اضافۂ پیداوار میں خاص طور پر تخفیفِ مصارف کا باعث ہوتی ہے؛

(ص) کفایتِ مصارف۔ اکثر مذکورہ بالا فوائد سے مصارف میں تخفیف ہوتی ہے علاوہ ازیں چونکہ بڑے کارخانے پیداوار خام وغیرہ زیادہ مقدار میں خریدتے ہیں اُن کو عمدہ سے عمدہ چیز تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے ملتی ہے۔ اور ریل کے کرائے اور باربرداری کے مصارف میں بھی معقول کفایت ہو جاتی ہے۔ یہ فوائد چھوٹے کارخانوں کو کمتر میسّر آتے ہیں؛

(ط) ازدیادِ منافع۔ ہر کارخانہ دار کی کوشش اصل پر زیادہ سے زیادہ شرحِ منافع فیصدی سالانہ حاصل کرنا ہوتی ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں چونکہ زیادہ مقدار میں مال جلد جلد تیار ہوتا ہے خریداری بڑھانے کی غرض سے فی چیز شرحِ منافع کم رکھنے پر بھی سال بھر میں مجموعی منافع کی شرح نہایت اچھی پڑتی ہے۔ اور چونکہ ہر قسم کا تازہ مال ایسے کارخانوں سے مل سکتا ہے، لوگ

دور دور سے مال منگاتے ہیں اور یہ تمام اسباب مل کر اور حلقے کے مانند گھوم گھوم کر کارخانہ دار اور خریدار دونوں کو بشکل ازدیادِ منافع و تخفیفِ قیمت فائدہ پہنچاتے ہیں۔
مثلاً اگر ایک کارخانے میں پچاس ہزار کے اصل سے دو دو ہزار چیزیں سال میں چھ مرتبہ کُل بارہ ہزار ایک روپیہ فی چیز کے صرف سے تیار ہو کر ایک روپیہ چار آنے فی چیز کے حساب سے بکتی ہیں۔ تو شرح منافع ۶ فی صدی سالانہ ہوگا۔ لیکن اگر دوسرا کارخانہ صرف دس ہزار کے اصل سے وہی چیز بنا لے تو بوجوہات مذکورۂ بالا صرف ایک روپے سے یقیناً زائد یعنی تخمیناً کم از کم ایک روپیہ دو آنے پڑیگا۔ اور چیزوں کی تعداد کا سالانہ اوسط بھی نسبتاً کم یعنی زیادہ سے زیادہ دو ہزار رہیگا۔ اس حالت میں چھ فی صدی منافع حاصل کرنے کی غرض سے نرخ ایکروپیہ چار آنے سے بڑھا کر عہ بلکہ اس سے بھی زیادہ کرنا پڑیگا۔ اگر بڑے کارخانے کے مقابلے میں ایکروپیہ چار آنے کے نرخ سے چیزیں فروخت کرنی پڑیں تو چھوٹے کارخانے کو زیادہ سے زیادہ پانچ روپے فیصدی منافع مل سکیگا یعنی بڑے کارخانے سے ایکروپیہ فیصدی کم حالانکہ نرخ وہی ایک ہے۔ اس فرق کا باعث کفایتِ مصارف اور کثرتِ فروخت کے سوا کیا ہے؟

(ع) جدت۔ اس زمانے میں جدت بہت بڑی طاقت ہے۔ محض تجربوں پر بڑے کارخانے جتنی رقم صرف کر دیتے ہیں وہ چھوٹے کارخانوں کے سرمائے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اُن کے تجربے کامیاب ہو کر دنیا کے رواج اور خشین میں داخل ہو جاتے ہیں تو معقول منافع و نیز مصارفِ تجارت بیشمار خریداروں سے بسہولت وصول ہو جاتے ہیں چنانچہ نت نئی چیزیں بنا بنا کر نئی نئی ضروریات پیدا کرنا اور لوگوں کو نیئے نیئے شوق دلانا آجکل اعلیٰ کارخانوں کا سب سے مُہتم بالشان کام اور امتیازی نشان ہو گیا ہے۔

(ف) اشتہار۔ اس زمانے میں تجارتی ترقی کا ایک بڑا راز اشتہار بھی ہے۔ چنانچہ سنگر اور لپٹن کے مثل عالمگیر کاروبار والے کارخانے لاکھوں روپے ہر سال صرف اشتہار میں صرف کر دیتے ہیں۔ کوئی ریلوے اسٹیشن، ہوٹل، تماشگاہ اور اخبار ایسا نہیں کہ ان کے اشتہار سے خالی ہو علاوہ اسکے انکے سفری ایجنٹ دُنیا بھر میں ذاتی کوشش سے خریدار بڑھاتے پھرتے ہیں۔ اور کُل مصارفِ اشتہار

حصۂ دوم
بابِ ششم

علاوہ منافع بآسانی خریداروں کی بڑی جماعت سے وصول ہوجاتے ہیں اور کاروبار کو دن دونا رات چوگنا عروج ہوتا چلا جاتا ہے۔

کفایات داخلی و خارجی

۹۔ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ بڑے کارخانوں کو چھوٹے کارخانوں سے پیدائش میں بہت زیادہ آسانیاں حاصل ہیں جن کی وجہ سے وہ مال عمدہ اور سستا تیار کر کے حسبِ دلخواہ منافع اُٹھاتے ہیں۔ ایسی کل آسانیاں **کفایات داخلی** کہلاتی ہیں۔ لیکن کچھ آسانیاں ایسی بھی ہیں جو ترقیٔ عام کا نتیجہ ہیں اور چھوٹے بڑے کارخانوں کو یکساں میسر ہیں مثلاً ریل و جہاز کی آسانیاں، پیداوارِ خام اور مشینوں کی ارزانی، پیدائش کی نئی نئی آسان ترکیبیں جو علمی تحقیقات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کو **کفایات خارجی** کہتے ہیں۔ پریس اور تعلیم کی مدد سے کفایاتِ خارجی کفایاتِ داخلی پر غالب ہوتی جاتی ہیں۔

قوانین تکثیرِ حاصل و استقرارِ حاصل

۱۰۔ تقسیمِ عمل اور استعمالِ مشین کی تمام بحث سے بخوبی واضح ہے کہ مصنوعات کی مقدار جس قدر بڑھتی ہے مصارف کی نسبت گھٹتی جاتی ہے یعنی چیزیں سستی تیار ہوتی ہیں، یا سابق مصارف کی وہی مقدار بیشتر چیزیں پیدا کر سکتی ہے۔ اس حالت کو اصطلاحاً **قانون تکثیرِ حاصل** کہتے ہیں۔ پیدائش جس قدر بہ پیمانۂ کبیر ہوگی اس قانون کا اثر قوی ہوگا۔ چنانچہ ریل، جہاز، کپڑے کی ملیں، جوتے کی فیکٹریاں اور دیگر صنعتوں کے کارخانے سب اس قانون کے خاص طور پر تابع ہوتے ہیں۔

یہ بتایا جاچکا ہے کہ زمین کی پیداوار قانونِ تقلیلِ حاصل کی تابع ہے پس پیداوارِ خام میں قانونِ تقلیلِ حاصل کا اثر اور صنعت میں قانونِ تکثیرِ حاصل کا اثر مضمر ہوتا ہے اگر دونوں مساوی ہوں تو مجموعی اثر مصنوعات میں بشکل **قانونِ استقرارِ حاصل** نمودار ہوتا ہے۔ یعنی مصارف کی نسبت ہمیشہ یکساں رہتی ہے بیشیٔ پیداوار سے بڑھتی گھٹتی نہیں۔ اور اگر کوئی اثر غالب ہو تو مصنوعات بقدرِ غلبہ اُسی کے قانون کی متابعت کریں گی۔ عمل پیدائش کے یہ تینوں قانون یعنی تقلیلِ حاصل تکثیرِ حاصل و استقرارِ حاصل اکثر مسائل خصوصاً ٹیکس کی بحث میں بہت اہمیت رکھتے ہیں جس کی موقع بموقع ہم تشریح کریں گے۔

تخصیصِ صنائع

۱۱۔ کچھ صنعتیں بعض مقامات سے اس قدر مخصوص پائی جاتی ہیں کہ کسی دوسری جگہ اُن کو رواج دینے کی کوشش اکثر لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ **حصرِ صنائع** کے اسباب کئی ہیں۔ آب و ہوا کی موافقت، پیداوارِ خام کی ارزانی، خریداروں کی کثرت، سرکاری سرپرستی

حصّہ دوم باب ششم

اور کبھی محض اتفاق بھی کشمیری شال دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اگر کشمیری بھیڑیں دوسری جگہ پالی جائیں یا اون کشمیر سے لے کر دوسری جگہ شالیں بنوائی جائیں۔ تو تجربے سے ثابت ہوا کہ کشمیر کی سی نفیس شال تیار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کشمیر کی آب و ہوا اون کے ریشے کی نرمی، لمبائی اور مضبوطی کے واسطے بیحد مناسب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لنکا شائر اور مانچسٹر جو انگلستان میں کپڑے کی صنعت کے مرکز ہیں وہاں کی آب و ہوا میں ایک خاص نمی پائی جاتی ہے جو تاگے کو نرم اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ ترچناپلی کی آب و ہوا عمدہ تمباکو کی کاشت اور سگرٹ کی ساخت دونوں کے واسطے موضوع ہے۔ بریلی کے گرد و نواح میں جنگل ہے جہاں فرنیچر کے قابل لکڑی بکثرت دستیاب ہوتی ہے۔ لوہے کے کارخانے عموماً لوہے یا کوئلے کی کانوں کے قرب و جوار میں قائم کیئے جاتے ہیں۔ بنارس میں ہر سال لاکھوں ہندو جاتری جمع ہوتے ہیں ان کی وجہ سے وہاں تانبے کے برتن بکثرت فروخت ہوتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ جو مدتوں بادشاہوں، نوابوں اور امراء کا مسکن رہ چکے ہیں، آجتک وہاں سونے چاندی کے زیور نہایت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ آگرہ بھی کسی زمانے میں شاہان مغلیہ کا دار السلطنت تھا۔ جے پور میں اب تک مہاراجہ رہتا ہے گرد و نواح میں پتھر کی کانیں بھی موجود ہیں۔ یہاں کے عالیشان محلات مشہور عالم ہیں اور سنگ مرمر کا کام لاجواب مانا جاتا ہے۔ قصہ مختصر تخصیص صنائع کا رواج ہر ملک میں پایا جاتا ہے اور اُسکے کچھ نہ کچھ اسباب بھی ضرور ہوتے ہیں۔ تخصیص صنائع بھی گویا ایک قسم کی تخصیص اور مقامی تقسیم عمل کی صورت ہے۔ اور اُس سے وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں:۔

تخصیص صنائع بھی تقسیم عمل کی مانند معاون کمال و مہارت ہے۔ آب و ہوا میں ایک خاص کاروباری اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک کو مصروف و کامیاب دیکھکر دوسرے کے دل میں کام کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ضروری معلومات آلات اور پیداوار خام بآسانی میسر آتے ہیں۔ بڑے بڑے ماہر کاریگر اور عمدہ مزدور سب آکر ایسی جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور حسب دلخواہ محنت مہیا ہو جاتی ہے۔ مقابلے کے جوش میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ مقامی خوشحالی اور صنعت کی ترقی ہوتی ہے۔

صنائع تضمینی و تضمیمی

۱۲۔ مقامی صنعت کے تعلق سے اور بھی چند ایسی صنعتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اس

صنائع تضمینی: خاص صنعت کو مختلف طور پر مدد دیتی ہیں۔ ایسی صنعتوں کو اصطلاحاً صنائع تضمینی کہتے ہیں۔ مثلاً کانپور میں جوتہ صنعت خاص ہے۔ چمڑہ دھونے اور رنگنے کے مصالحے تیار کرنا جوتوں کے فرمے اور تسمے بنانا، جوتے رکھنے کے کاغذی ڈبے اور جوتے باہر بھیجنے کیواسطے لکڑی کی پیٹیاں تیار کرنا سب صنائع تضمینی کہلائیں گے۔ اسی طرح جہاں مٹی کا تیل نکالنا صنعت خاص ہے۔ کنستر اور لکڑی کی پیٹیاں جن میں کنستر بند ہو کر آتے ہیں، صنائع تضمینی میں داخل ہیں کاغذ، روشنائی، جلد سازی، پریس کی صنعت خاص سے بطور صنائع تضمینی متعلق ہیں۔

اگر خاص مقامی صنعت طاقت طلب ہو جس میں سوائے مردوں کے عورتیں اور بچے شریک نہ ہو سکیں مثلاً کان کنی۔ تو اس حالت میں شرح اُجرت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور مزدوروں کی خاندانی آمدنی کم۔ وجہ تقسیم عمل میں بیان کی جا چکی ہے۔ پس اس ناگوار حالت کو رفع کرنے کی یہ سبیل نکالی گئی ہے کہ خاص اہتمام سے کچھ ایسی صنعتیں قائم کی جاتی ہیں کہ جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں شریک ہو کر۔ خاندانی آمدنی بڑھا سکیں چنانچہ ولایت میں لوہے کے کارخانوں اور کان کنی کے قرب و جوار میں آسان صنعتیں مثلاً اُون صاف کرنا اور رنگنا، موزے جراب بُننا، کشیدہ کاڑھنا، اکثر مروج پائی جاتی ہیں۔ ان کو اصطلاحاً صنائع تضمیمی کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں صنعت تضمینی و تضمیمی ایک ہی ہوتی ہے۔

کمپنیاں: **۱۲۳**۔ جب تجربے سے پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے بیش بہا فوائد تحقیق ہو گئے تو بڑے بڑے کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کی بنا پڑی جن کو ہم بغرض سہولت بیان کمپنی کہیں گے۔ کمپنی سے مُراد محنت اور اصل کی مقدار کثیر یکجا فراہم کرکے عمل پیدا وری جاری کرنا ہے۔ بعض دولتمند شخص اپنے ذاتی سرمائے سے کمپنی قائم کرتے ہیں۔ لیکن آجکل اکثر کمپنیاں مشترکہ سرمائے سے چلتی ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ حسب حیثیت و مرضی بشکل خریداری حصص جن کی کچھ قیمت مثلاً سو روپے فی حصہ مقرر ہوتی ہے، کمپنی کے سرمائے میں اپنا روپیہ شامل کرکے کاروبار کے نفع نقصان میں بحیثیت حصہ دار شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک قانون کی رو سے اب کمپنیاں محدود (لمیٹڈ) ہو سکتی ہیں اُس سے نقصان کا اثر حصے کی مقدار تک محدود رہتا ہے۔ حصے دار کی ذات اور

حصّہ دوم
باب ششم

دوسری ملک و جائداد نہیں پڑ سکتا۔ حصّہ داروں کی ایک مختصر انتظامی کمیٹی کی نگرانی میں اکثر تنخواہ دار منیجر کے اہتمام سے کمپنی کاروبار کرتی ہے۔ گورنمنٹ نے ایسے قانون نافذ کر دیئے ہیں کہ حصّوں اور منافع کے روپے میں کوئی تغلب نہ کر سکے۔ سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً کارخانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ اور سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہر سال حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کرا کے مفصّل رپورٹ شائع کرنا قانوناً لازمی ہے؛

آجر و منیجر اور تخمین و مخمن

۱۴۔ جو شخص ذاتی یا مستعار سرمائے سے کمپنی قائم کرے وہ آجر کہلاتا ہے۔ کمپنی کے مہتمم کو منیجر کہتے ہیں۔ اور وہ اکثر تنخواہ دار ہوتا ہے۔ منیجر کے فرائض بہت ذمّہ داری کے ہوتے ہیں۔ اس کی حیثیت بعینہ کپتانِ جہاز کی سی ہے۔ نہ صرف تمام مزدوروں کے کام کی نگرانی کرنا اس کا فرض ہے بلکہ وہ تمام دنیا پر نظر دوڑاتا ہے کہ بہترین پیداوار خام سب سے ارزاں کہاں ملتی ہے۔ کہاں کہاں مصنوعات کی خرید زیادہ ہے۔ دوسرے کارخانوں کے مقابلے میں خریدار اپنی طرف راغب کرنے کے لئے کیا کیا وسائل مفید اور کارگر ثابت ہوں گے۔ بالفاظ مختصر کاروبار کے فروغ کی عمدہ سبیلیں نکالنا اور انہیں عملدرآمد کرانا منیجر کا فرض ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے واسطے بیحد توجہ، تندہی، دور اندیشی وسعت معلومات اور زمانہ شناسی درکار ہے؛

کچھ لوگ کمپنی قائم کرنے کے بجائے دوسروں کی کمپنیوں سے ٹھیکے پر کام کراتے ہیں اور قیمتِ خرید و فروخت کے فرق سے منافع اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ذہین ہوں اور مستقبل کا صحیح اندازہ کر سکیں تو ایسے کاروبار سے بہت منافع اٹھا لیتے ہیں۔ چونکہ یہ کاروبار محض مستقبل کے تخمینے سے متعلق ہوتا ہے اس کو تخمین اور کرنے والے کو مخمن کہتے ہیں۔ بعض مخمن تو یہ غضب ڈھاتے ہیں کہ یا تو کُل روپیہ قرض لیکر یا محض بہت تھوڑے ذاتی سرمائے سے محض تخمینے کے بھروسے پر لاکھوں روپے کا کاروبار چلاتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً جید ذہین سمجھدار باخبر اور وقت شناس ہوتے ہیں۔ تخمینے میں شاذ و نادر غلطی کرتے ہیں۔ مگر جب کرتے ہیں تو بُری طرح قرضخواہ یا فریقِ ثانی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ چونکہ اہتمام کا دردِ سر کم اٹھانا پڑتا ہے تخمین کا یورپ میں بہت رواج ہو چلا ہے؛

حصۂ سوم

تقسیمِ دولت

بابِ نہم

دولت کے حصے دار

زمین محنت اور اصل یہی تینوں مل جل کر دولت پیدا کرتے ہیں لیکن ان عاملینِ پیدائش کو یکجا کرنا اپنی ذمہ داری اور نگرانی میں اُن سے کام لینا اور اُنکے اتفاقِ عمل سے پیداوارِ دولت حاصل کرنا، گو ایک قسم کی محنت ہی ہے لیکن فی نفسہٖ اس قدر اہم اور مخصوص شئے ہے کہ بغرضِ امتیاز اس کو تنظیم کہتے ہیں۔ پیدائشِ دولت کے واسطے ملک میں قیامِ امن و امان بھی لابدی ہے۔ اور یہ دشوار کام ہر گورنمنٹ نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ پس بحیثیتِ مجموعی دولت کی پیدائش میں زمین، محنت، اصل، تنظیم اور گورنمنٹ پانچ عامل شریک ہوتے ہیں اور پیداوار میں ان کے جداگانہ حصے علی الترتیب لگان، اجرت، سود، منافع اور ٹیکس کہلاتے ہیں۔ اب اگر ہر شخص جداجدا ان تمام عاملوں کا مالک ہوتا تو اپنی کل پیداوار کا بھی بلا شرکتِ غیرے حقدار بنتا۔ ایسی صورت میں پیداوار کو مذکورۂ بالا عاملوں کے حصوں میں جداگانہ ناموں سے تقسیم کرنا بھی فضول ہوتا لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ زمیندار بہت کم اپنی زمین سے خود کام لیتے ہیں۔ بلکہ اکثر اپنے کھیت یا مکان یا دکان لگان اور کرائے پر دوسروں کو اٹھا دیتے ہیں۔ علی ہذا مزدور اکثر اُجرت پر دوسروں کے کھیت اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اصل میں اُن کا کوئی حصہ

نہیں ہوتا۔ اصلداروں کا ایک علیحدہ گروہ ہے جو آلات اور سامان ضروری مہیا کر دیتے ہیں اور محنت میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ یہ لوگ کارخانوں اور کمپنیوں کے حصہ دار بھی کہلاتے ہیں۔ ایک مختصر مگر با اثر جماعت آجروں کی پیدا ہو چلی ہے جن کا خاص کام تنظیم عاملین ہے۔ جو اصل بھی اکثر دوسروں سے لے کر لگاتے ہیں اور سوائے نگرانی اور اہتمام کے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاتے رہا امن و امان، اُسکے قیام کے واسطے گورنمنٹ نے فوج، پولیس اور عدالت سے بیش خرچ متعدد محکمے قائم کر رکھے ہیں۔ پس جبکہ تمام عاملین پیدائش ہر شخص کی جداگانہ ملک نہیں بن سکتے اور ان میں سے ہر ایک مختلف گروہ کے ہاتھ میں ہے تو پیداوار دولت کو بھی لازماً جدا جدا حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ تاکہ ہر مالک اپنا حصہ لے سکے۔ چنانچہ زمیندار لگان وصول کرتا ہے۔ مزدور اُجرت پاتا ہے، اصلدار سود لیتا ہے، آجر منافع اُٹھاتا ہے اور گورنمنٹ ٹیکس لگاتی ہے کس اصول کے مطابق یہ مختلف حصے تقسیم ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں؟ یہ ایک نہایت اہم، پیچیدہ اور معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ اس پر نہایت قابلیت سے بہت کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے۔ ہم بھی اس حصے میں اسی بحث کا ایک سادہ خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں پر یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ لگان، اُجرت، سود اور منافع اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور ممیز ہیں۔ لیکن عرف عام میں یہ اکثر مخلوط بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اُجرت سے مراد پیداوار کا صرف وہ حصہ ہے جو محنت کا ماحصل ہو لیکن اجرت عرفی میں اکثر مزدور کے اصل کا سود بھی شامل ہوتا ہے۔ لوہار، بڑھئی یا درزی کو جو اُجرت دی جاتی ہے وہ نہ صرف اُس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے بلکہ بشکل آلات جو اصل وہ کام میں لگاتا ہے اُس کا سود بھی جزواً اُس میں داخل ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا لگان یعنی زمین کے ماحصل زائد میں کاشتکار کے ہل بیل چرس زمیندار کے کنویں وغیرہ جیسے اصل کا سود بھی شمار کر لیا جاتا ہے۔ ساہوکار کے سود میں لین دین چلانے کی محنت کی اُجرت اور دوسرے مصارف کا معاوضہ بھی شریک ہوتا ہے۔ منافع میں بھی اُجرت تنظیم کے علاوہ آجر کے ذاتی اصل کا سود اور مطالبات خطر داخل ہوتے ہیں۔ اختصار بیان اور سہولت حساب کی غرض سے

اگر زبان عربی میں یہ جداگانہ معنے حسب ضرورت مخلوط کر دیئے جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن ان کے حقیقی مفہوم اور اختلاط کی ماہیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

باب دہم

لگان

(۱) لگان کی ماہیت (۲) قانونِ تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے (۳) پیدائش لگان کی شرائط (۴) اقسام لگان (۵) لگان مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا (۶) لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدائش کا جزو بن سکتا ہے (۷) قیمت پیداوار لگان کا تعلق (۸) زرعی ترقیات کا لگان پر اثر (۹) ملکیت اراضی اور کاشت (۱۰) زمینداری لگان (۱۱) سرکاری مالگزاری (۱۲) زمین کو قومی ملک بنانے کی تجویز۔

لگان کی ماہیت

۱۔ لگان کا مسئلہ علمی پیچیدگی اور مرفہ الحالی کے لحاظ سے جس قدر اہم اور قابل توجہ ہے اسی قدر پیچیدہ اور بحث طلب ہے اس کے اسباب گوناگوں اور پیچ در پیچ اثرات ناقابل تفریق اور تخمینی، اصول دقیق و تشریح طلب، فروعات کثیر و گنجلک ہیں۔ ترک تفصیل سے مسئلہ سمجھنا آسان لیکن تنگیٔ نظر سے مغالطے میں پڑنا بھی اغلب ہے ہم صحتِ معلومات کو سہل فہمی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ماہیت سمجھنے کیواسطے جس قدر تفصیل ضروری معلوم ہوئی بلا تامل اختیار کی گئی ہے اور ساتھ ہی اسکے غیر ضروری پیچیدگیاں ترک بھی کر دی گئیں تا کہ یہ مسئلہ "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مصداق نہ بنجائے۔ مگر باوجود یکہ صفائی اور سلاست کی بہت کوشش کی گئی ہے اس مسئلے کی تحقیق پھر بھی خاص توجہ کی محتاج ہے۔

عرف عام میں لگان سے پیداوار زمین کا وہ حصہ مراد ہے جو کاشتکار زمیندار یا سرکار کو بموجب رواج یا معاہدہ دیتا ہے لیکن معاشی لگان ایک بالکل مختلف چیز ہے

جو قوانین قدرت کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اول ایک مثال [illegible] بیان کریں گے۔

فرض کرو کہ دس ہزار من گیہوں کسی منڈی میں فروخت [illegible] [illegible] کی پیداوار [illegible] [illegible] مختلف [illegible] [illegible] کی پیداوار [illegible] [illegible] کی قیمت [illegible] کے مصارف پیدائش کی نسبت مختلف اور [illegible] [illegible] مثلاً [illegible] تین روپے کے درمیان اس کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں قلیل رقبوں کو نظر انداز کر کے ان کھیتوں کے چند بڑے بڑے طبقے بنائے جا سکتے ہیں جن کی نسبت مصارف میں نمایاں فرق پایا جائے مثلاً تین درجے مقرر کئے جائیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ جن کے مصارف کی نسبت علی الترتیب دو روپے ڈھائی روپے اور تین روپے فی من ہے لیکن باوجود فرق مصارف منڈی میں گیہوں کا نرخ یکساں ہوگا اور اگر بازار اس قدر زیادہ ہے کہ ادنیٰ کھیتوں کے گیہوں خریدے بغیر رہا جا سکے تو نرخ تین روپے فی من سے کسی حالت میں کم نہ ہوگا۔ ادنیٰ کھیت کا کاشتکار اگرچہ حاصل زائد بھی نہ پا سکے تاہم ایسی حالت میں کم از کم مصارف پیدائش تو ضرور پیداوار کی قیمت سے وصول کر سکیگا۔ اعلیٰ اور متوسط کھیتوں کے کاشتکار تین روپے من کے نرخ سے علی الترتیب ایک روپیہ اور آٹھ آنے من نفع اٹھائیں گے۔ اور یہی حاصل زائد جو فرق مصارف کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے معاشی اصطلاح میں لگان کہلاتا ہے۔

یہاں نرخ کے متعلق دو نکتے واضح کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ بحث بالا سے تعین نرخ کا یہ اصول تحقیق ہو گیا کہ جس قدر مقدار مطلوب ہوتی ہے اسکا نرخ بیشتر مصارف پیدائش کی نسبت سے کم نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ برابر یا کچھ زیادہ ہوگا۔ مساوات نرخ کا مفروضہ بظاہر خلاف واقعات معلوم ہوتا ہے تشریح طلب ہے۔ ایک ہی جنس کے چند حصوں کا نرخ بلحاظ خوبی مختلف ہوتا ہے۔ اور درحقیقت کل مقدار ایک نرخ سے فروخت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر متوسط خوبی کی پیداوار کا نرخ معیار قرار دیکر اعلیٰ خوبی والی کے نرخ کا اضافہ تخفیف مصارف شمار کریں اور ادنیٰ خوبی والی کے نرخ کی کمی از دیاد مصارف سمجھیں تو باوجود فرق خوبی و اختلاف نرخ مساوات نرخ کا نتیجہ حاصل ہوگا۔ اور لگان کی بحث میں اس مفروضے سے یہی مراد ہے۔

حصہ سوم
باب دہم

صاف ظاہر ہے کہ بوجہ افزونیِ آبادی و معاشی ترقیات پیداوار زمین کی طلب جس قدر زیادہ ہوگی ادنیٰ زمینوں پر کاشت پھیلتی جائیگی جیسا کہ آجکل خود ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ و متوسط زمینوں کے لگان میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کسی وجہ سے طلب میں کمی آجائے تو ادنیٰ کھیتوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہوکر باقی کھیتوں کے لگان میں بھی تخفیف ہو جائیگی پس ثابت ہوا کہ مصارفِ پیدائش کا فرق جس کے اسباب ہم ابھی واضح کریں گے اور جو طلب کی کمی بیشی سے گھٹتا بڑھتا ہے لگان کا باعث ہے۔ لگان خود پانے والے کی کوشش سے پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اکثر غیر اختیاری اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ صرف لے لینا پانے والے کا کام ہے۔ لگان کی پیدائش میں اس کو زیادہ دخل نہیں۔

اب ہم مصارفِ پیدائش کی تفصیل کرتے ہیں جس سے اُن کے فرق کی وجہ خود ظاہر ہو جائیگی معمولاً خرچ کی جو مدیں مصارف میں شمار کی جاتی ہیں، درحقیقت اُن سے بہت زیادہ مدیں مصارف میں شامل ہیں۔ گو روزمرہ کے حسابات میں بغرض سہولت نظر انداز کردی جائیں لیکن علمی بحث میں بحیثیت جزوِ مصارف ان سب کا پورا لحاظ لازمی ہے چنانچہ تخم اور کھاد کی قیمت، جتائی، نلائی، آبپاشی، رکھوالی، کٹائی، اور پیداوار کو قابلِ فروخت بنانے کے کام مزدوروں کی لاگت، کھیتی کے مویشیوں کا خرچ، ہل بیل اور دیگر آلاتِ زراعت میں کاشتکار کا جو اصل لگا ہے اور کنویں، پختہ برہے کے مثل مستقل ترقیاتِ اراضی جن میں زمیندار کا اصل صرف ہوا ہے، ان سب کا سود۔ اصل قائم دورانِ استعمال میں جس رفتار سے فرسودہ اور زائل ہو رہا ہے اسکے مطابق مطالباتِ فرسودگی کی ایسی شرح سالانہ کہ بیکار ہونے تک کل اصل کی قیمت وصول ہو سکے خود کاشتکار اور اس کے خاندان کی محنت کی اجرت، نیز پیداوار کو منڈی تک لانے اور فروخت کرنے کا خرچ، یہ سب کچھ مصارفِ پیدائش میں شامل ہے۔ اتنے لحاظوں سے چپے کھیتوں کا بھی مساوی الحالت ہونا محال ہے۔ اوّل تو قدرتاً زمینوں کی زرخیزی میں فرق۔ اس کے علاوہ کھیت تمام ملک میں منتشر کوئی منڈی کے بالکل قریب، کوئی بیسیوں کوس دور۔ بعض ریل اور پختہ سڑکوں کے اردگرد بعض دور از راہ قطعات میں واقع۔ آبپاشی کہیں نہایت بیش خرچ اور کہیں بہت ارزاں۔ زرعی ضروریات کی قیمت جگہ جگہ مختلف۔ یہی حال

زرعی مزدوروں کی اجرت کا ہے۔ اور سب پر طرہ یہ کہ سب کاشتکار بھی یکساں ہوشیار اور محنتی نہیں۔ ان تمام اختلافات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بمشکل چند کھیتوں کے مصارف پیدائش کا وسط برابر ہوگا ورنہ عموماً ہر کھیت کا اوسط جداگانہ اور مختلف ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ مثال بالا سے ظاہر ہے۔ ان ہی مصارف کے باہمی فرق سے لگان پیدا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ لگان زمین کے قدرتی اور مستقل خواص سے پیدا ہوتا ہے۔ اس قول کی ایک شرح تو خواص زمین کی وہ تفصیل ہے جو اس سے قبل پیدائش دولت کے حصے میں بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن علاوہ بریں اس قول سے ایک اور نکتے کا بیان بھی مقصود ہے جس کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔ فرق مصارف کے جو اسباب بیان کیے گئے ان میں سے اکثر مثلاً زرخیزی، شرح اجرت، شرح ضروریات، موقع اراضی محنت اور اصل کے زور سے بہت کچھ درست اور بہتر ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ ممکن ہے کہ مزید پیداوار جو ان کی درستی اور بہتری سے حاصل ہو وہ اس محنت اور اصل کی معمولی اجرت اور سود کے برابر ہو یا کم رہے۔ یا کچھ بڑھ جائے۔ لیکن کمی و بیشی مصارف کے چند اسباب ایسے بھی ہیں جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہیں۔ اور اصل کا ان پر کوئی زور نہیں چلتا۔ عاملین قدرت گرمی، بارش، روشنی اور ہوا زراعت میں زمین، محنت اور اصل کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ اور پیداوار کی خوبی اور مقدار پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ انکو مجموعاً قدرتی زرخیزی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قدرت نے یہ عاملین مفت عطا کیے ہیں۔ ان کی پیدائش اور ترقی میں محنت اور اصل کا کچھ بس نہیں چلتا ہے۔ ان کی موافقت سے مصارف کی نسبت بہت کچھ گھٹ سکتی ہے۔ ایسی تخفیف مصارف سے جو حاصل زائد پیدا ہو وہ ہر حالت میں خالص لگان ہوگا حتے کہ بعض علما تو معاشی لگان کی مقدار صرف اسی تک محدود کرتے ہیں۔ جو حاصل زائد دیگر حالات کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ گو بظاہر لگان معلوم ہو لیکن کل یا اس کا کوئی جزو درپردہ اس محنت اور اصل کی اجرت اور سود ہو سکتا ہے جو حالات کو موافق بنانے کی غرض سے صرف کیا گیا ہو۔ گویا آخری قسم کے حاصل زائد کی ماہیت کم و بیش غیر متحقق ہوتی ہے۔ اور اس کا لگان ہونا نہ ہونا برابر ممکن ہے۔

اسی سلسلے میں یہ نکتہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اگر کسی زمین کی قیمت میں

صاف ظاہر ہے کہ بوجہ افزونی آبادی و معاشی ترقیات پیداوارِ زمین کی طلب جس قدر زیادہ ہوگی ادنیٰ زمینوں پر کاشت پھیلتی جائیگی جیسا کہ آجکل خود ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ و متوسط زمینوں کے لگان میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کسی وجہ سے طلب میں کمی آجائے تو ادنیٰ کھیتوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہو کر باقی کھیتوں کے لگان میں بھی تخفیف ہو جائیگی پس ثابت ہوا کہ مصارفِ پیدائش کا فرق جس کے اسباب ہم ابھی واضح کریں گے اور جو طلب کی کمی بیشی سے گھٹتا بڑھتا ہے لگان کا باعث ہے۔ لگان خود پانے والے کی کوشش سے پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اکثر غیر اختیاری اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے صرف لے لینا پانے والے کا کام ہے۔ لگان کی پیدائش میں اس کو زیادہ دخل نہیں۔

اب ہم مصارفِ پیدائش کی تفصیل کرتے ہیں جس سے ان کے فرق کی وجہ خود ظاہر ہو جائیگی معمولاً جو چیزیں مصارف میں شمار کی جاتی ہیں، درحقیقت ان سے بہت زیادہ چیزیں مصارف میں شامل ہیں۔ گو روزمرہ کے حسابات میں بغرض سہولت وہ نظرانداز کر دی جاتی ہیں لیکن علمی بحث میں بحیثیت جزوِ مصارف ان سب کا پورا لحاظ لازمی ہے چنانچہ تخم اور کھاد کی قیمت، جتائی، نلائی، آبپاشی، رکھوالی، کٹائی، اور پیداوار کو قابلِ فروخت بنانے کے کل کاموں کی لاگت، کھیتی کے مویشیوں کا خرچ، ہل بیل اور دیگر سامانِ زراعت میں کاشتکار کا جو اصل لگا ہے اور کنویں، پختہ نہر ہے کے مثل مستقل ترقیاتِ اراضی جن میں زمیندار کا اصل صرف ہوا ہے، ان سب کا سود نیز اصل تا دورانِ استعمال میں جس رفتار سے فرسودہ اور زائل ہو رہا ہے اسکے مطابق مطالبات فرسودگی کی ایسی شرح سالانہ کہ بیکار ہونے تک کل اصل کی قیمت وصول ہو سکے خود کاشتکار اور اس کے خاندان کی محنت کی اجرت، نیز پیداوار کو منڈی تک لانے اور فروخت کرنیکا خرچ، یہ سب کچھ مصارفِ پیدائش میں شامل ہے۔ اتنے لحاظوں سے چند کھیتوں کا بھی مساوی الحالت ہونا محال ہے۔ اوّل تو قدرۃً زمینوں کی زرخیزی میں فرق۔ اس کے علاوہ کھیت تمام ملک میں منتشر کوئی منڈی کے بالکل قریب، کوئی بیسیوں کوس دور۔ بعض ریل اور پختہ سڑکوں سے ملحق اور بعض دور از راہ قطعات میں واقع۔ آبپاشی کہیں نہایت بیش خرچ اور کہیں بہت ارزاں۔ نرخ ضروریات کی قیمت جگہ جگہ مختلف۔ یہی حال

زرعی مزدوروں کی اُجرت کا ہے۔ اور سب پر طرہ یہ کہ سب کاشتکار بھی یکساں ہوشیار و محنتی نہیں۔ ان تمام اختلافات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بمشکل چند کھیتوں کے مصارف پیدائش کا اوسط برابر ہوگا ورنہ عموماً ہر کھیت کا اوسط جداگانہ اور مختلف ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ مثال بالا سے ظاہر ہے۔ ان ہی مصارف کے باہمی فرق سے لگان پیدا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ لگان زمین کے قدرتی اور مستقل خواص سے پیدا ہوتا ہے۔ اس قول کی ایک شرح تو خواصِ زمین کی وہ تفصیل ہے جو اس سے قبل پیدائش دولت کے حصّے میں بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن علاوہ بریں اس قول سے ایک اور نکتے کا بیان بھی مقصود ہے جس کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔ فرقِ مصارف کے جو اسباب بیان کیے گئے ان میں سے اکثر مثلاً زرخیزی، شرحِ اُجرت، نرخ مزدوریات، موقع، اراضی محنت اور اصل کے زور سے بہت کچھ درست اور بہتر ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ ممکن ہے کہ مزید پیداوار جو ان کی درستی اور بہتری سے حاصل ہو وہ اس محنت اور اصل کی معمولی اُجرت اور سود کے برابر ہو یا کم رہے۔ یا کچھ بڑھ جائے۔ لیکن کمی و بیشی مصارف کے چند اسباب ایسے بھی ہیں جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہیں۔ اور اصل کا ان پر کوئی زور نہیں چلتا۔ عالمین قدرت گرمی، بارش، روشنی اور ہوا ندعت میں زمین، محنت اور اصل کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ اور پیداوار کی خوبی اور مقدار پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ انکو مجموعاً قدرتی زرخیزی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قدرت نے یہ عالمین مفت عطا کیے ہیں۔ ان کی پیدائش اور ترقی میں محنت اور اصل کا کچھ بس نہیں چلتا ہے۔ ان کی موافقت سے مصارف کی نسبت بہت کچھ گھٹ سکتی ہے۔ ایسی تخفیف مصارف سے جو حاصل زائد پیدا ہو وہ ہر حالت میں خالص لگان ہوگا حتےٰ کہ بعض علما تو معاشی لگان کی مقدار صرف اسی تک محدود کرتے ہیں۔ جو حاصل زائد دیگر حالات کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ گو بظاہر لگان معلوم ہو لیکن کُل یا اُس کا کوئی جزو در پردہ اس محنت اور اصل کی اُجرت اور سود ہو سکتا ہے جو حالات کو موافق بنانے کی غرض سے صرف کیا گیا ہو۔ گویا آخری قسم کے حاصل زائد کی ماہیت کم و بیش غیر متحقق ہوتی ہے۔ اور اس کا لگان ہونا نہ ہونا برابر ممکن ہے۔

اسی سلسلے میں یہ نکتہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اگر کسی زمین کی قیمت میں

حصہ سوم
باب دہم

لگان کا معاوضہ بھی شامل ہو تو ایسی زمین کے خریدار کے حق میں لگان بھی اصل کا سود بن جائیگا جو اُس کے معاوضے میں قیمتاً دیا گیا اس کے برعکس جو اضافہ زائد بدوں کسی محنت اور اصل سے پیدا ہو مثلاً جدید ریلوے لائن کھلنا، نہر جاری ہونا، یا قرب وجوار میں منڈی قائم ہونا۔ تو وہ بلاشبہ لگان شمار ہوگا۔ گویا کبھی خود لگان سود بن جاتا ہے اور کبھی وہ اضافہ زائد بھی جو اصل و محنت کا پیدا کیا ہوا ہو لگان ہو سکتا ہے۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصارف پیدائش کا نہ تو کوئی اس قدر مفصل حساب رکھتا ہے اور نہ رکھ سکتا ہے۔ خاص خاص مصارف مثلاً اجرت مزدوراں، خرچ آبپاشی، قیمت تخم وکھاد وغیرہ کا کاشتکار صرف تخمینہ کر لیتا ہے۔ صحیح مقدار ان کی بھی نہیں جانتا اسی وجہ سے کھیت سے خالص لگان کی ٹھیک ٹھیک مقدار معلوم کرنا نہایت دشوار اور اکثر محال ہے۔ مگر تمام حالات متعلقہ بغور مطالعہ کر کے صرف لگان کے پیدا ہونے نہ ہونے اور اسکے گھٹنے بڑھنے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مصارف پیدائش سے خالص لگان کا پتہ لگانا محال ہے۔ البتہ اس کی پیدائش اور کمی بیشی کے عام اصول بخوبی تحقیق ہو سکتے ہیں لہذا علمی اغراض کے واسطے ان کا جاننا کافی ہے۔

قانون تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے

۴۔ قانون تقلیل حاصل کو جو پیداوار زمین پر خاص طور سے مسلط پایا جاتا ہے اور جس کی تشریح خواص زمین کے بیان میں کی جا چکی ہے، مسئلہ لگان کا اصل بنیاد سمجھنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر یہ قانون ہر کھیت کی کاشت کی حد معیّن نہ کرتا تو اعلیٰ درجے کے سوا متوسط اور ادنیٰ درجے کے کھیت کبھی نہ بوئے جاتے اور موجودہ طریق سے لگان حاصل نہ ہوتا۔ لیکن اس سے یہ خیال کرنا کہ پیدائش لگان کے واسطے ادنیٰ زمینوں کی کاشت لازمی ہے درست نہ ہوگا۔ بلکہ بفرض محال اگر تمام کھیتوں کی زرخیزی دیگر حالات اور مصارف پیدائش کی نسبت سب یکساں ہوں، تو بھی اس قانون کے عمل سے لگان پیدا ہونا ممکن ہے۔ مثلاً محنت اور اصل کے پہلے جرعے کی پیداوار کے مصارف دو روپے فی من دوسرے کی ۲ ½ روپے من اور تیسرے کی تین روپے من ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب تک تیسرے جرعے کی پیداوار کی قیمت سے کم از کم مصارف پیدائش پورے نہ ہوں، کاشتکار تیسرا جرعہ نہیں لگا سکتا۔ لیکن اگر بوجہ اضافہ طلب تیسرے کی پیداوار بھی ناگزیر ہو تو اس کا نرخ تین روپے من سے کم نہ ہوگا۔ اور ایسی حالت میں بھی

حصہ سوم
باب دہم

یکساں کھیتوں کے کاشتکاروں کو جرعۂ اوّل و دوم کی پیداوار پر ایک روپیہ اور آٹھ آنے من لگان حاصل ہو سکیگا اور یہ محض اسی قانون کا نتیجہ ہوگا۔

پس صاف ظاہر ہے کہ لگان مصارفِ پیدائش کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ فرق قانونِ تقلیلِ حاصل پر مبنی ہے خواہ مختلف زرخیزی اور مختلف حالات کے کھیتوں سے متعلق ہو یا یکساں حیثیت کے کھیتوں سے۔ اضافۂ طلب سے اس فرق کا اثر قوی تر ہو جاتا ہے۔ اگر یکساں اور محدود زمین کاشت کے لیے میسر ہو کہ آگے قانونِ تقلیلِ حاصل کے عمل کی نوبت ہی نہ آئے، یا پیداوارِ زمین قانونِ استقرارِ حاصل کی پابند ہو اور ہر جرعے کے مصارف یکساں ہوں، یا طلب اس قدر کم ہو کہ ادنیٰ کھیتوں کی کاشت یا بیشتر جرعوں کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے تو ان تینوں صورتوں میں سے کسی میں بھی لگان پیدا ہونا ممکن نہیں۔

پیدائشِ لگان کے شرائط

۳۔ پیدائشِ لگان کی بحث میں ہم نے چند خاص حالتیں فرض کی ہیں جن کو شرائطِ لازمی کہنا بجا نہ ہوگا۔ سب سے اوّل تو کل پیداوار یکجا کا ایک ہی منڈی میں فروخت ہونا، دوسرے خرید و فروخت میں کامل آزادی اور مقابلہ، تیسرے طلب اور رسد کی قوت میں برابری۔ اوّل کی دو شرطوں کا اہم ترین نتیجہ مساوات نرخ ہے اور شرطِ آخر سے نرخ کا بیشترین مصارف کے برابر ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ اگر پیداوار چند منڈیوں میں فروخت ہو یا بوجہ پسماندگی نرخ بجائے مقابلے کے رسم و رواج اور دیگر اثرات کا تابع ہو، یا طلب رسد سے کم ہو تو لگان پیدا ہونے کا موقع بہت کم رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ نرخ کا یکساں ہونا یقینی (نہ بیشترین مصارف کے برابر ہونا ممکن)۔ گویا شرائط قائم نہ رہنے سے اسباب کا اثر ضعیف ہو کر لگان کا پیدا ہونا نہ ہونا محض اتفاق پر منحصر رہ جاتا ہے۔

لگان کے اقسام

۴۔ اگر پیداوار کی طلب رسد پر غالب ہو جائے تو نرخ بیشترین مصارفِ پیدائش سے بھی بڑھ سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہزار من غلّے کی طلب ہو اور صرف آٹھ سو من منڈی میں موجود ہو تو باوجودیکہ بیشترین مصارف تین روپیہ من ہوں، نرخ کا ۳½ اور ۴ روپیہ من تک چڑھنا دشوار نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں ادنیٰ کھیتوں یا انتہائی جرعوں کی پیداوار سے جو حاصل زائد ملیگا اور اسی نسبت سے باقی کھیتوں یا جرعوں کے لگان میں جو کچھ اضافہ ہوگا یہ کل معمولی معاشی لگان سے جداگانہ چیز ہے۔ اور چونکہ تعین رسد اور کثرتِ طلب سے

پیدا ہوتا ہے۔ اس کو لگانِ قلت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایسا لگان جو اکثر فوری اسباب سے پیدا ہوتا ہے زیادہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔ اضافۂ رسد بتدریج کچھ عرصے میں اس کو زائل کر دیتا ہے۔ بہت کم زرعی پیداوار اس قدر مخصوص ہیں مثلاً مشرقی بنگال کا جوٹ کہ جس سے عرصۂ دراز تک لگانِ قلت لینا ممکن ہو۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا مفید ہوگا کہ معاشی لگان اور لگانِ قلت میں کوئی بنیادی فرق نہیں (جو حاصل زائد بیشترین مصارف کے مساوی قیمت سے پیدا ہوتا ہے وہ اول قسم کا لگان ہے اور جو قیمت کے مزید اضافہ سے جدید حاصل زائد ملتا ہے وہ امتیازاً قسمِ دوم شمار کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر معاشی لگان کی پیدائش میں چند ایسے کھیتوں کی کاشت یا جزوں کا استعمال فرض کیا جاتا ہے کہ ان کی پیداوار کی قیمت مصارفِ پیدائش کے برابر ہوتی ہے۔ اور جب یہ قیمتِ مصارف سے بڑھ جائے تو جدید اضافہ لگانِ قلت متصور ہوگا۔ لیکن درحقیقت دونوں لگان تعینِ رسد اور کثرتِ طلب یا بالفاظ دیگر قلتِ پیداوار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین کی پیداوار بھی ہوا اور روشنی کی مانند غیر محدود ہوتی تو لگان ہرگز وجود میں نہ آتا۔ زرعی زمین کی طرح سکنی زمین سے بھی لگان حاصل ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ موقع جو منجملہ اور بہت سے اسباب کے پہلی قسم کے لگان کا ایک سبب ہوسکتا ہے دوسری قسم کے لگان کا خاص باعث ہوتا ہے۔ باموقع عمارت سے بمقابلہ بے موقع مساوی الحیثیت عمارت کے جو زیادہ کرایہ حاصل ہوتا ہے وہی سکنی زمین کا لگان ہے۔ اسی طرح کان کی زمین کا جو محصول لیا جاتا ہے اس کا بڑا حصہ تو معدنیات کی قیمت ہوتا ہے۔ باقی لگان بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ فرقِ مصارف کا نتیجہ ہو۔ بعض علما نے تو لگان کے معنوں کو اس قدر وسعت دی ہے کہ اگر کسی خاص پیدائشی قابلیت کی وجہ سے کوئی شخص اپنے ہم پیشوں سے زیادہ اجرت پائے یا کسی خاص اتفاقی آسانی سے کسی کارخانے کو دوسروں سے زیادہ منافع ملتا رہے تو اس مقدارِ زائد کو اصطلاحاً مثلِ لگان یا لگانِ اجارہ کہتے ہیں۔ پانے والے کی کوشش بغیر وہ محض کسی غیر اختیاری فرق کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اسکے حاصل کرنے میں کچھ محنت اور اصل لگتا تو وہ بجائے لگان کے اجرت اور سود میں شمار ہوتا۔ اقسام کی بحث سے لگان کی سب سے زیادہ قابل توجہ خصوصیت کا پتہ چلتا ہے

کہ وہ ایک مفت عطیہ ہے جو اسباب کی قدرتی یا اتفاقی موافقت سے بلا صرف و محنت حاصل ہوتا ہے ؛

لگان مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا

۵۔ منڈی میں جو پیداوار آتی ہے اس کے مختلف حصوں کے صرف پیدائش میں فرق ہوتا ہے لیکن کل مقدار مطلوبہ کا نرخ بیشترین مصارف کے کم از کم برابر ہوتا ہے اسی وجہ سے کمتر مصارف والوں کو ماحصل زائد ملتا ہے جس کو لگان کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لگان کسی حصے کے مصارف میں بھی داخل نہیں اور اسی وجہ سے اس کے نرخ پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ خود نرخ سے پیدا ہوتا ہے نرخ کی کمی بیشی سے یہ بھی گھٹتا بڑھتا ہے۔ اپنی طرف سے نرخ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ بالفاظ مختصر لگان اضافہ نرخ کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ باعث۔ چنانچہ اگر زمیندار یا سرکار لگان (بشرطیکہ معاشی لگان کے برابر یا اس سے کم ہو) لینا چھوڑ بھی دے تو کل لگان کاشتکار کی جیب میں جانے لگیگا۔ اور نرخ پیداوار میں ترک مطالبۂ لگان سے کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ لگان کو جزو مصارف نہ کہنے سے اسی واقعے کا اظہار مقصود ہے ؛

لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدائش کا جزو بن سکتا ہے

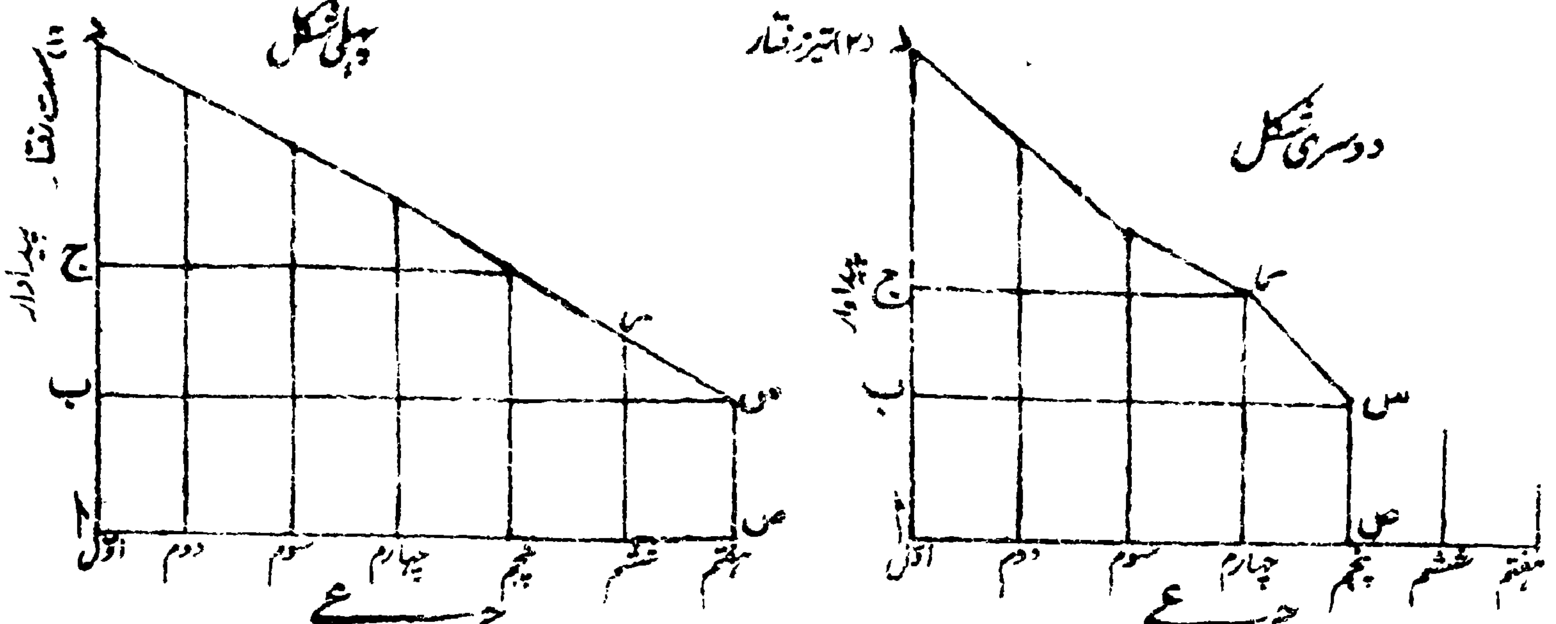
۶۔ جبکہ تمام کھیتوں میں ایک ہی چیز کاشت کی جائے تو لگان نہ مصارف پیدائش کا جزو ہوتا ہے نہ اضافۂ قیمت کا باعث۔ لیکن جبکہ مختلف چیزیں کاشت ہوتی ہوں تو ایک پیداوار کا لگان دوسری پیداوار کے صرف میں بالواسطہ شامل ہو سکتا ہے کسان تو وہی فصل بوئیگا جس سے سب سے زیادہ لگان ملنے کی امید ہو اور جب تک کم از کم اسی قدر لگان کی امید دوسری فصل سے نہ ہو، وہ فصل اول کی بجائے فصل دوم نہ بوئیگا۔ مثلاً کسی کھیت میں آلو کی کاشت سے پچاس روپے لگان ملتا ہے تو آلو بوتے وقت کسان کو یقین ہوگا کہ اس سے زیادہ لگان بلکہ اس قدر بھی کسی دوسری فصل سے نہیں مل سکتا۔ اور اگر واقعہ بھی یہی ہو تو یہ کاشتکار بجائے آلو کے گیہوں اسی وقت بوئیگا جبکہ جدید فصل سے بھی کم از کم پچاس روپے لگان مل سکے بلکہ اسی قدر زیادہ۔ فرض کرو کہ گیہوں کی طلب بڑھے، ادنیٰ کھیتوں کی پیداوار بھی ناکافی رہے اور آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف پیدائش ادنیٰ کھیتوں کے مصارف سے کم نہ ہوں تو اس صورت میں آلو کا کل لگان گیہوں کے مصارف پیدائش کا جزو بنیگا اور اضافۂ نرخ کا باعث ہوگا۔ آلو کا لگان گیہوں کا نرخ بعینہ اس طرح چڑھائیگا جیسے نہر کی جھال پانی کی سطح بلند کرتی ہے۔ ادنیٰ کھیتوں کے مانند

حصہ سوم باب دہم آلو کے کھیت میں بھی گیہوں کے مصارف تین روپے من ہوا سالانہ مقدار پیداوار فی ایکڑ
اب اگر یہ مقدار بوجہ قلت رسد ناگزیر ہو تو کاشتکار آلو کا پچاس روپے لگان گیہوں کے
مصارف میں شمار کرے گا تو تین روپے آٹھ آنے فی من کے نرخ سے گیہوں فروخت کریگا۔
مصارف ظاہر ہے کہ آٹھ آنے فی من محض آلو کے لگان کی بدولت زائد ہو گیا
نیز اگر آلو کے کھیت میں مصارف ادنیٰ کھیتوں سے زیادہ یا کم ہوں مثلاً دو روپے فی من
یا دو روپے بارہ آنے من تو نرخ علی الترتیب تین روپے بارہ آنے فی من اور تین روپے
چار آنے فی من قرار پائیگا لیکن آلو کا لگان ہر حالت میں داخل مصارف ہوکر اضافہ قیمت
کا باعث ہوگا۔ اس صورت میں ادنیٰ کھیتوں کو بھی حاصل زائد ملیگا جس کو
لگان قلت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

یہاں یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اگر آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف
ادنیٰ کھیتوں کے مصارف سے اسقدر کم ہوں کہ آلو کا لگان شامل ہوکر آخر الذکر مصارف کے
برابر ہوں تو گویا کسان کے نزدیک آلو یا گیہوں بونا دونوں یکساں ہے ہر حالت میں
ایک ہی لگان ملیگا اور اگر اس سے کم ہوں تو گویا کاشتکار کو گیہوں کی کاشت سے بمقابلہ آلو کے
زیادہ لگان حاصل ہوگا۔ اور ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی آلو کا لگان جزو مصارف نہ ہوگا۔
گویا آلو کا لگان گیہوں کے مصارف میں اسیوقت شامل ہوکر اضافہ نرخ کا باعث ہو سکتا ہے جبکہ
مجموعی مصارف گیہوں کی ادنیٰ زمینوں کے مصارف سے زیادہ ہوں اور قلت رسد کی وجہ سے
آلو کے کھیت میں پیدا ہوئے گیہوں بھی طلب پوری کرنے کے واسطے ناگزیر ہوں۔

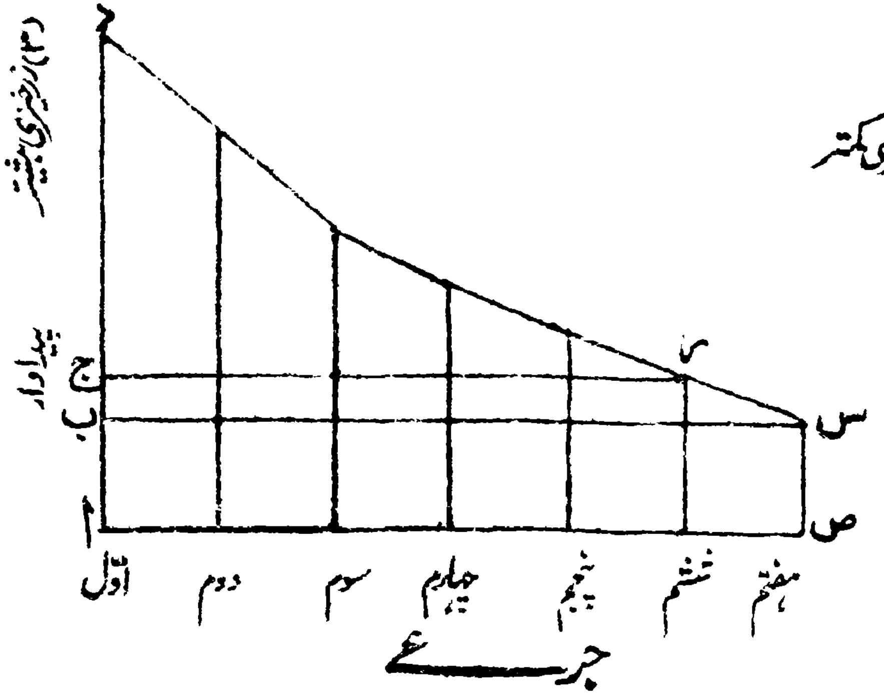
قیمت ۷ جب کسی زرعی پیداوار کی قیمت بڑھتی ہے تو نہ صرف ادنیٰ کھیتوں پر کاشت پھیلنے لگتی
پیداوار ہے بلکہ اعلیٰ کھیتوں کی کاشت بھی زیادہ دقیق ہوتی جاتی ہے۔ اور پیداوار کی بیشتر مقدار
اور لگان قانون تقلیل حاصل کے تحت میں پیدا ہوتی ہے لیکن ہر کھیت میں اس قانون کے عمل
سے تعلق کی رفتار یکساں نہیں جہاں سست ہوتی ہے نسبت مصارف میں تدریج اضافہ ہوتا ہے جہاں
تیز ہوگی جیسے جیسے جوں کے مصارف کی نسبت میں بسرعت نمایاں فرق پیدا ہو جائیگا اب ہم علیحدہ علیحدہ
مختلف زرخیزی والی زمینوں کے لگان پر عمل قانون تقلیل حاصل کی سست اور تیز رفتار کے
لحاظ سے اضافہ قیمت کا اثر بذریعہ اشکال واضح کریں گے کیونکہ محض الفاظ سے یہ مسئلہ
ایسی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا اسکے سمجھنے میں اشکال بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔

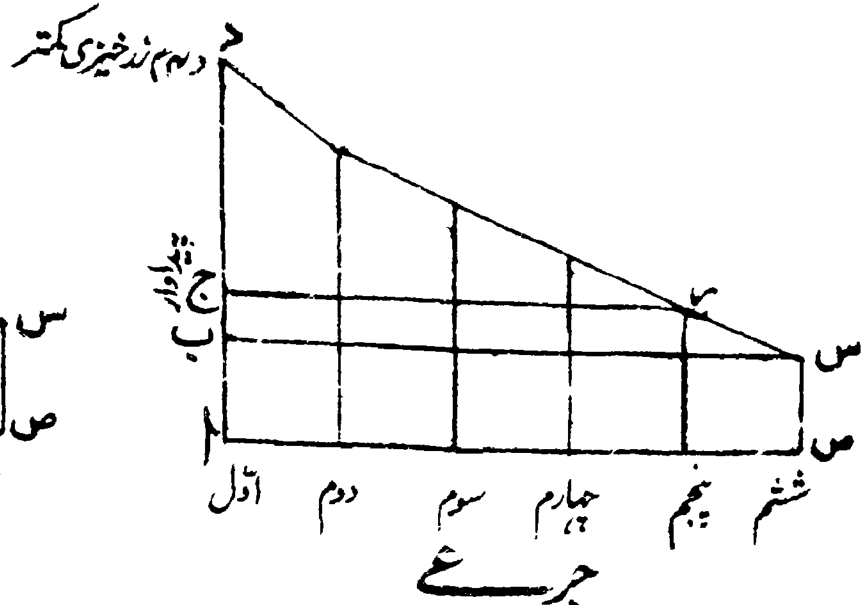
حالتِ اوّل - زرخیزی یکساں عملِ قانونِ تقلیل حاصل کی رفتار مختلف



شکلِ اوّل میں ہر جدید جریب کی پیداوار بتدریج گھٹتی ہے۔ یعنی مصارف نسبتہً آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور دقیق کاشت بڑھانیکی زیادہ گنجائش ہے۔ اسکے برعکس شکل دوم میں جدید جریبوں کی پیداوار بسرعت گھٹتی ہے۔ اور نسبتِ مصارف جلد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کاشتِ دقیق پانچویں جریب پرختم کرنی پڑتی ہے جبکہ پیداوار کا نرخ اسقدر بڑھے کہ بجائے مقدار اج کے اب ہر جریب کے مصارف پورے کردے تو لگان میں بمقدار ب ج م س اضافہ ہوگا مجموعی مقدار بجائے ج د م کے ب د س ہوجائیگی مقابلے سے ظاہر ہے کہ شکل اوّل میں اضافۂ لگان ب ج م س کی مقدار نسبتہً شکل دوم کی مقدار سے بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ اضافۂ نرخ سے قانون تقلیل حاصل کے عمل کی تیز اور سست رفتار کے مطابق علی الترتیب لگان میں اضافہ کم وبیش ہوگا۔

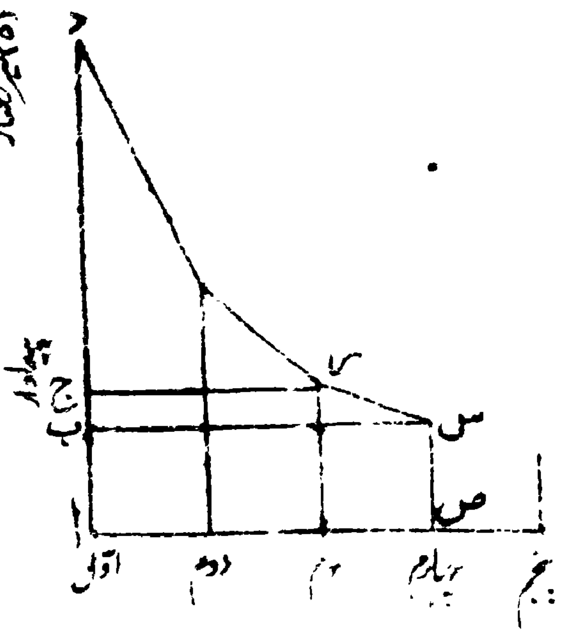
حالتِ دوم۔ زرخیزی مختلف عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں



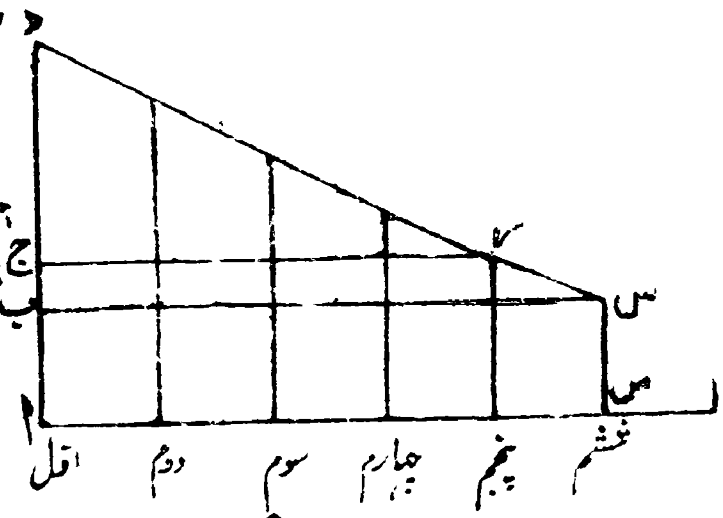


شکل ۳ کی زمین شکل ۴ کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے لیکن قانون تقلیل حاصل دونوں پر ایک ہی رفتار سے عمل کرتا ہے۔ اضافۂ زرخ سے جو جدید لگان ب ج م س حاصل ہوا اُس کی نسبت سابق لگان ج د م سے شکل چہارم میں بمقابلہ شکل سوم کے زیادہ موافق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر قانون کے عمل کی رفتار یکساں ہو تو کمتر زرخیز زمین میں بمقابلہ زیادہ زمین کے لگان نسبتہً زیادہ بڑھیگا۔

حالت سوم۔ زرخیزی مختلف عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار مختلف



جرعے



جرعے

شکل پنجم کی زمین شکل ششم کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے لیکن ساتھ ہی اس کے زمین اوّل میں قانون تقلیل حاصل کا عمل نہایت تیز ہے اور زمین دوم میں سست نتیجہ یہ ہے کہ نرخ بڑھنے سے رقبہ ہائے توازن کے فرق کی بدولت کمتر زرخیز زمین کے لگان میں بمقابلہ بیشتر زرخیز زمین کے زیادہ اضافہ ہوگا۔

حصۂ سوم
باب ہم

حالتِ چہارم۔ زرخیزی یکساں۔ عملِ قانونِ تقلیل حاصل کی رفتار یکساں۔
ظاہر ہے کہ اضافۂ نرخ سے ایسی یکساں زمینوں کے لگان میں مقابلتہً کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ ایک ہی نسبت سے لگان میں اضافہ ہوگا؛

مذکورۂ بالا نتائج سے ایک عملی ہدایت واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اضافۂ نرخ کی امید ہو تو کمتر زرخیز زمینوں کو جن میں عمل قانونِ تقلیل حاصل کی رفتار بھی سست ہو، بقیمتِ حیثیتِ موجودہ خریدنا آئندہ اضافۂ نرخ پر بہت کچھ منفعت کا باعث ہوگا۔ کیونکہ ایسے کھیتوں میں اضافۂ لگان کی نسبت سب سے زیادہ موافق ہوگی چنانچہ واقع میں اعلیٰ کھیتوں کی قیمت نسبتہً اس قدر نہیں بڑھ رہی ہے جس قدر کہ اوسط اور ادنیٰ کھیتوں کی؛

مختلف اور یکساں زرخیز زمینوں کے لگان پر بلحاظِ رفتارِ عملِ قانونِ تقلیل حاصل اضافۂ نرخ کا اثر بالتفصیل بیان ہو چکا۔ اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ کس طرح اضافۂ نرخ سے لگان میں دو طرح کا اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بوجہ اضافۂ نرخ بہ نسبتِ سابق کمتر مقدارِ پیداوار مصارفِ پیدائش پورا کر سکتی ہے۔ اول تو مقدارِ لگان میں اضافہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اضافہ شدہ مقدارِ لگان کی قیمت بھی اسی نسبت سے بڑھ جائیگی۔ مثلاً کسی کھیت میں ۲۰ روپے کی لاگت سے ۶ من غلہ پیدا ہو۔ اب اگر نرخ ۴ روپے من قرار پائے تو لگان کی مقدار ایک من قیمتی ۴ روپے ہوگی۔ اور اگر کسی وجہ سے قیمت ۵ روپے من ہو جائے تو نہ صرف لگان کی مقدار ایک من سے دو من ہو جائیگی بلکہ قیمت بھی بجائے ۴ روپے من کے ۵ روپے من ہو جانے سے بجائے ۴ روپے کے ۱۰ روپے ہوگی پس صاف ظاہر ہے کہ اضافۂ نرخ سے لگان میں دوگونہ اضافہ ہوتا ہے۔ اول مقدار میں دوم اُس کی قیمت میں۔ اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر نرخ گھٹ جائے تو لگان میں اسی طرح دوگونہ تخفیف ہوگی۔ اول مقدار میں، دوسرے اُسکی قیمت میں؛

زرعی ترقیات کا لگان پر اثر

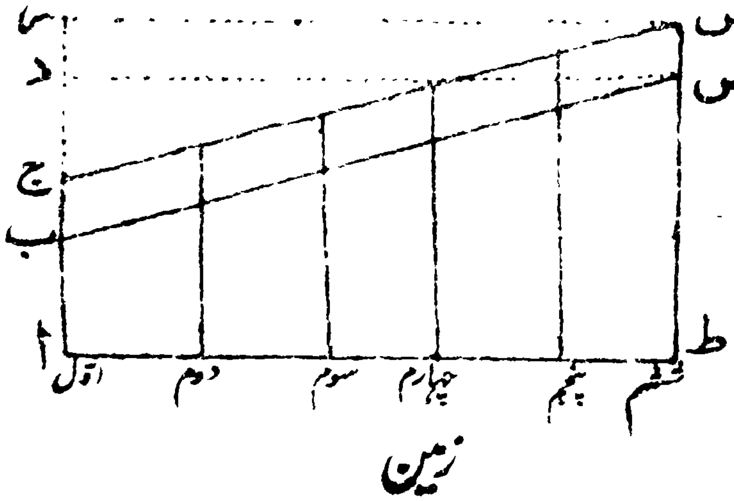
۸۔ زرعی ترقیات کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ کہ صرف مصارفِ پیداوار میں تخفیف کریں اور مقدار پر اُن کا کچھ اثر نہ ہو۔ مثلاً جدید ریلوے لائن یا پختہ سڑک کا اجرا قرب وجوار میں نئی منڈی کا قیام۔ دوسرے وہ کہ زمین کی زرخیزی بڑھاکر

ہر قطعے اور ہر کھیت کی قوت پیدائش میں اضافہ کریں۔ گویا تخفیف مصارف کے ساتھ مقدار پیداوار میں بھی اضافہ ہو مثلاً کھاد، آبپاشی، زراعتی محنت کی ارزانی، جدید آلات کا رواج اور طریق کاشت کی ترقی۔ اب ہم دونوں قسم کی ترقیوں کے نتائج سے جداگانہ بحث کرتے ہیں:۔

۱۔ ترقی قسم اول۔ مقدار پیداوار قائم، مصارف میں تخفیف

اس ترقی سے اگر صرف اعلیٰ زمینیں مستفید ہوں اور ادنیٰ زمینیں بالکل محروم رہیں تو نرخ میں کوئی تخفیف نہ ہو سکیگی۔ صرف اعلیٰ زمینوں کا لگان اور بڑھ جائیگا۔ اس کے برعکس اگر یہ ترقی صرف ادنیٰ کھیتوں تک محدود ہو تو نرخ ضرور گھٹ جائیگا اور اعلیٰ کھیتوں کے لگان میں دوگونہ تخفیف ہوگی لیکن اگر اعلیٰ ادنیٰ دونوں زمینیں یکساں مستفید ہوں یعنی سب کے مصارف میں مقدار معین برابر تخفیف ہو تو نرخ گھٹیگا اور مقدار لگان میں اضافہ ہوگا لیکن لگان کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ یہ پیچیدہ نتیجہ شکل ذیل سے بآسانی سمجھ میں آسکیگا۔

(۲)



اس شکل میں اوّل کمترین و بیشترین مصارف اور قیمت لگان علی الترتیب اج، طس اور ج ہس تھے۔ زرعی ترقیات کی بدولت مصارف میں بقدر ص س برابر تخفیف ہو کر ہر سہ مذکورۂ بالا میں علی الترتیب اب۔ طص اور ب د ص ہوگئیں۔ اصول اقلیدس کی رو سے

ج س اور ب د ص دونوں مثلث برابر ہیں - گویا قیمت لگان میں اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں آیا - لیکن چونکہ نرخ میں تخفیف ہوگئی - ظاہر ہے کہ بہ نسبت سابق لگان کی مقدار بڑھ گئی ہوگی - واضح ہو کہ ادنیٰ اور اعلیٰ تمام کھیتوں کو جن کی پیداوار زیر بحث ہے ایک قطعۂ اراضی تصوّر کرکے ہر ایک کے مصارف بترتیب اضافہ اس شکل میں دکھا کر تخفیفِ مصارف کا اثر لگان کی مجموعی مقدار اور قیمت پر دکھایا جاسکتا ہے - زمینوں کے جداگانہ لگان میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی وہ اس قدر گوناگوں ہوسکتی ہیں کہ اُن کے متعلق کوئی عام اُصول قرار نہیں دیا جاسکتا:

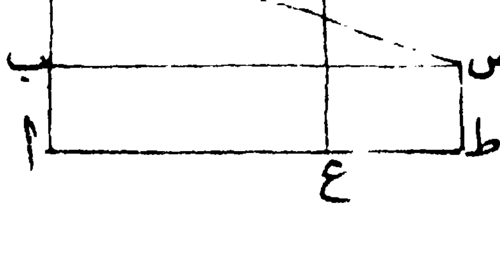
ب - ترقی قسم دوم - پیداوار میں اضافہ بہ نسبت مصارف میں تخفیف ظاہر ہے کہ بوجہ اضافۂ پیداوار نرخ میں تخفیف ہوگی - فرض کرو کہ صرف اعلیٰ زمینوں پر ان ترقیات کا عملدرآمد ممکن ہے - اب اگر تخفیفِ مصارف کمیٔ نرخ سے زیادہ رہے اور باوجود کمیٔ نرخ اعلیٰ زمینوں کے لگان میں تخفیفِ مصارف کی بدولت اضافہ ہوسکے تو یہ ترقیات اعلیٰ زمینوں میں پیدا کی جائیں گی اور بقدر اضافۂ پیداوار ادنیٰ زمینوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہوجائیگی - نتیجہ یہ کہ نرخ گھٹ جائیگا اور لگان میں بھی اضافہ نہ ہوسکیگا - اسکے برعکس اگر کمیٔ نرخ تخفیفِ مصارف پر غالب ہو اور نرخ کی کمی سے باوجود تخفیفِ مصارف لگان گھٹنے کا اندیشہ ہو تو اعلیٰ زمینیں ان ترقیات سے قصداً محروم رکھی جائیں گی اور باوجود امکان یہ ترقیاں وجود میں نہ آسکیں گی - ادنیٰ زمینوں کی کاشت حسبِ سابق جاری رہیگی اور نرخ بھی قائم رہیگا:

دوسرے فرض کرو کہ صرف ادنیٰ زمینوں تک یہ ترقیاں محدود ہوں - تو اُن کے پیدا کرنے سے ادنیٰ زمینوں کو کچھ نہ کچھ ضرور

فائدہ ہوگا - غالباً نرخ میں بقدر تخفیف مصارف جلد کمی نہ ہو سکیگی اور کم از کم کچھ عرصے تک مزید ما حصل ملنا ممکن ہوگا - ایسی حالت میں اعلیٰ زمینیں بے بس اور لاچار ہوں گی اور ادنیٰ زمینوں کی ترقیات کا نتیجہ بذریعہ کمی نرخ اعلیٰ زمینوں کے لگان کی وہی دوگونہ تخفیف ہوگی لیکن اگر کل اعلیٰ و ادنیٰ زمینیں ان ترقیات سے یکساں مستفید ہو سکیں یعنی سب کی پیداوار میں برابر بقدر معین اضافہ ہوسکے تو وجہ اضافہ پیداوار نرخ میں کمی ہوکر اکثر ادنیٰ زمینوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہو جائیگا اور لگان میں وہی دوگونہ تخفیف ہوگی یہ نتیجہ بھی شکل ذیل سے صاف ظاہر ہوگا؛

اس شکل میں ایک ہی معین جرعے کی بیشترین اور کمترین پیداوار اعلیٰ اور ادنیٰ زمینوں سے علی الترتیب ا د اور ص ط ہے - ا سے ط تک کل زمینیں کاشت ہوتی ہیں - مقدار ا ب ص ط مصارف کاشت ادا کرتی ہے اور ب د ص داخل لگان ہے - اب ترقیات کی بدولت ہر جرعے کی پیداوار بقدر د ہ برابر بڑھ جائے اور پیداوار کی مقدار ا ہ س ع - مقدار ا د ص ط کے برابر ہو تو صرف ا سے ع تک زمینیں کاشت ہوں گی اور ع سے ط تک کی کاشت بتدریج ترک ہو جائیگی - مقدار ا ج س ع مصارف پورے کریگی اور مقدار ج ہ س لگان بنجائیگی جوکہ سابق مقدار لگان ب د ص سے مقابلۃً بہت کم ہے - گویا ترقیات کی بدولت نرخ میں کمی ہوگی - ادنیٰ کھیتوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہوگا - اور لگان میں دوگونہ تخفیف ہوجائیگی۔

(۸)



اس شکل میں بھی ہم نے مثل شکل نمبر ۷ کل زمینوں کو ایک

قطعہ اراضی اصور (؟) کے ترقیات کا اثر لگان کی مجموعی مقدار او قیمت پر۔
ظاہر کیا ہے۔ ہر زمین کی جداگانہ تبدیلیوں کے متعلق بوجہ کثرت اختلافات
کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جاسکتا۔

واضح ہو کہ ترقیات کا لگان پر جو اثر پڑتا ہے، اُس کا ہر حال میں صحیح صحیح پتہ لگانا محال ہے۔ ہم نے صرف چند نہایت عام اُصول قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تغیرِ حالات سے اُن اصول کے عملدرآمد میں بہت رد وبدل ممکن ہے۔ یہ جتانا بھی لازمی ہے کہ مذکورہ بالا نتائج چند ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو ہمیشہ واقعات کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ دقت اور پیچیدگی سے بچنے کے لئے ہم نے کل نتائج میں طلب کو معین اور غیر متبدل فرض کیا ہے۔ حالانکہ طلب میں برابر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی سے نتائج کی صحت پر بہت کچھ موافق یا مخالف اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی طرح حسبِ ضرورت بعض نتائج میں پیداوار کے اضافے اور مصارف کی تخفیف کو بھی یکساں بمقدار معین فرض کیا ہے۔ حالانکہ اکثر یہ تبدیلیاں ہر زمین میں بمقدارِ مختلف ہوتی ہیں۔ یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ خلاف واقع حالات فرض کر کے نتائج مرتب کرنے سے واقعات سمجھنے میں کیا مدد مل سکتی ہے تحقیق کا یہ بھی ایک مسلمہ علمی طریق ہے جس کو طریق تسہیل کہتے ہیں پیچیدہ مسائل کے سلجھانے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ چند عام مفروضات متعلقہ گو خواہ ایک حد تک وہ بعید از واقع ہی کیوں نہ ہوں، سیدھے سادے اُصول قرار دے کر بتدریج واقعات کے اثر کا لحاظ کر کے ان عام نتائج میں ردّ وبدل کر دیئے بالآخر نتائج واقعات کے مطابق بنائے جاسکتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے بعض پیچیدہ مسائل کا حل کرنا اگر محال نہیں تو بدرجہا دشوار ضرور ہوگا۔ مسئلۂ لگان کے مختلف پہلوؤں پر اس وقت تک جو کچھ کہا گیا، اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بحث کا تعلق سال بسال جیسے مختصر دوران وقت کے بجائے سالہا سال کے وسیع زمانے سے ہوتا ہے۔ تمام اسباب ونتائج متعدد سال کے عرصے پر مبنی ہیں۔ سالانہ عارضی تبدیلیاں اس بحث میں ناقابلِ لحاظ سمجھی جاتی ہیں۔

حصۂ سوم
باب دہم
مِلکِ اراضی اور کاشت

۹۔ اکثر مہذب ممالک میں زمینداروں کا ایک ممتاز گروہ ایسا پایا جاتا ہے کہ بیشتر زرعی زمینیں ان کی مِلک ہوتی ہیں لیکن خود کاشت کرنے کے بجائے وہ اکثر پیداوار کے مقرر حصے یا رقم معیّن کی فصلانہ ادائگی کے معاوضے میں جس کو قانوناً لگان کہتے ہیں، دوسرے لوگوں کو وقتِ معیّن کے واسطے اپنی زمین پر کاشت کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہی طریق بکثرت رائج ہے۔ مِلک اور کاشت کی موجودہ علٰحدگی سے زراعت کی ترقی میں بڑی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں جن کو رفع کرنے میں قانون بہت سرگرمی سے مصروف نظر آتا ہے۔ چونکہ کاشتکار کا تعلق زمین سے محض چند روزہ ہوتا ہے اور اضافۂ لگان کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے۔ وہ کھیت کی درستی اور کاشت کی ترقی میں ایسی جان توڑ کوشش نہیں کرتا جیسی کہ خود مالک ہونے کی حالت میں کرتا اور سچ پوچھو تو اس کا ایسا کرنا محض اقتضائے فطرت ہے۔ تعلق کے عارضی ہونے کا خیال اور ماحصل کے ایک جزو سے بھی محروم رہنے کا اندیشہ خود قدرةً کوشش کے منافی ہے۔ قانون ان موانع کا زور توڑنے کی بہت کوشش کر رہا ہے۔ زمیندار کو خود اس کے ذاتی نفع کے دباؤ سے زیادہ زیادہ عرصے کیواسطے کاشتکار کو حقِ کاشت دینے کی بدرجۂ مجبوری ترغیب دیتا ہے۔ اضافۂ لگان پر طرح طرح سے حدود اور بندشیں قائم کرتا ہے۔ اور بیدخلی کے وقت کاشتکار کو زمیندار سے اُن تمام ترقیات کا معاوضہ دلاتا ہے جو کاشتکار نے اپنے صرف سے کھیت میں پیدا کی ہوں۔ بعض صورتوں میں کاشتکاروں کو تقریباً نیم مِلک کی حد تک حقوق دے دیئے جاتے ہیں ان پر لگان بڑھانا نہایت دشوار اور ان کو بیدخل کرنا شاذ و نادر ممکن ہوتا ہے۔ اور بعض بیدخلی سے قطعاً مستثنےٰ کر دیئے جاتے ہیں۔ ان حقوق کے پیدا ہونے کی شرائط جو قانون نے مقرر کی ہیں وہ بھی زیادہ سخت نہیں۔ ایسے خاص حقوق والے کاشتکار دخیلکار اور باقی عام غیر دخیلکار کہلاتے ہیں۔ غرضکہ قانون نے کاشتکار کو اضافۂ لگان، بیدخلی اور معاوضۂ ترقیات کے لحاظ سے زمیندار کے جبر و تشدد کے مقابلے میں بہت معقول امان دی ہے۔ اور غرض واحد یہی ہے کہ کاشتکار

حصۂ سوم
باب دہم

ترقئ زراعت میں دل سے کوشش کرے اور اپنی کوشش کا پھل پائے؛

زمیندار و کاشتکار اور خود کاشت زمیندار دو طریق مروج ہیں۔ اوّل بہت عام ہے لیکن دوم بدرجہا بہتر ہے۔ ملک اور کاشت کی جدائی جس قدر ترقئ زراعت کے منافی ہے ان کی یکجائی اسی قدر معاون ہے۔ چنانچہ قانون کا خاص منشا طریق اوّل کو حتی الوسع طریق دوم کے مشابہ بنانا قرار پاچکا ہے۔ معاشئین کا ایک گروہ سرکار و کاشتکار کا طریق تجویز کرتا ہے۔ گویا قوم اور گورنمنٹ کو زمیندار کا جانشین بنانا چاہتا ہے۔ اس جدید طریق پر بہت کچھ اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔ حامی اس کو طریق دوم پر قابل ترجیح بتاتے ہیں۔ معترض خلافِ انصاف اور ناقابلِ عمل ثابت کرتے ہیں۔ ہم بھی اس کی خوبیوں اور نقائص سے اسی باب کے آخر میں مختصراً بحث کریں گے؛

زمینداری لگان

۱۰۔ زمیندار کاشتکار سے جو لگان لیتا ہے۔ اُس کا ایک جزو تو اس اصل کا سود ہوتا ہے جو زمیندار نے اس زمین کے خریدنے اور اس کی ترقیات میں لگایا ہے جو کچھ باقی رہے وہ کاشتکار کو حق کاشت دینے کا معاوضہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی مقدار کا جو رواج یا قانون یا معاہدے کے مطابق قرار پاتی ہے، معاشی لگان کے مساوی ہونا ضرور نہیں۔ اگر کم ہے تو کاشتکار کا فائدہ ہے۔ اگر برابر ہے تو نہ فائدہ نہ نقصان اور اگر زیادہ ہے تو کاشتکار یہ زائد یا تو اپنی ذاتی محنت اور اصل کے اجرت و سود میں سے یا بشرطیکہ طلب رسد پر غالب ہو، اس کو داخل مصارف کر کے اور نرخ بڑھا کر جدید تحصیل زائد سے ادا کریگا۔ گویا زمینداری لگان کا معاشی لگان سے زائد حصہ یا تو غریب کاشتکار کی ذاتی اجرت اور سود کاٹ کر اس کو ہمیشہ کے واسطے خستہ حال یا چند روز میں تباہ کردیگا یا بحالتِ غلبہ طلب داخل مصارف ہو کر نرخ بڑھادیگا اور خریداروں یعنی عوام کی جیب سے ادا ہوگا۔ لیکن زائد حصہ اکثر کاشتکار اور خریدار دونوں مل کر ادا کرتے ہیں جس کا نتیجہ نہ صرف زرعی پیداوار کی گرانی بلکہ کاشتکار کی تباہ حالی بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے حالات ابھی نایاب نہیں ہیں لیکن کم ضرور ہو رہے ہیں؛

حصۂ سوم
باب یازدہم

زمین کی رسد اور طلب کا زمینداری لگان پر خاص اثر پایا جاتا ہے۔ گنجان آباد ملکوں میں جہاں زمین بکثرت دستیاب ہو سکتی ہے زمینداری لگان سکے اصل کے سود سے بہت کم بڑھ سکتا ہے۔ اس کے برعکس قدیم ممالک میں جہاں آبادی گھنی ہے زمین کی قلت ہے اور عام ذریعہ معاش زراعت ہے۔ زمینداری لگان معاشی لگان سے بھی بڑھ کر یا تو کاشتکار کو زیربار کرتا ہے یا پیداوار کے خریدار کو۔ بالفاظ دیگر کاشتکار کی آمدنی گھٹاتا ہے یا نرخ پیداوار چڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان اور آئرلینڈ کے بعض حصوں میں یہ نوبت آگئی ہے۔ قانون حتی الامکان زمینداری لگان کو حد اعتدال سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔

یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ زمینداری لگان کیونکر قرار پائے؟ آیا وہ پیداوار کا کوئی مقررہ حصہ ہونا چاہیئے مثلاً تہائی۔ چوتھائی یا بحساب پیداوار بشکل زر مقرر ہو۔ آنے یا روپے من یا کوئی مقدار معین ہو۔ مثلاً دس یا پندرہ من یا کوئی رقم مثلاً چالیس یا پچاس روپے۔ لگان قسم اول سب سے بہتر ہے کیونکہ زمیندار مقدار اور نیز قیمت کی کمی بیشی میں حصہ رسد شریک رہتا ہے۔ صورت دوم بھی اول کے مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ لگان اور پیداوار کی باہمی نسبت نرخ کے اضافے اور تخفیف کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے۔ بشکل سوم گو مقدار لگان معین ہے لیکن کم از کم نرخ کی کمی بیشی میں زمیندار کی شرکت قائم رہتی ہے لیکن بحالت چہارم زمیندار کو نہ مقدار پیداوار سے تعلق نہ نرخ سے کچھ سروکار۔ ہر حالت میں وہ اپنی مقررہ رقم کا طالب ہوتا ہے لیکن جبکہ بوجہ قلت بارش یا وبا پیداوار میں نمایاں کمی واقع ہو تو قانون بخیال انصاف زمیندار کو وصولی لگان کچھ عرصے تک ملتوی کرنے یا لگان کا مناسب حصہ معاف کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

سرکاری مالگزاری ۱۱۔ گورنمنٹ پیداوار زمین کا جو حصہ خود لیتی ہے مالگزاری کہلاتا ہے۔ ایک حد تک یہ خیال صحیح ہے کہ جب سرکاری حصہ زمینداری لگان کا ایک جزو ہو، جیسا کہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں بقدر نصف پایا جاتا ہے تو مالگزاری سے صرف زمیندار کی آمدنی گھٹ جاتی ہے۔ کاشتکار پر کوئی اثر

نہیں پڑتا۔ خواہ کُل لگان زمیندار کی جیب میں رہے یا گورنمنٹ اسمیں حصّہ بانٹے، کاشتکار کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ گورنمنٹ کی حصّہ طلبی سے زمیندار کو لگان بڑھانے کی ترغیب پیدا ہوسکتی ہے اور اپنی سابق مقدارِ لگان برقرار رکھنے کے لئے وہ تاحدِّ امکان مالگزاری کا بار کاشتکار پر ڈالنے کی کوشش کرے تو عجب نہیں۔ مگر دوراندیشی سے بذریعۂ قوانین اضافۂ لگان پر ایسی شرائط عائد کردی گئی ہیں کہ زمیندار کو مالگزاری کا کوئی جزو کاشتکار پر منتقل کرنے کا بہت کم موقع مل سکتا ہے اور جہاں زمیندار موجود نہ ہوں اور سرکار مالگزاری براہ راست کاشتکار سے وصول کرے، جیسا کہ دکن میں ہوتا ہے تو سرکار کی حیثیت زمیندار کی ہوجاتی ہے اور مالگزاری کا مُضر اور غیر مُضر اثر حسبِ حالات زمینداری لگان کا سا پڑتا ہے۔ پس اگر حقیقتہً مالگزاری معاشی لگان کے اندر اندر رہے تب تو کچھ مضائقہ نہیں، صرف زمیندار یا کاشتکار کے ماحصلِ زائد میں سے حصّہ نکل جائیگا۔ لیکن اگر اس حد سے آگے بڑھ کر زمیندار کے سود یا کاشتکار کی اجرت وسود میں سے بھی حصّہ بانٹے تو اس کے دو نتیجے ممکن ہیں۔ زرعی ترقیات میں رکاوٹ، زراعت میں تنزّل یعنی پیداوار میں کمی ہونا تو بہرصورت یقینی ہے۔ اب اگر تحقیق رسد سے پیداوار کی قیمت میں معقول اضافہ ہوسکا تو مالگزاری کا بار بقدرِ اضافۂ قیمت خریداروں یعنی عوام پر جا پڑیگا، کچھ زمیندار اور کاشتکار کے سود اور اجرت سے وصول ہوگا اور باقی بے لگان والے کھیتوں کے غریب کاشتکاروں کی زراعت روک کر اور ان کو تباہ کر کے خود بھی غارت ہوجائیگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ قیمت میں اضافہ نہ ہوسکا، تو زراعت بند ہونے سے کاشتکار برباد ہوجائیں گے اور سرکار کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئیگا۔ جب زراعت ہی نہ ہوگی تو مالگزاری کہاں سے آئیگی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ تعینِ مقدارِ مالگزاری میں جید اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ بزعمِ خود سرکاری آمدنی بڑھانے کے خیال سے بے بس زمیندار اور بے زبان کاشتکار پر مالگزاری از حد بڑھا دینا مرغی مار کر ایک دم سونے کے انڈے نکالنے کی عاقلانہ حرکت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

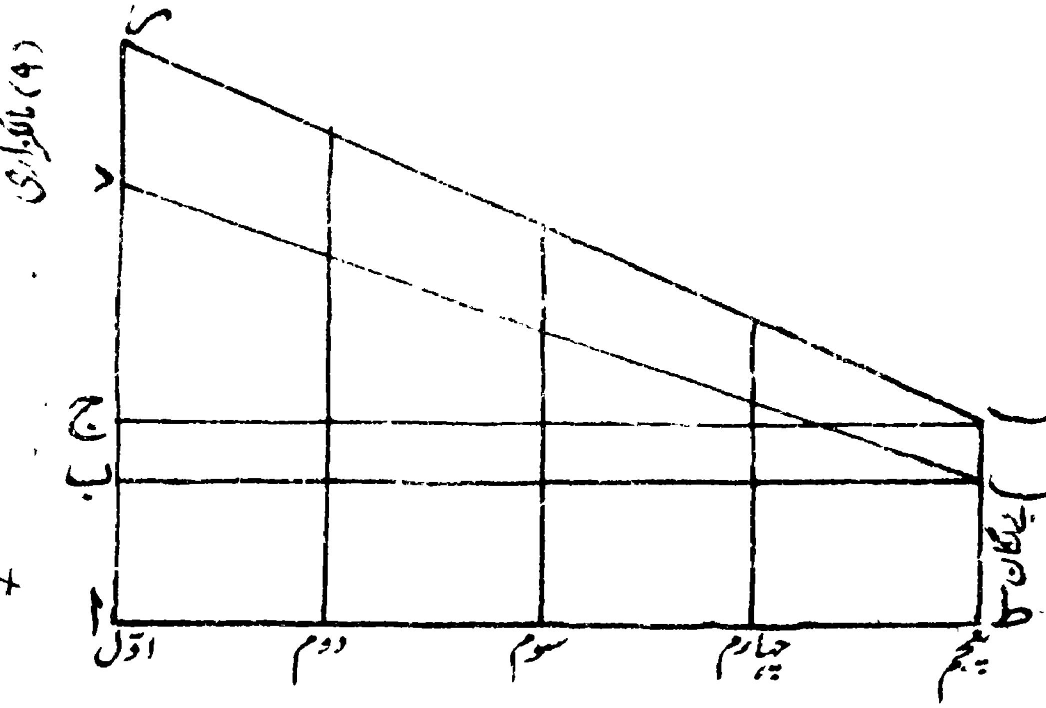
شمالی ہندوستان میں مالگزاری ترقی زراعت میں کمست-ہارج نظر آتی ہے۔ لیکن مسٹر جسٹس راناڈے، آنریبل مسٹر گوکھلے اور مسٹر رومیش چندر دت جیسے معاملہ فہم اور باخبر لوگ جنھوں نے ہندوستان کے معاشی حالات کا مطالعہ اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے دیا تھا اور جن کو اہل الرائے سمجھے جانے کا پورا حق حاصل ہے، شاکی ہیں کہ خصوصاً دکن میں مالگزاری حدِ مناسب سے تجاوز کر کے کم و بیش وہی افسوسناک نتائج پیدا کر رہی ہے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور شمالی ہندوستان میں آئندہ اضافہ احتیاط طلب ہے۔ نہ معلوم گورنمنٹ ہندوستانیوں کے ایسے بے لوث اور قابلانہ مشوروں سے مستفید ہونا کہاں تک پسند کرتی ہے۔ لیکن معاشی قوانین بدلنا بھی گورنمنٹ کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے:

اگر معاشی لگان تمام زمینوں پر بشرح معین مثلاً کل پیداوار کی ایک چوتھائی مالگزاری قائم کی جائے تو اُس کا کاشت اور نرخ پر کیا اثر ہوگا؟

پیدائشِ لگان کی بحث میں ہم نے چند ایسے ادنیٰ کھیتوں کی کاشت یا انتہائی جرعوں کا استعمال فرض کیا ہے جن کے مصارف پیدائش پیداوار کی قیمت کے برابر ہیں اور جن پر کچھ لگان نہیں ملتا۔ ان کو اصطلاحاً زمین بے لگان یا جرعۂ بے لگان کہتے ہیں۔ اب اگر بے لگان زمین یا بے لگان جرعوں کی پیداوار مجموعی پیداوار کا جزوِ قلیل ہو اور سخت ناگزیر نہ ہو تو ایسی زمینوں کی کاشت اور جرعوں کا استعمال ترک ہو کر مقدار پیداوار میں خفیف سی کمی ہو کر نرخ میں تھوڑا سا اضافہ ہونا ممکن ہے۔ لیکن مالگزاری کا بیشتر حصہ معاشی لگان سے وصول ہوگا۔ اور بحیثیتِ مجموعی کاشت اور نرخ پر کوئی قابلِ لحاظ اثر نہیں پڑیگا۔ صرف زمیندار یا کاشتکار کی آمنی (جو اب تک کل معاشی لگان پا رہے تھے) گھٹ جائیگی:

اس کے برعکس اگر بے لگان زمین اور جرعوں کی پیداوار مجموعی مقدار کا جزوِ اعظم ہو اور قطعاً ناگزیر ہو تو کاشت بحالتِ موجودہ جاری رہیگی۔

مالگذاری مصارف میں شامل ہوکر اسی قدر نرخ بڑھادیگی - اور زمین کے لگان کی قیمت وہی رہیگی البتہ مقدار میں تخفیف ہوجائیگی - چنانچہ شکل نمبر ۹ سے یہ نتیجہ بخوبی واضح ہوگا ؛



زمینیں

قبل مالگزاری نرخ ا ج ہے اور مقدار لگان ج ر س بعد قیام مالگزاری بشرح ایک چوتھائی پیداوار نرخ بھی اس شرح سے بڑھکر ا ب ہوجاتا ہے - لگان کی مقدار گھٹ کر ب د ص رہ جائیگی لیکن بوجہ اضافۂ نرخ قیمت سابق برقرار رہیگی - اس شکل میں مختلف زرخیزی کی زمینوں کا اوسط پیداوار فی جریب دکھایا گیا ہے اور بغرض سہولت فرض کیا گیا ہے کہ تمام زمینوں میں صرف ایک ہی جریب استعمال ہوتا ہے ؛

یا فرض کرو کہ اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ تین زمینیں ہیں جن سے علی الترتیب ۱۲، ۱۰ اور ۸ من غلہ پیدا ہوتا ہے اور نسبت مصارف ۴، ۵ اور ۶ روپیہ من ہے - اس حالت میں اعلیٰ اور متوسط زمین کو ۵ من اور ۲ من لگان قیمتی ۳۰ و ۱۲ روپیہ حاصل ہوگا - اب فرض کرو کہ تینوں زمینوں پر بشرح ایک چوتھائی

حصہ سوم
باب دہم

پیداوار مالگزاری قائم کر دی جائے اور ادنیٰ زمین کی پیداوار بھی سخت ناگزیر ہو، چونکہ ادنیٰ زمین ہمارے مفروضے کے مطابق بے لگان ہے اس کے باقی ۸ من کی قیمت لازماً سابق ۸ من کے برابر ہو جائیگی اور نرخ بجائے ۶ روپے من کے ۸ روپے من قرار پائے گا۔ چونکہ کل کی $\frac{1}{4}$ مالگزاری باقی $\frac{3}{4}$ کے ایک تہائی یعنی $\frac{1}{4}$ کے برابر ہے قیمت بھی اسی نسبت سے ۶ روپے کے $\frac{1}{3}$ کے برابر بقدر ۲ روپے بڑھ کر ۸ روپے ہو جاتی ہے۔ گویا مالگزاری اور اضافۂ نرخ کی نسبت یکساں ہوتی ہے۔ قیام مالگزاری کے بعد اعلیٰ اور متوسط زمین کا لگان علی الترتیب {مصارف (۵×۱۴) — (۱۱$\frac{1}{4}$ × ۸) قیمت} = ۳۰ روپے اور {مصارف (۵×۱۲) — (۹×۸) قیمت} = ۱۲ روپے رہے لیکن بوجہ اضافۂ نرخ مقدار بجائے ۵ من اور ۲ من کے صرف ۳$\frac{3}{4}$ اور ۱$\frac{1}{2}$ رہ جائیگی۔ ان دو مثالوں پر غور کرنے سے مذکورۂ بالا نتائج صاف ظاہر ہو سکتے ہیں ؛

واضح ہو کہ اگر مالگزاری مقدار پیداوار کے کسی حصے کے بجائے بحساب زر مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ فی من پیداوار۔ تو بھی معاشی لگان پر وہی اثر پڑیگا جو اوپر بیان ہوا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ بحالت اول مالگزاری اور پیداوار کی باہم نسبت معین ہے مثلاً ایک ثلث یا چہارم پیداوار اور بحالت آخر پیداوار کی گرانی اور ارزانی کے بموجب مالگزاری کی نسبت بھی علی الترتیب گھٹتی بڑھتی رہیگی۔ مثلاً شرح مالگزاری ایک روپیہ من ہو۔ اب اگر نرخ پیداوار پانچ روپے من ہے تو مالگزاری پیداوار کا پانچواں حصہ ہوگی اور اگر نرخ گھٹ کر چار روپے من رہ جائے تو مالگزاری بڑھ کر پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ ہو جائیگی ؛

تقرر مالگزاری کی چار صورتیں اوپر بیان ہوئیں۔ یا تو وہ ایک معین مقدار ہو مثلاً دس یا پانچ من، یا کوئی مقررہ رقم ہو مثلاً دس بیس روپے، یا پیداوار کا ایک مقررہ حصہ ہو مثلاً ایک ثلث یا چہارم، یا بحساب پیداوار بشکل زر مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ یا آٹھ آنے من۔ یہی چار صورتیں زمینداری لگان کی بھی بیان

ہو سکتی ہیں۔ دونوں حالتوں میں نتائج بھی یکساں نمودار ہوتے ہیں۔ زمینداری لگان اور سرکاری مالگزاری میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ زمیندار کاشتکار کی رضامندی بغیر لگان مقرر نہیں کرسکتا۔ لیکن سرکار کو اختیار ہے۔ جو کچھ مالگزاری مناسب سمجھے مقرر کردے، آگے چل کر نتیجہ بُرا نکلے یا بھلا؛

مین کو
می ملک
بنانے کی
تجویز

۱۳۔ لگان میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے وہ زمین کی قدرتی خواص اور ایسی عام معاشی ترقیات کا نتیجہ ہے جس میں زمیندار کی ذاتی کوشش کو کچھ دخل نہیں۔ زمین کی ترقی میں زمیندار اگر کچھ محنت اور اصل صرف کرتا ہے تو اُس کا معاوضہ بشکلِ اجرت وسود لگان سے جداگانہ شمار ہوتا ہے۔ زمیندار کے حق میں لگان کو محض خوش قسمتی اور حسنِ اتفاق کا نتیجہ کہنا خلافِ واقعہ نہ ہوگا۔ یہی حال زمینوں کی قیمت کا ہے کہ مالک کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ اضافۂ قیمت بھی اسبابِ لگان کا پیدا کیا ہوا نتیجہ ہے۔ حاصل کلام یہ کہ لگان اور نیز قیمتِ زمین قدرت اور بیشمار غیر متعلق لوگوں کی کوشش سے بسرعت بڑھ رہی ہے اور ہر اضافے پر صرف قبضہ کرلینا زمیندار کا کام ہے۔ شہرِ شکاگو میں ایک اُفتادہ زمین جو سنہ ۱۸۳۰ء میں محض مُفت ایک آنہ فی مربع گز سے بھی کم قیمت پر خریدی گئی چونسٹھ برس کے عرصے میں حسنِ اتفاق کی بدولت شہر کی توسیع سے اسکا موقع ایک ایسے آباد اور کاروباری چوک کے کنارے آپڑا کہ سنہ ۱۸۹۴ء میں وہی زمین تین ہزار روپے گز سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی۔ غضب ہے کہ سنہ ۱۸۹۵ء میں لندن کے مشہورِ عالم بازار لمبارڈ اسٹریٹ کے پہلو میں ایک قطعۂ اراضی سترہ ہزار روپئے فی گز سے کچھ ہی کم قیمت پر فروخت ہوا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عام مُلکی اور معاشی ترقیات جو بیشمار لوگوں کی محنت اور اصل کی کوشش کا نتیجہ ہیں، لگان اور قیمت یوں بے حد وحساب بڑھائیں تو ان اضافوں کی مالک بھی منجانب مُلک گورنمنٹ کیوں نہ بنے۔ مالکِ زمین اپنی محنت اور اصل کا معاوضہ شوق سے لے لیکن ماحصل زائد کے لامحدود اضافوں سے اس کو کیا تعلق عوام کی کوشش اور صرف سے

تو پیدا ہوتا ہے اور عوام کی نمائندہ گورنمنٹ اس کی جائز حقدار ہے۔
اضافۂ حاصل زائد پر گورنمنٹ کے قبضہ کرنے کی چند ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں
ایک تو یہ کہ گورنمنٹ کل زمین مالکوں سے خود خرید لے لیکن اوّل تو اسکے واسطے
کافی رقم مہیا ہونی دشوار، دوسرے بحیثیت مالک سرکار لاتعداد قطعات
کا انتظام بہت طوالت طلب اور بیش خرچ ہوگا۔ زیادہ آسان ترکیب یہ ہے
کہ سرکار مالگزاری اور ہاؤس ٹیکس اس قدر بڑھا دے کہ مالک زمین کو اس کے
اصل اور محنت کا جو خرید زمین اور اس کی ترقیات میں صرف ہوئی ہو پورا پورا معاوضہ
مل کر باقی کل اضافہ داخل خزانہ ہو۔ اس صورت میں گورنمنٹ بہت کچھ دردسری سے
بچ جائیگی اور مقصد اصلی بھی حاصل ہوجائیگا چنانچہ اکثر مہذب ممالک میں یہ طریق
رواج پا رہا ہے۔

لیکن واضح ہو کہ طریق آخر الذکر میں بھی چند خطرناک نقائص ہیں۔
اوّل تو زمیندار کے اصل و محنت کا معاوضہ باقی رکھنا نہایت دشوار کام ہوگا
اور اندیشہ ہے کہ سرکاری ملازموں کا اندازہ اکثر غلط ہو، بعض اوقات زمیندار
کے حق میں مضر ہوگا۔ یہ طرز عمل نہ صرف انصاف کے خلاف ہے بلکہ نیز ترقیات
اور اضافۂ کاشت یا بالفاظ دیگر ملکی مرفہ الحالی کے بھی منافی ہوگا۔ دوسرے جبکہ
گورنمنٹ اضافۂ لگان و قیمت زمین کی مالک بنتی ہے تو عام حالات کی کمی
تبدیلی سے زمیندار کے معاوضہ میں جو کمی پیدا ہو اس کی تلافی بھی
گورنمنٹ پر فرض ہونی چاہیئے ورنہ نفع سمیٹنا اور نقصان کا بار زمیندار پر
ڈالنا تو وہی مثل ہوگی کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ
گورنمنٹ اپنی گرہ سے ایسے نقصانات کی تلافی کرنے پر کہاں تک آمادہ ہوگی
تیسرا اعتراض بھی معقول ہے کہ کل لگان یا اضافۂ قیمت پر گورنمنٹ کا
قبضہ ہوجانے سے زمین کی قیمت بہت گھٹ جائیگی اور جن لوگوں نے موجودہ
بڑھی ہوئی شرح سے زمین خریدی ہے یا تو ان کو جدید تخفیف قیمت کا معاوضہ
ملنا چاہیئے یا تخفیفۂ لگان سے اس کل رقم کا سود خارج کرنا چاہیئے جو اُس نے
قیمتاً ادا کیا ہو۔ ورنہ کسی عام شرح سے ان پر مالگزاری یا ٹیکس قائم کرنا بے جا

بتہ سوم اور ظلم ہوگا ؛ ب دہم

ظاہر ہے کہ طریق دوم کے رواج میں بھی کس قدر احتیاط لازمی ہے اور اس کا لحاظ رکھنے کی سرکاری ملازموں سے توقع کرنا خلاف تجربہ اور مشاہدہ ہے بداحتیاطی جس کا سرکار کے موافق اور زمیندار کے مخالف ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے صرف لوگوں کے حق میں ظلم بلکہ عام بہبودی اور مرفہ الحالی کیواسطے سخت مضر ہوگی ؛

گویا سب سے بہتر یہ ہے کہ جدید نظام میں کوئی بڑا ردو بدل نہ کیا جائے۔ اضافۂ لگان اور ہاؤس ٹیکس میں نہ صرف بلحاظ انصاف بلکہ بخیال بہبودی عامہ اعتدال ملحوظ رہے ۔ ملکی ترقی روک کر سرکاری آمدنی بڑھانا گویا مرغی مار کر سونے کے انڈے لینے کی ہوس کرنا ہے ۔ البتہ اب سے موجودہ طریق ملک کو روکا جائے، جو زمینیں اب تک کسی کی ملک نہ ہوں سرکار اُن پر قبضہ کر لے اور اُن کے لگان اور قیمت کی بلا شرکت غیرے مالک بنے۔ چنانچہ اسی اصول پر جنگلات سرکاری ملک قرار دیئے جا رہے ہیں۔ عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک زمین کے معاملے میں صرف گزشتہ را صلوٰۃ و آئندہ را احتیاط کا اصول قابل عمل اور بیضرر نظر آتا ہے۔ زمین کے شخصی ملک کا موجودہ طریق ناقص سہی لیکن اس قدر پھیلا ہوا ہے اور مستحکم جڑ پکڑ چکا ہے کہ اسکے استیصال کی کوشش سے اور بھی زیادہ مضرت پہنچنے کا خوف ہے ۔ البتہ ایک حد تک بتدریج اصلاح ممکن ہے ؛

باب یازدہم

اُجرت

(۱) اجرت کا مفہوم (۲) قوانینِ اُجرت (۳) مسئلۂ اجرت فنڈ
(۴) مسئلۂ معیارِ زندگی (۵) مسئلۂ پیداآوری محنت (۶) مسئلۂ پیداآوری مختتم
(۷) اقسامِ اُجرت (۸) فرقِ اجرت کے اسباب (۹) ارزانی و گرانی محنت
(۱۰) اضافۂ اجرت اور اُس کے نتائج

اجرت کا مفہوم

۱۔ یوں تو ہر قسم کی محنت کا معاوضہ اُجرت ہے۔ مثلاً درزی دس روپے کا کپڑا خرید کر کوٹ تیار کرے جو بارہ روپے کو فروخت ہونے چاہئیں تو یہ دو زائد روپے اُس کی محنت کی اجرت شمار ہونی چاہئے۔ لیکن معاشیات جس اُجرت سے بیشتر بحث کرتا ہے وہ محنت کی ایک خاص حالت سے متعلق ہے۔ ہم اصلہ داروں اور آجروں کی نوعیت مختصراً دولت کے حصے داروں کے تحت میں بیان کر چکے ہیں (دیکھو) جب سے ان دو طبقوں نے زور پکڑا، مزدوروں کا بھی ایک گروہ کثیر پیدا ہو گیا۔ اور محنت کی بھی مثل دیگر اشیا باقاعدہ خرید و فروخت ہونے لگی۔ محنت فروش مزدور، خریدار آجر اور قیمت اُجرت کہلاتی ہے۔ اس سے قبل نہ تو تجارتِ محنت کا بازار اس قدر گرم تھا اور نہ اجرت مثل قیمت معاشی قوانین کی اس قدر پابند ہو سکتی تھی۔ اکثر صنّاع اور پیشہ ور اپنے ہی اصل سے بطورِ خود چیزیں تیار کرتے تھے۔ پیداوار کی قیمت میں سود اور اُجرت دونوں شامل تھے۔ لیکن بوجہ یکسو احد ہونے کے اُن کی تفریق غیر ضروری تھی۔ محنت کی خرید و فروخت خانگی خدمات مثلاً باورچیگری، سائیسی، خدمتگاری یا چند معزز پیشوں مثلاً معلمی، طبابت تک محدود تھی۔ شرحِ اجرت بیشتر رسم و رواج کی پابند تھی اور تعیین شرح پر معاشی قوانین کا اثر آجکل کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔ گوناگوں ترقیات کی بدولت تجارتِ محنت نے وہ فروغ پایا ہے کہ

تر تمام ملک اُس کی منڈی بنے ہوئے ہیں ۔ ہر ملک کا گروہ کثیر اس کاروبار میں لگا ہوا نظر آتا ہے اور خواص محنت کی وجہ سے جن کی تشریح اوپر کیجا چکی ہے، مزدور اور اُجرت بر ترقی یافتہ ملک میں نہایت دشوار اور نتیجہ خیز معاشی مسائل خیال کیئے جاتے ہیں ۔ اُجرت کو اکثر مزدور کا حصّہ پیداوار یا حصّہ قیمت پیداوار کہتے ہیں ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُجرت پیداوار کی تیاری اور فروخت کے قبل محنت شروع ہوتے ہی اُجر شاغل زر ادا کرنے لگتا ہے ۔ مزدور کو نہ تو پیداوار بعد سے حصّہ ملتا ہے ۔ نہ فروخت پیداوار تک انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ کام شروع ہوتے ہی اُجر حصول منافع کی امید پر اپنی گرہ سے اُجرت روزانہ ہفتہ وار یا ماہانہ پیشگی ادا کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ لیکن اُجرت کی مذکورہ بالا تعریف ایک معنی میں صحیح بھی ہے کیونکہ اُجرت کا موجودہ پیداوار اور حاصل مستقبل کی مقدار سے اور جب سے زر ادائی کا رواج ہوا ہے قیمت سے بھی قریبی تعلق ہے ۔ ان ہی تعلقات کی تحقیق و تشریح معاشیات کا منشا ہے ؛

قوانین اُجرت

۳ - بظاہر تو شرح اُجرت باہمی رضا مندی اور معاہدے سے قرار پاتی ہے لیکن خود رضامندی اور معاہدے پر گوناگوں معاشی حالات کا جو اثر پڑتا ہے حتیٰ کہ تعین اُجرت کے اسباب معاشی قوانین کے تابع ثابت کیئے جاتے ہیں ۔ رہا اُجرت پر رسم و رواج کا اثر تو وہ بھی سیاسی اور معاشی ترقیات کی وجہ سے بسرعت زائل ہو رہا ہے ۔ اوّل اوّل شرح اُجرت کو قانونِ طلب رسد سے سمجھایا گیا ۔ اگر دو آجر ایک مزدور کو بلاویں تو اُجرت بڑھیگی اور اگر دو مزدور ایک آجر کی طرف دوڑیں تو اُجرت گھٹیگی " یہ مسئلہ بالکل درست سہی لیکن یقیناً سطحی ہے اور علمی صحت و وضاحت سے معرا ۔ یہ صرف ایک واقعے کا بیان ہے ۔ کمی بیشی اُجرت کے اسباب اور حدود کا اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ تاہم اس قانون کا اُجرت کے اساسی قوانین سے قریبی تعلق ہے جن کی توضیح آئندہ فرقِ اُجرت کے تحت میں کریں گے ۔ اوّل قوانینِ اُجرت مع تنقید درج ذیل کرتے ہیں ؛

مسئلۂ اجرت فنڈ

۴ - اوائل بیسویں صدی میں انگلستان کے مزدوروں کی مالی حالت بمقابلہ دیگر ممالک یورپ کے بدرجہا بہتر تھی اور ساتھ ہی اس کے وہاں اصل کی مقدار بھی

حصۂ سوم
باب یازدہم

سب ملکوں سے بہت زیادہ موجود تھی اس زمانے کے معاشیین نے مقدار اصل اور شرحِ اُجرت کے درمیان براہِ راست ایک قریبی تعلق قرار دیا جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ پیدائشِ دولت کے بیان میں یہ رشتہ واضح کیا جا چکا ہے۔ اصل محنت بغیر وہ ہے اور محنت اٹل بغیر ایا ہج۔ مزدور کو اصل نہ صرف بشکل آلات مشین اور پیداوار خام درکار ہے بلکہ بطورِ احتیاجِ زندگی مثلاً خوراک و لباس بھی ناگزیر ہے۔ مزدور اور اصل پیدائش میں دو زندہ اور متحد دست ہیں لیکن بہت کم اصل مزدوروں کی ملکیت ہوتا ہے بجائے اس موجودہ اجر اصل داروں سے اصل حاصل ہوتا ہے۔ مستعار لے کر کارخانے جاری کرتے ہیں جن میں مزدور اصل دائم سے کام لیتے اور اصل دائر بطورِ اُجرت پاتے ہیں بہرحال اصل محنت کا ناگزیر ہمدم ہے اور اس کا اضافہ مزدوروں کے حق میں بہت مفید ہے۔ چنانچہ ملکی اصل کا نتیجہ مشرق و مغرب کے مزدوروں کی مالی حالت سے بخوبی ظاہر ہے۔ لیکن گزشتہ صدی کے معاشیین نے محنت و اصل کے مذکورہ رشتے پر اکتفا کر کے اس میں مبالغہ سے کام لیا اور صحت کی کوشش میں حقیقت سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے اصل دائر کی مقدار جو ادائی اُجرت میں صرف کیا جاتا ہے معین تصور کر کے شرحِ اُجرت کو تعدادِ مزدوران اور مقدارِ اصل دائر کی باہمی نسبت پر منحصر قرار دیا۔ مثلاً اگر کسی ملک میں اصل دائر کی مقدار ایک کروڑ روپے ہو اور مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ، تو ہر مزدور کی اوسط آمدنی سو روپے سال ہوگی۔

جدید تحقیقات سے چند معقول اعتراضات کی بنا پر یہ مسئلہ غیر معتبر قرار پا چکا ہے۔ اوّل تو اصل دائر کی کوئی ایسی مقدارِ معین فرض کرنا جس کی ادائی بشکلِ اُجرت لازمی ہو محض بے بنیاد ہے۔ آجر ہمیشہ اپنی ذاتی غرض سے جو متعدد اسباب کے تابع ہوگی۔ اُجرت میں کمی بیشی کرتا ہے کسی مقدارِ معین کی لازمی تقسیم کی مجبوری سے اُجرت میں تبدیلی نہیں کرتا۔ دوسرے خود اس مسئلے کی سلاست ایک سطحی دھوکا ہے غور کیجیے اس کا لُبِّ لُباب یہ نکلتا ہے کہ اُجرت کی مجموعی مقدار مزدوروں کی تعداد سے تقسیم کر کے اوسطِ شرحِ اُجرت دریافت کی جاتی ہے۔ ایک معنے یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ کثرتِ اصل اضافۂ اُجرت کا باعث ہوتا ہے لیکن یہ دونوں باتیں اس قدر صریح ہیں کہ

حصہ سوم باب یازدہم

ان کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ لہٰذا اس مسئلے سے اُجرت کی کوئی علمی توضیح نہیں ہوتی بایں ہمہ اس سے محنت و اصل کے باہمی تعلق پر توجہ ضرور منعطف ہوتی ہے؛

موجودہ ایجادات نے اصل میں بشکل مشین جو کچھ اضافہ کیا ہے اور جسکی بدولت عمل پیدائش میں اصل و محنت کے حصے گھٹتے بڑھتے ہیں، اس سے پیدائش دولت کے تحت میں مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس موقع پر مذکورۂ بالا بحث کی طرف رجوع کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا؛

بہرحال اضافۂ اصل کا خواہ وہ کسی شکل میں ہو نتیجہ قریب یا بعید ازدیادِ طلب محنت اور بیشی خرچ اُجرت ہوتا ہے لہٰذا مسئلۂ اُجرت فنڈ سے محنت کے پہلوے طلب پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے محنت کا پہلوئے رسد جو اس مسئلے میں سراسر نظر انداز کیا گیا ہے ایک دوسرے مسئلے سے واضح ہوگا جس کو ہم درج ذیل کرتے ہیں اور ان دونوں کی روشنی میں محنت کے ہر دو پہلوئے طلب و رسد کا مطالعہ کرنے سے اُجرت کے متعلق ایک مسئلہ مرتب ہو سکتا ہے جو حقیقت کے قریب ہے؛

مسئلہ ۴ — معیارِ زندگی

۴۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بڑے بڑے کارخانے مل اور فیکٹری جاری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور بھی اپنی محنت کو آجر کے ہاتھ مثل دیگر اشیا بکثرت فروخت کرنے لگے اور قیمتِ محنت اُجرت کہلاتی ہے عام قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت اُس کے مصارفِ پیدائش سے کم نہیں ہو سکتی اگر کسی قدر زیادہ یا کم از کم برابر ضرور ہوگی۔ ایسا کون احمق ہوگا جو نقصان اُٹھانے کے لئے کوئی چیز بنانے کی زحمت گوارا کریگا۔ اگر کسی وجہ سے قیمت مصارفِ پیدائش سے گھٹ جائے تو جلد سے جلد ایسی چیز کی پیدائش ترک کردی جائیگی۔ پس قیمت کا مصارفِ پیدائش کے کم از کم مساوی ہونا ہر چیز کی پیدائش کے واسطے شرط لازمی ہے۔ اس اہم مسئلے سے مبادلۂ دولت کے بیان میں مفصل بحث کرینگے (دیکھو) یہاں اسکا سیدھا سادھا مفہوم سمجھ لینا کافی ہے۔

فرض کرو انجن سے برقی طاقت بنائی جاتی ہے اب جو کوئلہ انجن چلانے میں جلتا ہے اُس کی قیمت اور نیز بطالبات فرسودگی ایسی شرح سے کہ انجن پرانا اور بیکار ہونے تک اُس کی کُل قیمت وصول ہو جائے جس سے نیا انجن خریدا جا سکے۔ یہ دونوں میں برقی طاقت کے مصارفِ پیدائش میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں زمین کا لگان انجن۔ کارخانے کی تعمیر میں

جو لاگت آتی ہے اُس کا سود اور ملازمین کی تنخواہ بھی جزوِ مصارف ہیں لیکن بس ہم صرف پہلی دو مدوں کا لحاظ کرنا کافی ہے باقی نظر انداز کی جاتی ہیں۔ مزدور اور محنت کا تعلق بھی جیسے انجن اور برقی طاقت کا سا ہے گویا مزدور کی مایحتاج زندگی اور پرورشِ اولاد کے مصارف جو اُس کے جانشین ہوں گے مصارفِ پیدائشِ محنت میں شامل ہیں اور اگر اُجرت کسی وجہ سے اُن کی مجموعی مقدار سے گھٹ جائے تو افلاس غریب مزدور کی زندگی کو ناقابلِ برداشت بنا کر اُس کو جلد تباہ کر دیگا۔ اور اس تباہی کا اثر آئندہ نسلوں پر پھیل کر کثرتِ مرضِ ضعف بیت خیالی اور نکمے پن کی ہی ناقابلِ اصلاح ابتری کا باعث ہوگا اور عام مرفہ الحالی کے سرچشمے مسدود کر دیگا۔ کسی چیز کا بنانا یا نہ بنانا اختیاری ہے۔ بصورتِ اندیشۂ نقصان پیدائش ترک کی جاسکتی ہے لیکن غریب مزدور کو محنت سے کوئی مفر نہیں اوّل تو اُس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ بیکار بیٹھ کر کھا سکے۔ دوسرے ترکِ محنت خود اُس کے حق میں سراسر نقصان دہ ہے۔ چنانچہ مزدور کی ان کمزوریوں سے خواص محنت کے تحت میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں (ب ۲) پس تخفیفِ اجرت کے لحاظ سے غریب مزدور کی حالت نہایت قابلِ رحم ہے اور اکثر اسپر نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی مثال صادق آتی ہے لیکن جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے از حد تخفیفِ اُجرت نہ صرف مزدور کی تباہی کا باعث ہے بلکہ ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کو بھی ایسی مضرت پہنچاتی ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ یہ تو ظاہر ہو چکا کہ اُجرت کا مزدور اور اُسکے خاندان کی مایحتاج زندگی کیواسطے کافی ہونا کسقدر ضروری اور مفید ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مایحتاجِ زندگی کا کوئی معیار معین ہے یا اُس میں کمی بیشی ممکن ہے! اور اگر ہے تو ایسی تبدیلی تخفیف و اضافۂ اجرت پر مقدم ہے یا اُس سے موخر؟

اٹھارھویں صدی کے آخری نصف کے اثنا میں جب فطرآئیں نے اس مسئلے کی بنا ڈالی تو اُس وقت فرانس کے مزدوروں کی مالی حالت نہایت خستہ تھی اور جو کچھ اُجرت ملتی تھی وہ اشد ضروریاتِ زندگی کے واسطے بمشکل کفایت کرتی تھی بہمعہ حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے قرار دیا کہ مایحتاجِ زندگی ناگزیر ضروریات تک محدود ہے اور اُجرت اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اوّل تو پہلے ہی سے بیکار اور متلاشیٔ روزگار مزدوروں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے دوسرے آبادی اصل اور کاروبار سے کہیں زیادہ جلد بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُجرت ناگزیر ضروریات کی

سوم زدہم

حد سے تیزی کے ساتھ البتہ گھٹنے کا اندیشہ اکثر دامنگیر رہتا ہے، چنانچہ پسماندہ ممالک میں اب تک مزدوروں کا یہی حال ہے کہ نہ بوٹی نہ شوربا روز کنواں کھودنا روز پانی پینا اگر چار دن کام نہ ملے تو اندوختہ کا صفایا ہی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مایحتاج زندگی صرف اشد ضروریات تک محدود ہے اور اُجرت مایحتاج تک۔

لیکن ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی مالی حالت دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ مایحتاج زندگی کا کوئی ایسا معیار معین نہیں کہ اُس میں تبدیل نہ ہو سکے بلکہ اگر ضروریات سے لے کر بھی ضروریات حتیٰ کہ کم خرچ تعیشات بھی اس میں شامل پائے جاتے ہیں گویا مایحتاج کا معیار کسی ملک کی معاشی ترقی یا پسماندگی کے مطابق بلند اور پست ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکن مزدور اچھا خاصہ خوش خوراک خوش پوشاک ہے اور اُس کے مکان میں علاوہ ضروری سامان کے آرائش و تفننِ طبع کی بھی معمولی چیزیں از قسم تصاویر [illegible] موجود ملیں تو عجب نہیں۔ شنبہ کی رات کو وہ کھیل تماشے دیکھنے کا بھی لطف اٹھاتا ہے البتہ اس میں ایک عیب ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ فضول خرچ ہے اور اڑے وقت کے خیال سے کافی پس انداز نہیں کرتا لیکن مزدوروں کی انجمن اتحاد نے [illegible] انتظام قائم کر رکھے جس کا ہم آئندہ مفصل حال لکھیں گے۔ یہ ترقی بھی ایک بڑی حد تک [illegible] یورپ کے مزدوروں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے لیکن ایشیا میں [illegible] بالکل برعکس نظر آتا ہے یعنی مزدور کی زندگی سب سے سادہ اور کم خرچ ہے اور اُس کی شرح اُجرت بھی بہت کم ہے۔ ہندوستانی مزدور کی حالت اُس سے بہتر سہی لیکن یورپین مزدور کے مقابلہ میں پھر بھی ادنیٰ ہے نہ اُس کو زندگی کا اس قدر لطف میسر ہے نہ اُس کے پاس زیادہ اندوختہ۔ یہ تو تحقیق ہو چکا کہ مزدوروں کا معیار مایحتاج زندگی ہر ملک میں جدا ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بلند اور پسماندہ میں پست۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اضافۂ اُجرت بلندیٔ معیار کا باعث ہوتا ہے یا نتیجہ میں حیثیت عمل کس کو کس پر تقدم حاصل ہے۔

[illegible] تو تعجب ہوتا ہے لیکن معاشیین کے ایک گروہ کا قول ہے کہ معیار مایحتاج سے اُجرت قرار پاتی ہے۔ گویا کہ معیار بلند کرنے سے اُجرت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ایسا ممکن ہوتا تو غریب مزدور کے دن پھر جاتے جب چاہتا [illegible]

حصہ سوم
باب دہم

کر کے اجرت میں اضافہ کرا لیتا۔ اور حسبِ دلخواہ زندگی کا لطف اُٹھاتا۔ روکھا سوکھا کھانا موٹے جھوٹے کپڑے اور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں پر قناعت کرنے کی اس کو کوئی خوشی یا مجبوری ہوتی۔ ہم نہیں کہتے کہ اس طریق سے وہ اجرت میں لا انتہا اضافہ کرا سکتا۔ لیکن کم از کم موجودہ تنگدستی کو وہ ضرور رفع کر دیتا اور اپنے تئیں ایسا بے بس اور ناچار نہ پاتا کہ دوسروں کی ہمدردی اور حمایت کا محتاج رہتا۔

واضح ہو کہ اگر محنت کی رسد محدود ہو اور طلب غالب۔ بالفاظِ دیگر اگر مزدوروں کی تعداد معین ہو اور اُن کی بہت جگہ مانگ ہو گویا کوئی مزدور بیکار نہ ہو تو ایسی حالت میں مزدور جتھا بنا کے اجرت میں مناسب اضافہ کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ محنتِ با مہارت کی اجرت میں اس تدبیر سے مزدوروں کے موافق تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن محنت بے مہارت کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بیکار مزدوروں کی جماعت موجودہ شرح اجرت قبول کر کے کوشش اضافہ کی مزاحم ہوتی ہے اور مزدوروں کا بہت بڑا گروہ اسی دشواری سے اضافۂ اجرت میں بے بس ہے۔ لیکن دباؤ ڈالے بغیر اضافہ اُن کی اجرت میں بھی بتدریج برابر ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ معیارِ مایحتاج بلند ہوتا جاتا ہے۔ مگر اس تبدیلی کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

مسئلۂ پیدآوری محنت

۵۔ جیسا کہ عاملین پیدائش کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے محنت کیا ہے؟ دولت پیدا کرنے کا ایک آلہ۔ اس کا افادہ کیا ہے؟ پیدآوری۔ معلوم ہے کہ زمین کی قیمت زرخیزی اور انجن کی قیمت طاقتِ محرکہ کے مطابق ہوتی ہے اور یہ دونوں معیارِ قیمت افادہ پیدآوری کی محض مختلف شکلیں ہیں۔ پس اگر محنت کی قیمت بھی یعنی اجرت مقدارِ پیدآوری پر منحصر ہو تو کیا عجب ہے۔ چنانچہ خود واقعات اس اصول کے شاہد ہیں۔ جس مزدور کی محنت میں پیدآوری خواہ بشکلِ عمدگی یا مقدارِ کام خواہ بشکل ہر دو زیادہ پائی جاتی ہے اُس کو اجرت بھی زیادہ دی جاتی ہے۔ اجرت اور پیدآوری کا تعلق اس قدر بدیہی ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اصول پیدآوری سے صرف اجرت کی کمی بیشی کا ایک اساسی سبب واضح ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم تعیینِ شرحِ اجرت کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔

پیدآوری مختتم

۶۔ یوں تو پیدائشِ دولت کے واسطے ہر سہ عاملین زمین محنت اور اصل کی شراکت

لازمی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ زراعت میں زمین کا حصّہ غالب رہتا ہے اور صنعت وحرفت میں اصل کی کارگزاری خاص طور سے قابل لحاظ ہوتی ہے۔ محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے۔ اوپر جا بجا خصوصاً لگان کی بحث میں زراعت پر قانونِ تقلیل حاصل کا قوی اثر ظاہر کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ کاشت میں چند ابتدائی جرعوں کے استعمال کے بعد کوئی ایک جرعہ ایسا پایا جاتا ہے کہ اس کا اور اُسکے مابعد جرعوں کا ماحصل مقابلتہً ماسبق جرعوں کے ماحصل سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جرعوں میں محنت اور اصل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر قطعۂ زمین کی طرح مقدارِ اصل بھی جو استعمال ہو مقرر کر لی جائے اور خالص محنت کے جرعوں میں اضافہ کیا جائے تو بھی اس قانون کا عمل درآمد نمودار ہوگا۔ مثلاً دس بیگھے زمین میں سَو روپے کی لاگت سے کاشت کی جائے۔ خود کاشتکار اور اُس کے دو لڑکے ہل چلا کر کھیت پر کام کریں اور ۵۰ من غلّہ پیدا ہو۔ اب اگر ایک مزدور لگایا جائے تو پیداوار ۶۰ من ہوجائے دو مزدور بڑھانے سے ۶۶ من اور تین بڑھانے سے ۷۰ من ہوگی۔ ایسی حالت میں مزدورِ اوّل کی محنت کی پیداوار ۱۰ من دوم کی ۶ من اور سوم کی ۴ من شمار ہوگی۔ اب اگر مزدورِ سوم بقدر ۴ من اُجرت طلب کرے تو کاشتکار کو کچھ بچت نہ ہوگی اور غالباً وہ اس کو رکھنے پر رضامند نہ ہوگا۔ اس لئے جبکہ مزدورِ سوم کو بوجہ تہی دستی محنت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور بوجہ کثرتِ مزدوراں بپابندئ قانونِ تقلیل حاصل اس سے زیادہ اپنی محنت سے پیدا ہی نہیں کرسکتا تو بمجبوری اُس کو کچھ کم یا ۴ من اجرت پر قناعت کرنی ہوگی۔ لیکن لطف یہ ہے کہ کاشتکار اوّل اور دُوم مزدور کو بھی اس سے زیادہ اجرت دینا گوارا نہ کریگا اور اُن کو بھی اتنی ہی قبول کرنی پڑیگی کیونکہ بحالتِ مفروضہ اُن کو دوسری جگہ ۴ من سے زیادہ اُجرت نہیں مِل سکتی، اگر ایسا ممکن ہوتا تو مزدورِ سوم ہی ۴ من پر کیوں رضامند ہوتا۔ اگر مزدورِ اوّل یہ کھیت چھوڑ کر دوسری جگہ کام تلاش کرے تو اُس کی حیثیت مزدورِ سوم کی سی ہوگی اور نئی جگہ غالباً وہی ادنیٰ اجرت قبول کرنی پڑے گی۔ کاشتکارِ زیرِ بحث کا اوّل کے چلے جانے سے کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ اب باقی دونوں مزدوروں کی محنت کی پیداوار ۱۰ من اور ۶ من ہوجانے سے ۴ من شرح اجرت کے حساب سے وہی ۸ من بچت ہوگی جو پہلے ہوتی۔ اگر موجودہ مزدورِ دوم نے اپنی

پیداوار محنت کی بیشی کی بنا پر اجرت میں بھی اضافہ چاہا تو تلاش روزگار مزدوروں میں سے کوئی نہ کوئی آکر مزدور دوم کی جگہ لے لیگا اور اضافۂ اجرت پر بوجہ اسباب مذکور الصدر پھر وہی بندش قائم ہو جائیگی جو مزدور اوّل کے جاتے سے قبل پیش آئی تھی بلکہ اگر کوئی گردش کا باعث تمام مزدوروں کمیت مذکور الصدر پر آگئے اور قانون تقلیل حاصل کی بدولت شرح اجرت ۴ من سے بھی گھٹا دے تو عجب نہیں۔

مذکورۂ بالا تیسرے یا چوتھے مزدور اور اُس کی محنت کی پیداوار کو مزدور مختتم اور پیداوار مختتم کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ اجرت قانون تقلیل حاصل کے اثر سے پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور مزدوروں کی کثرت سے اُسکی مقدار میں کمی ہوتی ہے۔

زراعت کی مثال میں ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا بعینہٖ یہی حال صنعت و حرفت کا ہے۔ عمل پیدائش میں وہاں زمین کا حصہ بڑھا ہوا ہے یہاں اصل کا۔ اسمیں فرق ہے۔ قانون تقلیل حاصل کے عمدہ آمد میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ مثال بالا میں اگر کھیت کے بجائے کارخانہ اور زراعت کے بجائے صنعت اور ۴ من کے بجائے چار شئے لکھدی جائیں تو اس کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ یہاں یہ غلط پیدا ہوتا ہے کہ اس سے قبل صنعت و حرفت قانون تکثیر حاصل کے ماتحت بتائی جا چکی ہے، یہاں وہ قانون تقلیل حاصل کے تابع کہی جاتی ہے گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ لیکن یہ ایک سطحی دھوکا ہے قانون تقلیل حاصل کی متابعت سے مراد یہ ہے کہ قطعۂ اراضی کی طرح کوئی مقدار لامحدود محنت کی متحمل نہیں ہو سکتی یعنی یہ ممکن نہیں کہ اگر دس ہزار اصل سے ۵۰ مزدور کام کر کے ایک مقدار پیدا کریں تو اسی اصل سے سو مزدور کام کر کے دوگنی مقدار پیدا کر سکیں گے۔ غالباً ڈیوڑھی کرنی بھی دشوار ہوگی اور یہ عمل قانون تقلیل کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اب غور کیجیے کہ صنعت و حرفت قانون تکثیر حاصل کے زیر عمل کیوں کہلاتی ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت میں استعمال مشین اور پیدائش بر پیمانہ کی بہت گنجائش ہے جسکا نتیجہ نسبتہً تخفیف مصارف پیدائش ہے اور یہی قانون تکثیر حاصل کا منشا ہے اور صنعت پر کیا منحصر ہے بعض بعض حالتوں میں

زراعت پر بھی قانون کا ایک حد تک اثر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ پس واضح ہوا کہ قانون تکثیر حاصل کا زمین محنت اور اصل کی مقدار سے تعلق ہے جو مل کر کام کریں اور قانون تقلیل حاصل عمل پیدائش میں زمین محنت اور اصل کی باہمی نسبت سے متعلق ہے۔ بالفاظ دیگر اگر عاملین کی بڑی سے بڑی مقدار یکجا کام کر سکیں تو قانون تکثیر کا عمل ظہور پذیر ہوگا اور اگر عاملین میں سے کسی کی مقدار نسبت مناسب سے تجاوز کرے تو اس کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہوگی:

حاصل کلام یہ کہ زراعت و صنعت دونوں یکساں قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں۔ محنت کے جزؤں کی پیداوار ایک خاص حد کے بعد نسبتاً گھٹنے لگتی ہے۔ اجرت ہمیشہ محنت کی پیداوار مختتم کی مساوی ہوتی ہے اور کثرت مزدوراں سے اسکی مقدار گھٹنی یقینی ہے:

اوّل تو اجرت پیداوار مختتم کے برابر قرار پائی پھر کثرت مزدوراں سے اس کی مقدار گھٹی اس پر طرہ یہ کہ مزدوروں کی مجبوری، تہی دستی، جہالت، پست ہمتی، رسم و رواج کی پابندی اور آجروں کے غلبے اور تسلط کی بدولت یہ اقل قلیل معاوضہ بھی پورا پورا بمشکل ہاتھ آتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا محنت کا حاصل زائد بشکل منافع آجر کی جیب میں جاتا ہے۔ آجر اگر محنت کی پیداوار میں سے ایک مناسب حصہ بطور کمیشن لے بھی تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن جب وہ مزدوروں کے سب سے قلیل حصے میں سے بھی کچھ غصب کرے تو یہ ظلم ہے۔ یا تو مزدور پامال ہو جاویں گے یا تنگ آکر وہ اسٹرائک شروع کر دیں گے۔ دونوں صورتوں میں عام ملکی مرفہ الحالی کو مضرت پہنچنا یقینی ہے:

واضح ہو کہ مزدور مختتم آجر کا بہت بڑا محسن ہے۔ اضافۂ حاصل زائد کے لحاظ سے اسکی حالت بعینہ مثل نہر کی جھال کی چوٹی کے ہے جو نیچی ہو ہو کر پانی کی زیادہ زیادہ مقدار اپنے اوپر سے گزرنے کا موقع دیتی ہے اور یہی اوپر سے گزرنے والا پانی گویا حاصل زائد ہے۔ جو پانی جہاں سے رکا رہے اس کو مزدوروں کی اجرت سمجھنا چاہئے۔ یہ مزدور جتنا آگے بڑھیگا، ماسبق مزدوروں کو بشکل تخفیف اجرت نقصان پہنچائیگا اور آجر کو بشکل اضافۂ حاصل زائد نفع۔ لیکن اگر پیچھے ہٹے تو نتیجہ بالکل برعکس ہوگا۔ کسی کاروبار میں بمقابلہ دسویں مزدور مختتم کے پانچواں مزدوروں کے حق میں مفید اور آجر کے

حصّہ سوم
باب نہم

حق میں مضر ہے۔ دسویں کی حالت اس کے برعکس ہے اور نہ بعد مختتم کا قُرب و بُعد بھی گویا محنت اور اجرت کے متعلق قانونِ طلب و رسد کی ایک گونہ تشریح ہے ؛

یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ مزدورِ مختتم سے لازماً یہی مزدور مراد ہے جو لحاظ ترتیب باوقت سب سے آخر میں شریک کار ہوتا ہے بلکہ مزدوروں کے اسی گروہ میں جو ایک ہی وقت کام شروع کرے مزدورِ مختتم کی موجودگی ممکن ہے۔ درحقیقت مزدورِ مختتم سے مراد کام کرنے والی ایسی جماعت کا کوئی فرد ہے کہ جس میں اگر کوئی جدید مزدور شامل کیا جائے تو مزید ماحصل اس کی اجرت سے کم رہے۔ اول تو جب مزدوروں کی ایک جماعت مل کر کوئی کام کرے تو ہر ایک کے کام کی جداگانہ تعداد دریافت کرنا اکثر محال ہوتا ہے۔ دوسرے یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ مزدورِ مختتم کارکردگی میں باقی دوسروں کے برابر ہے۔ پس اس کی محنت کا جداگانہ ماحصل جس کا دریافت کرنا دشوار ہے دوسروں سے کم ہونا ضروری نہیں ؛

اس کے شریکِ جماعت ہونے سے ماحصل میں جو اضافہ ہوتا ہے اور جو سب سابق اضافوں سے کم مقدار ہوتا ہے۔ درحقیقت کل جماعت کی مجموعی محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ اس کی جداگانہ محنت سے اور اس کے سبب سے کم مقدار ہونے کا باعث مزدورِ مختتم کی کارکردگی کا نقص نہیں بلکہ قانونِ تقلیلِ حاصل ہے۔ یہ تو عام تجربہ ہے کہ کسی کام میں تعدادِ مناسب سے زیادہ مزدوروں کی شرکت نہ صرف مالی نقصان بلکہ خرابیٔ کام کا باعث ہوتی ہے اور مزدورِ مختتم کی کل بحث اسی واقعے کی تشریح ہے اور کچھ نہیں ؛

پس ثابت ہوا کہ اجرت کا محنت کی پیدا آوری سے اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ پیداوارِ مختتم کے برابر ہوتی ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا باقی ہے کہ خود یہ معیار کس قدر غیر معین ہے اور کتنے بیشمار اسباب اس کی کمی بیشی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ایک سادہ مثال لو جو زراعت و صنعت دونوں سے مشابہ ہے کسی شخص کے ہاں دودھ مکھن کا کارخانہ جاری ہے۔ گائے بھینسوں کی نگرانی کے واسطے دس گھوسی نوکر ہیں اگر گیارھواں گھوسی ملازم رکھا جائے تو گلے میں دس گایوں کا اضافہ ہو سکیگا گویا موجودہ مشینوں سے ان کے دودھ کا مکھن نکل سکیگا اور اُن کے رہنے کے واسطے موجودہ جگہ میں سے

حصہ سوم باب پانزدہم

گنجائش نکل سکیگی کسی طرح پر کارخانے میں توسیع کی ضرورت نہ ہوگی۔ اب اگر اس گیارھویں گھوسی کی اجرت جدید دس گاؤں کی آمدنی سے کم ہو تو کارخانہ دار اُس کو ضرور ملازم رکھ لیگا۔ اور اس کا کام محنت مختتم ہوگا۔ واضح ہو کہ محنت مختتم کے ماحصل کی کمی بیشی گھوسیوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ خود یہ تعداد قوانین رسد و طلب کے تابع ہے۔ ایک طرف تو موجودہ نسل زیادہ [illegible] ہے جس سے گھوسی مہیا ہو سکیں۔ دوسری جانب دودھ مکھن کا صرف اور ایسے کارخانوں کی تعداد۔ گویا دودھ مکھن کی حالت طلب و رسد اور یہ حالت خود بیشمار اثرات کے تابع ہے۔ علاوہ ازیں چارے کی قلت و کثرت کا بھی محنت مختتم سے قریبی تعلق ہے اور چارے کی پیداوار زرعی حالت سے متعلق ہے جو خود بیشمار اسباب کے زیر اثر ہے۔ مزید برآں گائے بھینسوں کی رسد جسکا دارومدار چارے کی مقدار اور چراگاہوں اور گھوسیوں کی تعداد پر ہے اور انکی طلب جو چمڑے، گوشت، دودھ، مکھن اور زرعی کام کے طلبوں پر منحصر ہے، محنت مختتم پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ قصہ مختصر محنت مختتم کا تعین بیشمار پیچ در پیچ اسباب پر منحصر ہوتا ہے۔ ہمکو یہ جاننا کافی ہے کہ کسی کام میں یکساں کارکردگی والے مزدوروں کی شرح اجرت محنت مختتم کے ماحصل اُسکے برابر ہوتی ہے گویا شرح اجرت کا معیار پیداوار مختتم ہے۔

اجرت کے متعلق اس وقت تک جو چار مسئلے بیان کئے گئے اُن میں سے ہر ایک جداگانہ کُل حقیقت کا صرف ایک جزو واضح کرتا ہے۔ ہر ایک بذاتِ خود ناکمل ہے لیکن مکمل تشریح اجرت کیواسطے ان سبکا اجتماع لازمی ہے۔ اگر ربڑ کے چند تسموں سے کوئی چیز لٹکائی جائے تو وزن سنبھالنے میں ہر ایک تسمہ باقی تسموں کو مدد دیتا ہے اور سب کی مجموعی قوت سے اُنکی یکساں لمبائی قرار پاتی ہے اب اگر کسی تسمے کی لمبائی گھٹائی بڑھائی جائے یا اُسکی قوت میں کمی بیشی پیدا کی جائے تو یقیناً باقی تسموں کی لمبائی میں بھی فرق پیدا ہوگا اور لٹکنے والی چیز کی سطح بھی ضرور اونچی نیچی ہو جائیگی بعینہٖ یہی حال مذکورۂ بالا مسائل کے تعلق کا ہے مسئلہ اجرت فنڈ محنت کی طلب پر، مسئلۂ معیارِ مایحتاج زندگی محنت کی رسد پر اور مسائل پیداآوری محنت و پیداوارِ مختتم تعینِ شرح اجرت پر روشنی ڈال کر مسئلۂ اجرت کی کامل توضیح کرتے ہیں۔ اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں گویا یہ کُل مسائل اجرت پیدا کرنے والے مشین کے پرزے ہیں اور ظاہر ہے کہ مشین چلنے کیواسطے ہر ایک پرزہ

[illegible]

اصول معاشیات

حصہ سوم
باب یازدہم

انتہائی ضروری ہے۔ متعلقہ کوئی دوسرا ان تمام مسائل کو کسی ایک جامع مسئلے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کامیاب ہونی محال نظر آتی ہے۔ ہر ایک کو جداگانہ ذہن نشین کرتے ان کا باہمی تعلق سمجھ لینے سے بھی وہی مطلب حاصل ہوتا ہے اور یہ طریق سہل بھی ہے۔

۷ … چند اصول: اجرت کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ اوّل اجرت متعارف اور اجرت صحیحہ کو لیجئے۔ بالعموم مزدور کو اجرت بشکل زر نقد ادا کی جاتی ہے مثلاً کچھ آنے روز یا چند روپے ماہوار۔ لیکن فی نفسہ زر نقد یا سونے چاندی اور تانبے کے دھاتوں کے ٹکڑے ہیں جن کو مزدور نہ کھا سکے نہ پہن سکے۔ دولتمند لوگ جو قیمتی زیوروں اور سامان کے شائق ہوتے ہیں ان دھاتوں کے ٹکڑوں سے کچھ کام لے سکتے ہیں۔ لیکن غریب مزدوروں کے … جن کی ضروریات نہایت سادہ اور مختصر ہیں، یہ ٹکڑے بذات خود مٹی کی طرح ہیں۔ وہ تو اس لئے محنت کرتے ہیں کہ کھانے کو روٹی پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان ملے۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سامان راحت میسر آسکے تو فبہا ورنہ مضائقہ نہیں۔ بلاواسطہ نہ زر نقد سے مزدور کی احتیاج پوری ہوتی ہے نہ مزدور کو اس سے سروکار جیسا کہ ہم آگے چل کر تقسیم دولت کے تحت میں واضح کریں گے۔ زر نقد نہایت سہولت افزا آلۂ مبادلہ ہے بذات خود مزدور کی ضروریات سے خارج سہی لیکن بحیثیت آلۂ مبادلہ وہ مزدور کو حصول ضروریات میں بیش بہا مدد دیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مزدور بھی بلا حجت اس کو بطور اجرت قبول کر لیتا ہے۔ جب خورونوش اور لباس و مکان کا سامان مزدور کا مقصود ٹھیرا اور اسی کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ محنت کرتا ہے تو اس کی اجرت کا صحیح معیار اس سامان کی وہ مقدار ہے جو وہ اجرت کے زر نقد سے خرید سکے۔ زر نقد کی مقدار فی نفسہ اس کے نزدیک ناقابل لحاظ ہے۔ اجرت بمعیار ضروریات اجرت صحیحہ اور بمعیار زر نقد اجرت متعارف کہلاتی ہے۔ مزدور کی کل ضروریات کو شئے واحد مثلاً گیہوں تصور کر کے فرض کر لو کہ کسی زمانے میں اجرت متعارف دس روپے ماہوار ہے اور اجرت صحیحہ ۵ من گیہوں۔ اب اگر اجرت متعارف ۱۰ سے بڑھ کر ۱۲ روپے ہو جائے۔ اور بوجہ گرانی نرخ اجرت صحیحہ

۵ من سے گھٹ کر ۴ من رہ جائے تو اجرتِ متعارف میں نصف سے زیادہ اضافے کے باوجود اجرتِ صحیحہ میں بمقدار ⅕ تخفیف ہوجائیگی۔ اس کے برعکس اگر اجرتِ متعارف صرف آٹھ روپے ہو۔ لیکن بوجہ ارزانی نرخ اجرتِ صحیحہ ۶ من گیہوں ہوجائے تو باوجود کمی اجرتِ متعارف اجرتِ صحیحہ میں بیشی ہوجائیگی۔ گویا بلحاظ اضافہ و تخفیف ان دونوں قسم کی اجرتوں میں کوئی تعلق معین نہیں ہے۔ ان کی تبدیلی میں موافقت اور مخالفت دونوں ممکن ہیں۔ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مزدور کو تو مقدار گیہوں سے غرض ہے نہ کہ تعداد روپے سے لہٰذا اجرتِ صحیحہ کا اس کی حالت پر مفید و مضر اثر پڑتا ہے نہ کہ اجرتِ متعارف کا۔ چونکہ اجرت کا تعین اور ادائی بشکل زر نقد بجد آسان ہے۔ اجرتِ متعارف کا رواج ہوگیا۔ ورنہ مزدور کو صرف اجرتِ صحیحہ سے سروکار ہے اور جبکہ زرِ نقد کا استعمال اس قدر رائج نہ تھا اور نیز اب بھی پسماندہ دیہات میں اجرت میں غلہ دیا جاتا ہے ان دونوں قسم کی اجرتوں کے فرق سے بخوبی واضح ہوگا کہ مزدور کی مرفہ الحالی اجرتِ صحیحہ کے اضافے سے وابستہ ہے۔ یہ اضافہ دو طرح سے ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ اگر نرخ ضروریات معین ہو تو اجرتِ متعارف کے بڑھنے سے۔ اور اگر اجرتِ متعارف متعین ہو تو نرخ ضروریات گھٹنے سے، اور اگر اضافۂ اجرتِ متعارف کے ساتھ نرخ ضروریات میں تخفیف بھی ہو تو پھر کیا کہنا۔ گویا اجرتِ صحیحہ میں دو طرح کا اضافہ ہوجائیگا لیکن حالت بالکل اسکے برعکس ہے۔ ایکطرف تو اجرتِ متعارف بڑھ رہی ہے دوسری طرف ضروریات گراں ہوتی جاتی ہیں، گویا دو متضاد قوتیں اجرتِ صحیحہ پر عمل کر رہی ہیں اب اگر اضافۂ اجرتِ متعارف کا اثر گرانی ضروریات پر غالب آگیا تو اجرتِ صحیحہ میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوجائیگا اور اگر اثر الٹا پڑا تو نتیجہ بھی برعکس ہوگا گویا باوجود اضافۂ اجرت بوجہ گرانی ضروریات اجرتِ صحیحہ میں تخفیف ہوجائیگی۔ یہی آخری حالت ہے جو ہندوستان کے مزدور اور ملازمت پیشہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر آمدنی کو روپے سے شمار کرتے ہیں تو بہ نسبت سابق معقول اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ضروریات کے معیار سے تخمینہ کرتے ہیں تو معاملہ اکثر برعکس نظر آتا ہے؎

اسمیں شک نہیں کہ ضروریات کا اضافہ بھی خاندانی مصارف کی زیادتی کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں میں یہ وبا گرانیِ ضروریات کی بدولت پھیلا ہوا ہے؎

واضح ہو کہ ازالۂ مرض سے انسدادِ مرض بہتر ہے۔ اجرتِ صحیحہ بڑھانے

یا بالفاظ دیگر مزدور کی مالی حالت قوی کرنے کا طریق بہ نسبت اجرت متعارف بڑھانیکے
نرخ ضروریات گھٹانا بدرجہا زیادہ کارگر ہوگا۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ افزونی آبادی
اور قانون تقلیل حاصل کے قوی اثرات گرانی کے معاون اور ارزانی کی راہ میں
سخت مزاحم ہوتے رہے ہیں لیکن پھر بھی ترقی کارگری اور عجیب و غریب ایجادات
کی مدد سے ان اثرات کا زور بہت کچھ توڑا جارہا ہے اور مصنوعات میں اکثر
قانون تکثیر حاصل کا اثر غالب نظر آتا ہے محنت کی پیداآوری میں جتنا اضافہ ہوگا
یعنی اسکی ایک مقدار معین سے جتنی زیادہ پیداوار حاصل ہوگی یا پیداوار کی معین مقدار
حاصل کرنے کے واسطے جس قدر کم محنت درکار ہوگی ضروریات جو اس محنت سے
پیدا ہوں گی ارزاں ہوجائیں گی۔ چنانچہ کارگری کی ترقی اور کلوں کی ایجاد کا منشا
یہی محنت کی پیداآوری کا اضافہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اُن کے عمل کا اثر
ارزانی ضروریات پر بہت موافق پڑتا ہے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئیے کہ ارزانی ضروریات
اگر مزدوروں کے حق میں مفید ہے تو ضروریات کے پیدا کرنے والوں کے حق میں
بشکل تخفیف آمدنی مضر ہوگی۔ اول تو خود ہر ایک پیدا کرنے والے کو بہت سی ضرورتیں
ہیں اور اگر اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت کی ارزانی سے اس کو کوئی نقصان پہنچیگا تو باقی
دوسری ضروریات کی ارزانی جو اس کو درکار ہے اس نقصان کی بشکل تخفیف مصارف
پوری تلافی کردیگی علاوہ ازیں ارزانی کی بدولت خود اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت
کی طلب بڑھیگی اور پیدائش برپیمانۂ کبیر کے فوائد یا قانون تکثیر حاصل کے اثرات
کی بدولت مصارف پیدائش میں ارزانی کے مطابق کم و بیش تخفیف ہوسکیگی۔
اور مزید براں شرح منافع فی شئے بوجہ ارزانی گھٹ بھی جائے تو منافع کی مقدار کلی
بوجہ اضافۂ خرید اشیا بڑھ جانا عجب نہیں اور ظاہر ہے کہ ہر شئے کو منافع کی مقدار کلی سے
مطلب ہے نہ کہ شرح منافع فی شئے سے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ارزانی ضروریات
سب کے حق میں مفید ہے اور غالباً کسی کے حق میں بھی مضر نہیں اور قوم کو خوشحال
اور دولتمند بنانے کا کارگر طریق محنت و اصل کی پیداآوری بڑھاکر ضروریات کو
ارزاں کرنا ہے اور بس :

اجرت کی دو قسمیں متعارف اور صحیح بلحاظ معیار ادائی بیان کیجا چکی ہیں بلحاظ میار

حصہ سوم باب یازدہم

تعینِ شرح بھی اجرت کی تین قسمیں پائی جاتی ہیں۔ جبکہ اجرت کا حساب مطابق اس مقدار وقت کے ہو جو محنت میں صرف کیا جائے تو یہ اجرت **مختص بالزمان** کہلاتی ہے مثلاً بیس روپے ماہوار یا چار آنے روز۔ اور جبکہ اجرت مطابقِ مقدار کار قرار پائے تو اُس کو اجرت **مختص بالعمل** کہتے ہیں۔ مثلاً کپڑا بنوائی ۱۲ آنے گز یا اناج پسوائی ایک روپیہ من یا کتاب لکھوائی ایک روپیہ جزو۔ اجرت خواہ مختص بالزمان ہو خواہ مختص بالعمل اس کی مقدار کارکردگی کے مطابق اکثر مزدوروں کے حق میں جدا ہوگی۔ معمولی خدمتگار کو آٹھ روپے تو ہوشیار کو دس روپے ماہوار دیئے جا سکتے ہیں معمولی بڑھئی آٹھ آنے اور کاریگر بارہ آنے روز پاتا ہے۔ یہی حال اجرتِ مختص بالعمل کا ہے۔ جو جتنا کام کریگا اتنی اجرت پائیگا۔ ایک ہی شرح سے بعض زود نویس اور محنتی کاتب ۱۲ روز کماتے ہیں اور بعض بمشکل آٹھ آنے جو مقدارِ اجرت بلحاظِ کارگزاری دریافت کرتے ہیں اُس کو **اجرت مختص بہ کارگزاری** کہتے ہیں:

واضح ہو کہ بندشِ رسم و رواج سے مزدوروں کی رہائی کا یا بالفاظ دیگر اُن کے آزادانہ مقابلے کا نتیجہ اجرتِ مختص بالزمان و نیز مختص بالعمل میں فرق اور اجرتِ مختص بہ کارگزاری میں تناسب پیدا ہونا ہے۔ مقابلے کے دباؤ سے ہر مزدور کی اجرت اُس کی کارگزاری کے مطابق بنجائیگی۔ اسی وجہ سے اجرت مختص بالزمان اور مختص بالعمل میں فرق نمایاں ہوگا۔ غیر مساوی کارگزاری والے مزدور نہ اجرت مختص بالزمان برابر پاسکیں گے نہ اجرتِ مختص بالعمل۔ ہر ایک کی اجرت کارگزاری کے مطابق ہوگی اور مساوات کارگزاری کے ساتھ ہی مساواتِ اجرت خواہ مختص بالزمان ہو خواہ مختص بالعمل ممکن ہے۔ لہذا جب کہا جاتا ہے کہ مزدوروں کے آزادانہ مقابلے کا نتیجہ مساواتِ اجرت ہے تو وہاں پر اجرت مختص بہ کارگزاری مُراد ہوتی ہے:

واضح ہو کہ محنت جس قدر زیادہ نقل پذیر ہوگی اور کام جسقدر غیر تخصیص طلب ہوگا اُسی قدر آزادانہ مقابلے کا مذکورۂ بالا نتیجہ بیشتر واضح ہوگا:

اجرت مختص بہ کارگزاری کے متعلق ایک مغالطہ جس کا پیدا ہونا ممکن ہے جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مسئلۂ پیدآوری مختتم کے تحت میں بیان کیا گیا ہے کہ مزدوروں کی کسی جماعت کی شرحِ اجرت مزدورِ مختتم کی پیدآوری محنت کے جو سب سے کم

ہوتی ہے، برابر ہوگی لیکن جیساکہ پہلے بھی واضح کیا جاچکا ہے ۔ ایسی جماعت کے کُل مزدوروں کی کارگزاری یکساں ہونی چاہیئے نہ کہ کم و بیش ۔ اور محنت مختتم کی پیداوار کی کمی کا باعث عمل قانون تقلیل حاصل ہے ۔ نہ کہ مزدور مختتم کی کارگزاری کا نقص ۔ اور یہاں پر ازراہِ مقابلے کا اثر جو ہر مزدور کی اُجرت اس کی کارگزاری کے مطابق بنا دیتا ظاہر کیا گیا ہے ۔ تو ایسے مزدوروں کی کارگزاری میں بجائے یکسانیت کے فرق فرض کیا جاتا ہے ۔ گویا ان دونوں بحثوں کا علی الترتیب نتیجہ یہ ہے کہ یکساں کارگزاری والے مزدور برابر برابر اجرت پاتے ہیں اور مختلف کارگزاری والے مزدوروں کی شرح اجرت میں کارگزاری کی کمی بیشی کے مطابق تخفیف و اضافہ ہوتا رہتا ہے جو جتنا کام کرتا ہے اتنی اجرت پاتا ہے ۔

چونکہ ان دونوں مسئلوں میں بظاہر تضاد نظر آنے کا اندیشہ ہوسکتا تھا ۔ احتیاطاً مزید تشریح کردی گئی ۔

فرقِ اجرت کے اسباب — شرح اجرت میں بیشمار فرق پائے جاتے ہیں ۔ غریب قُلی دن بھر بوجھ ڈھو کر بمشکل کُنبے کی گزر کے لائق شام تک کماتا ہے اور ایک مشہور گویا گھنٹہ بھر گا کر صدہا روپے پا جاتا ہے ۔ سرکاری ملازمین یا کارخانہ جات کے مزدوروں کی فہرست خواہ اجرت اٹھا کر دیکھو تو چند روپے سے لے کر ہزاروں روپے تک بیشمار مدارج نظر آئیں گے ۔ ظاہر ہے کہ یہ بیشمار دیرپا اور بڑے بڑے فرق محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں ہوسکتے اجرت صحیحہ کے تخمینے میں جن جن باتوں کا لحاظ لازمی ہے اوّل ان کی تفصیل کرنے کے بعد ہم فرقِ اجرت کے اسباب تحقیق کرنا چاہتے ہیں ۔

تخمینۂ اجرت صحیحہ میں امور ذیل لازمی طور سے توجہ طلب ہیں ۔

۱ زرِ نقد کی قوت مبادلہ میں کمی بیشی ۔ بالفاظ دیگر ضروریات کی گرانی و ارزانی باوجودیکہ ریلوں نے اکثر چیزوں کی قیمت ہر جگہ کم و بیش مساوی کردی ہے ۔ تاہم واقعات شاہد ہیں کہ خورونوش کی معمولی چیزیں جن کی مزدور کو ضرورت ہے شہروں میں بہ نسبت دیہات و قصبات کے زیادہ گراں ملتی ہیں ۔ ایندھن گھاس ۔ چارہ جن کی مفصلات میں کوئی کمی نہیں شہروں میں غلے کی مانند تُل کر فروخت ہوتے ہیں اور مکانات کے کرایے میں تو زمین و آسمان کا فرق

نظر آتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جو ضروریات شہروں میں ایک روپے سے پوری ہوتی ہیں اُن کے واسطے مفصلات میں آٹھ آنے بلکہ اس سے بھی کم کافی ہیں اور اسی وجہ سے دیہات کے مزدور گو اجرت میں زرِ نقد کم پائیں لیکن بلحاظِ حصول ضروریات وہ شہر والوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہ ہوں گے۔ چنانچہ شہر والوں کی آمدنی کی زیادتی اکثر سطحی دھوکا ہوتی ہے۔ اُن کو قصبات کے کم آمدنی والوں سے زیادہ آرام میسر نہیں ہوتا۔ شہروں میں جو چیزیں بمقابلہ قصبات کے ارزاں ملتی ہیں وہ اکثر تنعّمات سے متعلق ہیں۔ دولتمند اُن سے لطف اُٹھا سکتے ہیں غریب مزدور کی حیثیت سے وہ بالاتر ہیں۔ جہاں تک مایحتاج زندگی کا تعلق ہے مفصلات کی بود و باش بمقابلہ شہروں کے بہت کم خرچ ہوتی ہے÷

ب۔ طریقِ ادائی اجرت، بالعموم تو مزدوروں کو صرف اجرت متعارف دی جاتی ہے لیکن بعض پیشہ وروں کو اجرت کا ایک جزو بشکل ضروریات بھی ملتا ہے۔ یعنی اُن کی کچھ اجرتِ متعارف ہوتی ہے اور کچھ صحیح۔ مثلاً سائیس کو علاوہ ماہواری تنخواہ کے رہنے کے واسطے مکان، جلانے کے واسطے کچھ گھاس اور اُمرا کے ہاں پہننے کے واسطے وردی بھی ملتی ہے۔ باورچی کو بھی علاوہ تنخواہ کے خوراک و مکان ملتا ہے۔ ریلوے ملازمین کو کرایہ معاف ہے۔ کہیں کہیں بڑے بڑے کارخانوں کے مزدوروں کو مکانات بلا کرایہ دیئے جاتے ہیں۔ ان کی ضروریات تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے مہیا کی جاتی ہیں۔ اور نیز پیداوارِ خام کے بعض ناقص حصے جو کارخانہ دار کے نزدیک ازکار رفتہ ہوتے ہیں مزدوروں کو مل جاتے ہیں جن سے وہ تھوڑا بہت کام ضرور نکال لیتے ہیں۔ غریب مزدور موسم سرما میں خصوصاً رات کے وقت روئی اور شکر کے کارخانوں میں نہایت شوق سے کام کرتے ہیں کیونکہ علاوہ اجرت ملنے کے اُن کو سردی کی تکلیف سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

حصۂ سوم
باب یازدہ

یہ تمام ضروریات جو مزدوروں کو حاصل ہوتی ہیں اجرت صحیحہ کا جزو ہیں۔
اجرت کُلّی کے تخمینے میں ان کا لحاظ ضروری ہے۔

یہاں یہ نکتہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مزدور کے لئے جو ضروریات مہیا کی جاتی ہیں اُن کی قدر و قیمت کا تخمینہ مزدور کے نقطۂ خیال سے کرنا چاہئے نہ کہ آجر کے۔ فرض کرو کہ کوئی امیر اپنی تُزک و شان کے خیال سے اپنے ملازمین کو نہایت بیش قیمتی لباس پہنائے یا اپنے پاس اُس کو کسی ایسی جگہ رکھے جہاں کرایۂ مکان بہت زیادہ ہو یا خوراک بہت زیادہ ہو تو ایسے لباس کی قیمت یا خرچ خوراک یا کرایۂ مکان کا حصہ مزدور اُس کی اُجرت میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ مزدور اگر آجر کا ملازم نہ ہوتا تو نہ ایسا لباس پہنتا نہ ایسی جگہ پر رہتا۔ مذکورۃ الصدر مصارف کی مقتضی آجر کی ضروریات ہیں نہ کہ مزدور کی۔ لہٰذا آجر کی ضروریات مہیا کرنے میں خواہ کچھ ہی صرف ہو مزدور کی اجرت میں اُن کے مصارف کا صرف اس قدر حصہ شمار کیا جانا چاہئے جو خود مزدور کی ضروریات کے واسطے بحالتِ خود مختاری مزدور کو درکار رہتا۔ اسی طرح اگر مزدور کو ایسی چیز ملے جو آجر کے نزدیک محض نکمی اور ناکارہ ہو۔ اور مزدور کا اس سے کوئی کام نکل سکے تو یہ چیز نہ ملنے کی حالت میں ایسی ضرورت پر مزدور کو جو کچھ صرف کرنا پڑتا وہ اُس چیز کے تعلق سے مزدور کی اجرت میں شمار کرنا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کوئی چیز جو مزدور کو دی جاتی ہے آجر کے نزدیک بیش قیمت ہو یا ناکارہ۔ اس کی قیمت وہ رقم قرار دینی چاہئے جو مزدور کو چیز نہ ملنے کی حالت میں ضرورت متعلقہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرنی پڑتی۔

ج۔ خود مزدور کو یا اُس کے خاندان کو مزید اجرت حاصل کرنے کا موقع۔

بعض پیشے ہیں کہ اُن میں علاوہ تنخواہ کے مزید آمدنی حاصل کرنے کے موقعے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسکول کے مدرس نجی طور پر طلبا کو پڑھا کر تنخواہ ملازمت کے برابر بلکہ اُس سے زیادہ روپیہ کما لیتے ہیں۔ بعض طبیب اور ڈاکٹر کسی عزیز یا دوست کا دواخانہ جاری کرا کے اپنے مریضوں کو وہاں سے دوا خریدواتے ہیں اور منافع میں خود بھی شریک رہتے ہیں۔ اسی طرح ہوشیار درزی کپڑا بھی خود ہی فروخت کر لیتے ہیں۔ اور [illegible]

خریدے ہوئے کپڑے کے مقابلے میں اپنے ہاں کے کپڑے کو جلد تر اور زیادہ عمدگی سے تیار کر کے گاہکوں کو اپنی دکان سے کپڑا خریدنے پر ایک حد تک مجبور کرتے ہیں۔ علاوہ اجرتِ سلائی کپڑے کی تجارت سے بھی منافع اُٹھاتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور دفتروں کی ملازمت میں اپنے عزیز و اقربا کے واسطے صورتیں پیدا کرنی آسان ہوتی ہیں اور بعض محکموں مثلاً ریلوے میں تو کسی ملازم کی رشتہ داری از روئے قاعدہ امیدوار کے حقوق میں داخل ہے حصولِ ملازمت میں بعض پسماندہ فرقوں کے افراد کو اعلیٰ تعلقات کی کمزوری کی وجہ سے بمقابلہ دیگر قابو یافتہ فرقوں کے ناکامی یا کم از کم دقت پیش آتی ہے۔ اگر کسی خاندان کے اکثر افراد ملازم ہوں اور فرداً فرداً تنخواہ کم ہو تو خاندان کی مجموعی آمدنی کسی ایسے خاندان سے زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے جہاں صرف ایک شخص بڑی تنخواہ پاتا ہے اور باقی سب بیکار ہیں، اور چونکہ مالی حالت کُل خاندان کی مجموعی آمدنی اور مصارف کی نسبت سے متعلق ہے لہذا اقربا و اعزا کے واسطے ملازمتیں پیدا کرنے کی قدرت اجرتِ صحیحہ کا اس وجہ سے ایک جزو ہے کہ اُس سے خاندانی آمدنی بڑھانے کی ضرورت حاصل ہوتی ہے۔ ہر سمجھدار مزدور ایسے کارخانے میں جہاں صرف اُس کی محنت درکار ہو، آٹھ آنے روز پر کام کرنے کے مقابلے میں دوسرے کارخانے میں چھ آنے روز پر کام کرنا پسند کریگا جہاں اُس کے بچے بھی سہل کام کر کے ۲ آنہ روز کما سکیں چنانچہ باوجود کمی شرحِ اجرت مزدور اس جگہ رہنا پسند کرتے ہیں جہاں خاندان کے اکثر افراد کام پا سکیں۔ گویا مزدور کے نزدیک خاندان کی مجموعی آمدنی قابلِ لحاظ ہے نہ کہ شرحِ اجرت اور یہی بات قرینِ عقل بھی ہے۔ خاندانی آمدنی کی اہمیت صنائعِ تعقیبی و تضمیمی کے تحت میں بھی واضح کیجا چکی ہے ۔ بلکہ

کسی پیشے میں خود ملازم کو جو مزید آمدنی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسکول کے مدرس کو نجی تعلیم سے فیس ملتی ہے تو اسکو اصطلاحاً اجرتِ تضمیمی کہتے ہیں خاندان کی مجموعی کمائی کو بھی اجرتِ خاندانی سے تعبیر کرتے ہیں؛

ان دونوں قسم کی اجرتوں کا اجرت صحیحہ سے جو قریبی تعلق ہے ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں۔

(۵)۔ سلسلۂ ملازمت کا قیام: بعض پیشے تو بارہ مہینے یکساں چلتے ہیں جیسے دھوبی حجام، سقے اور باورچی کا کام۔ لیکن بعض خاص خاص موسم یا حالات میں فروغ پاتے ہیں اور باقی وقت بیکاری میں بسر کرتے ہیں مثلاً درزی اور معمار بارش کے موسم میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن موسم سرما آتے ہی ان کا روزگار چمک اٹھتا ہے۔ تجارتی مرکزوں میں غلہ ڈھونے والے مزدور جن کو پلے دار کہتے ہیں، فصل ربیع و خریف کے موقع پر اتنا زیادہ کما لیتے ہیں کہ برسات میں گھر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے بیاہ شادی کے موسم کچھ مقرر سے ہیں ان دنوں میں تو باورچی اور باجہ بجانے والوں کو سائیاں سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن باقی دنوں میں وہ اتفاقی تقریبوں کا نہایت بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جب اب وہوا بگڑ جاتی ہے تو طبیب اور ڈاکٹروں کو دم لینے تک کی مہلت نہیں ملتی اور ہر وقت مٹھی گرم رہتی ہے لیکن اچھے موسم میں وہ بھی باطمینان مطب میں بیٹھے دوستوں کی گپ یا تاش و شطرنج کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مریض آگیا تو نسخہ لکھ دیا ورنہ اکثر مبارک دن وہ دوستوں کی لطف صحبت ہی سے دلشاد رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ روزگار چلنے کے زمانے میں ایسے غیر مستقل ملازمت والے اتنا زیادہ کمانے کی کوشش کریں گے کہ بیکاری کا زمانہ بسر کرنے کے لیے کافی پس انداز کر سکیں لہذا اگرچہ ایسے پیشہ وروں کی شرح اجرت زیادہ معلوم ہو لیکن درحقیقت باکاری و بیکاری کا زمانہ شمار کرنے سے انکی اجرت کا اوسط بہت گھٹ کر معمولی شرح پر آجاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اگر بیکاری کا زمانہ سخت محنت اور جفاکشی کے بعد پیش آئے تو اس سے صحت و تندرستی کو بہت نفع پہنچتا ہے اور اگر مالی آمدنی

رُک جانے سے جو کچھ نقصان ہوتا ہے اُس کی بہت کچھ تلافی راحت اور تقویت صحت سے ہوجاتی ہے مثلاً کامیاب بیرسٹر کوکسقدر دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے۔ عدالت کی تعطیلِ کلاں اُس کی تندرستی کے حق میں اسقدر مُفید ہے کہ کاروبار رُک جانے سے اُس کو حقیقتہً کوئی نقصان نہیں پہنچتا اُس بیکاری کے زمانے میں ماسبق کاروبار کی دماغی اور جسمانی تکان رفع ہوکر بعد تعطیل بیرسٹر تازہ دم کام شروع کرنے کے قابل ہوجاتا ہے جو صحت وراحت ایسی بیکاری میں حاصل ہوتی ہے وہ بھی اجرتِ صحیحہ کا جزو سمجھنی چاہیئے اس کے برعکس اگر کاروبار کی کسادبازاری سے بیکاری مسلط ہوجائے تو ایسی حالت میں بجائے آرام وتقویت کے پریشانی کی تکلیف سے صحت کو مضرت پہنچتی ہے۔گویا ایسی بیکاری سے اجرتِ صحیحہ کے اوسط میں تخفیف ہوجاتی ہے؛

بیکاری کے مذکورۂ بالا فرق کی بدولت بلاتنخواہ رخصتی ملازم اور بیکار آدمی کی حالت میں کتنا فرق نظر آتا ہے۔ ایک کے نزدیک بیکاری ضروری ہے اور دوسرے کے حق میں وبالِ جان؛

۴۔ پیشے کا صحت وطاقت پر اثر؛ اکثر کام تو ایسے ہیں کہ مزدور اُن کو عرصۂ دراز تک سرانجام دے سکتا ہے۔لیکن بعض کاموں کا مزدور کی صحت پر اس قدر مُضر اثر پڑتا ہے کہ اُس کو جلد ناکارہ بنادیتا ہے تحقیق سے ثابت ہوا کہ تعدادِ اموات کا پیشے کی نوعیت سے بہت کچھ تعلق ہے۔ پادریوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔ان کی تعدادِ اموات سو فرض کرکے نسبتہً تعدادِ اموات کاشتکاروں میں صرف ۱۱۴ قانون پیشہ لوگوں میں ۱۵۲ شراب بنانے والوں میں ۲۴۵ شراب فروشوں میں ۲۷۴ کمہاروں میں ۳۱۴ اور کان کھودنے والوں میں ۳۳۱ انگلستان میں تخمینہ کی گئی۔ چنانچہ بیمہ کمپنیاں بھی اس واقعے کا لحاظ کرکے ایسے لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے سے انکار کردیتی ہیں جو ازحد خطرناک اور مُضرِ صحت پیشوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ باوجود تمام احتیاطوں کے کان کنی خطرناک اور

مضرت رساں ہے اور خصوصاً پارے کی کان میں کام کرنیوالے مزدوروں کی صحت دو ایک ہی سال میں اس قدر تباہ ہو جاتی ہے کہ آئندہ زندگی کے باقی دن کاٹنے دوبھر ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ دلن میں جہاں پارہ نکلتا ہے مزدوروں سے کم و بیش دھوکے لالچ اور جبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خطرناک اور مخرب صحت کام لینے کے لئے مزدوروں کو اعلیٰ شرح اجرت کا لالچ دینا لازمی ہے۔ اضافۂ آمدنی کے لالچ بغیر کون خطرہ اور علالت اپنے ذمے لینا گوارا کر سکتا ہے اور جہاں مضرت کا اندیشہ اتنا قوی ہو کہ لالچ کی کشش بھی مزدور مہیا نہ کر سکے تو مجبوراً دھوکے یا جبر سے بھی کام لینا عجیب نہ ہوگا۔ اگرچہ قانون کی تیز شعاعیں ہر جگہ امن و عافیت کی روشنی پھیلا رہی ہیں، پھر بھی خدا جانے ظلم و تشدد کی تاریکی ابھی کہاں کہاں چھائی ہوئی ہے۔ ایسے معدودے چند از حد مضر صحت پیشوں کے علاوہ معمولی پیشوں میں بھی کام کا صحت پر کم و بیش مضر اثر پڑتا ہے اور شرح اجرت میں بھی اکثر اسی کے مطابق کمی بیشی ہوتی ہے؛

جو مزدور ایک پُر امن کام میں ہر روز کماتا ہے خطرناک کام میں دس بارہ آنے روز کما سکے تو عجب نہیں ہے اور جو "زیستن برائے کار" کے قائل ہیں وہ جان پر کھیل کر آمدنی بڑھاتے ہیں؛

(س) مصارف پیشہ: عام مقولہ ہے کہ وکالت کا پیشہ نمائش طلب ہے۔ وکیل کو کامیابی کے واسطے ظاہری ٹھاٹھ رکھنا لازمی ہے۔ مکان شاندار اور آراستہ ہو، گھوڑا گاڑی بھی قیمتی اور نفیس ہو، عمدہ لباس سے ذاتی وجاہت بھی بڑھی چڑھی رہے، عام تعلقات وسیع ہوں، حکام اور رؤسا سے ربط ضبط بڑھا ہوا ہو۔ تب کہیں وکالت زور پکڑ سکتی ہے۔ ورنہ محض سادگی کی وجہ سے لوگ اس قدر بدعقیدہ ہو جاتے ہیں کہ بعض قابل سے قابل وکیلوں کے جوہر کھلنے نہیں پاتے۔ اور یوں کوئی لعل گودڑ میں چمک اٹھے تو وہ مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔ یوں تو ہر پیشے میں ذاتی وجاہت اور طریق بود و باش کا اثر پڑتا ہے لیکن وکالت میں

وہ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ طبابت کا بھی کم و بیش یہی حال ہے اسی طرح عدالتی عہدوں کے مقابلے میں انتظامی عہدہ میں خرچ ہے۔ ڈپٹی کلکٹروں کو مقامی رؤسا اور معززین سے میل جول رکھنے کیلئے طریق بود و باش بھی اعلیٰ اختیار کرنا پڑتا ہے اور کھانے کھلانے میں بھی اُن کا صرف ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر مصنف چاہے تو بہت سادہ زندگی بسر کرے اور اُس کے کام میں کوئی خلل واقع نہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض مصارف محض پیشے کی مجبوری سے انسان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں ورنہ اُس کی کوئی ضرورت اُن سے حاصل نہیں ہوتی اگر وہ اس پیشے میں شریک نہ ہوتے تو ایسے مصارف کبھی گوارا نہ کرتے محض موکلوں یا مریضوں کی یا طالب علموں کی ضرورت سے وکیل طبیب یا معلم معقول کرایہ پر عمدہ موقع کے وسیع مکانات لیتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ کسی دفتر میں ملازم ہوتے تو شاید اس سے ایک چوتھائی کرایہ کے مکان کو اسی کے برابر اپنے واسطے آرام دہ پاتے۔ یا فرض کرو کہ کوئی شخص اپنے ملازم کو مجبور کرے کہ وہ معمول سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے تو ایسے کل مصارف جو مزدور کو محض پیشے کی خاطر برداشت کرنے پڑیں اور جو شریک پیشہ نہ ہونے کی صورت میں وہ گوارا نہ کرتا، اُس کی اجرت سے منہا کرنے ضروری ہیں جو کچھ باقی بچے وہی اُس کی اجرت ہے۔ اُس کی اجرت قبل و بعد منہائی مصارفِ پیشہ علی الترتیب اجرتِ خام اور اجرتِ خالص کہلائے گی:

(ص) مناسبتِ شوق و مذاق: اکثر اشخاص کو کسی نہ کسی چیز کا خاص شوق اور مذاق ہوتا ہے۔ کوئی لذیذ کھانے کا شوقین ہے تو کوئی نفیس لباس کا۔ کسی کو گانے بجانے کی دُھن ہے تو کوئی سیر و شکار پر مٹا ہوا ہے۔ کوئی روپے کا خواہاں ہے کوئی عزت کا طالب اور کسی کو حکومت و اقتدار سے زیادہ کوئی چیز بھی مرغوب نہیں۔ اور

حصّہ سوم
ابواب دہم

بعض طبیعتوں کے خواص اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ وہ افعال واعمال پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ گنوار کہاوت ہے "چار سے دو ہی کرے۔ پر نام در وند دھر دے" حکومت پسند طبیعتیں مالی آمدنی کی پروا کم کرتی ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر جیسے انتظامی عہدوں سے ایسے مصارف وابستہ ہیں کہ آمدنی خالص بعد دیگر مساوی تنخواہ والے عہدوں سے کم ہے۔ اور ہر ایک شخص رشوت بھی نہیں لیتا۔ اس عہدے کیواسطے جو اس قدر سخت کوشش اور مقابلہ ہوتا ہے۔ اس کا حقیقی باعث وہ تعزز و اقتدار ہے جو اُس سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔ فوج کی تنخواہ نسبتہً دوسرے محکموں سے کم ہے۔ لیکن سپاہی منش لوگ اسی جانبازی کی ملازمت پر جان دیتے ہیں۔ سیاحت پسند لوگ ریلوے کی ملازمت سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ شکاریوں کو جنگلات کی نوکری بیحد پسند ہے۔ سیر و تفریح کے شائق ایسے مقامات میں رہکر کام کرنا چاہتے ہیں جہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو اور دلکش قدرتی مناظر کی کثرت ہو۔

واضح ہو کہ عام طور پر تو لوگ جہاں موقع پاتے ہیں ملازمت کر لیتے ہیں لیکن بعض طبیعتوں پر شوق اور مذاق کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ انتخابِ ملازمت میں اُن کا خاص لحاظ کرنا پڑتا ہے اور اُن کی خاطر مالی منفعت کی تخفیف تک گوارا کیجاتی ہے ایسے لوگوں کی اجرتِ صحیحہ میں علاوہ اجرتِ متعارف کے۔ وہ لطف و مسرت بھی شمار کرنا چاہئے جو شوق پورا ہونے سے حاصل ہو اور جس کا تخمینہ زر نقد کی وہ مقدار ہے جو شخصِ مذکور اُس کی خاطر چھوڑنے پر رضامند ہو سکے۔

گویا شوق پورا کرنے کی حالت میں خود محنت مزدور کے حق میں دولت بن کر اجرتِ صحیحہ کا جزو ہو جاتی ہے۔ اس واقعے کو بعنوان تشریحِ خدمت۔ مقدمے میں واضح کر چکے ہیں۔

یہاں یہ جتانا بھی ضروری ہے کہ جو کام مذاق کے خلاف ہو اور طبیعت کو گراں گزرے اُس کی اجرتِ صحیحہ سے وہ بےلطفی اور تکلیف

مہیا کرنی چاہیئے جو ایسے کام کرنے سے مخصوص ہو۔ اور جو محنت کی تکان سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے۔ اور جس کا تخمینہ بھی وہ زرِ نقد ہے جو اس سے بچنے کے لیئے مزدور چھوڑنے پر آمادہ ہو سکے۔ گویا کوئی کام جس حد تک مزدور کے مذاق کے خلاف ہوگا اس کے حق میں دولتِ منفی بن کر اجرتِ صحیحہ میں تخفیف کر دیگا۔ گویا بحالتِ مساواتِ اجرتِ متعارف بے مذاق کام کرنے والے کی اجرتِ صحیحہ سے حسبِ مذاق کام کرنے والے کی اجرت زیادہ اور خلافِ مذاق کام کرنے والے کی کمتر ہوگی۔ پس مزدورِ اوّل کی اجرتِ صحیحہ مزدورِ سوم سے بدرجۂ اولیٰ زیادہ ہوئی؛

مثلاً اگر کوئی شخص مجبوری سے یا اتفاق سے یا شوق سے کاشمیر یا شملہ رہ کر کام کرے تو ان تینوں حالتوں میں بمقابلۂ یکدیگر علی الترتیب اجرتِ صحیحہ زیادہ ہوگی جب تکمیلِ شوق بھی اجرتِ صحیحہ کا جزو ٹھیرا تو اگر علمی مذاق کے لوگ مالی منفعت کی جستجو ترک کر کے مناسب ضروریات پر اکتفا کریں اور مشغلۂ تعلیم و تصنیف میں شاد و فرحاں رہیں تو کیا عجب ہے۔ چنانچہ حقیقی شاعر، ادیب، فلاسفر جیسے قوی علمی مذاق والوں نے ہمیشہ مادی دولت کو ناقابلِ التفات سمجھا ہے؛

یہاں یہ بیان لطف سے خالی نہ ہوگا کہ افراد کی طرح قوم اور فرقوں کے شوق و مذاق بھی کم و بیش جداگانہ اور مخصوص ہوتے ہیں۔ مثلاً پٹھان، سکھ، راجپوت اور مرہٹے اب تک فوجی خدمت کے شائق ہیں۔ انتخابِ ملازمت میں مسلمان بالعموم حکومت اور اختیار کا زیادہ لحاظ کرتے ہیں۔ اور اہلِ ہنود مقدارِ تنخواہ پر نظر رکھتے ہیں۔ پارسیوں کو دفتر کا کام بہت پسند ہے۔ بنگالی دماغی محنت کے بڑے مرد ہیں۔ راجپوتانے کے مارواڑی لین دین کے کام میں بے اعتدالی اور بدنامی کی حد تک مصروف اور ماہر ہیں۔ اور کاٹھیاواڑ کچھ کے بوہرے میمن تجارت میں ایسے مگن رہتے ہیں جیسے پانی میں مچھلی؛

حصۂ سوم
باب یازدہم

اجرتِ صحیحہ کے تعین میں جن باتوں کا لحاظ لازمی ہے اُن کی تفصیل بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اسکے فرق کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں اجرت کے اضافہ و تخفیف کے اسباب اور حدود قوانین اجرت کی بحث میں واضح کیئے جا چکے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مذکورۂ بالا قوانین کا مجموعی عمل بشکل قانونِ طلب و رسد نمودار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر مزدوروں کی موجودہ اور مطلوبہ تعداد کی باہمی نسبت سے ان قوانین کے مطابق اجرت میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہے۔ قانونِ طلب و رسد کا اجرت کے اساسی قوانین سے تعلق بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کا اجرت پر اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں:

عام تجربہ ہے کہ اگر ایک چیز کے دو خریدار ہوں تو قیمت بڑھیگی اور اگر ایک کے خریدار کو ایسی دو چیزیں پیش کی جائیں تو قیمت گھٹ جائیگی۔ گویا قیمت میں اضافہ و تخفیف علی الترتیب رسد اور طلب کی کمزوری یا بالفاظِ دیگر طلب و رسد کے غلبے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال اجرت کا ہے۔ اگر ایک مزدور کو دو آجر بلائیں تو اجرت بڑھیگی۔ اور اگر ایک آجر کی طرف دو مزدور دوڑیں تو اجرت میں تخفیف ہونا یقینی ہے گویا قیمت کی طرح اجرت بھی بلحاظِ کمی بیشی قانونِ طلب و رسد کے زیرِ عمل ہے۔ چیزیں بنانے کے واسطے محنت ناگزیر ہے۔ لہذا کسی چیز کی طلب میں کمی بیشی ہونے سے اس محنت کی طلب میں بھی کمی بیشی لازمی آتی ہے جو چیز مذکورہ کے بنانے میں صرف ہو۔ مثلاً گھڑی سگریٹ یا موٹر کا رواج جس قدر بڑھے گا اسی قدر زیادہ اُن کے بنانے والے درکار ہوں گے گویا چیزوں کی طلب سے محنتِ متعلقہ کی طلبِ محنت کی حقیقت سے وابستہ ہے۔ اوپر بیان کر چکے ہیں اب ہم رسدِ محنت کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں اور یہ دونوں پہلو پیشِ نظر ہونے کے بعد قانونِ طلب و رسد کا اجرت پر عملدرآمد بخوبی ذہن نشین ہو سکیگا، واضح ہو کہ جس طرح نہر کی جھالیں پانی کے بڑے بڑے تختے جابجا روکے رکھتی ہیں اور صرف سطح کا پانی ان پر گزر گزر کے آگے بڑھتا رہتا ہے بعینہ محنت کی آزادانہ رسد میں بھی چند زبردست بندشیں سدِ راہ ہو کر ترقی پذیر محنت کی مقدار گھٹاتی چلی جاتی ہیں اگر یہ بندشیں نہ ہوتیں تو سطحِ آب ہر جگہ برابر ہوتی۔ پانی جدھر ڈھلاؤ پاتا

بہنے لگتا۔ مزدوروں کے طبقوں میں اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ رسدِ محنت فوراً طلب کی پیروی کرتی۔ لیکن جبکہ متعدد بندشیں آزادانہ حرکت میں مزاحم ہوں تو پانی میں پست و بلند تختے اور مزدوروں میں اعلیٰ ادنیٰ طبقے پیدا ہو جانے لازمی ہیں۔ اور پانی کا بہاؤ اور محنت کی رسد بیشتر بندشوں کی حالت پر منحصر ہو جاتی ہے۔ چند قابلِ لحاظ رکاوٹیں جو رسدِ محنت میں مزاحم ہوتی ہیں حسبِ ذیل ہیں:۔

۱ قدرتی مناسبت و استعداد: کہتے ہیں کہ شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تعلیم سے نہیں بنتا۔ گویا استعدادِ شاعری خداداد ہوتی ہے۔ اکتسابی نہیں ہو سکتی۔ یہی حال کم و بیش مصوری اور موسیقی کا ہے۔ ان فنونِ لطیفہ میں ہر کوئی محنت اور کوشش کے زور سے کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ خیال ہے کہ عمدہ تراش اور اعلیٰ جراحی کیواسطے بعض ہاتھ قدرتاً موزوں ہوتے ہیں جو بچے پیدا ہوتے ہیں اُن میں صرف بعض نہایت توانا تندرست ہوتے ہیں اور بعض از حد ذکی اور تیز فہم اور باقی دونوں لحاظ سے اوسط اور ادنیٰ درجے میں شمار ہوتے ہیں گویا مناسبت اور استعداد کی تقسیم غیر مساوی ہے خود قدرت نے محنت کی رسد پر حدود قائم کر کے مزدوروں کے جدا جدا طبقے پیدا کر دئیے جس کام کیواسطے خداداد استعداد کی ضرورت ہے اس کے کرنے والوں کی رسد قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ الہ آباد کی مشہور نمائش میں مس گوہر سرکاری اہتمام سے بمشکل ایک گھنٹہ روز گاتی ہوگی۔ کئی ہزار روپے کے ٹکٹ روز فروخت ہوتے تھے جس میں سے صرف ایک ہزار مس گوہر بطور فیس لے لیتی تھی۔ اگر مس گوہر کے مثل گانے والوں کی کثرت ہوتی تو ایسی آمدنی ناممکن تھی۔ ملکۂ روس نے جب ایک مشہور گویتے سے شکایت کی کہ وہ روس کے سپہ سالارِ اعظم کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ روزانہ فیس وصول کرتا ہے تو اس نے کیا معقول جواب دیا کہ پھر آپ اپنے سپہ سالارِ اعظم ہی سے گانا کیوں نہیں گوا لیتی ہیں میری کیا ضرورت ہے۔ اگر محض کوشش سے مصوری میں کمال پیدا کرنا ممکن ہوتا تو مانی و بہزاد کا

نام دنیا میں یوں غیر فانی نہ ہو سکتا۔ ایک ایک تصویر کی ہزار ہا روپے قیمت کیوں دی جاتی ہے۔ دستی تصاویر فوٹو کی طرح کیوں ارزاں نہیں بکتیں۔ اکثر کلوں کی ایجاد نے جسمانی طاقت کی ضرورت گھٹا دی تاہم بعض کاموں میں اب تک جسمانی طاقت خاص طور سے درکار ہے اور ایسے طاقتور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے شرح اجرت بھی معمول سے زیادہ ہے۔ لوہا صاف کرنے اور ڈھالنے کے کارخانوں میں بعض اَن پڑھ مزدور نہایت طاقت طلب کام کر کے تین سو روپے ماہوار تک کما لیتے ہیں۔ علمی کاموں میں خداداد دماغی قوت کا فرق ہر طرف نمایاں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر قلت رسدِ محنت جو اضافۂ شرحِ اجرت کا باعث ہوتی ہے وہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ہے۔

ب۔ صرف دولت اکتسابِ قابلیت۔ قدرت نے انسان میں جو استعداد ودیعت کی ہے اس کی حالت اُس سونے کی سی ہے جو مٹی میں ملا کان میں پڑا ہو۔ کان سے کھود کر نکالنا مٹی سے صاف کرنا سونے سے کام لینے کی مقدم شرطیں ہیں۔ بعینہ خدا نے انسان کو جو استعداد عطا کی ہے اُس کا پتا لگانا اور تعلیم و تربیت کے ذریعے سے اُس کو اصلاح اور ترقی دے کر کمال پیدا کرنا قابلیت کے واسطے لازمی ہیں۔ خود اس محنت کی بحث میں ہم بالتفصیل واضح کر چکے ہیں کہ کیونکر تعلیمی مصارف اور تربیت کی دقتیں اکثر ہونہار غریب بچوں کو ان ترقیوں سے محروم کر دیتی ہیں جن کی وافر استعداد اُن کی ذات میں موجود ہوتی ہے بہت نہیں لیکن پھر بھی چند نیوٹن، شیکسپیر، نپولین، بسمارک اور گلیڈسٹون یورپ میں ضرور پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ایک ایک کے سوائے باقی سب ناساعد حالات کے شکار ہو گئے۔ اس موقعے پر خواصِ محنت کا بیان پڑھنے کی سفارش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گویا رسدِ محنت پر ایک حد خود قدرت نے غیر مساوی تقسیم استعداد سے قائم کر دی۔ دوسری حد استعداد کو

قابلیت بنانے کے مصارف اور دقتوں سے پیدا ہوگئی ہے۔

ج۔ مذکورۂ بالا غیر اختیاری بندشوں کے علاوہ کچھ رکاوٹیں مذہب رسم و رواج اور قانون نے بھی رسدِ محنت میں پیدا کر رکھی ہیں مثلاً مسلمان شراب کے کام سے بیزار رہتے ہیں۔ ہندو گوشت اور چمڑے کے کاروبار میں بہت کم ہاتھ لگاتے ہیں۔ اکثر مسلمان تو بلاتکلف ہندوؤں کی بنائی ہوئی چیزیں کھاتے ہیں مگر اکثر ہندو سوائے اپنے ہم مذہب اور خصوصاً برہمن کے اور کسی کی بنائی حتیٰ کہ چھوئی ہوئی کھانے پینے کی چیز کو پاس تک نہیں آنے دیتے۔ اسی وجہ سے مسلمان حلوائیوں کی دکانیں بہت کم سرسبز ہوسکتی ہیں۔ لوہار، بڑھئی، معمار، درزی وغیرہ کے پیشے ذلیل اور ادنےٰ خیال کیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ اب ان پیشوں کی اجرت معقول ہوگئی ہے اور برابر بڑھ رہی ہے لیکن اب تک رسم و رواج کے اثر سے نادار شریف قلیل ملازمت حتیٰ کہ فاقہ کشی کو بھی پیشے اختیار کرنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ غریب شریف دس روپے کی ملازمی کو بیس روپے کی مزدوری سے ہزار درجہ غنیمت سمجھیگا۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بیکار شریفوں پر افلاس کی مصیبت چھائی ہوئی ہے۔ اور پیشہ ور لوگ جن کو ذلیل خیال کیا جاتا ہے روز بروز خوشحال اور مالدار بنتے جاتے ہیں شریفوں کو خاندانی محلات کی مرمت کی بھی توفیق نہیں اور پیشہ ور نئے نئے مکانات تیار کرا رہے ہیں۔ شریف آبائی جائداد گرو رکھتے پھرتے ہیں۔ پیشہ وروں میں جائداد کا شوق پھیل رہا ہے۔ اگر کچھ دنوں رسم و رواج پیشے اختیار کرنے میں یوں ہی مزاحم رہے تو ان دونوں طبقوں کی مالی حالت میں بالکل کایا پلٹ ہو جائیگی۔ بمقابلہ ہمسایہ قوموں کے مسلمانوں میں پیشے خاص طور سے شرافت کے منافی خیال کیئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید گزشتہ حکومت کا خمار ہو۔ ورنہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ذات کے فرق مٹائے اور پیشہ وروں کا رتبہ بڑھا کر ہر ایک کو بلاتکلف پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔

قانون نے رسدِ محنت پر ایک طرف نمایاں حد قائم کی ہے یعنی فوج میں سوائے سکھ، پٹھان، راجپوت اور مرہٹے کے مثلاً جنگجو قوموں کے اور کوئی ہندوستانی فرقہ بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ اسکے علاوہ بعض محکموں کی ملازمت کے واسطے عمر کی بھی شرط لازمی ہے۔
چونکہ جدید کارخانوں میں جہاں ہزارہا مزدور یکجا کام کرتے ہیں بحالت عدم نگرانی مزدوروں کی صحت و اخلاق کے خراب ہونے حتی الامکان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے لہٰذا ایک فیکٹری ایکٹ پاس کر کے کارخانوں کی رسدِ محنت پر قانونی حدود عائد کر دی گئیں ۹ سال سے کم عمر بچے داخل نہیں ہو سکتے اور ۱۴ سال تک عمر والے ۷ گھنٹے روز سے زیادہ اور رات کے وقت کام نہیں کر سکتے عورتیں بھی صرف روئی اوٹنے کے کارخانوں میں رات کے وقت کام کر سکتی ہیں کوئی مزدور ۱۲ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں فیکٹری مزدوروں کی خاص نگرانی کی جاتی ہے۔ ورنہ آجروں کی چیرہ دستی اور مزدوروں کی ہوس کا یقینی نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔
علاوہ مذکورۂ بالا مذہبی رسوم اور قانونی حدود کے خود انسانی طبیعت اور عادات بھی رسدِ محنت میں حارج ہوتی ہیں جراحی کا کام مکروہ مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نفاست پسند طبیعت والے اس سے ہمیشہ دستکش رہے اور یہ فن اکثر حجاموں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ واقعہ ہے کہ بعض لوگ تو عمل جراحی دیکھنے تک کی تاب نہیں لا سکتے حتیٰ کہ بیہوش ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ ڈاکٹری مدرسوں میں جو طالبعلم داخل ہوتے ہیں اُن میں سے تخمیناً دس فی صدی چند ماہ میں اس وجہ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کے کام سے اُن کی طبیعت از حد متنفر ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس قدر احتیاط پسند ہوتے ہیں کہ وہ کمتر اجرت پر قناعت کر کے جرأت طلب اور خطرناک کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بعض کام گندے بھی ہیں اور اس قدر آسان کہ ادنیٰ ترین مزدور جن کی تعداد ہمیشہ کثیر ہوتی ہے، ان کو کر سکتے ہیں۔ ایسی محنت کی رسد ہمیشہ وافر ہوتی ہے اور

باب یازدہم شرحِ اجرت بھی ادنی۔ چنانچہ حلال خور اور رفاکروب اسی طبقے میں شامل ہیں؛

ارزانی وگرانی محنت ۹۔ ارزانی محنت کا مسئلہ جس قدر عملی لحاظ سے اہم اور قابلِ تحقیق ہے، اتنا ہی اصولی حیثیت سے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ عام طور پر تو ارزانی سے مقدار اجرت کی کمی مراد لی جاتی ہے۔ یعنی ۴ آنے روز والے مزدور کی محنت آٹھ آنے اجرت والے سے ارزاں مانی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت محنت کی ارزانی کو فی نفسہ مقدارِ اجرت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ بعض کہا جاتا ہے کہ ارزانی نسبتِ پیداوار محنت اور اجرت موافقت سے متعلق ہے مثلاً اگر ایک مزدور چار آنے روزانہ اجرت پر بارہ آنے کا کام کرے اور دوسرا آٹھ آنے پر ایک روپے چار آنے کا تو پہلے کی پیداوار محنت اور اجرت کی نسبت بمقابلہ دوسرے کے زیادہ موافق ہے۔ لہٰذا پہلے کی محنت دوسرے سے لازماً ارزاں ہے۔ بظاہر تو یہ اُصول بالکل درست نظر آتا ہے۔ لیکن بعض حالتوں میں یہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکہ میں بمقابلہ اکثر ترقی یافتہ ممالک کے باوجودیکہ نہ صرف مقدارِ اجرت سب سے زیادہ بلکہ نسبتِ پیداوار و اجرت بھی کمتر موافق ہے تاہم وہاں کی محنت سب سے ارزاں خیال کی جاتی ہے۔ اس معمّے کا حل ارزانی کے تغیر پذیر مفہوم میں مُضمر ہے۔ یاد ہوگا کہ بلحاظِ کاشت وسیع و قسیق زرخیزی زمین کے دو مفہوم بیان کیے گئے تھے۔ بحالتِ اوّل اس سے پیداوار اور مصارف کاشت کی موافقت مُراد ہے اور بحالتِ دوم مقدارِ پیداوار کی بیشی۔ بعینہٖ ارزانی اجرت کا مفہوم بھی دو معنی رکھتا ہے۔ بلحاظِ تعددِ مفہوم زرخیزی زمین اور ارزانی محنت میں کامل مشابہت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ زرخیزی کی مذکورۂ بالا بحث کا ارزانی کی مندرجۂ ذیل توضیح سے مقابلہ کرنا صرف مفید بلکہ باعثِ دلچسپی ہوگا؛

فرض کرو کہ چار مزدور ۴۔ ۶۔ ۸ اور ۱۰۔ آنے اجرت لیکر ۱۲۔ ۱۵۔ ۲۰ اور ۲۴ آنے قیمتی چیزیں روز تیار کریں۔ اب اگر آجر کو ایک مہینے میں ۴۵ ہزار روپے کا سامان تیار کرانا مقصود ہو تو اس کام کے واسطے قسمِ اول کے مزدور ۲۰۰۰ دوم کے ۱۶۰۰

حصۂ سوم باب یازدہم

سوم ۱۲۰۰ اور چہارم کے ۱۰۰۰ کارکنوں کے۔ ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اور صنعتی مرکزوں میں لگانِ زمین بہت اعلیٰ ہے اور کارخانوں میں نہایت بیش بہا کلوں سے کام لیا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ سو مزدوروں کی ٹولی کے واسطے ۱۵۰ روپیہ ماہوار تنخواہ کے نگران ۱۰۰ روپیہ ماہوار کرایہ کا قطعۂ اراضی اور پچاس ہزار کا اصل قائم بشکل مشین و عمارت درکار ہے جس کی شرح سود ۵ فی صدی اور مطالبات فرسودگی (جن کی مفصل تشریح آئندہ کی جا ئیگی) ۴ فی صدی سالانہ ہو تو مختلف قسم کے مزدوروں سے کام لینے میں مجموعی مصارف پیدائش علاوہ قیمت پیداوار خام حسب ذیل ہوں گے :-

مزدور قسم	اول ۲۰۰۰	دوم ۱۲۰۰	سوم ۱۱۸۰	چہارم ۱۰۰۰
اجرت	۱۵۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۸۷۵۰
تنخواہ نگران و لگان زمین	۵۰۰۰	۴۰۰۰	۳۰۰۰	۲۵۰۰
سود اصل و مطالبات فرسودگی	۷۵۰۰	۶۰۰۰	۴۵۰۰	۳۷۵۰
	۲۷۵۰۰	۲۸۰۰۰	۲۵۵۰۰	۲۵۰۰۰

تخمینۂ اوّل و چہارم پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ پسماندہ ممالک میں جہاں بیش بہا اصل سے کام نہیں لیا جاتا اور لگانِ زمین بھی اعلیٰ نہ ہو بالفاظ دیگر مقدارِ سود اور لگان زیادہ نہیں ہے اور مصارف پیدائش کا جزو قلیل ہو ارزانی محنت پیداوار و اجرت کی نسبت کی موافقت پر منحصر ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جہاں سود اور لگان مصارف پیدائش کے قابل لحاظ اجزا ہیں ارزانی محنت خاص طور سے پیداوار کی بیشی سے متعلق ہے۔ اگرچہ نسبت پیداوار و اجرت مقابلتہً کمتر موافق ہو لیکن اگر کمی موافقت حدِ مناسب سے تجاوز کر جائیگی تو باوجود بیشی پیداوار ایسی محنت ارزاں نہ ہو سکیگی۔ چنانچہ اگر قسم چہارم کے مزدور بجائے ۱۰ ر ۱۲ آنے اجرت لے کر ۲۴ آنے قیمتی چیز تیار کریں تو اُن سے کام لینے میں مصارف پیدائش ۲۸۷۵۰ تک بڑھ کر اُن کی محنت قسم اوّل سے بھی گراں ہو جائیگی دوسرے اور تیسرے تخمینے سے صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں اجرت مختص بالعمل کی یکساں شرح سے جو مزدور اجرت مختص بالزماں جس قدر زیادہ مقدار میں حاصل کر سکے گا

اس کی محنت بھی اُسی قدر ارزاں پڑیگی - اوّل تینوں تخمینوں کے ملاحظے سے تیسرا قابل توجہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مقدار پیداوار محنت میں زیادہ فرق ہو جیسا کہ اول دوم میں تو باوجود کمتر موافقت نسبت پیداوار و اجرت ارزانی محنت بیشی پیداوار کی پیرو ہوگی - اور اگر مقدار پیداوار میں فرق کم ہو جیسا کہ اوّل و دُوم میں تو باوجود بیشی پیداوار ارزانی محنت موافقت نسبت پیداوار و اجرت کے تابع ہوگی گویا فرق مقدار پیداوار کی کمی بیشی کے مطابق ارزانی محنت علی الترتیب موافقت نسبت پیداوار و اجرت اور بیشی مقدار پر منحصر ہے - حاصل کلام مذکورۂ بالا تینوں کا یہ ہے کہ پسماندہ ممالک میں شرح اُجرت مختص بالعمل جس قدر ادنیٰ ہوگی محنت ارزاں ہوگی - یکساں پسماندہ اور ترقی یافتہ ممالک میں مزدور اجرت مختص بالعمل کے مساوی شرح سے جس قدر زیادہ اجرت مختص بالزمان حاصل کرسکیگا اس کی محنت اُسی قدر ارزاں ہوگی - اور خاص ترقی یافتہ ممالک میں اس مزدور کی محنت ہی ارزاں ہے جو سب سے زیادہ اجرت مختص بالزماں حاصل کرے اگرچہ حدِ مناسب تک شرح اجرت مختص بالعمل بمقابلہ دیگر ممالک ناموافق بھی ہو - چنانچہ یہی آخری حالت امریکہ میں پائی جاتی ہے - وہاں مزدور بمقابلہ دوسرے ملکوں کے زیادہ کماتا ہے اور اجرت مختص بالعمل کی شرح بھی مقابلتہً اعلیٰ ہے - لیکن پھر وہاں کی محنت سب سے ارزاں اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت وہاں پر مصارف پیدائش میں سود اور لگان کا جزو بہت غالب ہے - اور اس غلبے کا نتیجہ ہم مندرجۂ بالا تخمینے میں بھی واضح کرچکے ہیں ؛

امریکن معاشیین کا مقولہ کہ **سب سے اعلیٰ اجرت والی محنت سب سے ارزاں ہے** - بظاہر ایک چیستاں معلوم ہوتا ہے لیکن مذکورۂ بالا بحث سے اس قول کی سچائی اور اہمیت ظاہر ہے - علاوہ ازیں معاشی ترقیات اور کلوں کی ایجادات کا مزدور کی مالی حالت پر کیونکر مفید اثر پڑ سکتا ہے اور کس حالت میں اضافۂ اجرت آجر و مزدور کے حق میں برابر مفید ہونا ممکن ہے - ان اہم مسئلوں کی بھی یہاں تشفی بخش توضیح ہوگی ؛

حصّہ سوم
باب یازدہم
اضافۂ اجرت
اور اس کے
نتائج

۱۰ جو معاملات شمار و اعداد میں ظہور پذیر ہو سکیں۔ مثلاً آبادی اموات و پیدائش امراض، تجارت درآمد و برآمد ان کے اعداد سے صحیح نتائج اخذ کرنا معاشی اُصول کی صحت جانچنا اُن کی ترمیم و تائید کرنا پیچیدہ دشوار کام ہے جو معاشیات میں ایک جداگانہ فنِ اعداد شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اس فن کی تفصیلی بحث کا محل نہیں ہے اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے ذرا اتنا جاننا کافی ہے کہ اس کام سے چند در چند شرائط متعلق ہیں جن میں سے اکثر کی پابندی اگر محال نہیں تو پیچیدہ دشوار ضرور ہے۔ انھیں دقت طلب شرائط کی بدولت یہ مقولہ صحیح ہے کہ اعداد سے ہر قسم کے حتّٰی کہ متضاد نتائج اخذ کیے جاتے ہیں جب تک شرائط لازمی کی تکمیل نہ ہو۔ اعداد کی حالت بالکل موم کی سی ہے جس سانچے میں چاہو ڈھال دو۔ چنانچہ اعداد وہی ایک ہیں لیکن دو گروہ اپنے اپنے طور پر ہندوستان میں افلاس و دولتمندی کا اضافہ ثابت کرتے ہیں۔ فرقِ اجرت ہی کو لیجیے۔ طبقے طبقے کے مزدوروں کی تعداد اور اُنکے کاروباری وقت کا سالانہ تخمینہ کرکے اُن کی اجرتِ متعارف کا جداگانہ اوسط نکالنا پھر زرِ نقد کی قوتِ مبادلہ اور ہر طبقے کی ضروریات کا علیحدہ اندازہ کرکے اجرتِ صحیحہ کا پتا لگانا یہ سب تحقیق زمانۂ ماضی و حال کے اوقاتِ معیّن کے متعلق کرکے دونوں نتائج کے مقابلے سے اضافہ و تخفیفِ اجرت کا دریافت کرنا، کیا کچھ آسان کام ہے؟ علاوہ احتیاط کے کس قدر وسعتِ معلومات درکار ہے اور حسب ضرورت صحیح و مکمل اعداد کا ملنا آجکل کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی کس قدر دشوار ہے چونکہ پیش پا افتادہ اعداد سے بلا تامل نتائج نکال کر انکی صحت پر اعتماد کرنے سے عجیب و غریب بے بنیاد مغالطے پیدا ہونے ممکن ہیں، بطور تنبیہ عددی نتائج کی احتیاط طلبی اور مغالطہ انگیزی کی طرف اشارہ ضروری سمجھا گیا؛

کسی مُلک کے مزدوروں کی مجموعی کمائی تعدادِ مزدوراں سے تقسیم کرکے جو اوسطِ اجرت فی مزدور نکالا جاتا ہے۔ اس سے نہ تو مزدوروں کی مالی حالت پر کچھ روشنی پڑتی ہے نہ اضافہ و تخفیفِ شرحِ اجرت ہی کا پتا چلتا ہے۔ فرض کرو کہ

حصّۂ سوم
باب یازدہم

ایک ایک ہزار مزدوروں کے دو گروہ ہیں۔ اوّل گروہ میں ۵۰۰ کی اجرت ۱۲ روپیے ماہانہ ۴۰۰ کی ۲۵ روپیے اور ۱۰۰ کی ۴۰ روپیے ماہانہ ہے۔ دوسرے گروہ میں ۵۰۰ کی آمدنی ۸ روپیے ۴۰۰ کی ۱۵ اور ۱۰۰ کی ۱۰۰ روپیے ماہوار ہے۔ ظاہر ہے کہ بحیثیت مجموعی اوّل گروہ کی مالی حالت دوم سے بہت بہتر ہے تاہم دونوں گروہوں کا اوسط اجرت وہی ۲۰ روپیے مزدور ہے۔ اور اگر گروہ دوم میں آخری ۱۰۰ کی اجرت ۱۱۰ روپیے ہوجائے تو اوسط اور بھی زیادہ گویا ۲۱ روپیے فی مزدور ہوجائیگی۔ حالانکہ مالی حالت اب بھی گروہ اوّل کی برتر رہیگی۔ اسی طرح فرض کرو کہ ۱۲ روپیے والے مزدوروں میں سے ۱۰۰ - ۲۵ والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۲۰۰ - ۴۰ والوں میں آملیں، یا الفاظِ دیگر ۲۰۰ کی اجرت ۱۲ اور ۴۰۰ کی ۲۵ اور ۴۰۰ کی ۴۰ ہوجائے تو اوسط اجرت بڑھ کر بجائے ۲۰ کے ۲۸ ½ روپیے ہوجائیگا حالانکہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا (مزید براں اگر شرح اجرت ۱۰ فی صدی گھٹا دی جائے تو بھی اوسط ۲۵ ½ فی مزدور قائم رہیگا گویا اجرت میں ۱۰ فی صدی تخفیف کے ساتھ ساتھ اوسط میں ۲۵ فی صدی اضافہ ہوگیا) اس کے برعکس اگر ۲۵ روپے والے مزدوروں میں سے ۳۰۰ - ۱۲ روپیے والوں میں آملیں تو اوسط صرف ۱۶ روپیے رہ جائیگا حالانکہ شرح اجرت برقرار ہے بلکہ اگر اجرت میں ۱۰ فی صدی اضافہ کردیا جائے تو بھی اوسط تقریباً ۱۸ روپیے پڑیگا گویا باوجود ۱۰ فیصدی اضافۂ اجرت اوسط میں ۱۰ فی صدی تخفیف نظر آئیگی۔ ان سادہ مثالوں سے واضح ہوا کہ جب تک پوری تفصیل پیشِ نظر نہ ہو محض اوسط سے مزدوروں کی مالی حالت اور تبدیلیٔ شرحِ اجرت کا صحیح علم ہونا محال ہے۔

اوسط اور تبدیلیٔ شرحِ اجرت کی بےتعلقی سے ایک قابلِ لحاظ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اضافۂ شرحِ اجرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک انفرادی، جیسا کہ مثالِ بالا میں ۱۲ روپیے والے مزدوروں کا ۲۵ روپیے والوں میں یا ۲۵ والوں کا ۴۰ والوں میں آملنا۔ جہاں تک ادنیٰ سے اعلیٰ طبقے میں ترقی کرنیوالے مزدوروں کا تعلق ہے، اجرت کے اضافے میں کوئی شک نہیں لیکن یہ اضافہ صرف اُن کی ذات تک محدود ہے۔ فی نفسہٖ شرحِ اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

حصہ سوم

باب دہم

طبقۂ ادنیٰ کے پسماندہ اور طبقۂ اعلیٰ کے سائر مزدوروں کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اضافۂ اجرت کی دوسری صورت طبقہ وار ہوتی ہے گویا مزدوروں کے کل گروہ کی اجرت میں کچھ فی صدی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور کل مزدور یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ مثالِ مذکورۂ بالا میں جب ۲۰ روپے والوں میں سے ۱۰۰ مزدور ۲۵ روپیے والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۱۰۰ – ۳۰ روپیے والوں میں آئیں تو اضافۂ اجرت انفرادی ہوگا۔ لیکن اگر ۲۰ روپیے والے ۵۰۰ مزدوروں کی اجرت ۲۴ روپئے اور ۲۵ والے ۴۰۰ کی اجرت ۳۰ روپیے اور ۳۰ والے ۱۰۰ کی اجرت ۳۶ روپئے ہو جائے تو اضافۂ اجرت طبقہ وار کہلائیگا۔ اور دونوں صورتوں میں اوسط اجرت یکساں ۲۰ روپئے سے بڑھ کر ۲۸ ½ روپئے ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی اضافے کے مقابلے میں طبقہ وار اضافے کا اثر مزدوروں اور نیز ملک کی مالی حالت پر کہیں زیادہ وسیع اور گہرا پڑیگا۔ چنانچہ اضافۂ شرحِ اجرت سے بالعموم طبقہ وار اضافہ مقصود ہوتا ہے اور اسی مفہوم میں ہم نے اوسط اور تبدیلیٔ اجرت کی بے تعلقی اوپر واضح کی ہے۔

اضافۂ اجرت کی بلحاظِ وسعت دو صورتیں، اور اُس کا عام مفہوم بیان کرنے کے بعد اب ہم اُس کا فائدہ اُٹھانے والے مزدوروں کی حالت پر اثر دکھانا چاہتے ہیں۔ بعض ضرورتیں قیامِ زندگی کے واسطے ناگزیر ہیں مثلاً کھانا، پینا، لباس، مکان۔ بعض عمدہ کارگزاری کے واسطے لازمی ہیں۔ مثلاً مقوی جسم غذا آرام دِہ لباس اور آسائش افزا مکان صحت بخش آب و ہوا آرام لینے کی مہلت خودداری کا احساس، ترقی کی اُمنگ اور یہ سامان مقدارِ اجرت کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ بدقسمتی سے مرفہ الحالی کی بدولت کہیں کہیں مزدوروں کی ضروریات اُن بیجا تنعمات کی حد میں داخل ہوگئی ہیں جو اخلاق صحت اور کارگزاری سب کے حق میں کم و بیش مُضر ہیں یہ حالت بیشتر یورپ اور امریکہ سے ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتی ہے لیکن وہاں بھی تمام مزدوروں کی ضروریات قسمِ دوم تک محدود ہیں۔ مقابلتہً صرف چند کو رنگ رلیاں میسر ہو سکتی ہیں ایشیا کا غریب مزدور کم و بیش ضروریاتِ قسمِ اوّل پر قانع پایا جاتا ہے لیکن مزدور کے حق اجرت کی تفریط

افراط سے بھی زیادہ مُضر ہے اور ضروریات قسم دوم کی بہم رسانی نہ صرف مزدور بلکہ کل مُلک کے حق میں بیحد مفید ہے ۔ واضح ہو کہ ایسی ضروریات میں بہت کچھ اضافے اور ترقی کی گنجائش ہے ۔ مزدور کی ضروریات قسم دوم تک محدود کرنے سے یہ غلط نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ اضافۂ اُجرت پر کوئی حد بندی مقصود ہے بلکہ یہ ظاہر کرنا مدِ نظر ہے کہ مذہبی معاشرتی اور تعلیمی اثرات اور بحدِ مناسب قانونی پابندی سے مزدور کو بُرے مذاق اور بُری عادات سے روکا جائے تاکہ وہ ضروریات قسم سوم کی طرف کم مائل ہو اور اپنی زندگی ضروریات قسم اوّل و دوم پر قائم کرکے خود بھی جائز لطف اُٹھائے اور مُلک کی مرفہ الحالی میں بھی اضافہ کرے ۔ چونکہ ہر مُلک میں جماعت کثیر مزدور پیشہ ہوتی ہے ۔ لہٰذا مزدوروں کی تربیت و اصلاح گویا کل آبادی سے متعلق ہے ؛

اگر مزدور صرف معدودے چند ضروریات قسم اوّل کا عادی اور انھیں پر قانع ہے تو اضافۂ اُجرت کا نتیجہ تخفیف محنت ہوگا ۔ مثلاً اگر چار آنے روز اجرت اُس کی کل ضروریات کے واسطے کافی ہیں اور ضروریات بڑھانے کا اس کو شوق نہ ہو تو اجرت ۸ آنے روز ہو جانے کی حالت میں وہ غالباً ہفتے میں دو تین روز کام کرنا چھوڑ دیگا ۔ بلا ضرورت ، وہ کام کیوں کرنے لگا ۔ چنانچہ ہمارے ملک کے اکثر کاریگر درزی ، سُنار ، بڑھئی جو تھوڑی سی محنت سے ضرورت کے لائق کما لیتے ہیں بدشوق اور کام چور ہونے میں مشہور عالم ہیں ۔ وہ دُکان پر بہت کم نظر آتے ہیں اور اُن سے کام بنوانے کیلئے پہرہ بٹھانا لازمی ہے ۔ گرم ممالک کے باشندے جن کی ضروریات متقابلۃً مختصر ہیں اور بآسانی مہیا ہو سکتی ہیں ۔ کام سے کمتر مانوس پائے جاتے ہیں اور بیشی اجرت سے وہ اکثر کمی محنت کا فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ اس کے برعکس اگر مزدور کو ضروریات قسم دوم کا چسکا لگ جائے اور ایسی ضروریات کا میدان نہایت وسیع ہے تو اضافۂ اجرت کے ساتھ ساتھ اس کو کام سے بھی زیادہ محبت ہوگی ۔ اس کی کارگزاری ترقی کریگی ۔ گویا بہم رسانی ضروریات کا شوق ، اضافۂ اجرت ، تکثیر محنت اور ترقی کارگزاری میں باہم سبب اور نتیجے کا دوہرا رشتہ

…کے مزدور کا طرزِ بود و باش اعلیٰ اور اس کی زندگی کا لطف بڑھا دیگی چنانچہ
…اور امریکا کے صنّاع جس قدر اپنے کام میں ماہر ہوں گے اور اُنکی اجرت
ہو گی اتنی ہی وہ اپنے کام میں توجہ اور محنت کریں گے۔ تاکہ زندگی کے
نئے لطف جو اُن کے پیشِ نظر ہیں اُٹھا سکیں۔ قسمِ دوم کی ضروریات
مزدور کو محنت کے میدان میں اسی طرح دوڑاتی ہیں جیسے پیاسے کو
…تادہ سرِ چشمہ درمیانی فاصلہ طے کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور منزلِ مقصود
قدر قریب ہوتی جاتی ہے۔ آتشِ شوق تیز تر گردد کے مطابق جہد بیشی
…تی ہے حتیٰ کہ فائز المرام ہونے پر بجائے کسل و تکان کے بوجہ مسرت کامیابی
…اور چستی میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ اِن ضروریات میں گویا دو [illegible]
ہے۔ اُن سے نہ صرف محنت کا شوق بڑھتا ہے بلکہ کارگزاری بھی ترقی
ہے اور چونکہ ان کا سلسلہ نہایت طولانی ہے مزدور [illegible] طرح
ترقی پر بہت دور پہنچا سکتی ہیں۔ چنانچہ مزدور کو ضروریاتِ قسمِ اوّل پر اکتفا
…کے دیتے ضروریاتِ قسمِ سوم سے بچانے اور قسمِ دوم کا ذوق و شوق پیدا
…کا امریکا میں خاص اہتمام پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ شرحِ اجرت اعلیٰ
…خوشحال محنت دارزان اور ملک دولتمندی میں سب سے پیش پیش ہے۔
عام مشاہدہ ہے کہ پسماندہ اور افلاس زدہ طبقوں میں بمقابلہ ترقی یافتہ
…عال لوگوں کے۔ اولاد کی ترقی ہے۔ اور اسباب کچھ ہی ہوں لیکن ایک
وجہ یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ ان کی ضروریاتِ زندگی اتنی مختصر اور
ہوتی ہیں کہ باوجود اپنی کثرتِ اولاد کچھ بار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس
…قوں میں ضروریات اس قدر کثیر اور پُر خرچ ہو گئی ہیں کہ ہر عاقبت اندیش آدمی
…ولاد کا مسئلہ اپنے حق میں قابلِ توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ
…یگر وجوہات کے مصارفِ خاندان کے متحمل نہ ہو سکنے کا خوف بھی
…فتہ ممالک میں بہت سے لوگوں کو شادی سے روکتا ہے خود ہندوستان
…یجیئے کہ جوں جوں مصارفِ زندگی بڑھ رہے ہیں بیاہ شادیوں میں بھی تاخیر
…وہی ہے۔ اوّل بسراوقات کی صورت پیدا کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اور گو

اخلاقی لحاظ سے یہ فعل قابلِ نفرین سہی لیکن واقعہ ہے کہ مصنوعی طریق سے پیدائش کی حدبندی کرسکے۔ خوشحال لوگ ایک دو بچوں سے زیادہ اولاد پسند نہیں کرتے اور اس لیئے کہ بطریقِ احسن پرورش پاسکیں محدود تعداد خود اولاد کے حق میں بھی مفید خیال کرتے ہیں۔ پیدائشِ اولاد کے اس نمایاں فرق کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ طبقوں کی اجرت بڑھنے سے اُن کی کارکردگی تو بڑھتی نہیں لیکن اولاد میں جلد اس قدر اضافہ ہوجاتا ہے کہ رسدِ محنت کی زیادتی سے اجرت کے پھر قدیم سطح پر گر پڑنے کا اندیشہ دامنگیر رہتا ہے اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں بیشی اجرت سے کارکردگی میں معقول ترقی ہوتی ہے اور مقابلتہً اولاد میں اضافہ بہت کم جس سے اجرت کا اضافہ مستقل اور دیرپا ہونے کی امید کی جاسکتی ہے؛

ترقیِ کارگزاری اور اضافۂ تعدادِ مزدوراں کا جو اجرت پر اثر پڑتا ہے اُسکی مزید توضیح خالی از منفعت نہ ہوگی ارزانیِ محنت کی بحث میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ ادنیٰ کارگزاری والے مزدوروں کی بڑی جماعت سے کام لینے کے مقابلے میں اعلیٰ کارگزاری والے مزدوروں کے مختصر گروہ سے کام لینا آجر کے حق میں زیادہ مفید ہے۔ اگرچہ بحالتِ دوم اجرتِ مختص بالعمل کی شرح اعلیٰ تر بھی ہو گویا اعلیٰ کارگزاری والے مزدور کو ادنےٰ کے مقابلے میں اجرتِ مختص بالعمل نسبتہً زیادہ ملنی بھی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں فرض کرو کہ دس مزدوروں کی جماعت میں گیارھویں کا اضافہ ہو۔ ظاہر ہے کہ محنتِ مختتم مقدارِ پیداوار گھٹ کر شرحِ اجرت میں تخفیف ضرور کردیگی۔ چنانچہ قوانینِ اجرت کی بحث میں پیداآوریِ مختتم کے عنوان سے یہ مسئلہ بخوبی واضح کیا جاچکا ہے۔ فرض کرو کہ اجرت میں بقدر ۱/۳۰ کمی ہو۔ اب اگر ان ہی دس مزدوروں کی کارگزاری بڑھ کر ان کو گیارہ مزدوروں کے کام کرنے کے قابل بنادے تو باوجود مذکورۂ بالا کمی شرح اُن کی اجرت میں تخمیناً ۱/۱۵ اضافہ ہوگا کیونکہ اب ان میں سے ہر ایک بمقابلۂ سابق اجرت کے ۱۱/۱۰ × ۲۹/۳۰ یعنی (۳۱۹/۳۰۰) حاصل کرسکیگا پس ثابت ہوا کہ ترقیِ کارگزاری آجر اور مزدور بالفاظِ دیگر کُل مُلک کے حق میں

بحد مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرح اُجرت کے متعلق جو آجر اور مزدوروں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہے تو غیر جانبدار عوام اور نیز گورنمنٹ اکثر مزدوروں کی ہمدرد اور طرفدار پائی جاتی ہے۔

باب دوازدہم

ترقیاتِ مزدوراں

(۱) انجمن اتحادِ مزدوراں (۲) بیمہ فنڈ (۳) حفظانِ صحت

(۴) تخفیفِ اوقات (۵) اضافۂ اجرت (۶) اسٹرائک یا ہڑتال (۷) شرکتِ منافع

انجمنِ اتحادِ مزدوراں

یورپ اور امریکا میں اکثر پیشوں کے مزدوروں نے باقاعدہ اپنی اپنی اتحادی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں جن میں ہم پیشہ مزدور جوق جوق مقررہ ماہانہ چندہ دیکر شریک ہوتے ہیں اور اتفاق عمل کے زور سے کل ممبروں کی بہبودی اور ترقی کی ہر مناسب طریق سے کوشش کرتے ہیں۔ ان انجمنوں کی ہر دلعزیزی اہمیت اور تقویت روز بروز بڑھ رہی ہے ہر سمجھدار مزدور ان کی ممبری اپنے حق میں ضروری اور مفید خیال کرنے لگا ہے۔ جرمنی اور انگلستان میں اتحادی مزدوروں کی تعداد ۲۵ اور ۲۴ لاکھ ہے۔ لیکن لحاظِ نسبتِ آبادی ایسے مزدور ڈنمارک اور سویڈن میں سب سے زیادہ ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی انجمنیں بلحاظِ کارگزاری و حسنِ انتظام ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقوں کی انجمنوں سے بدرجہا افضل نظر آتی ہیں۔ ان کی بارآور کوششوں سے ترقی یافتہ قوموں کے افراد کی ارادی قوت اور عملی قابلیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے مہتمم اور نگراں نہایت قابل اور کارگزار لوگ ہوتے ہیں جن میں سے بعض کو

حصۂ سوم
باب دوازدہم

ممبری پارلیمنٹ تک کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اتفاق کی طاقت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے اور جب ایسی طاقت نہایت باخبر معاملہ فہم اور خیر اندیش سرگروہوں کے ہاتھ میں آجائے تو اس سے کیا کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مزدور کسی شمار قطار میں نہ تھے۔ اور ہوتے کیونکر؟ غریب، بے علم، بیشمار اور منتشر، دولتمند اور قابو یافتہ آجروں کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں کم و بیش کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اوّل تو خود اُن کا افلاس، کثرت اور انتشار اُنکی سب سے بڑی کمزوری کا باعث تھے۔ علاوہ ازیں ملکی قانون سازی میں اُن کا برائے نام بھی دخل نہ تھا۔ خود غرض اور کوتہ اندیش آجر حسب دلخواہ اپنے موافق قانون پاس کر کے اپنے اقتدار سے بے بس مزدوروں کے خلاف ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ انگلستان میں ۱۸۲۴ء تک اسٹرائک میں مزدوروں کی کسی جماعت کا اپنے مطالبات پورا کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام چھوڑ دینا قانوناً بڑا جرم تھا اور ۱۸۷۱ء تک مزدوروں کو اتحادی انجمنیں باضابطہ قائم کرنے کا حق حاصل نہ تھا لیکن مزدوروں کے دن پھرنے کا زمانہ آن پہنچا تھا اور اُن کی ترقی اقتضائے وقت تھا۔ معاشی ترقی اور سیاسی آزادی نے مزدوروں کی اہمیت اور ان کے حقوق پر روشنی ڈالی۔ توسیع تعلیم اور اضافۂ اجرت سے خود مزدوروں میں بیداری اور خودداری کا احساس پیدا ہو چلا۔ کچھ روز تو آجروں نے انقلاب کی روک تھام کی۔ لیکن کب تک بالآخر مزدوروں نے کروٹ بدلی اور بتدریج قابو یافتہ آجروں کے تسلط سے آزاد ہونے لگے حتیٰ کہ آج ان اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدور آجروں کے بالمقابل مثل ہم پلہ اپنے فرائض و حقوق بآزادی طے کرتے نظر آتے ہیں۔ جب تک بہت سے غریب مزدور چند دولتمند آجروں سے جدا جدا اپنا معاملہ طے کرتے رہے وہ اپنے حقوق کی نگہداشت سے تقریباً بالکل معذور رہے۔ اور اکثر آجر کی پیش کردہ اجرت قبول کیئے بغیر ان کو کوئی چارہ نہ تھا۔
اس بے بسی کا خاص باعث مندرجہ ذیل حالات تھے:۔

۱۔ آجر تو معدودے چند تھے اور مزدوروں کی ازحد کثرت تھی۔

حصّہ سوم
باب دہم

آجر کم و بیش متفق رہ سکتے تھے لیکن موجودہ زمانے میں برائے نام اتفاق بھی وہم و گمان سے باہر تھا نتیجہ یہ کہ آجر کو مزدور ملنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی بلکہ مزدور کو آجر ملنا دشوار تھا۔ ایسی حالت میں مزدور کو آجر سے اجرت کے متعلق رد و قدح کرنے کی کیا جرأت ہو سکتی تھی:

ب۔ دولتمند آجر تو مزدور نہ ملنے کا انتظار برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن غریب مزدور میں بیکار رہنے کی سکت کہاں۔ اگر مزدور کام نہ کرے تو فاقہ کشی کی نوبت آجاتی۔ ایسے آجر اپنے حسب مرضی اجرت دیتے اور مزدور بجائے بیکار رہنے کے اس کو غنیمت سمجھتے تھے:

ج۔ یہاں مزدور کاروباری حالات سے بالکل ناواقف اور بے خبر تھے۔ آجر اضافہ منافع کی تو ان کو کانوں کان بھی خبر نہ ہونے دیتے تھے لیکن تخفیف کا بار ان کی اجرت پر ڈالنے کے واسطے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے قیام سے مذکورۃ الصدر حالات میں کایا پلٹ ہو گئی:

ا۔ مزدوروں میں باہمی اتفاق و اتحاد پیدا ہو گیا جس کی بدولت حسب دلخواہ شرائط پر مزدور ملنے کا موقع آجر کے ہاتھ سے جاتا رہا:

ب۔ مشترکہ اندوختہ سے فنڈ قائم کیا گیا۔ تاکہ بوقت بیکاری مزدوروں کی مالی امداد کی جائے گویا اب مزدور آجر پر دباؤ ڈالنے کے لئے بلا خوف فاقہ کشی ترک کار کر سکتے ہیں:

ج۔ انجمنوں کے تعلیم یافتہ اور باخبر نمائندے مقرر رکھ کر کاروباری حالات پیش نظر رکھتے ہوئے مزدوروں کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے ہیں:

جن جن طریق سے اتحادی انجمنیں مزدور کی بہبودی کے واسطے کوشش کر رہی ہیں ان کی ہم ذیل میں تفصیل کرتے ہیں:

۲۔ اوّل تو اکثر مزدوروں کی وہی مثل ہوتی ہے کہ روز کنواں کھودنا روز پانی پینا۔ اگر کہیں کام مل گیا تو روزی ورنہ روزہ۔ ان غریبوں کے پاس اندوختہ کہاں جو آڑے وقت کام آئے اور جو اجرت کچھ زیادہ بھی ہوئی تو یہ پس انداز کرنا کم جانتے ہیں۔ "ہر چہ داری بخور امروز غم فردا مخور" ان کا اصولِ زندگی نظر آتا ہے۔ چنانچہ امریکا میں بھی جہاں مقدار اجرت سب ملکوں سے زیادہ ہے مزدور اکثر خالی جیب رہتا ہے۔ دن بھر میں جو کچھ کماتا ہے شام تک اڑا دیتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بیش خرچی مفید ہے کہ مزدور چیونٹی کے مانند کام سے لگا رہتا ہے لیکن بحالتِ اندوختہ بیکاری کا شوق پیدا ہونا ممکن ہے بحالتِ حوادثِ زندگی اور ناموافقت زمانہ ایسے مزدوروں کی حالت نہایت ابتر اور قابلِ رحم ہو جاتی یقینی ہے۔ لہذا انجمنوں نے یہ طریق نکالا کہ ہر ممبر مزدور سے ماہانہ چندہ لے کر ایک مشترکہ فنڈ جاری کر دیا جس سے ہر ممبر کو جائز مشکلات میں بشرحِ معین مالی امداد دی جاتی ہے گویا مزدور کو اندوختے کے کل فوائد بھی بدرجۂ اولیٰ حاصل ہو گئے اور شوقِ بیکاری کا اندیشہ بھی رفع ہو گیا۔ انجمن گویا مزدوروں کے اندوختے کی امین ہے اور فنڈ ان کا مشترکہ سرمایہ جس کو جس قدر ضرورت پیش آئے بپابندیِ قواعد فنڈ سے لے سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انگلستان کی سو سربرآوردہ اتحادی انجمنوں نے جن کی سالانہ آمدنی ۳۱۲۵۰۰۰ روپے تھی اپنے ممبروں کی حسبِ ذیل مالی امداد کی:۔

ا۔ خرچ کفن دفن	۱۵۶۲۵۰۰
ب۔ وظیفۂ پیری	۳۱۲۵۰۰۰
ج۔ وظیفۂ علالت	۳،۲۵۰۰۰
س۔ تلافیِ حوادث مثلاً آتش زدگی فتورِ اعضاء	۲۱۸۷۵۰۰
د۔ وظیفۂ بیکاریِ غیر اختیاری	۵۰۰۰۰۰۰
میزان	۱۵۰۰۰۰۰۰

۳۔ تجارتی اور صنعتی مرکزوں کی آب و ہوا اوّل تو یونہی بوجہ گنجانی آبادی و بلندی عمارات خراب ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کارخانوں میں مزدوروں کا بے حد اژدحام ہوتا ہے۔ انجنوں سے بھاپ اور دھواں نکلتا ہے۔ بعض پیداوار خام مثلاً روئی سن کے

بیشمار باریک ریشے ہوا میں بکثرت مل جاتے ہیں۔ چمڑے اور کاغذ کے کارخانوں میں بعض کام خاص طور پر غلیظ ہوتے ہیں۔ لوہے اور شیشے کے کارخانوں میں جلنے کا خوف بہت دامنگیر رہتا ہے۔ حدبندی نہ ہونے کی حالت میں کلوں میں پھنس کر جان ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کارخانے کے اندر یا اسکے محاذات میں کوڑے کچرے سے آب و ہوا خراب ہونے کا خطرہ ہوسکتا ہے کان کنی میں تحفظِ جان اور صحت کے واسطے اور بھی زیادہ اہتمام اور خاص احتیاط درکار ہے ایسی حالت میں مزدوروں کی صحت پر جتنی توجہ صرف کی جائے کم ہے چنانچہ اوّل تو خود گورنمنٹ نے فیکٹری ایکٹ کے ذریعے سے کارخانوں پر بہت کچھ اپنی نگرانی قائم کردی ہے۔ دوسرے اتحادی انجمنیں بھی برابر دیکھ بھال رکھتی ہیں اور جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت نظر آتی ہے خواہ گورنمنٹ کو توجہ دلاکر یا اپنے اصرار و اسٹرائک سے آجر کو اسے پورا کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں؛

تخفیفِ اوقات

۴۔ کار برائے زیستن است۔ نہ کہ زیستن برائے کار محنت میں افراط و تفریط دونوں یکساں مضر اور قابلِ احتراز ہیں۔ آدمی کو محنت ایسے اعتدال پر قائم رکھنی چاہئے کہ اس کو کل جائز ضروریات حاصل ہوسکیں نہ تنگدستی میں گرفتار ہو اور نہ دولت کمانے کی کل بن جائے۔ ان دونوں حالتوں میں زندگی کا مقصد فوت ہوجاتا ہے پیشے کے علاوہ راحت آسائش سیر و تفریح کے کتنے مسرت بخش صحبت اور دوست و احباب کی ملاقات کا لطف، ملکی اور قومی معاملاتِ ضروری کی شرکت۔ اس قسم کے اور کام بھی حسبِ حال مزدور کی توجہ کے طالب ہیں۔ علاوہ ازیں خود قدرت نے مقدارِ محنت پر حد لگادی ہے۔ کچھ دیر کام کرنے کے بعد آدمی تھکنے لگتا ہے حتّٰی کہ تکان اس کو بالکل معذور کرکے آرام لینے پر مجبور کردیتی ہے۔ اگر مزدور کچھ عرصے تک ہدایتِ قدرت کی خلاف ورزی کرے تو صحت کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ اس کی کارکردگی میں بھی تخفیف ہوجانی یقینی ہے۔ گنوار و مثل ہے رات بھر پیسا اور چپنی میں اُٹھانا۔ جو لوگ جس قدر حد سے زیادہ محنت کرتے ہیں اسی قدر ان کی محنت کے نتائج بمقدار کمتر پیدا ہوتے ہیں چنانچہ واقعہ ہے کہ بعض طالب علموں کے فیل ہوجانے کی وجہ زیادہ مطالعہ ہوتا ہے جو

دماغ کو کند بلکہ معطل کر دیتا ہے۔ اور جب ازدیادِ محنت صحت و کارگزاری کے حق میں مضر ثابت ہوئی تو اس سے اجرت میں تخفیف ہونی بھی ظاہر ہے گویا کثرت سے خود محنت کی غرض و غایت فوت ہو جاتی ہے۔

لہٰذا اول تو فرصت فی نفسہ بہت ضروری اور مفید ہے۔ اگر تخفیفِ اوقات سے اجرت میں ناقابلِ برداشت کمی نہ ہو تو اس کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس کا کارگزاری پر جو مفید اثر پڑیگا وہ ایک حد تک شرحِ اجرت کو گھٹنے سے روکیگا۔ اور تخفیفِ اوقات سے اجرت میں اتنی کمی نہ ہوگی جتنا کہ اندیشہ ہے۔ اور اگر سطحِ کارگزاری بہت اعلیٰ ہو اور نہایت مکمل کلوں کا استعمال وسیع پیمانے پر جاری ہو تو باوجود تخفیفِ اوقات دوسرے مزدوروں سے زیادہ اجرت حاصل کرنی ممکن ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکا اور انگلستان میں اوقاتِ کار سب سے کم ہیں لیکن بوجوہاتِ بالا یہاں کے مزدور کو تقریباً سب سے زیادہ اجرت ملتی ہے اور ملک کی پیداوار بھی دوسرے ملکوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

بحثِ بالا سے واضح ہوا کہ تخفیفِ اوقات کی گنجائش اور اس کا اجرت پر اثر چند دیگر حالات پر منحصر ہے جن کو مختصراً معاشی ترقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تلوں ہی میں سے تیل نکلتا ہے۔ آجر اپنی گرہ سے تو مزدور کو اجرت دینے سے رہا۔ نقصان اٹھا کر وہ چند روز بھی کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا تخفیفِ اوقات کیساتھ سابق اجرت کا بھی مطالبہ کرنا ہر حال میں بجا نہ ہوگا۔ اگر ترقیِ کارگزاری کی بدولت محنت کی سابق پیداوار بحال رہے تو آجر کو سابق اجرت دینے میں غالباً کوئی عذر نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیئے اور اگر پیداوار میں کمی آگئی تو آجر اجرت میں تخفیف کرنے پر مجبور ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ اگر آجر کی مقدارِ منافع غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو آخری صورت میں بھی سابق اجرت ملنی ممکن ہے۔ گویا آجر اپنے منافع کا ایک حصہ مزدوروں کو بانٹ دینا بمقابلہ ان کو جدا کرنے کے گوارا کریگا اور گو مقدارِ اجرت وہی برقرار رہے لیکن تخفیفِ اوقات کی بدولت شرحِ اجرت میں اضافہ ہو جائیگا۔ تخفیفِ اوقات کا ایک منشا بیکار مزدوروں کو کام سے لگانا بھی قرار دیا جاتا ہے گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ پیداوارِ محنت میں کمی آجائیگی۔ پس اگر سوائے چند قابلِ استثنا حالتوں کے

مقدارِ اجرت بھی کچھ کم ہو جائے تو کیا عجب ہے۔ لیکن باوجود تقلیل مقدار شرحِ اجرت وہی برقرار رہیگی۔ ماحصل کلام یہ کہ چند در چند معقول وجوہات سے اکثر تخفیف اوقات ضروری اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ شرحِ اجرت میں تخفیف ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ البتہ اگر مقدارِ اجرت حسبِ سابق برقرار رہے تو کیا کہنا ورنہ قابلِ برداشت کمی کا بھی مضائقہ نہیں۔

اوقاتِ کار کا تعین آجر اور مزدور کی باہمی رضامندی پر نہیں چھوڑا جا سکتا آجر کا تو اسی میں فائدہ ہے کہ مزدور جہاں تک ممکن ہو زیادہ دیر تک کام کرے کیونکہ جس قدر زیادہ مال تیار ہوگا عمارت اور کل جیسے اصل مستقر پر زیادہ سود حاصل ہوگا۔ رہا مزدور سو اول تو وہ اتنا مآل اندیش نہیں کہ اجرت کے لالچ پر غالب آسکے۔ دوسرے اس کا بس کیا چل سکتا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے کی شرط یہ ہے کہ مزدور ٹھیک وقت پر سیٹی سنتے ہی آئے اور سیٹی سن کر جائے۔ ہر ایک کا کام باقی بیشمار مزدوروں کے کام سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہ تنہا حسبِ مرضی کام شروع اور ترک نہیں کرسکتا۔ ایسی حالت میں اوقات کا از حد طویل ہونا کیا تعجب ہے۔ چنانچہ اس معاملے کی اہمیت دیکھ کر اول تو خود گورنمنٹ نے بذریعۂ قانون اوقات کی انتہا معین کردی۔ علاوہ ازیں اتحادی انجمنیں بھی حسبِ ضرورت تخفیف کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں ہندوستان میں اوقاتِ کار ۱۲ گھنٹے انگلستان میں ۹ گھنٹے اور امریکا میں صرف ۸ گھنٹے ہیں۔ آٹھ گھنٹے محنت ۸ گھنٹے خواب اور ۸ گھنٹے فرصت بہترین تقسیم اوقات قرار دی جاتی ہے۔ واضح ہو کہ بیش بہا اصل مستقر کی بیکاری سے آجروں کو نقصان پہنچنے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں اب وہ بجائے مزدوروں کے ایک گروہ کے دوسرے یکے بعد دیگرے کام لے کر بمقابلۂ سابق اور بھی زیادہ دیر تک روزانہ کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں اور اضافۂ پیداوار کے ذریعے سے اصل مستقر بشرح اعلیٰ سود حاصل کرسکتے ہیں۔

اضافۂ اجرت

(۵)۔ کامیاب اور سرسبز کارخانوں کے مزدور یہ دیکھ کر کہ آجر بہت زیادہ منافع پا رہا ہے اور ان کی اجرت نسبتہً کم ہے۔ اسٹرائک کی دھمکی اور دباؤ سے اضافۂ اجرت کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ اب اگر آجر کے کارخانے میں کوئی اشد ضروری کام ہو رہا ہو

جس کو وہ ترک یا ملتوی نہ کر سکے اور بوجہ غلبۂ انجمن اتحاد یا تخصیص طلبی محنت جدید مزدور میسر نہ آسکیں تو وہ بے بس اور ناچار ہو کر اضافۂ اجرت بشرطیکہ اس کے حق میں سراسر تباہ کن اور ناقابل برداشت نہ ہو گوارا کر لے گا لیکن مزدوروں کی فوری کامیابی کچھ بڑی بات نہیں۔ تحقیق طلب بات تو یہ ہے کہ ایسے اضافے کے بعید اور دیرپا نتائج کیا ہوں گے وہ حسب حال تین ہو سکتے ہیں۔ اوّل اگر آجر درحقیقت معمول سے زیادہ منافع پا رہا تھا۔ اگرچہ آجکل آزاد مقابلے کے زمانے میں ایسا ہونا نہایت نادر ہے موجودہ حالات میں ممکن ہے جن کی اجارے کے عنوان سے ہم آئندہ تشریح کریں گے۔ تو وہ کاروبار بند کرنے پر منافع کا ایک حصہ بشکل اضافۂ اجرت مزدوروں کو بانٹ دینا گوارا کریگا اضافۂ اجرت کی یہ سب سے زیادہ قابل اطمینان صورت ہے۔ لیکن اتنی ہی نایاب بھی ہے۔ آجکل تمام آجر ہر طرف نظر دوڑاتے رہتے ہیں۔ اور اگر کسی کو معمول سے زیادہ منافع ملتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اس میں حصہ بٹانے کی فکر کرتے ہیں۔ اور بالآخر مقابلے کے اثر سے آخر الذکر آجر کا منافع بھی معمولی سطح پر اتر آتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آجر معمولی منافع پا رہا ہے تو اضافۂ اجرت کا کیا حشر ہوگا۔ اوّل آجر اپنی چیزوں کی قیمت بڑھانے کی کوشش کریگا تاکہ اضافۂ قیمت سے اضافۂ اجرت کی تلافی ہو سکے لیکن ایسا ہونا بھی خاص حالتوں میں ممکن ہے جن کی بعنوان طلب بالواسطہ ہم آئندہ تفصیل کریں گے۔ فرض کرو کہ قیمت بڑھ جائے تو گویا اضافۂ اجرت چیزوں کے خریداروں کی جیب سے ادا ہوگا۔ لیکن اگر نہ آجر کا منافع غیر معمولی طور پر اعلیٰ ہو نہ اضافۂ قیمت ممکن تو آجر موجودہ کام جس طرح سے بھی ہو ختم کرا کے اور غالباً آئندہ جلد سے جلد کارخانہ بند کر کے کوئی اور کاروبار جاری کر دیگا چونکہ بیش مقدار اصل مستقر کلوں اور عمارتیں پھنسا ہوا ہے ممکن ہے کہ موجودہ کاروبار بند کرنے میں اس کو کچھ دقت پڑے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہی نامساعد رہے تو جلد سے جلد بند ضرور کر دیگا۔ اور اگر موجودہ کلوں میں تھوڑی تبدیلی کرنے سے دوسرا کام لیا جانا ممکن ہوا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو موجودہ کام ترک کرنے میں اس کو اور بھی کم دیر لگے گی۔

علاوہ ازیں اور لوگ جو یہی کام جاری کرنیکا قصد کر رہے تھے حالات دیکھکر اپنی رائے بدل دیں گے اور کوئی دوسرا کام شروع کر دینگے - اس طرح پر بتدریج کار و بار زیر بحث گھٹتا چلا جائیگا اور اس چند روزہ اضافۂ اجرت کا نتیجہ مزدوروں کی تباہی ہوگی - اگر کاروبار کی تباہی سے قبل مزدور رنگ بدلتا دیکھکر اضافے کا مطالبہ ترک بھی کردیں تو تو بھی آجروں کے دل میں جو اندیشہ اور وحشت پیدا ہو چکی ہوگی وہ بدقت اور بدیر رفع ہوگی اور مزدوروں کو کار و بار کے زوال سے کم و بیش نقصان ضرور اٹھانا پڑیگا ؛

بحثِ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی طرف سے اضافۂ اجرت کا مطالبہ اکثر بیجا اور ناکامیاب ہوتا ہے اور اس سے خود انکو بمقابلۂ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ بحث بالا میں صرف کسی ایک خاص شعبۂ صنعت و حرفت میں اضافۂ اجرت فرض کیا گیا ہے اور ایسی حالت میں اضافۂ اجرت کے بیشک وہی نتائج ہوں گے جو بیان کیے گئے - لیکن جیسا کہ رواج بڑھ رہا ہے اگر ہر پیشہ و حرفہ والے اضافے کا مطالبہ شروع کر دیں تو قوانینِ اجرت کے تحت میں مذکور الصدر رسید اور مختتم کی بحث اور آئندہ منافعِ خالص کی تشریح سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ ابھی تک منافعِ خالص ہی میں سے کم و بیش اجرت کا اضافہ ممکن بھی ہے اور قرینِ انصاف و مصلحت بھی نیز واضح ہو کہ معمولِ شرح اور مقدارِ شرح دو جداگانہ چیزیں ہیں معمول سے مراد شرح کی مساوات ہے - اور مقدار سے مراد شرح کی زیادتی و کمی - پس جبکہ ہر صنعت و حرفت میں اضافۂ اجرت کا یکساں مطالبہ ہوگا تو بحالت مقابلہ شرحِ منافع اب بھی معمولی رہیگی - صرف مقدار میں ہموار تخفیف ہو جاویگی اور منافع میں ایک حد تک ابھی ایسی تخفیف کی گنجائش ضرور موجود ہے مختصر یہ کہ اگر مزدور آجر کے منافع میں سے کچھ حصہ مانگیں تو بحالتِ موجودہ بیجا نہیں اور اگر مطالبے میں سب متفق ہو سکیں تو کامیابی زیادہ دشوار نہیں - چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ جب سے بشکلِ اسٹرائک مطالبۂ اضافہ کا رواج پھیلا شرحِ اجرت

بتدریج بڑھ رہی ہے۔ اسٹرائک کا مسئلہ فی نفسہ اس قدر توجہ طلب ہے کہ ہم اس سے ذیل میں جداگانہ بحث کرتے ہیں:

(۶)۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ہڑتال سے مُراد مزدوروں کی کسی جماعت کا آجر پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات پورے کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام ترک کرنا ہے۔ جب سے اتحادی انجمنوں نے مزدوروں کا اتفاق وسیع اور مستحکم کر دیا ہے ہڑتال کا اثر بھی بڑھ گیا ہے جب کسی کارخانے کے مزدور کام چھوڑ بیٹھیں تو اُن کے جانشین ملنے بہت دشوار ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو مزدور اتحادی انجمن کے ممبر بھی نہ ہوں وہ بھی اپنے ہم پیشوں کے اخلاقی دباؤ اور ناراضی کے خوف سے ایسے کارخانے میں کام کرنے کی جرأت کم کرتے ہیں۔ اور اگر ایسے موقع پر فائدہ اُٹھاتے ہیں تو بعد کو جلد ہی باقی ہم پیشہ اُن کی حالت طرح طرح سے ناقابلِ برداشت حد تک ناخوشگوار بنا کر آئندہ کے واسطے عبرت دلا دیتے ہیں۔ مزدور موقع دیکھ کر اکثر ایسے وقت پر ہڑتال کرتے ہیں کہ آجر کا بہت زیادہ نقصان ہو تاکہ دباؤ خوب پڑے اور آجر کو مزدوروں کے مطالبات پورے کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ ہو۔

لیکن واضح ہو کہ کاروباری دنیا میں اسٹرائک کی حالت بعینہٖ اس پتھر کی سی ہے جو تالاب میں کہیں گر کر پانی کی کُل سطح پر قطار در قطار لہریں پھیلا دے۔ یوں تو تمام پیشے کم و بیش ایک دوسرے سے متعلق ہیں لیکن بعض کا بالخصوص دوسروں سے نہایت قریبی تعلق پایا جاتا ہے مثلاً کوئلہ یا مٹی کا تیل نکالنے والے۔ یا ریلوے اور جہازوں پر کام کرنے والے اگر ہڑتال کر دیں تو ناممکن ہے کہ کوئی کاروبار اور کوئی پیشہ کم و بیش اس سے متاثر نہ ہو۔ ایسے اسٹرائک سے علاوہ آجر کے عوام کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے نقصان اور تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن بعض نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود مزدوروں کو ہڑتال سے جس قدر مالی نقصان پہنچتا ہے بحالت اضافۂ اجرت بھی اس کی تلافی ہونی دشوار ہے۔ اور مزید نفع کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس واقعے کی یوں تشریح کی جاتی ہے گو ایسا کم ممکن ہے لیکن فرض کرو کہ مزدور برابر کام سے

حصّہ سوم
باب دوازدہم

لگا رہتا ہے اور اس کے کام کا اوسط ۵۰ ہفتے فی سال ہے گویا ایک ہفتہ
سال کے ۱/۵۰ یا ۲ ہفتے کے برابر ہے اور علیٰ ہذا ایک ہفتے کی اجرت بھی
کُل سالانہ مقدارِ اجرت کی ۲ فی صدی ہے۔ اب اگر چار فی صدی اضافۂ اجرت کی
ہڑتال دو ہفتے جاری رہے تو صاف ظاہر ہے کہ ہڑتال کے دوران میں
مزدوروں کا بقدر ۴ فی صدی سالانہ اجرت نقصان ہو چکیگا اور ۴ فی صدی
زیادہ جدید شرحِ اجرت سے بھی کہیں سال بھر میں اس نقصان کی تلافی ہو سکیگی
اسی طرح پر اگر ۸ فی صدی اضافۂ اجرت کی ہڑتال ایک ماہ جاری رہے تو
ایک سال تک مزدوروں کو اضافے سے کوئی نفع حاصل نہ ہو سکیگا اور اغلب
یہ ہے کہ مزدوروں کی کثرت اور مقابلے کی بدولت شرحِ اجرت جلد گر کر سابق سطح پر
آرہیگی اور اضافہ بطور دفع الوقتی چند روزہ ثابت ہوگا۔ گو ہڑتال حسبِ دلخواہ کامیاب ہو جائے
تب بھی مزدوروں کو بمقابلہ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ قوی ہے۔ اور اگر ہڑتال کی کثیر الوقوع
ناکامیابیاں اور کاروبار کے دوسرے شعبوں کا نقصان بھی پیشِ نظر
رکھا جائے تو بحیثیتِ مجموعی مزدوروں اور عوام کو اسٹرائک سے سوائے
مالی نقصان کے کچھ نفع حاصل نہیں ہوتا۔ واضح ہو کہ اس بحث میں بھی یہ فرض
کیا گیا ہے کہ مزدوروں کی ایک مختصر سی جماعت کسی خاص شعبے میں ہڑتال
کرتی ہے ایسی حالت میں تو بیشک اضافہ محض چند روزہ ہوگا۔ لیکن جبکہ
ہر شعبے کے مزدور اضافے کا مطالبہ کریں تو شرحِ اجرت کا سابق سطح تک
دوبارہ اُترنا دشوار ہوگا اور اضافۂ اجرت ضرور دیرپا بلکہ مستقل ہوگا۔ اور چونکہ عام بیداری
اور اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدوروں کے تقریباً کُل طبقوں میں مطالبۂ اضافہ
کا خیال پیدا ہو رہا ہے، نتیجۂ آخر الذکر زیادہ قرینِ وقوع ہے۔

گو اکثر حالتوں میں آجروں کے موجودہ منافع میں تخفیف کر کے اور بعض
صورتوں میں قیمتِ مصنوعات زیادہ کر کے اجرت بڑھانے کی گنجائش معلوم
ہوتی ہے لیکن اس کی بھی ایک حد ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ مزدور ہڑتال کر کے
حسبِ دلخواہ اضافہ کراتے رہیں اگر مطالبات حدِ مناسب سے تجاوز کریں تو
نتیجہ یقیناً کاروبار کی تباہی اور آجر اور مزدوروں کی بربادی ہوگا۔ اگر مزدوروں سے

حصۂ سوم
باب دوازدہم

کبھی ایسی غلطی سرزد ہوگی تو تجربہ جلد اس کی اصلاح اور آئندہ کے واسطے تنبیہ کردیگا۔ رہا نقصان و تکلیف جو عوام کو ہڑتال سے پہنچتی ہے اس کے بیجا ہونے میں کلام نہیں لیکن آجر اور مزدوروں میں جو فریق برسرِ حق ہے وہ بری الذمہ ہے اور اس کا الزام فریق ثانی کے سر رہنا چاہئیے جو گویا ہڑتال کا اصلی باعث ہے۔ گو بعض کا خیال اس کے برعکس ہے۔ لیکن انسانی فطرت قدیم تجربے اور نیز موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ ہڑتال کے دباؤ بغیر بھی آجر بخوشی اجرت میں اتنا اضافہ گوارا کرتے جتنا کہ مزدوروں نے لڑ جھگڑ کے کرالیا ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ شرح اجرت معاشی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن مزدوروں کی کثرت۔ تہیدستی۔ کم علمی۔ قدیم رسم و رواج۔ آجر کا اقتدار اس قسم کے مخالف حالات، انکے آزادانہ عملدرآمد میں مانع ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اور پسماندہ ممالک میں اب تک یہی رو رعایت اور مروت کا رواج پایا جاتا ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جائز سے جائز حقوق کے واسطے پُرزور مطالبہ شرط ہے حتی کہ اکثر مطالبے کی قوت اور کمزوری کے مطابق حق کا جواز و عدم جواز قرار پاتا ہے۔ پھر بھی اکثر ہڑتال عوام کے حق میں بے حد نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور جبتک حصول مطالبات کی دوسری کل تدابیر ناکام ثابت نہ ہوچکیں۔ مزدوروں کو یہ خوفناک آلہ استعمال نہ کرنا چاہئیے۔ مزدوروں کا اعتدال اور آجروں کی فراخدلی ہڑتال کو بہت کچھ روک سکتے ہیں۔ اگر اجرت میں اضافہ کرانا منظور ہو تو بجائے ہڑتال کے یہ معاملہ مزدوروں کے نمائندوں اور آجر کے روبرو پیش ہوکر باہمی پنچایت کے تصفیے سے طے ہونا ہزار درجے بہتر ہوگا۔ اور اب بھی یہی طریق رواج پا رہا ہے؛

شرکت منافع

(۷) بلحاظ طریق موجودہ آجر اور مزدوروں کے مفاد میں مخالفت نظر آتی ہے منافع اور اجرت سے کسی ایک کی بیشی دوسرے کی کمی کا باعث معلوم ہوتی ہے لیکن آپس کے سب شبہات اور جھگڑے مٹ جائیں اگر جس طرح اجرت کی شرح معین ہے آجر بھی اپنے منافع کی مناسب شرح مقرر کرلیں اور

اجرت و منافع متعا کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے تو آجر و مزدور اس کو آپس میں بانٹ لیں پھر مزدور کو آجر سے کوئی شکایت بھی نہ رہے - کاروبار کی کامیابی کے واسطے مزدور دل لگا کر کوشش کریں اور آجر و مزدور کو باہم نفع پہنچے چنانچہ بعض معاملہ فہم اور روشن خیال کارخانے شرکتِ منافع کا طریق جاری کر کے نمایاں کامیابی اور سرسبزی حاصل کر رہے ہیں اور امید ہے کہ شرکتِ منافع کے رواج سے اسٹرائک کا وبال دفع ہو جائیگا اور کاروبار زیادہ ترقی کریگا اور مزدور بھی زیادہ خوشحال ہو جائیں گے - اعتراض کیا جاتا ہے کہ شرکتِ نقصان بھی شرکتِ منافع کا لازمی جزو ہونا چاہئے اور اگر منافع کی شرحِ معین میں کمی ہو تو وہ کمی نہ صرف آجر بلکہ مزدوروں کو بھی حصہ رسد برداشت کرنی چاہئے ورنہ مزدوروں کی وہی مثل ہوگی کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو لیکن مزدوروں کو تو اجرت منافع حاصل ہونے سے قبل ہی مل چکتی ہے پھر شرکتِ نقصان کیونکر ممکن ہے - واضح ہو کہ اول تو منافع میں سال بسال بڑے بڑے تغیرات نہیں ہوتے - دوسرے صاف ظاہر ہے کہ اگر منافع میں مستقل کمی پیدا ہو جاتے تو اجرت پر بھی ضرور ناموافق اثر پڑیگا - اور نقصان کا بار مزدوروں کو بھی خواہ مخواہ برداشت کرنا ہوگا ؏

ترقیاتِ مزدوران کی ایک خاص صورت آئندہ بعنوانِ امدادِ باہمی جداگانہ باب میں مذکور ہے ؏

بابِ سیزدہم

سود

(۱) اصل کا مفہوم (۲) شغلِ اصل (۳) مسائلِ سود (۴) توقع پسندی (۵) پیدآوری (۶) شرحِ سود (۷) اقسامِ سود (۸) زر و سود کا تعلق (۹) سود کا حاضر و مستقبل۔

اصل کا مفہوم — ۱۔ پیدائش اصل کے تاریخی حال۔ افزونی اصل کے اسباب اور فرقِ دولت و اصل کی بحث میں اصل کا سیدھا سادھا مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی مفہوم کی ہم یہاں مزید تشریح کرنا چاہتے ہیں:

اصل کے معنوں کا اختلاف اُس کے استعمال کی تاریخ میں مضمر ہے۔ اوّل اوّل اصل سے مراد وہ رقم تھی جو سود پر قرض دی جاتی تھی چونکہ مذہب عیسوی کے مطابق بھی سود پر روپیہ چلانا حرام اور قانوناً ممنوع تھا طرح طرح پر لین دین کی ظاہری شکل بدلنے کی کوشش کی گئی تاکہ مذہبی گرفت اور قانونی سزا سے امان ملے۔ مثلاً براہِ راست قرض دینے کے بجائے یہ طویل طریقہ ایجاد کیا گیا کہ کوئی چیز قرضخواہ کے ساتھ اُدھار فروخت کی اور بعدہٗ پہلے سے مقررہ کی ہوئی کم قیمت پر اس سے واپس خرید لی۔ گویا قرض بشکلِ قیمت نقد دے کر اصل مع سود بشکلِ قیمت اُدھار وصول کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں جو چیزیں عاریتہً دی جاتی تھیں اُن کی ٹوٹ پھوٹ اور فرسودگی کے بہانے سے کچھ زیدہ تاوان لیا جانا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اصل کے معنی میں بھی توسیع شروع ہوئی اور زرِ نقد کے علاوہ دیگر اشیا و سامان بھی اصل میں شمار ہونے لگا۔ اس وقت تک

حصہ سوم باب سیزدہم

اصل کی خصوصیت امتیازی یہی مزید معاوضے کی آوری تھی۔ گویا اصل سے مراد دولت کا وہ حصہ تھا جو مستعار دیا جائے اور جس سے کچھ آمدنی غیر مکتسب بطور سود حاصل ہو۔

واضح ہو کہ اس دور اول میں صرف حاجتمند لوگ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی غرض سے زر نقد یا سامان قرض لیتے تھے۔ کاروباری اغراض سے اصل قرض لینے کا رواج ابھی جاری نہیں ہوا تھا اور نہ کم قیمت اور سیدھے سادھے آلات سے بڑھ کر اصل کو صنعت و حرفت میں کچھ دخل تھا۔

صاف ظاہر ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے کہ زر نقد انڈے بچے نہیں دیتا۔ علی ہذا سرمایہ اشیاء بھی رکھے رکھے خود بخود نہیں بڑھ سکتا۔ البتہ اصل سے اس طور پر کام لینا ممکن ہے کہ مزید دولت پیدا ہو سکے۔ اور اگر اصل سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام نہ لیا جاتا تو کیونکر ممکن تھا کہ ہر ملک میں صدیوں اصل بھی بڑھتا اور سود بھی ادا ہوتا رہتا۔ اگر اصل مثل دولت محض احتیاجات رفع کرنے میں کام آتا تو افزونی کا نوذکر کیا گنج قارون بھی چند روز میں ختم ہو جاتا اور حاجتمند قرضدار وں کو سود ادا کرنا محال تھا۔ چنانچہ اصل پیدائش دولت کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے۔ اور اس کی کارگزاری ہر طرف صنعت و حرفت میں اظہر من الشمس ہے۔ اصل کے پیداآوری کے متعلق ہم اس سے قبل بھی کافی بحث کر چکے ہیں یہاں اس کے اعادے سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اصل کے سابق مفہوم میں کیونکر تغیر ہوا اور اس کے زمانے میں اصل سے دولت کا وہ حصہ مراد لیا گیا کہ جو آئندہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے پس انداز کیا جاوے۔ اور آمدنی غیر مکتسب کے بجائے پیدائش دولت اصل کی خصوصیت امتیازی قرار پائی۔ اور پیداآوری کا خیال اصل کے معنی میں جذب ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فوری احتیاجات رفع کرنے کے بجائے تجارت اور کارخانے چلانے کی غرض سے لوگ زر نقد یا سامان قرض لینے لگے۔ اور جتیں بہا انجنوں اور مشینوں اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی بدولت عمل پیدائش دولت میں اصل نمایاں کام کرنے لگا۔

المختصر اصل کے دو خصائص امتیازی تحقیق ہوئے۔ اوّل وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ قرار پایا دوم پیدایشِ دولت کا ایک ناگزیر عامل تسلیم کیا گیا اور یہ دونوں خصائص اپنی اپنی جگہ اہم اور قابلِ توجہ ہیں۔ چنانچہ پیدائش کی بحث میں اصل کی خصوصیتِ دوم پر بہت زور دیا جاتا ہے اور تقسیمِ دولت کے بیان میں خصوصیتِ اوّل پر بجید توجہ طلب کی جاتی ہے؛

مفہومِ اصل کی بحث میں اور بھی بہت کچھ بال کی کھال نکالی گئی ہے۔ جس کی پیچیدہ تفصیل بخوفِ انتشار و حیرانی نظر انداز کرنا قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے؛

۲۔ پیدائش دولت کے میدان میں اس وقت اصل باقی ہر دو عامل (یعنی زمین و محنت) پر حکمراں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم ایک موقع پر پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عہدِ قدیم میں پیدائشِ دولت کا دار و مدار بیشتر زمین پر تھا۔ ازمنۂ متوسط میں محنت کا دخل بڑھا اور عہد جدید میں اصل کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ معاشی زبان میں موجودہ زمانے کو اصل شاہی یا عہد اصل کہتے ہیں۔ اصل کا عروج بھی تہذیبِ جدید کا ایک لازمہ ہے بعض نے تو اصل کو موجودہ تہذیب کا خونِ زندگی قرار دیا ہے۔ اور اس میں کچھ مبالغہ بھی نہیں کیونکہ قلم اور علم دونوں اسی کے متوسل نظر آتے ہیں۔ اور آجکل ممالک کی پسماندگی و ترقی کا باعث اسی اصل کی قلت و افراط میں مضمر ہے مشینوں اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے بیان سے اصل کی قوتِ پیدآوری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ([illegible]) فزونیٔ اصل کے اسباب بھی واضح ہو چکے ہیں ([illegible]) یہاں ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اس زمانے میں اصل سے کام لینا جس کو اصطلاحاً شغلِ اصل کہتے ہیں۔ کس قدر مروّج اہم اور آسان ہو گیا ہے۔ ایک طرف توعملِ اصل کے واسطے نہایت وسیع میدان نکل آیا۔ دوسری طرف قانونی تسلط اور کار و باری خوش معاملگی کی بدولت اصل کو وہ امن و امان میسر ہے کہ بلا خوف و خطر چار دانگ عالم میں چکر لگا رہا ہے، دنیا کا کونسا آباد حصہ ہے جہاں انگلستان کا تھوڑا بہت اصل

کام نہیں کر رہا ہے یہی اصل تو دنیا کے ہر گوشے سے دولت سمیٹ سمیٹ کر
یورپ اور امریکا لیئے جا رہا ہے۔ وہاں کے اصلدار نہ صرف اپنے ملک
کی صنعت و حرفت بلکہ نہایت دُور دست ممالک کی ریل۔ معدنیات۔ اور
جنگلات جیسے معاشی شعبوں میں بلا پس وپیش اور نہایت دریا دلی سے
اصل لگا لگا کر غیروں کی خداداد نعمتوں سے گھر بیٹھے پورا پورا فائدہ
اٹھا رہے ہیں ان کی زبردست اور ذی اقتدار حکومتیں ان کے بیرونی کاروبار
اور اصل کی پوری حفاظت اور نگہداشت کرتی ہیں اور موجودہ بیدار قومیں
دیگر ممالک میں اپنے معاشی فوائد کی ترقی ملک گیری سے بھی زیادہ اہم اور
قابل توجہ سمجھتی ہیں حتّٰی کہ کچھ عرصے سے ملکی فتوحات کے بجائے معاشی تسلط
کی خواہش جنگ کی محرک ہونے لگی ہے اور بعدہٗ یہی تسلط بلاد دیگر
ملکوں پر قبضہ بھی کرا دیتا ہے۔ آجکل تو آگے کھٹیا پیچھے لٹیا ملک گیری کا
عام اصول بنا رکھا ہے۔ ہندوستان سے لے کر مراکش مصر او فارس
تک معاشی تسلط کا یہی جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے؛

اب ذرا شغل اصل کی آسانیوں کا حال سُنیئے۔ اوّل تو صدہا بنک
ہیں جو اصل کے بیشمار چھوٹے چھوٹے اجزا سے نہایت کثیر مقدار
فراہم کر کے کاروبار میں بڑی بڑی رقمیں لگاتے ہیں۔ یہ بنک گویا ایسے تالاب
ہیں جن میں بیشمار چھوٹے چھوٹے گڑھوں کا پانی فراہم ہو کر کھیت اور باغات
کو سیراب و شاداب کرے۔ ہر شخص کو اتنی مہلت کہاں کہ اپنے اندوختے سے
خود کام لے سکے اور نہ چھوٹی چھوٹی رقموں سے آجکل کام چل سکتا ہے پس
اس سے بہتر کیا ہوگا کہ عدیم الفرصت اور چھوٹے چھوٹے اصلدار اپنا اندوختہ
کسی بنک میں داخل کر کے نہ صرف اس کی حفاظت سے سبکدوش ہوں
بلکہ کچھ سود بھی بطور معاوضہ پائیں اور بنک ایسے بیشمار اندوختوں کی
بڑی بڑی مقدار اپنے اہتمام اور ذمہ داری پر تاجر اور کارخانہ داروں کو
سود پر قرض دیں اور داخل کنندوں کو بشرح کمتر سود لے کر فرق میں سے
مصارف کا بار اور منافع نکالیں اور چونکہ اصولاً اکثر ایسی ضرورتوں کیواسطے

روپیہ قرض دیتے ہیں کہ جن میں اصل کی قوت پیدا آوری سے کام لے کر قرض لینے والا مزید دولت پیدا کر سکے۔ بنک کے قرضداروں پر سود کچھ گراں بھی نہیں گزرتا بلکہ اصل مستعار کے توسّل سے وہ خود بھی منافع اٹھا لیتے ہیں۔ گویا ایک ہی اصل اپنے مالک۔ بنک اور قرض لینے والے تین طبقوں سے گزر کر پیدائش کے میدان میں داخل ہوتا ہے

بنک میں اندوختہ جمع کرنے کے علاوہ شغل اصل کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ یہاں پر چند کاروباری اصطلاحات کی تشریح کرتے ہیں جس سے خود بخود واضح ہو جائیگا کہ کاروبار میں روپیہ لگانے کے آجکل کیا کیا طریق رائج ہیں:

"انجمن سرمایہ مشترک" سے کوئی ایسا کارخانہ یا دُکان مُراد ہے جس کو متعدد لوگوں نے مل کر جاری کیا ہو۔ کاروبار میں سب نے مل کر اپنی اپنی گرہ سے روپیہ لگایا ہو۔ اور بحالت ضرورت اپنی مجموعی ذمہ داری اور ضمانت پر دوسروں سے قرض لے کر کاروبار کو فروغ دیا ہو۔ انجمن کا انتظام وغیرہ تنخواہ دار منیجر اور ملازموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ البتہ شرکا کی ایک کمیٹی عام نگرانی رکھتی ہے۔ قانون نے ایسی انجمنوں میں دو بڑی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ اول تو سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ششماہی یا سالانہ حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کرا کے عام اطلاع کے واسطے کاروبار کی رپورٹ شائع کرانی قانوناً لازم ہے گویا انجمن کے حسابات میں ردوبدل کرنا بہت دشوار ہے۔ مزید براں ایسی انجمنیں محدود بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی مشترک سرمایہ دار محدود انجمن کو خسارہ آ پڑے تو شرکا سے زیادہ سے زیادہ اس قدر رقم وصول کی جا سکتی ہے جس قدر کہ انھوں نے اپنی گرہ سے کاروبار میں لگا رکھی ہے۔ گویا بارِ کفالت صرف اسی رقم تک محدود ہے۔ مطالبے داروں کو اس کے علاوہ شرکا کے دیگر مال و جائداد پر کچھ دعویٰ نہ ہوگا۔ مثلاً کسی محدود انجمن میں دس ہزار روپیہ شرکا کی طرف سے لگا ہوا ہو اور بارہ ہزار روپیہ واجب الادا ہو۔ مطالبے دار زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپیہ جو شرکا نے انجمن میں لگا رکھا ہے وصول

جا سکتے ہیں۔ ان کے مطالبے کا بار کفالت شدہ کمپنی کے دیگر مال و جائداد پر عائد نہیں ہوتا تو وہ بس انہیں کی رقم تک محدود ہے۔ ایسی کاروباری انجمنوں میں شریک ہونے میں لوگوں کو زیادہ پس و پیش نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشترک سرمایہ دار کمپنیاں اور انجمنیں ترقی یافتہ ممالک میں بکثرت جاری ہیں۔ اور بیشتر کاروبار انھیں کے ہاتھوں میں نظر آتا ہے ٭

بونڈ اور ڈبنچر میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ اگر کسی کمپنی کو عوام سے روپیہ قرض لینا مقصود ہو تو وہ بونڈ یا ڈبنچر فروخت کرکے روپیہ فراہم کر لیتی ہے۔ اور بونڈ کے مالکوں کو ایک معین سود ادا کرتی رہتی ہے۔ مثلاً سو سو روپے کے بونڈ جاری ہوں اور فی بونڈ چار روپے سالانہ سود دیا جائے گویا کمپنی نے چار فی صدی سود کے حساب سے قرض لیا اور قرض دہندوں کو بونڈ بطور تمسک دے دیا تاکہ اس کے ذریعے سے وہ سود پاتے رہیں۔ اور جب چاہیں اس کو فروخت کرکے کم و بیش روپیہ نکالیں یا بوقت معینہ کمپنی سے اصلی رقم وصول کریں۔ واضح ہو کہ بونڈ یا تمسک کی حالت بعینہ جائداد کی سی ہے۔ اس سے مستقل آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ بلا تکلف اس کو خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں۔ بونڈ کے سود کی مقدار معین ہوتی ہے۔ مثلاً سو روپے کے بونڈ کا سود فی بونڈ چار روپے سالانہ ہو۔ بازاری شرح سود کے حساب سے عام خرید و فروخت میں اس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہیگی۔ اگر بازاری شرح سود تین فی صدی ہو تو مذکورہ بالا سو روپے والے بونڈ کی قیمت جس سے چار روپے سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے سو نہیں بلکہ ایک سو تیس کے قریب ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر بازاری شرح پانچ فی صدی ہو تو اس کی قیمت گھٹ کر اسی روپے کے قریب آ رہیگی۔ جو قیمت کمپنی کی طرف سے بونڈ پر درج ہو وہ قیمت متعارفہ کہلاتی ہے۔ اور جو قیمت بازار میں وصول ہو اسکو قیمت صحیحہ کہتے ہیں۔ مثلاً بونڈ مذکورہ بالا کی قیمت متعارفہ سو روپے ہے۔ لیکن اس کی قیمت صحیحہ ایک وقت ایک سو تیس روپے کے قریب ہے اور دوسرے وقت

صرف اسّی روپے۔ اور اسی طرح وہ اکثر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

بونڈ کی کئی قسمیں قرار پاتی ہیں انسکرائیٹڈ بونڈ یا رجسٹرڈ بونڈ کو درج شدہ تمسّک یا رجسٹری شدہ تمسّک سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ ان کے مالکوں کے نام کمپنی کے رجسٹروں میں باقاعدہ درج رہتے ہیں۔ اگر ایسا تمسّک گم ہو یا چوری جائے تو کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی مِلک کا ثبوت محفوظ رہتا ہے۔ اس قدر احتیاط برتی جاتی ہے کہ خود مالک یا اس کے مختار کے سوائے کوئی اور سود بھی وصول نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس بیرر بونڈ یا دستگرداں تمسّک یونہیں ہاتھوں ہاتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ کمپنی کے رجسٹروں میں مالکوں کا نام درج نہیں رہتا۔ القبضة دليل الملك کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔ جو کوئی ایسا بونڈ یا تمسّک کمپنی کے ہاں پیش کرے سود وصول کر لے۔ اسی طرح اگر بیرر بونڈ گم ہو یا چوری جائے تو مالک کو ثبوت پیش کرنے میں وقت کا سامنا ہوگا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام خطروں کے ہوتے ہوئے لوگ ایسے بونڈ کیوں خریدتے ہیں۔ اس کی وجہ ذیل میں بیان ہوگی:

کمپنیوں کے اکثر بونڈ میعادی ہوتے ہیں۔ یعنی کمپنی وقت معیّنہ مثلاً دس پندرہ سال کے اندر اندر یا اختتام پر اصلی رقم یعنی متعارفہ کے حساب سے بونڈ واپس لے کر قرض ادا کرنے کا ذمّہ لے لیتی ہے اس اصول پر میونسپلٹیاں بھی سڑکوں کی روشنی اور واٹر ورکس یعنی ذرائع آبرسانی کے واسطے عوام سے قرض لیکر چلاتی ہیں۔ اور کمپنیوں کی طرح ان کو بھی سود ادا کرنے پر کچھ منافع بچ رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی سلطنت قرض لیتی ہے اور سلطنتوں میں قرض ستانی کا رواج بہت بڑھ رہا ہے۔ تو وہ اکثر دائمی بونڈ یا تمسّک فروخت کرتی ہے۔ یعنی بونڈ واپس لینے اور قرضہ ادا کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں کرتی۔ البتہ مالکان تمسّک کو مستقل طور پر سود دیتے رہنے کا پورا ذمّہ کر لیتی ہے۔ جب تک بونڈ اپنے پاس ہو۔ سرکار سے سود ملتا رہیگا۔ اور جب روپیہ نکالنا چاہے بونڈ کسی کے ہاتھ بہ نرخ بازار فروخت کر دے۔ بونڈ کے خریدار ملنے میں دقت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ بازاری شرح سود کے مطابق

پونڈ کی قیمت کم اُٹھے یا زیادہ۔ ایسے سرکاری پونڈ کو پرومیسری نوٹ یا گورنمنٹ اسٹاک یعنی سرکاری تمسک بھی کہتے ہیں۔ اسٹاک کا ایک خاص مفہوم اور بھی ہے جو ابھی بیان ہوگا۔

اگر سلطنت زرِ قرض کو کاروبار میں لگادے۔ نہریں کھدوائے۔ ریلیں نکالے تو سلطنت پر سود کا کوئی بار نہیں پڑتا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی آمدنی میں سود او مصارف منہا کرنے کے بعد اُلٹا منافع بچ رہتا ہے۔ چنانچہ سرکارِ ہند کا بیشتر قرضہ پیدا آور ہے۔ یعنی اس سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی سلطنتوں کا بحالتِ مجبوری غیر پیدا آور کاموں کے واسطے بھی قرض لینا بھی پڑتا ہے۔ مثلاً مصارفِ تاوانِ جنگ یا امدادِ قحط کے واسطے یا بصورتِ قلتِ محاصل معمولی مصارف کے واسطے ایسی سلطنت کی حالت بعینہٖ کسی خستہ حال اور مقروض رئیس کی سی ہوگی۔ غیر پیدا آور قرض اور اُس کا سود محاصل سلطنت پر سراسر بار ہوگا۔ اور ملک کی ترقیات میں جس قدر حارج ہو کم ہے۔

چونکہ اکثر ترقی یافتہ ممالک میں آئینی اور نیابتی حکومتیں قائم ہیں۔ سرکاری قرضہ پبلک لون یا قرضِ عامّہ کہلاتا ہے۔ فنانس یعنی مالیات کی ضخیم کتابوں میں قرضِ عامّہ کی پیچیدہ مگر دلچسپ بحث خاص توجہ اور غور سے مطالعہ کی جاتی ہے۔ جنگِ یورپ کی بدولت قرضِ عامّہ کا جال اس قدر پھیل گیا ہے کہ گھر گھر اس کے اصول و قواعد سمجھنے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ لیکن مفصل بیان کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے۔

جو لوگ اسٹاک یا شیر یعنی حصے خریدتے ہیں وہ کمپنی کو روپیہ قرض نہیں دیتے بلکہ مالکانِ کمپنی کی جماعت میں شریک ہوجاتے ہیں یعنی قرضخواہ کے بجائے وہ کمپنی کے مالک شمار ہوتے ہیں۔ ان کو بشرحِ معین سود نہیں ملتا بلکہ منافع میں سے حصہ ملتا ہے جس کو اصطلاحاً مقسوم کہتے ہیں۔ کاروبار کی اچھی یا بری حالت کے لحاظ سے مقسوم کی شرح بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ مثلاً کسی سال سو سو روپے کے حصوں پر چھ روپے فی حصہ مقسوم ملے اور

حصہ سوم باب نہم

کسی سال ممکن ہے کہ صرف تین روپے فی حصہ ملے۔ اسٹاک اور شیئر میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اول تو اسٹاک بالعموم درج شدہ ہوتا ہے۔ حالانکہ شیئر کا درج شدہ ہونا ضروری نہیں بلکہ اکثر شیئر دست گرداں ہوتے ہیں۔ دوم کمپنی سے اسٹاک خرید تے وقت رقم کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ کوئی چاہے شکستہ رقمیں مثلاً ۹۳ - ۲۱۱ - ۴۳ وغیرہ روپے کمپنی میں داخل کرکے اسی قدر رقم کا اسٹاک خرید لے۔ اس کے برعکس کمپنی سے خرید تے وقت شیئر کی رقم معین اور بالعموم ابتہ ہوتی ہے۔ مثلاً پچاس یا سو روپے۔ پانسو یا ہزار روپے کا ایک حصہ۔ حصے بھی مذکورۂ بالا تمسکوں کے مانند خرید و فروخت ہوتے ہیں۔ حصوں کی مقدار مقسوم تمسکوں کی مقدار سود کی طرح معین تو ہوتی نہیں کمپنی کی موجودہ کاروباری حالت اور دو ایک گزشتہ سالوں کے مقسوم سے حصوں کی آمدنی کا اندازہ کرلیا جاتا ہے مثلاً کسی کمپنی نے سو روپے کے شیئر پر سال گزشتہ چھ روپے مقسوم نکالا۔ اور اس کا کاروبار اب بھی سرسبز ہے۔ اگر موجودہ بازاری شرح سود چار فی صدی ہو تو اس کمپنی کا سو روپے والا شیئر آجکل ایک سو پچاس روپے کے قریب فروخت ہوگا۔ شکستہ رقموں کے حساب کرنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہے۔ مثلاً مذکورۂ بالا کمپنی کا ایک اسٹاک ہے جسکی اصلی رقم ۳۷۵ روپے ہے۔ گویا کسی نے کمپنی میں یہ شکستہ رقم داخل کرکے ایک اسٹاک لے لیا اب اگر کمپنی سو روپے کے شیئر پر چھ روپے سالانہ مقسوم نکالتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر اسٹاک پر بشرح ۵ فی صدی مقسوم دیتی ہے۔ تو اسی حساب سے اس اسٹاک پر اکیس روپے چھ آنے آٹھ پائی سے کچھ زیادہ مقسوم ملیگا۔ اور اگر بازاری شرح سود چار فی صدی ہو تو اسٹاک مذکور کی قیمت ۵۳۵ روپے آٹھ آنے ہوگی۔ اور اگر شرح ۵ فی صدی ہو قیمت ۴۴۶ روپے چار آنے ہوگی اور اگر شرح پونے پانچ فی صدی ہو تو اسٹاک کی قیمت میں پائیاں تک شامل ہو جاتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ بست رقوم کے مقابل ایسی شکستہ رقموں کے حساب اور لین دین میں کس قدر طوالت اور دقت ہوگی۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ جو لوگ بونڈ یا ڈبنچر یعنی تمسک خریدتے ہیں وہ کمپنی کو روپیہ قرض دے کر اس کے قرضخواہ بن جاتے ہیں۔ اور تا ادائی قرض بشرح معین سود پاتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اسٹاک یا شیئر یعنی حصے خریدتے ہیں وہ کمپنی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر اس کے مالک شمار ہونے لگتے ہیں۔ اور منافع میں سے حصۂ رسد مقسوم پاتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ کمپنی کو خسارہ پہنچے یا اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو اوّل زر تمسکات اور اس کے سود کی ادائی لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ بچے تو وہ حصے داروں کا حق ہے۔ گویا تمسک داروں کا مطالبہ حصے داروں کے حق پر مقدم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حصوں کے مقسوم کی شرح تمسک کے سود کی شرح سے بالعموم بڑھی رہتی ہے۔ مثلاً اگر سو روپیہ کے تمسک پر چار فی صدی سود ملے تو سو روپیہ کے حصے پر پانچ روپے مقسوم کی توقع کی جائیگی۔ اس بیشی کو مطالبات خطر سمجھنا چاہئے۔ یوں کہئے تو تمسک حصے سے زیادہ محفوظ ہے تاہم کسی متزلزل کمپنی کے تمسک سے مستحکم کمپنی کا حصہ ہزار درجے محفوظ ہے ؎

جو لوگ چاہیں کہ ان کا اندوختہ کہیں ٹھکانے لگ جائے اور ڈوبنا بھی نہ رہے اور اس سے کچھ مستقل آمدنی بھی حاصل ہو۔ ان کے واسطے کسی عمدہ کمپنی یا سلطنت کے بونڈ خریدنا بہت مناسب حال ہے۔ ان کی آمدنی مستقل ہوتی ہے اور اگر درج شدہ ہوں تو پھر گم ہونے یا چوری جانے سے نقصان پہنچنے کا ظن بھی کم رہ جاتا ہے۔ بوڑھوں، عورتوں، نابالغوں اور ملازمت پیشہ لوگوں کے واسطے شغلِ اصل کا یہی طریق سب سے بہتر ہے ؎

جن کو مستقل آمدنی اس قدر مطلوب نہ ہو بلکہ اضافۂ اصل کی زیادہ خواہش ہو ان کے واسطے دست گرداں شیئر خاص طور پر موزوں ہیں چونکہ مقسوم معین نہیں ہوتا۔ ان کی قیمتوں میں اکثر خاص تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان کی خرید و فروخت میں بھی کوئی طوالت اور دقت نہیں۔ اگر کسی کو اس قسم کے کاروبار میں دسترس ہو تو کم قیمت پر حصے خریدے اور زیادہ قیمت پہ

فروخت کرتا رہے ۔ چنانچہ لوگ اس طرح پر حصّوں وغیرہ کی اُلٹ پھیر کرکے لاکھوں روپے کما لیتے ہیں ۔ روپے کا ایسا کاروبار شغلِ اصل کے بجائے تخمین سے تعبیر ہوتا ہے ؛

مندرجۂ بالا از حد سادے اور مختصر خاکے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اصل کا کاروبار بھی کیسا وسیع اور دشوار فن ہے ۔ چنانچہ شغلِ اصل کے متعلق انگریزی میں متعدد ضخیم کتابیں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی شائع ہوتی ہیں ۔ بھلی بُری کمپنیوں میں تمیز کرنا تمسّکوں اور حصّوں کی خوبیاں اور نقص سمجھنا ۔ موقع محل پہچاننا یہ سب کیا کچھ آسان کام ہے ؟ لوگ عمریں صرف کرکے یہ مہارت حاصل کرتے ہیں ۔ چنانچہ تمسّک اور حصّوں وغیرہ کی خرید و فروخت بالعموم دلّالوں کی معرفت ہوتی ہے جو اس کام میں بڑے تجربہ کار مبصّر اور ماہر ہوتے ہیں ۔ دلّالوں کی خیر خواہی اور خوش معاملگی ضرب المثل ہے ۔ یہ اپنے موکّلوں کو پوری نیک نیتی سے بہترین رائے اور مشورہ دیتے ہیں ۔ اگر یہ خوبی نہ ہو تو لوگ اپنے لاکھوں روپے کے معاملات ان کے ہاتھ میں کیوں ڈالیں ۔ اور ان کے کاروبار کیونکر فروغ پائیں ۔ ایمانداری ہی ان کی ترقی کا حقیقی راز ہے ؛

اپنا اندوختہ دوسروں کے سپرد کرنے کی جدید مفید صورتیں اوپر بیان ہوئیں اب رہا لین دین کا قدیم طریق جس کا ہندوستان میں اب تک بہت رواج ہے یعنی ایسے لوگوں کو سود پر روپیہ قرض دینا جو اسکو غیر پیدا آور کاموں میں صرف کریں اور عمل پیدائش میں اس سے مدد نہ لیں ۔ بالفاظ دیگر جنکہ زرِ مستعار کو بطورِ دولت صرف کریں نہ کہ بطورِ اصل جیسا کہ قرض لے کر شادی ، غمی یا عشرت پرستی میں روپیہ صرف کیا جاتا ہے ۔ اگرچہ قرض دہندہ کے نقطۂ نظر سے یہ بھی شغلِ اصل ہے کیونکہ اس کو سود ملتا ہے ۔ لیکن معاشی ، معاشرتی ، اخلاقی اور مذہبی غرضکہ چند در چند لحاظ سے ایسا شغل بجہ نا جائز و معیوب ہے ۔ اور بذریعۂ قانون اس کو روکنے کی بہت کوشش ہو رہی ہے ، ایسے لین دین کا سود بدرجۂ اتم ربا ہوتا ۔ سود اور ربا کا علمی فرق

حصہ سوم

باب سیزدہم

سود کی روداد میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔ باقی خرابیوں سے ہم آئندہ بعنوان "سود کا حال و مستقبل" مفصل بحث کریں گے۔

شغلِ اصل کی ایک قدیم اور مفید صورت یہ بھی ہے کہ اپنے اصل سے خود ہی کاروبار جاری کر دے۔ یہ طریق اس قدر عام ہے کہ محض نظر انداز ہو جانے کے خوف سے اس کا حوالہ ضروری سمجھا گیا۔ اس حالت میں کاروبار سے جو منافع حاصل ہوگا اس کا ایک جزو اپنے اصل کا سود ہوگا۔ چنانچہ تیرھویں باب میں بعنوان منافع اس کی تفصیل موجود ہے۔

۴۔ سود کیا ہے؟ کس طرح پیدا ہو کر کس اصول کے مطابق تقسیم ہوتا ہے؟ ماہیتِ سود کے متعلق ان سوالات پر بحث اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے اور جس کے سمجھنے کے لیے معاشیات کی وسیع معلومات شرط اول ہے۔ سود کے متعلق جو متعدد مسائل نکالے گئے ہیں وہ چند انواع میں مرتب ہو سکتے ہیں۔ ایسے کل انواع کا مختصر بیان اور مسئلہ بامطابقتِ صحیح ترین تسلیم ہو چکا ہے اس کی مفصل بحث اس کتاب میں نہایت موزوں ہوگی:-

۱۔ مسئلۂ استحصال: جس طرح کسی زمانے میں صرف زمین عاملِ پیدائشِ دولت خیال کی جاتی تھی آج کل بھی بعض لوگ صرف محنت کو عاملِ پیدائش مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصلدار غریب مزدوروں کی کمائی کا ایک حصہ چھین لیتا ہے جس کو سود کہتے ہیں۔ گویا سود محض ان نامساعد حالات کا نتیجہ ہے کہ مزدور بالعموم غریب ہوتے ہیں اور دولتمندوں کے ہاتھ اپنی محنت فروخت کرنے کے سوائے ان کو کوئی چارہ نہیں۔ مزدوروں کو جو اجرت ملتی ہے وہ ان کی مایحتاج زندگی سے بمشکل زائد ہو سکتی ہے اور محنت کی پیداوار سے یقیناً کم ہوتی ہے۔ پیداوارِ محنت اور اجرت کا فرق بشکلِ سود اصلدار کی جیب میں جاتا ہے گویا اصل مزدوروں کی کمائی میں سے حصہ چھیننے کا آلہ ہے۔ علمی تحقیقات سے یہ مسئلہ

مسائل؛

محض وہمی اور بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ کسی زمانے میں اس مسئلہ کا بہت زور شور تھا لیکن اس کے حامیوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ بہر حال صرف یہی مسئلہ سود کا مخالف ہے۔ اس کے علاوہ باقی کل مسائل بالاتفاق سود کے موافق ہیں۔ اور صرف تشریح و توجیہ سود میں اختلاف کرتے ہیں۔

(ب) مسئلہ پیدآوری۔ سود اصل کی ان خدمات کا معاوضہ ہے جو پیدائش دولت میں وہ سر انجام دیتا ہے۔ عمل پیدائش دولت میں سود کا حصہ مسلّم ہے۔ چنانچہ وہ عامل پیدائش مانا جاتا ہے۔ اور جس طرح کہ مزدور کی محنت کا معاوضہ اجرت کہلاتا ہے اصل کی خدمات کے معاوضے کو سود کہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مسئلہ نہایت صاف اور صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن نظرِ غائر ڈالنے سے اس میں چند دقیق مگر اہم خامیاں نمایاں ہوں گی جن کی تشریح سے ہم یہاں معذور ہیں۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ سراسر غلط تو ہے نہیں مگر ادھورا اور غیر تشفی بخش ضرور ہے۔

(ج) مسئلہ اجتناب۔ انسانی خاصہ ہے کہ کسی چیز سے بوقتِ موجودہ لطف اٹھانے کو بمقابلہ مستقبل کے زیادہ دل چاہتا ہے۔ اور التوائے لطف بہت گراں گزرتا ہے۔ اوّل تو پیدائش اصل کے واسطے پس اندازی یعنی بعض موجودہ ضروریات ترک کر کے مستقبل ضروریات کے خیال سے کچھ بچانا شرط لابدی ہے دوسرے اندوختے سے بجائے دولت کے بطورِ اصل کام لینا۔ یعنی اس سے فوری احتیاجات رفع نہ کر کے مزید دولت پیدا کرنا گویا اس کی لطف اندوزی کو ملتوی کرنا ہے۔ پس پیدائش اور شغل اصل دونوں میں اجتناب مضمر ہے اور اجتناب کیا ہے۔ لطف اندوزی کے کام سے باز رہنا جسے ہم مقدمے میں

واضح کر چکے ہیں یہ خدمت کی ایک شکل ہے اور ہر طرح پر دولت کہلانے کی مستحق پس سود معاوضہ ہے اسی خدمت اجتناب کا یعنی موجودہ خرچ سے کچھ بچانے کا اور اندوختے کو فوری احتیاجات پر صرف کرنے کے بجائے اس سے مستقبل دولت پیدا کرنے کا۔ صریح واقعہ ہے کہ جب تک اندوختے سے کچھ آمدنی کی امید نہ ہو بہت کم پس انداز کیا جاتا ہے اور منافع کی امید بغیر اندوختہ کاروبار میں لگانا یا کسی کو قرض دینا تو محال ہے۔ البتہ جو قرض حسنہ براہ ہمدردی بلا سود دیا جاتا ہے وہ خارج از بحث ہے۔ لیکن ایسی مستثنیات بیحد نایاب اور ناقابل لحاظ ہیں حاصل کلام یہ کہ جو شخص کچھ روپیہ بچا کر کاروبار میں لگاتا ہے وہ فوری احتیاجات پر یہ روپیہ صرف کرنے سے باز رہنے کی خدمت سرانجام دیتا ہے اور سود اسی خدمت اجتناب کا معاوضہ ہے۔ اس مسئلے کی رو سے پیدائش اصل بہت کچھ اور شغل اصل سراسر سود پر منحصر ہے۔ اور چونکہ پیدائش دولت میں اصل اس قدر معاون ہے سود دینا لابدی اور درست ہے :

اس واقعے سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ ہر ایک شخص مقابلۃً موجودہ مساوی لطف اندوزی کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیتا ہے اور پیدائش و شغل اصل میں اجتناب مُضمر ہے ہا لیکن سود کو اس خدمت اجتناب کا معاوضہ قرار دینا علمی حیثیت سے کافی طور پر تشفی بخش اور قابل تسلیم نہیں۔ اس مسئلے پر چند دقیق اور مسکت اعتراض عائد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اجتناب کی خدمت غائب ہو جاتی ہے :

لطف اندوزی حاضر کو مستقبل پر ترجیح دینے کا انسانی خاصہ تو بالکل درست ہے لیکن اس مسئلے میں اس سے جو توجیہ کی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ بہتر توجیہ ہم آگے چل کر مکمل ترین مسئلے کے ضمن میں بیان کریں گے :

(د) مسئلۂ منت۔ بعض نے پس اندازی و شغل اصل کو

سیدھے سادھے طور پر محنت قرار دے کر سود کو اصلداری کی بس محنت کا معاوضہ یا اجرت قرار دے دیا۔ یہ مسئلہ بھی مسئلۂ اجتناب سے ملتا جلتا مگر اس سے زیادہ سادہ ہے۔ مذکورۂ بالا مسائل سے سود کے بجا اور درست ہونے کی تائید ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سود کی علمی تشریح و توجیہ بالکل ادھوری اور غیر تشفی بخش نظر آتی ہے۔

مذکورۂ بالا مسائل کے علاوہ چند اور مسائل بھی پیش کئے جا سکتے ہیں جنمیں سے بعض تو قطعاً رد ہو چکے ہیں اور محض تاریخی لحاظ سے سود کی بحث میں ان کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور بعض مذکورۂ بالا مسائل کے عجیب عجیب مرکب ہیں جن میں اُن کی خامیاں بھی بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں۔

اب ہم سود کا وہ آخری مسئلہ ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں جو مقابلتہً مکمل ترین خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی جتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ فی نفسہٖ ابھی خود یہ مسئلہ بھی تکمیل طلب ہے۔ اس مسئلے کے حامیوں میں بھی باہم اختلافِ رائے پھیلا ہوا ہے اور اسی وجہ سے مسئلے کی موجودہ شکل بعینہٖ کسی ایک مصنّف کی کتاب میں نظر آنی محال ہے۔ مطالعے اور غور سے پورا پورا کام لے کر اس مسئلے کے بیان میں ہم نے دَعْ مَاکَدَرَ خُذْ مَاصَفَا کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا اگر یہ مسئلہ بعض سے ملتا جلتا لیکن ہر ایک سے جدا نظر آئے تو تعجب نہیں۔ کتابِ ہٰذا میں یہ طریق ناگزیر معلوم ہوا ورنہ مسئلۂ سود کی بحث کے واسطے ضخیم کتاب اور اُسکے سمجھنے کیواسطے معاشیات میں بہت کچھ وسعتِ معلومات کی ضرورت ہے۔

سود کی سب سے بہتر علمی تشریح و توجیہ اصل کے دو مسلّم خواص سے متعلق معلوم ہوتی ہے ایک توقع پسندی جو اصل سے کام لینے میں کم و بیش لاحق ہوتی ہے دوسرے پیدآوری جو اصل کا لابُد خاصّہ ہے اور جسکی بدولت وہ عامل پیدائش شمار کیا جاتا ہے۔ مندرجۂ ذیل تفصیل سے واضح ہوگا کہ توقع پسندی سود کا باعث اور پیدآوری اُس کا منبع ہے علیٰ ہٰذا اصل کی رسد و طلب بھی

حصہ سوم
باب سیزدہم

تعیین خواص سے علی الترتیب متعلق ہے۔

۴۔ بعض لوگوں کے پاس تو اس قدر دولت ہوتی ہے کہ اُن سے خرچ کئے بن نہیں پڑتا، جبکہ تمام موجودہ ضروریات حاصل ہوں تو باقی ماندہ دولت کو پس انداز کئے بغیر کیا چارہ ہو سکتا ہے لیکن بعض زیادہ اہم مستقبل احتیاجات رفع کرنے کے خیال سے اگرچہ موجودہ ضروریات ترک کرکے بھی لوگ کچھ اندوختہ جمع کریں تو عجب نہیں چنانچہ واقعہ ہے کہ حسب حیثیت لوگ بالعموم علالت و پیری کے خیال سے موجودہ آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ جمع کیا [illegible] کرتے ہیں ایسے اندوختے لوگ خود بخود پس انداز کرتے ہیں انکو مزید [illegible] بلکہ ایسے اندوختوں کی نگہداشت کا کوئی معاوضہ [illegible] رضامند ہو جائیں تو عجب نہیں۔ چنانچہ جبکہ شغل اصل کا میدان [illegible] بنک، رقم داخل شدہ کی تحفظ و نگہداشت کا معاوضہ [illegible] وصول کرتی تھی۔ اب تک پس اندازی دو حالتوں تک محدود تھی [illegible] دولت کی خوب افراط ہو۔ دوم جبکہ بمقابل چند موجودہ احتیاجات کے آئندہ زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنی یقینی ہوں لیکن معاشی ترقیات کی بدولت جبکہ شغل اصل کے مواقع بہت کثیر اور وسیع ہو گئے ہیں ایک جدید تیسری قسم کی پس اندازی شروع ہوئی یعنی بلا زیادتی دولت و لحاظ احتیاجات مستقبل محض مزید معاوضے کے لالچ سے موجودہ احتیاجات کو دبا کر لوگوں نے پس اندازی شروع کر دی۔ ایک شخص سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ سو روپے آج لینا چاہتا ہے یا ایک سال کے بعد۔ اب اگر اس کو اس وقت کوئی احتیاج ہی درپیش نہ ہو۔ یا آئندہ احتیاجات موجودہ سے زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنے کا یقین ہو تو بشرطیکہ اس کو پورا اعتماد بھی ہو وہ رقم مذکورہ سال بھر میں لینا زیادہ پسند کریگا۔ بلکہ امانتداری کا کچھ معاوضہ بھی اپنی گرہ سے دے تو عجب نہیں۔ لیکن بحالت سوم اگر اس کو موجودہ احتیاجیں دبا رہی ہوں تو اُن کو رفع کرنے کی غرض سے وہ اس رقم کی ادائی حاضر کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیگا۔ البتہ اگر کچھ مناسب اضافے کا وعدہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ حال کے بجائے ایک سال ہی بعد لینا گوارا کرے۔ اس واقعے سے ایک عام اصول

وقت پسندی

حصہ سوم
باب سیزدہم

واضح ہوتا ہے کہ بحالت احتیاج کسی چیز کے ملنے کے وقت میں جس قدر بُعد ہو گا اُسی قدر موجودہ معیار کے مطابق اس کی قدر گھٹ جاویگی (نو نقد نہ تیرہ اُدھار) اسی کو خاصۂ توقع پسندی کہتے ہیں۔ اگر شخص مذکور اس وقت سَو روپے یا ایک سال بعد ۱۰۵ روپے لینے پر یکساں رضامند ہو تو گویا اس وقت ایک سال بعد ملنے والے ۱۰۵ روپے کی قدر اس کے نزدیک فوراً ملنے والے سَو روپے کے برابر ہے۔ لیکن واضح ہو کہ سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۵ روپے کی قدر موجودہ سو روپے کی قدر سے بمقدار ۵ روپے زائد ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سال بھر انتظار کرنے پر وہ رضامند کیوں ہونے لگا تھا گویا اس وقت تو ان ۵ روپوں سے بمقابلہ سو روپے حاضر کے ۱۰۰ روپے مستقبل کی قدر کی موجودہ تخفیف کی تلافی ہوتی ہے لیکن سال بھر بعد جبکہ بوقت حصول یہی ۱۰۰ روپے مستقبل ۱۰۰ روپے حاضر کے مساوی القدر ہو جاویں تو وہ ۵ روپے سود بن جاویں گے یا بالفاظ دیگر ۱۰۵ روپے مستقبل کی موجودہ قدر سو روپے حاضر کے برابر ہے۔ اور سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۰ روپے حاضر سے بقدر ۵ روپے زائد ہوگی یہی ۵ روپے جو اس وقت تخفیف قدر کی تلافی کرتے ہیں اُس وقت بطور قدر مزید سود شمار ہوں گے۔

پس صاف ظاہر ہے کہ سود کا باعث توقع پسندی ہے۔ اور توقع پسندی اکثر اصل کی پیدائش اور تمام اصل کے شغل سے لاینفک ہے۔ چند دولتمندوں کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ تھوڑی بہت موجودہ احتیاجات دبائے بغیر پس انداز کم کر سکتے ہیں۔ رہا شغل اصل۔ خواہ اندوختہ کچھ عرصے کے واسطے قرض دیا جائے یا زراعت۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں لگایا جائے اس کی واپسی ہمیشہ قریب یا بعید مستقبل میں ہوگی۔

جو اندوختہ محض بوجہ زیادتی دولت یا بخیال اہمیت احتیاجات مستقبل جمع ہوتا ہے اگر موجودہ کاروباری ضروریات کے لئے کافی ہوتا تو نہ توقع پسندی کا کوئی دخل ہوتا نہ اصلدار کی زیادہ پرواکی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ آجکل تو

حصہ سوم

اسبابِ سود

اور اس اصل کا عشر عشیر بھی مہیا نہیں کرسکتے جو عوام اور متوسط الحال لوگوں کے
زر اندوختوں سے ملتا ہے۔ اور آخر الذکر طبقہ کے اصل کی پیدائش میں عنصرِ
توقع پسندی کو بہت بڑا دخل ہے، بلا امیدِ منفعت سود نہ تو یہ لوگ اس قدر پس انداز کرسکتے ہیں
اور نہ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی قرض دینے یا کاروبار میں لگانے پر رضامند
ہو سکتے ہیں۔ اور موجودہ کاروباری ضروریات کے لحاظ سے ان کا اصل بھی ناگزیر ہے۔
پس ان کو سود دینا لابد ہوا۔ اور جب ان کو سود ملنے لگا تو پھر دولتمند اپنے اصل کا سود
کیوں نہ طلب کریں۔ کام تو ان کا اصل بھی ویسا ہی کرتا ہے جیسا دوسروں کا۔ پھر کیا وجہ
کہ اس پر سود نہ دیا جائے۔ آجر لوا اس سے لیا بحث کہ اس کی پیدائش اور شغل
میں توقع پسندی عنصر ہے یا نہیں۔ اس کو تو صرف اصل کے کام سے تعلق ہے
اور بس۔ لہٰذا بلا تفریق موجودگی و عدم موجودگی توقع پسندی ہر قسم کے اصل پر سود
دیا جانے لگا۔ لیکن سود کا حقیقی باعث پھر بھی توقع پسندی ہی رہا ہے۔

پیدا آوری

۵۔ پیدا آوری بھی اصل کا ایک خاصہ ہے۔ اس کی جابجا تفصیل بھی
کی جا چکی ہے۔ مختصراً یہاں بھی تشریح کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک
درزی جو ہاتھ کی سلائی سے آٹھ آنے روز کماتا ہے سلائی مشین کی مدد سے بارہ آنے
روز کمائے تو چار آنے کی پیداوار اصل مشین سے منسوب کرنا بجا ہوگا۔ لیکن
واضح ہو کہ اصل کی پیدا آوری ثابت کرنے کے لئے چار آنے کا محض پیدا ہونا
کافی نہیں۔ دورانِ شغل میں اصل تمام برابر فرسودہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصے میں
بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ ابتدائے استعمال کے وقت سے بیکاری کے وقت
تک اس پیداوار میں سے جو استعمال اصل کا نتیجہ ہو مطالباتِ فرسودگی
ایسی شرح سے منہا کرتے رہتے ہیں کہ کل اصل واپس آجائے۔ پس اگر
ایسی پیداوار مطالباتِ فرسودگی سے کمتر ہو تو گویا اصل بھی واپس نہیں آسکتا اور
اس کے استعمال میں سراسر نقصان ہے۔ اگر مطالباتِ فرسودگی کے مساوی
ہو تو کچھ عرصے میں صرف اصل واپس آجائیگا۔ استعمال سے اصول توقع پسندی کے مطابق
پھر بھی نقصان رہیگا۔ البتہ اگر مطالباتِ فرسودگی سے ایسی پیداوار کچھ زائد ہو تو
بیشک وہ پیدا آوری اصل کا ثبوت ہوگی اور پیداوار اصل کہلانے کی مستحق۔

حصۂ سوم باب سیزدہم

تجربہ شاہد ہے کہ شغل اصل سے علاوہ مطالبات فرسودگی کے مزید پیداوار بھی حاصل ہوتی ہے جس میں سے بالعموم سود ادا کیا جاتا ہے یہی پیدآوری ہے جس کی بدولت لوگ خوشی خوشی بقدار کثیر سود پر قرض لیکر اصل مستعار سے کاروبار چلاتے ہیں اور سود ادا کرنے پر بھی منافع اٹھاتے ہیں۔ اگر اصل سے پیداوار میں جداگانہ اضافہ نہ ہوتا تو لوگ اس قدر شوق سے قرض لے کر اسکو کیوں کام میں لاتے اور فضول کیوں سود کے زیربار ہوتے۔ البتہ جو لوگ روپیہ قرض لیکر بمجبوری یا بخوشی غیر پیدآور کاموں میں صرف کرتے ہیں جیسا کہ بحالت افلاس قرض لے کر بسر اوقات کرنا۔ یا آوارہ مزاج رؤسا کی طرح رنگ رلیاں منانا۔ ایسے اصل میں قرض دہندہ کی طرف سے توقع پسندی موجود ہوتی ہے لہٰذا وہ سود کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن مقروض کے ہاتھ میں آکر ایسا اصل محض دولت رہ جاتا ہے، اس سے پیدآوری مفقود ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ خود مع سود اس پر بار گراں بن کر تباہی کا باعث ہو جاتا ہے، اب اگر محض اس بنا پر کہ اصل مستعار سے پیدآوری کا کام نہیں لیا گیا تھا قرض دہندہ کو سود سے محروم کیا جائے تو وہ قرض دینے سے انکار کر دیگا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ ایسی قانونی بندش سے لین دین رک سکتا ہے۔ ایسے قرض لینے والے جو نہایت ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں طرح طرح کی تدابیر نکال کر قرض لیئے بغیر نہ رہیں گے۔ البتہ قانونی گرفت کے خوف سے قرض دہندے شرح سود کو اور بھی بڑھا دیں گے۔ اور اس اضافے کو مطالبۂ خطر کہیں گے جس کی تشریح ہم اقسام سود کے تحت میں آئندہ کریں گے۔

اگر قرض دہندہ کو قانوناً سود سے محروم کر کے قرض دینے سے روکنے کے بجائے بذریعۂ قانون قرض لینے والے کو روکا جائے تو نتیجہ زیادہ حسب دلخواہ ہوگا۔

محتاجوں کو اور رفاہ عام کے کاموں کے واسطے بلا سود قرض دینا۔ آوارہ لوگوں کو قرض دینے سے انکار کرنا معاشرتی واخلاقی لحاظ سے نہایت ضروری اور پسندیدہ ہے لیکن اس کی مثال اس قدر نایاب ہے کہ معاشی معاملات پر اس کا اثر قابل لحاظ نہیں ہو سکتا اسی طرح غریبوں سے بیحد زیادہ شرح سے

حصہ سوم
باب پنجم

سود۔ لیے کہ چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض دے کر ہمیشہ کے واسطے اُن کی کمائی کا شریکِ غالب بن جانا یا شوق دلا دلا کر بھولے بھالے وارستہ مزاج رئیس زادوں کو قرض دے کر ان کی جائداد ضبط کر لینا سوسائٹی کے حق میں اسقدر خطرناک اور اخلاقی لحاظ سے مذموم ہے کہ قانوناً اس کی بندش استصوابی بھی ہے اور ممکن بھی، سود کے بھلے برے نتائج سے ہم آئندہ سود کے ماضی و مستقبل کے تحت میں بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ جتا دینا مقصود تھا کہ سود توام پیدا اور پیدا آوری کا آفریدہ ہے اور یہ دونوں خواص شغلِ اصل میں مضمر ہیں۔ لہذا سود بھی شغلِ اصل سے لاینفک رہا۔

شرح سود

۶۔ جیسا کہ شرحِ اجرت کے بیان میں اشارہ کیا جا چکا ہے اصل بھی قانونِ تقلیلِ حاصل کا پابند ہے یعنی کسی کھیت یا مزدوروں کی جماعت میں جو اصل استعمال ہوتا ہے حسبِ دلخواہ کسی مقدار تک اس کا اضافہ کر کے اسی نسبت سے پیداوار میں بھی اضافہ ممکن نہیں۔ خواہ زراعت ہو یا صنعت و حرفت اصل کے جرعے استعمال کرتے کرتے ایک ایسا جرعہ ملیگا کہ اس کے مابعد جرعوں کی پیداوار درجہ بدرجہ گھٹتی چلی جاویگی۔ مثلاً کاشتکار اپنے کسی کھیت میں دس روپے کا کھاد ڈالے یا بیج بوئے یا پانی لگائے۔ اب اگر ان مدوں میں چوگنا اصل لگائے تو پیداوار کا چوگنے ہونے کا گمان نہیں ہے۔ اسی طرح کسی درزی کی دکان میں جب دو سنگر مشین استعمال ہوتی ہیں تو چار آنے روزانہ فی مشین ملتا ہے اب اگر دو مشینیں اور بڑھا دی جائیں تو ان پر بمشکل دو تین آنے مل سکیں گے۔ حاصل کلام یہ کہ دیگر عاملینِ پیدائش زمین و محنت کے مقابلے میں اصل کی مقدار جس قدر بڑھیگی پیداآور اصل کی شرح گھٹتی جانے کی اور شرحِ اجرت کی طرح شرحِ سود بھی سب سے کم پیداوار کے مساوی قرار پائیگی۔ زمین کی وسعت تو تقریباً معین ہے۔ اسمیں اضافے کی برائے نام بھی گنجائش نہیں۔ محنت کے اضافے میں بھی دیر لگتی ہے اور وباء قحط، جنگ جیسے عاملینِ موت اس کی کانٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں لیکن اصل کے اضافے کا کیا کہنا نہ سرگ بیل اس قدر پھیلے نہ مچھلی کی نسل اس قدر بڑھے، گزشتہ صدی میں

نہ معلوم اصل کے سو گنا ہو گیا ہو گا اور جس قدر بڑھتا ہے ساتھ ساتھ قوتِ اضافہ اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے اصل کی مقدار بڑھ رہی ہے جس کی [illegible] اندازی و شغل میں توقع پسندی مضر نہیں۔ ایسے اصل کی مقدار جس قدر بڑھیگی [illegible] اسی اصل کی عوضی بن کر اس کی مقدارِ مطلوبہ کی تخفیف کا باعث ہو گی اور جس قدر آخر الذکر اصل کی مقدار کم ہو گی ادنیٰ شرحِ سود پر اصل ملنا آسان ہو گا۔ علاوہ ازیں قیامِ امن و امان اور عام بیداری کی بدولت خود توقع پسندی کا اثر کمزور ہو رہا ہے یعنی بہ نسبت سابق اب لوگ کمتر معاوضے پر اپنا اندوختہ قرض دینے کا کاروبار میں لگانے پر رضامند پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ یا ادنیٰ شرحِ سود پر شغلِ اصل کو اختیار کرنا بھی معاشی ترقی و پس ماندگی کی علامت مانی جاتی ہے۔ اضافۂ اصل کے ساتھ ساتھ معاشی ترقیات کی بدولت شغلِ اصل کیواسطے بھی نئی نئی راہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور قانونِ تقلیلِ حاصل کے مقابلے میں نت نئی ایجادیں اصل کی قوتِ پیدا آوری بڑھا رہی ہیں۔ ایک طرف تو طلبِ اصل، زراعت صنعت و حرفت، تجارت اور عام کاروباری حالت پر منحصر ہے دوم کثرتِ اندوختہ، معاشی ترقیات اور عام بیداری کا رسدِ اصل پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور چونکہ طلب و رسد میں بہت کچھ باہمی انحصار موجود ہے اور ان کے عمل میں کوئی تقدم و تاخر نہیں۔ ایسی حالت میں شرحِ سود کے کل اسباب کا جدا جدا تعین محال ہے۔ صحت کے ساتھ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ شرحِ سود طلب و رسدِ اصل کے باہمی عمل سے مقرر ہوتی ہے۔ لیکن اتنا تحقیق ہے اور علمی لحاظ سے یہ واقعیت نہایت اہم ہے کہ مقدارِ سود بالعموم اصل کے پیداوارِ مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔

یہ ایک نہایت دقیق اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ چونکہ سود قلتِ اصل کا نتیجہ ہے یعنی توقع پسندی والا اصل ناگزیر ہے کسی زمانے میں کثرتِ اصل کی بدولت یعنی جبکہ غیر توقع پسندی والا اصل کاروباری ضروریات کیواسطے کافی ہو گا سود بھی غائب ہو جائیگا۔ یہ تو رسد کا پہلو تھا۔ ادھر طلب کے پہلو پر بھی بوجہ کثرتِ اصل پیداوارِ مختتم میں تخفیف ہوتے ہوتے صفر رہ جائیگا۔

حصۂ سوم
باب یازدہم

بالفاظِ دیگر یہ [illegible] محض موجودہ حالات کا آفریدہ ہے، پیداوار کا مستقل حصہ قرار نہیں پا سکتا۔ شرح سود برابر گھٹ رہی ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جہاں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ کبھی بالکل غائب ہو جائیگا، دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ایک خاص حد پر موجودہ تخفیف شروع [illegible] جائیگی اور وہ ہمیشہ برابر جاری رہیگا اور وہ پیداوار کا مستقل حصہ ہے۔ سود [illegible] ہے یا عارضی [illegible] کا فیصلہ تو بہت بحث طلب اور دشوار ہے لیکن [illegible] اس کا رواج [illegible] ہونا تو بہرحال یقینی ہے۔

تمام مذکورۂ بالا بحث سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ شرح سود معاشی اسباب سے خود بخود مقرر ہو جاتی ہے [illegible] قانون کی ضرورت نہیں۔ اور معاشی شرح سود میں قانونی مداخلت بیکار بلکہ مضر ہوتی ہے۔ لیکن پسماندہ ممالک میں جہاں معاشی اسباب کا اثر ضعیف ہے [illegible] قدیم طرز پر غیر پیدا آور کاموں کے واسطے زر نقد کا لین دین ہوتا ہے، سود بالعموم قرض گیر کی احتیاج کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے قرض ناچاری اور مجبوری کے ہوتے ہیں اور مثل مشہور ہے مرتا کیا نہ کرتا [illegible] کو قرض لئے بغیر چارہ ہی نہیں تو شرح سود پر قدم قدم کرنے [illegible] مہاجن سے جرأت ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ شرح جس کا وہ بظاہر متحمل ہو سکتا [illegible] اس سے طلب کرتا ہے اور اس کو بھی منظور کرنا پڑتا ہے۔ [illegible] کی مضرتوں سے ہم آئندہ سود کے [illegible] مستقبل کے تحت میں مفصل بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایسی شرح سود [illegible] مقرر کرنا ممکن بھی ہے اور [illegible] مفید بھی۔

اصطلاحی زبان میں مذکورۂ بالا بحث کا لب لباب یہ ہے کہ شرح سود معاشی اسباب کے تابع ہوتی ہے اور قانونی نگرانی کی محتاج نہیں لیکن شرح ربا بیشتر قرض گیر کی شدت احتیاج اور قرض دہندہ کی قوت [illegible] کے مطابق ہوتی ہے اور بذریعہ قانون اس کے حدود مقرر کرنا بھی مفید اور اشد ضروری ہے۔

۵۔ سود کی دو قسمیں ہیں سودِ خام و سودِ خالص، سودِ خام میں علاوہ سودِ خالص کے جس کی ماہیت مسائلِ سود کے تحت میں واضح کی جا چکی ہے۔ بعض اور میں بھی خصوصاً **مطالباتِ خطر و مطالباتِ فرسودگی شامل ہوتی ہیں۔** کاروباری مقابلے کی آزادی اور اصل کے سریع الانتقال ہونے کی بدولت سودِ خالص کی شرح تقریباً ہر جگہ ایک ہی سطح پر پائی جاتی ہے۔ یہ جو ۳ فیصدی سے لے کر ۲۰۔ ۲۵ فی صدی تک شرح میں فرق پھیلا ہوا ہے یہ درحقیقت سودِ خام سے متعلق ہے۔ جن کاروبار میں اصل ضائع ہونے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے یا فرسودگیٔ اصل کی رفتار تیز ہے اور اصل بھی بیش قیمت ہے تو سودِ خالص عام شرح کے مطابق ہونے کے باوجود بھی مطالباتِ خطر و فرسودگی کی زیادتی کی وجہ سے سودِ خام کی شرح بہت ہو جائیگی اور مذکورۂ بالا مطالبات ملے بغیر کوئی اپنا اصل ایسے کاروبار میں کیوں لگانے لگا۔ بمقابلہ زرِ رہن کے قرض پر زیادہ سود طلب کیا جاتا ہے، خوشحال لوگوں کو بمقابلہ عوام کے کمتر شرحِ سود پر قرض ملتا ہے۔ کمتر شرحِ سود پر بھی لوگ قدیم اور معتبر بنکوں ہی میں روپیہ داخل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے نئے بنکوں کو زرِ داخلہ پر شرحِ سود بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ شرحِ سود کے ایسے فرقوں کا باعث مطالباتِ خطر کی کمی بیشی ہوتی ہے۔ بعض کاروبار ایسے ہیں کہ ان میں خاص طور پر نقصان کا اندیشہ لگا رہتا ہے مثلاً شیشہ آلات یا اونی اور زردوز کپڑوں کی تجارت کہ ذرا سی بے احتیاطی سے ہزار ہا روپے کا سامان ٹوٹ پھوٹ کر یا کرم خوردہ اور ماند ہو کر اکارت جاتا ہے۔ ایسے کاروبار میں بھی باقاعدہ مطالباتِ خطر ملتے رہنے ضروری ہیں تاکہ ایسے اتفاقی نقصانات کی تلافی ہوتی رہے۔ ورنہ کچھ عرصے بعد کاروبار جاری رکھنا محال ہوگا۔ اصلِ دائر مثل کوئلہ، روپیہ اور مالِ خام تو عملِ پیدائش میں اوّل ہی مرتبہ اپنا کام ختم کر کے جلد واپس آ جاتا ہے۔ لیکن عمارت و مشین کے مثل اصلِ قائم عرصۂ دراز تک عملِ پیدائش میں اپنا کام انجام دے کر مدت میں واپس ہوتا ہے لیکن دورانِ عملِ پیدائش میں وہ برابر گھستا اور خراب ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصے میں وہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس وقت تک اس کی واپسی بھی ضروری ہے۔ پس قاعدہ یہ ہے کہ کچھ فی صدی سالانہ بطورِ مطالباتِ فرسودگی شمار کیا جاتا ہے۔ تاکہ بتدریج کل اصل قائم اس کی ناکارگی کے وقت تک واپس آجائے۔ اصل قائم جس قدر بیش قیمت اور سریع الزوال ہوگا مطالباتِ فرسودگی بھی زیادہ ہوں گے۔ بصورتِ دیگر مطالبات کی مقدار بھی بہت کم ہوگی۔

پس معلوم ہوا کہ سودِ خام میں علاوہ سودِ خالص کے جس کی شرح کم و بیش مساوی ہو مطالباتِ خطر و فرسودگی بھی خاص طور پر شامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان مطالبات کی مقدار کاروبار کی نوعیت سے متعلق ہوتی ہے سودِ خام میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں سودِ خالص کی شرح بھی معمولی سے اعلیٰ پائی جاتی ہے۔ لیکن اس حالت میں ممکن ہے جبکہ کاروبارِ متعلقہ میں اجارہ حاصل ہو یعنی وہ مقابلے کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ اجارے و مقابلے سے ہم آئندہ بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا کافی ہے کہ مقابلے کی خاصیت قیامِ مساوات ہے خواہ اجرت میں یا سود و قیمت میں۔ اس کے برعکس اجارہ داران میں اپنے موافق فرق بھی پیدا کر سکتا ہے لیکن شرح صرف کاروبار کے قایم شرکا کے نزدیک اعلیٰ شمار ہو سکتی ہے۔ جدید شرکا کے حق میں وہ بھی معمولی سطح پر آرہتی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگر کسی کاروبار میں بغایت اعلیٰ شرحِ سودِ خالص حاصل ہوتی ہو تو اس شرح کے حساب سے ایسے کاروبار کے حصص کی قیمت نتیجہ بھی بڑھ جاوے گی۔ اور جدید شرکا کو وہی معمولی شرح مل سکیگی مثلاً کسی کارخانے میں شرحِ سودِ خالص پندرہ روپے ہو اور معمولی شرح ۵ روپے تو ایسے کارخانے کے سو سو روپے قیمتِ متعارف والے حصے میں تین تین سو روپے میں فروخت ہو کر خریداروں کو معمولی شرح سے سود دیں گے۔ البتہ قدیم شرکا کو اب بھی ۱۰۰ روپے پر ۱۵ فی صدی ملیگا لیکن اُن کے قدیم ۱۰۰ روپے بھی اب ۱۰۰ روپے نہیں رہے بلکہ تین سو کے مساوی ہو گئے لہٰذا اصل کی موجودہ قیمت کے مطابق اُن کو بھی

حصۂ دوم
باب نہم

دس فی صدی ہی ملتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کارخانے کی شرح سود ادنیٰ ہو تو حصص کی قیمت یعنی قیمتِ متعارفہ سے گھٹ کر شرحِ سود معمولی شرح تک بلند کر دیگی۔ حاصل کلام یہ کہ سودِ خالص کی شرح کم و بیش ہر جگہ مساوی پائی جاتی ہے۔ جو کچھ فرق نظر آتا ہے اکثر سودِ خام سے متعلق ہے۔

سود و ربا اور سودِ خام و سودِ خالص کا فرق ظاہر ہو گیا۔ اب ہم سود کی ایک اور تفریق بتانا چاہتے ہیں جو کاروبار کی اصطلاحی زبان سے متعلق ہے۔ اصل قرض دینے کے بعد معاوضہ بشرحِ معین فی صدی سالانہ ہم قرضدار سے پاتے ہیں وہ سود کہلاتا ہے لیکن اگر کسی انجمن سرمایۂ مشترک کے حصے دار بن کر ہم کاروبار کے نفع نقصان میں یکساں شریک رہیں اور غیر معین شرح سے حسب حالات اشغل اصل کا معاوضہ پائیں تو وہ اگرچہ سود سے مختلف نہیں لیکن کاروباری زبان میں مقسوم کہلاویگا اور اگر بلا شرکتِ غیرے ہم اپنے اصل سے خود کاروبار چلائیں تو اس کا سود منافع میں شمار ہوگا جو سود کہ بشکل مقسوم یا منافع حاصل ہوتا ہے اس کی شرح غیر معین ہوتی ہے اور بمقابلہ اضافہ تخفیف کا اندیشہ زیادہ دامنگیر رہتا ہے اسی وجہ سے ان میں علاوہ مطالباتِ خطر و سود کی مطالباتِ ضمانت بھی شامل ہوتے ہیں تاکہ اس سود کی تلافی ہوتی رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح عام مروجہ شرح سود سے کسی قدر اعلیٰ ہوتی ہے۔ لیکن بحیثیت سودِ خالص سب تقریباً ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔

زر اور سود کا تعلق

علم زر کی ماہیت اور اس کے اصول و مسائل سے مبادلۂ دولت کے تحت میں مفصل بحث کی جائیگی۔ یہاں صرف زر و سود کا رشتہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ مفصل بحث سے بخوبی روشن ہوگا۔ زر کی تین حیثیتیں ہیں دو آلۂ مبادلہ زر معیار قدر ہے اور تیسرے خزینۃ القدر بالفاظِ دیگر زر سے ہر چیز کا مبادلہ ہو سکتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو بدلے میں لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں چونکہ زر کا مبادلہ بالکل عام ہے اس کی وساطت سے مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا باہمی مقابلہ ممکن ہے اور بشکل زر ہی لوگ اندوختہ جمع کرتے ہیں۔ مثلاً روپے سے ہم غلہ، شکر، نمک،

کپڑا، جوتہ غرضکہ دنیا بھر کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ اور اگر غلے کا نرخ چار روپے من اور شکر کا آٹھ روپے اور نمک کا دو روپے من ہو تو قیمت کے مقابلے سے ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ دو من غلہ ایک من شکر اور چار من نمک مساوی القیمت ہیں اور چند در چند آسانیوں کی وجہ سے بجائے دیگر اشیا کے لوگ بالعموم روپیہ پیسہ ہی انداز کرتے ہیں۔ البتہ اندوختے سے بعد کو اور چیزیں خریدنا اختیاری ہے۔ زر کی مذکورہ بالا تین حیثیتوں سے شرح سود کا بھی قابل توجہ تعلق ہے۔ چونکہ دولت بشکل زر بیشتر پس انداز کی جاتی ہے اور زر میں یہ خوبی ہے کہ حسب دلخواہ اس کا ہر چیز سے مبادلہ ممکن ہے۔ اصل کا لین دین بشکل زر ہوتا ہے۔ اور زر ہی کے حوالے سے فی صدی سالانہ سود شمار کیا جاتا ہے۔ درحقیقت تو اصل سے وہ آلات عمارات۔ پیداوار خام وغیرہ مراد ہوتی ہے جو عمل پیدائش میں کام آئے لیکن حساب کتاب اور علمی مباحث میں اصل ہمیشہ بشکل زر شمار کیا جاتا ہے۔ اور یہ ہم یہ بھی سمجھا چکے ہیں کہ سود خالص کی شرح آجکل ہر جگہ کم و بیش مساوی پائی جاتی ہے اور اصل بشکل سامان شرح مروجہ کے حساب سے اپنی مقدار سود کے مطابق اصل بشکل زر منتقل کیا جا سکتا ہے مثلاً کسی شین سے چار روپئے خالص سود سالانہ حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر عام شرح ۳ فی صدی ہے تو یہ مشین ۱۳۳ روپئے زر اصل کے مساوی شمار ہوگی اور اگر ۵ فی صدی ہو تو ۸۰ روپے کے برابر ہر ایک اصل خواہ دائر یا قائم اول بوقت شغل اکثر زر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر چونکہ عام آلۂ مبادلہ ہے۔ اصل بشکل زر از حد سریع السیر ہے۔ جہاں موقع ہوتا ہے جا پہنچتا ہے۔ اور شرح سود سطح آب کی مانند ہموار رہتی ہے حتیٰ کہ اصل قائم بھی مساوات شرح کے اثر سے اپنی شکل زر میں بدلتا رہتا ہے حاصل کلام یہ کہ اصل یوں تو بکثرت سامان و آلات کی شکل میں موجود ہے لیکن لین دین اور علمی مباحث میں وہ ہمیشہ بہ لباس زر پیش کیا جاتا ہے۔

زر کی تیسری حیثیت بھی کہ وہ معیار قیمت ہے شرح سود سے ایک نہایت دلچسپ تعلق رکھتی ہے۔ زر یوں تو عام آلۂ مبادلہ ہے کہ اس سے دنیا کی ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں لیکن فی نفسہٖ زر سے ہماری کوئی احتیاج رفع نہیں ہو سکتی ہے

حصّہ سوم
باب سیزدہم

زر کیا ہے سونے چاندی اور تانبے کے سکّے یا کاغذ کے پرزے کہ جن کو نہ ہم کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں نہ اوڑھ پہن سکتے ہیں نہ جن سے براہ راست ہماری اور کوئی احتیاج پوری ہوسکتی ہے۔ لیکن زر عام آلۂ مبادلہ ہے اور اس سے دنیا کی بیشمار چیزیں خریدی جاسکتی ہیں جن سے ہماری احتیاجات رفع ہوں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ زر محض مبادلے کے واسطے درکار ہے تاکہ حسبِ ضرورت اس سے ہر چیز خرید لی جائے، زر کے مبادلے میں جس قدر کوئی چیز زیادہ یا کم ملیگی۔ اُسی قدر گویا زر کی قدر بھی بحوالہ اس چیز کے بیش و کم ہوگی. مثلاً جس زمانے میں گیہوں کا نرخ ۱۵ سیر ہو تو ایک روپیہ اُس زمانے کے بارہ آنے کے برابر ہے۔ جبکہ گیہوں ۲۰ سیر فی روپیہ فروخت ہوتے ہوں اور اس زمانے کے عہ کے مساوی القدر ہے جبکہ نرخ ۱۰ سیر ہی ہو، زر سے جو بیشمار چیزیں خریدی جاتی ہیں اُن کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن علمی طریق تحقیق ہوا ہے کہ جس سے من حیث المجموع زر کی قدر و قیمت کا اضافہ یا تخفیف قابلِ اطمینان حد تک دریافت ہوسکتا ہے۔ اس کو انڈکس نمبر کہتے ہیں، بخوبی ثابت ہوچکا ہے کہ بحیثیت مجموعی تقریباً ہر ملک میں گرانی بڑھ رہی ہے یعنی زر کی قدر و قیمت گھٹ رہی ہے اور بمقابلہ سابق کمتر چیز اس کے مبادلے میں ملتی ہے۔ تخفیفِ قدر کے اسباب کی بحث بہت طویل ہے ہم یہاں نہیں چھیڑ سکتے صرف اسی تخفیف کا شرحِ سود پر اثر دکھانا مدنظر ہے۔ زر عام معیارِ قدر ہے اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے مثلاً گز کہ وہ ۳۶ انچ لمبا ہے۔ یا من کہ ۴۰ سیر وزنی ہے لیکن زر ایسا معیار ہے جو خود تغیر پذیر ہے۔ اور اشیا کی گرانی ارزانی کے مطابق کبھی گھٹ کر اپنے ماسبق روپے کا تین چوتھائی یا نصف رہجاتا ہے کبھی ڈیوڑھا و دوگنا ہوجاتا ہے۔ اسکی مثال ایک ایسے گز کی سی ہے جو کبھی سکڑ کر ۲۰-۲۵ انچ اور کبھی پھیل کر ۴۰-۵۰ انچ ہوتا ہے فرض کرو کہ کوئی شخص ۵ فی صدی شرحِ سود سے سال بھر کے واسطے ۱۰۰ روپے قرض لے اب اگر روپے کی قدر بمقدار ۲۰ فی صدی بڑھ جائے یعنی سال میں گیارہ سو روپے شروعِ سال کے ۱۲۰ روپے کے مساوی القدر ہوں تو گویا قرضدار بوقت ادا کرنے کے قرض و سود ۱۰۵ روپے کے درحقیقت ایسے

۱۲۶ روپے ادا کرتا ہے جیسے کہ اُس نے قرض لئے تھے۔ گویا کہ شرح متعارف ۵ فی صدی اور شرحِ صحیح ۲۶ فی صدی ہوگی، اس کے برعکس اگر روپے کی قدر بیس فی صدی گھٹ جائے یعنی آخرِ سال کے ۱۰۰ روپے شروعِ سال کے ۸۰ کے مساوی القدر رہجائیں تو بوقتِ ادائی ۱۰۵ روپے وہ درحقیقت ایسے ۸۴ روپے ہوتے ہیں جیسے کہ قرض لئے تھے۔ یعنی کہنے کو تو ۵ فی صدی سود ادا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت ۱۶ فی صدی بٹّہ گویا بمعاوضہ قرض گیری خود کاٹتا ہے۔ بالفاظِ مختصر زر کی قدر وقیمت تغیر پذیر ہے اور اسکے گھٹنے بڑھنے سے سود کی شرحِ صحیح میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ نصف صدی میں روپے کی قدر گھٹتے گھٹتے بشکل نصف رہ گئی ہے اور قدیم قرضخواہوں کو بھی درحقیقت قرض کم وبیش ۵۰ فی صدی مل رہا ہے اگرچہ روپے کی مقدار اب بھی وہی ہے لیکن ان کی قدر چونکہ اصلی غایت ہے جو قرض دئے ہوئے روپوں کے نصف کے برابر رہ گئی ہے۔ ایسے قرضوں پر سود ملنا تو درکنار خود قرضخواہ کو اپنی گرہ سے سود دینا پڑتا ہے لیکن واضح ہو کہ زر کی قدروقیمت میں ایسا بڑا فرق کہیں مدتوں میں نمودار ہوتا ہے مختصر زمانوں میں جن کے واسطے بالعموم قرض دیا لیا جاتا ہے قدروقیمت میں کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تخفیفِ قدرِ زر کا واقعہ اور اس کا سود پر اثر عملاً زیادہ اہم نہیں۔ البتہ اصولاً بہت قابلِ توجہ ہے؁

زر کے متعلق یہاں بلحاظِ ضرورت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُسکی مفصل تشریح زر کے تحت میں ملیگی؁

سود کا حاضر و مستقبل

۹۔ آجکل حتی الوسع ہر شخص اپنے اندوختے سے بطورِ اصل کام لینے کا خواہشمند نظر آتا ہے موجودہ طریق کاروبار نے شغلِ اصل میں ایسی آسانیاں پیدا کردی ہیں کہ ہر شخص بلا دردِ سرا اپنے اصل سے سود حاصل کرسکتا ہے۔ معتبر بنک میں اندوختہ داخل کردے یا سرکاری شرحِ معین سود والے پرامیسری نوٹ اور اسٹاک خرید لے یا کسی انجمن سرمایۂ مشترک کے حصّے خرید لے۔ غرضکہ بلا محنت ومشقت اصلدار اپنے سود کی آمدنی سے نہایت عیش وعشرت کی زندگی

بسر کر رہے ہیں۔ غریب مزدور تو پیٹ پالنے کے لیئے دن رات جان کھپاتا ہے۔ زمیندار کو بھی ریاست کے انتظام میں بہت کچھ تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اکثر اصلداروں کو وقتِ معینہ پر گورنمنٹ یا بنک یا کارخانوں سے سود وصول کرنا اور چین اڑانا اس کے سوا اور کام ہی نہیں۔ سیر و سیاحت شکار و تفریح کے سوا ان کو نہیں معلوم کہ دنیا میں کونسی ہوا چل رہی ہے دوسروں کا اُن کے عیش و بےفکری پر حسد کرنا بالکل قدرتی بات ہے۔ چنانچہ اصل کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اصل کا کوئی قصور نہیں اور نہ سود میں کچھ عیب۔ اصلداروں کی اصلاح کے واسطے ان اسباب کا روکنا ضروری ہے جنکی بدولت وہ بلا محنت و مشقت بڑی بڑی مقدار دولت کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ اگر امریکا والے راک فیلر کی طرح کوئی غریب شخص اپنی سخت محنت اور غیر معمولی قابلیت سے ناجائز طریق اختیار کئے بغیر کروڑپتی کیا بلکہ ارب یا کھرب پتی بن جاوے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ نہایت ناکارہ لوگ خود ہاتھ پیر ہلائے بغیر باپ دادا کے بڑے بڑے ورثوں کی آمدنی پر جسکو بذریعہ شغل اصل بطور سود حاصل کرنے سے شاید ہی کوئی دنیا میں آسان کام ہوگا۔ دن عید اور رات شب برات مناتے ہیں۔ زمیندار بھی اگرچہ ریاست کے انتظام میں کچھ توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں، جیسا کہ لگان کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے لیکن ان کی ملک و جائداد کی آمدنی و قیمت بہت سی عام معاشی ترقیات کی بدولت ان کی کوشش بغیر خود بخود دن دونی رات چوگنی ہو رہی ہے۔ یہ لوگ بھی ایسے اضافوں سے روز بروز بلا محنت و مشقت زیادہ دولتمند ہو رہے ہیں۔ مزید براں بوجہ سہولت شغل اصل کا ان کو بھی شوق پیدا ہو چلا ہے۔ اور ان کو آمدنی غیر مکتسب کے دو ذرائع حاصل ہیں علاوہ ازیں بطریق اجارہ بھی کاروبار میں اجرت و سود سے زیادہ معاوضہ وصول کیا جا سکتا ہے گویا وراثت زمین اور اجارہ ہی تین طریق ہیں جن سے کافی محنت و کوشش کئے بغیر بڑی بڑی دولتیں افراد کے ہاتھ آ جاتی ہیں پس انکی اسطرح پر اصلاح کرنی چاہئیے

حصۂ سوم
باب چہار دہم

کہ تقسیمِ دولت بہت کچھ مساوی رہے ۔ اس وقت نہ لوگوں کے پاس جداگانہ بہت زیادہ اندوختہ ہوگا ۔ نہ شغلِ اصل سے موجودہ آمدنی غیر مکتسب اس قدر زیادہ مقدار میں میسر آسکیگی ۔ ما حصلِ غیر مکتسب کے اصلی ذرائع تو مسدود نہ کرنا جن کی وجہ سے لوگ بڑی بڑی دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں اور یہ شکایت کرنا کہ دولتمند شغلِ اصل سے بہت کچھ سود پا رہے ہیں نہ اصولاً صحیح ہے نہ عملاً مفید ؛

بالفاظِ مختصر لوگوں کو بلا مشقت بہت سی دولت وصول لینے سے روکنا چاہیئے نہ کہ جو دولت وہ حاصل کرلیں اس کے استعمال سے ؛

باب چہار دہم

منافع

(۱) آجر کی کارگزاری (۲) منافع کی ماہیت (۳) شرحِ منافع

آجر کی کارگزاری

۱۔ اس سے قبل بھی آجر کے کام کا جا بجا ذکر آچکا ہے یہاں اس کی تفصیل مقصود ہے ۔ ہر سہ عاملینِ پیدائش کے مالک تین جداگانہ گروہ میں منقسم پائے جاتے ہیں ۔ زمیندار مزدور اور اصلدار ۔ چنانچہ بابِ اول میں واضح ہوچکا ہے کہ ملک عاملین کی اس تقسیم کی بدولت پیداوار میں لگان اجرت اور سود کی تفریق ضروری معلوم ہوئی بہت کم زمیندار خود کاشت کرنا پسند کرتے ہیں ۔ لگان پر زمین اٹھانے کا طریق مدت سے مروج ہے ۔ غریب مزدور کے پاس آجکل کے کاروبار کے لائق اصل کہاں ، اکثر دوسروں کے ہاں اجرت پر کام کرتے ہیں ۔ اکثر اندوختے والے چاہتے ہیں کہ

کاروبار کے مخصوصوں میں پڑے بغیر کسی دوسرے کی معرفت شغلِ اصل سے سود حاصل کریں زمینداروں کا جداگانہ گروہ تو قدیم سے چلا آتا ہے لیکن جب سے پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا رواج ہوا اور خاص و عام میں اپنے اندوختے سے بطور اصل کام لینے کا شوق بڑھا مزدور۔ اصلدار۔ اور آجر بھی جداگانہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ آجر کرائے پر زمین اور سود پر اصل قرض لے کر۔ اجرت پر مزدوروں سے کام لیتا ہے۔ گویا اپنے اہتمام نگرانی اور ذمہ داری میں دوسروں سے عاملینِ پیدائش مستعار لیکر کاروبار جاری کرتا ہے۔ واضح ہو کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں آجر کے کام کی بہت گنجائش ہے۔ اور آخر الذکر شعبۂ پیدائش میں اصل و محنت کے عمل کا غلبہ ہوتا ہے۔ براہِ راست زمین اس میں بہت کم حصہ لیتی ہے۔ لہٰذا آجر کا کام بالخصوص قابلِ لحاظ حصۂ اصل و محنت کو یکجا کرنا ہے مزدوروں سے اجرت پر کام لئے بغیر تو کوئی چارہ نہیں۔ آجر اپنی ذات سے کُل کاروبار کیونکر چلا سکتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ زمین اور اصل یا ان کے کسی حصّے کا خود مالک ہو لیکن ان کے ذاتی ملک ہونے سے آجر کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بالفاظِ مختصر آجر کا کام عاملین یکجا کر کے دولت پیدا کرنا ہے۔ خواہ خود مالکِ زمین ہو اور اپنی گرہ سے اصل لگائے یا دوسروں سے مستعار لے۔ لیکن مزدوروں سے بہرصورت اجرت پر کام لیتا ہے اور خاص اسی وجہ سے آجر کہلاتا ہے۔

چونکہ ہر عاملِ پیدائش ایک جداگانہ گروہ کے ہاتھ میں جا پڑا ہے اور مالک خود کام لینے سے یا تو جان چراتے ہیں یا معذور ہیں۔ اس لئے عاملین یکجا کر کے دولت پیدا کرنے کا کام خاص طور پر ایک جداگانہ گروہ کے سپرد کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت پیدائش کا کام اس قدر دشوار اور تخصیص طلب ہو گیا ہے کہ اس میدان میں اچھے اچھے ٹھوکریں کھاتے اور راستہ بھولتے ہیں۔ اوّل تو یہ پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا زمانہ ہے۔ صدہا بلکہ ہزارہا مزدور اور لاکھوں کروڑوں روپے قیمتی اصل کا اہتمام نگرانی کیا کوئی آسان کام ہے۔ ذرا تفصیل پر غور کیجئے تو قدم قدم پر بیدار ہوشیاری خبرداری وقت شناسی دوربینی مستعدی

اور استقلال کی ضرورت نظر آئیگی ۔ آجر کو کاروبار کا کپتان کہتے ہیں ۔ اور تشبیہ از حد موزوں اور درست ہے ۔ لڑتی تو فوج ہی ہے لیکن فتح و نصرت کا دارومدار بیشتر جنرل کی عاقلانہ ترکیب اور مناسب چالوں پر ہوتا ہے ۔ عمدہ افسر جن بہادر سپاہیوں سے بڑے بڑے فتوحات پاتے ہیں ۔ ناقابل افسر انھیں بیکار کٹوا کر ہزیمت اُٹھاتے ہیں ۔ ایسی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے ۔ خالد بن ولید، صلاح الدین اور نپولین کا نام جنگی دنیا میں کیوں روشن ہے ۔ سپاہی تو ان کے بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ بہت سے پیش رفتہ اور پس آئندہ سپہ سالاروں کے لیکن کام ان سے وہ وہ لیئے گئے کہ دنیا آج تک مداح اور حیران ہے ۔ یہی حال آج کل کاروبار کا ہے ۔ یوں تو سینکڑوں مزدور اور ملازمین شریک کار ہوتے ہیں لیکن کامیابی اور سرسبزی ایک ہی دو نگران کاروں کی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے ۔ چاہے ان کی ذراسی غلطی اور لغزش سب کی کوشش خاک میں ملا دے ۔ چاہے ان کی پیش بینی اور عاقلانہ کوشش کاروبار کو آسمان پر چڑھا دے ۔ دوسرے مزدور اور راس کی نگرانی کیا ادنیٰ کام ہے ۔ وسیع الاثر معاشی تغیرات کا بغور مطالعہ کرنا اقتضائے وقت کو پہلے سے تاڑنا اور اس کا ساتھ دینا نہ صرف مروجہ ضروریات بہم پہنچانا بلکہ بذریعہ نئے اختراع و ایجاد سے جدید ضروریات رائج کرنا ۔ عمدگی تنظیم اور سائینس کی تحقیقات اور عام معلومات سے مدد لے کر مصارف پیدائش میں کفایات داخلی و خارجی نکالنا، نرخ گھٹا کر خریدار بڑھانا، یا مروجہ نرخ سے اعلیٰ منافع اُٹھانا ۔ غرضکہ ہروقت نہایت باخبر اور مستعد رہنا اور حریف کارخانوں سے دوڑ میں آگے بڑھنے کی کوشش برابر جاری رکھنا ۔ کیسے کیسے دشوار کام آجر کے ذمے آپڑے ہیں ۔ یہ جو یورپ اور امریکا کے کارخانوں اور کاروبار نے دنیا پر تسلط کر رکھا ہے کیا یہ محض حسن اتفاق کا نتیجہ ہے؟ نہیں، بلکہ علاوہ چند در چند معاشی اسباب کے آجروں کی کوشش بھی اس عالمگیر کامیابی کا خاص اور بہت بڑا باعث ہے ۔ حتیٰ کہ چند مشہور بنکوں اور کارخانوں کے ڈائرکٹر اور منیجر بلحاظ کارگزاری و ذمہ داری اعلیٰ سے اعلیٰ سلطنت کے وزیر اعظم اور پریسیڈنٹ کے ہم پلہ مانے جاتے ہیں ۔ انگلستان کی وزارت اور لندن بنک کی ڈائرکٹری

حصّہ سوم
باب چہاردہم

ان دونوں عہدوں میں کون زیادہ اہم ہے۔ اس پر اب تک اختلاف رائے موجود ہے۔ کسی گروہ طبقے کے کل افراد کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ تمام آجر ایسی ہی عظیم الشان کارگزاریاں دکھا سکیں۔ یہ تو معدودے چند ہی کا حصّہ ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے موافق وہ ایک خاص قسم کا ضروری اور کام سرانجام دے رہے ہیں جس میں قابلیت درکار ہے۔ گو یہ کام فی نفسہ ایک قسم کی محنت ہے لیکن بوجوہات مذکورہ بالا اس قدر اہم اور ممیّز ہو گیا ہے کہ عمل پیدائش دولت کا چوتھا جزو شمار ہو کر تنظیم کے جداگانہ نام سے موسوم ہوا۔

ٹھیٹھ آجر تو وہی ہے جو ہر سہ عاملین یکجا جمع کر کے دولت پیدا کرے۔ لیکن تاجر بنکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ ایسے لوگ جو کسی کاروبار کے نگراں ہوں اسی زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے کام بھی مذکورالصدر تنظیم کی صرف مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بیان کر دینا نہایت ضروری ہے کہ آجر کہلانے کے واسطے نہ صرف کاروبار کی نگرانی بلکہ براہ راست ذاتی نفع نقصان کا تعلق بھی لازمی ہے۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی تنخواہ دار منیجر کاروبار کا نگراں ہو تو وہ آجر نہیں شمار ہو سکتا۔ کیونکہ اگرچہ بحیثیت ملازم وہ بھی جوابدہ ہے اور کاروبار کی سرسبزی و تباہی کا اس کے مالی مفاد پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن اس کی ذمّہ داری اور تعلق اتنا قوی اور قریبی نہیں جتنا اس وقت ہوتا جبکہ وہ خود اپنی طرف سے کاروبار جاری کرتا اور اس کا خود نگراں بنتا۔ بحالت اوّل صرف تنزّل یا زیادہ سے زیادہ ترک ملازمت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بحالت دوم کاروبار کے کل نفع نقصان کا اثر براہ راست اس کی ذاتی حالت پر پڑتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ کسی کارخانے اور کاروبار کے تنخواہ دار ملازم اور منیجر اس قدر توجہ اور مستعدی سے نگرانی نہیں کر سکتے جتنا کہ خود مالک کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ آجر سے مراد وہ لوگ ہیں جو عاملین پیدائش کو یکجا کر کے اپنی ذاتی نگرانی اور ذمّہ داری میں ان سے دولت پیدا کریں۔ آجکل اکثر آجر زمین دراصل دوسروں سے کسی معاوضے پر مستعار لے لیتے ہیں اور بعض خود ہی

ان کے مالک ہوتے ہیں۔ آخر الذکر قسم کے آجر تو زمانۂ قدیم میں بھی موجود تھے لیکن پیدائش بر پیمانۂ کبیر، شغل اصل کے رواج اور عام معاشی ترقیات کی بدولت اوّل الذکر قسم کے آجروں کا گروہ اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے۔ اور چونکہ یہ زیادہ ہوتے ہیں نہ محض مزدور نہ اصلدار۔ اور پھر بھی پیدائش دولت کے واسطے ان کا کام ایک حد تک ناگزیر ہو گیا ہے لہذا عاملین کے مالکوں سے ان کا بحیثیت عاملین سے کام لینے والوں کے ایک جدا طبقہ بن گیا ہے اور ان کا ماحصل زائد بھی ایک خاص نام یعنی منافع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن چند روز سے آجروں کا حلقۂ عمل کچھ تنگ ہوتا جاتا ہے۔ خصوصاً جب سے انجمن سرمایۂ مشترک اور نئے آلات کار رواج پھیلا کاروبار کے اہتمام اور نگرانی میں تنخواہ دار منیجر آجروں کے قائم مقام بنتے جاتے ہیں علاوہ ازیں مشین کا استعمال جس قدر بڑھ رہا ہے۔ بہ نسبت سابق نگرانی کی ضرورت بھی گھٹتی جاتی ہے۔ جو کاروبار کمال کو پہنچ چکے ہیں اور جن کے چلانے کے طرز و طریق مقرر سے ہو گئے ہیں۔ وہ تنخواہ دار منیجر کے بھی سپرد کیے جا سکتے ہیں لیکن جن کاموں میں جدت، جرأت اور جانکاہی کی ضرورت ہے وہ آجر کے ہاتھ ہی سے سرسبز ہو سکتے ہیں، آجکل بھی آجر و تنخواہ دار منیجر کے درمیان کام تقسیم کرنے میں اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

منافع کی ماہیت

۲۔ تقسیم دولت کے دیگر مباحث کی مانند منافع کا مسئلہ بھی کچھ کم معرکۃ الآرا اور پیچیدہ نہیں، اوّل تو خود اس کا مفہوم غیر معین دوم اسکے اسباب تحقیق کرنے پر اب تک معدودے چند لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اور ایسے مسائل کی لازمی و قسمت ان کے عدم تعین کی خاصیت ہوتی ہے۔ انکے متعلق جو کچھ بیان کیا جائے زیادہ سے زیادہ وہ تقریباً صحیح ہو سکتا ہے کوئی بات قطعی طور پر کہنی محال ہے۔ ایسی صورت میں جسقدر اختلاف رائے ہو کم ہے۔ مستند تصانیف کے مطالعے اور ذاتی غور و خوض کے بعد منافع کی جو تشریح سب سے زیادہ اصولاً قرین عقل اور تشفی بخش نظر آئی وہ بیان کی جاتی ہے۔

سوم
باب دہم

منافع کا مفہوم اوّل ایک مثال سے واضح کر کے بعدہٗ اُسکے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ فرض کرو کہ کسی کارخانے کے سالانہ آمد و خرچ کا حساب حسبِ ذیل ہے:-

		روپیہ
قیمتِ پیداوار		۵۰۰۰۰
قیمتِ اشیائے خام مستعملہ	۲۵۰۰۰	
اجرتِ مزدوران	۹۰۰۰	
اصلِ مستعار کا سود	۴۰۰۰	
بشرطِ امکان دوسرے کی زمین کا کرایہ جو معاشی لگان سے زائد ہو	۲۰۰۰	
دوسروں کی رقمیں جو حسبِ تفصیلِ بالا اپنی جیب سے دی گئیں		۴۰۰۰۰
منافع خام		
اجرتِ تنظیم	۴۰۰۰	
کچھ ذاتی اصل ہے جس کا سود	۳۰۰۰	
کچھ زمین ذاتی ہے جس کا کرایہ زائد از معاشی لگان	۱۰۰۰	
اصلِ قائم کے مطالبات فرسودگی و خطر	۱۰۰۰	
جو رقمیں حسبِ تفصیلِ بالا اپنی جیب میں رہیں		۹۰۰۰
منافع خالص		۱۰۰۰

منافع خام

اس مثال میں بغرضِ جامعیت وہ تمام مدیں دکھائی گئی ہیں جو منافع کی بحث میں قابلِ توجہ ہو سکتی ہیں لیکن ہر ایک کارخانے کے حساب میں ان سب مدوں کی موجودگی لازمی نہیں۔ فرض کرو کہ کسی آجر کے پاس نہ ذاتی اصل ہو نہ زمین یعنی دونوں مستعار لے تو منافع خام میں سے صرف اجرتِ تنظیم اور اصلِ قائم کے مطالباتِ فرسودگی و خطر منہا کرنے کے بعد جو بچے وہ منافع خالص ہوگا۔ اسی طرح پر اگر کوئی آجر نہ سود پر اصل مستعار لے

نہ کرائے پر زمین یعنی دونوں اس کے ذاتی ہوں تو قیمتِ اشیا سے خام و اجرتِ مزدوران منہا کرنے کے بعد جو بچے وہ منافعِ خام ہوگا۔ اجرت، سود اور کرایۂ زمین مصارفِ پیدائش کی ان تین مدوں کو دو جزو میں منقسم کر کے ایک ایک کو منافعِ خام سے خارج اور باقی کو شامل شمار کرنے کی وجہ ایک تو حساب کتاب کی سہولت ہے۔ جو اجرت، سود یا کرایہ دوسروں کو ادا کرنا پڑتا ہے وہ تو مصارفِ پیدائش میں جداگانہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن جو اپنی ہی جیب میں رہتا ہے۔ اس کی ایسی باقاعدہ تفریق غیر ضروری سمجھ کر لوگ اسکو منافع شمار کر لیتے ہیں۔ مطالبات فرسودگی و خطرہ اگرچہ مصارفِ پیدائش کے ضروری جزو ہیں لیکن جب تک وہ آجر کی جیب سے نہیں نکلتے۔ منافع میں ملے جلے رہتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ منافع خام محض رواج کا نتیجہ ہے۔ علمی لحاظ سے اس کا کوئی وجود نہیں۔ اوّل تو منافع خام کے دو جزو یعنی اجرتِ تنظیم اور ذاتی اصل کے سود کا موازنہ اس اجرت و سود سے جو خارج از منافع ہے علمی غرض سے ضروری ہے۔ دوم منافع خام کاروباری مقابلے کا ایک کارگر آلہ ہے جس کی ہم ابھی مختصر تشریح کریں گے۔

اوّل اجرتِ تنظیم کو لیجئے۔ بحیثیتِ ملازم دوسروں کے کاروبار کی نگرانی واہتمام میں اس قدر تندہی و ذمہ داری درکار نہیں جتنی کہ ذاتی کاموں میں۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ آجر اپنے کاروبار کی ترقی میں جس قدر جانفشانی کرتا ہے تنخواہ دار منیجر ہرگز نہیں کرسکتا۔ ایسی محنت و ذمہ داری سے بچنے کے لئے اکثر لوگ کمتر شرحِ معین پر اپنا اصل قرض دے دینا اور دوسروں کے کارخانوں کی ملازمت کو آجر بننے کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ منیجر کو جو تنخواہ دینی پڑے یا جو تنخواہ خود آجر کو کسی دوسرے کارخانے میں بحیثیت منیجر مل سکے اس سے غالباً کچھ زیادہ اجرتِ تنظیم کے طور پر آجر وصول کرنے کی کوشش کریگا۔ یہی حال سود کا ہے۔ دوسروں کو اصل قرض دے کر اصل دار سود بشرحِ معین اطمینان سے وصول کرسکتا تھا۔ لیکن اپنے کاروبار میں لگانے سے اس کے سود کی شرح ہمیشہ غیر معین رہتی ہے

کبھی معمول سے زیادہ ملا تو کبھی کچھ نہیں، ایسی غیر اطمینانی حالت میں اجر مطالبات ضمانت بغیر جن سے قلت مقدار سود کی تلافی ہوتی رہنا یقینی ہو۔ بطور خود کاروبار میں اصل لگانا ہرگز پسند نہ کریگا اور بشرح معین سود پر دوسروں کو قرض دینا ہزار درجہ غنیمت سمجھیگا۔ لہذا ذاتی اصل کے سود کی شرح بھی بازاری شرح سے بقدر مطالبات ضمانت زیادہ مطلوب ہوگی۔ البتہ ذاتی زمین کے کرائے میں کوئی بیشی ضروری نہیں اور اصل ذاتی و مستعار کے مطالبات فرسودگی و خطر بھی یکساں ہونگے:

واضح ہو کہ اس بحث میں یہ لازم نہیں آتا کہ آجر کو ہمیشہ اجرت تنظیم اور ذاتی اصل کا سود بشرح اعلیٰ ہی ملتا ہے۔ بلکہ ایسا ہونا عجب نہیں کہ کاروبار جاری کرنے کے بعد نا موافق تغیرات کی بدولت معمولی شرح سے بھی کم وصول ہو۔ یہ آجر کی بڑی بدقسمتی ہوگی۔ لیکن وہ اکثر بے بس ہو جاتا ہے۔ فرض کرو کہ آجر ہزار ہا بلکہ لاکھوں روپے عمارت اور مشین میں لگا کر کارخانہ جاری کرے اور حالات نا مساعد اس کے کاروبار پر محیط ہو جائیں۔ اب اگر وہ کاروبار بالکل بند کردے تو جو کچھ منافع ملتا ہے وہ بھی نہ ملیگا اور سرا سر نقصان ہوگا اور اگر کاروبار فروخت کرے تو بحالت موجودہ قیمت نہایت ادنیٰ اٹھیگی لہذا کچھ مجبور ہو کر اور کچھ آئندہ اصلاح کی امید پر وہ کاروبار جاری رکھیگا اور بمصداق "گندم اگر بہم نرسد جو غنیمت است" تھوڑا بہت منافع جو کچھ بھی ملیگا۔ اسی پر قناعت کریگا۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر آجر کے کاروبار میں منافع کی گنجائش ہی بہت کم ہو یعنی زمین اور کُل اصل مستعار ہو تو کساد بازاری کا وہ بہت کم متحمل ہو سکیگا اور جلد تباہ ہو جائیگا پس جبکہ عملاً منافع میں شرح اُجرت و سود اسقدر تغیر پذیر ہو تو پھر ایسی شرح کا بازاری شرح سے اعلیٰ ہونا کیونکر ضروری بتایا جاتا ہے؟ اس سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ کن وجوہ پر کاروبار جاری کرتے وقت آجر لازماً اعلیٰ شرح کی امید باندھتا ہے اور بحالت کامیابی کس بنا پر اپنے آپ کو اعلیٰ شرح کا مستحق قرار دے سکتا ہے:

منافعِ خام کو مقابلے کا آلہ اس وجہ سے کہا گیا کہ چونکہ وہ آجر کی جیب میں جاتا ہے اور کسی دوسرے کو ادا نہیں کیا جاتا۔ چند روز اس سے دست بردار ہو کر ایسے حریف کو میدانِ مقابلہ سے بھگانا دشوار نہیں کہ جس کو منافعِ خام کا کچھ سہارا نہ ہو اور کل مصارفِ پیدائش اس کو جیب سے نقد ادا کرنے پڑیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ منافعِ خام بھی عرصے تک مقابلے کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ برس تک تو تلافی یا مستقبل کی امید پر منافعِ خام کو کوئی صبر کر سکتا ہے لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ سالہا سال کے واسطے کوئی اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ تو سراسر تباہی ہوگا مقابلہ جاری رکھ سکنے کی مدت کا دار و مدار بار مقابلہ اور مقدارِ منافع کی باہمی نسبت پر منحصر ہے۔ اگر مقابلے میں کم نقصان اٹھانا پڑے اور مقدارِ منافعِ خام کثیر ہو تو زیادہ عرصے تک مقابلہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کا جلد خاتمہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ ایسے مقابلے کا منتہا ہمیشہ حریف کی تباہی ہوتا ہے۔ دوران مقابلہ میں تخفیفِ نرخ سے خریداروں کو جو کچھ نفع ہو مقابلہ ختم ہونے کے بعد ممکن ہے کہ فتحیاب کارخانہ کچھ اجارے کے زعم میں جس کی وجہ سے مقابلہ کیا گیا اور کچھ نقصان مقابلے کی تلافی کرنے کے واسطے نرخ بڑھا کر خریداروں سے کل منافع تلف شدہ مع سود دام دام وصول کر لے، مقابلے اور اجارے سے ہم مبادلۂ دولت کے تحت میں مفصل بحث کریں گے۔ اس وقت منافعِ خام کا جداگانہ وجود تسلیم کرنے کی عملی سہولت اور علمی ضرورت واضح کرنے کے بعد منافعِ خالص پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جبکہ منافعِ خام کی مقدار غیر معین ہو اور اس میں بے حد تخفیف ہو سکتی ہو تو منافعِ خالص کا ملنا معلوم۔ چنانچہ اکثر معاشیین کا خیال ہے کہ مقابلے کے دباؤ سے نرخ گھٹتے گھٹتے مصارفِ پیدائش کے برابر آ چکا ہے۔ اور منافعِ خالص کی عام شرح صفر ہے لیکن علمی لحاظ سے یہ سوال نہایت قابلِ توجہ ہے کہ منافعِ خالص اگر کبھی نمودار ہو تو اول اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں، دوم کن کن حالتوں میں وہ آجر کو ہاتھ آتا ہے اور کب اُس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے؟

حصہ سوم
باب چہاردہم

تعین شرح اجرت وسود کی بحث میں اس سے قبل بالتفصیل سمجھایا جا چکا ہے کہ ہر دو شرح محنت و اصل کے جزو مختتم کی پیداوار کے مساوی ہوتی ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ جزو مختتم کے کل ماسبق جزوں کی پیداوار سے آجر کو کچھ ماحصل زائد ضرور ملتا ہے اور اس واقعے کی اس سے قبل لگان اجرت وسود کے تحت میں متواتر تشریح ہو چکی ہے جس کا اعادہ یہاں پر محض طوالت ہوگا۔ منافع خالص کی یہ مد تو کم و بیش جائز مانی جاتی ہے کیونکہ یہ ماحصل زائد تنظیم آجر کی بدولت پیدائش بر پیمانۂ کبیر سے حاصل ہوتا ہے اگر تنظیم نہ ہو اور مزدور جدا جدا بطور خود کام کریں تو غالباً یہ ماحصل زائد پیدا ہی نہ ہو بلکہ اگر موجودہ شرح سے بھی اجرت کم پڑے تو عجب نہیں۔ البتہ اگر مزدور خود مل جل کر کاروبار چلائیں جیسا کہ شراکت کے عنوان سے اجرت کے بیان میں واضح کیا جا چکا ہے تو یہ منافع پیدا ہوگا اور خود انھیں کی جیب میں رہے گا۔ لیکن بحالت موجودہ آجر ناگزیر ہے اور اس لیئے اگر وہ مذکورۂ بالا منافع خود اپنے ڈب میں رکھے تو چارہ نہیں اور اگر بطریق شراکت منافع کچھ مزدوروں کو بھی دے تو اس کا ہزار احسان اور لاکھ شکریہ۔ لیکن اگر آجر مزدوروں کی تہی دستی، غفلت و نااتفاقی اور اپنے قابو سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شرح اجرت محنت کی پیداوار مختتم سے بھی گھٹا دے تو ایسا منافع میں جو اضافہ ہو وہ سراسر بیجا ہوگا۔ اجرت میں اضافہ یا تخفیف جس پر مزدوروں یعنی نسل انسان کی سب سے بڑی جماعت کی حیات و ترقی کا دارومدار ہے۔ ازحد قابل توجہ ہے۔

اگر شرح اجرت پیداوار مختتم کی پابند ہے اور اس پابندی میں ایک عملی سہولت ضرور ہے تو آجر کو چاہیئے کہ شرح اجرت میں مزید تخفیف کرنے کے بجائے محنت کے ماحصل زائد کا ایک جزو اپنی طرف سے مزدوروں میں تقسیم کردے۔ چنانچہ شرکت منافع کے تحت میں اس تجویز کی تفصیل کی جا چکی ہے اور کہیں کہیں تجربۃً اس پر عملدرآمد بھی ہو رہا ہے اور آجر و مزدور دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے رہی شرح سود وہ بھی اصل کی پیداوار مختتم

کے مساوی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس سے کچھ کم ہو سکے تو ایسی تخفیف صرف اضافۂ اصل کی رفتار گھٹانے کی وجہ سے قابلِ توجہ ہے اور بس۔ مزید براں واقعات شاہد ہیں کہ معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ پس اندازی کی قابلیت و عادت بڑھنے سے اصل کا اضافہ سود کے لالچ سے روز بروز مستغنی ہوتا جاتا ہے۔ گویا تخفیفِ اجرت کے برعکس تخفیفِ شرحِ سود سے کسی بڑی مضرت کا اندیشہ نہیں۔ اور منافع خالص کا جو حصہ پیداوارِ اصل کے ماحصل زائد سے مرکب ہو وہ معاشی لحاظ سے قطعاً بے ضرر اور ناقابلِ اعتراض ہے۔

اوپر کی کل بحث سے مترشح ہوتا ہے کہ ہم کاروباری دنیا کو دیرپا سکون فرض کر کے تمام اسبابِ زیرِ بحث کا تعین قرار دے رہے ہیں اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل تو ایسے مفروضات کے بغیر کسی معاشی مسئلے کی تحقیق محال ہے۔ دوم کاروبار کے روزانہ، ماہانہ اور سالانہ تغیرات نظر انداز کر کے جب ہم کسی طویل زمانے مثلاً چالیس پچاس سال پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی حد تک سکونِ تعین کے مفروضات ضرور قرینِ حقیقت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جلد جلد جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ بھی اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلافِ امید کبھی کاروبار کی حالت ایسی ابتر ہو جاتی ہے کہ منافع خام تک غائب ہو جاتا ہے۔ اور کبھی گرم بازاری کا یہ زور بندھتا ہے کہ منافع خام سے بڑھ کر منافع خالص نمودار ہونے لگتا ہے۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ منافع خالص اگر نمودار بھی ہو تو آجر کے ہاتھ کب آ سکتا ہے؟ اس وقت جبکہ آجر کو کسی نہ کسی شکل پر اجارہ حاصل ہو یعنی صرف وہی۔ یا چند اور آجر بھی کوئی کاروبار چلائیں لیکن باہمی اتفاق سے پیداوار کی حسبِ دلخواہ قیمت مقرر کریں۔ ایسی حالت میں مصارفِ پیدائش کی کل مدیں قیمت میں شامل کر کے اصل و محنت کی پیداوار کا ماحصل زائد یعنی منافع خالص بچا سکیں گے۔ بلکہ مصارفِ پیدائش سے بھی قیمت بڑھا کر اگر منافع خالص میں اضافہ کر لیں تو عجب نہیں، لیکن واضح ہو کہ ایسا اضافہ

از حد مذموم اور عوام کے حق میں مضر ہوگا۔ علاوہ بیش قیمت مصنوعات کے جنکی خریدار دولتمندوں کی مختصر جماعت ہوتی ہے۔ مایحتاج زندگی کی ارزانی و گرانی کا اثر کل لوگوں پر پڑتا ہے جنکی تعداد کثیر مزدوری پیشہ ہے اور جن میں سے اکثر غریب اور بہت سے متوسط الحال ہیں پس آجروں کا باہمی اتفاق کرکے اضافہ منافع کی ہوس میں بیجا طور پر مصارف پیدائش سے زیادہ قیمت بڑھانا جبر و تعدی نہیں تو اور کیا ہے۔ بہرحال اگر بیشی قیمت سے منافع میں ایسا اضافہ نہ بھی کیا جاوے تو بحالت اجارہ منافع خالص جو اصل محنت کی پیداوار کے ماحصل زائد سے نمودار ہو باسانی اپنی جیب میں رکھا جاسکتا ہے اسکے برعکس اگر آجروں میں مقابلہ ہو تو ہر ایک اپنے کارخانے کی بکری بڑھانے اور حریف کو زک دینے کی غرض سے قیمت میں یہاں تک تخفیف کریگا کہ اگر منافع خالص نمودار ہوا بھی ہوگا تو تخفیف کی نذر ہو جائیگا اور قیمت مصارف پیدائش کی سطح پر آرہیگی۔ آجر منافع خام پر قناعت کریگا۔ بلکہ مقابلے کے جوش میں بخوشی اسے بھی تخفیف کے ریلے میں بہا دے تو عجب نہیں۔ چونکہ آجکل مقابلے کا زور شور خیال کیا جاتا ہے۔ لہذا شرح منافع خالص محض صفر قرار دیجاتی ہے۔
المختصر منافع کا مفہوم اس کی دو قسمیں اور منافع خالص نمودار ہونے اور آجر کے قبضے میں آنے کی صورتیں یہ سب نکات حتی الوسع سلیس طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن فی نفسہ منافع کے مفہوم اور ماہیت پر اس قدر جزوی اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ مبتدی حیران رہ جاتا ہے۔

منافع

۴۔ اگرچہ اصل مستعار کا سود منافع سے خارج ہوتا ہے لیکن عام قاعدہ ہے کہ منافع کی شرح اس کل اصل کی نسبت سے شمار کی جاتی ہے جو کاروبار میں صرف ہو خواہ وہ اصل مستعار ہو یا ذاتی یا ہر دو قسم کا مثلاً اگر اصل کی مقدار ایک لاکھ ہو اور منافع کی پانچ ہزار تو شرح منافع ۵ فی صدی شمار ہوگا۔
ذاتی اصل و زمین کا سود اور کرایہ اور اجرت تنظیم تو ایک خاص شرح سے تجاوز نہیں کرسکتی، منافع خالص کی بھی ایک حد ہے کہ جو کاروبار میں ایک بلکہ

حصہ دوم
باب چہاردہم

نصف فی صدی سے لے کر سو اور دو سو فی صدی تک شرح منافع میں حیرت انگیز فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے درحقیقت دو باعث ہیں۔ اول اُجرت تنظیم اور مقدار اصل کی باہمی نسبت، دوم اصل کا مستعار ہونا۔ فرض کرو ایک شخص بذریعۂ ملازمت سو روپے ماہوار کما سکتا ہے۔ اب اگر وہ بشرط امکان کوئی ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ شغل اصل کی گنجائش ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ جب اس کا گزارہ اسی کاروبار پر ٹھیرا تو علاوہ سود اصل وہ سو روپے ماہوار کی اجرت بھی اسی کاروبار کے منافع سے نکالیگا (اس حالت میں علاوہ سود صرف اُجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے ۱۲۰ فی صدی پڑیگی۔ اب اگر شرح سود ۵ فی صدی ہو اور اصل ذاتی ہو تو شرح منافع ۱۲۵ فی صدی ہو جائیگی اور اگر اصل مستعار ہے تو سود منافع میں شمار نہ ہوگا اور شرح منافع ۱۲۰ پر قرار رہیگی اور اگر کچھ منافع خالص ہو تو اس کے شامل ہونے کے بعد منافع خام کی شرح اور بھی بڑھ جائیگی) مشہور بات ہے کہ قصبات کے بساطی، عطار، تنبولی اور پنساری ایسے دکاندار جو صبح سے شام تک دو دو چار چار پیسے کا بمشکل سودا فروخت کر کے بمشکل چند روپے روز کا کاروبار چلاتے ہیں تھوک فروشی کے نرخ کے مقابلے میں بھی بہت زیادہ قیمت وصول کر لیتے ہیں اور کہنے کو شرح منافع بھی بہت اعلیٰ پاتے ہیں۔ لیکن ایسا ہونا نہ کچھ عجیب نہ کاروبار والوں کے حق میں خاص طور پر مفید۔ ان کو درحقیقت منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہے شرح خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اور اوپر کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود شرح اس قدر اعلیٰ ہونے کے مقدار منافع معمول سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ حلوائی نان بائی بقال ایسے خردہ فروشوں کی دکانیں اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں تو ہر ایک دکان کی مقدار فروخت گھٹنے سے نرخ اشیا بڑھ جاویگا اور باوجود اضافۂ شرح اگر مقدار منافع میں تخفیف ہو جائے تو عجب نہیں۔ دکانداروں کے باہمی مقابلے کا نتیجہ بالعموم تو تخفیف نرخ ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں خود مقابلہ اضافۂ نرخ کا باعث بن جاتا ہے۔ مقابلے کے اس خلاف توقع خاصے کے سبب

مبادلۂ دولت کے تحت میں مفصل بحث کریں گے جو چیزیں قیمتی ہوں اور بآسانی تھوک فروشوں سے منگائی جاسکیں ان کی قیمت میں تو اضافہ دشوار ہے اور نہ ایسی چیزوں کی تجارت میں خردہ فروشی سرسبز ہوسکتی ہے لیکن جو چیزیں کم قیمت ہوں یا بآسانی باہر سے نہ منگائی جاسکیں انکی تجارت میں چھوٹے چھوٹے دکانداروں کی بن آتی ہے۔ خریدار یا تو بوجہ قلت مقدار اضافہ قیمت کی پرواہ نہیں کرتے یا بوجہ مجبوری اس کو گوارا کرتے ہیں ایسی صورت میں خردہ فروشوں کی دکانیں جس قدر بڑھیں گی قیمت بھی چڑھیگی اور گو فرداً فرداً بوجہ قلت مقدار اضافہ محسوس نہ ہو لیکن بحیثیت مجموعی خریدار ضرور زیربار ہوں گے۔ اس توضیح کی روشنی میں اب صاف معلوم ہو جائیگا کہ بعض تجارتوں میں خردہ فروشی اس قدر کیوں مروج ہے اور بعض میں بہت کم اور کسی کاروبار میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کی شرکت کس طرح پیشہ کار اور عوام دونوں کے حق میں یکساں مضر ہے؛

مذکور الصدر مثال کے مقابلے میں فرض کرو جو شخص سو روپے ماہوار کی ملازمت پا سکتا ہے ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ۲۴ ہزار روپے سالانہ شغل اصل کی گنجائش ہو اس میں بھی وہ سو روپے ماہوار کاروبار کے منافع میں سے نکالیگا۔ لیکن اسی اجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے مثال اول الذکر میں ۱۲۰ فی صدی قرار پائی تھی اور یہاں صرف ۵ فی صدی شرح میں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن مقدار مجموعی وہی ایک ہے یعنی ۱۰۰ روپے ماہوار یا ۱۲۰۰ روپے سالانہ اور آجر کے حق میں نتیجہ یکساں۔ نیز فرض کرو کہ شرح سود ۵ فیصدی ہے۔ اب اگر اصل مستعار ہے تو منافع جسمیں صرف اجرت تنظیم شامل ہے ۵ فی صدی رہیگا اور اگر ذاتی ہے۔ تو سود بھی شامل منافع ہوکر شرح تا مقدار ۱۰ فی صدی بڑھا دیگا۔ منافع خالص اس کے علاوہ رہا۔

چھوٹے چھوٹے کاروبار تو ذاتی سرمائے سے چلتے ہیں۔ لیکن آجکل کے بڑے بڑے کارخانوں میں اور تجارتوں میں بالعموم کروڑہا روپے قیمتی اصل قرض لے کر لگاتے ہیں بالفاظ دیگر کبھی سود جزو منافع شمار ہوتا ہے کبھی

حصہ سوم
باب چہاردہم

نہیں ہوتا۔ ہر دو مذکورۂ بالا مثالوں پر غور کرنے سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ بالعموم بڑے کاروباروں میں بمقابلہ چھوٹوں کے شرحِ منافع کیوں ادنیٰ ہوتی ہے، شرح میں اس قدر فرق کیونکر ممکن ہے اور وہ کس طرح پر اجرتِ تنظیم اور اصل کی باہمی نسبت اور نیز اصل کے ذاتی یا مستعار ہونے سے متعلق ہے۔

اسی سلسلے میں اس نکتے کا بیان بھی ضروری ہے کہ آجر کو تو منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہے شرح جو دیگر اسباب پر منحصر ہے خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ لیکن عوام یعنی خریداروں کا حال مختلف ہے۔ اصل ذاتی یا مستعار ہونے کے مطابق سود کے شامل یا خارج ہونے سے جو بیشی و کمی شرحِ منافع میں نمودار ہو اس کا نرخِ اشیا پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اسی لئے وہ خریداروں کے حق میں مفید نہ مضر۔ اس کے برعکس اگر اجرتِ تنظیم اور مقدارِ اصل کے موافق نسبت سے شرح میں تخفیف یا اضافہ ہو تو اس کا اثر بذریعۂ ارزانی و گرانی نرخِ اشیا عوام کے مالی مفاد پر اچھا خاصہ پڑیگا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یوں تو اصل کی نسبت سے شرحِ منافع فی صدی سالانہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن شرح کی ایک اور قسم بھی قرار دی گئی ہے جو عملی لحاظ سے بہت قابلِ توجہ ہے، اصل قائم تو عرصۂ دراز تک عمل پیدائش سر انجام دے کر بشکل مطالباتِ فرسودگی قسط وار واپس آسکتا ہے۔ لیکن اصل دائر جلد جلد بشکل قیمتِ پیداوار وصول ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر کسی کاروبار میں اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہو اور وہ تیزی سے گھومتا رہے تو فی گردش شرحِ منافع ادنیٰ ہونے پر شرحِ سالانہ اعلیٰ ہونی ممکن ہے۔ اور مقدارِ منافع بھی بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۲۰ ہزار کا مال صرف ایک فی صدی منافع پر ہر مہینے ارزاں فروخت کرتا رہے تو گو شرحِ منافع فی گردش نہایت ادنیٰ ہے شرحِ سالانہ ۱۲ فی صدی آپڑیگی۔ اور مقدارِ منافع جو اصل مقصود ہے ۲۰۰ روپے ماہوار یا ۲۴۰۰ روپے سال ہوگی۔ اس کے برعکس اگر کوئی کوتہ نظر تاجر زیادہ منافع کی ہوس میں صرف ۵ ہزار کا مال ۲ فی صدی کے منافع سے سال میں صرف دو مرتبہ فروخت کرے

تو گو شرح منافع فی گردش ۳ فی صدی نظر آئے لیکن شرح سالانہ صرف ۶ فیصدی ہوگی اور مقدار منافع صرف ۲۵ روپئے ماہوار یا ۳۰۰ روپئے سالانہ۔ شرح فی گردش، شرح سالانہ اور مقدار منافع کے مذکورۂ بالا تعلق سے ایک نہایت اہم اصول تحقیق ہوتا ہے، کاروبار میں کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قیمت گھٹا گھٹا کر بہت بہت سا مال جلد جلد اس طرح پر فروخت کرے کہ نہایت ادنیٰ شرح فی گردش سے نہ صرف اعلیٰ شرح سالانہ ملے بلکہ منافع کی بڑی سے بڑی مقدار ہاتھ آئے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کے کارخانے سال میں کئی بار ½ بلکہ ¼ فی صدی منافع فی گردش کی شرح سے کروڑہا روپے کا قیمتی سامان فروخت کرکے لاکھوں روپئے منافع اٹھا رہے ہیں لیکن معاشی پسماندگی اور ناواقفیت کی بدولت ہمارے اکثر ہموطن کاروباری لوگ اس کے بالکل برعکس کوشاں رہتے ہیں یعنی شرح فی گردش اس قدر اعلیٰ چاہتے ہیں کہ بوجہ تاخیر فروخت شرح سالانہ بہت ادنیٰ رہ جاتی ہے اور بوجہ قلت فروخت مقدار منافع اور بھی کچھ نہیں رہتی۔ گویا خود اپنے ہاتھوں اپنے پیر میں کلہاڑی مار لیتے ہیں، خریداروں کی آگاہی کیواسطے قیمت نقد کا نوٹس تو اکثر جلی حروف میں دکان پر آویزاں رہتا ہے لیکن کیا اچھا ہو کہ "منافع کم" کا زرّیں اصول دکاندار اپنے دلوں پر نقش کرلیں، البتہ جہاں کمی منافع سے اضافۂ فروخت کی گنجائش نہ ہو وہاں تخفیف سے سراسر نقصان ہوگا۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے بالعموم تخفیف منافع سے ارزانی زر[illegible] لنے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

صاف ظاہر ہے کہ منافع کی شرح فی گردش بحوالہ اصل دائر شمار کیجاتی ہے اس شرح کا تجارت میں اس وجہ سے خاص طور پر رواج ہے کہ اسمیں اصل کی بیشتر مقدار بشکل دائر ہوتی ہے، چنانچہ تجارت کا مشہور گر منافع کم اور بکری زیادہ اسی شرح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ رہی صنعت وحرفت اگرچہ اس میں اصل کی بڑی مقدار بشکل قائم ہوتی ہے لیکن تاہم شرح منافع فی گردش بحوالہ سپید اور اس میں بھی قرار پا سکتی ہے اور پاتی ہے۔

باب پانزدہم
ترکیب عاملین پیدائش

(۱) تقسیم دولت کا خلاصہ (۲) قانون تقلیل و تکثیر و استقرار حاصل کا تعلق (۳) ترکیبِ عاملین کا اصول (۴) تنظیم کا ہر سہ عاملین سے تعلق (۵) ضروری نتائج۔

تقسیم دولت کا خلاصہ

۱۔ ہر سہ عاملینِ پیدائش زمین، محنت و اصل اور نیز محنت کی ایک خاص الخاص قسم تنظیم جس کی حیثیت کم و بیش ایک جداگانہ عاملِ پیدائش کی ہوگئی ہے۔ جو کچھ پیدائشِ دولت میں حصہ لیتے ہیں اور اُن کی کارگزاری کا جو معاوضہ ملتا ہے اس سے پہلے لگان۔ اجرت سود اور منافع کے تحت میں مفصل بیان کیا جاچکا ہے۔ یہاں یہ تحقیق درپیش ہے کہ آیا ان عاملین کے مل کر کام کرنے کا کوئی اُصول بھی ہے اور اگر ہے تو کیا۔ اس غرض کیلئے ہم اول ہر سہ قوانینِ پیدائش یعنی قانونِ تقلیل و تکثیر و استقرارِ حاصل کے مفہوم اور باہمی تعلق کی تشریح کرکے عملِ پیدائش میں عاملین کی ترکیب مذکورالصدر قوانین سے متعلق ثابت کریں گے۔ ان کے علاوہ اور چند ضروری نتائج بھی اخذ کئے جائیں گے۔ پس موجودہ بیان کو تقسیم دولت کے کل مذکورالصدر مباحث کا خلاصہ اور لبِّ لباب سمجھنا چاہیئے۔

۲۔ زراعت کی بحث میں قانونِ تقلیل حاصل کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر واضح کریں گے اس قانون کا عملدرآمد پیدائش کے کل شعبوں میں عام ہے اور زراعت تک محدود نہیں۔ اس قانون سے مراد یہ ہے کہ کسی کھیت میں محنت و اصل کے جزے بڑھانے

شروع کرو۔ اگر ابتک بہ حد کافی جرعے مستعمل تھے تو چند جدید جرعوں کی پیداوار سابق جرعوں کی پیداوار سے نسبتۃً زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے اور اس حد تک زراعت قانونِ تکثیر حاصل کے تابع کہلائیگی۔ لیکن جرعے بڑھاتے بڑھاتے بالآخر ایک ایسا جرعہ آئیگا کہ اُس کے مابعد جرعوں کی پیداوار نسبتۃً گھٹتی چلی جاویگی۔ گویا قانونِ تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوگا۔ ایک مثال لو۔ بغرض سہولت ہم اول محنت و اصل کے جرعوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے فرض کرو کہ دس بیگھے زمین میں صرف ایک جرعہ لگایا جائے غالباً کچھ بھی پیدا ہوسکیگا اور جرعہ بھی اکارت جائیگا ۵ جرعوں سے کچھ تھوڑا بہت پیدا ہوگا۔ غالباً ۱۰ جرعوں کی پیداوار ۵ کی دوگنی سے بھی زیادہ ہوگی اور اگر ۴۰ جرعوں کی پیداوار ۵ کی چوگنی یا دس کی دوگنی سے بھی زیادہ ہو تو عجب نہیں لیکن جدید جرعوں کی پیداوار میں اضافۂ نسبتی کی بھی ایک حد ہے۔ غالباً چالیس جرعوں کی پیداوار بیس کی پیداوار سے دوگنی نہ ہوسکیگی۔ ۶۰ جرعوں کی پیداوار بیس کی سے تقریباً سہ گنی رہیگی اور ۲۰۰ جرعوں کی پیداوار تو ۲۰ کی دس گنی سے بہت ہی کم غالباً ۶-۷ گنی ہوگی۔ ایسی حالت میں ۲۰ جرعوں تک تو قانونِ تکثیر حاصل کا اور بعدہٗ قانونِ تقلیل حاصل کا عملدرآمد شمار ہوگا۔ دس بیگھے زمین اور ۲۰ جرعوں کی نسبت جس کے بعد ہی قانونِ تقلیل حاصل کا عمل نمودار ہوتا ہے اصطلاحاً نسبت اعلیٰ کہلائیگی؀

واضح ہو کہ اگرچہ قانونِ تقلیل حاصل کا ذکر بیشتر زراعت کے بیان میں آیا ہے اس کا عمل زراعت سے مخصوص نہیں۔ بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت بھی یکساں اس کے تابع ہیں جس طرح پر کہ کسی کھیت میں واصل کے جرعوں کی ایک محدود تعداد استعمال کی جاسکتی ہے اور نسبتِ اعلیٰ سے تجاوز کرنے کا نتیجہ مزید ماحصل میں نسبتۃً بیش از بیش تخفیف ہوتا ہے بعینہٖ صنعت و حرفت اور تجارت میں کسی قطعۂ اراضی پر محنت و اصل کے لاتعداد جرعے فراہم نہیں کیئے جاسکتے، ایک کارخانے یا دکان میں جس قدر آلات و مزدور سے کام لیا جاسکے اس کی مقدار کم و بیش معین ہے

اور مزید اضافے کی حالت میں قانونِ تقلیل حاصل کا عملدرآمد یقینی ہے۔ فرق ہے تو صرف اس قدر کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت اور تجارت میں محنت و اصل کے بہت زیادہ جرعے ایک ہی رقبۂ زمین پر کام کر سکتے ہیں لیکن ایسا فرق تو خود زراعت میں بھی بلحاظِ فصل کم و بیش موجود ہے بعض چیزوں مثلاً تمباکو، آلو اور نیشکر کی کاشت میں بمقابلہ جوار، باجرا، مکا جیسی فصلوں کی کاشت کے کہیں زیادہ جرعے لگتے ہیں، علیٰ ہذا کم و بیش جرعے استعمال ہو سکنے کی گنجائش کا فرق صنعت و تجارت میں بھی عام ہے مثلاً غلہ و آہن کے مقابل موتی جواہرات اور چاندی سونے کی تجارت میں ایک ہی قطعۂ زمین پر صد ہا گنا زیادہ اصل کے جرعے فراہم ہوتے ہیں۔ یہی حال بیش قیمت کلوں والے کارخانوں کا ہے۔ علیٰ ہذا بمقابلہ جلاہوں یا رنگریزوں کے بہت زیادہ موچی یا زرگر ایک ہی کارخانے میں مل کر کام کر سکتے ہیں یعنی کام کے مطابق ایک ہی قطعۂ اراضی پر محنت کے جرعوں کی بھی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ لیکن جرعوں کی مقدار کا عاملین کی باہمی نسبت پر اثر پڑتا ہے، قانونِ تقلیل حاصل کے عملدرآمد میں جرعوں کی کمی بیشی کی طرح حارج نہیں ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ عاملین کی باہمی نسبت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور جیسا کہ ابھی بتا چکے ہیں ہر شعبۂ پیدائش میں ان کی نسبتِ اعلیٰ ضرور مختلف ہو گی لیکن قانونِ تقلیل حاصل کا عملدرآمد پیدائش کے کل شعبوں پر مسلط ہے۔ اب تک ہم نے زمین کا ایک مقررہ قطعہ لے کر باقی دو عاملین یعنی محنت و اصل کو قانونِ تقلیل حاصل کا پابند ثابت کیا۔ لیکن اگر محنت و اصل کے جرعوں کی مقدار معین فرض کر لی جائے تو زمین بھی اسی طرح مذکورالصدر قانون کے تابع نظر آئیگی۔ فرض کرو کہ عاملین نسبت اعلیٰ حسبِ ذیل ہے:-

الف بیگہ زمین اور ب جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی

لہٰذا ذیل میں چونکہ نسبتِ اعلیٰ میں تغیر ہو گیا۔

الف بیگہ زمین اور ب ل جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار ی سے بلحاظِ کمی ل سے کم

حصہ سوم
باب پانزدہم

مگر ذیل میں چونکہ نسبتِ اعلیٰ برقرار ہے :-

الف ل بگیہ زمین اور ب ل جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی ل

آخری دو مثالوں کے مقابلے سے واضح ہوگا کہ جبکہ مقدارِ جرعہ یکساں ب ل ہو اور زمین الف بگیہ سے بڑھ کر الف ل بگیہ ہو جائے تو پیداوار میں ی سے زیادہ اور ی ل سے کم کوئی مقدار بڑھ کر ی ل ہو جائیگی۔ پس چوتھا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر مطابق نسبتِ اعلیٰ :-

الف بگیہ زمین اور ب جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی

تو :-

الف ل بگیہ زمین اور ب جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم گویا جس طرح کہ محنت و اصل کے جرعے ایک قطعۂ اراضی پر نسبتِ اعلیٰ کے بعد قانونِ تقلیل حاصل کی متابعت کرتے ہیں بعینہ زمین کے جرعے بھی محنت و اصل کے معین جرعوں کیساتھ نسبتِ اعلیٰ کے بعد اسی قانون کے پیرو بن جاتے ہیں محنت و اصل کی طرح زمین کے جرعوں کا پابند قانون تقلیل حاصل ہونا ہم ایک دوسری مثال سے بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک دس بیگے والے کھیت میں اضافہ جرعوں کا نتیجہ حسبِ ذیل ہے۔

جرعے	مقدارِ پیداوار
ا	×
۵	۵۰ من
۱۰	۱۵۰ من
۱۵	۲۷۰ من
۲۰	۳۸۰ من
۲۵	۴۵۰ من

۲۰ جرعوں کی دس بیگے زمین میں پیداوار ۳۸۰ من اور اوسط پیداوار

حصۂ سوم
باب پانزدہم

فی بیگہ ۳۰ من ہے اب اگر ۲۵ جرعے ۱۲½ بیگے زمین میں لگائے جائیں تو چونکہ ۲۰ جرعے اور دس بیگے کھیت اور ۲۵ جرعے اور ۱۲½ بیگے کھیت میں نسبت یکساں ۲ اور ۱ کی ہے دونوں حالتوں میں اوسط پیداوار فی بیگہ برابر ہوگا۔ اور وہ اوسط جبکہ ۲۰ جرعے اور دس بیگے کی پیداوار ۳۰۰ من ہے ۳۰ من فی بیگہ ہوا۔ لہٰذا ۲۵ جرعے اور ۱۲½ بیگے کی پیداوار ۳۷۵ من ہوگی لیکن ۲۵ جرعوں اور ۱۰ بیگے کی پیداوار ۳۵۰ من ہے لہٰذا جدید ۲½ بیگے کی پیداوار صرف ۲۵ من ہے۔ گویا جبکہ مقدار جرعہ وہی ۲۵ رہے سابق ۱۰ بیگوں کا اوسط پیداوار ۳۵ من اور جدید ۲½ بیگے کا صرف ۱۰ من بیگہ ہے گویا محنت و اصل کی مانند زمین کے جرعے بھی قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں؛

اب تک ہم نے بغرض سہولت جرعوں میں محنت و اصل کو یکجا شمار کیا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں عامل جدا جدا بھی قانون مذکور کے اسطرح پابند ہیں۔ مثلاً اگر کاشت میں صرف محنت یا صرف اصل کے جرعے بڑھائے جائیں۔ تب بھی قانون تقلیل حاصل کا عمل نمودار ہوگا۔ پس جبکہ ہر عامل اس قانون کا تابع ٹھیرا تو قانون مذکور کا ماحصل یہ نکلا کہ عمل پیدائش میں جبکہ عاملین کے باہم نسبت اعلیٰ قرار پائی جائے ان میں سے کسی ایک یا دو کو بحال رکھ کر اور باقی دو ایک میں اضافہ کرکے نسبت اعلیٰ متغیر کردی جائے تو جدید جرعوں اور ان کی مزید پیداوار کی نسبت بمقابلہ سابق جرعوں اور اُن کی پیداوار کے ادنیٰ ہوگی؛

حاصل کلام یہ کہ اگر نسبت اعلیٰ کے مطابق:۔

الف زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار = ی

تقلیل و قانون تکثیر و استقرار حاصل کا تعلق

تو:۔

الف ل زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار
الف زمین ب ل محنت اور ج اصل کی پیداوار
الف زمین ب محنت اور ج ل اصل کی پیداوار } ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم

الف ل زمین ب ل محنت اور ج اصل کی پیداوار
الف زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار
الف ل زمین ب محنت اور ج ل اصل کی پیداوار

اوپر کی کل بحث سے ایک نتیجہ خیز واسطے کا پتہ چلتا ہے کہ عمل پیدائش میں اگرچہ ہر سہ عاملین مختلف نسبتوں سے مل کر کام کر سکتے ہیں لیکن ان سب میں کوئی نسبت بلحاظ نسبت پیداوار بطور حد فاصل واقع ہوتی ہے۔ اگر عاملین میں سے کسی ایک یا دو میں تخفیف یا اضافہ کر کے نسبت رد و بدل کر دی جائے تو قانون تقلیل حاصل کے عمل جاری ہونے سے پیداوار میں باقی جزوں کی پیداوار سے نسبتہً کمتر اضافہ ہوگا۔ نیز یہ بھی تحقیق ہوا کہ ہر عامل کی پیدا آوری سب کی باہمی نسبت پر منحصر ہے۔ جداگانہ معین نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا پیداوار کی نسبت بھی عاملین کی باہمی نسبت کے ساتھ ساتھ تبدل ہوتی رہتی ہے اس کو کسی عامل سے نسبت مستقیم حاصل نہیں۔

۴۔ قانون تقلیل حاصل کی جداگانہ تشریح کے بعد اب ہم اس کا باقی دو قانون تکثیر و استقرار حاصل سے تعلق دکھانا چاہتے ہیں۔ فرض کرو کہ نسبت اعلیٰ کے مطابق :-

الف زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار = ی

اب اگر ان کل عاملین میں برابر اضافہ کیا جائے مثلاً دوگنا سہ گنا۔ چہار گنا تاکہ صرف مقدار بڑھ جائے اور نسبت اعلیٰ برقرار رہے تو دو نتیجے ممکن ہیں :-

الف ل زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار = ی ل
یا
ی ل سے زیادہ

نتیجۂ اول جو بالعموم زراعت میں نمودار ہوتا ہے قانون استقرار حاصل کہلاتا ہے یعنی اگر نسبت صحیح یا اعلیٰ برقرار رکھتے ہوئے صرف عاملین کی مقدار بڑھائی جائے۔ تو پیداوار بھی اسی نسبت سے بڑھیگی۔ اور بہر صورت جزوں اور پیداوار میں ایک ہی نسبت قائم رہیگی۔

نتیجہ وہ ہے جس کو قانون تکثیر حاصل کہتے ہیں عموماً صنعت وحرفت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے اسباب آئمال شین و تقسیم کار اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے تحت میں ذرا واضح کر چکے ہیں۔ اس کا ما حصل یہی ہے کہ ہر عامل کی مقدار جس قدر بڑھیگی مزید پیداوار ما سبق جزوں کی پیداوار کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ بڑھیگی۔

پس صاف ظاہر ہے کہ قانون تقلیل حاصل عاملین کی نسبت سے متعلق ہے اور قانون استقرار و تکثیر حاصل عاملین کی مقدار سے۔ یہاں یہ نکتہ جتانا ضروری ہے کہ قانون استقرار حاصل میں تو سابق نسبت اعلیٰ برابر قائم رہتی ہے۔ صرف عاملین کی مقداریں بیشی ہوتی ہے لیکن قانون تکثیر حاصل میں علاوہ اضافۂ مقدار عاملین اُن کی سابق نسبت اعلیٰ میں بھی ردوبدل ہونا ممکن بلکہ اغلب ہے۔ مثلاً

الف زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار = ی

اب اگر پیدائش قانون تکثیر حاصل کی پابند ہو تو

الف ل زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار = ی ل سے زیادہ ہوگا۔

الف ل زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار سے کچھ کم = ی ل

آخری نتیجے پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ بحالت قانون تقلیل حاصل بحالت قانون تکثیر حاصل سابق نسبت اعلیٰ میں جو ردوبدل ہوتا ہے انمیں ایک بیّن فرق ہے وہ یہ کہ قانون تقلیل حاصل میں جو نسبت بدلتی ہے وہ صرف ایک یا دو عامل کے اضافے سے لیکن قانون تکثیر حاصل میں جو نسبت بدلیگی وہ ہر سہ عاملین کے کم و بیش اضافے سے۔ یہاں یہ نکتہ بھی جتانا ضروری ہے کہ کبھی صرف ایک یا دو عامل کے اضافے سے نسبت بدلنے کے باوجود بھی قانون تکثیر حاصل نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ کاشت میں اس کی مثال بیان ہو چکی ہے اس کے قیام کے بعد اگر قانون تکثیر حاصل ظہور پذیر ہوگا تو ہر سہ عاملین کے اضافے سے خواہ سابق نسبت اعلیٰ برقرار رہے یا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے متبدل ہو جائے۔

حصۂ سوم
باب پانزدہم

حاصل کلام یہ کہ نسبت اعلیٰ قائم ہونے سے قبل تو صرف ایک یا دو عامل کا اضافہ بھی قانون تکثیر حاصل نمایاں کر سکتا ہے لیکن ایسی نسبت قائم ہو جانے کے بعد صرف ایک۔ یا دو عامل کے اضافے سے قانون تقلیل حاصل نمودار ہوگا۔ لیکن ہر سہ عامل کے اضافے سے قانون تکثیر حاصل پیدا ہو سکتا ہے اور عاملین کی جدید مقدار کی نسبت سابق نسبت اعلیٰ سے مختلف ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ لیکن جدید نسبت میں بھی ایک ایسی نسبت اعلیٰ قرار پا سکتی ہے جب سابق محض ایک یا دو عامل کے اضافے سے اب بھی ویسے ہی قانون تقلیل حاصل نمودار ہو۔ رہا قانون استقرار حاصل۔ اس میں ایک ہی نسبت اعلیٰ برابر قائم رہتی ہے۔ صرف عاملین کی مقدار بڑھتی ہے اور پیداوار کی نسبت بھی بہر صورت برقرار رہتی ہے۔

واضح ہو کہ مقدار عاملین کے اضافے سے ہمیشہ قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا عمل لازمی نہیں۔ جیسا کہ ہم تنظیم اور دیگر عاملین کے تعلق سے تحت میں ظاہر کریں گے، اضافہ مقدار کی بھی ایک حد ہے جس سے تجاوز کرنے کا نتیجہ قانون تقلیل حاصل کا ظہور ہوگا گویا جس طرح کہ ہر سہ عامل کے باہم نسبت اعلیٰ ہوتی ہے تینوں عامل اور تنظیم کے درمیان بھی ایک ایسی ہی نسبت اعلیٰ پائی جاتی ہے۔

المختصر ہر سہ قوانین پیدائش کے باہمی تعلق کی مذکورۃ الصدر بحث میں عاملین کی باہمی نسبت اور مقدار کے ردوبدل کی مختلف صورتیں اور نتائج واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اب ہم تقرر نسبت کے اصول دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

ترکیب عاملین کا اصول

۴۔ ہر سہ عاملین مل جل کر جو عمل پیدائش میں حصہ لیتے ہیں اُن کی ترکیب کیونکر قرار پاتی ہے بالفاظ دیگر کس اصول کے مطابق عاملین کی باہمی نسبت قائم ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے نسبت اعلیٰ سے مراد عاملین کی ایسی ترکیب ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک یا دو میں اضافہ کیا جائے ان کی مزید پیداوار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہو۔

لیکن لگان کی بحث میں صاف بتا چکے ہیں کہ قانونِ مذکور کا عمل مقدار پیداوار کے معیار سے دریافت کرتے ہیں۔ اس کو قیمت پیداوار سے کوئی تعلق نہیں البتہ جزءِ مختتم ہمیشہ قیمت سے قرار پاتا ہے قیمت جس قدر زیادہ ہوگی جزءِ مختتم قانونِ تقلیل حاصل کی حد سے آگے بڑھیگا۔ اگر قیمت گھٹیگی نتیجہ اس کے برعکس ہوگا، جزءِ مختتم کو قیمت پیداوار مثل فٹ بال قانون مذکور کی حد کے کبھی اس طرف کبھی اُس طرف پھینکتی رہتی ہے۔ دراصل تو ماحصل زائد کی بڑی سے بڑی مقدار مطلوب ہوتی ہے نہ کہ صرف اعلیٰ سے اعلیٰ شرح اور اُس کی وجہ منافع کی بحث میں واضح کر چکے ہیں اور آئندہ بھی تنظیم کے سلسلے میں بیان کریں گے، صاف ظاہر ہے کہ ماحصل زائد کی سب سے اعلیٰ شرح تو قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد پر قرار پاتی ہے لیکن ماحصل زائد کی سب سے بڑی مقدار جزءِ مختتم کی حد پر حاصل ہوتی ہے۔ لہذا ہر سہ عاملین کو اُن کے جزءِ مختتم کی حد تک یکجا کر کے کام لینے میں سب سے زیادہ ماحصل زائد ہاتھ آئیگا پس بلحاظِ مقدار ماحصل زائد عاملین کی بہترین ترکیب وہ ہے کہ ہر ایک عامل اپنے جزءِ مختتم تک شامل ہو یعنی اُن میں سے ہر ایک کے آخری جزے کی پیداوار اس کی لاگت کے برابر ہو نہ کم نہ زیادہ۔ اسی ترتیب میں عاملین کی جو نسبت قائم ہو وہ اصطلاحاً نسبت مفید کہلائیگی۔

جبکہ جزءِ مختتم کی لاگت اس کی پیداوار کی قیمت کے مساوی ٹھیری تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی عامل جس قدر ارزاں ہوگا اُس کا جزءِ مختتم بھی قانون تقلیل حاصل کی حد سے آگے بڑھا ہوگا اور جس قدر گراں ہوگا نتیجہ اس کے برعکس ہوگا۔ چنانچہ ترکیب عاملین کا یہ عام قاعدہ ہے کہ ارزاں عامل کے حتی الوسع بیشتر جزے اور گراں کے حتی الارکان کمتر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً سو من غلہ دو طرح پر پیدا کیا جا سکتا ہے تھوڑی سی زمین پر محنت و اصل کے بہت سے جزے لگائے جاویں یا بہت سی زمین پر تھوڑے سے جزے استعمال ہوں۔ اگر مقابلۃً زمین گراں ہے اور

حصہ سوم
باب یازدہم

محنت و اصل ارزاں تو کاشتِ دقیق مفید ثابت ہوگی جس میں شرحِ پیداوار معیارِ زمین بہت اعلیٰ اور معیارِ محنت و اصل متوسط یا ادنیٰ ہوگی۔ لیکن اگر محنت و اصل مقابلۃً گراں ہو اور زمین ارزاں تو کاشتِ وسیع سے زیادہ منافع ہوگا جس میں شرحِ پیداوار معیارِ محنت و اصل بہت اعلیٰ اور معیارِ زمین متوسط یا ادنیٰ ہوگی۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی دس بیگے کھیت کی کاشت کے نتائج حسبِ ذیل دریافت ہوں:-

جرعے	پیداوار	اوسط فی جرعہ	اوسط فی بیگہ
۵	۵۰ من	۱۰ من	۵ من
۱۰	۱۵۰ من	۱۵ من	۱۵ من
۱۵	۲۷۰ من	۱۸ من	۲۷ من
۲۰	۳۸۰ من	۱۹ من	۳۸ من
۲۵	۴۵۰ من	۱۸ من	۴۵ من
۳۰	۵۱۰ من	۱۷ من	۵۱ من
۳۵	۵۲۰ من	۱۶ من	۵۶ من
۴۰	۶۰۰ من	۱۵ من	۶۰ من
۴۵	۶۳۰ من	۱۴ من	۶۳ من
۵۰	۶۵۰ من	۱۳ من	۶۵ من

اب بفرضِ محال اگر زمین کی اس قدر کثرت ہو کہ حسبِ ضرورت مفت مل سکے تو گویا صرف جرعوں کی لاگت مصارفِ کاشت میں شمار ہوگی۔ ایسی حالت میں دس دس بیگے زمین پر ۲۰،۲۰ جرعے لگائے جائیں تاکہ حاصل زائد کی بیشترین مقدار ہاتھ آئے گی اور شرحِ پیداوار معیارِ جرعہ اعلیٰ ترین و معیارِ زمین ادنیٰ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر جرعے مفت میسر آسکیں اور صرف زمین کا کرایہ مصارفِ کاشت میں شامل ہو تو دس بیگے زمین پر بجائے ۲۰ کے ۵۰ جرعے بالفاظِ دیگر ۲۵ بیگے کی بجائے ۱۰ بیگے پر ۵۰ جرعے استعمال کرنے سے بیشترین حاصلِ زائد حاصل ہوگا۔

حصہ سوم
باب یازدہم

شرح پیداوار بمعیار زمین نہایت اعلیٰ و بمعیار جرعہ ادنیٰ ہوگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو زمین مفت مل سکتی ہے نہ جرعے بالکل بے قیمت ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ مقابلۃً کہیں زمین گراں ہوتی ہے اور کہیں محنت و اصل۔ اس کے مطابق علی الترتیب کاشت دقیق و وسیع رواج پاتی ہے۔ مذکورالصدر مثال میں اگر قیمت جرعہ ۱۵ من ہو تو ۲۰ جرعے ۱۳ من ہو تو ۲۵ جرعے ۱۱ من ہو تو ۳۰ جرعے ۹ من ہو تو ۳۵ جرعے ۷ من ہو تو ۴۰ جرعے ۵ من ہو تو ۴۵ جرعے اور ۳ من ہو تو ۵۰ جرعے استعمال کرنے سے بیشترین حاصل زائد ملیگا۔ اس واقعے سے دو نتیجے ثابت ہوتے ہیں اوّل یہ کہ ارزانی کیساتھ عامل کی مقدار استعمال بھی بڑھتی ہے دوم یہ کہ ہر دو عاملین کو ان کے جرعۂ مختتم تک استعمال کرنے سے بیشترین ماحصل زائد حاصل ہوتا ہے۔

اب تک ہم نے زمین کی ایک معین مقدار یعنی دس بیگھے فرض کرکے قیمت جرعہ اصل و محنت کی کمی بیشی کا اثر جرعوں کی مقدار استعمال پر ظاہر کیا۔ اب ان جرعوں کی ایک مقدار معین لو اور فرض کرو کہ کسی کاشتکار کے پاس ۵۰ جرعے ہیں جن کو وہ زراعت میں لگانا چاہتا ہے اب سوال یہ ہے کہ وہ کتنی زمین پر کاشت پھیلائیگا۔ واضح ہو کہ ارزانی و گرانی عامل کے مذکورالصدر اصول کے مطابق اس کے کھیت کا رقبہ کرایۂ زمین کی کمی بیشی کے حساب سے وسیع اور مختصر ہوگا۔ مذکورالصدر مثال میں ۴۵ جرعوں اور ۱۰ بیگھے زمین سے ۶۳۰ من پیداوار حاصل ہوئی۔ پس چونکہ ۴۵ جرعوں اور ۱۰ بیگھے میں نسبت وہی ہے جو ۵۰ جرعے اور ۱۱ ۱/۹ بیگھے میں لہٰذا اسی اوسط سے ۵۰ جرعوں اور ۱۱ ۱/۲ بیگھے کی پیداوار ۷۰۰ من ہوگی لیکن ۵۰ جرعے اور ۱۰ بیگھے کی پیداوار ۶۵۰ من ہے۔ لہٰذا جدید ۱ ۱/۹ بیگھے کی مزید پیداوار کل ۵۰ من یا ۴۵ من فی بیگہ ہوئی۔ اب اگر کرایۂ زمین ۴۵ من بیگھے سے زیادہ ہو تو ۱۰ بیگھے کی کاشت زیادہ مفید ہوگی اور اگر ۴۵ من بیگھے سے کم تو ۱۱ ۱/۹ بیگھے کی۔ اب اگر کرایۂ زمین گھٹتے گھٹتے ۴۰ من بیگھے سے بھی کم رہ جائے تو ۱۱ ۱/۹ بیگھے کے مقابلے میں ۱۲ ۱/۲ بیگھے کی کاشت زیادہ مفید

ثابت ہوگی ۴۰ جرعے اور دس بیگے و ۵۰ جرعے اور ۱۲ ½ بیگے کی نسبت مساوی ہے جبکہ ۴۰ جرعے اور ۱۰ بیگے کی پیداوار ۶۰۰ من ہے تو اسی حساب سے ۵۰ جرعے اور ۱۲ ½ بیگے کی پیداوار ۷۵۰ من ہوگی لیکن ۵۰ جرعے اور ۱۰ بیگے زمین سے ۶۵۰ من پیداوار حاصل ہوتی ہے لہذا جدید ۲ ½ بیگے کی مزید پیداوار کُل ۱۰۰ من یا ۴۰ من فی بیگہ ہوئی۔ کرایہ ۴۰ من بیگے سے جس قدر گھٹے گا ۱۲ ½ بیگے کی کاشت سے بشیتر حاصل زائد ملیگا۔ مندرجہ بالا مثال سے ایک نقشہ بناکر درج ذیل کرتے ہیں جس سے واضح ہوگا کہ ۱۰ من سے لے کر ۴۵ من بیگے کرایۂ زمین تک ۵۰ جرعے زیادہ سے زیادہ کس قدر زمین پر استعمال ہوسکیں گے ؛

تعداد بیگہ	مقدار پیداوار	مقدار اضافۂ زمین	حاصل ختم فی بیگہ
۱۰	۶۵۰ من	۱ ۱/۹ بیگہ	۴۵ من
۱۱ ۱/۹	۷۰۰	۱ ۷/۱۸	۳۶
۱۲ ۱/۲	۷۵۰	۱ ۱۱/۱۴	۲۸
۱۴ ۲/۷	۸۰۰	۲ ۸/۲۱	۲۰
۱۶ ۲/۳	۸۵۰	۳ ۱/۳	۱۵
۲۰	۹۰۰	۵	۱۰
۲۵	۹۵۰	۰	۰

اس نقشے کے بنانے کا طریق مذکورالصدر ان دو مثالوں سے بخوبی واضح ہوگا جہاں بمقابلہ ۱۰ بیگے کے ۱۱ ۱/۹ اور ۱۲ ½ بیگے پر ۵۰ جرعے استعمال کرنا۔ کرایۂ زمین کی تخفیف کے ساتھ ساتھ زیادہ مفید ثابت کیا گیا ہے ؛

بغرض سہولت ہم نے زراعت کی مثال پیش کی لیکن واضح ہو کہ صنعت و حرفت کا بھی یہی حال ہے۔ اگر محنت و اصل کی بجائے زمین و اصل کے جرعے یکجا کرکے محنت سے مقابلہ کیا جائے اور باری باری سے محنت کی مقدار اور جرعوں کی مقدار معین فرض کرکے حسب طریق بالا

کمی وبیشی قیمت محنت کا اثر ان کی مقدار پر تحقیق کیا جائے تو بعینہ وہی نتیجہ برآمد ہوگا۔ علیٰ ہذا تجارت میں بھی زمین و محنت کے جرعوں کا اصل سے مقابلہ کرنے پر یہی کیفیت نظر آئیگی۔ یہاں یہ نکتہ جتانا بے محل نہ ہوگا کہ زراعت میں زمین صنعت وحرفت میں محنت اور تجارت میں اصل کی کارگزاری مقابلۃً باقی عاملین سے عموماً بڑھی چڑھی ہوتی ہے اور پیدائش کے ان تینوں اہم شعبوں میں ان کے مخصوص عامل کے مقابل علی الترتیب محنت و اصل اور زمین و محنت کے جرعے یا جاشما کرنے سے بیان میں صفائی اور سہولت ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عاملین کی ترکیب محض اتفاقی نہیں بلکہ ایک اصول کی پابند ہوتی ہے نسبتِ مفید میں ہر ایک عامل جرعۂ مختتم حد تک شامل ہوتا ہے۔ اور مقابلۃً جو عامل جس قدر ارزاں ہوگا اس کی مقدار زیادہ اور جس قدر گراں ہوگا اس کی مقدار کمتر استعمال ہوگی لہذا کل پیداوار کی شرح ارزاں عامل کے معیار سے ادنیٰ اور گراں کے معیار سے اعلیٰ ہوگی۔

تنظیم کا برسرِ عاملین سے تعلق

۵۔ خواہ زراعت ہو خواہ صنعت وحرفت وتجارت شخصی کسی کاروبار کی ایک خاص مقدار کا اہتمام اور نگرانی بطریقِ احسن کرسکتا ہے اور عمل پیدائش میں تنظیم کا جو رتبہ ہے اور پیداوار پر اس کا جس قدر اثر پڑتا ہے منافع کے تحت میں واضح ہوچکا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقدارِ عاملین اور تنظیم میں بھی نسبتِ اعلیٰ اور نسبتِ مفید قائم ہے نسبتِ اعلیٰ کی حد پر عاملین کی ایسی ترکیب ہوتی ہے کہ قانونِ تکثیرِ حاصل یا استقرارِ حاصل کا اثر درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے، اس کے بعد ضعفِ تنظیم بتدریج اس اثر کو زائل کرتا ہے حتیٰ کہ گویا ہر سہ عاملین کا مجموعی جرعۂ مختتم بھی کاروبار میں لگ جاتا ہے۔ یہی نسبتِ مفید کی حد ہے۔ اس کے بعد یا تو کاروبار کی توسیع روک دی جاتی ہے۔ یا نسبتِ مفید برقرار رکھنے کی غرض سے تنظیم میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ کاروبار ایک حد تک تو موجودہ تنظیم میں بڑھ سکتا ہے لیکن اس کے بعد گر مقدارِ تنظیم میں بھی مناسب اضافہ کیا جائے تو کاروبار میں بوجہ قلتِ اہتمام و نگرانی

اجزائے حاصل کے بجائے نفع کے نقصان ہونے لگتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ترکیب عاملین میں ان کی مقدار کا اضافہ لامحدود ہو کر قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا پیرو نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس اضافے پر بھی مقدار عاملین اور تنظیم کی نسبت ایک حد قائم کر دی ہے جس سے تجاوز کرنے پر قانون تقلیل حاصل نمودار ہوتا ہے حتیٰ کہ عاملین کا مجموعی جبر مختتم مزید اضافے کو قطعاً بند کر دیتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے جبکہ کوئی کاشتکار آجر یا تاجر مزید کاروبار سنبھال نہ سکنے کے خوف سے اس کی توسیع روک دے اور موجودہ مقدار پر قناعت کرنا اپنے حق میں سب سے بہتر سمجھے۔

یہاں دو نکتے قابل توجہ معلوم ہوتے ہیں، اول یہ کہ جس طرح حسب نوعیت پیدائش عاملین کی مختلف مقداریں یکجا ہوتی ممکن ہیں مثلاً بمقابلہ زراعت کے صنعت میں محنت و اصل کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور زمین کی کم تجارت میں اصل کی مقدار سب پر غالب ہوتی ہے۔ اسی طرح پر لحاظ نوعیت کاروبار عاملین اور تنظیم بھی مختلف مقداروں میں ترکیب پاتے ہیں۔ بالعموم ایک ہی مقدار تنظیم کے ساتھ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں عاملین کی بیشتر مجموعی مقدار مل سکتی ہے اور تجارت میں سب سے زیادہ لیکن جیسا کہ عاملین کی باہمی نسبت کے سلسلے میں سمجھایا جا چکا ہے مقدار کی کمی بیشی کا صرف نسبت پر اثر پڑتا ہے۔ اس سے قانون تقلیل حاصل کے عمل میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس سے قبل قانون تقلیل حاصل کا ہر سہ عاملین کی نسبت اعلیٰ کے بعد ایک یا دو عامل کے اضافے سے نمودار ہونا بیان کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں پر معلوم ہوا کہ ہر سہ عاملین اور تنظیم کی نسبت اعلیٰ کے بعد تینوں عاملوں کے اضافے سے بھی قانون مذکور ظہور پذیر ہو سکتا ہے پس تحقیق ہوا کہ قانون تقلیل حاصل کس طرح نمودار ہوتا ہے کبھی صرف ایک یا دو اور کبھی تینوں عاملوں کے اضافے سے۔

تنظیم ایک اور لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے۔ اس سے قبل

حصہ سوم
باب پانزدہم

بتایا جا چکا ہے کہ کاروبار میں ماحصل زائد کی اعلیٰ شرح اس قدر مطلوب نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی مقدار کلی کی زیادتی ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نسبتاً اعلیٰ کے بجائے نسبتِ مفید عاملین کی ترکیب میں قائم کی جاتی ہے اور قانونِ تقلیل ماحصل کی ابتدائی حد کے بجائے جو عموماً کاروبار کی توسیع روکی جاتی ہے اس کا باعث یہی تنظیم ہے ۔ مثلاً کسی کمپنی میں نسبتِ اعلیٰ کے مطابق ۱۰۰ روپیہ قیمتی ہزینے استعمال ہونے سے ۳۰۰ روپے قیمتی پیداوار حاصل ہو اور نسبتِ مفید کے مطابق ۳۰۰ روپیہ قیمتی جرعمل سے صرف ۷۰۰ روپے قیمتی پیداوار کے شرح ماحصل زائد تو بحالتِ اوّل اعلیٰ ہے یعنی سہ گونی لیکن مقدار ماحصل زائد بحالتِ دوم زیادہ ہے یعنی اوّل سے دوگنی (۳۰۰ — ۱۰۰) کے مقابل میں (۷۰۰ — ۳۰۰) گویا جبکہ شرح ماحصل زائدہ میار جحت اعلیٰ ہے تو اجرتِ تنظیم اور منافع صرف ۲۰۰ روپے ہیں اور جبکہ مقدار زیادہ ہے تو ۴۰۰ روپے تنظیم اور عاملین پیدائش کی کمی بیشی کا تعلق منافع کے تحت میں بھی واضح کر چکے ہیں عاملین کی کثرت اجرتِ تنظیم اور منافع کے حق میں بہت مفید ہے اور ان کی قلت بید مضر یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی عاملین کی مقدار بڑھانے اور جرعۂ ختم تک کاروبار جاری رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب ہو کر اعلیٰ تنظیم اور بہت سا منافع پاتا ہے ۔

پس واضح ہوا کہ مقدارِ عاملین کے اضافے اور جرعۂ ختم کے استعمال کا حقیقی باعث اجرتِ تنظیم اور منافع ہے ۔

حد زرعی منافع

۶ ۔ زمین کی مقدار تو ہر ملک میں محدود ہے ۔ اضافۂ اصل بھی چند خاص حالتوں میں ممکن ہے لیکن آبادی برابر بڑھتی رہتی ہے اور اضافۂ محنت کی ہر ملک میں بہت گنجائش ہے ۔ اب اگر آبادی بڑھتی اور اصل نہ بڑھے یا کم بڑھے تو کاروبار کا بیشتر بار زراعت پر آ پڑیگا اور قانونِ تقلیل ماحصل زراعت میں محنت کی پیداوار گھٹاتے گھٹاتے شرحِ اجرت نہایت ادنیٰ کر کے مزدوروں کو مفلس اور خستہ حال بنا دیگا ۔ چنانچہ اکثر

پسماندہ ممالک اور ہندوستان کے بعض دور افتادہ حصص میں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

لیکن اگر صرف اصل بڑھے یا آبادی و اصل ساتھ ساتھ بڑھیں تو زراعت ترک ہو کر صنعت و حرفت کا زیادہ رواج ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ زمین جو زراعت کی بنا ہے رقبے میں محدود ہے اس پر طرہ یہ کہ زراعت میں قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد جلد شروع ہو جاتا ہے اور اس میں قانون تکثیر حاصل سے بہت کم فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اور اسی وجہ سے بہت زیادہ محنت و اصل کی اس میں کھپت نہیں ہو سکتی۔ اسکے برعکس اصل جو صنعت و حرفت کی روح رواں ہے انسانی کوشش سے بہت کچھ بڑھ سکتا ہے اور بڑھ رہا ہے، مزید براں صنعت و حرفت میں اول تو قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد واقع ہوتی ہے۔ پھر قانون تکثیر حاصل بھی موقع بموقع اس کا زور توڑتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں محنت و اصل کی بہت زیادہ مقدار شریک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ یورپ و امریکا جیسے ترقی یافتہ ممالک میں جہاں آبادی بھی گھنی ہے اور اصل کی بھی کثرت ہے زراعت کے مقابل صنعت و حرفت بہت عروج پا رہی ہے۔ آجکل کے پس ماندہ اور ترقی یافتہ ممالک کا سب سے بڑا امتیازی فرق اصل کی قلت و کثرت ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پیداوار خام کی بہم رسانی اور خصوصاً زراعت پسماندہ ممالک کے سپرد ہے اور مصنوعات کی تیاری بالخصوص صنعت و حرفت ترقی یافتہ ممالک نے سنگوار رکھی ہے۔ اول الذکر ممالک میں مزدور مفلس اور آخر الذکر میں مقابلۃً خوش ہیں۔ امید ہے کہ مندرجۂ بالا مباحث سے مختلف ممالک کے معاشی حالات سمجھنے اور انکی توجیہ کرنے میں ضرور مدد ملیگی۔

ترکیبِ عاملین کا مضمون درحقیقت نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اعلیٰ درجے کے انگریزی مصنفین میں سے بھی بہت کم نے اسکو واضح کرنے

اور سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ تازہ ترین تحقیق کا ماحصل ہے ؛

بابِ شانزدہم

دولتمندی و افلاس

(۱) سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم (۲) اشتراک کی تشریح و تنقید (۳) تقسیمِ دولت کی موجودہ حالت (۴) تجاویزِ اصلاح (۵) اشتراکِ سرکاری۔

سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم

۱۔ کچھ عرصے سے ایک تحریک کا کُل ترقی یافتہ ممالک میں بہت چرچا ہو رہا ہے اور اُس کے حامیوں کی جماعت اور سرگرمی بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس کا مشہورِ عالم نام سوشیلزم ہے جس کو ہم اشتراک سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ محض ایک اخلاقی اور معاشی مسئلہ مانا جاتا تھا لیکن اب اس پر سیاسیات کا بھی گہرا رنگ چڑھ رہا ہے حتّٰی کہ نیابتی حکومتوں کے انتخابات میں بھی اس کا اثر دخل پانے لگا ہے۔ بحث یہ ہے کہ موجودہ معاشی ترقیات کا بحیثیت مجموعی بنی نوعِ انسان کی مالی حالت پر کیا اثر پڑا۔ ایک گروہ کا دعوٰے ہے کہ ان ترقیات کی بدولت زمیندار اصلدار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تو بیجا طور پر از حد دولتمند بن گئیں اور انسانوں کا سب سے بڑا گروہ یعنی مزدور لوگ اور بھی مفلس اور خستہ حال ہو گئے، گویا جماعتِ قلیل کی

مرفہ الحالی اور گروہِ کثیر کی تنگدستی ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے۔ موجودہ معاشی ترقیات کو ایک نہایت موٹی آہنی میخ سے تشبیہ دی جاتی ہے جو کسی چوبی ستون کی چوٹی کے قریب اندر ٹھوکی گئی سے چھوٹے بالائی حصّے کو اوپر اٹھائے اور نیچے والے بڑے حصّے کو اور بھی دبا دے اور جتنی زیادہ اندر گھسے ان دونوں حصّوں میں بُعد اور علٰحدگی بڑھا دے۔ حضرت اکبر نے بھی اس دعوے کو یوں بیان کیا ہے:۔

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے ۔ اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

اس دعوے کی علمی توجیہ و تائید میں یہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ زمیندار، اصلدار اور آجروں کی مختصر جماعتوں کی آمدنی نہ صرف بیجا زیادہ بلکہ سراسر غیر مکتسب اور ناجائز بھی ہے یعنی وہ آمدنی غریب مزدوروں کے گروہِ کثیر کی کمائی میں سے غصب کر لی جاتی ہے۔ گویا تقسیم دولت کے مروجہ طریق کے مطابق ایک لوٹ اور اندھیر مچا ہوا ہے۔ دولتمندوں کی مختصر جماعت غریبوں کی کمائی کا بڑا حصہ غصب کر کے خود تو لطف و عیش اُڑاتی ہے اور باقی سب کی زندگی تلخ اور ناقابل برداشت بنا رکھی ہے۔ اس افسوسناک حالت کی اصلاح کے واسطے گوناگوں تدابیر و تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں سے بعض از حد انتہائی قسم کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جو موجودہ مالکوں سے کُل زمین اور اصل چھین کر کُل قوم کی مشترک مِلک قرار دے دی جائے اور ہر شخص صرف اُجرت کما کر زندگی بسر کرے۔ گویا سب مزدور بن جائیں۔ زمیندار، اصلدار اور آجر کوئی باقی نہ رہے اور بعض معتدل ہیں۔ مثلاً سرکاری قوانین کی مدد سے بیجا آمدنیوں کو روکا جائے۔ تقسیم دولت میں حتی الامکان مساوات پیدا کی جاوے اور مزدوروں کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھا جائے۔ تجاویز اصلاح کے اختلافات کی بنا پر یوں تو اس تحریک کی متعدد انواع قرار پا چکی ہیں۔ لیکن دو قسمیں بہت مشہور اور ممتاز ہیں اشتراکِ انقلابی جس میں انتہائی قسم کی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا جائے اور اشتراکِ ارتقائی

حصّہ سوم

اشتراکیزم

جس میں معتدل تدابیر کے ذریعے سے بتدریج اشتراکی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاوے۔ مسئلۂ سوشلزم یعنی اشتراک کی تفصیل نہایت طویل اور پیچیدہ ہے جس کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔ یہاں ہم اس کے تمام مباحث اور اہم نکات مختصراً پیش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اس تحریک کا تمام مفہوم تو اوپر بیان ہو چکا۔ اب اس کی مزید تشریح ضروری تنقید کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تاکہ اگر کامل استحضار حاصل نہ ہو سکے تو ایک سادہ خاکہ ہی پیش نظر ہو جائے اور امید ہے کہ اتنی معلومات بھی اشتراک کی بحث و مباحثے سمجھنے میں قابل قدر حد تک مفید ثابت ہوں گی۔

اشتراک کی تشریح و تنقید

۴۔ اوّل اشتراکیین کے ان معاشی اصولوں کو لیجئے جن کی رو سے زمیندار، استعدار اور آجر کی آمدنی یعنی لگان، سود اور منافع غیر مکتسب اور مزدور کی اجرت کا غصب شدہ حصہ ثابت کیا جاتا ہے۔ وہ اصول یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ صرف محنت ہی قدر و قیمت کی بنا ہے یعنی ہر چیز کی قدر و قیمت محض اس محنت سے پیدا ہوتی ہے جو اس کی تیاری میں صرف ہوا۔ کسی چیز کی قدر و قیمت میں زمین، اصل اور تنظیم کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ مزدور کا کیا دھرا ہوتا ہے اور وہی کُل پیداوار یا یوں کہئے کہ پیداوار کی کُل قدر و قیمت کا مستحق ہوتا ہے۔ زمیندار، اصحاب اصل اور آجر کون ہوتے ہیں جو اپنا حصہ بانٹیں۔ دوم اجرت جو مزدور کو ملتی ہے لازماً ناگزیر یا محتاج زندگی کے مساوی ہوتی ہے۔ دوسرے جو بااقتدار طبقے جو مزدوروں پر حاوی ہو گئے ہیں اُن کو اس سے زیادہ اجرت نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پیداوار یا اس کی قدر و قیمت کا ایک قلیل جزو پر تو مزدوروں کو قناعت کرنی پڑتی ہے اور باقی پیداوار یا اس کی قدر و قیمت کو جو اصطلاحاً قدر زاید کہلاتی ہے قابو یافتہ طبقے بطور لگان، سود اور منافع خود ہتھیا لیتے ہیں۔ غریب مزدور جو سب کچھ پیدا کرتا ہے منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ تنہا مزدور سب کچھ پیدا کرتا ہے۔ لیکن پیداوار نہیں

حصہ سوم
باب نہم

دوسرے طبقے بھی شریک ہوجاتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ غریب مزدور بہت چھوٹا حصہ لیتے ہیں۔ ہر دو اصول اصطلاحاً حسبِ ترتیب مسئلۂ قدرِ زائد اور مسئلۂ اجرت فنڈ کہلاتے ہیں، مدتوں ان کی بہت زور شور سے منادی کی گئی اور پر جوش مؤیدوں کے رعب میں آکر لوگوں نے ان اصولوں کی صحت میں بھی چون وچرا نہیں کیا، لیکن بالآخر طلسم ٹوٹ گیا اور لطف یہ ہے کہ جن معاشیین نے عمر بھر نہایت شد و مد سے ان اصولوں کی تلقین کی خود ان پر جب نقص وخامی نمایاں ہوئی تو نہایت اخلاقی جرأت سے کام لے کر ان میں سے بعض نے خود ان کی عدمِ صحت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اپنی طرف سے اعلان بھی کرادیا۔ اس معاملے میں مشہور عالم فلاسفر مل کا طرزِ عمل خاص طور پر قابل ستائش و یادگار ہے کہ مدتوں مسئلۂ اجرت فنڈ کا سخت حامی رہا اور جب کمتر معروف معصروں نے اس مسئلے کی خامیاں واضح کیں تو نہایت صدق پسندی سے اس مسئلے سے اپنی دست برداری کا صاف اعلان کردیا، مسئلۂ قدرِ زاید کا بھی اس کے اکثر مؤیدوں کے ہاتھ سے یہی حشر ہوا اور اب یہ مسائل صرف معاشی اور بالخصوص تحریکِ اشتراک کی تاریخ میں دلچسپ اور سبق آموز یادگار مانے جاتے ہیں، بلحاظِ صحت و استدلال وہ تقریباً از کار رفتہ ہیں۔

تقسیمِ دولت کے اصول اس سے قبل بالتفصیل بیان ہوچکے ہیں۔ مسئلۂ قدر و قیمت سے مبادلۂ دولت کے تحت میں بحث کی جائے گی۔ ان بیانات سے مقابلہ کرنے پر اشتراکیین کے ہر دو مذکورۂ بالا اصول کی خامی اور تنگی کا خوب اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ بھی بخوبی ثابت ہوجائیگا کہ پیدائش دولت کے واسطے زمین، اصل اور نیز تنظیم اسی قدر ضروری ہیں جتنی کہ محنت، کسی کا کسی پر فوقیت کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے سب ناگزیر ہیں اور یہ دعوے کہ کل پیداوار صرف محنت کا نتیجہ ہے اگرچہ تائید کے جوش میں معقول نظر آیا ہو لیکن درحقیقت مضحکہ انگیز ہے۔ جہاں تک جواز کا تعلق ہے۔

لگان، سود اور منافع پیداوار کے ایسے ہی جائز حصے ہیں جیسے کہ اجرت - وہ کسی طرح پر اجرت کے غصب شدہ حصے نہیں شمار ہو سکتے - اب رہا یہ سوال کہ لگان سود اور منافع کے مالک کون بننے چاہئیں آیا خود مزدور یا زمیندار، اصلدار اور آجر بھی ہوں یا آخر الذکر طبقے مزدوروں سے جداگانہ رہیں اور بہر دو صورت عام مرفہ الحالی پر کیا اثر پڑے گا، اور بلحاظ بہبودی کافہ ناس کونسی صورت بہتر اور قابل ترجیح ہونی چاہئے - یہ ایک دوسری بحث ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے ۔

زمینداروں، اصلداروں اور آجروں کی دولتمندی تو ہر کسی کو تسلیم ہے اور اشتراکئین کو اسی کا قلق اور شکایت ہے۔ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ مزدوروں کی مالی حالت بمقابلہ سابق کے اب کیسی ہے ۔ آیا وہ بقول اشتراکئین روز افزوں افلاس کا شکار ہو رہے ہیں یا وہ بھی بہ نسبت اپنے آباؤ اجداد کے زیادہ آسودہ اور خوشحال ہو گئے ہیں یہاں افلاس و خوشحالی کی مختصر تشریح ضروری اور برمحل معلوم ہوتی ہے کسی طبقے کے مفلس ہو جانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو بہ نسبت سابق کمتر ضروریات میسر آئیں یا اس کے کمتر افراد کو سابق کی کل ضروریات حاصل ہوں، اس کے برعکس خوشحالی سے مراد یہ ہے کہ بہ نسبت سابق بہت زیادہ ضروریات پر دسترس ہو یا زیادہ بڑی جماعت کو سابق کی ضروریات حاصل ہوں - اب دیکھنا یہ ہے کہ مالی حالت کے وہ کیا قابل عمل معیار ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے سے ہم کسی طبقے کے خوشحال یا مفلس ہونے کا بآسانی پتہ چل سکے - دولتمندی و افلاس کے مذکورالصدر مفہوم سے معیار کا صاف پتہ چلتا ہے، اول کسی طبقے کی تعداد دوم اس کی ضروریات - اگر دونوں میں اضافہ ہو تو خوشحالی یقینی ہے اگر کمی ہو تو افلاس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا - نیز تعداد میں تخفیف اور ضروریات میں سکون یا تعداد میں سکون اور ضروریات میں کمی - دونوں افلاس کی علامت ہیں اسی طرح پر تعداد کے اضافے اور ضروریات کے سکون یا تعداد کے

باب سوم
فصل نوزدہم

سکون اور ضروریات کے اضافے سے خوشحالی کا پتہ چلتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی طبقے کے اوسطِ اموات اور اوسطِ عمر سے بھی اس کی مالی حالت پر قابل لحاظ روشنی پڑتی ہے۔ انگلستان سا ملک اس فیصلہ طلب امر کی تحقیق کے واسطے کہ آیا معاشی ترقیات سے طبقۂ مزدوراں میں افلاس بڑھ رہا ہے یا مرفہ الحالی دو وجہ سے نہایت مناسب ہے۔ اول تو وہاں جدید معاشی ترقیات کا خوب دور دورہ ہے۔ دوم وہاں ملکی اور غیر ملکی ہر قسم کی پیداوار جو صرف میں آئے بڑے اہتمام سے درج رجسٹر کی جاتی ہے جس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی طبقے کی ضروریات میں تخفیف ہو رہی ہے یا اضافہ۔ نیز پیدائش و فوتی کی صحت کے متعلق وہاں کی سرکاری یادداشت بہت زیادہ قریب صحت اور مکمل ہوتی ہے۔ اگر یہ اعداد و شمار سراسر درست اور قابل اعتماد نہ بھی سہی تاہم ان سے مالی حالت کا مذکورۂ بالا اصول کے مطابق ضروری حد تک اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دوم ان سے زیادہ معتبر کوئی دوسرا معیار بھی میسر نہیں آ سکتا۔ پس ہم کو انھیں ذرائع پر قناعت کر کے ان سے جو معلومات حاصل ہوں اس کی بنا پر مالی حالت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنی چاہئے۔ اعداد و شمار موجود ہیں۔ ان سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بہ نسبتِ سابق مزدوری پیشہ عوام کی مالی حالت کہیں بہتر ہے اور روبہ ترقی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اشتراکیین سراسر بیخبر تھے یا ان کو دھوکہ دہی منظور تھی کہ افزونیِ افلاس کا انھوں نے بے بنیاد شور مچا دیا۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ اتفاق سے اشتراک کے پرجوش مؤید معاشی انقلاب کے دوران میں پیدا ہوئے اور عارضی مگر نہایت قوی اثرات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان اثرات کو مستقل قرار دے دیا۔ یہ سچ ہے کہ گزشتہ دو صدیوں میں مزدوری پیشہ طبقوں پر بڑا نازک وقت گزر گیا اور زمیندار، اصلدار اور آجروں کے طبقوں نے وہ عروج پایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ یہی وہ

زمانہ تھا جبکہ نت نئے انجن اور کلیں ایجاد ہوئیں۔ کارخانے جاری ہوئے۔ کلوں کی بدولت اصل کا زور بندھا۔ مزدور آجروں کے دست نگر ہو گئے۔ ایک طرف تو ہزارہا مزدور بیکاری میں مبتلا ہوئے دوسری طرف کارخانے والے دنیا کی دولت سمیٹنے لگے۔ جو مزدور کام سے بھی لگے تھے سرکاری نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں انکی صحت و اخلاق کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کارخانہ دار گویا آقا تھے اور مزدور ان کے غلام یہ کماتے اور وہ لطف اڑاتے تھے۔ مگر آندھی کے جھونکے کی مانند یہ حالات چند روزہ تھے۔ رفتہ رفتہ بوجہ ارزانی پیداوار صنعت و حرفت نے ترقی پائی تو بیکاری کی شکایت بھی بہت کچھ رفع ہونے لگی اور بہ نسبت سابق صدہا گنے مزدور کاروبار سے لگ گئے۔ ایک چھاپے کی ایجاد کو لو۔ آج کروڑہا آدمی پریسوں میں ملازم ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس ایجاد بغیر موجودہ تعداد کا عشر عشیر بھی کتابت کرکے روٹی کما سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اول اول کلوں کی ایجاد سے مزدوروں پر ضرور بیکاری کی مصیبت طاری ہوتی ہے لیکن صنعت و حرفت متعلقہ کی مابعد ترقی سے یہ شکایت بتدریج رفع ہو کر بالآخر کلوں ہی کے طفیل سے مزدوروں کی مانگ اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بہت زیادہ لوگ روزی کمانے لگتے ہیں۔

اس سے قبل کلوں کا مزدوروں کی حالت پر اثر واضح کیا جا چکا ہے۔

معاشی انقلابات کے زمانے میں گوناگوں انکشافات و ایجادات کی بدولت مزدوروں کی حالت اکثر ناقابل اطمینان بلکہ افسوسناک ہو جاتی ہے لیکن وہ زمانہ بھی یہی ہوتا ہے جبکہ لوگ حسن اتفاق، خوش قسمتی یا عقلمندی سے غرضکہ کسی نہ کسی طرح بڑی بڑی دولتیں جمع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے مشہور کروڑپتی اصلداروں اور آجروں کی جڑ اسی زمانے میں جمی جبکہ ہر طرف معاشی انقلابات کا طوفان بپا تھا۔ سکون قائم ہونے کے بعد مقابلے کے دباؤ سے سب کاروبار ایک سطح پر آ لگتے ہیں اور اس زمانے میں غیر معمولی ترقی کرنا نہایت دشوار بلکہ اکثر محال ہو جاتا ہے۔

باوجود بہت کچھ جدوجہد کرنے کے بھی معمول سے زیادہ دولت ہاتھ نہیں لگ سکتی ہر تجربہ کار اور سمجھدار آجر اس واقعے کی تصدیق کر سکیگا۔ انکم ٹکس کے اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک میں متوسط درجے کے دولتمندوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور اعلیٰ درجے والے دولتمندوں کے اضافے کی رفتار روز بروز گھٹ رہی ہے، انجمن سرمایہ مشترک اور بینکوں کے اعداد و شمار سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دولت اب زیادہ پھیل رہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ معاشی انقلابات کے زمانے میں مزدور پریشان حال اور خوش قسمت اصلدار و آجر جدید مرفہ الحال بن جاتے ہیں۔ کچھ عرصے تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا معاشی ترقیوں سے ایک مخصوص جماعت کی دولتمندی اور نہایت کثیر گروہ کے افلاس میں ساتھ ساتھ اضافہ ہونا لازمی ہے۔ لیکن بالآخر حالات پلٹا کھاتے ہیں مزدور کی حالت سدھرنی شروع ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ بہ نسبت سابق بدرجہا بہتر اور عمدہ ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی غیر معمولی خوش قسمتوں کی تعداد گھٹنے لگتی ہے، نئے نئے کروڑپتی تو کم پیدا ہوتے ہیں اور انکے بجائے بہت سے متوسط درجے کے دولتمند نمودار ہونے لگتے ہیں اکثر معاصر اشتراکیین پر انقلاب کے عارضی مگر خوفناک اثرات کی ہیبت اس قدر طاری ہوئی کہ وہ گھبرا اٹھے اور معاشی ترقیات کو عالمگیر تباہی کا آلہ قرار دے دیا لیکن جب انقلاب کا طوفان پورے طور پر فرو ہو چکا تو ان خوفناک اثرات نے کم و بیش قابل اطمینان صورت اختیار کر لی یہی وجہ ہے کہ جدید اشتراکیین کی رائے اور تجاویز میں وہ سخت گیری اور تشدد نہیں پایا جاتا جو اُن کے پیشرؤں میں تھا۔ اور بحیثیت مجموعی یہ تحریک انتہا گزینی سے اعتدال پسندی کی طرف مائل ہوتی جاتی ہے۔

عہد جدید جس کا باقاعدہ آغاز انقلاب فرانس سے شمار کیا جاتا ہے آزادی، مساوات اور عام بیداری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے رسم غلامی کا خاتمہ ہوا، قابو یافتہ طبقوں کا زور ٹوٹا آئینی اور نیابتی

حکومتوں نے جڑ پکڑی، عوام میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا بالطریق نیابت سلطنت کے نظم ونسق میں ان کو بھی دخل ملنے لگا اور بتدریج کل باشندگان کو سیاسی آزادی حاصل ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ عوام میں تعلیم بھی ہر طرف پھیلی اور حصول تعلیم کے واسطے طرح طرح کی سہولتیں مہیا کردی گئیں، علم کسی خاص طبقے کی میراث نہیں رہا۔ بلکہ اس کے حاصل کرنے کی ہر شخص کو کامل آزادی مل گئی اور نیز آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ گویا دماغی اور تعلیمی حالت میں بھی بہت کچھ مساوات نمودار ہونے لگی۔ سیاسی آزادی اور اشاعت تعلیم کا لازمی نتیجہ عام بیداری ہوا، لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، وہ اپنے حقوق سمجھنے لگے اور اپنی حالت سدھارنے کا ان میں ولولہ پیدا ہوگیا عوام کے سیاسی حقوق مساوی قرار پاگئے اور تعلیمی حالت بہت کچھ یکساں ہوگئی۔ سوسائٹی میں بھی ذات پات کی تفریق گھٹنے لگی۔ گویا سیاسی و دماغی اور نیز سوشیل تفریقیں مٹ کر سب میں مساوات پھیل گئی لیکن مالی حالت میں اب بھی زمین و آسمان کا فرق بکثرت قائم ہے جبکہ ہر طرف مساوات کی رو بہہ رہی ہو، مالی حالت کے فرق جس قدر ناگوار معلوم ہوں کم ہیں چنانچہ باوجودیکہ مزدوری پیشہ طبقوں کی حالت بہ نسبت سابق بہت بہتر ہوگئی لیکن پھر بھی ان کو دوسروں کی دولتمندی شاق گزرتی رہی اور اپنی بہتر حالت ان کو افلاس سے بھی بدتر معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ بعض اشتراکیین نے مزدوروں کی مالی حالت بہ نسبت سابق فی نفسہ بہت بہتر تسلیم کرنے پر ان کو اس وجہ سے مفلس قرار دیا ہے کہ بعض دیگر طبقے ان سے بہت زیادہ دولتمند بن گئے گویا دوسروں کے مقابل مزدوروں کی کمتر ترقی کو وہ تنزل سے تعبیر کرتے ہیں اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ دو ریل گاڑیاں ایک ہی سمت کو دوڑیں اور ان میں سے ایک زیادہ تیز رفتار ہو تو چونکہ کمتر رفتار والی گاڑی پیچھے رہ جائے گی اس لیئے نتیجہ نکال لیا جائے کہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ بحیثیت مجموعی مزدوروں کی مالی حالت بہ نسبت سابق

م
دہم

ضرور بہتر ہوگئی ہے مفلس ہونے کے بجائے اب وہ مقابلۃً خوش حال ہوتے جاتے ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کی ترقی کی رفتار سست ہے اور باوجود بہتر ہونے کے اُن کی مالی حالت ہرگز قابلِ اطمینان نہیں۔ دیگر طبقے بہت زیادہ دولت سمیٹ رہے ہیں اور جیسا کہ ہم ابھی اعداد و شمار سے ثابت کریں گے دولت ازحد غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہورہی ہے۔ المختصر اشتراکیئین کے بیانات خلافِ واقعہ اور مبالغہ آمیز بھی ہوں تب بھی تقسیمِ دولت کا موجودہ طریق اصلاح طلب ضرور ہے۔

دولت
موجودہ
ست

۴۵۔ مروجہ طریقِ تقسیمِ دولت کی علمی تشریح و توجیہ اوپر ہوچکی ہے جس سے واضح ہوا ہوگا کہ منجملہ چہار حصص پیدائش اجرت تو سب سے بڑی جماعت میں تقسیم ہوتی ہے اور لگان سود و منافع زمیندار و اصلدار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں رول لیتی ہیں۔ ان تینوں حصوں کی مقدار اجرت سے کہیں زیادہ ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ افزونی آبادی، سہولتِ آمد و رفت، استعمالِ مشین، پیدائش بر پیمانۂ کبیر، تنظیمِ کاروبار سی معاشی ترقیوں کی بدولت جس قدر ان میں خود بخود اضافہ ہورہا ہے اس کا نصف بھی باوجود ہزار جدوجہد اجرت میں نظر نہیں آتا۔ اس فرق کا باعث عاملین کے خواص میں مضمر ہے جن کی اس سے قبل تشریح کی جاچکی ہے۔ نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً مزدور کو زمیندار اصلدار یا آجر کے مقابلے میں پیداوار کا بہت کم حصہ ملتا ہے بلکہ یہ قلیل مقدار حاصل کرنے کے واسطے بھی وہ آجکل اصلدار و آجر کی دستگیری کا محتاج ہے۔ پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے رواج نے بطورِ خود روزی کمانے سے اس کو بالکل معذور کردیا۔ زمین و پیداوارِ زمین جو اس کی ضروریات کا جزوِ اعظم ہے گراں ہو ہو کر زمیندار کو مالا مال اور غریب مزدور کو زیرِ بار کررہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ زمیندار اصلدار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی ذی اقتدار اور دولتمند جماعتوں کے مقابلے میں غریب مزدوروں کا سب سے بڑا گروہ بہت کمزور اور بے بس نظر آتا ہے جیسا کہ اوپر

بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مزدوروں کی حالت بہ نسبت سابق بدتر ہے۔ صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ جدید معاشی ترقیاں بھی مزدوروں کے کمتر موافق ہیں اور مقابلۃً زمینداروں اصلداروں اور آجروں کی از حد معاون بن کر انھوں نے مزدوروں کی حالت مستحق اعانت بنا رکھی ہے ہم نے مانا کہ مجموعی طور پر مزدوروں کی مالی حالت بہتر ہے اور اضافۂ دولت کے ساتھ ایسا ہونا کیا تعجب ہے لیکن دراصل بحث یہ ہے کہ آیا انکی مالی حالت قابلِ اطمینان بھی ہے۔ فرض کرو کہ دولت میں بقدر ۲۰ فی صدی اضافہ ہو اور اُن میں سے صرف تین چار فی صدی تو غریب مزدوروں کے گروہ کثیر کو ملے اور باقی کُل چند مختصر طبقے سمیٹ لیں تو کیا مزدوروں کی ایسی ترقی کچھ ترقی کہلا سکتی ہے؟ البتہ ع

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مزدوروں کی موجودہ حالت جو کچھ ہے وہ بہ نسبت سابق بہتر سہی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کو اب بھی بہت زیادہ بہتر ہونا چاہئے۔ اور اشتراکیئین کی خصوصیت نہیں سب عالی حوصلہ اور باخبر لوگ اس خیال سے سراسر متفق ہیں؛

ترقی یافتہ ممالک میں تقسیمِ دولت کی عدمِ مساوات دیکھ کر آدمی چونک پڑتا ہے چند قابل لوگوں نے نہایت احتیاط اور عرق ریزی سے تقسیمِ دولت کے معتبر تخمینے تیار کیئے ہیں جن کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:-

امریکا میں ۱½ فی صدی آبادی ۷۰ فی صدی سے زیادہ مجموعی دولت کی مالک ہے۔ ۱۲ فی صدی دولت ۹⅕ فی صدی آبادی کی ملک ہے اور باقی ۱۸ فی صدی دولت ۸۹½ فی صدی آبادی میں منقسم ہے۔ ایک دوسرے تخمینے کے مطابق صرف ۳½ فیصدی آبادی ۲۰ فیصدی دولت، ۸ ۹/۱۰ فی صدی آبادی ۱۵ فی صدی دولت اور باقی ۹۱ فی صدی آبادی صرف ۲۹ فی صدی دولت کی مالک ہے۔ تیسرا تخمینہ ہے کہ امریکا میں

کچھ کم نصف خاندانوں کے پاس تو برائے نام بھی اندوختہ نہیں اور کنواں کھودنا اور پانی پینا صرف ⅛ دولت ⅞ خاندانوں کی ملک ہے اور ایک فی صدی خاندانوں کی دولت باقی ۹۹ فیصدی خاندانوں کی دولت سے کچھ زیادہ ہی ہے کم نہیں۔ بلحاظ غیر مساوی تقسیم دولت کے انگلستان کی حالت اور بھی ابتر ہے تین چوتھائی لوگوں کے نام کسی قسم کی ملک و جائداد درج رجسٹر نہیں۔ ان کے مال و اسباب کی مجموعی قیمت بھی ڈیڑھ ارب روپے سے زیادہ نہوگی، ۹۲ فی صدی آبادی کے پاس تو بمشکل ۸ فی صدی دولت ہوگی اور ۲ فی صدی) خاندانوں کی ملک باقی ۹۸ فی صدی کے مقابلے میں سہ گنی سے بھی زیادہ ہے۔ سلطنت برطانیۂ عظمیٰ کے مرکز لندن کا حال ذرا ملاحظہ ہو، جہاں مغربی حصے میں سر بفلک عمارات اور انبار تعیشات لامحدود دولت کا حیرت انگیز منظر دکھاتے ہیں مشرقی حصے کے خام و خستہ جھونپڑوں میں خدا کی لاکھوں سیلے برگ و نوا مخلوق حیوانات سے کچھ ہی بہتر زندگی بسر کرتی ہے۔ جوانی میں فطرۃً جرأت طلب کام کرنے کو دل چاہا کرتا ہے۔ ایک مشہور انگریزی مصنف نے ایسے کاموں کے سلسلے میں شریر گھوڑا دوڑانے کدانے، طوفان میں تیرنے کشتی چلانے اور آتش زدہ مقامات میں گھس پڑنے کے علاوہ لندن کے مشرقی حصے سے دن دہاڑے گزرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہاں کے غرق نکبت و افلاس باشندے بھوک اور شدت سرما سے جھنجھلا کر وحشیوں کی مانند راہ گیروں پر جھپٹتے اور ان کو دق کرتے ہیں ؛

عام خیال ہے کہ تقسیم دولت کی عدم مساوات امریکا میں سب جگہ سے بڑھی ہوئی ہے۔ مگر درحقیقت انگلستان اس معاملے میں سب سے پیش پیش ہے۔ انکم ٹکس کے سلسلے میں انگلستان اور

حصّہ سوم
باب شانزدہم

امریکا میں ۱۹۱۶ء میں کروڑپتیوں کی تعداد حسبِ ذیل دریافت ہوئی۔

ہر کروڑپتی کی دولت	ایسے کروڑپتیوں کی تعداد	
	سلطنت متحدہ برطانیہ و آئرلینڈ	ریاستہائے متحدہ امریکا
تقریباً چالیس کروڑ روپے	۷۹	۱۰
تقریباً بیالیس کروڑ روپے	۶۸	۹
چھبیس اور بتیس کروڑ کے درمیان	۴۵	۱۴
سولہ کروڑ کے قریب	امریکا سے ۹ زیادہ	نامعلوم
آٹھ اور بارہ کروڑ کے درمیان	۸۳	۹۷

دیگر ترقی یافتہ ممالک کا حال بھی کم و بیش امریکا اور انگلستان ہی کا سا ہے جہاں دولت بسرعت بڑھ رہی ہے تقسیم تو وہ سب میں ہوتی ہے اور اسی لئے بہ نسبتِ سابق مالی حالت سدھرتی جاتی ہے۔ لیکن حصّے بہت غیر مساوی ہوتے ہیں۔ بعض قابو یافتہ مختصر جماعتوں کو بہت زیادہ ملتا ہے اور مزدوروں کے گروہِ کثیر کو مقابلتاً کم، تقسیمِ دولت کی عدمِ مساوات جب تحقیق ہو چکی تو اب اس میں مناسب مساوات پیدا کرنے کی تدابیر پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تجاویز اصلاح ۴۔ واضح ہو کہ سوشیالزم کی بحث میں انفرادی املاک پر ازحد رد و قدح کی جاتی ہے اس طریق کی ایک خوبی تو مسلّم ہے اس سے پیدائش و بیش اندازئ دولت کا شوق ازحد بڑھتا ہے۔ لیکن تقسیمِ دولت کی روزافزوں عدمِ مساوات کا خاص الخاص باعث بھی یہی طریق قرار دیا جاتا ہے۔ انفرادی املاک طریق کی ابتدا اور توسیع کا مفصّل حال اصول قوانین کی کتابوں میں مذکور ہے، یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں۔ اس طریق کے صرف معاشی نتائج واضح کرنا اور تجاویزِ اصلاح جانچنا ہمارے مطلب کے واسطے کافی ہے، انفرادی املاک سے چند حقوق وابستہ ہیں جو

حصہ سوم
باب شانزدہم

موجودہ عدم مساوات کے بانی ہیں اور جن کی قانون ہر ملک میں حمایت کرتا ہے۔ املاک انفرادی ذاتی صرف میں آنے کے علاوہ دوسروں کو بطور ورثہ ہبہ یا وقف منتقل کی جاتی ہے نیز بلامعاوضہ یا کسی معاوضے پر عاریتہ دی جاسکتی ہے اور جدید معاشی ترقیات کی بدولت بہ نسبت سابق اب اس سے عمل پیدائش میں کہیں زیادہ کام لینا اور ماحصل زائد کی بڑی بڑی مقدار بشکل لگان سود اور منافع وصول کرنا آسانی ممکن ہے۔ ان حالات سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ بہت سے لوگ بلا محنت مشقت بڑی بڑی دولتوں کے مالک بن کر نہایت عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں حالانکہ بہت سے کام کرنے والوں کو جائز ضروریات بھی بدقت دستیاب ہوتی ہیں۔ دوسرے محض انفرادی املاک کی بدولت تھوڑے سے لوگ تو بطور زمیندار اصل دار و آجر کثیر پیداوار کے مالک بن بیٹھے اور باقی کل تہی دست مزدور رہ گئے جو نہایت قلیل معاش کے واسطے اُن کی دستگیری کے محتاج بھی ہیں اور اُن کی آمدنی بڑھانے میں معاون بھی۔ جو لوگ ہزارہا روپے آمدنی کی جائداد کے مالک ہوں اُن کی قسمت کا کیا کہنا۔ خود کمانے کی قابلیت ان میں کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو محنتی کاشتکار شب و روز جان کھپانے اور خون پانی کرنے سے جو کچھ کما سکیں اس کا صد ہا گنا وہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر وصول کر لیتے ہیں۔ کارندوں کے ہاتھ سے جو تھوڑا بہت نقصان پہنچتا ہے اس کی پروا نہ ہو تو انتظام اور نگرانی ریاست کے دردِ سر سے بھی نجات ممکن ہے، اگر ان کی ریاست کے قرب و جوار میں ریل یا نہر نکلے، کوئی عدالت دفتر یا مدرسہ قائم ہو، منڈی یا بازار کھلے یا آبادی بڑھے تو خواہ مخواہ اُن کی زمینوں کی قیمت اور آمدنی بھی ضرور بڑھیگی۔ حالانکہ مذکورالصدر تبدیلیوں میں ان کی برائے نام بھی شرکت نہ ہو اسی طرح پر اگر کسی کے پاس کچھ رقم ہو اور وہ اسکو کسی معتبر بنک میں داخل کردے یا اسٹاک خرید کر سرکاری قرض خواہ بنے یا کسی قابل اعتماد کاروبار کے حصے خرید کر صرف منافع کا شریک ہو جائے

حصّہ سوم
باب شانزدہم

اس کی جسمانی صحت ۔ دماغی قابلیت اور اخلاقی چال چلن کی حالت کیسی ہی ابتر کیوں نہ ہو خواہ وہ دنیا کے کسی حصّے میں جا کر رہے ہر حالت میں بلا ناغہ اس کو آمدنی ملتی رہنی تقریباً یقینی ہے ۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا کل سرمایہ کسی بنک وغیرہ میں داخل کر کے سود کی آمدنی سے عیش و عشرت اور سیر و شکار میں رشک کے قابل زندگی بسر کرتے ہیں ۔ آجر اگرچہ بمقابل زمیندار و اصل دار بہت زیادہ کام کرتا ہے لیکن وہ انفرادی املاک و معاشی اسباب کی مدد سے اپنی محنت سے کہیں زیادہ معاوضہ پا جاتا ہے اور زندگی کا لطف اٹھاتا ہے ۔ لیکن خدا کی کروڑہا مخلوق ہے جسے محنت کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی ہے اور سوائے علالت یا آزار یا بیکاری کے بچپن سے بڑھاپے تک ان کو کبھی فراغت سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا اور کچا پکا جھونپڑا موٹا جھوٹا کپڑا اور روکھا پھیکا کھانا اُن کی ضروریات کا منتہیٰ ہے طبقۂ مزدوراں اور زمینداروں اصل داروں آجروں کے گروہ میں سوائے اس کے کوئی عام اور مستقل فرق نہیں کہ وہ تہی دست ہیں اور ان کے پاس دولت ہے ۔ ہم نے مانا کہ محنت کے علاوہ زمین اصل اور نیز تنظیم پیدائش دولت کے واسطے ناگزیر ہیں ۔ اور ان کی پیداوار لگان ۔ سود منافع بجا اور درست ہیں ۔ لیکن ان کو بطور انفرادی املاک کیوں قائم رکھا جائے کہ پیداوار کا جزو کثیر تو مالکوں کے چند طبقے سمیٹ بیٹھیں اور تھوڑے سے بچے کھچے پر باقی لوگوں کو صبر کرنا پڑے کیا اچھا ہو کہ زمین اور اصل یہ دونوں عاملین پیدائش عوام کی قائم مقام یعنی گورنمنٹ کی ملک بن جائیں اور ان کی آمدنی چونکہ بیشتر عام معاشی ترقیوں کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ سرکاری خزانے میں داخل ہو کر کل ملک کے کام آئے ۔ لوگ سرکاری زمینیں جوتیں بوئیں یا سرکاری کارخانوں میں کام کریں ۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ سب کی کمائی ایک قومی بیت المال میں داخل ہوتی اور اسمیں سے ہر شخص جائز ضروریات کے واسطے خرچ لے لیا کرتا ۔ لیکن جب تک

خود غرضی کے بجائے انسان مجسم بے غرضی نہ بن جائے اس طریق پر عملدرآمد خواب و خیال سے بھی باہر ہے۔ پس جو جس قدر محنت کرے اس کی اجرت لے لے، جو کچھ ما حصل زائد ہو سرکار کو ملے اور سرکار اپنی طرف سے عام بہبودی پر صرف کرے، لوگ بطور اجرت جو کچھ کمائیں اسے کھائیں پئیں یا آڑے وقت کے لیئے بچائیں لیکن بطریق انفرادی املاک نہ تو وہ بطور ورثہ یا ہبہ اس کو منتقل کر سکیں نہ بطور خود اس سے پیدائش دولت میں کام لے سکیں۔ گویا ان کی کمائی محض ناقابل انتقال دولت ہو اور کچھ نہیں؛

حاصل کلام یہ کہ انفرادی املاک کا طریقہ بند کر کے کُل زمین اور اصل سرکاری ملک قرار دینا۔ نیز تنظیم کا کام گورنمنٹ کے سپرد کرنا گویا زمینداروں اصلداروں اور آجروں کے گروہ کو توڑنا۔ لگان سود اور منافع سرکاری تصرف میں دے دینا اور عوام کے لیئے سوائے محنت و اجرت کے کوئی اور ذریعۂ معاش باقی نہ چھوڑنا۔ اور تاکہ جدید نظام برقرار رہ سکے کمائی سے تاحین حیات اپنی اور اپنے کنبے کی پرورش کرنا لیکن نہ اس کو بطور ورثہ پسماندوں کو منتقل کر سکنا۔ نہ اس سے بطور عامل پیدائش کوئی کام لے سکنا۔ بالفاظ مختصر کمائی کو محض دولت ناقابل انتقال قرار دے دینا یہ سب تجاویز ٹھیٹ سوشیلزم کی پیش کردہ ہیں۔ انکی غرض واحد انفرادی املاک کا طریق روک کر دولت و آمدنی غیر مکتسب کے ذرائع بند کرنا ہے تاکہ ہر شخص اپنی قوت بازو سے روزی کمائے۔ نہ بذریعہ ورثہ یا ہبہ دوسرے کے اندوختے پر چین اُڑائے نہ سوائے محنت کے کسی اور عامل پیدائش کی پیداوار سمیٹے تاکہ تقسیم دولت میں جو تشویشناک عدم مساوات پھیلتی جاتی ہے رفع ہو جائے۔ جبکہ پیداوار صرف بمعیار محنت تقسیم ہوگی تو اول تو لوگوں کی مالی حالت میں موجودہ فرق کا عشر عشیر پیدا ہونا بھی ممکن نہیں۔ اور اس طریق سے اگر دوسروں کے مقابلے میں کسی کے پاس زیادہ دولت ہوگی بھی تو سراسر

جائز اور واجبی ہوگی۔ گاڑھے پسینے کی کمائی ہوگی۔ نہ کہ حسنِ اتفاق کا نتیجہ۔ واضح ہو کہ بعض نے بحیثیت مجموعی انفرادی املاک کے متعلق اتنی رعایت گوارا کی ہے کہ خالص اجرت کا اندوختہ جو کسی حالت میں بہت زیادہ نہیں ہو سکتا۔ بطور ورثہ یا ہبہ منتقل ہو سکتا ہے لیکن خود مالک یا وارث اس کو بطورِ عاملِ پیدائش استعمال کر کے آمدنی غیر مکتسب حاصل نہیں کر سکتے نیز بعض کا خیال ہے کہ چونکہ اضافۂ اصل و ترقی کاروبار بغیر انفرادی املاک کے محال ہے لہذا ان میں کوئی ردّ و بدل کرنا خلافِ مصلحت ہوگا۔ صرف زمین جو کہ عطیۂ قدرت ہے قوم کی مشترک مِلک ہونی چاہیئے چنانچہ اس تجویز سے ہم لگان کے تحت میں مختصراً بحث کر چکے ہیں۔

مذکورالصدر تجاویز پر غور کرنے سے آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اشتراکیین نے مساواتِ تقسیم کے جوش میں انسانی فطرت اور عام مشاہدات کو بُری طرح سے نظر انداز کیا ہے اور جو خرابیاں رفع کرنی مقصود ہیں ان سے بھی بدتر خرابیاں اُن کی پیش کردہ تجاویز کے عملدرآمد سے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ فیاضی اور بہبودیٔ عامہ کی خواہش مذہب اخلاق اور روشن خیالی کی بدولت خواہ کتنی ہی قوی اور عالمگیر کیوں نہ ہو جائے لیکن "میں" اور میری منفعت ہمیشہ سے ترقی کی روحِ رواں چلی آتی ہے۔ اور رہے گی یہ تو عام قانونِ فطرت ہے۔ دوسروں کی خاطر سے جدّ و جہد گوارا کرنا ہمیشہ ایک عارضی استثنا ثابت ہوا ہے اور ہوتا رہیگا۔ انسانی خُلق اور سرشت میں کایا پلٹ ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ انفرادی املاک کا طریق توڑنے اور اندوختے کو بطورِ اصل عملِ پیدائش میں لگانے سے روکنے کا یقینی نتیجہ کاروباری تنزل اور معاشی زوال ہوگا۔ جبکہ اندوختہ اصل بن سکے نہ ورثہ تو پھر لوگ پس انداز کیوں کرنے لگے اگر کچھ بچائیں گے بھی تو بس اتنا کہ تا حینِ حیات بُرے وقت کام آئے ورنہ صرف

اتنی محنت کریں گے کہ اس کی اجرت سے ضروریات با حصر حاصل ہوتی رہیں۔ نیز اگر اندوختہ ورثہ بن سکے لیکن بطور راس المال استعمال نہ کیا جا سکے تو بھی پس اندازی میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوگا۔ اب تک جو لوگ پس اندازی کی استطاعت نہیں رکھتے اُن کے سامنے بھی انفرادی املاک کی دلکش منزل مقصود تو موجود ہے جس کی طرف ترقی کی اُمنگ ان کو کھینچتی رہتی ہے۔ لیکن جب کل دولت یا کم از کم راس المال پر سرکاری املاک کی سد سکندری قائم ہو جائے گی تو جو لوگ پس انداز کر رہے ہیں ان کی بھی امنگیں سرد اور ہمتیں پست ہو جائیں گی محنت کا شوق بھی گھٹ جائیگا اور اضافہ راس المال میں سخت رکاوٹ پیش آنی یقینی ہوگی۔ مزید برآں جبکہ کاروبار سرکاری ملازمین کے ہاتھ میں ہوگا اور منفعت ذاتی غائب ہونے کی وجہ سے کسی کو اس سے ذاتی غرض اور دلچسپی بھی نہ ہوگی تو دیگر عاملین کی قوت پیدائش میں بھی ضعف آنا عجب نہیں۔ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ اپنے نج کے کاروبار کی ترقی میں لوگ جس قدر جان توڑ کوشش کرتے ہیں بحیثیت ملازم دوسروں کے کاروبار کے واسطے نہیں کرتے اور سرکاری انتظامات میں کفایت طلبی کا تو ذکر ہی کیا اکثر فضول خرچی کی شکایت سننے میں آتی رہتی ہے۔ ضابطے کی تاخیرات جو کہ کارگزاروں کی بے تعلقی کا نتیجہ ہوتی ہیں ضرب المثل ہیں اور ترقی کا جوش سرکاری کاروبار میں متابلۃً ہمیشہ کم پایا جاتا ہے اور اس کا باعث وہی کارکنوں کی ذاتی منفعت کی عدم موجودگی ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ سرکاری کاروبار نج کے کاروبار سے ہمیشہ خراب حالت میں ہوتے ہیں۔ بلکہ بہت سی مثالیں بالکل اس کے برعکس نظر آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ترقی کی اُمنگ کی کمی تو سرکاری کاروبار میں مسلم ہے لیکن اور لحاظ سے سرکاری کاروبار کو ایسی فوقیت حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اس نقص کی بدرجہ اولیٰ تلافی کر دے۔ واضح ہو کہ مذکورہ بالا نقص تو سرکاری کاروبار میں

عام ہوتا ہے۔ لیکن فوقیت ہونا نہ ہونا یا کم و بیش ہونا کاروبار کی نوعیت پر منحصر ہے۔ چنانچہ یہی عمومیت نقص اور خصوصیت توفق اس طویل اور کارآمد بحث کی بنا ہے کہ کونسے کاروبار سرکاری اہتمام کے واسطے مناسب ہیں اور کونسے نامناسب۔ بالفاظِ دیگر سرکار کن کاموں کو کامیابی سے چلا سکتی ہے اور کونسے کاروبار نج کے طور پر چلنے زیادہ مفید ہوں گے۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ جن کاموں میں پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد بدرجۂ اعلیٰ حاصل ہوں، جن میں بوجہِ کمال۔ ایجاد و جدت و اختراع کا میدان تنگ ہو چکنے کے واسطے زرِکثیر مطلوب ہو جن کے چلانے کے واسطے مدتِ دراز درکار ہو یا جن میں بہت زیادہ اعتبار کی ضرورت ہو ایسے کاروبار سرکاری اہتمام کے واسطے خاص طور پر مناسب ہوتے ہیں ڈاک خانہ، تار، نہریں، پختہ سڑکیں جنگلات اور سکہ یہ سب محکمے ہر ملک میں سرکاری قرار پا چکے ہیں اور نج کے طور پر ان کا چلنا دشوار ہے لیکن زراعت اور دیگر مصنوعات کے بیشمار شعبے بوجوہاتِ معکوس نج کے طریق سے کاروبار میں خوب پھولتے پھلتے ہیں اور سرکاری ہاتھوں میں ان کا ٹھٹھر کے رہ جانا یقینی ہے۔ بعض قابل مصنفین نے مع وجوہات سرکاری اور نج کے کاروبار کی مکمل فہرستیں مرتب کی ہیں جن کے بیان درج کرنے سے بخوفِ طوالت ہم معذور ہیں لیکن اس تفریق کے عام اصول وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے ؛

حاصل کلام یہ کہ گو بعض شعبے سرکاری اہتمام کے واسطے بھی موزوں سہی لیکن سرکار کو آجرِ واحد قرار دے کر پیدائشِ دولت کا کُل کاروبار اُس کے سپرد کر دیا جائے تو چند در چند وجوہات سے جو انسانی فطرت پر مبنی ہیں اس کا مجموعی نتیجہ معاشی تنزل ہوگا۔ پیدائش دولت اور اضافۂ اصل کی رفتار ضرور سست پڑ جائیگی اور اگر ایسا ہوا تو عوام کی تھوڑی بہت مرفہ الحالی جو باوجود عدمِ مساوات تقسیمِ حاصل پائی جاتی ہے

سوم
منہدم

خاک میں مل جائے گی۔ یہ خیال غلط ہے کہ موجودہ دولتمندوں کی آمدنی غربا میں تقسیم کرنے سے عام مرفہ الحالی میں کوئی نمایاں فرق پیدا ہوجائیگا۔ اگر دنیا کے کل پہاڑ مسمار کرکے ان کی خاک کرۂ ارض پر ہموار پھیلائی جائے تو سطح زمین بمشکل ایک آدھ انچ بلند ہوسکیگی بعینہ یہی حال دنیا کے بڑے بڑے زمینداروں، اصلاعِ دولوں اور آجیروں کی آمدنی کا ہے۔ اگر اس کو عوام میں تقسیم کرو تو دو چار بلکہ دس بیس روپے فی کس سے زیادہ اضافہ نہ ہو سکے گا۔ اور بحیثیت مجموعی عوام کی مالی حالت میں کوئی بڑی ترقی نہ ہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک جو مجموعی آمدنی حاصل ہورہی ہے وہ موجودہ آبادی کی ضروریات کے واسطے سراسر ناکافی ہے اور افلاس رفع کرنے کی لازمی شرط اضافۂ پیدائش دولت ہے۔ پس کوئی ایسا طریق جس سے پیدائش میں رکاوٹ پیدا ہو اضافۂ افلاس کا یقینی باعث ہوگا۔ ہرچند کہ مساوات تقسیم ضروری ہے ترقی پیدائش اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے اور عام مرفہ الحالی کے واسطے ہر دو لابدی۔ بدقسمتی سے ان دونوں میں ایک حد تک تضاد سا پھیلا ہوا ہے اور ایک ایسا طریق جو دونوں مقصد پورے کر سکے یعنی اضافۂ پیدائش بھی کرے اور تقسیم میں بھی مساوات پیدا ہو جائے اب تک تحقیق نہیں ہوسکا تاہم تھوڑی بہت جس حد تک بھی یہ صفت کسی طریق میں موجود ہو اسے ہی کو اتنا ہی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اور بحالتِ موجودہ اس لحاظ سے جو طریق بہترین نظر آتا ہے ہم اس کی ذیل میں تفصیل کرتے ہیں:

اشتراک
سرکاری

۵ ۔ نہ تو موجودہ طریق تقسیم بوجہ روز افزوں عدم مساوات قابل برداشت ہے نہ سوشیلزم کی انقلاب انگیز تجاویز پوری طور پر قابل عملدرآمد۔ ان دونوں کے بین بین ایک معتدل طریق اختیار کیا گیا ہے اصولِ غیر مداخلت میں ترمیم کرکے سرکار نے حسب ضرورت ہر مناسب طرح سے معاشی معاملات میں اپنی نگرانی و شرکت پھر جاری کردی۔ اول تو کاروبار کے اہم شعبوں پر نگرانی قائم کی۔ مثلاً بنک ایکٹ، فیکٹری ایکٹ

حصہ سوم
باب [illegible]

قانون دستاویزات تبادلہ خرید و فروخت وغیرہ بعض کا رواج جن کا ملکی بہبودی
اور ترقی سے بہت تعلق ہے اپنے واسطے مخصوص کر لئے اور اس سے ناجائز
[illegible] نفع اٹھانے لگے [illegible] تھا [illegible] خاندانے [illegible]
[illegible] کا [illegible] بلکہ [illegible]
[illegible] آمدنی ملنے لگی [illegible]
[illegible] اگر [illegible] طرح طرح کے ٹیکس
[illegible] بڑی بڑی [illegible] کا حصہ [illegible] مرفہ الحال پر
صرف [illegible] انفرادی املاک منضبط کرنے کے بجائے
[illegible] کے خلاف طریقوں سے [illegible] ضرورت پوری کی۔ کہیں
[illegible] کمزور اور نادار [illegible] پر جبر و تشدد [illegible] غریب
سے [illegible] کہیں [illegible] قبضہ کر کے پیداوار [illegible]
اور آج کل جانشین [illegible] سود و منافع کی مالک بن بیٹھی اور مزید برآں دولتمند
ٹیکس [illegible] ان کی آمدنی میں سے حصہ لیا تاکہ وہ عوام کے کام آئے
جن میں نسبتاً غالب غریب اور متوسط الحال لوگ ہوتے ہیں۔ [illegible]
نگرانی کاروبار۔ ملک زمین واصل اور ٹیکس آمدنی ان تدبیروں سے
انفرادی املاک کی مضرت گھٹا کر ایک حد تک تقسیم میں مساوات قائم کرنی۔

کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ موجودہ طریق تقسیم میں دو بڑے
نقص ہیں۔ اول بلا محنت و مشقت دولت کے مالک بن جاتے ہیں
اور اگر محنت کریں بھی تو اس کی اجرت سے صدہا گنی زیادہ آمدنی حاصل کر سکتے ہیں۔
نتیجہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت تو دولت میں دن دوگنی رات چوگنی
ترقی کر رہی ہے اور باقی خدا کی بے شمار مخلوق کو مقابلتاً اس کی عشر عشیر تک بھی
نصیب نہیں۔ بلکہ تھوڑی بہت آمدنی کے واسطے بھی آخرالذکر گروہ
اول الذکر مختصر جماعت کی اعانت و دستگیری کا محتاج ہے حالانکہ
ان ہی کی محنت ان کی دولتمندی کے واسطے لازمی شرط ہے۔ اس
افسوسناک غلطی اور بے بسی کا حقیقی باعث انفرادی املاک کا رواج ہے۔

حصۂ سوم
باب شانزدہم

خاک میں مل جائے گی۔ یہ خیال غلط ہے کہ موجودہ دولتمندوں کی آمدنی غربا میں تقسیم کرنے سے عام مرفہ الحالی میں کوئی نمایاں فرق پیدا ہو جائیگا۔ اگر دنیا کے کل پہاڑ مسمار کرکے ان کی خاک کرۂ ارض پر ہموار پھیلائی جائے تو سطح زمین بمشکل ایک آدھ انچ بلند ہوسکیگی بعینہ یہی حال دنیا کے بڑے بڑے زمینداروں، صنعتکاروں اور تاجروں کی آمدنی کا ہے۔ اگر اس کو عوام میں تقسیم کرو تو دو چار دس پانچ روپیہ فی کس سے زیادہ اضافہ نہ ہو سکے گا۔ اور بحیثیت مجموعی عوام کی مالی حالت میں کوئی بڑی ترقی نہ ہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک جو مجموعی آمدنی حاصل ہو رہی ہے وہ موجودہ آبادی کی ضروریات کے واسطے سراسر ناکافی ہے اور افلاس رفع کرنے کی لازمی شرط اضافۂ پیدائش دولت ہے۔ پس کوئی ایسا طریق جس سے پیدائش میں رکاوٹ پیدا ہو اضافۂ افلاس کا یقینی باعث ہوگا۔ ہر چند کہ مساوات تقسیم ضروری ہے ترقی پیدائش اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے اور عام مرفہ الحالی کے واسطے ہر دو لابدی۔ بدقسمتی سے ان دونوں میں ایک حد تک تضاد سا پیدا ہوا ہے اور ایک ایسا طریق جو دونوں مقصد پورے کر سکے یعنی اضافۂ پیدائش بھی نہ رکے اور تقسیم میں بھی مساوات پیدا ہو جائے اب تک تحقیق نہیں ہو سکا تاہم تھوڑی بہت جس حد تک بھی یہ صفت کسی طریق میں موجود ہو اسے ہم کو اتنا ہی غنیمت سمجھنا چاہئیے۔ اور بحالتِ موجودہ اس لحاظ سے جو طریق بہترین نظر آتا ہے ہم اس کی ذیل میں تفصیل کرتے ہیں۔

اشتراک سرکاری

۵۔ نہ تو موجودہ طریق تقسیم بوجہ روز افزوں عدم مساوات قابلِ برداشت ہے نہ سوشلزم کی انقلاب انگیز تجاویز پوری طور پر قابلِ عملدر آمد۔ ان دونوں کے بین بین ایک معتدل طریق اختیار کیا گیا ہے اصولِ عدم مداخلت میں ترمیم کرکے سرکار نے حسب ضرورت ہر مناسب طرح سے معاشی معاملات میں اپنی نگرانی و شرکت پھر جاری کر دی۔ اول تو کاروبار کے اہم شعبوں پر نگرانی قائم کی۔ مثلاً بنک ایکٹ، فیکٹری ایکٹ

حصہ سوم
باب [illegible]

[illegible] قانون و دستاویزات تھا [illegible] فروخت [illegible] بعض کا [illegible] جن کا ملکی [illegible]
اور ترقی سے [illegible] یہی تعلق [illegible] سے اپنے [illegible] مخصوص [illegible] لئے [illegible] اصل [illegible]
[illegible] نفع اٹھا [illegible] [illegible] [illegible] خانے [illegible]
[illegible] [illegible] کا [illegible] ملکیت [illegible] کے [illegible] اور
مثال [illegible] کا [illegible] آمدنی ملنے لگی [illegible]
[illegible] سے [illegible] اور [illegible] وجہ [illegible] طرح [illegible] گئیں
[illegible] بڑی [illegible] کا [illegible] مرفہ الحال پر
[illegible] انفرادی املاک ضبط کرنے کے بجائے [illegible]
[illegible] طریقہ [illegible] پوری کی [illegible] میں
[illegible] اگر [illegible] اور [illegible] ان سے جبر و تشدد [illegible] غریب
سے [illegible] کہیں [illegible] اور [illegible] قبضہ کر کے [illegible]
اور [illegible] کی جانشین اور [illegible] سود و منافع کی مالک بن بیٹھی اور مزید براں دولتمند طبقہ
[illegible] ان کی آمدنی میں سے حصہ [illegible] تاکہ وہ عوام کے کام آئے
جن میں [illegible] غالب غریب اور متوسط الحال لوگ ہوتے ہیں۔
نگرانی کاروبار۔ ملک زمین واصل [illegible] آمدنی ان تمام ترکیبوں سے
انفرادی املاک کی مضرت گھٹا کر ایک حد تک تقسیم میں مساوات قائم کرنی۔

کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ موجودہ طریق تقسیم میں دو بڑے نقص ہیں۔ لوگ بلا محنت و مشقت دولت کے مالک بن جاتے ہیں اور اگر محنت کریں بھی تو اس کی اجرت سے صدہا گنی زیادہ آمدنی حاصل کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت تو دولت میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور باقی خدا کی بیشمار مخلوق کو مقابلۃً اس کی عشر عشیر تک بھی نصیب نہیں۔ بلکہ تھوڑی بہت آمدنی کے واسطے بھی آخر الذکر گروہ اول الذکر مختصر جماعت کی اعانت و دستگیری کا محتاج ہے حالانکہ ان ہی کی محنت ان کی دولتمندی کے واسطے لازمی شرط ہے۔ اس افسوسناک غلبے اور بے بسی کا حقیقی باعث انفرادی املاک کا رواج ہے۔

حصۂ سوم
باب شانزدہم

عوام کی قائم مقام گورنمنٹ کل زمین و اصل ضبط کر کے تنہا زمیندار، اصلدار اور آجر تو بن نہیں سکتی اور بن بھی سکے تو بمقابلۂ اس نفع کے جو مساوی تقسیمِ دولت سے حاصل ہوگا بشکل معاشی تنزل زیادہ مضرت پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس مذکورالصدر اصلاح کی غرض سے ایک اعتدال آمیز طریق پر عملدرآمد جاری ہے۔ کہیں بذریعہ سرکاری نگرانی غریبوں کو دولتمندوں کی چیرہ دستی سے محفوظ کیا۔ کہیں بشرطِ امکان زمین اور کاروبار پر بھی قبضہ کرلیا اور کہیں بڑی بڑی آمدنیوں میں سے حصہ بانٹ کر غریبوں کے مفیدِ مطلب صرف کر دیا۔ گنوارو مثل ہے سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ "ہم عمل بدست آید و ہم یار نرنجد"، مروجہ طریق کو اسی کا مصداق سمجھنا چاہیئے۔ یہی وہ طریق ہے کہ جس کے رواج سے کمترین مضرت کا اندیشہ ہوسکتا ہے اور جس سے سوشیلزم کی غرض و غایت ایک معقول حد تک پوری ہورہی ہے چنانچہ اسی وجہ سے وہ ہر جگہ روز بروز مقبول ہو رہا ہے۔ اس کو اصطلاحاً سرکاری سوشیلزم کہنا بجا ہوگا۔ اس نکتے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسی تدبیر کو جو عدم مساوات تقسیم کو گھٹا دے اشتراکِ ارتقائی کی نوع سمجھنی چاہیئے چنانچہ سرکاری اشتراک کے علاوہ شرکتِ منافع کا مندرجہ بالا طریق ([illegible]) اور نیز امداد باہمی کا طریق جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے اشتراکِ ارتقائی میں شامل ہے۔

اب اشتراک کی دو خاص قسم یعنی انقلابی اور ارتقائی کا فرق خوب واضح ہوگیا۔ اول الذکر تو تشدد پر مائل ہے، اس کی تجاویز معدودے چند مگر انقلاب انگیز اور فطرتِ انسانی کے منافی ہیں اور اگر ان پر بہزار دقت بالجبر عملدرآمد بھی کرایا جائے تو جس قدر خرابی رفع کرنے کی امید ہے اس سے دس گنی مضرت پہنچنا سراسر یقینی ہے۔ اس کے برعکس آخر الذکر انسانی فطرت کا مقتضا بھی مدنظر رکھتا ہے، اسی وجہ سے اس کی تجاویز معتدل اور گوناگوں ہیں اور ان کے عملدرآمد کی منفعت کا پلہ مضرت سے بھاری ہے۔ جوں جوں بیجا جوش اور غلط فہمی رفع

حصّہ سوم باب ہشتم

ہوتی جاتی ہے اشتراک انقلابی کا زور ٹوٹ رہا ہے اور اشتراکِ ارتقائی کا اثر ہر طرف پھیل رہا ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل بھی کہہ چکے ہیں اس تحریک کی بحث بھی انواع و اقسام ہیں ہم نے دقیق اختلافات نظر انداز کر کے سیدھا سادہ لب لباب پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مفصل بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

باب نہم

امداد باہمی

(۱) امداد باہمی کی مختلف شکلیں (۲) قرض امداد باہمی (۳) خرید بامداد باہمی (۴) فروخت بامداد باہمی (۵) بود و باش بامداد باہمی۔

امداد باہمی کی مختلف شکلیں

۱۔ تقسیمِ عمل کے اصول پر کاربند ہونے سے جہاں گوناگوں فوائد حاصل ہوئے وہاں کچھ دقتیں بھی بڑھ گئیں اوّل تو اصل اور محنت ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں۔ اصلداروں کی ایک خاصی جماعت بن گئی جو کاروبار میں روپیہ لگاتی ہے یا دوسروں کو قرض دیتی ہے لیکن جب سے بنکوں مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کا رواج نکلا عوام کو بھی اپنے اندوختوں سے بطورِ اصل کام لینے کا موقع ملنے لگا۔ چنانچہ اس کی مختصر کیفیت بعنوانِ شکلِ اوّل اوپر بیان ہو چکی ہے بنکوں کی بدولت قرض لینے میں بھی

سوم [illegible]

بہت کچھ سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ اجرائے بنک کا منشا ہی یہ ہے کہ عوام کا اندوختہ جمع کر کے جن کو ضرورت ہو ان میں بطور قرض تقسیم کرے تا کہ یہ جدید طریق بشیتر مرفہ الحال اور بڑے بڑے کاروبار والوں کے واسطے مناسب اور مفید ہے۔ غریب لوگ ان سے بہت کم مستفید ہوتے ہیں اور اکثر ممالک میں ایسے ہی لوگوں کی کثرت ہے۔ اسوائے بنک کے ذریعے سے ان کے قلیل اندوختے تو کچھ کام آبھی جاتے ہیں۔ مگر ان کو قرض لینے میں اب بھی بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اور قرض بغیر ان کا کام چلنا دشوار ہے۔ اول تو قرض ملنا کم ہے اور ملا بھی تو شرح سود اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کی ادائی دشوار ہو جاتی ہے۔ صنعت و حرفت میں تو اب پیدائش بر پیمانہ کبیر کا رواج بڑھ رہا ہے۔ مزدور کو اصل قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی کیا اور کسی کارخانے میں کام کرنے لگا جو اجرت ملی اس پر گزر کر لی لیکن کاشتکار کو اب بھی تقریباً ہر ملک میں اپنی کھیتی باڑی کے واسطے تھوڑا بہت قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور جہاں اب تک پیدائش بر پیمانہ صغیر کا رواج باقی ہے دستکار بھی کاروبار کے واسطے تھوڑا سا قرض لیتے ہیں۔ ایسے بیشمار چھوٹے چھوٹے قرض لینے والوں کی سہولت اور فائدے کے خیال سے لین دین کا ایک نیا طریق نکالا ہے جو اکثر ممالک میں تجربے سے کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ اس کو قرض بامداد باہمی کہتے ہیں۔ اصلی منشا یہ ہے کہ غریب کاشتکاروں اور دستکاروں کو کاروبار کے واسطے چھوٹی چھوٹی رقمیں مناسب شرح پر بسہولت قرض ملتی رہیں اور نیز اگر ان کے پاس کچھ اندوختہ ہو تو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملے۔

اصل داروں کے مانند ایک بڑی جماعت تاجروں اور دکانداروں کی ہے جو کارخانوں دستکاروں اور کاشتکاروں سے مال خرید کر عوام کے ہاتھ فروخت کرتی ہے اور اس خدمت کے معاوضے میں منافع وصول کرتی ہے۔ غریب لوگ خردہ فروشوں سے پرچون سودا خریدتے ہیں

حصہ سوم
باب نہم

اس وجہ سے ان کو اکثر چیزیں بہت گراں ملتی ہیں اور وہ بھی عمدہ نہیں ہوتیں اگر یہ بہت سے لوگ مل کر کسی تھوک فروش سے معاملہ کریں تو قیمت میں بھی کفایت ہو سکے اور چیزیں بھی اچھی ملیں۔ چنانچہ اسی مقصد سے سرمایہ داری باہمی ایک طریق نکالا ہے جس کو خرید بامداد باہمی کہتے ہیں۔ [illegible] اور خوردہ فروش ایسے کاروبار میں جیسے بیچ میں نکلے اتنے سے عوام کو بہت اندیشہ ہے ان سے زیادہ نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ اسی سبب سے قرض بامداد باہمی اور خرید بامداد باہمی کی انجمنیں اکثر ممالک میں کثرت سے قائم ہو رہی ہیں۔ ان دو کے علاوہ امداد باہمی کے اور بھی عجیب اور کارآمد طریق نکل رہے ہیں۔ مثلاً فروخت بامداد باہمی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے دستکار یا کاشتکار مل کر اپنا مال کسی بڑے تاجر کے ہاتھ عمدہ نرخ سے فروخت کریں۔ اسی طرح سکونت بامداد باہمی ہم متعدد خاندان مل کر رہیں تاکہ مصارف خانہ داری میں کفایت ہو۔ یہ طریق سکونت ہوٹلوں اور کالجوں کے بورڈنگ ہاؤس اور ہاسٹلوں کے اصول پر مبنی ہے۔ اور ان ممالک میں خاص طور پر ضروری اور مفید ہے جہاں مکانات کا کرایہ گراں اور ملازموں کی تنخواہ بہت زیادہ ہو۔

امداد باہمی کے اور اور طریق بھی انگریزی کتابوں میں مذکور ہیں مگر وہ خاص خاص حالات کے واسطے موضوع ہیں۔ مذکورہ بالا چند طریقوں کی تفصیل یہاں پر کافی ہے۔

قرض بامداد باہمی

۴۔ کاشتکار اور دستکار چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لیتے ہیں اس قسم کے لین دین میں اول تو مصارف کاروبار بہت بڑھ جاتے ہیں۔ بہت سے چھوٹے قرضوں کا حساب کتاب رکھنا۔ ان کو وصول کرنا ہے حالانکہ اگر ان سب کے مجموعے کا ذخیرہ بھی صرف دو یا ایک شخص کو قرض دیا جائے تو بدرجہا سہولت اور کفایت ہو۔ دوسرے بوجہ بے سروسامانی ان لوگوں کا ضمانت بھی بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ یعنی ان سے قرضہ وصول ہونے کی امید کم ہوتی ہے اور روپیہ مارے جانے کا خطرہ

حصہ سوم
باب پنجم

لگا رہتا ہے۔ حالانکہ امیروں اور زمینداروں کے مال و جائداد سے قرضہ وصول کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ گویا چھوٹے قرضوں کے کاروبار میں مطالبات خطر بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ تیسری خرابی یہ کہ ان غریب جاہلوں کو قرض لیئے بغیر چارہ نہیں خواہ اس قدر سود ادا کرنا پڑے کہ وہ ہمیشہ کیواسطے قرض دہندہ کے غلام بن جائیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سالہا سال اس پر بھینٹ چڑھانی پڑے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مطالبات کاروبار اور مطالبہ سے خطر کی بیشی اور قرض گیروں کی ناچاری و بیبسی کی بدولت ایسے قرضوں کی شرح سود بہت بڑھی رہتی ہے تیس چالیس فی صدی تو معمولی بات ہے۔ اس سے زیادہ شرح بھی کچھ عجیب نہیں سمجھی جاتی چنانچہ مہاجن اور ساہوکاروں کی ایک بڑی جماعت اس قسم کے لین دین میں مصروف ہے۔ اوّل تو اس کاروبار میں ان کو بھی بہت کچھ درد سر اور صرفہ برداشت کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ رقم ماری جاتی ہے۔ دوسرے عوام بھی ایسے قرضوں کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں۔ قرضہ اور سود ادا کرتے کرتے عمر گزر جاتی ہے مگر کیا ممکن کہ حساب بیباق ہو۔ امداد باہمی کے ذریعے سے یہ سب خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اسی اصول پر ہزارہا انجمن **قرض** امداد باہمی ملک ملک قائم ہو رہی ہیں:

فرض کرو کسی گاؤں میں پچاس کاشتکار رہتے ہیں۔ ان سب کو تھوڑا بہت قرض درکار ہے۔ کسی کو پچاس ساٹھ روپے تو کسی کو سو سوا سو۔ کُل قرضوں کی مجموعی مقدار چار ہزار روپے ہے۔ علیحدہ علیحدہ معاملہ کرنے کے بجائے یہ سب کاشتکار مل کر ایک انجمن بنائیں اور اس کے نام سے چار ہزار روپے یکمشت قرض لے لیں۔ اور حسب ضرورت بطور خود آپس میں بانٹ لیں۔ اس صورت میں قرض دہندہ کو بہت سہولت ہو گی۔ کُل رقم صرف انجمن کے نام ہی کھاتے میں درج کر لی اور انجمن ہی دیندار رہی۔ مصارف کاروبار بہت گھٹ گئے ممبران انجمن میں بعض مقابلۃً زیادہ خوشحال ہوں گے۔ اب اگر ہر ایک ممبر بلا لحاظ اپنے قرضے کے

بقدر اپنے کُل مال و اسباب کے ادائی قرض کا ذمہ دار ہو یعنی ممبروں کی ذمہ داری غیر محدود ہو تو انجمن کا اعتبار بھی قرض دہندوں کی نظر میں بڑھ جائیگا اور مطالبات خطر میں معقول تخفیف ہوگی۔ فرداً فرداً معاملہ کرنے میں تو یہ کاشتکار بیشک بہت دبے رہتے تھے لیکن جب ان کی انجمن بن گئی تو اتفاق کے طفیل سے ان میں ایک گونہ قوت پیدا ہوگئی۔ ایک طرف تو کاروبار کی سہولت اور تخفیف خطر کی وجہ سے قرض دہندے شرح سود گھٹانے پر خود ہی آمادہ ہو جائیں گے۔ دوسری طرف انجمن بھی دیکھ بھال کر معاملہ کرے گی نہیں کہ قرض دہندے جو شرح مانگیں وہی قبول کرلے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو کاشتکار جدا جدا قرض لے کر تیس چالیس فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ سود ادا کرتے ہیں۔ انجمن کے ذریعے سے ان کو معمولی شرح سے قرض ملنے لگے گا۔ اور دس بارہ فی صدی سے زیادہ سود ادا کرنیکی نوبت نہ آئے گی؛

کچھ کاشتکار یا دستکار جن کی چھوٹی سے چھوٹی تعداد از روئے قانون مقرر ہے مثلاً کم از کم دس یا بارہ مل کر ایک انجمن قرض امداد باہمی قائم کرنے کی سرکار میں درخواست پیش کریں۔ اور حسبِ قانون و ضابطہ منظوری حاصل کرکے اپنی انجمن بنالیں جو ان کی طرف سے لین دین کے معاملات انجام دینے کی پوری مجاز ہوگی۔ سرکار کی طرف سے رجسٹرار مقرر ہیں جو انجمن قائم کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ان انجمنوں کو چند خاص قانونی شرائط و قیود کی پابندی بھی لازم ہے۔ مثلاً کسی محاسبِ مجاز یا آڈیٹر سے حساب و کتاب کی ششماہی یا سالانہ جانچ پڑتال کرانا قانونی نگرانی کا منشا صرف یہی ہے کہ انجمنوں کا کام باقاعدہ چلے اور کوئی ممبر خرد برد نہ کرسکے۔ انجمن کے چند عام اساسی اصول مقرر ہوچکے ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا ان سب کا مقصد بھی انجمن کو استحکام و تقویت پہنچانا ہے تاکہ اس کے قیام سے ممبر عرصۂ دراز تک فائدہ اٹھا سکیں؛

(۱) ممبرانِ انجمن کی ذمہ داری ادائی قرض کے معاملہ میں

غیر محدود ہوتی ہے یعنی بلا لحاظ خود قرضے کے ہر ممبر بقدر اپنی کُل ملک و مال کے کے مجموعی قرضے کا کفیل ہے۔ مثلاً کوئی ممبر انجمن سے صرف سو روپے قرض لے اور اس کے پاس ڈھائی سو روپے کا مال و اسباب موجود ہو اگر عدم ادائے قرض کے پچاس روپے کسی دوسرے ممبر کسی شخص سے وصول نہ ہو سکیں تو وہ رقم بھی انجمن اس سے خوشحال ممبر سے وصول کر سکتی ہے۔ بظاہر یہ اصول بڑا خطرناک اور خلاف انصاف نظر آتا ہے لیکن اوّل تو اس پر عملدرآمد ہونے کی شاذ و نادر نوبت آتی ہے۔ دیگر اصول و قواعد کے ذریعے سے کافی پیش بندیاں کر لی جاتی ہیں کہ قرضہ ڈوبنے یا وصول ہونے میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ اس کی تفصیل آئندہ بیان کی جاتی ہے۔ دوسرے غیر محدود ذمہ داری کی بدولت ہر ایک ممبر انجمن کے کاروبار میں بغایت احتیاط اور مآل اندیشی سے کام کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر انجمن کے کام پر تمام ممبر پوری پوری نگرانی رکھتے ہیں اور بد انتظامی کا خطرہ نہیں رہتا۔ تیسرے اسی اصول کے طفیل سے عوام کی نظر میں انجمن کا اعتبار بہت بڑھ جاتا ہے اور کمتر شرح سود پر روپیہ قرض ملنے لگتا ہے۔ چنانچہ غیر محدود ذمہ داری کا اصول انجمن ہائے امداد باہمی کا اصل بنیاد مقرر ہوتا ہے۔

(۲) صرف وہی لوگ انجمن کے ممبر بن سکتے ہیں جن کی ایمانداری نیک چلنی اور خوش معاملگی تحقیق اور مسلّم ہو۔ یہ اصول پہلے اُصول کا جزو لاینفک ہے۔ اس پر عمل ہونے کے بعد غیر محدود ذمہ داری کا خطرہ بہت گھٹ جاتا ہے۔ اور یوں بھی انجمن کی کامیابی کے واسطے ان اخلاقی صفات کی اشد ضرورت ہے۔ مزید برآں اس اصول کی پابندی سے

لوگوں کو اپنے اخلاق درست کرنے کی بڑی ترغیب ہوتی ہے۔ ایماندارانہ نیک چلن رہنے سے اُن کو کم شرح سود پر آسانی قرض مل جاتا ہے گویا اخلاقی صفات کا مالی معاوضہ موجود ہے۔

(۳) مندرجۂ بالا اصولوں کی پابندی اُسی وقت ممکن ہے جبکہ کُل ممبر پاس پاس رہتے ہوں ایک دوسرے کی حالت سے پورے طور پر واقف ہوں۔ انجمن کے کاروبار میں سرگرمی سے حصہ لیں اور کسی ناقابل اعتبار شخص کو انجمن میں شریک نہ ہونے دیں۔ چنانچہ تیسرا اصول قرار پایا کہ انجمن کی شرکت ایک مختصر رقبے تک محدود رہنی چاہئے۔ مثلاً ہر گاؤں میں ایک جداگانہ انجمن ہو۔ بلکہ ایک سے زیادہ ہوں تو بہتر ہے لیکن یہ خلاف احتیاط ہے کہ کئی گاؤں مل کر ایک انجمن چلائیں۔ اس حالت میں نہ ممبروں کو ایک دوسرے پر اطمینان ہو سکتا ہے اور نہ سب ممبر انجمن کے کام میں کماحقہٗ شریک ہو سکتے ہیں۔

(۴) چونکہ ممبروں کو انجمن سے معقول فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا یہی مناسب ہے کہ وہ حسب لیاقت انجمن کا کام بلامعاوضہ اعزازی طور پر سرانجام دیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو انجمن پر تنخواہ کا بار نہ ڈالیں۔ بحالتِ مجبوری زیادہ سے زیادہ ایک محاسب رکھ لیں جو لین دین کا حساب تیار کرے۔ لیکن یہ کام بھی اگر کوئی خواندہ ممبر انجام دے تو بہتر ہے۔ مالی کفایت کے علاوہ اعزازی خدمت سے ایثار کی عادت پڑتی ہے۔ ایثار بجائے خود ایک بڑی اخلاقی خوبی ہے اور امداد باہمی کی تحریک میں تو روح رواں کا کام دیتی ہے۔

(۵) قرض دیتے وقت یہ تحقیق کر لینا لازمی ہے کہ وہ رقم

کس بجا طور پر صرف ہوگی تاکہ ممبر فضول خرچیوں سے بچے رہیں۔ اور بعد کو نگرانی رکھنی چاہئیے کہ قرض لینے کی جو غرض بیان کی گئی ہو اُس کے خلاف روپیہ صرف نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی ممبر بیل خریدنے یا کنواں بنوانے کے خیال سے قرض لے تو وہ ہرگز مجاز نہیں کہ زرِ قرض خواہ بیاہ شادی یا کسی اور کام میں خرچ کرے۔

(۶) انجمن جس شرح سود پر خود قرض لے اُس سے کسی قدر زیادہ شرح پر ممبران کو قرض دے۔ اس طرح پر جو خالص منافع ملے اُس کے حصے سے تو کاروبار کے ناگزیر خرچ چلاوے اور دوسرے حصے کو بطور سرمایۂ محفوظ جمع کرتی رہے۔ رفتہ رفتہ سرمایۂ محفوظ کی اچھی خاصی مقدار فراہم ہو جائے گی۔ اوّل تو اس اندوختہ سے انجمن کا اعتبار بڑھ جائے گا، دوسرے بقدرِ مناسب عام مفید کاموں میں صرف ہو سکتا ہے۔ مثلاً ممبروں کے بچوں کے واسطے ایک مکتب یا پاٹ شالہ کھول دی جائے جہاں مفت تعلیم ہو یا چھوٹا سا دوا خانہ قائم ہو جہاں معمولی دوا بلا قیمت ملے لیکن ممبر کسی حالت میں اس فنڈ کو باہم تقسیم کرنے کے مجاز نہ ہوں گے حتّٰی کہ اگر انجمن ٹوٹ جائے تو یہ فنڈ باتفاقِ رائے کسی کارِ خیر میں صرف ہو، بلکہ بہتر ہے کہ بطورِ اعانت کسی بنک یا سرکاری خزانے میں داخل کر دیا جائے تاکہ اگر کوئی ایسی ہی انجمن آیندہ بنے تو اُس کو مدد ملے۔

(۷) اوّل تو غریب ممبروں کے پاس اندوختہ کہاں کہ وہ انجمن کے حصے خریدیں، وہ خود قرض کی جستجو میں رہتے ہیں۔ دوم حصے جاری کرنے میں یہ بھی پیچیدگی ہے کہ حصہ دار ممبر زیادہ مقسوم حاصل کرنے کے لالچ سے قرض کی شرح سود

بڑھانے پر اصرار کریں گے اور جب شرح سود بڑھی تو ممبروں کو انجمن سے کیا فائدہ پہنچا۔ پس اگر کوئی ممبر اپنا اندوختہ انجمن کے سپرد کرنا چاہے تو اُس کے ہاتھ حصے فروخت کرنے کے بجائے اُس کا روپیہ بطور امانت جمع کرلینا بہتر ہے۔ اور اُس پر بشرح معین سود دیا جائے۔ جس طرح کہ انجمن زیر قرض پر بنک یا ساہوکاروں کو سود ادا کرتی ہے۔ اسطرح پر انجمن اور ممبر اندوختوں سے یکساں مستفید ہوں گے:

مندرجہ بالا اصولوں پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ انجمن قرضہ امداد باہمی اچھی خاصی تربیت گاہ ہے اور عملی طور پر ممبروں کو ایمانداری نیک چلنی۔ کفایت شعاری مردم شناسی۔ ہمدردی۔ اعتماد۔ ایثار اور کاروباری بیداری کی تعلیم دیتی ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں امداد باہمی کے اصول پر انجمنیں قائم ہوئیں اخلاق اور معاشرت میں خودبخود اصلاح ہونے لگی۔ حتیٰ کہ بدرویہ لوگ مالی فائدے کے لالچ سے راہ راست پر آگئے:

انجمن کا کاروبار دو ایک منتخب کمیٹیوں کے سپرد رہتا ہے اور ممبروں کی عام پنچایت ششماہی یا سالانہ جلسے کرکے اس کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہے۔ سب معاملات بکثرتِ رائے طے ہوتے ہیں بنک یا ساہوکار سے قرض لینا۔ ممبروں کو اندوختہ بطور امانت جمع کرنا۔ ممبروں کو قرض دینا۔ ان سے مطالبہ وصول کرنا۔ حساب وکتاب رکھنا۔ اُس کی جانچ پڑتال کرانا۔ جلسے منعقد کرکے معاملات طے کرنا۔ حاصل کلام یہ کہ انجمن کے کاروبار کے متعلق پورے قواعد مرتب ہوچکے ہیں جنکی تفصیل امداد باہمی کی جداگانہ کتابوں میں مندرج ہے۔ بخوف طوالت اُسکو یہاں قلم انداز کرتے ہیں:

امدادِ باہمی کے طریق پر سب سے اوّل جرمنی میں عملدرآمد شروع ہوا۔ ضلع ہائن لینڈ میں کسی گاؤں کے ایک مقدم نے جس کا نام رفیزن تھا از راہِ ہمدردی وفیاضی اپنی گرہ سے کچھ رقم جمع کرکے ۱۸۴۹ء میں اس قسم کی

سوم بہم ایک انجمن قائم کی تاکہ قرب وجوار کے غریب دیہاتی قرضخواہوں کے پنجے سے نجات پائیں اور معتدل شرحِ سود پر اُن کو قرض ملنے لگے۔ مندرجۂ بالا اصول خود رفیزن نے وضع کیے اور جن انجمنوں میں ان پر عمل ہوتا ہے وہ ابتک رفیزن کی انجمنیں کہلاتی ہیں۔ بمقتضائے اختلاف حالات دیگر ممالک نے اس میں کچھ رد و بدل بھی کردیا۔ چنانچہ خود جرمنی میں ایک شولز نامی زمیندار نے اپنی ریاست میں قرض بامدادِ باہمی کی جو انجمنیں قائم کیں تو اس نے رفیزن کے بعض اصول میں ترمیم کردی بالخصوص یہ کہ انجمن ہی نے حصّے فروخت کیے اور ہر ممبر کے واسطے کم از کم ایک حصّہ خریدنا لازمی قرار پایا۔ ممبروں کی ذمہ داری غیر محدود ہونی لازمی و ضروری نہ رہی۔ شولز نے اپنی انجمنوں کا رقبۂ ممبری بھی زیادہ وسیع رکھا یعنی قرب وجوار کے مقامات کے لوگ بھی مل کر ایک انجمن بنا سکتے ہیں۔ سب کو ایک ہی گاؤں کا باشندہ ہونا ضرور نہیں۔ کاروبار کے قواعد میں بھی کچھ فرق ہے۔ مثلاً رفیزن کی انجمنیں طویل عرصے کے واسطے قرض دیتی ہیں جیسے چھ ماہ یا سال دو سال۔ اس کے برعکس شولز کی انجمنیں دو چار ماہ سے زیادہ کے واسطے قرض کم دیتی ہیں۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ رفیزن کی انجمنیں کاشتکاروں کے واسطے بنہایت مفید ہیں۔ شولز کی انجمنیں دستکاروں کے واسطے موزوں ہیں جسب حالات و ضروریات ہر دو قسم کی انجمنیں جابجا پھیل رہی ہیں۔ چنانچہ امدادِ باہمی کی تحریک گو ہندوستان میں اس صدی کے شروع میں جاری ہوئی لیکن سرکاری سرپرستی اور امداد کی بدولت ۱۹۱۶ء میں انجمن قرض بامدادِ باہمی کی مجموعی تعداد سولہ ہزار سے اوپر تھی جن میں ساڑھے سات لاکھ سے زیادہ ممبر شریک تھے اور جن کے پاس کاروبار کے واسطے ساڑھے آٹھ کروڑ روپے سے زیادہ اصل موجود تھا لیکن چونکہ ہندوستان خاص طور پر زرعی ملک ہے۔ رفیزن کی انجمنوں کی بہت کثرت ہے۔ شولز کی انجمنیں کہیں کہیں قصبات میں جاری ہو رہی ہیں؛

حصّہ سوم

باہمی خرید

۳۔ منافع کی بحث میں واضح ہو چکا ہے کہ بہ شکل سود خریداران کو چیزیں بالعموم ارزاں ملتی ہیں یا دیر میں بھی اچھی کم ملتی ہیں۔ اب فرض کرو کہ خریداروں کی ایک جماعت باضابطہ اپنی انجمنیں قائم کر لے کہ جو ان کی مستقل ضروریات مثلاً سامان خوراک و لباس وغیرہ تھوک فروش کارخانوں اور تاجروں سے ارزاں خرید کر ممبروں کے ہاتھ فروخت کرے۔ اس طریق سے اوّل تو چیزیں عمدہ قسم کی ملیں گی۔ دوسرے ارزاں ملیں گی۔ ایسی انجمنوں کا طریق کاروبار یہ ہے کہ کچھ رقم تو خود ممبر بطور امانت جمع کر دیتے ہیں جس پر ان کو بشرح مناسب باقاعدہ سود ملتا ہے۔ بشرط ضرورت کچھ رقم قرض لی جا سکتی ہے۔ سود اصل اور مصارف کاروبار ادا کرنے کے بعد جس قدر منافع بچے آئندہ ایک مناسب حصّہ سرمایۂ محفوظ میں داخل ہو جاتا ہے اور باقی ہر ششماہی یا سال کے آخر پر ممبروں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جو ممبر جس قدر زیادہ مال انجمن سے خریدتا ہے۔ اُسی حساب سے اُس کو منافع کا حصّہ ملتا ہے۔ اس طرح پر ممبر اپنی انجمن کو چھوڑ کر کسی دُکان کی طرف رُخ نہیں کر سکتے۔ اور گو خریدتے وقت اُن کو بازاری نرخ سے سامان ملتا ہے۔ لیکن منافع ملنے کے بعد وہ کافی ارزاں پڑتا ہے۔ خردہ فروشوں کی دستبرد سے تنگ آ کر اکثر ممالک میں دستکار۔ کاشتکار اور مزدور پیشہ لوگ اس قسم کی انجمنیں جاری کر رہے ہیں اور وہ مفید ثابت ہوئی ہیں۔ کاروبار کی قواعد کی تفصیل کے لیئے یہاں گنجائش نہیں۔ البتّہ یہ تذکرہ ضروری ہے کہ امداد باہمی خواہ کوئی شکل اختیار کرے۔ ایثار۔ ایمانداری اور باہمی اعتماد ممبروں کے واسطے لازمی ہے اور شرط قواعد انھیں اُصولوں کی تائید کرتی ہے۔ مزید براں ہر قسم کی انجمن امداد باہمی ایک خاص قانون کی تابع ہے۔ غرضکہ انجمن کے کاروبار میں بدمعاملگی کرنا آسان نہیں ہے۔ اسکول اور کالجوں کے لڑکے اگر چاہیں تو کتابیں اور دیگر ضروریات نوشت و خواند خریدنے میں ان انجمنوں کے ذریعے سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مزید براں کاروبار کا کچھ عملی تجربہ بھی حاصل ہوگا۔ ولایت کے بعض کالجوں میں ایسی انجمنیں

حصۂ سوم
باب ہفدہم

مدت سے قائم ہیں اور خوب چل رہی ہیں ؛

فروخت باہمی

۴۔ جب کاشتکار یا دستکار اپنا اپنا تھوڑا تھوڑا مال جدا گانہ فروخت کرتے ہیں تو اُن کو اچھی قیمت نہیں ملتی۔ اوّل تو وہ تجارت کی حالت سے کافی واقف نہیں ہوتے۔ دوسرے اُن کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اچھی قیمت کا انتظار نہیں کر سکتے جو کچھ دام وقت پر ملے لے لیتے۔ تیسرے اُن میں کوئی اتحاد نہیں ہوتا جہاں بعض نے کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے مال کا نرخ گھٹایا۔ اوروں کو بھی گھٹانا پڑا۔ اب اگر گاؤں گاؤں کے کاشتکار یا قصبوں کے دستکار مثلاً کوچی یا ٹیلی باضابطہ انجمن بنالیں جو اُن کی طرف سے کُل مال بطریق تھوک فروشی نکالے۔ اور براہ راست بڑے بڑے کارخانوں اور تاجروں سے معاملات کرے تو ممبروں کو اپنے اپنے مال کی یقیناً زیادہ قیمت ملے۔ ایسی انجمنیں کہیں کہیں کام کر رہی ہیں اور اُن پر وہی قانونی نگرانی قائم ہے۔ مصنوعات اور زرعی پیداوار کے علاوہ گھی۔ دودھ سی چیزیں بھی اس طریق سے فروخت ہوتی ہیں ؛

بود و باش باہمی

۵۔ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں مکانات کا کرایہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ زمین بہت بیش قیمت ہے اور ملازم بھی کمیاب ہیں۔ کئی کئی خاندان مل کے رہتے ہیں اس طرح پر خانہ داری کے مصارف میں بہت کفایت ہو جاتی ہے بعض بعض انجمنیں اپنے ممبروں کو مکانات بنانے کے واسطے پیشگی روپیہ دیتی ہیں اور اور زر قرض وسود متعدد برسوں میں بالاقساط وصول کر لیتی ہیں حساب بیباق ہونے تک بار کفالت مکان پر رہتا ہے۔ لین دین کے اُصول حتی الوسع ایسے فیاضانہ ہوتے ہیں کہ غریب لوگوں کو مکان بنانے میں دقت نہ ہو ؛

امداد باہمی کی اور بھی بہت سی شکلیں ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتی ہیں۔ اور وہ سب اس مشہور مقولے کی تصدیق کرتی ہیں کہ اتفاق بڑی طاقت ہے۔ یہاں پر امدادِ باہمی کا ایک نہایت مختصر خاکہ پیش ہو سکا۔ اس بحث کیواسطے جداگانہ کتاب درکار ہے ؛

حصہ سوم
باب سیزدہم

باب سیزدہم

ٹیکس

(۱) مالیات (۲) مفہوم ٹیکس (۳) تقرر ٹیکس (۴) اصول ٹیکس
(۵) اقسام ٹیکس (۶) اشکال ٹیکس (۷) انکم ٹیکس
(۸) ہاؤس ٹیکس (۹) محصول چنگی (۱۰) فیس اسٹامپ
و رجسٹری داخل خارج و لیسنس۔

مالیات

۱۔ اصطلاح مالیات سے مراد کسی سلطنت کے آمد و خرچ کا انتظام و حساب ہے۔ اس فن کی مفصل بحث کے واسطے تو ایک جداگانہ کتاب درکار ہے، یہاں خرچ کی تفصیل نظر انداز کر کے صرف اس قدر بیان کافی ہے کہ ہر قسم کی ملکی ترقی اور عام بہبودی، عمدہ حکومت کے قیام و استحکام سے وابستہ ہے۔ چنانچہ عمل پیدائش دولت میں سرکار بھی براہ راست یا بالواسطہ حسب حالات شریک مانی جاتی ہے اور حکومت کے واسطے خرچ ناگزیر ہے۔ رہی آمدنی وہ بھی ملک کی پیداوار سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا حکومت بھی بحیثیت مجموعی ایک عامل پیدائش ہے جو پیداوار میں سے حصہ لے کر اپنا کام چلاتی اور بشرط امکان اندوختہ جمع کرتی ہے۔ بحالت ضرورت مثل عوام اس کو قرض بھی لینا پڑتا ہے۔ واضح ہو کہ ازمنۂ سابقہ میں حکومت امن و امان قائم رکھکر پیدائش دولت میں محض بواسطۂ بعید شریک ہوتی تھی۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل جا بجا بتایا جا چکا ہے ہر مہذب حکومت معاشی معاملات میں روز افزوں دلچسپی

لینے لگی ہے اور بشرطِ موقع عام زمیندار اصل دار اور آجروں کے مانند کاروبار میں بھی مصروف نظر آتی ہے۔ المختصر حکومت بھی ایک عامل پیدائش ہے اور پیداوار میں سے اسکو جو حصّہ ملے وہ سرکاری محاصل کہلاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری محاصل کے بالعموم چار وسائل پائے جاتے ہیں

(ا) سرکاری اراضی وجنگلات جن کی پیداوار سے معقول آمدنی ملتی رہتی ہے؛

(ب) معاشی کاروبار مثلاً نہر۔ ریل۔ ڈاک خانہ یا افیوں کی تجارت ہندوستان میں اور تمباکو کی فرانس میں؛

(ج) قرض جو بمجبوری قلّت آمدنی۔ خرچ چلانے کے واسطے یا بغرض حصول منافع کاروبار میں لگانے کے واسطے کسی شرح سود پر عوام سے لیا جائے؛

(د) ٹکس؛

ان چاروں وسائل آمدنی میں سے اوّل تو عام کاروبار سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور اگر کچھ فرق ہے بھی تو اس کا بیان مالیات کی جداگانہ بحث میں زیادہ برمحل ہوگا۔ لیکن آمدنی کی چوتھی مد یعنی ٹکس جو عوام اپنے حصّہ پیداوار میں سے سرکار کو ادا کرتے ہیں براہ راست انفرادی ملک انفرادی آمدنی پر نہایت گہرا اثر ڈالتی ہے اور اس کے عملدرآمد سے ایسی معاشی قوانین ونتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں کہ جن کا بیان تقسیم دولت کے تحت میں جداگانہ طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر تازہ ترین تصانیف میں بھی یہی طریق اختیار کیا گیا ہے اور ہم بھی اس کتاب میں یہی مناسب سمجھتے ہیں؛

مفہوم ٹکس ۲۔ ٹکس سے مراد دولت کا وہ حصّہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارفِ حکومت کے واسطے ادا کریں۔ اس تعریف میں چند الفاظ غور طلب ہیں۔ اصطلاح دولت اپنے وسیع معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ گویا مال وجائداد کے علاوہ خدمات بھی اس میں شامل ہیں؛

حصہ سوم
باب پنجم

چنانچہ پچھلے معنوں میں یہ ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹیکس ہے۔ دولت کا انفرادی ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ جب تک دولت کسی کی انفرادی ملک نہ ہو کوئی گورنمنٹ اس سے اس کا کچھ حصہ وصول نہیں کر سکتی اسے اور کسی کو دینے کا حق حاصل ہے تو وہ یا ملکی دولت [illegible] سرکار کم و بیش خود ہی مالک ہوتی ہے۔ صرف انفرادی دولت ہی [illegible] عوام سے حصہ لینا پڑتا ہے۔ الفاظِ ذیل سے واضح ہوتا ہے کہ جب [illegible] انفرادی ملکیت اور آمدنی سے ادا کیا جاتا ہے تو ٹیکس دہندوں کے واسطے ایثار لازمی ہے۔ اگرچہ اس ایثار کے نتائج ان کے حق میں کہیں زیادہ مفید اور بیش بہا [illegible] ہوں بجز اختیاری طور پر [illegible] بلکہ اس [illegible] کا اظہار ہے کہ ٹیکس کی مقدار اور طریق وصول [illegible] خود مقرر کرتی ہے اور اگرچہ آئینی حکومتوں میں تقررِ ٹیکس کا اختیار [illegible] عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہے لیکن حیثیت ادا کنندہ عوام [illegible] بے بس رہنا پڑتا ہے اور ٹیکس ادا کرنے میں ان کی خوشی یا مرضی کو دخل نہیں جو ٹیکس قائم کر دیا جاتا ہے اس کو ادا کرنا ان کا قانونی فرض ہو جاتا ہے۔ لوگ سرکار کو جو کچھ اپنی طرف سے بطیبِ خاطر دیتے ہیں وہ پیشکش یا نذرانہ شمار ہوتا ہے سرکار سے مراد لازماً مرکزی حکومت نہیں بلکہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا جزو حتیٰ کہ قصبات کی میونسپلٹی بھی جداگانہ طور پر سرکار شمار ہو سکتی ہے حکومت کے قیام و استحکام کے واسطے بیشمار مصارف ناگزیر ہیں جن میں سے بعض تو سرکاری املاک [illegible] کاروبار کی آمدنی اور قرض سے پورے ہوتے ہیں اور باقی عوام اپنی جیب سے بطریق ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

تقررِ ٹیکس
۳۔ یہ مسئلہ علمی اور عملی لحاظ سے نہایت معرکۃ الآرا اور اہم ہے کہ کس اصول کے مطابق لوگوں پر ٹیکس قائم کرنا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر کس سے کتنا ٹیکس وصول کیا جائے اور مقدارِ ٹیکس کا معیار کیا ہو۔ سب سے قدیم اور سیدھا سادہ مگر از حد ناقابلِ عمل معیار تو سرکاری خدمات ہیں جو ٹیکس دہندہ کو حاصل ہوں گویا جس طرح کہ مزدور کو محنت کی اجرت دی جاتی ہے ٹیکس بھی سرکار کی خدمت کا معاوضہ ہے۔ اس

ہر ایک جو سرکار سے جتنی خدمت لے اسی کے مطابق معاوضہ بشکل ٹکس ادا کرے۔ واضح ہو کہ سرکاری خدمات اس قدر بیشمار اور اُن کے نتائج اس قدر گونا گوں ہیں کہ ان میں کسی شخص کے حصّے کا تخمینہ کرنا محال یعنی ناممکن ہے۔ پُلوں فوجوں جنگوں فتوحات اور اعلیٰ حکام کی تنخواہوں پر سرکاری آمدنی کا سب سے بڑا حصّہ صرف کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو اُن سے جو فائدہ پہنچتا ہے اس کا جداگانہ تخمینہ کیونکر ممکن ہے۔ اور اگر نہیں تو جو ٹکس ان مصارف کے واسطے طلب کیا جائے وہ سرکار کی خدماتِ منفردہ کے کیونکر مساوی مقرر ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو ٹکس شہر کی صفائی روشنی سڑکوں کی درستی اور واٹرورکس پر صرف کرنے کی غرض سے میونسپلٹی وصول کرتی ہے اس کے تقرر میں معیارِ خدمات کی تھوڑی سی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن پورا پورا عملدرآمد وہاں بھی ممکن نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ معدودے چند حالتوں میں تو ٹکس کسی حد تک بمعیارِ خدمات مقرر ہو سکتا ہے۔ لیکن مصارف کی بڑی بڑی مدوں میں جن کے واسطے گرانبار ٹکس قائم کئے جاتے ہیں نہ خدماتِ منفردہ کا تخمینہ ممکن ہے نہ تقرر ٹکس میں معیارِ خدمت کا برائے نام بھی لحاظ کیا جا سکتا ہے۔ اوّل الذکر قسم لوکل یا مقامی ٹکس کہلاتی ہے اور آخر الذکر امپیریل یا ملکی ٹکس۔ حاصلِ کلام یہ کہ مقامی ٹکس میں پورا تو ہرگز نہیں مگر تھوڑا بہت لحاظ معیارِ خدمات کا تقرر ٹکس میں ضرور ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ رہا ملکی ٹکس۔ جبکہ خدماتِ منفردہ کا برائے نام بھی تخمینہ نہیں کیا جا سکتا تو اس معیار کا لحاظ کیونکر ممکن ہے؟

جبکہ سرکار کی خدماتِ منفردہ کا تخمینہ ممکن ہے اور نہ ٹکس ان کے معیار کے مطابق مقرر ہو سکے تو پھر چونکہ تمام ملک ایسی خدمات سے مستفید ہوتا ہے سب سے بلا امتیاز مساوی مقدارِ ٹکس وصول کرنا بہت آسان ہوگا اور کچھ خلافِ انصاف بھی نہیں۔ واضح ہو کہ خدماتِ منفردہ کا تخمینہ ممکن نہ سہی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سب لوگ ایسی خدمات سے یکساں مستفید نہیں ہو سکتے اور بالعموم دولتمندوں کو بمقابلہ غربا کے

بہت زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ مزید براں جب غربا کو اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہو رہا ہو اور بسر اوقات کے واسطے دوسروں کی فیاضی کے دست نگر ہوں تو ان سے ٹیکس طلب کرنا کہاں تک قرینِ انصاف اور عدل کرنا کہاں تک ممکن ہے ان کی تو وہی مثل ہے جامہ ندارم دامن از کجا آرم۔ غریب بھلا ننگے میں سے تانگا کیونکر دے سکتے ہیں۔ اصح ہو کہ غربا اور ایسے متوسط الحال لوگوں کی تعداد ہر ملک میں بہت بڑی ہے جو بارِ ٹیکس کے بالکل متحمل نہیں ہو سکتے اور ان سے ٹیکس وصول کرنا یا تو محال ہے یا سراسر ظلم۔ لہذا مساوی ٹیکس کا یقینی نتیجہ خود ملک کی تباہی و بربادی ہوگا۔

مذکورالصدر دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر تقررِ ٹیکس کا ایک تیسرا اصول تجویز کیا گیا ہے جس پر آجکل بالعموم عملدرآمد بھی ہو رہا ہے یعنی یہ کہ ہر شخص سے اس کی مالی حیثیت کے موافق ٹیکس وصول کرنا چاہیئے۔ دولتمندوں سے زیادہ، متوسط الحال سے کم اور غربا سے کچھ نہیں۔ گویا تقررِ ٹیکس کا معیار خدماتِ منفردہ یا مساوات کی بجائے مالی حیثیت ہونا چاہیئے اب ایک دشوار سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مالی حیثیت سے کیا مراد ہے اور اس کے تخمینے کا کیا اصول ہونا چاہیئے اور مالی حیثیت کے تین معیار ہو سکتے ہیں۔ مال و جائداد یا آمدنی خام یا آمدنی خالص۔ ان میں سے کوئی معیار لے کر ٹیکس دو طریق پر مقرر کیا جا سکتا ہے:

(۱) ٹیکس اور ملک یا آمدنی کے مابین ایک عام نسبت قرار دی جائے مثلاً کچھ فی صدی سالانہ اس کو اصطلاحاً ٹیکس متناسب کہتے ہیں۔

(ب) مقدارِ ملک یا آمدنی کی کمی بیشی کے مطابق نسبت یعنی شرحِ ٹیکس میں بھی تخفیف و اضافہ کیا جائے۔ مثلاً ہزار روپے تک ۳ فی صدی۔ ایک ہزار کے بعد پانچ ہزار تک $3\frac{1}{2}$ فی صدی۔ پانچ ہزار سے اوپر دس ہزار تک ۴ فیصدی

اور دس ہزار سے بالاتر ملک یا آمدنی پر ۵ فی صدی ٹیکس قائم کیا جائے
اس کو اصطلاحاً ٹیکس متزائد کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ ان وجوہات کی بنا پر جن کا مساوی ٹیکس کے تحت میں ذکر آچکا ہے۔ ملک یا آمدنی کی کوئی ایسی تعداد یا مقدار جو قیام حیات کے واسطے لازمی ہو ٹیکس سے ہر صورت میں مستثنیٰ کر دی جاتی ہے۔ گویا غریب لوگوں سے جن کی ملک یا آمدنی بمشکل ان کی ضروریات کے واسطے بمشکل کفایت کرتی ہے کوئی ٹیکس نہ لینا چاہئے جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ملک یا آمدنی کی کم سے کم قابل ٹیکس مقدار قانوناً مقرر کرنی پڑتی ہے اور کل کمتر مقداریں ٹیکس سے معاف ہوتی ہیں۔

ٹیکس تناسب کا طریق بہت سہل اور سادہ ہے لیکن ٹیکس متزائد زیادہ قرین انصاف و مصلحت ہے۔ فرض کرو کہ عام شرح ٹیکس آمدنی کا دس فی صدی سالانہ ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ۱۰۰ روپیہ ماہوار آمدنی والے کو ۱۰ روپیہ ماہوار ٹیکس دینا بہت زیادہ گراں گزرے گا بمقابلہ ایک ہزار آمدنی والے کے جو اسی شرح سے سو روپے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ دس ہزار آمدنی والے کو ایک ہزار روپے ٹیکس اور بھی کم بار معلوم ہوگا۔ اور ایک لاکھ روپے آمدنی میں سے دس ہزار روپے دے دینے سے مالی حالت پر مقابلۃً بہت ہی کم اثر پڑ سکتا ہے چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ آدمی جس قدر زیادہ دولتمند ہوتا ہے اسکی نظر میں بمقابلہ متوسط الحال اور غریب لوگوں کے روپے پیسے کی قدر و قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔ صدہا بلکہ ہزارہا روپے کی وہ اتنی بھی قدر نہیں سمجھتے ہیں جتنی کہ غریب لوگ چند روپوں بلکہ آنوں کی۔ مبادلہ دولت کے تحت میں اس نکتہ پر خاصکر بعنوان تقلیل افادہ مفصل بحث کر کے بہت سے اصول اخذ کئے گئے ہیں جن کی مناسب موقع پر آئندہ [illegible] کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر ذکر مقصود ہے کہ یکساں شرح سے بمعیار ملک یا آمدنی امیر و غریب سے ٹیکس وصول کرنے کا نتیجہ

عدم مساوات پیدا ہوگا اور حقیقت یہ تھا [illegible] کے خیال [illegible] ٹیکس کا زیادہ بار
پڑنے لگا لیکن اگر ٹیکس بہت زیادہ ترقی [illegible] جائے تو [illegible] اثبات کے علاوہ
[illegible]
مساوات [illegible] اثبات کا اصول [illegible] جاتا ہے اور
[illegible]
لیکن [illegible]
[illegible]
آمدنی کے متعلق غلط بیانی پر زیادہ مائل ہوا [illegible] سب سے بڑا اندیشہ
یہ ہے کہ شرح ٹیکس کی زیادتی کے خوف سے لوگ دولت فراہم
کرنے میں کمی کر دیں گے۔ غور کرنے سے صاف ظاہر ہوگا کہ [illegible]
اعتراض کرنے کی خاطر سے یہ اعتراض کئے [illegible] اول تو
اعتراض تو کم مناسب [illegible] ہوتے ہیں اور دوسرا اس وجہ سے
قابل التفات نہیں کہ جب تک زیادتی حد تک نہ آ جائے شرح ٹیکس
بہت ہی زیادہ اضافہ نہ ہو کوئی ایسا نتیجہ [illegible] نامناسب
شرح کا اضافہ ہمیشہ معتدل اور مناسب ہوتا ہے [illegible] کبھی کم از
نہیں بنایا جاتا ہے کہ لوگ اس کو ناقابل برداشت سمجھ [illegible] دولت
جمع کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اگرچہ [illegible] کی طرف سے ابھی تک مخالفت
جاری ہے لیکن چونکہ عوام کے حق میں مفید ہے ٹیکس [illegible] کا رواج
ہر ملک میں پھیلتا جاتا ہے، خود ہندوستان میں بھی انکم ٹیکس کا یہی اصول
اختیار کیا گیا ہے، جنگی مصارف کی مجبوریوں سے شرح میں ۱۹۱۵ء سے
سال بسال کچھ اضافہ ہو رہا ہے ۱۹۲۱ء تک انکم ٹیکس کا طریق یہ تھا کہ
ایک ہزار روپیہ سالانہ سے کم آمدنی تو معاف۔ ایک ہزار سے لے کر
دو ہزار سے کم تک شرح ٹیکس ۴ پائی فی روپیہ، ۲ ہزار سے لے کر
پانچ ہزار سے کم تک ۵ پائی فی روپیہ، پانچ ہزار سے لے کر دس ہزار
سے کم تک ۶ پائی فی روپیہ، دس ہزار سے لے کر ۲۵ ہزار سے کم تک

۹ پائی فی روپیہ اور ۲۵ ہزار یا اس سے زیادہ آمدنی پر ایک آنہ فی روپیہ انکم ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں انکم ٹیکس بنام سپر ٹیکس جدید اضافہ ہوا تفصیل ملاحظہ ہو:-

۲۵ ہزار سے ۵۰ ہزار تک انکم ٹیکس	۱	فی روپیہ	
۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک	″	۲	″
ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ تک	″	۲.۵	″
ڈیڑھ لاکھ سے دو لاکھ تک	″	۳	″
دو لاکھ سے ڈھائی لاکھ تک	″	۳.۵	″
ڈھائی لاکھ سے اوپر آمدنی پر	″	۴	″

گویا پچاس پچاس ہزار کی پہلی پانچ رقموں پر تو سپر ٹیکس بتدریج آدھ آدھ آنہ بڑھتا ہے۔ اور ڈھائی لاکھ کے بعد عام شرح ۴ فی روپیہ ہوجاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ٹیکس سرکار کی خدمات منفردہ کے معیار سے مقرر ہوسکتا ہے۔ بمقدار مساوی ہر شخص سے وصول کیا جاسکتا ہے۔ تقرریہ بمقدار مساوی ہر شخص سے وصول کیا جاسکتا ہے۔ تقرر ٹیکس کا قابل عمل معیار صرف لوگوں کی مالی حالت ہے۔ رہا طریق تقرر بعض لوگ مساوی شرح کے حامی ہیں اور بعض اس کو مساوات ایثار کے منافی ثابت کرکے حسب فرق حیثیت مدارج شرح کے موید ہیں۔ لیکن بمقابلہ ٹیکس متناسب کے ٹیکس بتزائد کا رواج بڑھتا نظر آتا ہے۔

یہاں پر تقرر ٹیکس کے متعلق دو ضروری اصطلاحوں پر توجہ دلانا بے محل نہ ہوگا۔ اول معیار ٹیکس جس سے کسی چیز کی جسامت، وسعت، طول، وزن یا قیمت کی وہ مقدار معین مراد ہوتی ہے کہ جس کے حوالے سے ٹیکس قائم کیا جائے۔ مثلاً فی مکعب گز پتھر یا لکڑی، فی مربع بیگہ زمین، فی گز کپڑا، فی من غلہ یا فی صدی مال۔ دوم شرح ٹیکس جس سے ٹیکس کی وہ مقدار معین مراد ہے جو فی معیار وصول کی جائے مثلاً ۴ سر

حصّہ سوم
باب ۲۴

فی مکعب مربع گز۔ اور من یا ۴ روپیے فی صدی آمدنی:

اصول ٹیکس

۴۔ متعدد مصنفین نے چند اصول وضع کئے ہیں جن کو ٹیکس قائم کرنے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور جن کی خلاف ورزی سے عام مرفہ الحالی اور معاشی ترقیات کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ اہم اصول بہ ترتیب اہمیت ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

ا۔ پیدا آوری۔ ٹیکس بدرجہ اولیٰ پیدا آور ہونا چاہئے۔ یعنی ماحصل ٹیکس کی مقدار بہت معقول ہونی چاہئے۔ ٹیکس قائم کرنے کا منشا مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنا ہے اور جب ایسی آمدنی کی مقدار قلیل ہو تو گویا ٹیکس ناقص ہے اور حصولِ آمدنی کی غرض و غایت اس سے بدرجہ ادنیٰ پوری ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اجرائے ٹیکس میں اور باتوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے اور کرنا چاہئے چنانچہ ان میں سے خاص خاص ہم ذیل میں بیان کریں گے۔ لیکن پیدا آوری ہر ٹیکس کی اساسی اور مقدم ترین خوبی ہے جس کا لحاظ باقی سب پر فائق ہونا چاہئے۔ بالفاظ مختصر عمدہ ٹیکس کی خصوصیت اولین محصل کی بیشی ہے:

ٹیکس کے مناسب ذرائع کا انتخاب اول تو وسعتِ معلومات پر منحصر ہے دوم اس کے واسطے جرأت و استقلال بھی درکار ہے کہ نہ غیر ہردل عزیزی کا اندیشہ سدراہ ہو سکے نہ مخالفت کا خوف۔ ماہر مالیات نیک نظری سے پیدا آور ذرائع پہچان کر اور بلا تامل اُن پر ٹیکس قائم کر کے ملکی آمدنی میں اضافہ کر دکھائیگا:

ب۔ کفایت: ٹیکس حتی الامکان کم خرچ ہونا چاہئے۔ اس کے تین مفہوم ہیں اول یہ کہ جو کچھ صرفہ اہی ٹیکس میں صرف ہو اس کی مقدار بمقابلِ ماحصلِ ٹیکس ادنیٰ سے ادنیٰ ہو۔ مثلاً اگر مصارفِ ماحصل کے ۱۰ اور ۱ فی صدی ہوں تو بلحاظِ کفایت ٹیکس اول الذکر بہتر ہے اور ماحصل کے ۵ فیصدی مصارف والا ٹیکس

حصہ سوم
باب پنجم

اس لئے بھی بہت شمار ہوگا۔ دوسرے ٹیکس دہندوں کو مقدارِ ٹیکس سے زیادہ ادا کرنا نہ پڑے۔ اس نکتے کی تشریح آگے چل کر اقسامِ ٹیکس کے تحت میں کی جائیگی۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ ٹیکس کو افزونیِ دولت اور اضافۂ خوشحالی میں مانع اور مزاحم نہ ہونا چاہئے۔ بعض ٹیکس بمقابلہ دوسروں کے لوگوں کو زیادہ گراں گزرتے ہیں اور کاروبار پر بھی ان کا مضر اثر پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرکار کو جتنا محصول ملتا ہے اُس سے کہیں زیادہ عوام کو نقصان پہنچ جاتا ہے اور کاروباری تنزل سے خود ذرائعِ ٹیکس مسدود اور محدود ہونے لگتے ہیں اور بالآخر حکومت کا محصول بھی گھٹ جاتا ہے۔ گویا کفایتِ ٹیکس کی اوّلین خوبی پیداوار کی لازمی شرط ہے۔

آگے چل کر صرفِ دولت کے تحت زیرِ عنوان "نفع الصرف" واضح کیا جائے گا کہ ٹیکس میں صفتِ کفایت کن کن صورتوں میں موجود ہو سکتی ہے اور کن میں مفقود جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے ٹیکس ستراند پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ افزونیِ دولت اور ترقیِ کاروبار میں حارج ہوگا گویا وہ کفایت کے منافی ہے۔

ج۔ **عدل**: ٹیکس انصاف سے قائم کرنا چاہئے۔ اس اصول کی تکمیل کی متعدد تدابیر تقررِ ٹیکس کے عنوان سے اوپر بیان ہوئی ہیں یہاں مختصراً اعادہ کافی ہے۔

(۱) ٹیکس بمعیارِ خدمات۔ ٹیکس سرکاری خدمات کے مساوی ہونا چاہئے۔ لیکن ہر شخص سرکاری خدمات سے جس قدر مستفید ہوتا ہے اس کا برائے نام بھی اندازہ دشوار ہے۔

(۲) ٹیکس مساوی۔ ٹیکس سب پر بمقدار مساوی قائم ہونا چاہئے خواہ مفلس اور غریب ہوں ان کو

حصّہ سوم
باب ہشتم

اپنی جان و مال سے ہے اور کمینہ پن سے محال ہے کہ ٹیکس ادا کر سکتے ہیں۔ ان سے ٹیکس کا مطالبہ کرنا ان کا سخت ترین نقصان اور ظلم ہوگا۔

(۲) اگر ٹیکس [illegible] مالی حالت کی [illegible] بشرح مساوی قائم ہونا چاہئے [illegible] قریب انصاف نظر آتا ہے [illegible] ہوں گے۔

(۳) ٹیکس بہت سے ذرائع پر [illegible] بشرح مختلف قائم ہونا چاہئیے یعنی امرا پر بشرح اعلیٰ اور غربا پر بشرح ادنیٰ تاکہ سب ٹیکس دہندے مساوی بار یا ایثار محسوس کریں۔ مزید برآں آگے چل کر انتقال ٹیکس کی بحث سے واضح ہوگا کہ ٹیکس کا بار کبھی ٹیکس دہندہ پر قائم رہتا ہے اور کبھی دوسرے لوگوں پر بھی منتقل ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں حصول عدل کی کوئی تدبیر بھی پورے طور پر قابل عمل نہیں۔ البتہ جس حد تک بھی عدل کا منشا پورا ہو سکے غنیمت سمجھنا چاہئیے۔

د۔ تغیر پذیری: ٹیکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحوں سے اس طرح پر قائم کرنا چاہئیے کہ حسب حالات اس کی مقدار حاصل میں اضافہ و تخفیف ہو سکے۔ یہ نہیں کہ مصارف حکومت کیواسطے خواہ زیادہ رقم درکار ہو یا کم ہر حالت میں ماحصل ٹیکس کی مقدار وہی ایک رہی اور کبھی خرچ کے واسطے بھی ناکافی ہو اور کبھی زاید بچ رہے، گھر بار کے انتظام میں تو بالعموم مصارف آمدنی کے ماتحت ہوتے ہیں لیکن نظام سلطنت میں آمدنی کو مصارف کا

حصہ دوم
باب پنجم

پیدا کیا جاتا ہے جس کا محصول [illegible] جس [illegible] کمی بیشی
معاملات کی مناسبت کرے بہتر ہے ورنہ بصورت دیگر سلطنت کی
مالی حالت ہمیشہ متزلزل رہے گی۔

تعجب ہے کہ امریکہ کے مثل ترقی یافتہ سلطنت کی اب تک
یہ حالت ہے کہ گو ہماری تمام حکومت سے بہت زیادہ
[illegible] اور بھی [illegible] کی بدولت کام چلتا ہے [illegible] وقتوں کا سامنا
پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے ہماری گورنمنٹ کا مالی انتظام بہتر ہے۔

[illegible] ہو جانا بہت ضروری [illegible] ٹیکس کی شرح [illegible]
وصول کیا [illegible] دہندہ کو کچھ مقدار کا علم ہوتا جو
[illegible] کوئی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تغیرات کا اعلان ہو
[illegible] نتیجہ یہ ہے کہ ایک اگر خلاف توقع
[illegible] ہے تو ہزارہا بن کر ہزارہا بگڑ جاتے ہیں۔ اگر کسی
[illegible] چیز پر نیا ٹیکس قائم کیا جائے یا صرف شرح میں
کمی بیشی کی جائے تو [illegible] نرخ پر نمایاں اثر نمودار ہوگا۔ سرکاری قول
کے مطابق شرح [illegible] محصول زائد کا ۵ فی صدی ہے
اب اگر وہ ۵ فی صدی [illegible] فی صدی کردی جائے تو بہر صورت
قیمت زمین میں بہت کچھ اضافہ یا تخفیف ہونا لازمی ہے۔

قدیم ٹیکس کے تو لوگ اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ کاروبار میں
معمولاً ان کا لحاظ کرتے کرتے کوئی بار محسوس نہیں ہوتا چنانچہ
کسی کا مقولہ ہے کہ قدیم ٹیکس کوئی ٹیکس ہی نہیں۔ لیکن جب کوئی
نیا ٹیکس قائم ہوتا ہے یا شرح گھٹتی بڑھتی ہے تو کاروباری سمندر میں

حصّہ سوم
باب [illegible]

[illegible] ہوا ہے بعض [illegible] اتفاق کرتے ہیں اور بعض کو بے عزتی
حاصل [illegible] پہنچا [illegible] ہے کہ اسلئے سکون غائب
ہوکر [illegible] اور جب تک ٹیکس بخوبی جاگزیں
نہ ہوسکے یہی حالت [illegible] ہے [illegible] ٹیکس متعین ہو [illegible]
اور [illegible] اصول لازم ہے۔

[illegible] ٹیکس [illegible] کے ذرائع اور
[illegible] چاہئیں کہ
ٹیکس [illegible] کہ کوئی نقصان [illegible] ہو [illegible] دشواری وقت
اُن کو محسوس ہو سیاست کا عام [illegible] ہے کہ [illegible] حکومت
[illegible] طرح کام میں لانا چاہئیں کہ اگر لوگوں [illegible] گزریں بھی تو
کم سے کم گزریں ٹیکس کا موجودہ اصول بھی اسی کا شاہد ہے۔

ان چھ ٹیکس کے علاوہ ٹیکس کے اور [illegible] قرار دیئے گئے ہیں
لیکن وہ اکثر فروعات ہیں اور عمومیت سے معرا لہٰذا اُن کا بیان غیر ضروری
طوالت ہوگی۔ واضح ہو کہ ٹیکس ان تمام اصول کے پابند ہوں وہ بلا شک
نہایت عمدہ ہیں اور جو جس قدر کم پابند ہوں [illegible] ناقص ہوں گے
یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ ایسا بھی تو ممکن ہے کہ ان اصول میں [illegible]
آ پڑے [illegible] مثلاً کسی ٹیکس [illegible] پیدا آوری ہو لیکن سہولت نہ ہو یا سہولت
سہولت ہو تو عدل نہ ہو ایسی حالت میں کیا کیا جائے [illegible]
کہ ضروری اصول [illegible] بیان کر دیا گیا ہے [illegible] اوپر اصول
بہ ترتیب اہمیت بیان کئے ہیں لہٰذا پیدا آوری عدل و سہولت پر بھی
فائق ہے۔ سہولت عدل کے تابع ہونی چاہئے لیکن ان اصول میں
اختلاف کی طرح اتفاق بھی ممکن ہے۔ مثلاً کفایت تعین اور سہولت پیدا آوری
کے معاون ہیں اور تغیر پذیری پیدا آوری اور کفایت کی مؤید ہے۔
خود پیدا آوری سے دوسرے اصولوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ حاصل کلام
یہ کہ ماہر مالیات کا کمال یہ ہے کہ ان تمام اساسی اصولوں کو ٹیکس [illegible]

حصہ سوم باب چہارم

ٹیکس لگایا جائے اور اگر ایسا ممکن ہی نہ ہو تو ایسے ٹیکس [illegible] ان پر کے اعلیٰ او[ر] متوازن [illegible] سکے۔

اقسام ٹیکس

۵۔ اقسام ٹیکس کے متعلق چند اصطلاحات جاننے ضروری ہیں۔ جو شخص ٹیکس ادا کرتا ہے اس کو ادا کنندہ اور جس شخص پر ٹیکس کا بار پڑتا ہے اس کو مورد ٹیکس کہتے ہیں دونوں اصطلاحوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ٹیکس ادا کوئی کرے اور پڑے کسی کے [illegible] اور [illegible] ٹیکس کا [illegible] اور پڑتا [illegible] چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ٹیکس کا بار ادا کنندہ پر تا دیر قائم رہتا ہے ورنہ اسکا کم و بیش جزو [illegible] پر منتقل ہو جاتا ہے [illegible] ٹیکس کے ادا کنندہ سے دوسروں پر [illegible] منتقل ہونے کے واقعہ کو اصطلاحاً ورود ٹیکس سے تعبیر [illegible] ٹیکس کی بحث سب سے زیادہ دقیق اور [illegible] ہے کہ کونسا ٹیکس ادا کنندہ پر قائم رہتا ہے اور کونسا ٹیکس [illegible] دوسروں پر منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کا پتہ چلانا نہایت دشوار ہے اور [illegible] ان میں [illegible] مشکلوں سے [illegible] ہم آگے [illegible] بحث کریں گے یہاں صرف اسقدر [illegible] ہے کہ بعض ٹیکس [illegible] ادا کنندہ اور مورد ایک ہی شخص [illegible] ہے اور بعض کے مختلف [illegible] جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے اگرچہ اس واقعے کی تحقیق نہایت [illegible] معلومات اور تجربہ [illegible] ورود کی بنا پر ٹیکس کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ٹیکس کا ادا کنندہ اور مورد ایک ہی شخص ہو یعنی جو دوسروں پر منتقل نہ ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ جس کے ادا کنندہ اور مورد مختلف ہوں [illegible] یعنی جو ادا کنندہ سے گذر کر بہت سے لوگوں پر منقسم ہو جائے۔ اصطلاحاً اول کو ٹیکس بلا واسطہ اور دوم کو ٹیکس بالواسطہ کہتے ہیں۔ لیکن ان ہر دو قسم کا امتیاز اس قدر محقق اور نمایاں نہیں

حصہ سوم
باب پنجم

[illegible] حد تک قائل ہیں [illegible] اور بعض ٹیکس کے متعلق تو
[illegible] ہی منحصر ہے کہ وہ کس قسم کے ہیں مثلاً [illegible]
اور انکم ٹیکس ہم ادا کرتے ہیں اور محصول چنگی آبکاری اور درآمد [illegible] دوسری
قسم کے ہوتے ہیں اور فیس رجسٹری و فیس اسٹامپ کی قسم [illegible]
بہر حال ٹیکس قائم کرنے میں ماہرین مالیات کی رو سے ایک غرض ہوتی ہے
یا تو یہ کہ جو شخص ٹیکس ادا کرے وہی اس کا متحمل ہو یا یہ کہ ادا کنندہ
ٹیکس دوسرے لوگوں سے وصول کر لے۔ پہلی غرض پوری کرنے کیلئے
[illegible] سو بہت پیدا کرتے اور تدابیر نکالتے ہیں لیکن پھر بھی [illegible]
اگر تھوڑا بہت دوسروں پر منتقل ہو جائے تو عجب نہیں اور اس کے برعکس
ٹیکس بالواسطہ ہمیشہ اس حد تک اور اس سہولت و سرعت سے دوسروں پر
منتقل نہیں ہوتا جتنا کہ مقصود ہوتا ہے۔ ہر دو قسم کے ٹیکس کی اہمیت
[illegible] ان کی عدم [illegible] کی تمامی واضح کرنے کے بعد ہم ان کے حسن و قبح
[illegible] ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

ٹیکس بلا واسطہ لگان، سود، اجرت یا ملک و جائداد میں سے
[illegible] راست و صریحاً اپنا حصہ نکالتا ہے۔ یہ ٹیکس سیاسی تربیت کا
نہایت کارگر آلہ ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ جس کام پر [illegible]
[illegible] اس سے خواہ مخواہ شوق اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ
بعض انجمنوں میں تو علاوہ مالی امداد کے دلچسپی بڑھانے کی غرض سے بھی
ممبروں سے چندہ طلب کیا جاتا ہے۔ جبکہ لوگ جان بوجھ کر مصارف حکومت
ادا کرتے ہیں تو ان کو سیاسی معاملات سے خود بخود تعلق زیادہ محسوس
ہونے لگتا ہے اور اس کا نتیجہ عام سیاسی بیداری ہوتا ہے۔ اس کے برعکس
ٹیکس بالواسطہ جو کہ بطور محصول چنگی آبکاری درآمد برآمد خرید و فروخت
کے سامان پر قائم ہوتا ہے اور جس کے ادا کنندہ تو بالعموم تاجر [illegible]
ہوتے ہیں لیکن جو بذریعہ اضافہ قیمت بالآخر خریداروں سے وصول
ہو جاتا ہے اپنے مورد [illegible] کی نظر سے بیشتر چھپا ہوتا ہے اور ان کو خبر نہیں

یہ صفت تغیر پذیری جس قدر بحالت معاشی ترقیات مفید ہے اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ بصورت سرد بازاری کاروبار خطرناک بھی ہے اس کے برعکس اگرچہ ٹکس بلاواسطہ میں اضافہ خود بخود فوراً نمودار نہیں ہوتا کبھی اس کے تخفیف میں بھی دیر لگتی ہے اور کچھ عرصے کے واسطے اس کی مقدار مستقل اور معین ہوتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اچھے زمانے میں تو ٹکس بالواسطہ بھی زیادہ پیداآور ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت ٹکس بلاواسطہ ہی کام آتا ہے۔ چنانچہ گو محصول جنگی و نیز آمدوبرآمد کی مقدار گھٹتی بڑھتی ہے لیکن گورنمنٹ ہند کے محاصل کی پشت و پناہ مالگزاری ہی قائم رہتی ہے۔

جو ٹکس بلحاظ قسم مخلوط ہوں یعنی نہ صاف طور پر بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ مثلاً فیس اسٹامپ رجسٹری ان میں مذکورالصدر خوبیوں اور نقص میں سے کسی کا بھی ہونا نہ ہونا ممکن ہے۔

ہر دو قسم ٹکس کے حسن و قبح کا لب لباب بحوالۂ اصول ٹکس پیش نظر کرنا مفید ہوگا۔

(ا) ٹکس بلاواسطہ۔ عدل۔ کفایت۔ تعین۔
(ب) ٹکس بالواسطہ۔ پیداآوری۔ سہولت۔ تغیر پذیری۔

اشکالِ ٹکس

۴۔ ٹکس کے اصول و اقسام کی مذکورالصدر بحث سے واضح ہوگا کہ ہر شخص سے براہ راست ایک معین رقم بطور ٹکس لینا سہل ہے نہ مفید۔ گو بعض لوگ اصولاً ٹکس مفرد کے حامی ہیں لیکن یہ طریق عملاً دقت طلب اور باعث نقصان ثابت ہوگا اور آجکل ہر جگہ ٹکس مرکب کا رواج بڑھ رہا ہے ٹکس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں جن میں سے بعض کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور بعض کو باوجود ادا کرنے کے پہچانتے تک نہیں اور ان سب کے اتفاقی عمل کے مجموعی نتائج سے نظام مالیات کے حسن و قبح کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ اس غرض کے لیئے ایک یا دو ٹکسوں کے نتائج پر اکتفا کرنا بیجا ہوگا پس ٹکس کی چند مروجہ شکلیں پیش نظر کرنا بے موقعہ نہ ہوگا۔

ٹیکس بلاواسطہ آمدنی یا ملک پر قائم ہوتا ہے۔ لگان اجرت اور منافع
آمدنی کی چار قسمیں ہیں اور ٹیکس بر ملک۔ تو مالگزاری ٹیکس اس کی عمدہ مثال ہے
ان میں سے مالگزاری پر لگان کے تحت میں بحث ہو چکی ہے۔ آمدنی کے
باقی ٹیکس بعنوان انکم ٹیکس اور نیز مالی ٹیکس ابھی واضح کیے جائیں گے۔
محصول پیداوار، محصول چنگی اور محصول درآمد برآمد جو حکومت ریاست پر قائم
ہوتے ہیں ٹیکس بالواسطہ کی مروجہ اشکال ہیں۔ ٹیکس بر پیداوار سے
متعلق ابواب نفع المصرف اور محصول درآمد برآمد سے تجارت بین الاقوام
کے تحت میں آگے چل کر بحث کریں گے۔ اجارے کی بحث میں
آئندہ بوجہ چند خصوصیات ٹیکس پر جداگانہ غور کیا جائے گا۔ بالواسطہ ٹیکسوں
میں سے صرف محصول چنگی یہاں بیان ہونا ہے وہ چند ٹیکس
جن کی قسم غیر محقق ہے مثلاً فیس اسٹامپ۔ رجسٹری و داخل خارج
یا لیسنس۔ ان سے بھی مختصراً ابھی ہم بحث کریں گے۔

ٹیکس بلاواسطہ کی بہترین مثال انکم ٹیکس ہے جس میں اس کی
بھلائیاں برائیاں بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں۔ اس ٹیکس کا بار بکثرت دولتمندوں پر
پڑتا ہے اور بوجہ بلاواسطہ ہونے کے بہت گراں گزرتا ہے۔ چنانچہ
حکومت شخصی یا حکومت امرا کے زمانے میں یہ ٹیکس رائج نہ ہوسکا لیکن
جب سے آئینی حکومت میں عوام کا زور بڑھا۔ اس ٹیکس کا رواج بھی پھیلنا
شروع ہوا۔ اور آج ہر مہذب ملک میں یہ رائج پایا جاتا ہے۔ امرا اور
دولتمندوں کو تو شاید اب بھی ناپسند ہو لیکن حکومت میں عوام کے
غلبے کے ہاتھوں وہ مجبور ہیں اور خواستہ ناخواستہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں
غربا تو اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں متوسط الحال لوگوں پر بھی بشرح ادنیٰ
قائم کیا جاتا ہے۔ البتہ بڑی بڑی آمدنی والوں سے یہ ٹیکس بشرح اعلیٰ
وصول ہوتا ہے اس تفریق کی بنا اوّل تو بعنوان تفریق ٹیکس واضح کی جا چکی ہے
مزید براں ٹیکس بالواسطہ عموماً گرانی نرخ کا باعث ہو کر عوام اور غربا سے وصول
ہوتا ہے اور مقابلتاً اس کا بار امرا پر کمتر پڑتا ہے پس اس عدم مساوات کی

حصّہ سوم
باب چہارم

اصلاح بھی بذریعۂ انکم ٹیکس بہت زائد ہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں سوشیلزم کی بحث میں بعنوان دولتمندی و افلاس تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کی ایک سبیل یہی انکم ٹیکس تجویز ہو چکا ہے۔ گویا علاوہ سرکاری آمدنی کے انکم ٹیکس کی ایک غرض موجودہ عدم مساوات تقسیم دولت بھی رفع کرنا ہے یعنی دولتمندوں کی آمدنی کا ایک مناسب حصّہ بذریعۂ ٹیکس لے کر غربا اور عوام کی بہبودی پر صرف کرنا۔ اور انکم ٹیکس کا بار ناقابل برداشت بن کر افزونی دولت سے مانع نہ ہو تو یہ آخری مقصد بھی بلا کسی اندیشے اور مضرت کے حاصل ہو سکتا ہے؛

انکم ٹیکس اگر بشرح مناسب وصول کیا جائے جیسا کہ آجکل ہوتا ہے تو اس کا بار ادا کنندہ پر ہی رہتا ہے کوئی دوسرا اس کا مورد نہیں بنتا۔ لیکن اگر وہ اس قدر گراں کر دیا جائے کہ اجرت سود یا منافع کا جزو اعظم منضبط کر لے تو محنت اصل اور کاروبار کے اضافہ و ترقی کے رکنے سے اس کا بار کلّاً یا جزواً بذریعۂ گرانی نرخ عوام پر جا پڑے گا یعنی ادا کنندہ تو دولتمند ہی رہیں گے لیکن اس کے مورد تھوڑے بہت عوام بھی ہو جائیں گے موجودہ انکم ٹیکس کے متعلق خیال ہے کہ اس کے ادا کنندہ اور مورد دولتمند لوگ ہی ہیں اور غربا اس کے بار سے محفوظ ہیں؛

ہاؤس ٹیکس

۸۔ مکانات پر جو ٹیکس قائم کیا جاتا ہے اس کا حسن و قبح و معیار اور اس کے تعدیہ کی کیفیت یکے بعد دیگرے ہم ذیل میں بیان کرنا چاہتے ہیں بعض دیگر معاشی مسائل کی طرح ہاؤس ٹیکس کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے۔ بخوف طوالت و پریشانی تنازعات اور جزوی اختلافات نظر انداز کر کے ہاؤس ٹیکس کے سلیس و مختصر مگر جامع بیان پر اکتفا کرنا یہاں زیادہ قرین اصول معلوم ہوتا ہے چنانچہ ہاؤس ٹیکس کے کل بحث مباحثے میں سے صرف چند اہم اور عام پہلو بہ ترتیب مناسب یکجا پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛

یہ اصول تو قرار پا چکا ہے کہ لوگوں سے ٹکس اُن کی مالی حیثیت کے مطابق لینا چاہیئے۔ امیروں سے زیادہ، متوسط الحال سے کم اور غربا سے برائے نام یا کچھ بھی نہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ مکان کی حیثیت اور مکاندار کی مالی حالت میں ایک گونہ تناسب ہوتا ہے۔ خوشحال لوگ عالی شان محلات میں رہتے ہیں۔ عوام معمولی مکانات میں اور غربا کچے جھونپڑوں میں گویا بالعموم مکان کی حیثیت سے مکاندار کی مالی حالت کا صحیح پتہ چلتا ہے لہذا مکان ہی مالی حالت کا معیار قرار دیا ہے کہ اسی کے مطابق ٹکس مقرر کیا جاتا ہے جس کو اصطلاحاً ہاؤس ٹکس کہتے ہیں۔ اس ٹکس میں چند خوبیاں بتائی جاتی ہیں اول تو مکان زندگی کی ناگزیر ضروریات میں داخل ہے اور لوگ بالعموم اپنی حیثیت کے موافق اچھے سے اچھے مکان میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر مکان حسب دلخواہ میسر نہ آسکے تو گویا زندگی دو بھر معلوم ہونے لگتی ہے۔ دوم مکان آدمی کی مالی حالت کا ایسا بین اور واضح ثبوت ہے کہ کوئی اس کو چھپا کر ٹکس سے بچ نہیں سکتا۔

پس اگر غربا کے مکانات مستثنیٰ بھی کر دیئے جائیں تب بھی اس ٹکس سے معقول مقدار حاصل ہو سکتی ہے۔ گویا پہلی صفت پیدا آوری اس ٹکس میں موجود ہے۔ نیز اس میں دوسری صفت کفایت بھی موجود ہے اول تو اس کی فراہمی میں زیادہ خرچ درکار نہیں دوم مکاندار کو مقدار ٹکس سے زیادہ کسی حالت میں ادا کرنا نہیں پڑتا اور اگر وہ مقدار مناسب سے تجاوز نہ کرے تو ترقیِ دولت و صرف الحالی میں بھی مزاحم نہیں ہوتا۔ چونکہ بالعموم مکان کی حیثیت مکاندار کی مالی حالت کے مطابق ہوتی ہے اس ٹکس میں عدل بھی ملحوظ رہتا ہے جبکہ معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ مکانات کی قدر و حیثیت بھی بڑھتی ہے تو اس ٹکس میں صفت تغیر پذیری بھی ہونا عجب نہیں صفت تعین پیدا کرنا خود اختیاری ہے۔ اس کی سہولت بھی صاف ظاہر ہے۔ پس بحیثیت مجموعی ہاؤس ٹکس کل ضروری اصول کا کم و بیش پابند نظر آتا ہے صرف خاص خاص حالتوں میں وہ بعض

حصۂ سوم
باب ہجدہم

اصول کے منافی ہوسکتا ہے جس کی تفصیل ہم آئندہ کریں گے نتیجہ یہ ہے کہ اس ٹکس کا رواج ہر ملک میں پھیلتا جاتا ہے خود ہندوستان کے اکثر شہروں اور قصبوں میں محصول چینگی توڑ کر ہاؤس ٹکس جاری کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہم آگے چل کر واضح کریں گے کہ بعض حالتوں میں کیونکر اس ٹکس سے سرکار اور عوام کو یکساں نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس اصول کے مطابق مکانات پر ٹکس قائم کرنا چاہئیے۔ کسی زمانے میں تو یورپ کے اکثر ممالک میں مکان کے دریچے دروازے یا روشن دان شمار کر کے ان کے مطابق ٹکس وصول کیا جاتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ حیثیت مکان کے یہ قابل اعتماد معیار نہ تھے اور طرز عمارت بدل کر ٹکس سے کم و بیش بچنا ممکن تھا اس لئے اول اول تعمیر مکان کی اصلی لاگت اور کچھ عرصے بعد تعمیر کی لاگت کا موجودہ تخمینہ تعین ٹکس کا معیار قرار پایا لیکن عام مشاہدہ ہے کہ مکان کی خوبی و قیمت میں عمارت سے کہیں زیادہ موقع کا دخل ہے چنانچہ اس سے قبل جابجا لگان و قیمت زمین کی بحث میں موقع کا اثر زرعی اور بالخصوص سکنی اراضیات کی قیمت و آمدنی پر بالتفصیل واضح کیا جا چکا ہے۔ ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں کہ بے موقع عالی شان عمارات پر باموقع معمولی مکانات کو لوگ بہت زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اوّل الذکر قسم کی عمارتوں کا کرایہ بمقابلہ آخر الذکر مکانات کے بہت کم ہوتا ہے اور نیز بصورت فروخت بے موقع عمارات کی لاگت کا عشر عشیر بھی ملنا دشوار ہو جاتا ہے، چنانچہ محاورہ ہے کہ فلاں عمارت کے پانی کے دام بھی وصول نہیں ہوئے اس کے برعکس عمدہ موقع کے مکانات کی قیمت تعمیر کی لاگت سے دس گنی زیادہ بآسانی بڑھ سکتی ہے۔ پس واضح ہوا کہ اصلی لاگت یا اس کا موجودہ تخمینہ بھی حیثیت مکان کا عمدہ معیار نہیں بلکہ کسی مکان کی حیثیت کا معیار اس کا کرایہ سمجھنا چاہئیے جو کرایہ داروں سے وصول ہو سکے جو جتنے زیادہ کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ اسی قدر خوشحال سمجھا جانا چاہئیے۔

بے موقع اور کم کرایہ کے محض عالی شان مکانات میں رہنے سے لوگ امیر نہیں شمار کیے جا سکتے اور نہ ایسے مکانات مالکوں کے حق میں لاگت کی مقدار سے دولت سمجھنے چاہئیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ قدیم بے موقع محلات مسمار کرانے کا خرچ ملبے کی قیمت سے بھی بڑھ جاتا ہے اور مسمار کرائے بغیر زمین سے کوئی آمدنی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں گویا مکان ایک قسم کی نقصانی دولت ہے جو آمدنی زمین میں مزاحم ہوتی ہے اور جس سے سبکدوش ہونے کے واسطے خرچ ناگزیر ہے۔

کسی نئی سڑک کے کنارے، جہاں صرف دکانات کی طلب ہو قدیم وضع کی وسیع اور عالی شان مستحکم عمارت جس کا کوئی خواستگار نہ ہو یا ہو تو بہت تھوڑا کرایہ دے، یا تو سراسر دولت ہی نہیں یا لاگت تعمیر سے بہت کم ہے۔ باموقع مکان کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ہاؤس ٹیکس کا معیار مکان کا کرایہ ہونا چاہئے نہ کہ اصلی لاگت تعمیر یا اس کا موجودہ تخمینہ۔ معیار کی مذکورۃ الصدر بحث سے ایک عملی نتیجہ واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ قدیم پسماندہ شہر او قصبات جو کبھی دولت و حشمت کا مرکز رہ چکے ہوں اور جہاں قدیم عالیشان عمارات کی کثرت ہو لیکن جہاں اب نکبت و افلاس کی ایسی گھٹا چھائی ہو کہ مکینوں کو اپنے آباؤ اجداد کے مکانات کی مرمت کی بھی توفیق نہ ہو۔ جہاں بوجہ پسماندگی مکانات کی طلب بھی بہت کم ہو اور محلات سے ترقی یافتہ شہروں کے جھونپڑوں کا بھی کرایہ وصول نہ ہو سکے وہاں پر ہاؤس ٹیکس جاری کرنا عقل و مصلحت دونوں کے خلاف ہے۔ اگر ہاؤس ٹیکس کا معیار عمارت کی لاگت قرار پائے تو علاوہ خلاف اصول ہونے کے ہاؤس ٹیکس مکینوں کو جلد تباہ کر کے خود بھی فنا ہو جائیگا اور اگر کرایہ مکانات معیار ہو تو اول ہی سے کچھ وصول نہ ہوگا۔ بہر صورت ٹیکس ناکامیاب رہیگا اور بصورت اول مکینوں کی مزید تباہی کا بھی باعث ہوگا۔

رہے ایسے قصبات جہاں ایک سرے سے عمدہ عمارات ہی نہ ہوں اور غربا جھونپڑوں اور کچے مکانات میں بستے ہوں وہاں ہاؤس ٹیکس کا رواج خارج از بحث ہے بس ہاؤس ٹیکس صرف جدید خوشحال اور ترقی پذیر شہروں کے واسطے موزوں ہے جہاں مکانات کی بہت مانگ ہو اور کرایہ اعلیٰ ہو۔ ایسی جگہ ٹیکس کی مقدار بھی بہت کثیر رہیگی اور لوگوں پر بار بھی نہ ہوگا۔

جو قصبہ بہت سے خوشحال لوگوں کا مسکن ہو جہاں انھوں نے عمدہ عمارتیں بنا رکھی ہوں اور وقتاً فوقتاً آ رہتے ہوں لیکن جہاں کاروباری مرکز نہ ہونے کی وجہ سے مکانات کی مانگ کم ہو اور زیادہ کرایہ وصول نہ ہو سکے وہاں ہاؤس ٹیکس لاگت تعمیر کے معیار سے قائم کرنا بھی مضائقہ نہ ہوگا۔ لیکن ایسے قصبات شاذ و نادر مل سکتے ہیں۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ ترقی پذیر شہروں اور کاروباری مرکزوں میں جہاں مکانات کی بہت مانگ ہوتی ہے اور کرایہ اعلیٰ ہوتا ہے خوشحال لوگ رہتے ہیں اور پسماندہ قصبات میں جہاں قدیم عمارات ہوں یا نہ ہوں مکانات کا کرایہ اور ان کی حیثیت ادنیٰ ہوتی ہے جن میں غریب خاندان رہتے ہیں۔

بڑے شہروں کی دیکھا دیکھی یہ جو ہر قصبے میں محصول چنگی توڑ کر ہاؤس ٹیکس جاری کرنے کا خبط ہر طرف پھیل رہا ہے یہ نہایت غیر معقول نقالی ہے جس کا کبھی کبھی میونسپلٹی اور باشندگان شہر کو سخت خمیازہ اٹھانا پڑے تو عجب نہیں۔ ہاؤس ٹیکس فی نفسہ بہت اچھا سہی لیکن اس کے واسطے موقع و محل شرط ہے۔ ایک ہی دوا یا غذا کسی کے حق میں آب حیات اور کسی کے حق میں سم قاتل ہو سکتی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ نکتہ بھی ذکر کے قابل معلوم ہوتا ہے کہ ہاؤس ٹیکس تعمیر کی لاگت کے معیار پر وصول کرنے سے یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ ٹیکس سے بچنے کے خیال سے لوگ عمدہ عمارتیں بنانا کم کر دیں اور شہروں کی شان و خوبصورتی میں فرق آ جائے اکثر خوشحال لوگ تعمیر میں

حصہ سوم
باب چہارم

محض شان، خوبصورتی کی خاطر سے دل کھول کر دولت لگاتے ہیں اور اس بیش خرچی سے کرائے میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوتا۔ البتہ عمارتیں نہایت محکم اور قابل دید ہوتی ہیں، ایسی ہی عمارتیں ہر ترقی یافتہ شہر کی آرائش سمجھنی چاہئیں اور ٹکس بمعیار کرایہ ان سے کسی طرح پر گراں نہ ہوگا۔ مزید براں ٹکس بمعیار کرایہ مقابلۃً کم گراں گزرتا ہے، وجہ یہ کہ کرایہ بہ حیثیت عمارت سے کہیں زیادہ موقع محل پر منحصر ہوتا ہے اور عمدگی موقع بالعموم عام ترقیات کا نتیجہ ہوتی ہے، مالک مکان کو اپنی گرہ سے بہت کم خرچ کرنا پڑتا ہے لہٰذا جبکہ کرائے میں عام ترقیات سے اضافہ ہو تو اس کا ایک جزو بہبودی عامہ کے واسطے بطور ٹکس دینا مالک مکان کو کیونکر گراں گزر سکتا ہے معیار لاگت کے مقابلے میں بمعیار کرایہ اگر ٹکس کی مقدار زیادہ بھی رہے تو دینے والے کو ناگوار اس وجہ سے نہیں گزرنا چاہئے کہ محض موقع کی بدولت جو عام ترقیات کا نتیجہ ہے مکان کی حیثیت سے کہیں زیادہ کرایہ مل جاتا ہے، اگر اس میں سے کچھ حصہ طلب کیا جائے تو کیا بیجا ہے اس کے برعکس اگر ٹکس لاگت کے معیار کرایہ کے مقابل میں زیادہ ہو تو مالک مکان اپنے کو دوگونہ بدقسمت سمجھے گا، وجہ یہ کہ کرایہ تو مکان کی حیثیت سے کم ملتا ہے اور ٹکس کرائے کی حیثیت سے کہیں زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ گویا مکان کی عمدگی سے بجائے نفع کے نقصان پہنچتا ہے:

اگر کوئی چیز درحقیقت وہی رہے تب بھی اکثر محض ظاہری صورت بدل جانے سے اس کا اثر طبیعت پر مختلف پڑ سکتا ہے، فطرت انسانی کا یہ ایک نہایت نتیجہ خیز خاصہ ہے جس کا لحاظ کرنے نہ کرنے سے بڑے بڑے کام سنورتے اور بگڑتے ہیں۔ ہاوس ٹکس ادا تو بہر صورت کیا ہی جاتا ہے لیکن محض معیار کا ادا کنندوں کی طبیعت پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہے۔ لاگت کا معیار بظاہر عمدہ عمارت بنانے کا جرمانہ معلوم ہوتا ہے اور معیار کرایہ گویا آمدنی میں سے ایک حصے کا

جائز مطالبہ نظر آتا ہے ٭

انکم ٹکس کی طرح ہاوس ٹکس سے بھی غریبوں کو جو کچے مکانوں اور جھونپڑوں میں رہتے ہیں مستثنیٰ کرنا بلحاظِ انصاف و مصلحت ضروری ہے۔ نیز جبکہ بمعیارِ کرایہ ہاوس ٹکس قائم کیا جائے تو مکان کی مرمّت اور درستی کے تخمینی مصارف کرائے میں سے اوّل منہا کر دینے چاہئیں، گویا کرائے کی خالص آمدنی پر ٹکس قائم ہونا چاہئیے، یہاں پر یہ تذکرہ غیر ضروری ہے کہ جو لوگ خود اپنے مکانات میں رہیں اُن کے مکانوں کے کرائے کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جو مکانات غیر معمولی طور پر وسیع اور عالیشان ہوں کہ گرد و نواح میں ویسے مکانات کا کوئی کرایہ دار ہی نہ مل سکے اور جن کے کرائے کا تخمینہ دشوار ہو وہاں بطورِ خاص لاگت کا معیار استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی صورتیں بہت کم پیش آتی ہیں اور معیارِ کرایہ میں شاذ و نادر ہی مزاحم ہوتی ہیں ٭

ہاوس ٹکس کے حسن و قبح اور اُس کے معیار سے بحث کرنے کے بعد اب ہم اس کا ورود تحقیق کرنا چاہتے ہیں یعنی دیکھنا یہ ہے کہ ہاوس ٹکس کا ادا کنندہ کون ہوتا ہے اور سور دکون عملاً ٹکس کس سے وصول کیا جاتا ہے اور حقیقتہً اس کا بار کس پر پڑتا ہے۔ اس غرض کے واسطے اوّل ٹکس کی چند خصوصیات سمجھانے ضروری معلوم ہوتے ہیں ٭

ہاوس ٹکس سے جو رقم وصول ہو وہ دو طرح پر صرف ہو سکتی ہے، یا تو ایسے کاموں میں کہ مکاندار وں کو آرام پہنچے مثلاً شہر کی گلی کوچوں کی صفائی اور روشنی۔ نل کا پانی۔ مفت ابتدائی تعلیم یا اس کے برعکس ایسی مدوں میں کہ ٹکس دہندوں کو کسی قسم کا اس سے نفع پہنچتا معلوم نہ ہو، مثلاً ایسے قدیم قرض اور اس کے سود کی ادائی جو کسی مفید کام میں لگا ہو مگر بوجہ ناکامیابی ضائع ہو گیا ہو۔ جیسے کہ کسی قصبے میں صفائی کی زمین دوز نالیاں یا نل کا پانی جاری کرنے میں بہت سا روپیہ صرف کیا جائے مگر بالآخر اسکیم ناقابلِ عمل ثابت ہو اور کل لاگت اکارت جائے یا مثلاً

رہے سے لئے ہوئے ہاؤس ٹیکس کا جزو غالب کسی منفعت عام پر صرف ہو تو ہاؤس ٹیکس سے براہ راست امراکو فائدہ محسوس نہ ہوگا۔ بحالت اول ہاؤس ٹیکس مطلقاً ٹیکس فیض رساں اور بحالت ثانی ٹیکس بے فیض کہلائے گا۔ بلحاظ وسعت حلقہ بھی ٹیکس کی دو قسمیں ہیں، لوکل یا مقامی جو کسی خاص شہر تک محدود ہو۔ امپیریل یا ملکی جو کہ تمام ملک سے یکساں وصول کیا جائے بین مقامی اور ملکی کے بین بین ٹیکس کی ایک تیسری قسم پراونشیل یا صوبہ وار بھی ہے جو ملک کے کسی حصے یا صوبے میں رائج ہو۔ اس سے قبل آراضیات ٹیکس کی بحث میں ابھی واضح ہو چکا ہے کہ کسی مکان کا کرایہ عمارت کی حیثیت اور زمین کے موقع پر منحصر ہے۔ اگر دو یکساں حیثیت والے مکانوں سے جو شہر کے مختلف حصوں میں واقع ہوں ۴۰ اور ۶۰ روپے ماہوار کرایہ وصول ہو تو دوسرے کے کرایہ میں (۶۰ - ۴۰) ۲۰ روپے کرایہ موقع زمین شمار ہوگا۔ اگر تعمیر کو بھی ایک قسم کی زیر پا زراعت فرض کریں اور اس کے کرایہ کو زرعی پیداوار لگان کی مذکورالصدر بحث کی روشنی میں دیکھیں تو سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ جو کرایہ بابت عمارت وصول ہو وہ درحقیقت اس اصل قائم کا سود مع مطالبات فرسودگی وغیرہ ہے جو بشکل عمارت منتقل ہے اور جو کرایہ بوجہ موقع زمین ملے وہ زرعی لگان کی مانند محض اتفاق اور ایسے اسباب کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے جن پر مالک زمین کو بہت کم قابو حاصل ہو۔ اگر کرایہ پر چلانے کی نیت سے مکانات تعمیر کرائے جائیں تو لو یا التعمیر بھی یک گونہ شغل اصل ہے اور عمارات اصل قائم کی ایک شکل۔ ظاہر ہے کہ جس حالت میں عرصے تک ایسے اصل قائم یعنی عمارات پر بشرح مناسب سود و مطالبات فرسودگی وغیرہ بشکل کرایہ وصول ہونیکی امید نہ ہو کوئی مکانات بنا کر نیا سرمایہ پیدا اور کام میں اپنا روپیہ کیوں پھنسانا گوارا کرے گا۔ اور جبکہ مکانات کی مانگ اس قدر ہو کہ بے موقع سے بے موقع مکان کا کرایہ بھی کم از کم اصل قائم کا سود و مطالبات پورے کر سکے تو باقی مکانات کا موقع جس قدر عمدہ ہوگا کرایہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا اور یہ

اضافۂ کرایہ لگان میں شمار ہوگا۔ لگان کی تفصیل اور موجودہ اجمال پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہوگا کہ زمین خواہ زرعی ہو یا سکنی اس کا معاشی لگان یا کرایہ یکساں اسباب و حالات کا پیدا کیا ہوا ہے اور بہر صورت وہ ترخ پیداوار یا کرایہ مکانات کے اضافے کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ باعث اور کسی حالت میں وہ مصارفِ پیدائش کا جزو شمار نہیں ہو سکتا۔ المختصر کرایۂ مکانات کے دو جزو ہوتے ہیں کرایۂ عمارت جس کو اصلِ قائم کا سود اور مطالباتِ خطر و فرسودگی سمجھنا چاہیئے دوم کرایۂ زمین جو ہر طرح پر معاشی لگان ہوتا ہے۔

ٹکس کی چار قسمیں فیض رساں و بے فیض اور مقامی و ملکی اور کرایۂ مکانات کے دو جزو کرایۂ عمارت و کرایۂ زمین ان سب کی توضیح کے بعد اب ہم ورود ٹکس کی کیفیت پیش کرنا چاہتے ہیں، بالعموم تو عمارت و زمین ایک ہی شخص کی ملک ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ خود ہی اپنے مکانات میں رہتے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ تین شخصوں کا ایک ہی مکان سے تعلق ہو سکتا ہے۔ مالکِ زمین۔ مالکِ عمارت۔ اور کرایہ دار مکان بغرض صفائی بیان ہم ان تینوں کا مکانات سے تعلق فرض کرتے ہیں اور اسی بحث سے بصورتِ دیگر جبکہ صرف دو یا ایک شخص کا مکان سے تعلق ہو نتائج اخذ کرنا دشوار نہ ہوگا۔

جیساکہ ترقی یافتہ ممالک میں رواج پایا جاتا ہے فرض کرو کہ کوئی شخص کسی ہونہار شہر میں جہاں آبادی بڑھ رہی ہو مکانات کا کاروبار جاری کرے۔ یعنی کوئی کارخانہ یا دکان کھولنے کی بجائے وہ مکانات تعمیر کرائے اور اُن کے کرائے سے عمارات جیسے اصلِ قائم کا سود اور مطالباتِ خطر و فرسودگی وصول کرے۔ عمارات بنواتے وقت انتخابِ موقع کا مسئلہ از حد توجہ طلب ہوگا۔ ایسی بے موقع زمین کہ جہاں مکان بنانے سے بقدرِ سود اصل بھی کرایہ وصول نہ ہو سکے وہ مفت بھی لینا گوارا نہ کرے گا۔ جس زمین پر مکان بنانے سے اصلِ قائم کے سود اور دیگر واجبی مطالبات کے علاوہ کچھ وصول نہ ہو ایسی زمین بھلا وہ کیوں خریدنے لگا۔ البتہ

اگر کوئی ایسی عمدہ موقع کی زمین ہاتھ لگے کہ وہاں پر مکان کا کرایہ سود و مطالبات سے بھی زیادہ وصول ہو سکے تو بیشک اس کا خواستگار ہوگا۔ اس مزید مقدار کرایہ کی حالت بعینہٖ معاشی لگان کی سی ہے، اب اگر وہ زمین خریدتا ہے تو اس کی قیمت لگان کے حساب سے دے گا۔ اگر قیمتِ لگان سے کم پر زمین مل جائے تو کیا کہنا ورنہ زیادہ سے زیادہ اس قیمت تک زمین خرید لے گا، اس سے زیادہ صرف نہیں کر سکتا کہ اس کو سراسر نقصان ہوگا۔ پس لگان کی قیمت سے کم یا مساوی رقم تک وہ زمین خریدیگا۔ لیکن چونکہ زمین کی قیمت گویا لگان کی قیمت ہے۔ یہی معاشی لگان خریدار کے حق میں اس اصل کا سود بن جائیگا جو اس نے بطور قیمتِ زمین ادا کیا ہو۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ آپڑا۔ ہم اپنے مفروضے پر قائم رہ کر خیال کرتے ہیں کہ زمین خریدنے کی بجائے اس نے کچھ مدت کے واسطے کرایہ پر لی گویا مالکِ زمین و مالکِ مکان دو جداگانہ شخص رہے، اس صورت میں بھی صاف ظاہر ہے کہ زمین کا کرایہ اس کے لگان کی مقدار سے کم ہوگا یا اس کے مساوی، اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کی زمین کرایہ پر لے کر مکانات تعمیر کرانا اور ان کو کرایہ پر چلا کر کرایہ کی آمدنی میں سے زمیندار کو کرایۂ زمین ادا کرنا اور خود اپنے اصل قائم کا سود اور مطالبات وصول کرنا ہندوستان میں شاید عجیب معلوم ہو لیکن اکثر ترقی یافتہ ممالک میں اس کا رواج پایا جاتا ہے؛ قاعدہ یہ ہے کہ ۹۹ برس کے واسطے مقررہ کرایہ پر زمین اجارے لے کر اس شرط سے مکانات تعمیر کیئے جاتے ہیں کہ بعد انقضائے میعاد بحصولِ معاوضہ یا بلا معاوضہ مالکِ مکان عمارت و زمین سے دست بردار ہو کر ان کو مالکِ زمین کے سپرد کر دیگا۔ کرایۂ زمین و کرایۂ مکان میں ایسی نسبت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مالکِ مکان کو عرصۂ معینہ میں اصلِ قائم پر بشرحِ مناسب سود بھی ملتا رہے اور

بذریعۂ مطالبات فرسودگی اختتامِ میعاد تک کُل اصل قائم واپس بھی آجائے - چونکہ اس کاروبار میں بوجہ وسعت زمانہ وغیرہ اختیاری تغیرات نقصان کا اندیشہ قوی ہے - مطالبات خطر کی شرح کبھی بہت اعلیٰ ہو تو عجب نہیں - نیز ظاہر ہے کہ بوقتِ واپسی زمین عمارات کا معاوضہ نہ دینے کی حالت میں کرائۂ زمین کسی قدر معاوضہ دینے کی حالت سے کم ہوگا - حاصل کلام یہ کہ ایک شخص اپنی لاگت سے کرایے کی زمین پر مکان تعمیر کرکے کرائے پر اٹھاتا ہے - کرائۂ مکان میں سے اپنے اصل کا سود اور مطالبات ضروری وصول کرتا ہے اور نیز زمیندار کو کرائۂ زمین ادا کرتا ہے - گویا ہمارے سابق مفروضے کے مطابق مکان سے تین شخصوں کو تعلق ہے - مالکِ زمین - مالکِ عمارت و کرایہ دار مکان کے ہر دو مالکوں میں کرایہ جس اصول سے منقسم ہوتا ہے ہم ابھی واضح کر چکے ہیں - آمدم بر سرِ مطلب فرض کرو کہ ایسے بہت سے مکانات ہوں اور ان سب پر ہاوس ٹکس قائم ہو - اب اگر ٹکس فیض رساں ہوگا تو کرایہ دار اس کو بخوشی ادا کریں گے بلکہ اس ٹکس کے خیال سے قرب وجوار سے آکر حلقۂ ٹکس میں آباد ہوں تو عجب نہیں، وجہ یہ کہ صفائی پانی روشنی جیسی ضروریات جب پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے اصول پر باشندگانِ شہر کو مہیا کی جاتی ہیں تو اکثر نہایت ارزاں پڑتی ہیں - اور اُن کی جو کچھ قیمت بطورِ ٹکس ادا کی جائے وہ بجائے گراں گزرنے کے مفید معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ٹکس بے فیض ہو تو اُس کا تعدیہ بہت ٹیڑھی کھیر ہے - تحقیقی طور سے معلوم کر لینا کہ ٹکس کا مورد کون ہوگا از حد دشوار ہے - زیادہ سے زیادہ چند ایسے عام اُصول قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ ورود ٹکس جن کا کم و بیش پابند ہو اور بس - جیسا کہ معاشی لگان اور اور سرکاری مالگزاری کی مذکورۂ سابق بحث سے بخوبی واضح ہے ٹکس کا جو حصہ کرائۂ زمین پر پڑیگا اس کا مورد زمیندار ہوگا - نہ کسی اور پر منتقل نہیں ہو سکتا جب قرار داد تا انقضائے میعاد مالکِ عمارت زمیندار کو

مقررہ کرایہ ادا کرتا ہے اور اس اثنا میں اگر وہی اس کا متحمل ہو تو عجب نہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ تعین کرایہ میں آئندہ محصول ٹیکس کا اس نے لحاظ رکھا ہو۔ اور اگر بوقت تعین یہ ٹیکس جاری ہو تو یقیناً اس نے ٹیکس کی وہ مقدار جو کرایہ زمین پر عاید ہو کرایہ دینے میں سے منہا کر لی ہوگی؛

اب رہا ٹیکس کا وہ جزو جو کرایہ عمارت پر پڑے۔ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر یہ ٹیکس محض مقامی ہے اور لوگ قرب و جوار میں رہ کر اس سے بچ سکیں تو اس خوف سے کہ مبادا کرایہ دار مکان چھوڑ دیں مالک عمارت اس کا بار کرایہ داروں پر توڑا لینے سے رہے اگر کرایہ عمارت کی مقدار سود و مطالبات سے کچھ زیادہ ہو تو ٹیکس کو خاموشی سے خود برداشت کریں گے اور بصورت دیگر اس کا کم و بیش بار زمیندار پر بھی منتقل ہو جائے گا یعنی کرایہ زمین میں مزید تخفیف ہوگی۔ لیکن اگر یہ ٹیکس مقامی نہیں بلکہ ملکی ہو تو اس سے کرایہ دار کو کہیں بھی مفر نہ ہو تو مالکان عمارت کی حالت قوی ہوگی کرایہ داروں کے چلے جانے کا کچھ خوف نہیں جہاں جائیں گے ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ پھر بھلا وہ ٹیکس سے بچنے کی خاطر کہاں جانے لگے۔ ایسی صورت میں اگر ٹیکس کے مورد کرایہ دار بنیں تو عجب نہ ہوگا؛

چنانچہ مذکورہ بالا وجوہات پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہاؤس ٹیکس فیصد سال کا مورد ہمیشہ کرایہ دار ہوتا ہے۔ رہا ہاؤس ٹیکس سے بعض اگر مقامی ہے تو اس کا مورد زمیندار ہوگا اور اگر ملکی تو کرایہ دار۔ مالک عمارت کو بھی معاہدوں کی مجبوری سے کچھ دنوں ہاؤس ٹیکس کا بار اٹھانا پڑے تو عجب نہیں۔ اس عرصے میں غالباً کہ اس کو اصل کا سود و مطالبات کافی مقدار میں نہ مل سکیں اور نقصان اٹھانا پڑے لیکن میعاد معاہدہ ختم ہوتے ہی وہ کرایہ دار یا زمیندار پر حسب حالات ٹیکس کا بار منتقل کر دیگا۔ معاہدے سے آزاد ہونے کے بعد وہ مناسب منافع کے بغیر جدید کاروبار ہرگز جاری نہ کرے گا۔ اور چونکہ بحالت مفروضہ اس کا کاروبار یعنی عمارات ہونہار شہروں میں ناگزیر ہیں

حصہ سوم باب ہجدہم

اس لیئے مقامی ٹکس زمیندار کو دینا پڑیگا۔ اور ملکی ٹکس کرایہ دار کو۔ اس بحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ چونکہ کرائیہ زمین و مکانات ازروئے معاہدہ اوقاتِ معینہ کے واسطے مقرر ہوتے ہیں اور حسب دلخواہ ان میں جلد جلد ردو بدل ممکن نہیں۔

ہاوس ٹکس کے انتقال میں معاہدات و نیز رسم و رواج عارضی طور پر مزاحم ہوتے ہیں۔ یعنی تعدیۂ ٹکس میں دیر لگتی ہے فوراً اس کا عملدرآمد نہیں ہوسکتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادا کنندوں کو مورد ہوئے بغیر بھی کچھ عرصے تک ہاوس ٹکس کا بار برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اصولی ہاوس ٹکس میں حتی الامکان ادا کنندہ وہی مقرر کرنا چاہیئے جس کا مورد ہونا مقصود ہو۔ تاکہ کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو فضول کچھ دنوں ٹکس کے زیر بار ہونا نہ پڑے۔

ملک و جائداد غیر منقولہ مثلاً کھیت۔ باغات۔ مکانات دکانات پر جو ٹکس قائم کیا جاتا ہے اُس کے متعلق اس سے آگاہ کرنا مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بوقتِ فروخت ایسی ملک و جائداد کی آمدنی میں سے مقدار ٹکس منہا کر کے قیمت قرار دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے واسطے ٹکس کا بار اُس شخص پر قائم رہجاتا ہے جو بوقتِ تقررِ ٹکس جائداد کا مالک تھا۔ بعد کے خریدار چونکہ ٹکس آمدنی سے منہا کر کے جائداد کی قیمت ادا کرتے ہیں اُنکو ٹکس سے صرف اس قدر سروکار ہے کہ ابتدائی مالک کی طرف سے سرکار کو ادا کرتے رہیں۔ البتہ خرید کے بعد اگر ٹکس بڑھے تو بقدرِ اضافہ جدید مالک اس کا متحمل ہوگا۔ قدیم ٹکس کوئی ٹکس نہیں۔ جو ایک معاشی مقولہ ہے اس کا یہی خاص مفہوم ہے۔ عام طور پر اس مقولے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ جب ٹکس پرانا ہوجاتا ہے تو کچھ لوگ اُس کے عادی ہوجاتے ہیں اور نیز کاروبار میں اس کا پورا لحاظ کرنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کا بار کم محسوس ہونے لگتا ہے۔

واضح ہو کہ اس ٹکس اور خصوصاً اُس کے ورود کی بحث کی دقت اور پیچیدگی کا ہر ایک مستند مصنف نے صاف صاف اعتراف کیا ہے۔ اس میں تعیین تو قطعاً محال ہے۔ چند ظنون نتائج دریافت ہو سکتے ہیں جن کا ہر حالت میں ظہور پذیر ہونا یقینی نہیں۔ تاہم تھوڑی بہت جو کچھ معلومات بھی مہیا ہو سکے ہیں۔ تقرر ٹکس میں عملاً اُس سے از حد مفید مدد لی جا سکتی ہے اور لی جاتی ہے۔

۹۔ محصول چنگی بھی ٹکس بالواسطہ کی ایک قسم ہے اور فرانس، اٹلی اور ہندوستان میں بکثرت رائج ہے۔ اس کی مخالفت اور تائید دونوں جاری ہیں۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چنگی کی چوکی پر مال رُکنے سے ادا کنندہ کا وقت ضائع ہوتا ہے گویا طریق چنگی مال کی آمد و رفت میں تاخیر کا باعث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ تجارت میں وقت بڑی چیز ہے، مقدارِ محصول جس کا تعیین بیشتر ملازمانِ چوکی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، حسبِ مرضی کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے واسطے خاص طور پر عملہ رکھنا پڑتا ہے جس سے مصارفِ فراہمی بہت بڑھ جاتے ہیں نیز مال چھپا کر بلا محصول داخلِ حدِ چنگی ہو سکتا ہے۔ اور باوجود نگرانی یہ نقص کم و بیش ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ محصول چنگی کی نسبت سے کہیں زیادہ خُردہ فروشی کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ محصول اکثر ضروریات پر لیا جاتا ہے اس کا بار متوسط الحال اور غُربا پر بہت زیادہ پڑتا ہے، ساتھ ہی اس کے چند خوبیاں بھی محصولِ چنگی میں موجود ہیں۔ مثلاً جہاں صنعت و حرفت اور تجارت کا بازار گرم ہو اس محصول سے بہت معقول آمدنی حاصل ہوتی ہے، نیز خُردہ فروشی کی قیمت میں کوئی ایسا اضافہ نہیں ہوتا کہ خریداروں پر نامناسب بار ہو بوقت خریداری مورد وں کو ٹکس کا علم تک نہیں ہوتا اور نیز بعض حالتوں میں خود ادا کنندہ کل محصول یا اُس کے ایک حصے کا خود مورد بن جاتا ہے نہ کہ خریدار۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مقامی ٹکس کے واسطے

اُس کا بدل ہاؤس ٹیکس جو پیش کیا جاتا ہے اُسکے اجرا میں اس سے بھی زیادہ اندیشے اور دقتیں لاحق ہوں گی۔ چنانچہ بہت سے ہندوستانی قصبات میں اب تک محصول چنگی بمقابل ہاؤس ٹیکس ہر لحاظ سے قابلِ ترجیح اور لہذا رائج ہے۔

۱۰۔ اس فیس کا ایک حصہ تو محض اُن خدمات کا معاوضہ ہوتا ہے جو سرکار بشکل قانونی و رسمی عدالتوں کے ذریعے سے انجام دیتی ہے۔ باقی کم و بیش ٹیکس ہوتا ہے جس کا بار حسبِ حالات یا ارادتاً یا تو سب متعلقین پر پڑتا ہے یا بعض خاص پر۔ ایسے ٹیکسوں کے تعین کے لئے کوئی عام اصول مقرر کرنا دشوار ہے۔

جہاں تک اس کتاب میں گنجائش نظر آئی بحثِ ٹیکس کا ایک سادہ اور مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔ لیکن فی نفسہ یہ مسئلہ نہایت اہم اور توجہ طلب ہے اور اس کی تفصیلی بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

حصہ چہارم

مبادلۂ دولت

باب نوزدہم

قیمت

(۱) بحثِ مبادلہ کی اہمیت (۲) قانونِ تقلیلِ افادہ
(۳) قانونِ طلب (۴) تغیر پذیریِ طلب (۵) بازار (۶) قدر قیمت
(۷) مسئلۂ قیمت (۸) مصارفِ پیدائش (۹) طلبِ مشترک
وطلبِ مرکب (۱۰) رسدِ مشترک و رسدِ مرکب

۱۔ مبادلے کا مفہوم اس کے لوازمات و شرائط اور مبادلے کی مختلف صورتیں بعنوان مبادلہ پذیری واشکالِ دولت بالتفصیل بیان ہو چکی ہیں یہاں مجملاً اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ مبادلے سے مراد ہے چیزوں کا ایک دوسری سے ادل بدل کرنا۔ مبادلے کی بنا افادہ ہے اور قلت یعنی تعینِ مقدار اور تملیک کلی شرط لابد۔ مبادلے میں انتقالِ ملک اگرچہ معمولی ہے لیکن لازمی نہیں؛

مبادلے کے متعلق دو جدید نکتوں کی تشریح یہاں ضروری ہے۔

حصۂ چہارم
باب نوزدہم

پہلی بات توجہ طلب یہ ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت کسی دو چیزوں کے مبادلے کے واسطے ایک خاص تیسری چیز کی وساطت لازمی ہی ہو گئی ہے جس کو اصطلاحاً زر کہتے ہیں۔ اس چیز سے ہم عنقریب ایک جداگانہ باب میں مفصل بحث کریں گے زر کے سیدھے سادے مفہوم سے ہر کوئی واقف ہے یعنی کوئی ایسی چیز جس کو ہر شخص بلا عذر اپنی چیز کے مبادلے میں قبول کرے۔ مثلاً روپے پیسے پونڈ شلنگ اور پیسے ہیں۔ ہر ملک کی چیزوں کا براہ راست مبادلہ آجکل شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ پس ماندہ دیہات میں کھانے پینے کی چیزوں کا تو ادل بدل ہو جاتا ہے۔ مثلاً غلہ دے کر پھل اور ترکاری لینا۔ دودھ سے تیل بدلنا۔ حجام سقے کو غلہ بطور فصلانہ دینا۔ لیکن دیہات میں بڑی بڑی چیزوں کا مثلاً ہل بیل۔ کھاد۔ گاڑی اور شہروں میں چھوٹی بڑی ہر قسم کی چیزوں کا مبادلہ ہمیشہ زر کی وساطت سے ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مبادلے کا عمل زائد خرید و فروخت کے دو عملوں میں تقسیم ہو گیا ہے جب ہم اپنی چیز کا زر سے مبادلہ کرتے ہیں تو ہماری طرف سے یہ عمل فروخت کہلاتا ہے۔ اور مبادلے میں ملے ہوئے زر کا جب کسی شئے مطلوبہ سے مبادلہ کرتے ہیں تو وہ خرید کہلاتا ہے حالانکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فروخت و خرید کے ہر دو عمل کا نتیجہ درحقیقت اپنی چیز کا دوسرے کی شئے مطلوبہ سے مبادلہ ہوتا ہے اور زر محض ایک درمیانی وسیلے کا کام دیتا ہے۔ مثلاً آجکل سائیکل اور گھوڑے کا براہ راست مبادلہ تو بہت کم ممکن ہے لیکن مبادلے کا نہایت سہل طریق یہ ہے کہ اول ہم اپنا گھوڑا کسی سوار کے ہاتھ بیچ دیں اور اس کی قیمت سے کسی سوداگر کی دکان سے سائیکل خرید لیں یعنی اول گھوڑے کا زر سے مبادلہ کریں۔ جس کو فروخت کہتے ہیں۔ اور بعدہٗ زر کا سائیکل سے جو خرید کہلاتا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو خرید و فروخت کے دو عملوں سے بوسیلۂ زر صرف گھوڑے اور سائیکل کے مبادلے کا عمل واحد ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس جدید

حصۂ چہارم
باب دوم

بحث طویل ہے۔ اس طریق میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں جن سے ہم آئندہ مفصل بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہئے کہ معاشی ترقیات نے مبادلے کے عمل واحد کو خرید و فروخت کے دو عملوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اب بجائے اس کے کہ ہم اپنی پیداوار سے شئے مطلوبہ کا براہ راست مبادلہ کریں ایک تیسری چیز زر کی وساطت سے یہ عمل مبادلہ پورا کرتے ہیں ؛

مبادلے کے متعلق دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ اب اس کی از حد کثرت ہے۔ کسی زمانے میں تو ہر خاندان اپنی مختصر ضروریات بیشتر خود ہی پوری کر لیتا تھا اور مبادلے کی بہت کم نوبت آتی تھی ناگزیر ضروریات زندگی مثلاً کھانا کپڑا اور مکان سب اہل خاندان مل جل کر مہیا کر لیتے تھے لیکن معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ ایک تو ضروریات میں روز افزوں اضافہ شروع ہوا دوسرے طریق تقسیم عمل کی اشد ضرورت اور اس کے بیش بہا فوائد بھی نمایاں ہونے لگے نوبت بایں جا رسید کہ آجکل نہ صرف ضروریات کی تعداد بہت بڑھی ہوئی ہے اور بڑھ رہی ہے بلکہ ان کی بہم رسانی کے واسطے ہم عموماً بالکلیہ دوسروں کے محتاج ہیں اور اسی طرح دوسرے ہمارے محتاج ہیں ہر ایک شخص دوسروں کی ضروریات مہیا کرنے میں مصروف ہے اور اپنی ضروریات دوسروں سے حاصل کرتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ اپنی ضروریات خود اپنے ہاتھ سے براہ راست بہم پہنچانے کے بجائے وہ اپنے حسب حال دوسروں کے واسطے کوئی ایک یا زیادہ ضروریات مہیا کر کے مبادلے کے ذریعے سے اپنی کل ضروریات جن کو دوسروں نے اس کی طرح بہم پہنچایا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے۔ کسان غلہ اگاتا ہے، باغبان پھل پھول لگاتا ہے۔ موچی صرف جوتا بناتا ہے جلاہا صرف کپڑا بناتا ہے۔ لوہار قفل بناتا ہے۔ ڈاکٹر علاج کرتا ہے سوداگر طرح طرح کے مال لاتا ہے،

لیکن ہر پیشے و حرفے والا بیشتر دوسروں کی ضروریات مہیا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اور صرف ایک یا چند ضروریات بہم پہنچا کر مبادلے کے طفیل سے اپنی ہر قسم کی کُل ضروریات بلا دقت و پریشانی حاصل کر لیتا ہے۔ کیا یہ کچھ کم عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ سہولت و ارزانیِ آمد و رفت اور قیامِ امن و امان کی بدولت صنعت و حرفت اور تجارت نے وہ فروغ پایا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ مدّت العمر ایسی چیزیں تیار کرتے رہتے ہیں کہ جن کو وہ برائے نام بھی خود استعمال نہیں کرتے اور جو اُن لوگوں کی ضروریات میں داخل ہیں جو ہزارہا میل دور رہتے ہیں اور جن کی صورت کبھی خواب میں بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ دور اُفتادہ لوگ بھی اپنی طرف سے اُن کے واسطے کوئی نہ کوئی ضرورت بہم پہنچانے میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ اگر طریقِ تقسیمِ عمل یوں اختیار نہ کیا جاتا اور ہر ایک شخص جدا جدا خود اپنی ضروریات مہیا کرنے کی کوشش کرتا تو موجودہ حاصل شدہ ضروریات کا عشرِ عشیر بھی میسر نہ آتا اور معاشی ترقیات خواب و خیال سے بھی باہر رہتیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ طریقِ مبادلہ کُل معاشی ترقیوں کی پہلی شرط ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معاشی جد و جہد کی باقی تین صورتیں یعنی پیدائش، تقسیم اور صرفِ دولت اسی مبادلۂ دولت کی خوبیوں اور برکتوں کی شرح اور تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مبادلہ اور خصوصاً مسئلۂ قیمت جس سے ہم ابھی بحث کریں گے۔ بالاتفاق علم المعیشت کا سنگ بنیاد مانا گیا ہے اور ہر ایک مستند مصنف نے اس کی تشریح و توجیہ میں پوری قابلیت صرف کی ہے۔ مِل کو بھی بخیال خود اپنے اسی مبحث کے بیان پر ناز تھا اور انگلستان کے مشہور معاشی پروفیسر مارشل نے بھی مسئلۂ قیمت میں سب سے زیادہ جدت اور نازک خیالی دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی تصنیف کا یہ جزو بہت زیادہ قابل قدر مانا جاتا ہے۔ اگر مبادلے کا رواج نہ ہوتا تو دنیا طریقِ تقسیمِ عمل

پیدائش پیمانۂ کبیر صنعت وحرفت اور تجارت غرضکہ کُل معاشی ترقیات سے بالکل محروم رہ جاتی اور موجودہ گوناگوں تعیشات کا تو ذکر کیا ہے۔ بغیر مبادلہ روکھا سوکھا کھانا۔ موٹا جھوٹا کپڑا اور ٹوٹا پھوٹا مکان جیسی مایحتاج زندگی بھی محض اپنی قوت بازو سے ہر شخص کو حسب دلخواہ میسر آنی محال ہو جائیں۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ مبادلے کی قلت وکثرت معاشی پس ماندگی و ترقی کا عام معیار ہے۔ مبادلے کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ معاشی جد وجہد کے ہر شعبے سے اس کا اساسی تعلق ہے۔ زمین محنت اصل اور تنظیم ان ہی چار عاملین کے اتفاقِ عمل پر پیدائش دولت کا دارومدار ہے۔ اور دولت معاشی زندگی کی روح رواں ہے۔ لگان۔ اجرت۔ سود اور منافع تقسیم دولت کی یہ چاروں شکلیں درحقیقت ان چاروں عاملوں کی خدمتوں کا معاوضہ یعنی قیمت ہیں۔ اسی واسطے سے ہم آگے چل کر بحث کرینگے۔ یہاں اجمالاً یہ دکھانا مقصود ہے کہ تقسیم دولت درحقیقت مبادلۂ دولت کی ایک خاص صورت ہے۔ وجہ خصوصیت یہ ہے کہ عام مبادلے میں تو چیزوں کی قیمت خریدار و فروشندہ کی آزادانہ کھینچ تان سے قرار پاتی ہے۔ لیکن لگان اجرت۔ سود اور منافع جیسی قیمتیں مدتوں تک رسم و رواج اور فرسودہ قانون کی آفریدہ رہیں اور صرف چند روز سے ان کے تعین میں فریقین کو عام قیمت کی سی آزادی مقابلۃً حاصل ہوئی ہے۔ پیدائش دولت کا براہ راست و نیز بسلسلۂ تقسیم دولت مبادلے پر انحصار ظاہر ہے۔ رہا صرف دولت سو جب پیدائش و تقسیم دولت مبادلے پر اس قدر منحصر ہیں تو صرف دولت کا بدرجۂ اولیٰ مبادلے کے زیر اثر ہونا یقینی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مبادلے کا اثر معاشی زندگی کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور اس کی بحث علم معاشیات کے ہر شعبے سے علاقۂ غالب رکھتی ہے۔ یوں تو اس علم کی کل بحثوں میں

باہمی تعلق ہے اور ہونا چاہیئے۔ لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ مبادلے کا تعلق سب سے زیادہ وسیع اور اکثر باقی تعلقات کا باعث و بنا ہے۔

مبادلے میں سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ قیمت کا ہے۔ یعنی مبادلہ یا خرید و فروخت میں کسی چیز کی قیمت کیونکر قرار پاتی ہے تعیّن۔ تبدلِ قیمت کن کن قوانین کا پابند رہتا ہے۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چند دیگر قوانین سمجھانا ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ مسئلۂ قیمت کے نکات سمجھنے میں اُن سے بعید مدد ملے گی۔

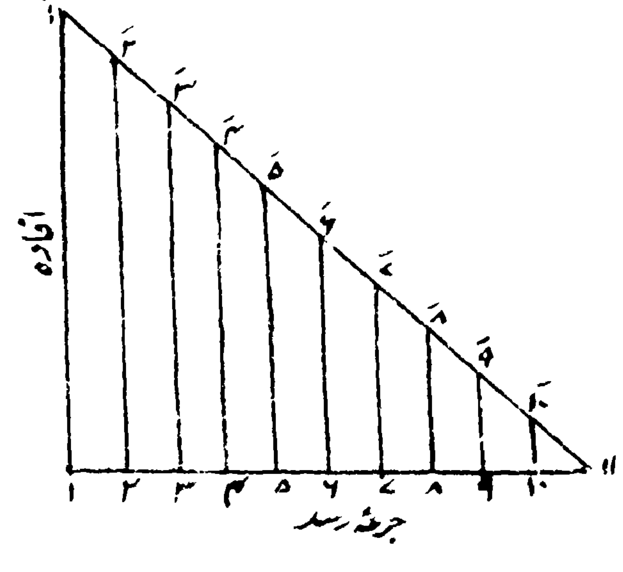
۲۔ معاشیات کے اکثر قوانین پر ہم بےخبری میں عمل کرتے رہتے ہیں لیکن ان سے واقف ہوئے بغیر اُن کے نتائج ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ معاشیات کے مسائل میں جہاں عدم تعیّن کی خامی عام ہے وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ بلا اہتمام معاشی قوانین ہر ایک کے تجربے میں آتے رہتے ہیں اور اکثر واقف ہونے پر تعجب ہوتا ہے کہ ایسی بیّن یا اُفتادہ بات سے ہم اب تک کیوں غافل رہے اور اس کے نتائج پر کیوں غور نہ کیا چنانچہ قانونِ تقلیلِ افادہ پر انسان تو درکنار حیوان بھی عامل نظر آتے ہیں اور شیرخوار بچے تک اس کی پابندی کرتے ہیں اگر کسی بھوکے پیاسے جانور کے سامنے دانہ پانی رکھا جائے تو اوّل اوّل وہ کیسی جلدی جلدی کھانا پینا شروع کرتا ہے لیکن بتدریج کھانے پینے کی رفتار گھٹنے لگتی ہے پھر وہ کچھ ٹھہر ٹھہر کر تھوڑا تھوڑا آہستہ کھاتا ہے حتّٰی کہ سیر ہو کر علٰحدہ ہو جاتا ہے پھر خواہ دانہ پانی کتنا ہی اس کے سامنے کیوں نہ رکھا رہے منھ ڈالنا تو درکنار ادھر نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وجہ کیا ہے۔ جبکہ بھوک پیاس سی احتیاج کی شدت تھی تو دانے پانی کے ابتدائی جرعوں میں اس کو افادہ بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا لیکن جوں جوں بھوک پیاس گھٹتی گئی مابعد جرعوں میں افادہ بھی کم ہوتا گیا حتّٰی کہ جب سیری ہو گئی یعنی احتیاجات

تمام وکمال رفع ہوگئیں تو باقیماندہ دانہ پانی میں سے اُس وقت افادہ ابھی غائب ہوگیا جس کی وجہ سے وہ اب اُن کو سونگھتا بھی نہیں البتہ بھوک پیاس کی احتیاجیں نمودار ہونے پر پھر حسب سابق اُن میں بھی افادہ محسوس ہونا یقینی ہے۔ بھوکا بچہ کس تندہی سے ماں کا دودھ کھینچتا ہے۔ لیکن کچھ سیر ہونے پر اس کی شیر کشی کی سرگرمی بھی گھٹنے لگتی ہے اب وہ لگاتار دودھ نہیں پیتا بلکہ درمیان میں رُک رُک کر مسکراتا ہے حتٰی کہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوجاتا ہے اور بعد سیری ایک قطرہ دودھ نہیں کھینچتا وجہ یہی ہے کہ گھٹتے گھٹتے دودھ کا افادہ اُس وقت بالکل غائب ہوجاتا ہے پھر وہ شیر کشی کی تکلیف کیوں گوارا کرے۔ ان فطری واقعات سے ایک نہایت نتیجہ خیز معاشی قانون کا پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ شئے مطلوبہ کی مقدار جس قدر بڑھیگی اُس کے مزید جزوں کا افادہ متقابلۃً گھٹے گا حتٰی کہ اگر مقدار بہت بڑھ جائے تو افادہ گھٹتے گھٹتے مابعد جزوں میں بالکل مفقود ہوجائیگا یا یوں کہئیے کہ اضافہ مقدار شئے مطلوبہ اور اُس کے افادے کے اضافے میں نسبت معکوس ہے، مقدار جتنی ہی زیادہ ہوگی مزید مقدار کا افادہ نسبتہً اُتنا ہی کم ہوگا حتٰی کہ مقدار بڑھتے بڑھتے افادہ بالکل غائب ہوجانا ممکن ہے، پانی کو لو کیسی ضروری چیز ہے اور جبکہ زندگی کا اس پر اس قدر دارومدار ہو کہ چند گھنٹے اُس کے نہ ملنے سے مرنے کی نوبت آجائے تو اس کے افادے سے بڑھکر کس کا افادہ ہوسکتا ہے۔ لیکن پانی کی مقدار جس قدر بڑھتی ہے ہمارے نزدیک اُس کا افادہ گھٹتا ہے حتٰی کہ پانی بڑھتے بڑھتے افادہ غائب ہونیسے وہ اُلٹا وبال جان وبال ہوجاتا ہے، پیاس کی شدت میں ہر شخص سرد پانی کے ایک گلاس کے لیئے اپنی کل جیب خالی کرنے پر مجبور ہوسکتا ہے اگر دور دور تک کنواں اور چشمہ نہ ہو تو ایسے خشک میدان میں پانی دو چار بلکہ دس یا پانچ روپے سیر تک بھی

فروخت ہونا ممکن ہے، جب تک کسی داموں پانی میسر آسکتا ہے کوئی پیاس سے مرنا کیوں گوارا کرے گا۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی اعلیٰ شرح سے ہم صرف اس قدر پانی خریدنا پسند کریں گے جو پیاس کو تسکین دے سکے۔ لیکن اگر قیمت میں کچھ مناسب تخفیف ہو جائے تو شاید ہم اس قدر پانی خرید لیں گے کہ علاوہ پینے کے ہم اُس سے منہ ہاتھ بھی دھو سکیں۔ صاف ظاہر ہے کہ پانی کی اس مزید مقدار سے کہ جو منہ ہاتھ دھونے میں کام آئے ہم کو بمقابلہ پینے کے پانی کے کم افادہ محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم نے اُس کو پینے کے پانی کی شرح سے خریدنا پسند نہ کیا لیکن قیمت گھٹ کر جب اس کے کمتر افادے کے مساوی ہو گئی تو ہم نے اس کو خرید لیا۔ اب اگر پانی کی قیمت اور بھی گھٹ جائے تو ہم اسکی اتنی مقدار خرید سکتے ہیں کہ پینے اور منہ ہاتھ دھونے کے علاوہ اُس سے نہا دھو بھی لیں لیکن نہانے دھونے کے پانی کا افادہ پینے اور منہ ہاتھ دھونے کے پانی کے افادے سے کم ہے اس لئے جب تک قیمت میں مزید تخفیف نہ ہوئی ہم نے اُس کو نہ خریدا۔ لیکن جب ہم کو اپنی کل ضروریات کے واسطے پانی مل جائیگا تو باقی پانی میں ہمارے نزدیک کوئی افادہ نہیں رہیگا جس کی وجہ سے ہم اس کو کم سے کم قیمت پر حتیٰ کہ مفت بھی لینا گوارا نہ کریں گے کیونکہ وہ غیر ضروری بلکہ تکلیف دہ بار ہو گا اور کچھ نہیں بعینہ یہی حال باقی تمام چیزوں کا ہے جس قدر مقدارِ مطلوبہ بڑھے گی ہماری احتیاجِ متعلقہ گھٹے گی اور ساتھ ساتھ مزید اضافوں کا افادہ بھی نسبتہً کم ہوتے ہوتے مفقود ہو جائیگا حتیٰ کہ مزید اضافہ مفت بھی گوارا نہ ہو گا۔ گرمی میں برف ہر ایک کو کس قدر مرغوب ہے اگر چار آنے سیر فروخت ہو رہی ہو تو ہم صرف پانی سرد کرنے کیواسطے سیر دو سیر خرید لیں گے۔ لیکن اگر نرخ صرف ایکدم آنے سیر رہ جائے تو

ہم پانی کی برف بنانے کی تیاری کریں گے اور اگر صرف آدھ آنہ فی پاؤ سیر ہو جائے تو ہم آم اور دوسرے پھل بھی برف میں لگا کر خنکی کا لطف اٹھائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ پانی والی برف سے آئس کریم والی برف کا افادہ ہماری نظر میں کم ہے۔ اور پھل والی کا اس سے بھی کم جب ہی تو قیمت گھٹے بغیر ہم نے اس کو نہیں خریدا اگر ہمارے نزدیک افادہ یکساں ہوتا تو تینوں مقداریں اول ہی دام کی طرح سے نہ خرید لیتے۔ لیکن جب ہماری کل احتیاجیں رفع ہو جائیں گی تو برف کی اینٹ پتھر کے برابر بھی قدر نہ پائیں گے اور کوئی مفت بھی دیگا تو نہ لیں گے ؛

حاصل کلام یہ کہ قانون تقلیل افادہ سے مراد اس واقعے کا بیان ہے کہ مقدار شئے مطلوبہ میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے مزید مقدار کا افادہ بھی نسبتہً گھٹنے لگتا ہے حتی کہ مقدار بڑھتے بڑھتے افادے کا اضافہ بالکل بند ہو سکتا ہے۔ اگر احتیاج ایک قطعہ اراضی فرض کر کے شئے مطلوبہ کی مقداریں جرعے قرار دے لئے جائیں اور افادے کو پیداوار مان لیں تو قانون تقلیل افادہ بعینہ قانون تقلیل حاصل کے مشابہ نظر آئیگا اور اس کی کل تفصیل اسپر بالکل راست عائد ہوگی۔ اور تفصیل کی تطبیق از حد دلچسپ بھی ثابت ہوگی۔ ذیل کی شکل سے قانون تقلیل افادہ کا مفہوم اور اسکی قانون تقلیل حاصل سے مشابہت بخوبی واضح ہے ؛



اس شکل میں خط ایک سے لے کر ۱۰ تک برابر برابر رسد کے کم از
حصے دکھائے گئے ہیں اور ۱-۱ و ۲-۲ سے ۱۰-۱۰ تک علی الترتیب
ہر ایک حصے کا جداگانہ افادہ جو قانون تقلیل افادہ کے بموجب
گھٹتے گھٹتے گیارھویں حصے پر غائب ہو جاتا ہے۔ اور یہ وہ حالت
ہوگی جبکہ احتیاج مطلوبہ تمام و کمال پوری ہو جائے گی ا سے لے کر
۱۰ تک کی شکل اصطلاحاً خط افادہ کہلائیگی۔

اس قانون کا مفہوم بتا دینے کے بعد اب اس کے متعلق ہم
ضروری نکات واضح کرنا چاہتے ہیں، اوپر کی بحث سے صاف ظاہر ہے
کہ ہم نے افادے کا معیار وہ قیمت قرار دی ہے جو ہم کسی مقدار
کے واسطے ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔ مثلاً اگر برف ۸ آنے سیر بک رہی ہو
خریدیں تو گویا دو سیر برف کا افادہ ہمارے نزدیک عہ سے زیادہ نہیں۔
قیمت کے اس معیار پر چند نہایت بھاری اعتراض عائد ہوتے ہیں
اور یہ معیار کسی حال میں بھی سراسر قابل اعتماد نہیں مانا جا سکتا لیکن چونکہ
اس سے بہتر معیار میسر نہیں آسکا لہٰذا باہمہ نقائص اسی کو غنیمت سمجھ کر اختیار
کرلیا، اس معیار کے نقائص کی دقیق و پیچیدہ بحث بخوف پراگندگی
و حیرانی ترک کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ قیمت کے متعلق
ایک نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ عام مقولہ ہے کہ غریب کا ایک پیسہ اور
امیر کا ایک روپیہ برابر ہے یعنی غریب کی نظر میں ایک پیسے کی
وہی قدر ہوتی ہے جو امیر کی نظر میں ایک روپے کی۔ پندرہ روپے
ماہوار آمدنی والے کو ایک روپیہ جس قدر عزیز ہوگا ہزار روپے ماہوار والے
کے نزدیک تیس روپے کی بھی اس کے برابر قدر نہ ہوگی۔ اس
واقعے سے اول تو قانون تقلیل افادہ کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ گویا
روپے کی مقدار میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے ہر مزید اضافے کا
افادہ نسبتاً گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ جب آمدنی پندرہ سے بڑھ کر ہزار
ہوتی ہے تو تیس روپے کا افادہ گھٹتے گھٹتے بمشکل سابق کے

ایک روپے کے برابر رہ جاتا ہے یعنی جس افادے کا غریب آدمی ایک روپیہ معاوضہ تخمینہ کرتا ہے اسی افادے کا امیر آدمی تین روپے کرتا ہے۔ برف پینے کا خصوصاً گرمیوں کے موسم میں کس روزہ دار کو اشتیاق نہیں ہوتا۔ لیکن امیر آدمی دو روپے سیر تک برف نہیں چھوڑ سکتے۔ متوسط الحال ۱۲ آنے ۸ آنے سیر تک خرید سکتے ہیں اور غریب ایک آنہ سیر سے آگے جرأت نہیں کر سکتے۔ ان تینوں طبقوں کے تخمینے میں وہی ایک سیر برف کا افادہ دو روپے ۸ آنے اور ایک آنے کے برابر ہے گویا تینوں قیمتیں ایک ہی مقدار افادہ کے بظاہر جداگانہ معیار معلوم ہوتے ہیں لیکن قیمت دہندوں کے تخمینے میں اُن قیمتوں کا جو افادہ ہے وہ برابر ہے لہذا یہ تینوں معیار بھی یکساں ہیں ان کے ظاہری عدم مساوات سے دھوکے میں نہ پڑنا چاہیئے اگر دو روپے آٹھ آنے اور ایک آنے کا افادہ بالکل برابر بھی نہ ہو تو فرق اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا جو ان مقداروں میں بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اور سہولت بیان کی غرض سے اس ایک قلیل فرق نظر انداز کر کے ان تینوں رقموں کا ہر طبقہ کے آدمی کی نظر میں یکساں افادہ قرار دینا کچھ بعید از حقیقت نہیں ہے۔ پس قیمت کو معیار افادہ قرار دینے میں قیمت دہندہ کی مالی حالت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ یہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ امیر اور غریب اگر ایک ہی چیز ایک روپے اور ۱۲ آنے کو خریدیں تو غریب کی نظر میں اس چیز کا افادہ بمقابلہ امیر کے چوگنا ہو۔ اگرچہ صرف مقدار قیمت پر نظر کرتے ہوئے غریب کے نزدیک اس چیز کا افادہ صرف ایک چوتھائی معلوم ہوگا۔ خوشحالی اور افلاس کے علاوہ معیار قیمت پر طبیعت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ بعض لوگ فراخ حوصلہ اور فراخ خرچ ہوتے ہیں بعض تنگ دل اور [illegible]

ہوتے ہوئے بھی آخر الذکر کا ایک روپیہ اوّل الذکر کے دس روپے کے برابر ہو تو عجیب نہیں مالی حالت اور طبیعت کے علاوہ شوق اور مذاق کا اختلاف بھی معیارِ قیمت میں قابلِ لحاظ ہے چند احتیاجِ زندگی مثلاً کھانا پانی وغیرہ تو ایسی ہیں کہ ان کی کم و بیش ہر شخص کو احتیاج ہوتی ہے لیکن بیشمار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا کسی کو بدرجۂ عشق و دیوانگی شوق ہے اور بعض ان سے نفور اور گریزاں ہیں اور بعض کے نزدیک اُن کا ملنا نہ ملنا یکساں، مختلف مذاق کے لوگ جب کسی ایک ہی چیز کی یکساں قیمت ادا کریں تو وہ قیمتیں باوجود مساوات یقیناً مختلف مقدارِ افادہ کی معیار ہوں گی اور اگر مختلف قیمتیں ادا کریں تو اُن سب کا باوجود عدمِ مساوات ایک ہی مقدارِ افادہ کا معیار ہونا اغلب نہیں تو ممکن ضرور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی قیمت بیشمار مدارج افادہ کا معیار ہو سکتی ہے اور ایک ہی مقدارِ افادہ کے بیشمار معیارِ قیمت قرار پا سکتے ہیں گویا ہر ایک قیمت ایک جداگانہ معیار ہے۔ اس نتیجے کی صحت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن کسی ملک کے معاشی حالات کے مطالعے اور تحقیق میں اتنے دقیق فرق قابلِ لحاظ نہیں ہوتے اور ان کو نظر انداز کر کے عام حالات پر اکتفا کرنے سے بجائے کسی نقص و خامی کے عملی تحقیقات میں بیش بہا اور ناگزیر سہولت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ فرقِ معیار کے متعلق بھی یہی طریق برتا جاتا ہے اور اس سے کوئی مفر بھی نہیں۔

قانونِ تقلیلِ افادہ کے عملدرآمد میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ہماری احتیاج معیّن ہے۔ اور اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر مقدارِ شۓ مطلوبہ کے اضافے کے ساتھ ساتھ احتیاج میں بھی اضافہ ہو تو اس قانون کا عمل اگر قطعاً نہ رکے تو ملتوی ضرور ہو سکتا ہے مثلاً ہم بشرح ۲۴ آنے سیر پینے کے واسطے سیر بھر برف

حصہ چہارم باب نہم

روز منگائیں۔ اور اگر نرخ گھٹ کر ایک آنے سیر رہ جائے تو ۴ سیر برف اور
منگا کر شاید آئس کریم بھی جما ڈالیں۔ لیکن اگر ہمارے ہاں مہمان آجائیں تو
ہم نرخ ۴ آنے سیر صرف پینے کے واسطے ۵ سیر منگالیں تو عجب نہیں
گویا جس نرخ سے ہم پہلے صرف ایک سیر برف خریدنا پسند کرتے تھے
اسی نرخ سے ہم نے اب ۵ مقدار خریدلی جو ہم پہلے کمتر نرخ سے خریدنا پسند کرتے تھے
وجہ یہ ہے کہ احتیاج بڑھنے سے قانون تقلیل افادہ کا عمل ملتوی ہوگیا لیکن پینے کے
۵ سیر برف سے زائد برف آئس کریم کے واسطے ہم اب بھی شاید ایک آنہ سیر
سے زیادہ خریدنے پر آمادہ نہ ہوں گے گویا قانون کا عمل پہلے ایک سیر بعد
شروع ہوجاتا تھا اور اب احتیاج بڑھنے پر ۵ سیر بعد شروع ہوتا ہے ؛

اگرچہ قانون تقلیل افادہ سے کوئی فرق نہیں۔ احتیاج کے اضافے سے اس کے
عمل کا التوا البتہ ممکن ہے لیکن یہاں پر یہ کہنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ
کبھی کبھی اس قانون کے عمل سے قبل اس کے برعکس قانون تکثیر افادہ کا عمل
عارضی طور پر نمودار ہوتا ہے۔ یہ اسوقت ممکن ہے جبکہ موجودہ مقدار شئے مطلوبہ
موجودہ احتیاج کیواسطے ناکافی ہو ایسی حالت میں مقدار شئے مطلوبہ کا اضافہ اس
حد تک کہ موجودہ احتیاج رفع ہوجائے قانون تکثیر افادہ کا پابند ہوگا
مثلاً ہم کو آئس کریم بنانا مقصود ہے اور اس کے واسطے ۵ سیر برف
درکار ہے۔ اب اگر صرف ۲ سیر برف دستیاب ہوسکے تو ہم اس کو
شاید بہت کم قیمت پر بھی خریدنا پسند نہ کریں کیونکہ اس سے ہماری
موجودہ احتیاج پوری نہیں ہوسکتی لیکن اگر مقدار مطلوبہ دستیاب ہو تو
ضرور مناسب قیمت پر خریدلیں گے کپڑوں کے ٹکڑے خاص
اسی وجہ سے کمتر قیمت پر فروخت ہوتے ہیں کہ اُن سے حسب دلخواہ
لباس تیار نہیں ہوسکتا۔ جو کپڑا پورے سوٹ کے واسطے ہم
بقدر ۴ گز چار روپے کے نرخ سے بخوشی خریدیں اس کا ۳ گز کا
ٹکڑا جس سے ایک چھوٹا کوٹ تیار ہوسکے ہم ۲ روپے گز کو بھی
نہ خریدیں تو کیا عجب اور اگر ٹکڑا اس سے بھی چھوٹا ہو تو کوئی اپنے

بچے کے واسطے بہت سا خرید لیا - اسی طرح علاوہ موقع کے زمین کی وسعت کا اس کی قیمت پر اثر پڑتا ہے اگر احتیاج سے کم ہے تو بھی قیمت گھٹے گی اور اگر احتیاج سے بہت زیادہ ہے تو بھی قیمت پر مضر اثر پڑے گا البتہ اگر احتیاج کے موافق ہے تو خریدار اپنے تخمینے کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ شرح منظور پیش کردیگا مکانات کے کرایے کا بھی یہی حال ہے غرضکہ قانونِ تقلیل افادہ اور کثیر افادہ کا عملدرآمد حسب طریق بالا ہر خرید و فروخت میں مخفی یا نمایاں ہوگا:

قانونِ تقلیل افادہ کی ایک سادہ مثال سے مزید تشریح کرکے اس کے متعلق چند ضروری اصطلاحات اور بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو کہ کوئی خاندان چائے کا عادی ہے اب اگر نرخ چاء ۳۲ روپے فی ڈبا ہو تو شاید ایک ہی ڈبا خریدا جائے۔ دوسرا ڈبا اس وجہ سے نہیں خریدیں گے کہ قانونِ تقلیل افادہ کے بموجب اس کا افادہ پہلے ڈبے کے افادے سے کمتر ہوگا۔ لہٰذا اس کی قیمت پہلے ڈبے کے برابر نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ اگر نرخ گھٹ کر ۲۴ روپے ڈبا رہ جائے تو بجائے ایک ڈبے کے دو ڈبے خریدے جاسکیں گے۔ اس صورت میں ۲۴ روپے دوسرے ڈبے کے افادے کا معیار ہوگا۔ اور چونکہ پہلا ڈبا ۳۲ روپے کو خرید لیا جاتا اس لیئے ۳۲ روپے اس کے افادے کا معیار رہا۔ ان دونوں ڈبوں کے مجموعی افادے کا معیار رہا (۳۲ + ۲۴) ۵۶ روپے ہوا اور ایسے مجموعی افادے کو اصطلاحاً افادۂ کلی کہتے ہیں لیکن اگر خریدار کے نزدیک پہلے ڈبے کا افادہ ۳۲ روپے ہے اور دوسرے کا ۲۴ روپے۔ سب ڈبے بلا تفریق ایک ہی نرخ سے فروخت ہوتے ہیں اور دونوں ڈبے ۲۴-۲۴ روپے کو خریدے گئے صاف ظاہر ہے کہ خریدار کی نظر میں پہلے ڈبے پر بقدر (۳۲-۲۴) ۸ روپے

حصہ چہارم
باب نوزدہم

زائد افادہ حاصل ہوا جس کو اصطلاحاً نفع المصرف کہتے ہیں۔ نیز واضح ہو کہ
۲۴ روپے دوسرے ڈبے کے افادے کا معیار ہے۔ اگر
۳۰ روپے میں ڈبا فروخت ہوتا تب بھی ایسے ہی ڈبا خریدا جاتا اور
اس صورت میں ۲۲ (۳۰ - ۲۲ = ۸) روپے نفع المصرف
حاصل ہوتا لیکن دوسرے ڈبے کے خریدنے کی نسبت
خیال یہ تھا کہ اس کا افادہ ۲۴ روپے سے زیادہ نہیں ہے لہٰذا
دوسرے ڈبے کے خریدنے کی شرط یہ نکلی کہ وہ ۲۴ روپے کو فروخت ہو اور جب ایک ڈبا
۲۴ روپے کو فروخت ہوا تو دوسرا اس سے زائد قیمت پر کیوں فروخت ہونے لگا۔ آئیں
لیا عمل کے گئے ہیں۔ فروشندہ کی نظر میں ڈبے سب برابر محض
اس وجہ سے کہ خریدار کی نظر میں ڈبوں کے افادے کی مقدار
مختلف ہیں فروشندہ اپنی طرف سے بلحاظ فرق افادہ اُن کی قیمت میں
فرق قرار نہیں دے سکتا۔ اگر اس کو دو ڈبے فروخت کرنے
مقصود ہیں تو وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ایک ڈبا ۳۲ کو اور ساتھ ہی اس قسم کا
دوسرا ڈبا ۲۴ روپے کو دے بلکہ ایک ساتھ دونوں ڈبے
۲۴-۲۴ کو فروخت کرے گا اور دوسرے ڈبے کا کمتر افادہ
جس کا معیار ۲۴ روپے ہے اصطلاحاً افادۂ مختتم کہلائے گا۔
یہاں پر یہ اصول بھی واضح ہوا کہ جب کوئی شخص ایک ہی چیز کے
چند عدد یا کوئی مقدار خریدے تو اس کی نظر میں ہر عدد یا جزو مقدار کا
افادہ مختلف ہوگا اور جس قدر عدد یا مقدار میں اضافہ ہوگا ایسے
اضافے کے افادے میں نسبتاً تخفیف ہوتی جائے گی اور ان
تمام عددوں یا مقدار کی قیمت وہ بشرح مساوی ادا کریگا تو وہ آخری عدد
یا جزو مقدار کے کمترین افادے کے برابر ہوگی بالفاظ مختصر
کسی چیز کی شرح قیمت اس کے افادۂ مختتم کے مساوی ہوتی ہے
جس کی وجہ سے بمقدار افادۂ زائد خریدار کو نفع المصرف حاصل
ہوتا ہے۔ افادۂ کلی۔ افادۂ مختتم۔ اور نفع المصرف۔ کا مفہوم اور اُن کا

باہمی تعلق ذیل کی مثال سے بیان بالا کے ساتھ ساتھ اور بھی واضح ہوگا۔ یہاں پر حسب بالا فرض کرتے ہیں کہ کس کس قیمت پر کتنے کتنے چائے کے ڈبے خرید سے جاسکتے ہیں اور ہر صورت میں افادۂ کلی۔ افادۂ مختتم اور نفع المصرف کیا کیا ہوگا۔

اعلیٰ ترین قیمت	ڈبوں کی تعداد	افادۂ کلی	افادۂ مختتم	نفع المصرف
۳۲ روپے	۱	۳۲	۳۲	۰
۲۴ "	۲	۵۶(۲۴+۳۲)	۲۴	۸ (۴۸-۵۶)
۱۸ "	۳	۷۴(۱۸+۵۶)	۱۸	۳۰(۵۴-۷۴)
۱۴ "	۴	۸۸(۱۴+۷۴)	۱۴	۳۲(۵۶-۸۸)
۱۲ "	۵	۱۰۰(۱۲+۸۸)	۱۲	۴۰(۶۰-۱۰۰)

اعلیٰ ترین قیمت سے مراد وہ قیمت ہے کہ جس سے زائد دینے پر خریدار رضامند نہ ہو اور چونکہ وہ افادۂ مختتم کے مساوی ہوتی ہے قانون تقلیل افادہ کے طفیل سے اعلیٰ ترین قیمت ادا کرنے پر بھی خریدار کو کچھ نہ کچھ افادۂ زائد یعنی نفع المصرف حاصل ہو ہی جاتا ہے لیکن جیسا کہ اکثر واقع ہوتا ہے اگر حسن اتفاق سے خریدار کو اعلیٰ ترین سے کم قیمت پر چیز مل جائے تو اس کو دوگنا نفع المصرف حاصل ہوگا مثلاً مثال بالا میں اگر نرخ چائے ۲۸ روپے ڈبا ہو تو پہلے ڈبے پر بھی اس کو (۳۲-۲۸) ۴ روپے نفع المصرف ملے گا اور اگر نرخ بجائے ۲۴ کے ۲۰ روپے رہ جائے تو پہلے دو ڈبوں پر بجائے ۸ روپے کے {(۳۲ + ۲۴)-۴۰} ۱۶ روپے نفع المصرف دستیاب ہوگا لیکن واضح ہو کہ قیمت ۲۰ روپے ہو جانے پر بھی وہ صرف دو ہی ڈبے خریدے گا۔ تیسرا ڈبا جس کا افادہ اس کی نظر میں زیادہ سے زیادہ ۱۸ روپے ہے نہیں خرید سکتا کیونکہ ایسا کرنے میں نفع المصرف ۱۶ روپے سے گھٹ کر {(۳۲ + ۲۴ + ۱۸)-۶۰} صرف ۱۴ روپے رہ جاتا ہے گویا تیسرا ڈبا خریدنے میں سراسر نقصان ہے البتہ قیمت ۱۸ روپے

[illegible]

تو وہ ۱۰ روپے پر دو ٹین اور پیچھے خریدے گا کیونکہ ایسا کرنے سے نفع المصرف ۱۰ روپے سے بڑھ کر ۱۲ روپے ہو جائے گا اور اگر حسن اتفاق سے قیمت گھٹ کر ۷ روپے رہ جائے تو نفع المصرف میں اور بھی اضافہ ہو سکے گا لیکن اسی طرح پر قیمت جب تک ۱۲ روپے نہ ہو گی وہ چائے ہرگز نہ خریدے گا۔

مذکورہ بالا بحث سے قیمت کا ایک پہلو بخوبی واضح ہو لیا ہے۔ اور اس توضیح سے آپ کے پاس مسئلۂ قیمت کی تحقیق کا ایک بنیادی خاکہ خریدار کی طرف سے شرح قیمت ہمیشہ کسی چیز کے افادۂ مختتم سے مساوی ہوتی ہے یا اس سے کم افادۂ مختتم سے زیادہ اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس میں خریدار کا سراسر نقصان ہے۔ نفع المصرف کی مقدار بجائے بڑھنے کے الٹی گھٹ جاتی ہے۔ جو قیمت کہ خریدار کی طرف سے پیش کی جائے اصطلاحاً قیمت طلب کہلاتی ہے اور جیسا کہ خوب واضح ہو چکا ہے وہ افادۂ مختتم کے مساوی ہوتی ہے یا اس سے کم۔

قانون طلب

۴۔ قانون تقلیل افادہ اس غرض سے یوں بالتفصیل بیان کیا گیا کہ وہ قانون طلب کا سنگ بنیاد ہے اور لہٰذا اس کا ذہن نشین ہونا بھی اس کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ اساسی قوانین اول جب اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں تو بعد کو مسائل متعلقہ کے بیان میں بہت آسانی و سہولت پیدا ہو جاتی ہے قوانین کا صرف حوالہ کافی ہوتا ہے اور تمامتر توجہ مسئلۂ زیر بحث پر یکجا رہتی ہے۔ قانون طلب کو ہم کئی طرح پر بیان کر سکتے ہیں لیکن وہ سب ایک ہی واقعے کے مختلف پہلو ہوں گے۔

الف۔ کسی چیز کی مقدار رسد جس قدر بڑھے گی اس کی قیمت بھی ضرور گھٹے گی۔ یعنی اگر کوئی چیز زیادہ مقدار میں فروخت کرنا مقصود ہو تو اس کی قیمت گھٹانا لازمی ہو گا جیسا کہ صاف ظاہر ہے۔ ہر مزید اضافے کا افادہ گھٹے گا اور قیمت

افادۂ مختتم سے زیادہ نہیں ہوسکتی ۔

ب ۔ کسی چیز کی مقدار رسد جس قدر گھٹے گی اُس کی قیمت بڑھیگی ۔ قانونِ تقلیلِ افادہ کا اثر کثرت میں بہت قوی ہوجاتا ہے اور قلت میں اس کے برعکس، پس جبکہ شئے مطلوبہ کی مقدار برابر گھٹے گی تو افادۂ مختتم کی مقدار میں اضافہ ہوگا ۔ اور قیمت کو بھی اس کے ساتھ بڑھنا پڑے گا ۔

ج ۔ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی جتایا جاچکا ہے یہ بات پیشِ نظر رکھنی از حد ضروری ہے کہ قانون تقلیل افادہ و نیز قانونِ طلب میں کسی چیز کی طلب کی حالت معین فرض کر لی جاتی ہے ۔ طلب کا دار و مدار آبادی، رسم و رواج اور لوگوں کے شوق و مذاق پر ہے نیز ایسی چیزوں کا جو شئے زیر بحث کے بدل کے طور پر استعمال ہوسکتی ہیں طلب پر قابلِ لحاظ اثر پڑتا ہے ، قانونِ طلب بیان کرتے وقت ان تمام حالتوں میں سکون فرض کرتے ہیں گویا ان میں کوئی قابلِ لحاظ تغیر پیدا نہیں ہوتا اور اس لئے شئے زیر بحث کی طلب معین سی مانی جاتی ہے ۔ مثلاً چائے کا رواج کثرتِ آبادی ۔ ملکی آب و ہوا ۔ رسم و رواج عام شوق و مذاق پر منحصر ہے کافی اور قہوے کے رواج کی کمی بیشی کا بھی چائے کے استعمال پر اثر پڑتا ہے اگر ان حالات کے ردّ و بدل سے چائے کی طلب میں معقول اضافہ ہو تو قوانینِ تقلیلِ افادہ و طلب کا اثر ضعیف بلکہ قطعاً زائل ہوسکتا ہے اور اگر طلب بھی گھٹے تو ان قوانین کا عمل دس گنا قوی ہونا آسان ہے گویا طلب میں کوئی قابلِ لحاظ

حصہ سوم
باب نمبر ۴

کمی بیشی ان قوانین کے عمل کے مخالف و معاون ہوتی ہے لیکن قوانین بحالتِ مخالفت و معاونت اپنا عمل برابر جاری رکھتے ہیں۔ اس سے باز نہیں رہ سکتے۔ ان قوانین کا اثر دریافت کرتے وقت طلب کم و بیش معین فرض کی جاتی ہے اور ایسا مفروضہ کچھ زیادہ خلافِ واقعہ بھی نہیں کیونکہ طلب میں بڑے بڑے تغیرات مدتوں بعد نمودار ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان ہر دو قوانین کا عمل واضح ہر طرف نظر آتا ہے۔

کبھی کبھی طلب کی حالت جلد بھی بدل جاتی ہے اور قانونِ طلب کے عمل میں ضعف آجاتا ہے مثلاً شروع فصل میں جبکہ ہر شخص کو شوق ہوتا ہے خربوزے اور آم جیسے پھلوں کی قیمت بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور عین ریزش کے زمانے میں قیمت بہت گھٹ جاتی ہے اس کا باعث قانونِ تقلیلِ افادہ اور قانونِ طلب سے صاف ظاہر ہے لیکن آخر فصل میں جبکہ ان پھلوں کی اتنی ہی کمی ہو جاتی ہے جتنی کہ شروع فصل میں تھی ان کو معمولی قیمت پر بھی لوگ خریدنے کی پروا نہیں کرتے۔ سوال ہوتا ہے کہ مقدار گھٹنے پر قیمت میں اضافہ کیوں نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ حالتِ طلب بدل گئی لوگوں کا کھاتے کھاتے جی بھر گیا۔ طبیعت سیر ہو گئی گویا شروع اور آخرِ فصل کی طلب میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا اسی وجہ سے آخرِ فصل میں قانونِ طلب کا عمل بھی نمایاں نہیں ہوتا۔

یہ بھی اکثر سننے میں آتا ہے کہ کسی چیز کی طلب بڑھنے سے اُس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور طلب گھٹنے سے قیمت بھی گھٹ جاتی ہے یہ مقولہ صرف اس حالت میں

صحیح ہے جبکہ مقدار رسد معین فرض کر لی جائے اول یہ کہ شئے زیر بحث کی مقدار میں جلد اضافہ نہ ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ شئے مذکور سریع الزوال ہو اور عرصے تک اچھی حالت میں نہ رہ سکے۔ مثلاً کچھ قدیم چیزیں فروخت کی جائیں اگر محققینِ آثارِ قدیمہ اُن کے شائق اور خواہاں ہوں گے تو زر و جواہر کے ہموزن فروخت ہونا عجب نہیں ورنہ کوئی اُن کا پرسانِ حال بھی نہ ہوگا علیٰ ہذا پھل پھول ترکاری مچھلی اور برف سی عام استعمال کی چیزیں بھی جبکہ طلب کم ہو کوڑیوں کے مول فروخت ہونے لگتی ہیں کیونکہ فروخت نہ ہونے سے وہ جلد خراب ہو جاتی ہیں اور تھوڑی بہت جو کچھ قیمت ملتی ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ لیکن جب طلب بڑھتی ہے تو یہی چیزیں روپوں کے حساب سے فروخت ہو جاتی ہیں لیکن ایسی چیزیں کہ جن کی رسد بطور مذکورۂ بالا معین ہو کم ہیں۔ بیشمار چیزیں جن کا تعلق زراعت اور صنعت و حرفت سے ہے تھوڑے عرصہ میں گھٹ بڑھ سکتی ہیں اور بطور ذخیرہ بلا خوف و خرابی رکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی رسد کے اضافے و تخفیف میں جس قدر عرصہ لگے اُس وقت تک تو مذکورۂ بالا مقولہ اُن پر بھی صادق آئے گا لیکن اس کے بعد اُنکی قیمت قوانینِ تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہوگی اور طلب کی کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی محرک ہوگی، براہِ راست قیمت کی کمی بیشی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ مثلاً اگر شئے زیر بحث قانونِ تقلیل حاصل کی تابع ہے تو اضافۂ طلب و اضافۂ رسد سے اُس کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بحالتِ قانونِ تکثیر حاصل قیمت میں تخفیف یقینی ہوگی، اسی طرح جبکہ طلب کی

حصۂ چہارم
باب نوزدہم

کمی سے رسد بھی گھٹے تو قانون تقلیل حاصل سے قیمت میں تخفیف ہو جانا
عجب نہیں لیکن قانون تکثیر حاصل ضرور قیمت میں اضافہ کرے گا۔

اس بحث سے مجملاً یہ اصول دریافت ہو گیا کہ فروشندہ کی
جانب سے قیمت کیونکر قرار پاتی ہے یعنی کوئی چیز کس اصول کے
مطابق کم سے کم قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جن چیزوں کی
مقدار کم و بیش متعین ہو اور ان میں اضافہ نہ ہو سکے یا جو چیزیں
جلد خراب ہو جائیں اور بطور ذخیرہ نہ رکھی جا سکیں ان کی قیمت پر
تو طلب کی کمی بیشی کا اثر غالب ہوتا ہے یعنی ان کی قیمت بیشتر صرف
قیمت طلب ہوتی ہے لیکن دیگر بے شمار چیزیں جو کاشت اور
صنعت و حرفت سے تیار ہوتی ہیں جن کی مقدار بھی بہت زیادہ ہوتی ہے
بڑھائی جاتی ہے اور جو کچھ عرصے تک بطور ذخیرہ رکھی جا سکیں ان کی قیمت پر
مصارف پیدائش کا بھی قابل لحاظ اثر پڑتا ہے۔ اور مصارف پیدائش
قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہیں پس طلب کی کمی و بیشی کا
صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے
عمل کی محرک ہوتی ہے۔ ورنہ قیمت منجانب فروشندہ براہ راست
انھیں ہر دو قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ تقسیم دولت میں جا بجا واضح
ہو چکا ہے کہ قیمت منجانب فروشندہ براہ راست مصارف مختتم کے
مساوی ہوتی ہے اور اس کو اصطلاحاً قیمت رسد کہتے ہیں۔

در اصل زیر بحث یہ مقولہ تھا کہ طلب بڑھنے گھٹنے سے چیز کی
قیمت بھی بڑھتی گھٹتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مقولہ اسی حالت میں صحیح
ہوتا ہے جبکہ مقدار رسد معین فرض کر لی جائے یا چیز سریع الزوال ہو
اسی سلسلے میں ہم قیمت رسد کے اصول بھی مجملاً بیان کر گئے لیکن
باوجود خوف طوالت ہم ان اصول سے مسئلۂ قیمت کے تحت میں
پھر بحث کریں گے کیونکہ ان کا صاف طور پر ذہن نشین ہونا نہایت
ضروری ہے یہاں پر صرف ایک نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہیں

جس کے سلجھانے میں اس قدر بحث مباحثے کے بعد کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ:-

الف۔ کسی چیز کی قیمت گھٹتی ہے تو اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور کسی چیز کی طلب بڑھ جانے سے اُس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے:

یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے اُس کی طلب گھٹ جاتی ہے لیکن کسی چیز کی طلب گھٹنے سے اُس کی قیمت بھی گھٹ جاتی ہے:

ان دونوں مقولوں کا مفہوم وہی ایک ہے گو بظاہر ان میں سے ہر ایک میں تضاد معلوم ہوتا ہے تخفیف و اضافۂ قیمت ایک ہی وقت میں اضافۂ طلب کا باعث و نتیجہ علی الترتیب کیونکر ہو سکتے ہیں اسی طرح اضافہ و تخفیفِ قیمت کا بھی علی الترتیب تخفیفِ طلب کا باعث و نتیجہ ہو سکنا سمجھ میں نہیں آتا، اس معمے کا حل مذکور الصدر بحث میں بالتفصیل موجود ہے لیکن مزید سہولت کی نظر سے ہم یہاں اتنا اشارہ اور کئے دیتے ہیں کہ قیمت گھٹنے سے طلب بڑھنے یا قیمت بڑھنے سے طلب گھٹنے میں طلب کی حالت میں سکون فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ نتائج قیمت بڑھنے گھٹنے سے قانونِ تقلیلِ افادہ و قانون طلب کے تحت میں نمودار ہوتے ہیں لیکن طلب بڑھنے سے قیمت بڑھنے یا طلب گھٹنے سے قیمت گھٹنے میں رسد کو معین یا سریع الزوال خیال کرتے ہوئے حالتِ طلب میں ردّ و بدل تصور کرتے ہیں بالفاظِ دیگر اوّل دو حالتوں میں تغیرِ طلب کا باعث تغیرِ قیمت ہے اور آخر دو حالتوں میں خود تغیرِ قیمت تغیرِ طلب کا نتیجہ ہے:

حصّہ چہارم
باب نوزدہم

اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اضافۂ طلب کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، اوّل جبکہ دیگر حالات کے تغیّر سے اضافۂ طلب نمودار ہو کر اضافۂ قیمت کا باعث ہو، دوم جبکہ وہ حسب قانون تقلیل افادہ و قانون طلب تخفیف قیمت کا نتیجہ ہو۔ ان ہر دو جداگانہ قسم کے اضافۂ طلب کو علی الترتیب اصطلاحاً اضافۂ طلب و کشاد طلب کہیں گے تخفیف طلب کے بھی یہی دو مفہوم ہو سکتے ہیں یعنی یا تو وہ اضافۂ قیمت کا نتیجہ ہو یا دیگر حالات سے پیدا ہو کر تخفیف قیمت کا باعث ہو۔ ان ہر دو مفہوم کے لحاظ سے اس کو بھی علی الترتیب تخفیف طلب و بست طلب کہنا چاہئے۔ اسی اصول کے مطابق رسد میں بھی بعینہ چار قسم کی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اضافہ اور حقیقت رسد جو بطور خود پیدا ہو کر کمی و بیشی قیمت کا باعث ہو، کشائش و بست رسد جو طلب یا قیمت کی بیشی کمی سے نمودار ہو۔

غور کرنے سے واضح ہو گا کہ اضافۂ طلب و کشائش رسد اضافۂ رسد و کشائش طلب تخفیف طلب و بست رسد تخفیف رسد و بست طلب یہ دو دو تبدیلیاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور اوّل الذکر تبدیلی دوسری کا باعث ہوتی ہے۔

تغیر پذیری طلب

۴۔ قانون تقلیل افادہ سے ہم کو یہ قانون طلب دریافت ہوا کہ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اس کی طلب بڑھتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے۔

لیکن واضح ہو کہ قیمت و طلب کی ان معکوس تبدیلیوں میں کوئی نسبت مستقیم نہیں، کبھی قیمت کی ذرا سی تبدیلی طلب میں بہت بڑا فرق کر دیتی ہے اور کبھی معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے مثلاً ۲۰-۲۵ فیصدی قیمت گھٹنے سے طلب میں دوچند سہ چند اضافہ ہو سکتا ہے اور کبھی اس کے برعکس قیمت نصف بلکہ چہارم بھی ہو جائے تو بھی طلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا علیٰ ہذا کبھی قیمت کے صرف دس بیس فیصدی

چڑھنے سے طلب بجائے نصف بلکہ چہارم گھٹ جاتی ہے اور گاہے قیمت دگنی تگنی بھی ہو جائے لیکن طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ قانونِ تقلیل افادہ کے عمل کی رفتار کبھی سست ہوتی ہے اور کبھی تیز۔ اس سستی اور تیزی کے شرائط تو ہم ابھی بیان کریں گے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر رفتار سست ہے تو بہت زیادہ مقدار خریدی جانے پر بھی قیمت کم گھٹے گی۔ یا یوں کہو کہ قیمت تھوڑی سی بھی کم ہو جائے تو طلب بہت بڑھ جائیگی اور اگر رفتار تیز ہے تو تھوڑی سی مقدار بڑھنے پر قیمت بہت زیادہ گر جائے گی یا بالفاظِ دیگر باوجود قیمت بہت زیادہ تخفیف ہونے کے طلب میں نمایاں اضافہ نہ ہوگا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جب قیمت کی تھوڑی سی تخفیف سے طلب میں بہت سا اضافہ ہو تو اسکے برعکس قیمت کا تھوڑا سا اضافہ طلب کی بہت زیادہ تخفیف کا باعث ہوگا۔ مثلاً اگر چائے کے ڈبے عہ/ کی بجائے ۱۵/ کی شرح سے بہت زیادہ فروخت ہوں تو یقیناً ۱۵/ کی بجائے عہ/ کی شرح سے بہت کم فروخت ہوں گے۔ اب اگر قیمت کی قلیل تخفیف یا اضافے سے طلب میں کثیر اضافہ یا تخفیف نمودار ہو تو اس واقعے کو تغیر پذیری طلب اور طلب کو طلبِ تغیر پذیر کہیں گے علاوہ ازیں یہ بھی مثال سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر قیمت کی کثیر تخفیف سے طلب میں قلیل اضافہ نمودار ہو تو قیمت کے کثیر اضافے سے طلب میں قلیل تخفیف ہوگی مثلاً اگر للعہ/ کی بجائے عہ/ کے نرخ سے کوئی چیز صرف دس فی صدی زیادہ فروخت ہو تو عہ/ کی بجائے للعہ/ کے نرخ سے صرف تقریباً دس فی صدی کم فروخت ہوں گی۔ پس اگر قیمت کی کثیر تخفیف یا اضافے سے طلب میں قلیل اضافہ یا تخفیف نمودار ہو تو ایسی طلب کو طلبِ غیر تغیر پذیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

طلبِ تغیر پذیر و غیر تغیر پذیر کے کچھ معیار مقرر نہیں کہ

ان دونوں قسموں میں کوئی عام اور مستقل تفریق کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تغیر پذیری تو طلب کا ایک عام خاصہ ہے اور اس کے بیشمار مدارج ہیں جتنی تغیر پذیری بدرجۂ اعلیٰ پائی جائے گی یعنی قیمت کی تھوڑی تبدیلی سے طلب میں کوئی بڑا فرق پیدا ہوگا تو اسی قدر وہ طلب تغیر پذیر کہلانے کی زیادہ مستحق ہوگی اور اگر تغیر پذیری بدرجۂ ادنےٰ پائی جائے یعنی قیمت کی بڑی تبدیلی سے بھی طلب میں نہایت معمولی فرق پیدا ہو تو ایسی طلب غیر تغیر پذیر کہلائے گی۔ حالانکہ اس میں تغیر پذیری اس میں بھی ضرور موجود ہے گویا طلب غیر تغیر پذیر و تغیر پذیر میں صرف تغیر پذیری کی کمی بیشی کا فرق ہے ورنہ تھوڑی بہت تغیر پذیری دونوں طلبوں میں موجود ضرور ہے۔

پس تغیر پذیری طلب کی مختصر تعریف یہ ہوگی کہ اگر قیمت تھوڑی گھٹنے سے طلب بہت بڑھے یا قیمت تھوڑی بڑھنے سے طلب بہت گھٹے اور ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں حالتیں لازم و ملزوم ہیں تو طلب بہت تغیر پذیر کہلائے گی اس کے برعکس اگر قیمت بہت گھٹنے سے طلب کم بڑھے یا قیمت بڑھنے سے طلب کم گھٹے اور یہ حالتیں بھی لازم و ملزوم ہیں تو طلب کم تغیر پذیر یا غیر تغیر پذیر شمار ہوگی۔ اسی تعریف کو بدل کر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر قیمت میں کچھ تخفیف ہونے سے طلب زیادہ بڑھے تو تغیر پذیر کہلائے گی اور اگر کم تو غیر تغیر پذیر علیٰ ہذا اگر قیمت میں کچھ اضافہ ہونے پر طلب میں بہت تخفیف ہو تو طلب تغیر پذیر ہے ورنہ غیر تغیر پذیر۔ ہم نے قصداً تغیر پذیری طلب کو کئی طرح سے بیان کیا ہے۔ بظاہر تو اس سے دقت اور پیچیدگی بڑھتی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس طریق سے یہ قانون بہت عمدہ طور پر ذہن نشین ہوگا۔ البتہ ذرا غور و توجہ شرط ہے۔ تغیر پذیری طلب ایک عام مشاہدہ ہے اور اس کے واقع ہونے سے تو کسی کو انکار ہو نہیں سکتا۔ دیکھنا یہ ہے

کہ آیا یہ تغیر پذیری کن کن قوانین کی پابند ہے کیا ایسی چیزوں کے جن میں تغیر پذیری زیادہ یا کم ہو چند عام اور مستقل علامات قرار پا سکتے ہیں کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے تغیر پذیر طلب کا پہلے ہی سے تخمینہ اور اندازہ کیا جا سکے علمی تحقیقات اور عملی تجربے سے تغیر پذیریِ طلب کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں پیش کئے جاتے ہیں۔

یوں تو دولتمندی و افلاس کے مدارج کا کوئی شمار نہیں لیکن مالی حالت کے بہ حیثیت قلیل فرق نظر انداز کر کے چند طبقے ایسے قرار پا سکتے ہیں کہ اُن کی مالی حالت میں بمقابلہ یکے بادیگرے عام فرق نمایاں ہو مثلاً خوشحال متوسط الحال اور تنگدست۔ ان طبقوں میں کوئی مستقل حدِ فاصل قائم کرنی تو محال ہے۔ بہت سے لوگ طبقۂ اول کے ادنیٰ زمرے میں اور طبقۂ دوم کے اعلیٰ ممبروں میں یکساں شمار ہو سکیں گے۔ لیکن پھر بھی علاوہ اُن لوگوں کے جن کا کسی طبقے میں شامل ہونا محقق نہ ہو سکے۔ ہر طبقے کے گروہ کثیر کی مالی حیثیت میں مقابلۃً نہایت بیّن فرق نظر آئے گا، مالی حالت کی طرح قیمت کے مدارج بھی شمار سے باہر ہیں، ایک پائی سے لے کر کروڑہا روپے تک کے نرخ سے چیزیں فروخت ہوتی ہیں لیکن قلیل فرق نظر انداز کر کے مالی طبقوں کی طرح قیمت کے بھی ہم تین عام درجے مقرر کر سکتے ہیں اعلیٰ۔ متوسط۔ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ سے مراد ایسی قیمت ہے کہ جو خریدار کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو لوگ اس قیمت پر چیزیں نہ خرید سکتے ہوں۔ متوسط قیمت وہ ہے کہ لوگوں کو گراں نہ گزرے اور ادنیٰ قیمت سے چیزوں کی بحد ارزانی مراد ہے کہ ہر کوئی دل بھر کر خرید سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ قیمت کے یہ مدارج محض اضافی ہیں مستقل نہیں ہو سکتے۔ خوشحال طبقے کی نظر میں جو قیمت ادنیٰ ہے تنگدستوں کے نزدیک وہ ضرور اعلیٰ ہوگی، متوسط الحال طبقہ جس قیمت کو اعلیٰ قرار دے

خوشحال طبقہ اُسی قیمت کو متوسط سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح پر تنگدستوں کی متوسط قیمت۔ متوسط الحال کو ادنےٰ معلوم ہوگی۔ غرضکہ ایک ہی قیمت خریداروں کی مالی حیثیت کے مطابق اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ محسوس ہوتی ہے۔ مالی حالت اور قیمت کے مدارج اور اُن کے باہمی تعلق تو عام مشاہدے میں ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن احتیاطاً اوّل اُن کو ذہن نشین کرکے اب ہم تغیر پذیری طلب پر ان کا اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ واضح ہو کہ اعلیٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزوں کی طلب عموماً غیر تغیر پذیر ہوتی ہے اور متوسط قیمت والوں کی تغیر پذیری وجہ غور کرنے سے خود سمجھ میں آسکتی ہے۔ اعلیٰ قیمت چونکہ خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے اضافے یا تخفیف کا اُن کی خریداری پر قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ چونکہ ایسی چیزیں شاذ و نادر ہی خریدتے ہیں اضافۂ قیمت سے اُن کی قلیل طلب میں اور کیا تخفیف ہوسکتی ہے۔ اور چونکہ قیمت اُن کے نزدیک نہایت گراں ہوتی ہے اُس کی تخفیف سے بھی طلب میں کوئی نمایاں اضافہ ہونا دشوار ہے۔ اس کے برعکس ادنیٰ قیمت والی چیزیں اس قدر ارزاں ہوتی ہیں کہ اگر اُن کی قیمت میں اضافہ بھی ہوجائے تو لوگوں کو یہ اضافہ بار محسوس نہ ہوگا اور حسبِ سابق خریداری جاری رکھیں گے اور چونکہ بوجہ ارزانی ہر کوئی جی بھر کے خرید سکتا ہے۔ مزید ارزانی سے اُن کی طلب میں اضافہ ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قیمت کی افراط و تفریط کی دونوں حالتوں میں اشیائے متعلقہ کی طلب غیر تغیر پذیر کہلا سکے پس تحقیق ہوا کہ علی العموم اعلےٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے لیکن متوسط قیمت والی چیزوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے ایسی چیزیں نہ تو اس قدر گراں ہوتی ہیں کہ لوگ اُن سے دست کش رہیں اور

قیمت بڑھنے پر ان کی قلیل طلب میں کوئی تخفیف نہ ہو اور قیمت گھٹنے پر بھی لوگ اُس کی مزید خریداری کی ہمت نہ کرسکیں اور نہ اس قدر ارزاں ہوتی ہیں کہ قیمت بڑھنے پر بھی لوگ ان کو گراں محسوس نہ کریں اور بقدرِ سابق خریدتے جائیں اور اگر قیمت اور بھی گھٹ جاوے تو زیادہ اس وجہ سے نہ خرید سکیں کہ سابق قیمت ہی پر وہ خوب جی بھر کے خریدتے رہے تھے اور طلب میں اضافے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی بلکہ متوسط قیمت اس قدر معتدل ہوتی ہے کہ تھوڑے سے اضافے سے وہ گراں اور تھوڑی سی تخفیف سے ارزاں محسوس ہونے لگتی ہے اور قیمت کی تھوڑی سی تبدیلی کا طلب پر نمایاں اثر پڑتا ہے گویا متوسط قیمت والی چیزوں کی طلب تغیر پذیر ہوتی ہے۔ ہر ملک میں کسی چیز کی طلب اس کے باشندوں کی طلب کا مجموعہ ہوتی ہے اور بلحاظ مالی حالت باشندوں کے مختلف طبقے ہوتے ہیں اور ہر طبقے کا معیارِ قیمت اعلیٰ و متوسط و ادنیٰ جدا جدا ہے پس جس قدر زیادہ باشندوں کی نظر میں کسی چیز کی قیمت متوسط ہوگی اتنی اُس کی طلب بھی تغیر پذیر ہوگی۔

اب تک ہم نے صرف قیمت کی بیشی اور کمی کا تغیر پذیری طلب پر اثر دریافت کیا۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ چیزوں کی اہمیت کو تغیر پذیری طلب سے قریبی تعلق ہے۔ واضح ہو کہ ضروریات کے بھی بلحاظ اہمیت و شدت بے شمار مدارج ہیں۔ ان میں سے بعض از حد لابدی اور ناگزیر ہیں مثلاً کھانا۔ پانی۔ لباس۔ مکان کہ گویا زندگی کا ان پر سراسر دار و مدار ہے اور بہت سی ایسی ہیں کہ اگر ہم ان کی عادت نہ ڈالیں تو ہم کو ان کے نہ ملنے سے کوئی قابلِ لحاظ تکلیف نہ ہو بلکہ اکثر کا وہم و گمان بھی ہمارے دل میں نہ گزرے۔

مصرع آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست۔ اوّل الذکر قسم کی چیز ضروریاتِ لابدی اور آخر الذکر کو تنعمات سے تعبیر کرتے

ضروریات لابدی اور تنعمات میں ایک اور صریحی سا فرق ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ خود قدرت نے مقصود قرار دیا ہے۔ احتیاجات ضروریات لابدی سے متعلق اُن کو رفع کئے بغیر چارہ نہیں اور وہ ایک مقدار سے تمام و کمال رفع بھی ہو جاتی ہیں اس کے برعکس تنعمات والی احتیاجات پوری نہ بھی ہو سکیں تو کچھ زیادہ مضائقہ نہیں لیکن پوری کرنے کا جس قدر اہتمام کیا جاتا ہے وہ ھل من مزید پکارتی ہیں احتیاجات اوّل الذکر اصطلاحاً سیری پذیر اور دوم غیر سیری پذیر کہلائیں گی۔ مثلاً بھوک پیاس اور قحط سالی اور خشک سالی میں جان بچانے کی خاطر جہاں تک استطاعت ہوتی ہے لوگ کھانا پانی خریدتے ہیں نیز غلہ خواہ کتنا ہی ارزاں ہو جائے اور پانی خواہ کتنا ہی وافر کیوں نہ ہو ایک مقدار معین سے زیادہ آدمی ایک وقت میں کھا پی نہیں سکتا۔ کچھ کھانا اور ایک آدھ گلاس پانی کے بعد آدمی اُس وقت اس قدر سیری محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر اسکو مجبور بھی کیجئے تو زیادہ کھا پی نہ سکے غلے اور پانی کا اگر کچھ ذخیرہ رکھا جاتا ہے تو آئندہ محض احتیاجات کے خیال سے بوقت سیری اُس کی موجودگی و عدم موجودگی یکساں ہے۔ لیکن احتیاجات تنعمات کی حالت بالکل برعکس ہے۔ اگر تنعمات گراں ہوں تو لوگ اُن کی پروا بھی نہیں کرتے لیکن اگر وہ ارزاں ہو جائیں تو خریدتے خریدتے نہیں تھکتے فیشن ایبل جنٹلمین کے پاس حسب استطاعت درجنوں بوٹ سوٹ ٹائی کالر جراب۔ تصاویر چھڑیاں میز کرسیاں فرش فروش اور ہر قسم کا فرنیچر ہو تب بھی اُن کا دل نہیں بھرتا ہر وقت ان چیزوں کے اضافے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کوئی چیز پسند آئی خرید لی۔ یہ سب چیزیں مثل ذخیرہ غلہ و پانی آئندہ احتیاجات کی غرض سے نہیں فراہم کیجاتیں بلکہ ایک ہی وقت میں ان سب کی موجودگی سے لطف آتا ہے لیکن تنعمات کی مقدار

کتنی ہی بڑھ جائے احتیاجات متعلقہ کو مثل بھوک و پیاس پوری سیری کبھی نصیب نہیں ہوتی بلکہ بمصداق "آتش شوق تیز تر گردد" احتیاجات کی شدت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ امیر خواہ بقول گنوار ہزار گھی ہی گھی ہیں اور گڑ ہی گڑ کھائیں لیکن اُن کی احتیاج بھوک و پیاس کی اتنی ہی مقدار بلکہ کم سے رفع ہو جاتی ہے جتنی کہ غریب کی۔ اس کے برعکس انکی احتیاجات تنعمات غریب کے مقابلے میں لاکھوں گنا زیادہ مقدار سے بھی پوری نہیں ہوتیں۔ اسی سلسلے میں اس نکتے کا بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سیری پذیر احتیاجات کی ضروریات تو عموماً تنعمات ہیں لیکن سیری پذیر احتیاجات کی ضروریات میں سے بھی بعض داخل تنعمات ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ناگزیر نہیں مثلاً شکر دودھ اور میوے۔ تنعمات کی اس تفریق کی اہمیت آگے چل کر اضافۂ طلب کے مختلف مفہوم کے سلسلے میں واضح ہوگی۔

ضروریات لابُد اور تنعمات کی کوئی قطعی طور پر جدا جدا فہرست نہیں بنائی جا سکتی کھانا پینا یہ دو ضروریات تو بیشک دنیا بھر میں یکساں اور شدید ناگزیر ہیں لیکن ان کے علاوہ باقی بیشمار ضروریات شدت و نوعیت کے لحاظ سے مثلاً آب و ہوا۔ رسم و رواج اور مالی حالت سے متعلق ہیں وہی ایک چیز کسی کے نزدیک از حد ناگزیر ضروریات میں شامل ہے اور کوئی اس کو نہایت فضول خرچ تنعمات میں شمار کرتا ہے۔ سرد ممالک میں غریب سے غریب کو بھی چائے پینی پڑتی ہے گرم ممالک میں اختیاری ہے۔ یہی حال جوتے اور بیش خرچ اعلیٰ لباس کا ہے اول اول تنباکو یا شراب محض شوقیہ استعمال کی جاتی ہے لیکن چند روز بعد مثل غذا لوازم زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ لباس اور مکان غریب لوگوں کو اگر میسر بھی آتا ہے تو صرف بقدر ضرورت۔ لیکن امرا اُن کو تنعمات کی حد تک استعمال کرتے ہیں عیش پسند امرا کو آنے جانے میں سواری بغیر چارہ نہیں لیکن محنت پسند عوام

اور ہر ایک کو پیدل چلنے پھرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

بحثِ بالا سے بظاہر پڑھنے والے کے دل میں ایک قسم کی بے اعتقادگی پیدا ہو جائے تو عجب نہیں۔ اس کو ہر بات غیر معین سی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت کل پہلو دیکھ لینے سے وسعتِ نظر پیدا ہو کر واقعات کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور بالخصوص علمِ معیشت میں یہ مغالطہ ہرگز پیدا نہ ہونے دینا چاہئیے کہ علمِ ہندسہ و طبیعیات کی طرح اس کے اصطلاحات اصول و قوانین بالکل قطعی اور معین ہیں ورنہ ایسی خوش عقیدگی کا نتیجہ علم اور واقعات میں کامل مطابقت نہ ہونے سے بالآخر سخت مایوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد کی بے بنیاد بدعقیدگی آیا ہوا سب برباد کر دیتی ہے۔ اسی احتیاط سے ہم اکثر بار بار یہ بیان کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ معاشیات کے مسائل و اصطلاحات میں کامل تعین اور تیقن محال ہے اس کے قوانین تخمینی ہونے سے زیادہ کا دعویٰ نہیں کر سکتے اور اُن کا عمل گوناگوں شرائط کا ماتحت ہوتا ہے۔

مقدارِ قیمت اور تغیر پذیریٔ طلب کے باہمی تعلق کی بابت جو جو عام اصول ہم نے اوپر دریافت کئے ہیں ان میں ضروریات لابدّ اور تنعمات کے مذکورۂ بالا فرق و خواص سے حسبِ ذیل ترمیم ہوتی ہے۔

۱۔ جبکہ قیمت اعلیٰ ہو ضروریاتِ لابدّ کی طلب میں بہت کچھ تغیر پذیری ہو سکتی ہے لیکن تنعمات میں بہت کم۔ باعثِ فرق یہ ہے کہ ضرورتِ زیرِ بحث بوجہ لابدّ ہونے کے بحالتِ قیمتِ اعلیٰ بھی تنعمات کے مقابل میں بہت زیادہ خریدی جاتی ہیں اور لوگوں کو خرید سے بغیر کوئی چارہ نہیں، جہاں تک بھی استطاعت ساتھ دے گی قیمت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ شئے مذکور ضرور خریدیں گے پس اگر

قیمت ایسی انتہائی حد سے آگے بڑھے گی تو طلب میں
جبریہ تخفیف نمودار ہوگی اور اگر قیمت میں تخفیف ہوگی تو
طلب میں معقول اضافہ ہوگا کیونکہ جو لوگ خریدنے کے
بخوشی متمنی تھے لیکن بوجہ عدم استطاعت خرید سے
معذور تھے وہ بھی شئے مذکور کو تخفیفِ قیمت پر فوراً
خریدنے لگیں گے۔ چونکہ ضروریاتِ لابدی کی طلب
کم و بیش غیر اختیاری اور جبریہ سی ہوتی ہے اور
اس کے برعکس تنعمات کی طلب خود اختیاری اور
خوشی خواہ ہے۔ بمقابلہ تنعمات کے لوگ
ضروریاتِ لابدی کی گرانی کے بہت زیادہ حد تک
متحمل ہو سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مقابلۃً ضروریاتِ لابدی کی
طلب تنعمات کی طلب سے بحالتِ قیمت اعلیٰ
زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے؛

ب۔ قیمتِ متوسط کی حالت میں تنعمات کی
طلب مقابلتاً اس وجہ سے زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے کہ
اوّل تو اُن کی احتیاج غیر سیری پذیر ہے گویا تخفیفِ قیمت سے
بہت زیادہ اضافۂ طلب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوم
وہ ناگزیر نہیں یعنی اُن کی طلب اختیاری ہے لہٰذا
اضافۂ قیمت سے اُن کی طلب میں بہت کچھ تخفیف
ممکن ہے۔ اس کے برعکس ضروریاتِ لابدی کی طلب
اس قدر تغیر پذیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اوّل تو وہ ناگزیر ہیں
دوم احتیاجاتِ متعلقہ سیری پذیر ہیں سیری پذیر احتیاجات کی
تنعمات میں بھی (مثلاً دودھ۔ گھی۔ شکر) کم و بیش
تغیر پذیری سے پائی جاتی ہے کہ وہ ناگزیر نہیں۔
کچھ ارزاں ہو جائیں تو لوگ زیادہ خریدیں اور

گراں ہو گئیں تو خرید نا چھوڑ دیں ؛

ج۔ قیمت ادنیٰ میں ہر قسم کی چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی مقابلۃً تنعمات کی طلب ضروریاتِ لابدی کی طلب سے کم تر غیر تغیر پذیر ہوگی۔ یا یوں کہو کہ ضروریاتِ لابدی کی طلب مقابلۃً بیشتر غیر تغیر پذیر ہوگی۔ اس فرق کا باعث بھی وہی احتیاج کی سیری پذیری و عدم سیری پذیری کا خاصہ ہے جو علی الترتیب ضروریاتِ لابدی اور تنعمات سے متعلق ہے ؛

تغیر پذیری طلب کے متعلق اب دو نکتوں کا اظہار اور ضروری معلوم ہوتا ہے اوّل یہ کہ طریق بدل کا تغیر پذیری طلب پر اثر قابلِ توجہ ہے۔ بدل سے مراد ہے کسی ایک چیز کے بجائے وہی احتیاج رفع کرنے کی غرض سے دوسری چیز استعمال کرنا۔ مثلاً جوتوں میں بجائے چمڑے کے کپڑا استعمال کرنا تعمیر میں بجائے کنکر کے چونے کے ریل کے کوئلے کی راکھ لگانا کھانے میں بجائے غلے کے بھوسے کے جانوروں کا گوشت کھانا۔ درختوں کی چھال۔ پتوں اور گھاس کے ریشے سے روئی اور ریشم کے مانند کپڑا بننا ہے۔ سائنس اور ایجادات کی بدولت شاید کوئی چیز ایسی ہو کہ جس کا بدل دریافت نہ کر لیا گیا ہو ورنہ اکثر چیزوں کے متعدد بدل استعمال ہیں موجودہ جنگِ یورپ میں جرمنی کی لامحدود طاقت کا ایک سب سے بڑا راز اُس کا بدل میں کمال فرا پایا ہے۔ صرف آلو سے جو جرمنی میں بافراط پیدا ہوتا ہے کھانے پینے کی ہر قسم کی چیزیں ساٹھ سے اوپر تیار کی جاتی ہیں جو گوشت اور گھی جیسی مختلف چیزوں تک کا بدرجہ اعلیٰ کام دیتی ہیں۔ طریق بدل کی کثرت بھی معاشی ترقیات کے علامات و لوازم میں سے ہے۔ اس کا طلب کی تغیر پذیری پر اثر پڑتا ہے کہ اگر کسی چیز کی قیمت میں اضافہ ہو تو طریق بدل دوسری

مقابلۃً ارزاں چیزیں استعمال ہونے لگتی ہیں اور شئے زیر بحث کی طلب میں بے حد تخفیف ہو جاتی ہے اسی طرح اگر کسی چیز کی قیمت گھٹے تو وہ خود بطور بدل دوسری مقابلۃً گراں چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے گی۔ تخفیف قیمت سے بھی اس کی طلب میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا گویا طریق بدل ہر دو صورت میں کسی چیز کی طلب میں تغیر پذیری بڑھا دیتا ہے؛

واضح ہو کہ طلب میں اضافہ تین طرح پر ہو سکتا ہے جو لوگ پہلے سے شئے زیر بحث کو استعمال کر رہے ہیں اب وہ اس کو زیادہ زیادہ مقدار میں استعمال کریں۔ تنعمات کے واسطے جن کی احتیاج غیر سیری پذیر ہوتی ہے۔ اضافۂ طلب کا یہ طریق نہایت کارگر ہے ضروریات لابدی میں بوجہ احتیاج سیری پذیر ہونے کے ایسے اضافے کی گنجائش بہت کم ہے نیز جو تنعمات احتیاجات سیری پذیری سے متعلق ہیں مثلاً دودھ۔ شکر تمباکو وہ بھی اس اضافے سے زیادہ مستفید نہیں ہو سکتیں۔ دوم جو لوگ پہلے سے شئے زیر بحث کو استعمال نہیں کرتے تھے وہ بھی اس کو استعمال کرنے لگیں ضروریات لابدی تو صحت و زندگی کے لئے جہاں تک استطاعت ساتھ دے ہر کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ تنعمات سے بوجہ گرانی دست کش رہتے ہیں پس اضافۂ طلب کی یہ صورت بھی مقابلۃً تنعمات کے واسطے زیادہ موافق ہے تیسری صورت اضافۂ طلب کی طریق بدل ہے کہ شئے زیر بحث دوسری چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے یہ صورت ضروریات لابدی اور تنعمات کے واسطے یکساں ہے۔ بحالت ارزانی جو مزدوری پیشہ لوگ گیہوں گھی اور شکر استعمال کرتے ہیں ان میں سے اکثر گرانی میں جو چنا۔ تیل اور گڑ استعمال کرنے لگتے ہیں قحط میں لوگ کثرت سے بھوسے جانوروں کا

گوشت ہی گوشت کھاتے ہیں ؛

تخفیفِ طلب کی بھی تین صورتیں ہیں جو اضافۂ طلب کی مذکورۂ بالا صورتوں کے بالکل برعکس ہیں یعنی سابق والے لوگ کمتر مقدار میں استعمال کریں یا لوگوں کی کمتر تعداد استعمال کرے یا دوسری چیزیں شئے زیرِ بحث کے بجائے استعمال ہونے لگیں اوّل دو صورتیں مقابلۃً تنعمات کے واسطے زیادہ موزوں ہیں اور تیسری ضروریاتِ لابدی کے واسطے بھی یکساں عام ہے واقعہ یہ ہے کہ اضافے یا تخفیفِ طلب کی یہ تینوں شکلیں علی العموم ملی جلی رہتی ہیں لیکن جو شکل سب سے عام ہوگی اُس کا اثر بھی غالب رہیگا ؛

تغیر پذیری طلب کے متعلق دوسرا نکتہ قابلِ توجہ یہ ہے کہ اکثر چیزوں سے متعدد احتیاجات پوری ہوتی ہیں مثلاً پانی کہ وہ پینے۔ کھانے۔ نہانے۔ دھونے اور چھڑکاؤ میں استعمال ہوتا ہے مشین چلانے میں بھی اس کی بھاپ سے بہت کام لیا جارہا ہے۔ ان چند در چند احتیاجات میں سے بلحاظِ خور و نوش تو پانی قطعاً ضروریاتِ لابدیہ میں داخل ہے لیکن نہانے دھونے اور چھڑکاؤ جیسی احتیاجات کے ہمراہ وہ بتدریج تنعمات میں داخل ہوجاتا ہے، نہانا اگر زندگی کیواسطے ہفتے میں ایک مرتبہ ناگزیر ہو تو ہر روز نہانا تنعمات میں شمار ہوگا۔ پھر کپڑے اور مکان دھونے کا نمبر آتا ہے اور چھڑکاؤ و مشین میں پانی کا استعمال تو صرف اوّل الذکر چاروں احتیاجوں کے پورے ہونے کے بعد ممکن ہے۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اگر ایک ہی چیز سے بہت سی ضروریات حاصل ہوں جن میں سے بعض لابدی ہوں اور بعض تنعمات تو ایسی چیز کی مجموعی طلب میں ضرور تغیر پذیری ہوگی قیمت بڑھنے سے اس کا استعمال

بطور ضروریات لائبدی تو بحال رہیگا لیکن بطور تنعمات گھٹ جائیگا اور مجموعی نتیجہ تخفیف طلب ہوگا۔ اسی طرح پر قیمت گھٹنے سے اگرچہ بحدِ ضروریات لائبدی اُس کی طلب وہی رہیگی لیکن بحیثیت تنعمات اس کا استعمال بہت بڑھ جائے گا اور مجموعی نتیجہ اضافۂ طلب ہوگا لیکن جو چیزیں صرف ایک ہی احتیاج پوری کریں مثلاً گیہوں۔ گھی اور شکر، دودھ تمباکو کہ صرف کھانے پینے کے کام آئیں وہ ضروریات لائبدی یا تنعمات میں سے جن میں شمار ہوں اُن ہی کے مذکورۂ بالا قوانین کی پابند ہوں گی۔ اول الذکر قسم کی چیزوں کے مقابلے میں بہرحال اُن کی طلب کمتر تغیر پذیر ہوگی:

تغیر پذیری طلب کی بحث نہ صرف ضروری بلکہ دلچسپ بھی ہے اور بلالحاظ طوالت ہم نے کُل ضروری پہلو پیشِ نظر کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعات پر غور کرنے سے اگر سراسر نہیں تو ایک بڑی حد تک تغیر پذیر طلب مذکورۂ بالا اصول کی پابند نظر آئے گی:

موتی جواہر کی طلب تغیر پذیر اس وجہ سے بہت کم ہے کہ جماعت کثیر کے نزدیک وہ انتہا درجے کے تنعمات میں داخل ہیں اور اُن کی قیمت بھی اعلیٰ ہے:

شکر کی طلب تغیر پذیر اور نمک کی غیر تغیر پذیر اس وجہ سے ہے کہ شکر کی قیمت متوسط ہے اور وہ داخل تنعمات ہے اور نمک کی قیمت ادنیٰ ہے اور نیز وہ ضروریات لائبدی میں سے ہے یہی حال دودھ اور پانی کی طلب کا ہے جن ملکوں میں پانی بہت وافر نہ ہو وہاں اس کی طلب ضرور تغیر پذیر ہوگی:

تمباکو کی طلب بھی تغیر پذیر ہے کیونکہ اس کی قیمت متوسط ہے۔ اور وہ داخل تنعمات ہے۔ چنانچہ اکثر محض اخلاقی خیال سے نہ کہ آمدنی کی غرض سے ٹیکس قائم کر کے اسکی

قیمت بڑھائی جاتی ہے تاکہ اس کا صرف استعمال کم ہو۔

معاشیات کے مسائل سلجھانے میں وسعت نظر نہایت ضروری ہے۔ اگر کل ضروری پہلو پیش نظر نہ رکھے جائیں تو تحقیقات کا نتیجہ لاتقربوا الصلوٰۃ کا مصداق ہونا تعجب خیز نہ ہوگا۔ اگر صرف چند پہلو سب مطلب یکجا کرکے کوئی بظاہر قطعی مسئلہ مرتب کر لیا جائے تو تجربے اور مشاہدے کی ہوا سے مثل حباب ٹوٹ جائے گا۔ مسئلہ بلا سے ادھورا ہو لیکن قسمرین حقیقت ضرور ہونا چاہیئے ناکمل صحیح مسئلہ مکمل نما غلط مسئلے سے ہزار درجے بہتر ہے۔ ہم نے اسی غرض سے بلا لحاظ طوالت ہر مسئلے کے کل ضروری پہلو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اول اول اگر پڑھنے والے کو اُن کے سمجھنے میں کچھ محنت بھی کرنی پڑیگی تو اس کے معاوضے میں اس کو صحیح معلومات حاصل ہوں گے۔ لیکن سہل و مکمل نما مسائل سے تو خطرناک مغالطے کا اندیشہ وابستہ ہے۔

۵ مسئلۂ قیمت کے کل اساسی اصول بیان ہو چکے اب صرف بازار کا مفہوم اور اُس کے متعلق چند ضروری باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ہم مبادلے کے مرکزی مبحث قیمت پر توجہ کریں گے۔

بازار سے عرف عام میں تو مراد ایسی جگہ ہے جہاں قیمت سے لوگ جمع ہو کر خرید و فروخت کریں۔ شہروں میں تو کئی قسم کے مستقل بازار ہیں ہر قسم کے سامان کی دکانیں ہر روز کھلی رہتی اور دکاندار صبح سے شام تک خریداروں کے ہاتھ سودا سلف بیچتے رہتے ہیں۔ دیہات میں ہفتہ وار بازار لگتا ہے۔ نیز شہروں میں سالانہ نمائشیں ہوتی ہیں یہ سب عرفی بازار کی مختلف شکلیں ہیں لیکن معاشیات میں بازار کا مفہوم کچھ اور زیادہ ہے

حصہ چہارم
باب نوزدہم

اصطلاحاً بازار سے مراد وہ کُل خطہ ہے جس کے اندر اندر ایک
وقت میں ایک چیز کی قیمت ہر جگہ برابر ہو اگر کچھ فرق ہو تو
وہ بقدارِ مصارف آمد ورفت ہو اور نہیں۔ ایسا خطہ خواہ تمام
روئے زمین پر محیط ہو یا چند ملکوں تک وسیع ہو یا کسی ملک
یا اُس کے حصے یا صرف کسی شہر یا گاؤں تک محدود ہو جن جن
مقامات میں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی فاصلے پر
کیوں نہ ہوں کسی چیز کی ایک ہی وقت میں قیمت مساوی
پائی جائے۔ اور اگر فرق ہو تو بمقدارِ مصارف آمدورفت کے
برابر ہو تو وہ کُل اُس چیز کے ایک ہی بازار میں شامل شمار کئے جائیں گے
گویا اُن کُل مقامات تک وہ بازار وسیع مانا جائے گا مثلاً گیہوں
ہندوستان میں ۳ روپے من فروخت ہو امریکہ میں ۴ روپے من
انگلستان میں ۵ روپے من اور ہندوستان سے امریکہ اور
امریکا سے ولایت گیہوں لے جانے کا صرفہ ایک ایک روپے من
ہو اور ہندوستان سے براہِ راست ولایت بھیجنے کا صرفہ ۲ روپے من
ہو تو یہ تینوں مُلک گیہوں کا ایک بازار شمار ہوں گے۔ اگر روئی
ہندوستان مصر اور امریکہ میں ایک ہی نرخ سے فروخت ہو
یا اگر کہیں کم وبیش ہو تو بس اس قدر کہ باہر بھیجنے یا باہر سے منگانے
کے صرفے کے برابر ہو تو یہ تینوں مُلک روئی کا ایک بازار
مانے جائیں گے۔ لیکن اگر آم خربوزے دودھ دہی گاؤں میں
ارزاں فروخت ہوں اور شہروں میں گراں اور قیمت کا فرق
مصارفِ آمدورفت سے کم ہو یا زیادہ تو ہر ایک ایسا گاؤں اور
شہر باوجود بہت قریب قریب ہونے کے ان چیزوں کا جدا جدا
بازار شمار ہوگا۔ اس کُل بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ معاشی بازار کی
خصوصیت لابدی مساواتِ قیمت ہے نہ کہ قیامِ دکانات
یا اجتماعِ خریداران وفروشندگان۔ بازار کا علمی مفہوم بیان کرنے کے بعد

اب ہم اُس کی وسعت و تنگی کے اُصول دریافت کرنا چاہتے ہیں؛
وسعتِ بازار کی پہلی شرط آزادیِ مقابلہ ہے یعنی فروشندگان اور خریداران اپنے کاروبار کی حالت سے پورے طور پر واقف ہوں۔ اُن کو رسد اور طلب کی مقدار کا اندازہ ہو، نہ صرف قرب و جوار بلکہ دور دراز مقامات میں بھی اُن کے کاروبار کی جو حالت ہو اس سے ہر وقت باخبر رہیں سودا خواہ کہیں سے بکے خریداران کم سے کم اور فروشندگان زیادہ سے زیادہ نرخ پر معاملہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں، اس کوشش اور کشمکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقابلے کے دباؤ سے ہر جگہ نرخ ہموار ہو جائے گا اور قیمت کی حالت سطح آب کی سی ہوگی۔ عالمگیر امن وامان معاشی ترقیات اور سہولت آمد و رفت و خط وکتابت کی بدولت مقابلے کا اثر وسیع اور قوی ہو جانے سے بازاروں میں بھی بلا کی وسعت پیدا ہو گئی ہے اور بعض تو تمام دُنیا پر مسلط ہیں۔ مساواتِ قیمت اور توسیع بازار کے واسطے مقابلہ شرطِ اوّلین تو ضرور ہے۔ اگر مقابلہ نہ ہو تو دو پاس پاس مقامات میں وہی ایک چیز مختلف نرخ سے فروخت ہوتی رہے اور اگر فرقِ قیمت مصارفِ آمد و رفت سے زیادہ بھی ہو تو نہ خریدار اپنے سے دوسرے مقام کی ارزانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ فروشندے اپنے سے دوسرے مقام کی گرانی سے۔ جہاں قیمت کم ہے وہاں کے خریدار نفع میں ہیں اور جہاں قیمت زیادہ ہے وہاں کے فروشندے بحالتِ مقابلہ یہ فرق قائم نہ رہ سکتا۔ دونوں جگہ کا نرخ مل کر یوں ہموار ہو جاتا جیسا کہ قلابے سے ملے ہوئے دو حوضوں کا پانی؛
لیکن واضح ہو کہ ہر چیز کی خرید و فروخت میں مقابلے کی یکساں گنجائش نہیں۔ بعض چیزیں تو مقابلے کے واسطے اس قدر موزوں ہیں کہ اُن کے کاروبار میں ہم دُنیا کے ہر خطے سے

حصۂ چہارم
باب نوزدہم

مقابلہ کر سکتے ہیں اور بعض اس قدر ناموزوں کہ باوجود ہزار کوشش ہم مقابلے سے معذور ہیں جس کے معنی یہ ہوے کہ بازار کی وسعت و تنگی نہ صرف مقابلہ ہونے نہ ہونے پر منحصر ہے بلکہ اسکا چیزوں کی نوعیت سے بھی اس قدر قریبی تعلق ہے کہ مقابلے کو بھی اس کا پابند ہونا پڑتا ہے۔

جن چیزوں کی خرید و فروخت میں بجد مقابلے کی گنجائش ہے اور اس لئے جن کے بازار نہایت وسیع ہو سکتے ہیں اور ہیں ان میں خواص ذیل ہونا لازمی ہے۔ قوتِ مقابلہ اور وسعت بازار ان ہی خواص کی نسبت سے ہوگی۔

ا۔ عمومیتِ طلب۔ اس چیز کی تقریباً ہر ملک میں مانگ ہونی چاہیئے اور یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ ہر جگہ اس کا استعمال ہوتا ہو۔ مثلاً سونا چاندی گیہوں شکر اون۔ روئی۔

ب۔ شناخت پذیری۔ اس چیز کی خوبی میں ایسا تعین اور یکسانی ہونی چاہیئے کہ اس کے مدارج قرار پا سکیں اور تھوڑے سے نمونے سے چیز کی خوبی کا پتہ چل جائے۔ مثلاً سونا چاندی ایک ماشے سے منوں کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور اگر کوئی فرق ہو تو بلا دقت پتہ چل جاتا ہے۔ سونے اور چاندی کے مانند گیہوں اور روئی کے نمونے پورے طور پر قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتے تھے لیکن چونکہ ان دونوں کی مانگ عالمگیر ہے ان کے نمونے بھی ایک عجیب طریق سے بہت کافی حد تک قابلِ اطمینان بنائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سالہا سال کے تجربے اور کوشش سے اپنے آپ کو گیہوں روئی بھی

تمام طلب والی چیزوں کا ماہر اور معتبر نام لیتے ہیں۔ یہ لوگ ان چیزوں کی خوبی کا درجہ قرار دیتے ہیں مثلاً قسم اوّل، دوم و سوم ان کی رائے دو، یا سہ نہایت مستند اور قابلِ اعتماد پائی جاتی ہے۔ لوگ اپنا اپنا مال اُن کے پاس لاتے ہیں اور بلحاظِ خوبی یہ مال کا درجہ قرار دے کر مال والوں کو ایک پروانہ دے دیتے ہیں کہ فلاں درجے کا اس قدر مال معلوم فلاں ہماری تحویل میں موجود ہے۔ اور مال اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اس طرح یہ بہت سے لوگوں کا مال لے کر درجہ وار بڑے بڑے ذخیرے فراہم کر لیتے ہیں یکساں درجے والے مال کی سب مقداریں ملا دی جاتی ہیں اور ذخیرے میں مال کی کوئی تفریق نہیں رہتی۔ مثلاً بیس آدمی اگر درجۂ اوّل کے گیہوں کی مختلف مقداریں لائیں تو وہ سب مل کر درجۂ اوّل کا ایک انبار بن جائیں گی مال والے محض ماہرین و معتبرین کے دیئے ہوئے پروانے بازار میں پیش کرتے ہیں اور خریدار پروانوں کے بھروسے پر مال خرید لیتے ہیں اور مال ماہرین کے ہاں سے بھجوا دیا جاتا ہے۔ اس خدمت کے صلے میں ماہرین کو دستوری ملتی ہے، مال ہمیشہ پروانے کے مطابق نکلتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو معتبرین کا اعتبار اُٹھ جائے اور اُن کا کاروبار تباہ ہو جائے خود اپنے کاروبار کی ترقی کے لحاظ سے نہایت احتیاط اور توجہ سے مال کی خوبی تشخیص کر کے پروانہ دیتے ہیں تاکہ اُن کا اعتبار بڑھے بازار میں وقعت و اعتماد بڑھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ

لوگ بطورِ خود مال خریدنے کی بجائے اُن کی معرفت خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

نمونے کے قابلِ اطمینان ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ محض نمونہ دیکھ کر دور دراز مقامات سے بلا خدشہ فرمائش بھیج سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یا خریدار چیز دیکھنے آئے یا کل چیز برائے ملاحظہ اس کے پاس جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس طریق سے کاروبار چلنا محال ہے۔

ج۔ انتقال پذیری۔ یعنی چیز اس قابل ہو کہ دور دراز مقامات تک بھیجی جا سکے۔ اس کی دو شرطیں ہیں اوّل یہ کہ وہ دیرپا ہو اور گل سڑ کر جلد ناکارہ نہ ہو جائے تاکہ دیگر مقامات تک پہنچنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اُس میں وہ صحیح سالم رہے اور خریدار کے پاس عمدہ حالت میں پہنچے۔ دوم یہ کہ اُس کے وزن اور جسامت کے مقابلے میں اس کی قیمت عمدہ ہو تاکہ مصارفِ آمدورفت قیمت کا ایک جزوِ قلیل رہیں۔ سونا چاندی اس لحاظ سے سب سے بہتر ہیں کہ اُن کا وزن وجسامت دونوں نہایت کم اور مقدارِ قیمت بہت زیادہ، گیہوں روئی اور شکر کا وزن وجسامت بھی موافق ہے اور اُن کی قیمت مصارفِ آمدورفت کی متحمل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر معمولی اینٹیں یا پتھر دور بھیجے جائیں تو مصارفِ آمدورفت اصلی قیمت سے بھی کہیں بڑھ جائیں گے۔ پس جو چیزیں بوجہ زیادہ وزنی جسیم اور کم قیمت ہونے کے دُور نہ بھیجی جا سکیں اُن کی قیمت میں مقابلۃً دو جگہ بہت فرق قائم رہ سکتا ہے۔ کیونکہ مصارفِ آمدورفت اس

فرق سے بھی زائد ہوتے ہیں۔ مصارف آمد و رفت جس قدر کم ہوں گے قیمت میں فرق کم رہ سکے گا اور چیز جس قدر کم وزن چھوٹی اور بیش قیمت ہوگی مصارفِ آمد و رفت کم ہوں گے گویا ایسی چیزوں کی خرید و فروخت میں مقابلہ قوی ہوگا اور ان کا بازار وسیع ہوگا۔

قوتِ مقابلہ اور وسعتِ بازار کے واسطے کسی چیز میں مذکورۂ بالا تینوں خواص کم و بیش موجود ہونے لازمی ہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں میں اُن کے برعکس خواص پائے جائیں یعنی اُن کی طلب مخصوص اور محدود ہو ان میں شناخت پذیری اور انتقال پذیری مفقود ہو تو اُن کے کاروبار میں مقابلہ ضعیف ہوگا۔ اور اُن کا بازار تنگ و مختصر۔ مثلاً پھل پھول ترکاری گوشت۔ گویا ایک طرف تو چند عالمگیر بازار ہیں اور دوسری طرف مقامی بازار اور اُن کے بین بین بے شمار بازار ہیں جن کی وسعت مختلف ہے۔ مقابلے کا وسعتِ بازار پر جو اثر پڑتا ہے مقابلے میں جو آجکل سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں اور مقابلے کے واسطے چیزوں میں جو خواص لازمی ہیں یہ سب جاننے کے بعد بعض نرخوں کی عالمگیر مساوات اور بعض کے بے شمار اختلافات جو ہر طرف نظر آتے ہیں سمجھنے میں سہولت ہوگی اور واقعات سے مذکورہ بالا اصول کی تطبیق بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

قدر و قیمت ۶۔ جب ہم ایک چیز کا دوسری چیز سے براہِ راست مبادلہ کریں مثلاً ایک سیر گھی کے معاوضے میں دس سیر گیہوں یا سیر بھر دودھ کے بدلے میں پاؤ بھر شکر۔ تو یہ چیزیں اصطلاحاً ایک دوسرے کی قدر کہلائیں گی گویا قدر سے مراد دوسری چیزوں کی وہ مقدار ہے جو ہماری چیز کے مبادلے میں مل سکے

لیکن جیساکہ اہمیت مبادلہ کے تحت میں اوپر بتایا جا چکا ہے اور نیز آئندہ بعنوانِ زر بالتفصیل بیان کیا جائے گا۔ آجکل چیزوں کا چیزوں سے براہِ راست مبادلہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے بغرضِ سہولت ایک خاص چیز ایجاد کی گئی ہے جو اصطلاحاً زر کہلاتی ہے۔ ہر شخص اپنی چیز کا بخوشی اس سے مبادلہ کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ گویا مبادلے میں زر ہر شخص کو قبول ہے زر کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ کسی دو چیزوں کے مبادلے میں بطور ثالث اس کی وساطت ناگزیر ہے۔ چنانچہ زر کی وساطت ہی کے باعث مبادلے کا عمل دو احداث خرید و فروخت کے عمل میں منقسم ہو گیا اگرچہ زر بھی خود ایک چیز ہے لیکن دنیا کی باقی تمام چیزوں سے وہ اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ مبادلے میں دوسری چیزیں تو بشرطِ احتیاج قبول کی جا سکتی تھیں لیکن اس کی مقبولیت عام ہے اور مبادلے میں ہر شخص اس کا خواہاں نظر آتا ہے۔ پس اگر کسی چیز کا ہم زر سے مبادلہ کریں خواہ وہ چیز خریدیں یا فروخت کریں تو زر کی وہ مقدار جو معاوضے میں دی جائے اصطلاحاً قیمت کہلائے گی۔ مثلاً سیر بھر گھی اور دس سیر گیہوں ایک دوسرے کی قدر تھے لیکن ایک ایک روپیہ ان دونوں کی قیمت ہوتی ہے:

اسی طرح سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر شکر جو ایک دوسرے کی قدر تھی ان کی قیمت بھی دو دو آنے ہوگی:

آجکل قیمت کا رواج عام ہے۔ لیکن اس کے ذریعے سے ہم کسی دو یا زیادہ چیزوں کی باہمی قدر کا اندازہ لگا سکتے ہیں مثلاً دودھ دو آنے سیر فروخت ہو۔ گھی کا نرخ روپے سیر ہو شکر روپے کی چار سیر ملے اور نمک ۱۶ سیر تو ایک روپیہ معیار قرار دینے سے معلوم ہوا کہ آٹھ سیر دودھ۔ سیر بھر گھی ۴ سیر شکر اور ۱۶ سیر نمک ایک دوسرے کے ہم قدر ہیں اور ایک ایک روپیہ ان سب کی

بیگانہ قیمت:

صاف ظاہر ہے کہ قیمت قدر کی ایک خاص شکل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو چیز مبادلے میں بطور قیمت قبول کی جاتی ہے اس کی مقبولیت عام ہے اور وہ اصطلاحاً زر کہلاتی ہے گویا قیمت وہ قدر ہے جو مبادلے میں بشکلِ زر قبول کی جائے۔

مبادلے میں جو زر دیا جائے وہ تو اس چیز کی قیمت قرار پایا اور وہ چیز اس مقدارِ زر کی قدر کہلائے گی۔ مثلاً جبکہ ایک روپیہ سیر بھر گھی کی قیمت ہے تو سیر بھر گھی ایک روپے کی قدر شمار ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے زر کی قدر گھٹتی ہے اور قیمت اترنے سے زر کی قدر چڑھتی ہے مثلاً اگر گھی کا نرخ سیر کی بجائے تین پاؤ فی روپیہ رہ جائے یا یوں کہو کہ ایک سیر گھی کی قیمت روپے کی بجائے عہ ۱/۵ ہو جائے تو روپے کی قدر بجائے ایک سیر کے تین پاؤ گھی رہ گئی گویا موجودہ عہ ۱۲ کی قدر وہی ہے جو سابق میں ایک روپے کی تھی یعنی سیر بھر گھی۔ اسی طرح اگر گھی کا نرخ سیر بھر کی بجائے ڈیڑھ سیر فی روپیہ ہو جائے یا یوں کہو کہ ایک سیر گھی کی قیمت روپے کی بجائے دس آنے رہ جائے تو روپے کی قدر ایک سیر کی بجائے ڈیڑھ سیر گھی ہو گئی۔ گویا موجودہ دس آنے کی قدر وہی ہے جو پہلے ایک روپے کی تھی یعنی سیر بھر گھی۔

حاصل کلام یہ کہ قیمت اشیا اور قدرِ زر کی تبدیلیاں بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہوتی ہیں۔ چیزوں کے علاوہ زر کی قلت و کثرت سے بھی ان تبدیلیوں کا تعلق نہایت قریبی مگر دقیق اور پیچیدہ ہے جس کی تشریح ہم آئندہ زر کے سلسلے میں بیان کریں گے۔

چیزوں کی قدر و قیمت اور زر کی قدر کے سلسلے میں یہاں مختصراً یہ بتانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ زر کی قدر بلکہ قیمت بھی ہوتی ہے۔

حصۂ چہارم
باب نوزدہم

البتہ زر کی قیمت کا ایک خاص جداگانہ مفہوم ہے۔ زر کی قیمت سے مراد شرح سود ہے جو زر مستعار پر ملے۔ چنانچہ گرانی زر سے اصطلاحاً یہ مراد ہوتی ہے کہ عام طور پر روپیہ قرض ملنے میں دقت پیش آئے اور شرح سود بہت اعلیٰ طلب کی جائے۔ اس کے برعکس ارزانی زر کے معنی یہ ہیں کہ لوگ بکثرت قرض دینے پر آمادہ ہوں اور شرح سود بھی ادنیٰ ہو۔ ان مسائل سے ہم آئندہ بھی بحث کریں گے۔ زر کی قدر و قیمت کی طرف یہاں صرف اشارہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ زر کا بھی آپس میں مبادلہ ہوتا ہے۔ روپے سے روپیہ اور پیسے سے پیسہ یا گنی سے گنی تو کوئی بدلتا نہیں کیونکہ ان میں کوئی فرق نہیں لیکن روپے سے پیسے اور گنی سے روپے ضرور بدلے جاتے ہیں گویا مختلف قسم کے زر کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے۔ ایسے مبادلے کی شرح کے اصول ہم آئندہ زر کے تحت میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ جبکہ زر کا معاوضہ زر دیا جائے تو وہ بھی اصطلاحاً ایک دوسرے کی قدر کہلاتے ہیں نہ کہ قیمت مثلاً سولہ آنے روپے کی قدر ہیں اور گنی کی قدر پندرہ روپے کلدار ہیں۔

واضح ہو کہ مبادلے کی اصلی غرض حصول ضروریات ہے جس چیز کی ہم کو ضرورت نہ ہو یا کم ہو اس کے مبادلے میں ہم ایسی چیز لینا چاہتے ہیں کہ جس کی ہم کو ضرورت یا بیشتر ضرورت ہے۔ مبادلے میں زر محض بطور ایک سہولت افزا آلے یا وسیلے کے استعمال ہوتا ہے پس درحقیقت توجہ طلب تو چیزوں کی قدر ہونی چاہیئے۔ لیکن چونکہ معاوضے کا مروجہ معیار قیمت ہے۔ لہذا قدر و قیمت کا رشتہ بتانے کے بعد ہم بھی قدر کی بجائے قیمت سے بحث کریں گے۔ نیز قدر و قیمت کے مزید تعلقات زر کے بیان میں واضح کریں گے اور اسی طرح پر مبادلے کا اساسی مسئلہ صاف ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

مسئلۂ قیمت

۷۔ صاف ظاہر ہے کہ قیمت مبادلے پر مبنی ہے۔

جب کسی چیز کا مبادلہ ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت کیونکر قرار پا سکتی ہے
اور مبادلے کے واسطے جو شرائط لازمی ہیں وہ مقدمے میں
بعنوان استبدال بالتفصیل بیان ہو چکی ہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ
مبادلے کے واسطے اوّل کسی چیز میں افادہ شرط ہے۔ دوم اس
چیز کی قلت بھی لازمی ہے۔ قلت سے مراد ہے کسی چیز کا
بقدر طلب دستیاب نہ ہونا۔ چنانچہ خود قلت میں افادے کی شرط
مضمر ہے۔ اگر کسی چیز میں افادہ ہی نہ ہو تو پھر لوگ اس کو طلب کیوں
کرنے لگے اور پھر قلت کے کیا معنی۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا خالی از لطف
نہ ہوگا، **قلت** اور **ندرت** دو جداگانہ حالتیں ہیں۔ اگر کوئی چیز اتنی بڑی
کثیر مقدار میں پیدا ہو لیکن پھر بھی بلحاظ طلب ناکافی ہو۔ یعنی اس کی رسد
طلب سے کم رہے تو اس کی قلت مانی جائے گی۔ اس کے برعکس
اگر کسی چیز کی نہایت تھوڑی مقدار موجود ہو لیکن اس کی طلب نہ ہو
تو ایسی حالت قلت شمار نہیں ہو سکتی بلکہ ندرت کہلائے گی۔ ہوا اور دھوپ
میں از حد افادہ موجود ہے مگر چونکہ ان کی مقدار لامحدود ہے اور وہ ہر شخص
کو میسر ہیں، بوجہ قلت نہ ہونے کے ان کی کوئی قیمت بھی نہیں۔ کم و بیش
یہی حال لب دریا پانی اور اندرون جنگل لکڑی کا ہے۔ اگر کل کرۂ ارض
سونے کا ہوتا تو سونا مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت ہوتا یا اگر غلہ آسمان
سے بکثرت برستا تو پھر کوئی کسی سے نہ خریدتا۔ گیہوں اور روئی جیسی چیزیں
جن کی طلب عالمگیر ہے اربوں اور کھربوں ہی من پیدا ہوتی ہیں
لیکن پھر بھی ان کی ایسی افراط نہیں کہ لوگوں کو حسب طلب بطور خود
دستیاب ہو سکیں بلکہ ان میں بھی تعینِ مقدار اور ملکیت کی صفات
موجود ہیں۔ یعنی باوجود فی نفسہ مقدار بڑی ہونے کے بلحاظ طلب
ان کی قلت ہے اور اسی وجہ سے ان کی قیمت اٹھ جاتی ہے بیس برس
پرانی صد سالہ شراب میں قلت اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ
اس کی رسد طلب سے کم ہے۔ لیکن صرف ایک سیر دودھ جو بیس برس

بوتل میں بند رکھا ہو باوجود اس قدر کم مقدار ہونے کے صفت قلت سے معرا ہے۔ کیونکہ اس کی طلب ہی نہیں جو کچھ اس میں ہے صرف ندرت ہی ندرت ہے۔ علیٰ ہذا اگرچہ گائے بکریوں کے ہوتے ہوئے اُن کی قلت ہے۔ حالانکہ بعض وحشی جانوروں میں جن کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی صرف ندرت ہو سکتی ہے ان کی کوئی قلت نہیں۔ گلاب۔ چنبیلی اور بہت سے خوشبودار درخت اور بیلیں بکثرت اگائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی اُن کی قلت ہے۔ اپنی اپنی قسم کے تھوڑے تھوڑے بہت سے پودے اور گھاسیں اُگتی ہیں جن کی کوئی قلت نہیں محسوس ہوتی ان میں ندرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ندرت سے فی نفسہ کسی چیز کی کمی مراد ہے اور وہ عمومیت کی متضاد ہے۔ لیکن قلت محض ایک صفت اضافی ہے ان سے کسی چیز کی کمی فی نفسہ بلکہ بلحاظ طلب مراد ہے اور وہ کثرت کی متضاد ہے؛

یہ ایک معاشی مقولہ ہے کہ قیمت کا دارومدار محض قلت پر ہے۔ اگر کسی چیز کی قلت زیادہ ہے قیمت بھی زیادہ ہوگی اور اگر قلت کم ہے تو قیمت بھی کم۔ قلت کا مذکورۂ بالا مفہوم کہ اس میں افادہ بھی مضمر ہے اور نیز قلت وندرت کا فرق سمجھنے کے بعد قانون تقلیل افادہ کو پیش نظر رکھ کر اس مقولے کی صحت میں کوئی شک نہیں رہنا چاہئے اگر سچ پوچھو تو اس مقولے نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے لوازم مبادلہ قانون تقلیل افادہ۔ قانون طلب ورسد اور اصول شرح قیمت یہ سب باتیں اس مقولے میں داخل ہیں۔ پہلے تین اجزا تو بیان ہو چکے ہیں۔ صرف حوالہ کافی ہونا چاہئے۔ البتہ چوتھے جزو یعنی شرح قیمت سے ہم ذیل میں جداگانہ مفصل بحث کرتے ہیں؛

قیمت مبادلے پر مبنی ہے اور مبادلے کے واسطے دو فریق لازمی ہیں چنانچہ خریدار اور بیچنے والے کے باہم جھگڑنے سے چیز کی قیمت طے ہوتی ہے خریدار گھٹانے کی کوشش کرتا ہے

بیچنے والا حتی الامکان قیمت بڑھانے پر زور لگاتا ہے ۔ ورفریقین کی کشمکش سے کوئی ایسی قیمت قرار پاجاتی ہے جس پر دونوں رضامند ہوجائیں اگر دونوں رضامند نہ ہوسکیں تو سودا نہ پٹے گا اور نہ کوئی قیمت قرار پائے گی پس اصول شرح قیمت دریافت کرنے کے لیئے یکے بعد دیگرے خریدار و فروشندہ دونوں فریق کے نقطۂ نظر کی تحقیق لازمی ہے ؛

خریدار کا طرز عمل تو صاف ہے خریدنے میں وہ قانون تقلیل افادہ کا پیرو ہوتا ہے اور قیمتِ طلب یعنی خریدار کی پیش کردہ قیمت کسی مقدار کے افادۂ مختتم سے کم یا اس کے مساوی ہوتی ہے اس طرح پر خریدار کو زائد افادہ حاصل ہو وہ اصطلاحاً نفع المصرف کہلاتا ہے اس اجمال کی تفصیل بعنوانِ قانونِ تقلیلِ افادہ موجود ہے جس کا اعادہ سراسر بیجا طوالت ہوگا ؛

اب رہا دوسرا فریق یعنی بیچنے والا اس کا طرز عمل ذرا پیچیدہ اور تشریح طلب ہے جس کم سے کم قیمت پر فروشندہ مال دینے کو آمادہ ہوجائے وہ اصطلاحاً قیمتِ رسد کہلاتی ہے ۔ عام مقولہ ہے کہ قیمتِ رسد مصارفِ پیدائش کے مساوی ہوتی ہے اور بظاہر بات بھی صاف ہے مصارفِ پیدائش سے کم قیمت پر فروخت کرنے سے بیچنے والے کا سراسر نقصان ہے ۔ اور لوگ کاروبار نفع کے واسطے کرتے ہیں نہ کہ نقصان برداشت کرنے کو لہذا کاروبار کی شرطِ اول یہی ہے کہ قیمت مصارفِ پیدائش کے برابر ضرور وصول ہوتی رہے ورنہ چندہی روز میں کاروبار بند ہوجانا یقینی ہے ۔ واضح ہو کہ بحیثیت مجموعی یہ مقولہ ضرور صحیح اور درست ہے ۔ لیکن اول تو اس میں دو مستثنیٰ توجہ طلب ہیں ۔ دوم بلحاظ تنگی و وسعتِ وقت اس مقولے کے عمل میں اور نیز مصارفِ پیدائش کے مفہوم میں قابل لحاظ فرق پیدا ہوجاتا ہے چنانچہ ان نکات کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں ؛

اوّل مستثنیٰ کو لیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیمت کا دار و مدار قلت پر ہے۔ اور قلت کے اسباب مختلف ہیں بعض حالتوں میں قلت محض اتفاقی ہوتی ہے۔ مثلاً قدیم کرم خوردہ کتابیں بوسیدہ نقشے اور تصویریں زنگ آلودہ سکے۔ اگر کوئی ان کا طالب نہ ہو تو ان میں ندرت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جب محققینِ آثارِ قدیمہ میں اس کی مانگ ہو تو ساتھ ہی قلت نمودار ہوگی۔ اور قیمت کا کتنا ہی بڑھ جانا عجب نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی قیمت طلب پر منحصر ہے یعنی خریدار جس قدر دینے پر رضامند ہوسکیں۔ جب ان چیزوں کو بنے ہوئے صدہا برس گزر چکے ان کے موجودہ مالکوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کتنے کتنے کو خریدی ہوں گی اور جبکہ ایسی چیزیں کسی صرفے سے بھی تیار نہ ہوسکیں تو قیمتِ رسد اور مصارفِ پیدائش کا لحاظ خارج از بحث ہے۔ دوم جبکہ کوئی چیز بحالتِ اجارہ پیدا ہو نہ کہ بحالتِ مقابلہ تو اس صورت میں بھی قیمتِ رسد کا مصارفِ پیدائش کے مساوی ہونا یقینی نہیں، اغلب یہ ہے کہ وہ مصارفِ پیدائش سے زیادہ ہوگی۔ چنانچہ اجارہ دار کے نقطۂ نظر سے اجارے میں سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ قیمت حسب دلخواہ قرار دی جاسکتی ہے، اجارے میں قیمتِ رسد کس اصول کے مطابق قرار پاتی ہے یہ بطور خود ایک جداگانہ مسئلہ ہے اور آگے چل کر بعنوانِ اجارہ ہم اس سے مفصل طور پر بحث کریں گے یہاں صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ اجارے کی حالت میں بھی قیمتِ رسد کا مصارفِ پیدائش کے مساوی ہونا ضروری نہیں بلکہ اس سے زیادہ ہونا اغلب ہے۔ البتہ تیسری حالت میں یعنی جبکہ قلت کا باعث نہ اتفاق ہو نہ اجارہ بلکہ مصارفِ پیدائش ہوں تو قیمتِ رسد ضرور مصارفِ پیدائش کے مساوی ہوگی۔

مذکورالصدر ہر دو مستثنیٰ سے واضح ہوا کہ اوّل تو یہ مقولہ کہ قیمتِ رسد مصارفِ پیدائش کے مساوی ہوتی ہے اُن چیزوں سے متعلق ہے

جو پیدا کی جا سکیں اور جن کی پیداوار میں اضافہ و تخفیف ممکن ہے۔ دوم اس مقولے کی صحت صرف بحالتِ مقابلہ یقینی ہے جبکہ ہر کوئی اپنے حریف کو زک دینے اور اپنے مال کی بکری بڑھانے کی غرض سے قیمت گھٹاتے گھٹاتے مصارفِ پیدائش تک لے آتا ہے بلکہ مقابلے کے جوش میں کبھی کبھی حریف مصارفِ پیدائش سے بھی قیمت کم کر گزرتے ہیں اگرچہ ایسی کمی صرف چند روزہ ہوتی ہے بہرحال اجارے کی طرح مقابلے میں قیمتِ رسد کا مصارفِ پیدائش سے زیادہ ہونا ممکن نہیں اور مساوی ہونا اغلب ہے :

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وسعتِ وقت کا اس قول کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے اور مصارفِ پیدائش کے مفہوم میں کیا فرق نمودار ہوتا ہے :

جبکہ وقت اس قدر تنگ ہو کہ چیزوں کی پیداوار میں حسبِ دلخواہ کمی بیشی نہ کی جا سکے اور چیزیں بھی سریع الزوال ہوں تو ایسے وقت کے اندر قیمت بیشتر قیمتِ طلب پر منحصر ہوتی ہے۔ قیمتِ رسد کا اثر بہت ضعیف ہوتا ہے۔ آم امرود بیر وغیرہ پھلوں کی پیداوار باغات کی تعداد پر منحصر ہے اور باغ مدتوں میں تیار ہوتے ہیں اور مدتوں ہی میں بیکار۔ پس ہر فصل میں جتنے پھل پیدا ہونے ہوگئے اور ان کی قیمت قیمتِ طلب کے تابع ہوتی ہے۔ اسی طرح خربزے تربوز جب کھیت میں بو دیئے گئے تو پھر ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ اور ان کی قیمت فصل پر قیمتِ طلب کے مطابق رہتی ہے۔ خواہ طلب ایک حالت پر برقرار رہے اور ان پھلوں کی بہت کم یا بہت زیادہ مقدار پیدا ہو یا مقدارِ پیداوار برقرار رہے اور طلب میں بہت زیادہ اضافہ یا تخفیف ہو جائے یا یہ دونوں تبدیلیاں کسی ترکیب سے ایک ساتھ نمودار ہوں ہر حالت میں نتیجہ وہی ایک ہوگا یعنی قیمت طلب سے قیمت قرار پائے گی۔ یوں تو شہروں میں دو دھری ایک نرخ مقررہ سے

حصّہ چہارم
باب نوزدہم

فروخت ہوتے ہیں لیکن فرض کرو کہ ہفتے بھر کے واسطے بوجہ شادی یا تیوہار ان کی طلب یکایک بڑھ جائے تو ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں لوگ نئی گائے بھینس خرید کر دودھ کی مقدار نہیں بڑھا سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قیمت بہت چڑھ جائے گی۔ اسی طرح پر اگر چند روز کے واسطے بوجہ خرابیِ موسم ان کی بکری بہت گھٹ جائے تو لوگ گائے بھینس جو انہیں کرسکتے اور دودھ بھی سپیسے سیر بھی بک جائے تو عجب نہیں چونکہ یہ دونوں سریع الزوال ہیں، فروخت نہ کرنے میں سراسر نقصان ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی دام اٹھ آئیں قیمت ہے۔ اسی طرح پر اگر سوءِ اتفاق سے گھوسیوں کی بہت سی بھینسیں گم یا بیمار ہوجائیں یا برائے فروخت چند روز کے واسطے باہر سے بہت سی بھینسیں آجائیں تب بھی دودھ کی قیمت علی الترتیب بہت چڑھ اتر جائیگی۔ گویا خواہ طلب میں تبدیلی ہو یا رسد میں یا دونوں میں نتیجہ وہی ایک ہوگا۔ قیمتِ طلب کا غلبہ رہے گا۔ برف کا کارخانہ ہر روز ایک مقدار تیار کرتا ہے۔ اب اگر کسی روز یکایک برف کی مانگ بہت بڑھ یا گھٹ جائے یا برف بہت زیادہ یا کم مقدار میں تیار ہو تو بہر صورت اس کی قیمت قیمتِ طلب کی تابع ہوگی۔

اوپر کی مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ علی الترتیب چند سال، ایک فصل، ایک ماہ دو ایک روز تک اشیائے مذکور کی مقدارِ پیداوار میں کوئی حسبِ دلخواہ ردّ و بدل کرنا دشوار ہے یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ طلب بڑھتی دیکھ کر اپنی طرف سے پیداوار بڑھا دیں اور گھٹتی دیکھ کر گھٹا دیں بلکہ اوقاتِ مذکورہ کے اندر جو مقدار پیدا ہوتی ہے وہ پیدا ہو جاتی ہے اور قیمت محض طلب پر منحصر رہ جاتی ہے قیمتِ طلب جو کچھ ہو وہی چیز کی قیمت قرار پائے گی قیمتِ رسد کو دخل دینے کی مجال نہیں ہوتی اب یہ اتفاق پر منحصر ہے کہ قیمتِ طلب قیمتِ رسد سے بڑھ کر فروشندہ کو مالامال کردے یا گھٹ کر اس کا

[illegible]

دیوالہ نکال دے گا۔

حاصل کلام یہ کہ سریع الزوال چیزوں کی قیمت اتنے تھوڑے عرصے کے اندر اندر کہ ان کی مقدار رسد اور پیداوار میں حسب دلخواہ کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکے گویا مقدار رسد اور کم و بیش معین ہوتی ہے قیمت طلب کے ماتحت ہوتی ہے۔ قیمت رسد کا اس وقت کے اندر اندر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایسے مختصر وقت کے اندر جو قیمت ہو اس کو اصطلاحاً بازاری قیمت کہتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ بازاری قیمت طلب کی پیرو یا تابع ہوتی ہے اور اس میں بڑے بڑے فرق ممکن ہیں۔ پھل پھول اور ترکاریوں کی فصل کی قیمت بدلتی رہتی ہے۔ عید تیوہار اور سہالگ کے موقعوں پر دودھ دہی کی قیمت دگنی چوگنی ہو جانا معمولی بات ہے۔ یہی برف پیسہ سیر سے لے کر روپوں تک بک جاتی ہے۔

تلون بازاری قیمت کا خاصہ ہے۔ لیکن پھر بھی بازاری قیمت کا اوسط قیمت رسد یعنی مصارف پیدائش کے مساوی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اتنے عرصے تک کہ مقدار رسد میں کمی بیشی کی جا سکے بازاری قیمت کا اوسط قیمت رسد سے زیادہ رہا تو مقابلے کے زور میں لوگ رسد بڑھا دیں گے اور بصورت دیگر رسد گھٹا دیں گے۔ مثلاً اوپر کی چار مثالوں میں بحالت بیشی اوسط بازاری قیمت بر قیمت رسد لوگ دس بارہ برس میں نئے نئے باغات لگا دیں گے۔ دو ایک فصل میں باڑیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ گھوسی اپنا گلہ بڑھائیں گے اور کارخانہ زیادہ برف تیار کرنے لگے گا۔ اور اگر اوسط کم پڑا تو عمل اس کے برعکس ہو گا۔

اب اگر اس دوران میں طلب اپنی سابق حالت پر قائم رہی تو رسد کی بیشی کمی کے بعد بازاری قیمت کا اوسط مصارف پیدائش کے لگ بھگ پڑے گا۔ اگرچہ قیمت طلب کے زیر اثر بازاری قیمت اب بھی کافی تغیر پذیر رہے گی۔ اور اگر اصلاح رسد کے بعد طلب میں

حصّہ چہارم
باب نوزدہم

کوئی اور دیرپا بڑا تغیر ہو جائے تو نہیں معلوم اوسط قیمت اور مصارفِ پیدائش میں کیا تعلق قائم ہو۔

جو چیزیں مقابلۃً زیادہ دیرپا ہیں مثلاً سونا چاندی۔ لکڑی۔ غلہ۔ کپڑا۔ جوتا اور بہت سے مصنوعات بازاری قیمت تو اُن کی بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ قیمتِ طلب کی یوں سراسر پیرو نہیں ہوتی بلکہ قیمتِ رسد سے بھی تعلق کم و بیش ضرور لگا رکھتی ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے کچھ مدت تک ذخیرے رہ سکتے ہیں اور اگر کوئی ردّ و بدل ازحد قوی اور دیرپا نہ ہو تو کمی بیشی طلب ور سد کی زد ذخائر پر پڑتی ہے اور اس قدر پر اثر ثابت نہیں ہوتا جتنی کہ سریع الزوال چیزوں میں۔ طلب بڑھنے یا رسد گھٹنے سے مقابلۃً بازاری قیمت میں کمتر فرق نمودار ہوتا ہے۔ اور علیٰ ہذا طلب گھٹنے یا رسد بڑھنے سے عام مشاہدہ ہے کہ مذکورالصدر جیسی دیرپا چیزوں کی قیمت میں کہیں مدتوں بعد کوئی بڑا اور دیرپا فرق پیدا ہوتا ہے ورنہ سالہا سال تک قیمت ایک سطح پر قائم رہتی ہے۔ بازاری قیمت کے تغیرات بہت ادنیٰ قسم کے ہوتے ہیں اور اگر کوئی غیر معمولی فرق نمودار بھی ہوا تو وہ بہت جلد زائل ہو جاتا ہے اور قیمت پھر معمولی سطح پر آ رہتی ہے۔ ایک سادہ مثال لو:۔

مقدار گیہوں	قیمتِ طلب	قیمتِ رسد
۱۲۰۰ من	۲ روپے من	۴ روپے من
۱۰۰۰ "	۲½ " "	۳½ " "
۷۰۰ "	۳ " "	۳ " "
۵۰۰ "	۴ " "	۲½ " "
۳۰۰ "	۵ " "	۲ " "

قانونِ تقلیل افادہ اور قانونِ تقلیل حاصل پیش رکھنے سے بلحاظِ مقدارِ گیہوں قیمتِ طلب و رسد کے فرق سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔

اوپر کی مثال میں مقدارِ رسد ۷۰۰ من کے قریب رہے گی اور قیمت تقریباً ۳ روپے من۔ اگر مقدارِ رسد صرف ۵۰۰ من ہوئی تو مقابلے کے جوش میں اُس کو بڑھا کر ۷۰۰ اور اگر مقدار ۱۰۰۰ من ہو تو بخوفِ نقصان اُس کو گھٹا کر ۷۰۰ من کر دیں گے اور قابلِ ذخیرہ ہونے کی وجہ سے ایسی چیزوں کی رسد میں کمی بیشی اس قدر دقّت طلب نہیں جتنی کہ سریع الزوال چیزوں میں۔ اوپر کی مثال میں یہ حالت کہ مقدارِ رسد و طلب یعنی ۷۰۰ من ایک ہی قیمت یعنی ۳ روپے من پر برابر ہو جائیں اصطلاحاً **توازنِ طلب و رسد** کہلاتی ہے۔ اور وہ قیمت کہ جس پر دونوں مقداریں مساوی قرار پائیں یعنی ۳ روپے۔ اصطلاحاً **قیمتِ متوازن**؛ اور خود یہ مقدار **مقدارِ متوازنہ** کہلاتی ہے۔ واضح ہو کہ کامل توازنِ طلب و رسد کم ممکن ہے۔ گر کبھی نمودار بھی ہوتا ہے تو محض اتفاقی طور پر اور بہت جلد زائل ہو جاتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رسد ۷۰۰ من کے اور قیمت ۳ روپے کے قریب قریب رہتی ہے کبھی کچھ زیادہ کبھی کم۔ قانونِ تقلیلِ افادہ و تقلیلِ حاصل مل کر ہر تبدیلی کی اصلاح جلد کر دیتے ہیں اور چیزوں کے دیرپا ہونے کی وجہ سے ایسی اصلاح بھی سہل ہے۔ ان چیزوں کی قیمت کا حال قطب نما کی سوئی کا سا ہے کہ جو ساکن تو بہت کم ہوتی ہے مگر بالعموم اِدھر اُدھر ہٹ ہٹ کر جلد جلد مرکز یعنی قیمتِ متوازن کی طرف پلٹتی رہتی ہے۔ ایسی قیمت جس کی تبدیلیاں عرصے تک مختصر حدود کے اندر اندر رہیں اصطلاحاً **قیمتِ معمولی** کہلاتی ہے، مثلاً چند سال سے گیہوں کی قیمتِ معمولی ۳ اور ۴ روپے من کے درمیان چلی آتی ہے؛

قیمتِ متوسط اور قیمتِ معمولی کا فرق صاف ظاہر ہے۔ اگر ۱۰۰ چیزیں ۳ روپے کے نرخ سے ۴۰۰ ایک روپیہ بارہ آنے کے نرخ سے اور ۱۵۰۰ ۱عہ کے نرخ سے فروخت ہوں تو قیمتِ معمولی ایک روپیہ کہلائیگی اور قیمتِ متوسط $\left\{\frac{(100\times3)+(400\times1\frac{3}{4})+1500}{100+400+1500}\right\} = \frac{300+700+1500}{2000}$

حصّۂ چہارم
باب نوزدہم

= $\frac{2500}{2}$ = عہ ہوگی؛

اوپر کے بیان سے واضح ہوگا کہ دیرپا چیزوں کی ٹھیک محض،
بازاری قیمت کچھ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتی اُن کی قیمت بشیتر قیمت معمولی
ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سریع الزوال چیزوں کی قیمت معمولی
کم پائی جاتی ہے ان میں بازاری قیمت کا بہت دور دورہ ہے،
قیمت معمولی تو قیمت متوسط کے آس پاس رہتی ہے۔ اور بازاری قیمت
اُس سے دور دور لیکن قیمت متوسط ہر حال میں مصارف پیدائش کے
مساوی ہوتی ہے اگر نہیں ہے تو کچھ عرصے میں ہو جاتی ہے لیکن حقیقت
یہ ہے کہ طلب و رسد میں ہر آن اس قدر بے شمار اور طرح طرح کی
تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ اُن کا احاطہ محال ہے ہم ایسی تبدیلیوں کی
مجموعی حالت اور اُن کے اغلب نتائج کا اندازہ کر سکتے ہیں اور بس
چنانچہ مذکورۂ بالا اصول قیمت اگر ہر جداگانہ تفصیل سے موافقت
نہ کریں تو اس کا باعث خصوصیاتِ حالات ہوں گے ورنہ عام حالات
کم و بیش ضرور مطابق نکلیں گے اور معاشی اصول و قوانین عام حالات
کی مطابقت سے زیادہ کا دعویٰ بھی کم کر سکتے ہیں؛

مصارفِ پیدائش

۸ مصارف پیدائش کی دو مدیں مانی جاتی ہیں مصارف مقدم
اور مصارف تضمیمی اور ان دونوں کے مجموعے کو مصارف کلی
کہتے ہیں مصارف کی یہ تقسیم بھی اور بہت سے معاشی اصطلاحات کی
تقسیم کے مانند غیر مکمل ہے۔ ان کی وجداگانہ فہرستیں مرتب کرنی
دشوار ہیں۔ رسم و رواج کے متعلق اکثر کاروبار میں ان کا مفہوم جداگانہ ہے
ایک ہی مد کہیں قسم اوّل میں داخل ہے اور کہیں قسم دوم میں بہر حال
باوجود تفصیلی اختلافات کے اس قدر تحقیق ہے کہ ایسے مصارف
جو محض شئے زیر بحث کی وجہ سے برداشت کیے جائیں مثلاً
پیداوار خام کی قیمت اور مزدوروں کی اجرت تیل کوئلہ اور
مشین چلانے کے دیگر مصارف و نیز مصارف فرسودگی یہ سب

مصارفِ مقدم میں داخل ہیں۔ کیونکہ اگر وہ چیز تیار نہ کی جاتی [illegible]
مصارف بھی پیش نہ آتے۔ لیکن ایسے مستقل مصارف [illegible]
چیز کے واسطے مخصوص نہ ہوں اگرچہ اُن سے [illegible]
مدد ملے۔ لیکن چیز تیار نہ ہونے کی حالت [illegible]
برداشت کیئے جاتے مثلاً کارخانے کے منیجر اور دیگر عمال
کی تنخواہ جو عام مزدوروں کی طرح روز نہیں بدلے جاسکتے [illegible]
کے اصل کا سود جو چیز تیار نہ ہونے کی حالت میں بھی دینا پڑتا
مصارفِ تفضیمی شمار ہوتے ہیں۔ اس تفریق کی ضرورت یہ ہے کہ
مصارفِ مقدم ملے بغیر تو کوئی کارخانہ دار چیز تیار کرکے دے ہی
نہیں سکتا۔ لیکن سرد بازاری کی حالت میں مصارفِ تفضیمی کا کوئی
حصہ چھوڑا جاسکتا ہے اگرچہ ایسا کرنے میں بھی آئندہ نرخ خراب
ہو جانے کے اندیشے سے کارخانہ دار کو تامل ہوگا بہرحال
یہ ممکن ہے اگرچہ مرجوح سہی کہ مصارفِ مقدم کے [illegible] کی قیمت پر
کوئی کارخانہ مال تیار کردے لیکن اگر ایسا ہو بھی تو گاہے گاہے [illegible]
تھوڑے زمانے تک ہو سکتا ہے۔ عرصۂ دراز تک صرف
مصارفِ مقدم کی مساوی قیمت پر مال فروخت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا
کہ مصارفِ تفضیمی ناقابلِ برداشت بن کر کارخانے کو بٹھا دیں گے
جب وہ مصارف کاروبار ہی سے نہ نکلیں گے تو کارخانہ دار اپنی گرہ سے
کیوں ادا کرے گا اور کب تک، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مصارفِ مقدم تو
ہر صورت میں ملتے ہیں، رہے مصارفِ تفضیمی وہ اگر کہیں کم تو
کہیں زیادہ اور اس طرح پر بلحاظ چند ماہ یا سال قیمت کا ایسا اوسط
پڑتا ہے کہ مصارفِ کُلّی مل جاتے ہیں گویا بلحاظ زمانہ مختصر تو
قیمت صرف مصارفِ مقدم کے مساوی ہو سکتی ہے لیکن بلحاظ زمانہ
وسیع قیمت کا مصارفِ کُلّی کے برابر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ کاروبار
چلنا محال ہے:

مصارف کی مدات اوپر واضح ہو چکیں۔ اب مصارف کی بنا لیجئے اس پر بھی وسعتِ وقت کا قابلِ توجہ اثر پڑتا ہے:۔
بازاری قیمت یعنی کسی چیز کی قیمت بلحاظ اس قدر تنگ وقت کے کہ اس کی رسد میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جا سکے مصارف پیدائش سے کچھ تعلق نہیں وہ تو قیمتِ طلب کی پیرو ہے۔ خواہ قیمت مصارف سے کم رہے یا زیادہ دودھ دہی پھل پھول ترکاری اور برف جیسی سریع الزوال چیزوں میں بازاری قیمت کا خاص نمونہ ہے:۔
یہی قیمتِ معمولی یعنی قیمت بلحاظ اس قدر وسیع وقت کے کہ رسد میں حسبِ دلخواہ کمی بیشی کی جا سکے۔ وہ مصارف پیدائش کا بھی اتباع کرتی ہے۔ قیمتِ طلب و قیمت رسد دونوں کا اسیر بار پڑتا ہے۔ کبھی ایک کا پلّہ جھک جاتا ہے کبھی دوسرے کا۔ اس صورت میں وسعتِ وقت کے دو درجے ہو سکتے ہیں۔ اوّل اتنا وقت کہ صرف موجودہ کارخانوں کے کام میں اضافہ یا تخفیف کر سکے دوم اتنا عرصہ کہ نئے کارخانے جاری یا موجودہ کارخانے سراسر بند کر کے رسد میں اضافہ یا تخفیف کی جائے بنظرِ سہولت صرف اضافۂ رسد کی حالت میں وقت کے مذکورۂ بالا درجوں کا مصارفِ پیدائش پر اثر مثال سے واضح کرتے ہیں:۔
فرض کرو کہ تحقیق طور پر صرف چھ ماہ یا برس روز کے واسطے جوتوں کی مانگ بہت بڑھ جائے تو اتنے عرصے تک نہ تو موجودہ ذخیرے پر اکتفا کیا جائے گا کہ تعین رسد سے بازاری قیمت نمودار ہو جائے اور نہ اتنے دنوں کے واسطے نئے کارخانے جاری کیے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ہوگا یہ کہ اوقات کار حتی الامکان بڑھ کر موجودہ کارخانوں ہی سے زیادہ مال تیار ہونے لگے گا اور موجودہ ذرائعِ پیدائش سے زیادہ کام لے کر جو مصارف پڑیں قیمت بھی کم و بیش

اس کے مطابق قرار پائے گی؛

لیکن اگر تحقیق طور پر دس بارہ سال کے واسطے جوتوں کی مستقل مانگ بڑھ جائے تو موجودہ کارخانوں سے زیادہ کام لینے پر اکتفانہ کرکے نئے نئے کارخانے جاری کردیئے جائیں گے اور اُن کے اجرا کے مصارف کے لحاظ سے قیمت قرار پائے گی؛

المختصر بازاری قیمت مصارفِ پیدائش سے بے سروکار ہوتی ہے اور قیمتِ معمولی مصارفِ پیدائش کے مطابق۔ بحالتِ اضافۂ رسد مصارفِ پیدائش یا تو موجودہ ذرائعِ پیدائش سے زیادہ کام لینے کے مصارف سے قرار پاتے ہیں یا اگر وقت اور بھی ہو تو جدید ذرائعِ پیدائش جاری کرنے کے مصارف سے قرار پائیں گے تخفیفِ رسد میں عملدرآمد اس کے برعکس ہوگا؛

واضح ہو کہ تعینِ قیمت کی ان تینوں صورتوں کے علاوہ ایک چوتھی صورت اور بھی ہے وہ یہ کہ دنیا میں جو بے شمار اور گوناگوں تغیرات اور انقلابات ہوتے رہتے ہیں اُن کا بھی قیمتِ معمولی پر بتدریج لیکن یقینی طور پر اثر پڑتا رہتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ہر ایک دو نسل بعد وہ نہایت واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے؛

حاصل کلام یہ کہ وقت کے بلحاظِ وسعت چار مدارج ہیں۔ کم۔ بیش۔ بیشتر۔ بیشترین۔ اور ہر وقت کے عرصے کی قیمت جداگانہ ہوگی۔ وقت کا قیمت پر اثر ایک نہایت دقیق اور جدید مسئلہ ہے اس کی تحقیقات کا سہرا خاص طور سے مارشل جیسے عالمِ معیشت کے سر ہے۔ ہم نے بھی حیرانی افزا تفصیل و طوالت ترک کرکے مختصر اور سلیس طور پر قیمت کا یہ پہلو واضح کرنے کی کوشش کی ہے؛

اوپر کی بحث سے اندازہ ہو جائے گا کہ مسئلۂ قیمت میں

کتنے پہلو توجہ طلب ہیں۔ قانونِ تقلیلِ افادہ و قانونِ طلب کا مفہوم اور مفروضہ بازار کی ضرورت سمجھنا۔ کمی بیشی رسد۔ اجارہ و مقابلہ وقت کی تنگی و فراخی۔ سریع الزوالی و دیرپائی اشیاء اور قوانینِ پیدائش کا قیمت اور مصارفِ پیدائش کے تعلق پر اثر واضح کرنا اور نیز بلحاظِ وسعتِ وقت خود مصارفِ پیدائش کی مدوں کے شمار کی بحث میں رد و بدل پیشِ نظر رکھنا قیمت کی عام حالت سمجھنے کے واسطے لابد ہے ورنہ ہر جداگانہ قیمت تو اس قدر اثرات و اسباب کی آفریدہ ہوگی کہ ان سب کا استحضار محال ہے۔ اکثر جتایا جا چکا ہے کہ جس قدر وسعتِ نظر سے کام لیا جائیگا مسائل معاشیات میں صفتِ تعین گھٹے گی۔ لیکن اُن کی صحت میں اضافہ ہوگا یعنی معلومات غیر معیّن معلوم ہونے کے ساتھ زیادہ قرینِ حقیقت ہونے لگیں گی۔ اس کے برعکس تنگ نظری سے مسائل میں تعین کا اضافہ ہونے لگتا ہے اور جلد ہی ایسے معلومات خلافِ واقعات ثابت ہوتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ قیمت گوناگوں شرائط کی پابندی کے ساتھ طلب و رسد کی کشاکشی سے قرار پاتی ہے، ان دونوں کے باہمی اثر ناقابلِ تفریق ہیں اور بلحاظِ عمل کسی کا تقدم و تاخر قرار دینا محال ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بحالت قانونِ تقلیلِ حاصل اضافۂ رسد پر اضافۂ طلب مقدم ہے۔ لیکن بحالت قانونِ تکثیرِ حاصل اضافۂ رسد کشائش طلب کا باعث بھی ہو سکتا ہے؛

مبادلے کی اہمیت کے تحت میں ہم نے اشارہ کیا تھا کہ تقسیمِ دولت بھی مبادلے کی ایک خاص صورت ہے اور بس۔ چنانچہ دیگر سامان کی طرح محنت اور خدماتِ اصل کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے اور ان کی قیمت اصطلاحاً اجرت اور سود کہلاتی ہے۔ ان کی بھی بازاری قیمت اور قیمتِ معمولی دونوں قسم کی ہوتی ہے۔

منجانب خریدار وہ بہرصورت افادۂ مختتم کی تابع ہوتی ہے اور منجانب فروشندہ مصارف پیدائش کی بیشی [illegible] شرح سود و شرح منافع کی بحث اسی قول کی تفصیل ہے اور اس قدر معاشی معلومات کے بعد غور کرنے سے یوں بھی اس قول کی صحت سمجھ میں آنی دشوار نہ ہونی چاہیئے؛

رہی زمین اس کی خرید و فروخت کی حالت اُس چیز کی سی ہے کہ جس کی قلت اتفاقی ہو اور جس کی رسد میں کوئی قابل لحاظ تخفیف یا اضافہ نہ ہو سکے۔ اور لگان قدرت کا ایک عطیہ ہے کسی چیز کا معاوضہ یا قیمت نہیں؛

قیمت کے متعلق اب صرف ایک نکتہ بتانا باقی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور ضروری بھی۔ وہ یہ کہ مختلف چیزوں کی قیمتوں کا ایک دوسرے پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیونکہ قیمتوں کے باہمی رشتے اکثر اس قدر بسیط دقیق اور پیچ در پیچ ہوتے ہیں کہ ان سب کا پتا چلانا محال ہے لیکن چند اصول ذیل میں واضح کیئے جاتے ہیں جن سے قیمتوں کے عام تعلقات سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے؛

طلب مشترک
طلب مرکب

۹۔ روٹی کھانے کے واسطے چاہیئے گو یا روٹی سے براہِ راست بھوک کی احتیاج رفع ہوتی ہے۔ لباس پہننے کے واسطے درکار ہے اس سے بھی تحفظِ بدن کی احتیاجیں براہِ راست پوری ہوتی ہیں۔ مکان رہنے کے واسطے ضروری ہے وہ بھی قیام و آسائش کی احتیاج پوری کرتا ہے۔ کتاب پڑھنے کے واسطے مطلوب ہوتی ہے ایسی تمام چیزوں کی طلب جن سے براہِ راست کوئی احتیاج پوری ہو اصطلاحاً طلب بلاواسطہ کہلاتی ہے۔ لیکن گیہوں۔ آٹا پیسنے کی چکی۔ ایندھن اور روٹی پکانے کے برتن جو روٹی کی تیاری کے واسطے ناگزیر ہیں۔ روئی۔ ریشم۔ اُون۔ تاگا کاتنے اور کپڑا بننے کی مشین۔ سوئی۔ قینچی۔ کپڑا سینے کی مشین جو لباس کی تیاری میں ناگزیر دتی ہے

اینٹ ۔ چونہ ۔ لکڑی ۔ لوہا ۔ راج ۔ بڑھئی ۔ لوہار ۔ مزدور جو عمارت بنانے میں کام آئیں اور کاغذ روشنائی ۔ پریس جو کتاب تیار کرے ۔ یہ سب چیزیں خود تو براہ راست کوئی احتیاج رفع نہیں کرتیں لیکن ایسی چیزوں کی تیاری میں ناگزیر مدد دیتی ہیں جن سے براہ راست کوئی احتیاج پوری ہو سکے لہذا یہ سب چیزیں بالواسطہ احتیاج رفع کرتی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کی طلب بھی اصطلاحاً طلبِ بالواسطہ کہلاتی ہے ۔ بالفاظِ مختصر جو چیزیں تیار ہو کر براہ راست کوئی احتیاج رفع کریں اُن کی طلب تو بلاواسطہ کہلاتی ہے اور ایسی چیز تیار کرنے میں جو جو پیداوارِ خام اور ذرائع پیدائش کام آئیں اُن میں سے ہر ایک کی طلب بالواسطہ شمار ہوگی ۔ مثلاً چھتری کی طلب بلاواسطہ ہے ۔ لیکن کپڑا ۔ لوہا ۔ لکڑی جس سے چھتری تیار ہو ان کی طلب بالواسطہ کہلائے گی اسی طرح پر جوتے کی طلب بلاواسطہ اور چمڑے ۔ ڈور کیل ۔ پالش اور جوتا بنانے کے ضروری اوزار کی طلب بالواسطہ ہوتی ہے ؛

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ جو جو پیداوار خام اور ذرائع پیدائش کسی چیز کی تیاری میں کام آئیں اُن کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ کہیں کہیں لاانتہا ہی سا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن عملی اور نیز علمی تحقیقات کے واسطے سلسلے کے تھوڑے سے قریب ترین حصے پر اکتفا کرنا ضروری بھی ہے اور مفید بھی ۔ سلسلے کا اتنی دور تک بڑھانا کہ طول سے حیرت پیدا ہو جائے سراسر عبث ہے ؛

جبکہ متعدد چیزیں مِل جُل کر ایک چیز تیار کریں یعنی جبکہ کسی چیز کی تیاری میں بہت سی چیزوں کی شرکت ہو تو ایسی کُل چیزوں کی مجموعی طلب اصطلاحاً طلبِ مشترک کہلاتی ہے گویا سب چیزوں کی جداگانہ طلب بالواسطہ کو مجموعی طور پر طلبِ مشترک کہتے ہیں یا یوں کہیئے کہ طلب بالواسطہ طلبِ مشترک کے اجزا ہیں اور طلب بلاواسطہ اُن کا ست یا عطر ؛

بالواسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت تو عام اصول قیمت کے مطابق قرار پاتی ہے۔ اور یہی حال بلا واسطہ طلب والی چیزوں کا بھی ہے۔ نیز ظاہر ہے کہ آخر الذکر چیز کی قیمت اول الذکر کی قیمتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا مقصود ہے کہ اگر چند چیزیں مل جل کر ایک چیز تیار کرتی رہیں تو ایسی حالت میں ان میں سے کسی چیز کی قیمت بڑھنا کن کن صورتوں میں ممکن ہے۔ اضافۂ قیمت کس حد تک قابل برداشت ہوسکتا ہے نیز یہ کہ اس حد سے تجاوز کرنے کا دوسری چیزوں کی قیمت پر کیا اثر پڑے گا:

بہ شرائط ذیل کسی بالواسطہ طلب والی چیز کی قیمت میں بوجہ تخفیف رسد بہت کچھ اضافہ ممکن ہے:-

ا۔ اول یہ کہ من جملہ تمام بالواسطہ طلب والی چیزوں کے وہ چیز بلا واسطہ طلب والی چیز کی تیاری کے واسطے سراسر یا تقریباً ناگزیر ہو اور اس کا کوئی بدل بہت زیادہ قیمت پر بھی دستیاب نہ ہوسکے:

ب۔ دوم جس چیز کی تیاری میں چیز معلومہ کام آئے اس کی طلب بھی تغیر پذیر ہونی چاہیئے تاکہ قیمت بہت زیادہ بڑھنے پر بھی طلب میں تخفیف کم ہو۔ اس خصوصیت کی ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس چیز کا کوئی بدل بہت قیمت پر بھی میسر نہ آسکے:

ج۔ سوم چیز معلومہ کی قیمت بلا واسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت کا ایک چھوٹا جزو ہو تاکہ اول الذکر قیمت کا بہت زیادہ اضافہ بھی آخر الذکر قیمت میں تھوڑا سا معلوم ہو۔ مثلاً اگر پہلی قیمت دوسری کی صرف ۵ فی صدی ہو تو اُس کے سہ چند ہونے پر بھی دوسری قیمت میں اضافہ بقدر دس فی صدی نظر آئیگا جو کچھ زیادہ نہیں:

د۔ چہارم اگر چیزِ معلومہ کے علاوہ دوسری چیزیں جو بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری میں کام آئیں وافر ہوں اور کسی دوسرے کام میں بہت کم آسکیں تاکہ تھوڑی سی تخفیفِ طلب سے اُن کی قیمت بھی گھٹ جائے تو ایسی تخفیفِ قیمت میں سے چیزِ معلومہ کی قیمت میں اضافے کی اور بھی گنجائش نکل آئے گی؛

اگر حالاتِ مذکورۂ بالا شرائط کے برعکس ہوں یعنی چیزِ معلومہ ناگزیر نہ ہو یا معمولی قیمت پر اس کا بدل مل سکے یا جس چیز کی تیاری میں وہ کام آئے اس کی طلب لغت پذیر ہو یا اُس کا معمولی قیمت پر بدل میسر آجائے یا چیزِ معلومہ کی قیمت تیار شدہ چیز کی قیمت کا بڑا حصّہ ہو یا بالواسطہ طلب والی دوسری چیزیں اور کام آسکیں تو باوجود تخفیفِ رسد چیزِ معلومہ کی قیمت میں اضافہ نہ ہو سکے گا۔ نیز واضح ہو کہ مذکورۂ بالا اضافۂ قیمت کچھ عرصے تک تو ضرور قائم رہے گا۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گوناگوں معاشی تغیرات کے ہاتھوں کچھ دنوں بعد اس کا کیا حشر ہو؛

جن جن صورتوں میں اضافۂ قیمت ممکن ہے اُن کو دریافت کرنے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ کس حد تک یہ اضافہ دوسری چیزوں کے حق میں قابلِ برداشت ہو سکتا ہے تاکہ باوجود اپنے میں سے ایک کی قیمت میں اضافہ ہونے کے وہ مل جل کر چیزوں کی تیاری جاری رکھیں اور کس حالت میں یہ اضافہ اس قدر گراں بار ہو جائے گا کہ وہ چیزیں بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری چھوڑ کر جدا ہونے پر مجبور ہو جاویں اور یا تو بے کار پڑی رہیں یا نہایت ادنےٰ کاموں میں جا لگیں قابلِ برداشت اضافۂ قیمت کی حد کے متعلق اصول یہ ہے کہ تیار شدہ چیز کی قیمت دوسری بالواسطہ طلب والی چیزوں کی مجموعی قیمت سے جس قدر بڑھ سکے گی اُسی قدر چیزِ معلومہ کی قیمت میں اضافہ ممکن ہو گا۔ مثلاً تین چیزوں سے جن کی قیمت ۴/۸/

اور ۱۲ ؍ ہو ایک چیز تیار کی جائے اور ایسی سو چیزیں عہ کے حساب سے فروخت ہو جائیں۔ اب فرض کرو کہ ۴ ؍ قیمت والی چیز کی رسد میں اس قدر تخفیف ہو جائے کہ صرف ۵۰ چیزیں تیار ہو سکیں اور اُن کا نرخ بڑھ کر عہ ہو جائے باقی دو چیزوں کی قیمت تو وہی ۸ ؍ آنے اور ۱۲ ؍ قائم رہے گی بلکہ بوجہ تخفیف طلب کچھ گھٹ جائے تو عجب نہیں پس تیار شدہ چیز کی قیمت کا اضافہ (عہ) ۸ ؍ پہلی چیز کی قیمت ۴ ؍ میں شریک ہو کر اُس کو ۱۲ ؍ تک بڑھا دے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اسی چیز کی رسد کی تخفیف سے تیار شدہ چیز کی رسد میں بھی تخفیف پیدا ہوئی اور اسی کی بدولت قیمت میں اضافہ ہوا پس وہی چیز اس اضافے کی مالک بھی بنے گی۔

جس صنعت و حرفت میں جرمن ساخت کے رنگ وغیرہ استعمال ہوتے ہیں اور ان میں مذکورالصدر شرائط بھی کسی حد تک پوری ہوتی ہیں تو بوجہ تخفیفِ رسد رنگ وغیرہ تیار شدہ چیزوں کی قیمت اور چیزِ معلومہ کی قیمت کا اضافہ اُصول بالا کا پابند نظر آئے گا۔ غور کرنے سے ایسی متعدد موزوں مثالیں نظر آسکتی ہیں۔

اب اگر چیزِ معلومہ کی قیمت بوجہ ازحد تخفیفِ رسد اس قدر بڑھ جائے کہ کسی تیار شدہ چیز کی قیمت کے اضافے میں سے اس کا کُل اضافہ نہ نکل سکے اور نہ دوسری چیزوں کی تخفیفِ قیمت سے اس کی تلافی ہو تو اس چیز کی تیاری بند کرنی پڑے گی اور دوسری چیزیں محض بے بسی کی حالت میں جدا ہو جائیں گی۔ اور جب وہ کسی کام ہی نہ آئیں گی تو پھر اُن کی قیمت کہاں سے آئے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کا خون چیزِ معلومہ کی گردن پر ہے جس نے اپنی قیمت بڑھا کر ان سب کو جدا اور بیکار کر دیا اور خود اب بھی چند خاص خاص کاموں میں شریک رہ کر اس قدر اعلیٰ قیمت وصول کر رہی ہے۔

سُنا ہے امریکا میں ہوشیار باورچی کی بہت قلت ہے اور اُس کی

اجرت بھی نہایت اعلیٰ ہوتی ہے۔ باورچی کی تنخواہ زیادہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ اکثر قسم کے گوشت اور ترکاریاں نہایت ارزاں ملتی ہیں کیونکہ اُن کی طلب کم ہوتی ہے اس کے برعکس فرانس میں ہوشیار باورچی مناسب اجرت پر بکثرت مل سکتے ہیں اور انھیں گوشت اور ترکاریوں کی فرانس میں قیمت بھی خاصی ملتی ہے کیونکہ یہاں پر اُن کی طلب ہے۔ طلب نہ ہونے اور ہونے کا راز اور قیمت کی کمی بیشی کا باعث دراصل باورچی کی اجرت کی کمی بیشی میں مضمر ہے۔ تیار شدہ کھانے کی قیمت کے لحاظ سے امریکا میں اُس کی اجرت گراں بار ہے اور فرانس میں قابلِ برداشت، ہندوستان میں بہت سی کارآمد چیزیں محض اس وجہ سے ناکارہ پڑی ہوئی ہیں کہ اُن سے چیزیں تیار کرنیوالوں کی قلت ہے اور اُن کی اجرت اس قدر زیادہ ہے کہ تیار شدہ چیز کی قیمت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی اگر اجرت کم ہوتی تو جو چیزیں اب کوڑیوں کے مول بھی نہیں بکتیں اُن سے لاکھوں روپے کا قیمتی سامان تیار ہوا کرتا ہے "دمڑی کی گڑیا ٹکا سر منڈائی" یہ مثل اسی واقعے یعنی چیز معلومہ کی قیمت گراں بار ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

طلب بالواسطہ والی چیزوں کی قیمت میں جو کمی بیشی ہوتی رہتی ہے مذکورالصدر اصول کی روشنی میں اُن کو مطالعہ کرنے سے عجیب و غریب اور نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز معلومات حاصل ہوسکتی ہے جو عملی کاروبار میں بھی قابلِ قدر ثابت ہوگی۔

طلبِ مشترک سے ایسی کُل چیزوں کی طلب بالواسطہ کا مجموعہ مراد ہے جو کسی طلب بلاواسطہ والی چیز کی تیاری میں کام آئیں لیکن جس طرح چند چیزوں سے مل کر ایک چیز تیار ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک چیز جداگانہ چیزوں کے بنانے میں کام آتی ہے۔ یعنی چند جدا جدا بلاواسطہ طلب والی چیزوں کے بنانے میں ایک ہی بالواسطہ طلب والی چیز استعمال ہوتی ہے مثلاً چمڑا کئی کام آتا ہے

اس سے جوتے ہینڈ بیگ۔ سوٹ کیس بستر بند۔ گھوڑوں کے ساز کاٹھی سپاہیوں کی پیٹیاں اور کل چلانے کی مال اور رستے تیار ہوتے ہیں۔ چمڑے کی ان کُل طلبوں کے مجموعے کو اصطلاحاً طلب مرکب کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان طلبوں میں سے اگر کسی میں معقول اضافہ ہو جائے تو باقی شعبوں کی رسد میں تخفیف ہونے سے حسبِ گنجائش کل شعبوں میں چمڑے کی قیمت بڑھ جائیگی طلبِ مرکب کا یہ اصول اس قدر صریح اور سادہ ہے کہ مزید تشریح کا محتاج نہیں؛

واضح ہو کہ یہاں بھی عرصۂ وقت مختصر فرض کیا جاتا ہے۔ ورنہ زیادہ وسیع مدت میں چمڑے کی قیمت کیا قرار پائے کوئی نہیں بتا سکتا؛

۱۰۔ اکثر چند چیزیں ایک ساتھ مل کر پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً چمڑا گوشت اور ہڈی۔ غلہ اور بھوسا ایسی چیزوں کے رسد کے مجموعے کو جو ایک ہی ساتھ مل کر پیدا ہوں اصطلاحاً رسدِ مشترک کہتے ہیں۔ اس کی حالت بعینہ طلبِ مشترک کی سی ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ طلبِ مشترک والی متعدد چیزیں مل کر ایک چیز تیار کرتی ہیں اور رسدِ مشترک والی متعدد چیزیں مل کر ایک چیز سے پیدا ہوتی ہیں؛

گائے بھینس یا بکری سے گوشت چمڑا اور ہڈی ایک ساتھ مل کر حاصل ہوتے ہیں اب اگر چمڑے کی طلب میں اضافہ ہو اس کی قیمت بڑھے تو زیادہ مویشی ذبح ہونے لگیں گے۔ گوشت اور ہڈی کی رسد میں ساتھ ساتھ اضافہ ہونے سے اُن کی قیمت گھٹ جائے گی، ایسی صورت میں چمڑے کی قیمت کا اضافہ، گوشت اور ہڈی کی قیمت کی مجموعی تخفیف سے زیادہ یا کم از کم اسکے برابر ضروری ہے ورنہ چمڑے کی رسد میں کشائش محال ہے؛

جبکہ **قانون غلہ** کی رو سے ولایت میں غلے کی درآمد بند تھی مصارفِ کاشت بیشتر غلے سے اور کمتر غلے کے پیداوار کے

تنکوں کی قیمت سے حاصل ہوتے تھے۔ لیکن جب سے قانون مذکور منسوخ ہو کر غلّے کی درآمد شروع ہوئی ولایت میں غلّے کی قیمت گھٹ گئی۔ جس کی وجہ سے رقبۂ کاشت بھی تنگ ہو گیا۔ ولایت میں غلّے کے ساتھ تنکوں کی رسد بھی گھٹ گئی اور تنکے ٹوپیوں اور ٹوکریوں کے بنانے میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غلّے کی قیمت گھٹنے کے ساتھ ساتھ بوجہ تخفیفِ رسد تنکوں کی قیمت میں اضافہ ہوا جس نے قیمتِ غلّہ کی تخفیف کی تلافی کر دی۔ چنانچہ ولایت میں جو کسان غلّہ بوتا ہے وہ مصارفِ کاشت کا ایک معقول حصّہ تنکوں کی قیمت سے اور باقی غلّے سے وصول کرتا ہے؛

اس کے برعکس جن ملکوں سے غلّہ ولایت جانا شروع ہوا وہاں بوجہ اضافۂ رسد ایسے تنکوں کی قیمت گھٹ گئی اور بوجہ اضافۂ طلب غلّے کی قیمت میں جو اضافہ ہوا اُس نے تنکوں کی قیمت کی تخفیف پوری کر دی۔ جب تک برآمدِ گوشت کا رواج نہ ہوا۔ آسٹریلیا میں گوشت کوڑیوں کے مول فروخت ہوتا رہا۔ اور بھیڑوں کی کُل قیمت اُن کی اون سے وصول ہوتی رہی جو بمقدارِ کثیر دیگر ممالک کو بھیجی جاتی تھی۔ جب سے انگلستان میں اون کی درآمد شروع ہونے سے مقامی اون کی قیمت گھٹی بھیڑوں کا پالنا بھی کم ہو گیا ساتھ ساتھ تازہ گوشت کی رسد میں بھی تخفیف نمودار ہونے سے اُس کی قیمت میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب گوشت کے لئے ولایت میں بھیڑ کو بہت موٹا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خواہ ایسا کرنے سے اُون کی مقدار اور خوبی میں کچھ کمی اور نقص کیوں نہ آجائے وجہ یہ ہے کہ اب بھیڑ کی قیمت حسبِ سابق اُون سے اس قدر وصول نہیں ہوتی جتنی کہ گوشت سے۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ بالعموم رسدِ مشترک والی چیزوں میں سے

کسی ایک یا بعض کی قیمت کی تبدیلی سے باقی کی قیمت میں برعکس تبدیلی نمودار ہو کر تبدیلیوں کے مجموعی اثر کو بہت معتدل بنا دیتی ہے اور قیمت کی ایسی معکوس تبدیلیاں لازم و ملزوم سی ہوتی ہیں اور جس چیز کی تبدیلی پر قیمت کا اثر غالب ہوتا ہے رسد اسی کی پیروی کرتی ہے، رہیں دوسری چیزیں اضافۂ رسد سے قیمت گھٹتی اور تخفیف سے بڑھ جاتی ہے۔

طلبِ مشترک اور رسدِ مشترک کی طرح طلبِ مرکب کی بھی ہم پلہ رسدِ مرکب ہوتی ہے۔ ایک چیز بنانے میں متعدد چیزیں جدا جدا کام آسکتی ہیں۔ مثلاً کاغذ ہے کہ چیتھڑوں، درخت کی چھالوں اور گھاسوں سے تیار ہوتا ہے۔ چمڑا کپڑا بلکہ چند دز سے کاغذ کا پٹھا بھی جوتوں میں لگایا جاتا ہے۔ رسدِ مرکب والی چیزیں ایک دوسرے کے مقابلے بطورِ بدل کام دے کر ان میں سے ہر ایک کی قیمت کے اضافے میں مانع ہوتی ہیں اور کسی ایک کی قیمت کی تخفیف دوسروں کی تخفیف کا باعث ہو سکتی ہے۔

گیہوں جو چنا جوار باجرا اور مکا جیسے غلّوں کی قیمت کا ایک دوسرے پر برابر اثر پڑتا ہے ایک کی ارزانی سے باقی بھی کم و بیش ارزاں ہو جاتے ہیں اور کسی ایک یا بعض کے اضافۂ قیمت کو باقیوں کی موجودگی کم و بیش روکتی رہتی ہے۔

اس کل باب کا لبِ لباب یہ ہے کہ اگر چیزوں کی قلت محض غیر اختیاری ہے اور اُنکی رسد میں بیشی کمی نہیں ہو سکتی تو اُن کی قیمت قیمتِ طلب کی مطیع رہیگی ورنہ بصورتِ دیگر اُن کی قیمت قلیل مدت کے واسطے تو محض قیمتِ طلب کی پابند ہو سکتی ہے مگر زیادہ مدت کے اندر وہ مصارفِ پیدائش کی بھی پیرو ہو جائے گی، رہیں وہ چیزیں جن کی رسد میں کمی بیشی بحالتِ اجارہ ہوتی ہے، اُن کی قیمت کے اصول سے ہم اگلے باب میں بحث کرتے ہیں۔

رم
ا
تم

باب ہفتم

مقابلہ و اجارہ

(۱) مقابلہ (۲) اجارہ (۳) ٹکس یا امداد کا اجارے پر اثر

کاروبار چلانے کے دو طریق ہیں مقابلہ یا اجارہ کسی زمانے میں اجارے کا بہت رواج تھا، انقلاب فرانس کے بعد سے مقابلے کا زور بندھا۔ آج کل حسب حالات ہر دو طریق مروج پائے جاتے ہیں دونوں میں خوبیاں بھی ہیں اور نقص بھی قطعی طور سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا دشوار ہے۔ ان کے خواص کی ہم ذیل میں مختصر تشریح کرتے ہیں:۔

مقابلہ ۱۔ مقابلے سے کسی کاروبار کی ایسی حالت مراد ہے کہ لوگ بلا روک ٹوک اور دقت اس میں شریک ہو کر اپنے ہم پیشوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کر سکیں حریفوں کے مقابلے میں اپنے کاروبار کو چمکانے کی سو سو ترکیبیں نکالی جاتی ہیں اور ترقی کی جدوجہد یا قانون بقائے اصلح کا دور دورہ رہتا ہے۔

مقابلے کی سب سے بڑی مسلمہ خوبی تو یہ ہے کہ وہ ترقی کا زبردست محرک و معاون ہے۔ میدان کاروبار میں حریفوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کا نتیجہ بیشتر معاشی ترقی ہوتا ہے۔ نت نئی ایجاد و اختراع اور ارزانی اشیا یہ سب مقابلے کا عام نتیجہ

نظر آتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ مقابلہ آزادی پر مبنی ہے اور آزادی ایک نہایت بیش قدر نعمت ہے۔ سوم مقابلہ اپنے پاؤں سے خود چلتا ہے اس کو کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ مقابلہ کاروبار کا قدرتی طریق ہے اس میں ترقی کا جوش اور موقع دونوں پائے جاتے ہیں اور وہ قانون وغیرہ کی عارضی اعانت سے بھی مستغنی ہے۔

جبکہ لوگ طریق اجارہ کی بے عنوانیوں سے تنگ آگئے تھے اور مقابلے کا نیا نیا رواج ہوا تو وہ خوبی مجسم سمجھا جانے لگا۔ لیکن کوئی طریق کیونکر سراسر بے عیب ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصے کے تجربے سے اس میں بھی نقص نمودار ہو گئے حتیٰ کہ ایک گروہ اس کا اس قدر مخالف بن گیا کہ اس کو آلۂ تباہی قرار دیا۔ چنانچہ اشتراک کا منشا انفرادی املاک اور کاروبار ختم کرنے سے مقابلہ روکنا نہیں تو اور کیا ہے۔ سابق مداحوں کی مانند جدید معترض بھی مبالغے سے کام ضرور لیتے ہیں، موافق مطلب پہلو تو دکھائے اور مخالف نظر انداز کر دیئے لیکن اصلیت ہمیشہ غیر جانبدارانہ تحقیق سے دریافت ہوتی ہے خصوصاً معاشی مسائل کی بحث میں تو (۱) "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" کے اصول پر چلنے کی بے حد ضرورت اور گنجائش ہے۔ مقابلے کے چند نقائص جو عملی تجربے سے دریافت ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱- اس میں شک نہیں کہ مقابلے کے دباؤ سے قیمت اشیا گھٹتے گھٹتے مصارف پیدائش کے برابر آ رہتی ہے لیکن خود مقابلے کی وجہ سے اکثر خاص مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں جو مصارف پیدائش میں شمار ہو کر ان کی مقدار اور لہذا قیمت پیداوار بڑھا دیتے ہیں۔ خریداروں کو متوجہ کرنے کے لیئے بڑے بڑے حریف کارخانے لاکھوں بلکہ کروڑہا روپے صرف اشتہارات

اور کلینڈروں پر صرف کر دیتے ہیں مزید برآں ملکوں ملکوں اُن کے ایجنٹ دورہ لگاتے پھرتے ہیں اور ذاتی طور پر مل کر خریداروں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لپٹن کی چاء۔ پیرس کا صابون۔ اسٹیفن کی روشنائی۔ بیچم صاحب کی گولیاں اور ایسے ہی بہت سے اشتہارات ہیں جن سے ہر ریلوے اسٹیشن کے در و دیوار آراستہ رہتے ہیں، جن کے دل کش کیسنڈر ہر دکان پر آویزاں نظر آتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ بعض چیزوں کی قیمت میں مصارفِ اشتہار بقدرِ چہارم پائے گئے اور چونکہ اشتہارات سے بکری بڑھتی ہے کارخانے اس مد میں دل کھول کر دولت لٹاتے ہیں؛

ب۔ جیسا کہ منافع کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے خُردہ فروشوں کی دکانیں زائد از ضرورت کا نتیجہ ہمیشہ اضافۂ قیمت ہوتا ہے۔ گویا اس حالت میں مقابلے سے بجائے ارزانی کے گرانی بڑھتی ہے۔ قصبات کے حلوائی۔ نان بائی تنبولی۔ پنساری۔ بزاز اور جوتے بیچنے والے جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو خریداری گھٹنے کی وجہ سے اُن کو مجبوراً شرحِ منافع بڑھانی پڑتی ہے جس کا لازمی نتیجہ گرانی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ چند پیسے آنے یا زیادہ سے زیادہ دس پانچ روپے کا فی خریدار کاروبار ہوتا ہے لوگوں کو گرانی کمتر محسوس ہوتی ہے؛

اسی اُصول کے لحاظ سے کسی زمانے میں آبادی کے مطابق حلوائیوں اور نان بائیوں کی دکانوں کی تعداد قانوناً مقرر کر دی جاتی تھی۔ آج سے تیس برس قبل

فرانس کے دارالسلطنت شہر پیرس میں ایسی دکانوں کا اوسط فی ۱۸۰۰ باشندہ ایک تھا۔ لیکن آجکل فی ۸۰۰ باشندہ ایک ہے۔ حساب سے تخمینہ لگایا گیا ہے کہ محض دکانات کی کثرت کی بدولت کھانا ۴۰ فی صدی زیادہ گراں فروخت ہوتا ہے پروفیسر لیراؤ بیولو نے اپنی کتاب پولیٹیکل اکانمی میں اس واقعے سے مفصل بحث کی ہے۔

ج۔ تخفیف قیمت کی کوشش کا کبھی کبھی چیز کی خوبی پر نہایت ناپسندیدہ اثر پڑتا ہے۔ بہت سستا مال تیار کیا جاتا ہے جو دیکھنے میں تو عمدہ ہے لیکن برتنے میں ناقص ثابت ہوتا ہے چنانچہ مقابلے کی جنگ میں آمیزش یا ملاوٹ نہایت کارگر آلہ ثابت ہوا ہے۔ گھی کی بجائے تیل اور چربی، تنباکو کی بجائے نہایت مضرت رساں گھاس اور پتے۔ چرم نما کپڑے بلکہ کاغذی، جھوٹے ریشم اور اون کی بجائے درختوں کے ریشے حتیٰ کہ مصنوعی مکھن اور انڈے تک فروخت ہو رہے ہیں۔ اگر اصول بدل کی پیروی میں کوئی نئی چیز بنظر ترقی رائج کی جائے تو مضائقہ نہیں لیکن جبکہ محض سستی قیمت سے خریداروں کو لالچ دلانے کی نیت سے چیزوں کی خوبی برباد کی جائے تو اول تو خود خریداروں کو وہ ناگوار گزرتی ہے دوم اگر نہ بھی گزرے تو اکثر مضر ہونے کی وجہ سے وہ ہر طرح پر قابل اعتراض ہوتی ہے اور ضرورۃً سرکار کو بذریعۂ قانون تعزیری اس کی ممانعت کرنی پڑتی ہے۔ گویا خریدار بھی ہر حالت میں اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتا۔ کبھی سستی چیز بخوبی خرید کر بھی وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتا ہے اور

اسی صورت میں اس کو سرکاری نگرانی اور اعانت کی ضرورت ہوتی ہے سستی گھڑیوں سستے چشموں سستے سگریٹ میں جن کو لوگ شوق سے خریدتے ہیں ہر سال کروڑہا روپیہ ضائع ہوتا ہے اور مقابلتہً خریداروں کو بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ چیزوں کی خوبی برباد کرکے اُن کو ارزاں بنانا اکثر خریدار کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے اور مقابلے کے جوش میں مذکورۂ بالا طرزِ عمل بہت اختیار کیا جاتا ہے:

د۔ مقابلے کے جوش میں کبھی ضرورت سے زیادہ مال تیار کر لیا جاتا ہے اور قانونِ طلب و رسد کے مطابق قیمت پیداوار بہت گھٹ جاتی ہے اور کل حریفوں کو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، خوشحال کارخانے تو اسکے متحمل ہو جاتے ہیں مگر کمزور دم توڑ دیتے ہیں اس طرح پر بہت سا اصل ضائع ہوتا رہتا ہے:

۳۔ مقابلے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے کاروبار کو ہر ممکن لحاظ سے ترقی دینے کی کوشش کرے تاکہ حریفوں کے مقابل بہت سا مال عمدہ اور ارزاں فروخت کر سکے ایسا مقابلہ ہمیشہ معاشی ترقی کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے، اور ملک کے حق میں نہایت مفید ہے۔ دوسرا مقابلہ جس کا بدقسمتی سے رواج بڑھ رہا ہے اصطلاحاً مقابلۂ گلوتراش کہلاتا ہے۔ اسکی خاصیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ایسے مقابلے کا منشا ہر ممکن طریق سے حریف کو زک دینا اور تباہ کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ خود بھی نقصان برداشت کر لیا جاتا ہے تاکہ جب

حریف سے میدان خالی ہو جائے تو موجودہ نقصان کی تلافی بھی ہو سکے اور حسبِ دلخواہ منافع حاصل ہو:

اس مقابلے کا طریق یہ ہے کہ نئے حریف کو پریشان و برباد کرنے کے لیئے مصارفِ پیدائش سے بھی کمتر قیمت پر مال فروخت کرتے ہیں۔ بڑے قدیم کارخانوں کو ایسا کرنے میں بمقابلہ نئے کارخانوں کے دو وجہ سے کم مضرت پہنچتی ہے ان کا مال دور دراز بازاروں تک فروخت ہوتا ہے اور جس بازار میں حریف مقابل ہوتا ہے صرف بھی نرخ گھٹا دیتے ہیں یا اُن کے کارخانوں میں علاوہ سامانِ زیرِ مقابلہ کے اور مال بھی تیار ہوتا ہے اور وہ باقی مال کی سابق قیمت برقرار رکھتے ہیں بلکہ بشرطِ امکان بڑھا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقابلے کا دباؤ نسبتً نئے حریف پر بہت زیادہ پڑتا ہے اور قدیم پر کم۔ طرح طرح کے دباؤ ڈال کر خُردہ فروشوں کو بھی حریف کا مال خریدنے سے روکا جاتا ہے حتیٰ کہ لے دے کر کمپنیوں کے ملازموں سے ساز باز کر لی جاتی ہے کہ اُن کا مال بمقابلہ دوسروں کے جلد روانہ کیا جائے اور تجارت میں وقت ہی بہت بڑی چیز ہے چند گھنٹوں کی عجلت اور تاخیر سے کایا پلٹ ہو جاتی ہے:

صاف ظاہر ہے کہ مقابلۂ گلو تراش اخلاقی سیاسی اور معاشی غرضکہ ہر لحاظ سے مذموم ہے اور سوائے مضرت کے اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا:

س۔ مقابلہ جس کا منشا اجارے کی بیخ کنی ہے کامیاب ہونے پر خود اجارے کی بنا رکھتا ہے

جب کمزور حریف پس پا ہو جاتے ہیں تو کل میدان
چند طاقتور کارخانوں کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے
اور وہ مل کر ایک زبردست جتھا قائم کرتے ہیں اور
باہمی صلاح مشورے سے کاروبار چلاتے ہیں۔
جبکہ اُن کا اقتدار از حد بڑھ جانے سے اندیشے
پیدا ہوتے ہیں تو سرکار کو دست اندازی کرنی پڑتی ہے
یا تو اُن کو خاص قانون کا پابند بنایا جاتا ہے یا سرے سے
کل ایسے کاروبار کو سرکار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔
گویا کاروباری ارتقا کے تین درجے ہوتے ہیں۔
اوّل کاروبار والوں کا مقابلہ۔ دوم ان میں سے
چند کا غلبہ اور تسلط۔ سوم سرکاری نگرانی۔ بعض
لوگوں کا خیال ہے کہ اگر طریق شراکت پر عمل کیا جائے
تو سرکاری اشتراک کی بھی ضرورت کم پڑے۔ شراکت کا
کچھ ذکر اجرت کے تحت میں آچکا ہے۔ اس سے
مفصل طور پر آئندہ صرف دولت کے تحت میں
بحث کریں گے۔

مقابلے کا حسن وقبح تو مختصراً بیان ہو چکا۔ اب ہم ذیل میں
اجارے کے خواص پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اجارہ

۲۔ کسی کاروبار کی یہ حالت کہ وہ صرف ایک یا چند کارخانوں کے
قبضے میں ہو اور نئے لوگ اس کاروبار کو جاری کرنے سے کسی وجہ سے
معذور ہوں اجارہ کہلاتی ہے اجارے کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے
کہ مقدار پیداوار معین کرکے قانون طلب ورسد کے مطابق حسب دلخواہ
قیمت وصول کی جائے۔ اجارہ کئی طرح پر حاصل ہو سکتا ہے۔ اوّل
قانون کے ذریعے سے جبکہ کوئی کاروبار چند مخصوص کارخانوں کے علاوہ
سب کے واسطے قانوناً ممنوع ہو۔ ایسے قانونی اجاروں کی ایک زمانے میں

بہت کثرت تھی اور شاہی عنایت بخشش اکثر یہ شکل اختیار کرتی تھی۔ حق تصنیف وحق ایجاد قانونی اجارے کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دوسرے بذریعۂ معاشی اقتدار کے جبکہ کوئی کارخانہ اپنی عمدہ تنظیم یا اتفاقی سہولتوں کی بدولت سب سے عمدہ اور ارزاں مال تیار کر کے حریفوں سے بازی لیجائے مثلاً کسی کارخانے کے قرب وجوار میں عمدہ سے عمدہ پیداوار خام بکثرت ارزاں مل سکے یا کوئی کارخانہ ذرائع آمدورفت سے قریب واقع ہو اور دیگر حریف کارخانوں کو ایسا عمدہ موقع میسر نہ آسکے یہ سب جائز اجارے کہلاتے ہیں۔ تیسرے ناجائز اجارہ جو اکثر گلوتراش مقابلے سے حاصل کیا جاتا ہے اور جو معاشی ترقی کے منافی ہے۔

اجارے میں پیدائش برپیمانۂ کبیر کے فوائد سے مستفید ہونا بدرجۂ اولی ممکن ہے چنانچہ اگر اجارے میں عالی ہمتی اور بیدار مغزی سے کام لیا جائے تو بہ نسبت مقابلے کے مال زیادہ عمدہ اور ارزاں تیار ہوسکتا ہے چونکہ بحالت اجارہ مقدار پیداوار کا تعین ممکن بلکہ اغلب ہے۔ پیداوار کا نرخ بہ نسبت مقابلے کے اجارے میں بہت زیادہ کارخانوں کے اختیار میں ہوتا ہے۔ گویا مقدار بڑھا گھٹا کر وہ قیمت میں اضافہ کرسکتے ہیں ان دونوں خواص کو مدنظر رکھتے ہوئے اب دیکھنا یہ ہے کہ اجارہ کن حالتوں میں مفید اور کن حالتوں میں مضر ہونا چاہیئے اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ مصنوعات بالعموم قانون تکثیر حاصل کے تابع ہوتی ہیں۔ گویا پیدائش برپیمانۂ کبیر کے فوائد ان میں بہت زیادہ حاصل ہوتے ہیں اور نیز چونکہ وہ بیشتر داخل تعیشات ہیں ان کی طلب بہت کچھ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ یعنی قیمت کے تھوڑے اضافے یا تخفیف سے ان کی طلب بہت کچھ گھٹ بڑھ جاتی ہے نتیجہ یہ کہ ایسی مصنوعات اجارے کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں۔ اول تو قانون تکثیر حاصل کی بدولت مقدار پیداوار بڑھنے سے مصارف پیدائش خود گھٹ جاتے ہیں

مرکز عمل

حصۂ چہارم
باب پنجم

دوم تغیّر پذیری طلب اضافۂ قیمت کی بجائے تخفیف کی ترغیب دیتی ہے اس کا باعث وہی اصول ہے "منافع کم اور بکری زیادہ" جو آجکل کے کاروباری ترقی کا بہت بڑا گر ہے اور جس کی منافع کے تحت میں تشریح کی جا چکی ہے۔ گویا اس صورت میں شرحِ منافع تو ادنےٰ لیکن مقدارِ منافع بہت اعلیٰ رہتی ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کارخانہ دار کو مقدار سے غرض ہوتی ہے نہ کہ شرح سے چنانچہ حوصلہ مند اجارہ دار نیئے نیئے سامان اور اُن میں نئی نئی خوبیاں پیدا کر کے خریداروں کا دل لبھاتے ہیں اور اپنی چیزوں کے رواج اور استعمال بڑھانے کی غرض سے ان کو برائے نام قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور جب اُن کی طلب وسیع اور مستقل ہو جاتی ہے تو ایسے ادنیٰ نرخ سے بڑے بڑے منافع پاتے ہیں اور چونکہ کسی حریف کے حصے بانٹنے کا خوف نہیں ہوتا یہ سب کچھ کرنے میں انھیں بہت سہولت اور اطمینان ہوتا ہے:

حاصلِ کلام یہ کہ تعیّشات جو بالعموم قانونِ تکثیرِ حاصل کے پابند ہوتے ہیں اور جن کی طلب تغیّر پذیر ہوتی ہے اجارے کے واسطے بہت موزوں ہیں:

زراعت میں پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد کی گنجائش بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس میں قانونِ تکثیرِ حاصل کا عمل ضعیف ہوتا ہے اور اجارہ دار کو مقدارِ پیداوار بڑھانے سے مصارفِ پیدائش میں کوئی قابلِ لحاظ تخفیف نہیں ہوتی۔ اس پر طرّہ یہ کہ زرعی پیداوار سے اکثر ناگزیر ضروریات متعلق ہیں جن کی طلب غیر تغیّر پذیر ہوتی ہے یعنی جن کی قیمت بڑھنے گھٹنے سے بھی طلب میں کوئی خاص کمی بیشی نہیں ہوتی پس زرعی پیداوار اور نیز ایسی مصنوعات کو جو قانونِ تکثیرِ حاصل کی بہت کم تابع ہوں اور جو ناگزیر ضروریات میں داخل ہوں اجارے کیواسطے ازحد ناموزوں ہیں اُن کے اجارے میں مقدارِ پیداوار گھٹنے اور قیمت

بڑھنے کا سمت اندیشہ لاحق ہے یہی وجہ ہے کہ غلے اور روئی وغیرہ کے اجارے کی جب کبھی تجویز سننے میں آتی ہے تو دنیا کے ہر گوشے سے مخالفت کی آواز بلند ہو جاتی ہے ؛

حاصل کلام یہ کہ تنعمات کے اجارے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اکثر فائدہ رہتا ہے مگر ناگزیر ضروریات کا اجارہ سراسر خلاف مصلحت و دور اندیشی ہے اس فرق کا باعث قانون تکثیر حاصل کے عمل و تعطل اور طلب کی تغیر پذیری و غیر تغیر پذیری میں مضمر ہے ؛

پیداوار کی مختلف مقداروں کی قیمت رسد و قیمت طلب بھی مختلف ہوتی ہے ۔ مثلاً اگر پیداوار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہے تو تھوڑی مقدار کی قیمت رسد ادنیٰ اور بڑی مقدار کی اعلیٰ ہو گی لیکن اگر وہ قانون تکثیر حاصل کی پابند ہو تو معاملہ برعکس ہو گا یعنی کمتر مقدار کی قیمت رسد اعلیٰ اور بیشتر کی ادنیٰ ہو گی ۔ رہی قیمت طلب سو اس کا یہی ایک عام اصول ہے کہ مقدار رسد گھٹنے بڑھنے سے قیمت طلب بڑھتی گھٹتی ہے ۔ مقابلے کی حالت میں تو پیداوار کی مقدار معین کرنا محال ہے ۔ ہر شخص اپنے کاروبار کی ترقی چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ مقدار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے کبھی پیداوار کی اس قدر کثرت ہو جاتی ہے کہ قیمت طلب قیمت رسد سے بھی گھٹ جاتی ہے اور اکثر حریفوں کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے ۔ لیکن اجارے کی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اس میں مقدار پیداوار کا تعین ممکن ہے ۔ اور قیمت طلب کا قیمت رسد سے اعلیٰ برقرار رکھنا سہل ہے ۔ قیمت رسد میں مصارف پیدائش کی کل مدیں یعنی قیمت پیداوار خام ۔ اجرت ۔ سود ۔ مطالبات فرسودگی و خطر و ضمانت وغیرہ شامل ہوتی ہیں قیمت طلب کی بیشی سے جو صرف بحالت اجارہ ممکن ہے جو کچھ ماحصل زائد ہاتھ لگے وہ اصطلاحاً ماحصل اجارہ کہلاتا ہے بالفاظ دیگر مقابلے میں تو قیمت طلب بالعموم قیمت رسد کے برابر

رہتی ہے۔ چنانچہ قیمت کی بحث میں اس واقعے کی تشریح بھی ہو چکی ہے۔ لیکن اجارے میں قیمت طلب کا قیمت رسد سے بڑھا چڑھا رہنا ممکن ہے اور ان دونوں کا فرق ماحصل اجارہ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً کسی چیز کی قیمت رسد ۵ آنے ہے اس قیمت میں کل مصارف پیدائش شامل ہیں مقابلے کے دباؤ سے تو اس کا نرخ ۵ آنے کے قریب قریب رہے گا۔ لیکن بحالت اجارہ اس کا نرخ ۶؍ یا اس سے بھی زیادہ رہنا ممکن ہے۔ قیمت رسد ۵ آنے اور قیمت طلب ۶؍ کا فرق ا جو محض اجارے کا طفیل سمجھنا چاہیئے ماحصل اجارہ ہوا۔ ہر اجارہ دار کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کو بیشترین ماحصل اجارہ ملے مختلف مقدار پیداوار قیمت طلب میں سے قیمت رسد منہا کرنے پر یہ دریافت ہو سکتا ہے کہ کون مقدار پیدا کرنے پر ماحصل اجارہ کی بیشترین تعداد ہاتھ لگے گی۔ ذیل میں ہم بائیسکل کے اجارہ دار کارخانے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ بائیسکل بوجہ مصنوعات ہونے کے قانون تکثیر حاصل کے ضرور تابع ہوگی اور صرف ایسی ہی چیزیں اجارے کے واسطے بھی موزوں ہوتی ہیں:-

تعداد بائیسکل	قیمت رسد	قیمت طلب	ماحصل اجارہ
۱۰۰۰	۱۷۰	۲۰۰	۳۰۰۰۰
۸۰۰۰	۱۷۱	۱۷۵	۳۲۰۰۰
۲۰۰۰۰	۱۶۳	۱۶۵	۴۰۰۰۰
۳۵۰۰۰	۱۴۹	۱۵۰	۳۵۰۰۰

اوپر کی مثال سے واضح ہوگا کہ ۲۰۰۰۰ بائیسکل بنانے میں کارخانہ دار کو سب سے زیادہ ماحصل اجارہ یعنی ۴۰۰۰۰ روپیہ حاصل ہوتا ہے۔ پس وہ اسی تعداد پر قائم رہے گا نہ اس کو گھٹائیگا نہ بڑھائیگا اور اگر تبدیلی حالات کی بدولت کسی دوسری تعداد سے اور بھی زیادہ ماحصل اجارہ حاصل ہوا تو اسی کو اختیار کرلیگا۔ غرضکہ تجربے کی مدد سے

حصۂ چہارم
باب بستم

وہ ایسی تعداد تلاش کریگا جو اس کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہو یعنی جس سے بیشترین مقدار حاصل اجارہ ہاتھ لگے۔ اوپر کی مثال پر یہ اعتراض بیجا نہ ہوگا کہ اس میں حسب طلب اعداد لئے گئے ہیں جیسا ہے کوئی اعداد لئے جائیں ایک تعداد ضرور ایسی نکلے گی جس سے حاصل اجارہ کی سب سے بڑی مقدار حاصل ہو۔

سرکار کبھی اس خیال سے کہ اجارہ دار کو بہت کچھ منافع ہوتا ہے اس پر ٹکس قائم کرتی ہے اور کہیں کسی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی غرض سے اجارہ دار کو اپنی طرف سے مالی امداد دیتی ہے تاکہ اس کی ہمت افزائی ہو اور کاروبار عروج پکڑے۔ جن خوش قسمت ملکوں کو خود اختیاری حکومت حاصل ہے وہاں ایسی امداد کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے خصوصاً امریکہ اور جاپان نے اس طریق سے اپنے ہاں کی صنعت وحرفت کو بجد ترقی دی ہے ایسی امداد کا اگر سرکار پر کچھ روز بار بھی پڑتا ہے تو مابعد معاشی ترقی اور عام خوشحالی سے اس کی ہزارگنی تلافی ہوجاتی ہے۔ اس امداد کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ کسی نازک اور کمزور پودے کو لکڑی کا سہارا دیا جائے حتّی کہ اُس کی جڑ مضبوط اور تنہ موٹا ہوجائے اور وہ پھلنے پھولنے لگے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ٹکس یا سرکاری امداد کا اجارے کی پیداوار اور اُس کی قیمت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ واضح ہو کہ تعینِ ٹکس یا امداد کے حسب ذیل تین اصول ہو سکتے ہیں:

ا۔ مقدار ٹکس یا امداد معین ہو مثلاً دس ہزار روپے۔

ب۔ ٹکس یا امداد بحساب حاصل اجارہ کچھ فی صدی مقرر ہو مثلاً ۱۰ فی صدی حاصل اجارہ۔

ج۔ ٹکس یا امداد بحساب مقدار پیداوار مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ فی بائیسکل۔

ان تینوں اصول کے مطابق ٹکس یا امداد مقرر کرنے سے

مذکورالصدر مثال میں حسب ذیل فرق نمودار ہوگا:-

تعداد بائیسکل	۱۰۰۰	۸۰۰۰	۲۰۰۰۰	۳۵۰۰۰
ماحصل اجارہ قبل ٹکس یا امداد	۳۰۰۰	۳۲۰۰۰	۴۰۰۰۰	۳۵۰۰۰
ماحصل اجارہ بعد ٹکس بقدر ۱۰ ہزار	۲۰۰۰۰	۲۲۰۰۰	۳۰۰۰۰	۲۵۰۰۰
″ ″ بعد امداد ″	۴۰۰۰۰	۴۲۰۰۰	۵۰۰۰۰	۲۵۰۰۰
″ ″ بعد ٹکس بشرح ۱۰ فی صدی	۲۷۰۰۰	۲۸۸۰۰	۳۶۰۰۰	۳۱۵۰۰
″ ″ بعد امداد بشرح ″ ″	۳۳۰۰۰	۳۵۲۰۰	۴۴۰۰۰	۳۸۵۰۰
″ ″ بعد ٹکس بشرح عہ/ فی بائیسکل	۲۹۰۰۰	۲۴۰۰۰	۲۰۰۰۰	×
″ ″ بعد امداد ″ ″ ″	۳۱۰۰۰	۴۰۰۰۰	۶۰۰۰۰	۷۰۰۰۰

اس دوسری مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اگر پہلے دو اصول کے مطابق ٹکس یا امداد مقرر کی جائے تو پیداوار کی مقدار اور قیمت میں کوئی ردوبدل نہ ہوگا جس مقدار سے اجارہ دار کو قبل ٹکس یا امداد سب سے زیادہ ماحصل اجارہ ملتا تھا اسی سے اب بھی بعد ٹکس یا امداد ملے گا۔ یعنی جبکہ ٹکس یا امداد کی مقدار دس ہزار معین ہو تو بیس ہزار بائیسکل کا ماحصل اجارہ چالیس ہزار علی الترتیب گھٹ بڑھ کر تیس ہزار و پچاس ہزار ہو جائے گا۔ اور جیسا کہ قبل ٹکس یا امداد یہ ماحصل باقی تعدادوں کے ماحصل سے زیادہ تھا۔ ایسا ہی بعد تبدیلی مذکورۂ بالا اب بھی مقابلۃً سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح پر اگر ٹکس یا امداد بحساب ماحصل اجارہ ۱۰ فی صدی مقرر ہو تو بیس ہزار بائیسکل کا چالیس ہزار ماحصل اجارہ علی الترتیب گھٹ بڑھ کر ۳۶ ہزار اور ۴۴ ہزار ہو جائے گا۔ لیکن دونوں تبدیلیوں کے بعد بھی وہ دوسرے ماحصلوں سے اسی طرح پر بڑھا رہے گا جیسا کہ قبل ٹکس یا امداد بحالت چالیس ہزار تھا۔ چنانچہ دوسری تعدادوں کی تبدیلی شدہ ماحصلوں سے مقابلہ کرنے پر یہ بخوبی واضح ہو جائے گا۔

اب رہا تیسرا اصول یعنی جبکہ ٹکس یا امداد بحساب مقدار پیداوار

مقرر ہو اس کا عمل ذرا پیچیدہ ہے اوپر کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اس اصول کے مطابق ٹکس قائم کرنے کا نتیجہ مقدار پیداوار میں تخفیف اور قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صرف پانچ سو کا ٹکس قائم ہونے پر بجائے بیس ہزار کے ایک ہزار پانچ سو کا ماحصل اجارہ سب سے بڑھ گیا۔ اس کے برعکس اس اصول کے مطابق امداد دینے سے مقدار پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور قیمت میں تخفیف اوپر کی مثال میں صرف پانسو کی امداد دینے سے بیس ہزار کی بجائے ۲۰ ہزار پانسو کا ماحصل اجارہ سب سے بڑھ گیا اس اصول سے جو ماحصلوں میں فرق نمودار ہوا ہے اُن کا مقابلہ کرنے پر آخر الذکر دونوں مقولوں کی صحت بھی بخوبی واضح ہو جائے گی۔

اجارے پر ٹکس یا امداد مقرر کرنے کا مقدار پیداوار اور قیمت پر جو اثر پڑتا ہے وہ اوپر کی دو مثالوں سے بالتفصیل واضح کیا جا چکا ہے۔ اس طویل بحث کا لُبِ لُباب بغرض یاد دہانی ہم ذیل میں پھر پیش کرتے ہیں:

آجر کو ہمیشہ ماحصل اجارہ کی بیشترین مقدار مطلوب ہوتی ہے ایسا ماحصل قیمتِ طلب کی قیمتِ رسد پر بیشی سے حاصل ہوتا ہے ایسی بیشی صرف بحالتِ اجارہ برقرار رہ سکتی ہے۔ نہ مقابلے میں دونوں قیمتیں مساوی ہو جاتی ہیں ٹکس یا امداد تین اصول پر قرار دی جا سکتی ہے:-

اوّل۔ مقدار معین مثلاً دس ہزار ٹکس یا امداد۔

دوم۔ ماحصلِ اجارہ کے حساب سے کچھ فی صدی مثلاً ماحصل کا دس فی صدی ٹکس یا امداد۔

سوم۔ مقدار پیداوار کے حساب سے کوئی شرح مثلاً عہ/ فی شئے ٹکس یا امداد۔

حصہ چہارم
باب ہفتم

جب کہ ٹکس یا امداد پہلے یا دوسرے اصول کے مطابق مقرر کی جائے تو جس مقدارِ پیداوار سے قبل ٹکس یا امداد بیشترین ما حصل اجارہ ملتا تھا۔ اسی سے اب بھی ملے گا۔ کاروبار اپنی سابق حالت پر قائم رہے گا نہ مقدارِ پیداوار میں کوئی تبدیلی ہوگی نہ قیمت میں۔ لیکن تیسرے اصول کے عمل کی حالت پہلے دو سے بالکل مختلف ہے اگر اس اصول کے مطابق ٹکس قائم کیا جائے گا تو بیشترین ما حصل اجارہ حاصل کرنے کے لیئے اجارہ دار کو غالباً مقدارِ پیداوار گھٹا کر قیمت بڑھانی پڑے گی اس کے برعکس اگر امداد دی جائے تو اجارہ دار کو مقدارِ پیداوار بڑھانے اور قیمت گھٹانے سے بیشترین ما حصل اجارہ ہاتھ آئیگا۔ المختصر اگر ٹکس یا امداد کی مقدار معین ہو یا اس کی شرح بحساب ما حصل اجارہ قرار پائے تو کاروبار میں کوئی تغیر نہ ہوگا لیکن اگر ٹکس بحسابِ مقدارِ پیداوار مقرر ہو تو غالباً پیداوار گھٹ کر قیمت بڑھ جائے گی اور اگر امداد بحسابِ مقدارِ پیداوار قرار پائے تو پیداوار بڑھ کر قیمت گھٹ جائیگی؀

اب صرف ایک نکتے کا واضح کرنا باقی ہے وہ یہ کہ پہلے اور دوسرے اصول کا عملدرآمد تو عام ہے ان کے مطابق ٹکس یا امداد مقرر کرنے کا نتیجہ ہر حالت میں وہی نکلیگا جو اوپر بیان کیا گیا لیکن تیسرے اصول کا عمل دو شرطوں کا پابند ہے اور بعض حالتوں میں اُسکے مطابق ٹکس یا امداد مقرر کرنے کا نتیجہ وہ نہیں نکل سکتا جو بیان کیا گیا۔ وہ شرطیں یہ ہیں۔ اوّل تو بیشترین ما حصل اجارہ والی مقدارِ پیداوار اور اُس کے ماسبق و مابعد مقداروں میں بہت زیادہ فرق ہو لیکن اُن کے ما حصلوں میں فرق بہت تھوڑا ہو۔ دوم شرحِ ٹکس یا امداد ذرا اعلیٰ ہو۔ اگر حالت ان شرائط کے برعکس ہو یعنی پیداوار کی مقداروں میں تو فرق کم ہو اور ما حصلوں میں زیادہ اور شرحِ ٹکس یا امداد بھی ادنیٰ ہو تو تیسرے اصول کے مطابق مقرر کیئے ہوئے ٹکس یا امداد کا وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جو اوپر بیان کیا گیا

بلکہ وہ بھی اصول اوّل و دوم کے نتیجے کے مثل ہوگا۔

ٹکس یا امداد اور اجارے کا تعلق درحقیقت ایک دقیق بحث ہے جو حتّی الوسع سلاست کے ساتھ پیش کی گئی۔ ناظرین کو چاہیئے کہ بطورِ خود مثالیں بنا بنا کر مذکورۂ بالا نتائج کی صحت کو جانچیں اس طرح یہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہو سکے گا۔

باب بست و یکم

زر

(۱) مبادلے کی دقتیں (۲) زر کا مفہوم (۳) زر کے کام

مبادلے کی دقتیں قیمت کی بحث کے شروع میں سمجھایا جاچکا ہے کہ عمل مبادلہ کیونکر اور کس لیئے خرید و فروخت میں منقسم ہوا۔ اسی مسئلے کی ہم یہاں مزید تشریح کرنا چاہتے ہیں مبادلے سے مراد ہے دو یا زیادہ چیزوں کا ایک دوسری سے ادل بدل کرنا مثلاً اگر کسی کو گھڑی دے کر اس سے معاوضے میں کتاب لی جائے چاقو دے کر چھڑی لی جائے، باغ دے کر مکان لیا جائے تو چیزوں کا اس طرح پر براہِ راست ادل بدل اصطلاحاً مبادلہ کہلاتا ہے کسی زمانے میں جبکہ انسانی ضروریات انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں اور ہر خاندان یا گاؤں بیشتر ضروریات کا خود کفیل تھا۔ کاروبار مبادلے سے چلا کیا لیکن معاشی ترقیات کے ساتھ جوں جوں تجارت کی گرم بازاری ہوئی مبادلہ ناقابل عمل ثابت ہونے لگا خصوصاً تین ایسی لاعلاج دقتیں نمودار ہوئیں کہ کاروبار چلنا محال ہوگیا:۔

۱۔ اوّل عدمِ مطابقت ضروریات یعنی ایسے مبادلہ خواہوں کا اجتماع شاذونادر ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی چیز دوسرے کو مطلوب ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ جو چیز زید کو درکار ہے وہ عمرو مبادلے میں دینے کو آمادہ ہو لیکن جب تک وہ چیز جو زید معاوضے میں

دینا چاہیے عمرو کو درکار نہ ہو مبادلہ کیونکر ممکن ہے۔ مبادلے کے واسطے عمرو کی چیز زید کو اور زید کی عمرو کو مطلوب ہونا لازمی ہے جبکہ لاتعداد چیزوں کی تجارت یوں عالمگیر ہو تو مبادلہ خواہوں کی مطلوبہ چیزوں کا ایسا اتفاق اگر ناممکن نہیں تو نادر الوجود ضرور ہے پس ماندہ ممالک کے باشندوں کی ضروریات گنی چنی ہوتی ہیں اور سیاح اُن کی اکثر مطلوبہ چیزیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں لیکن پھر بھی بعض وقت اُن کو مبادلے میں عجیب پُرلطف دقّت اُٹھانی پڑتی ہے۔ چنانچہ ایک سیاح لفٹننٹ کیمرن نے افریقہ میں ایک کشتی خریدنے کی سرگزشت یوں تحریر کی ہے۔ میں سید کی کشتی لینا چاہتا تھا۔ لیکن سید کو اس کے معاوضے میں ہاتھی دانت مطلوب تھا جو کہ میرے پاس نہ تھا پتا چلا کہ محمد ابن ثابت ہاتھی دانت دینا چاہتا ہے مگر اُس کو ایک قسم کا کپڑا درکار تھا اور سوءِ اتفاق سے وہ بھی اُس وقت میرے پاس نہ تھا۔ پھر خبر ملی کہ محمد ابن غریب کے پاس وہ کپڑا موجود ہے اور اس کے معاوضے میں وہ تار چاہتا ہے خوش قسمتی سے تار میرے پاس موجود تھا۔ چنانچہ میں نے محمد ابن غریب کو تار دیدیا۔ اس نے محمد ابن ثابت کو کپڑا دیا اس نے سید کو ہاتھی دانت دیا اور سید نے مجھ کو کشتی دے دی اور یوں حسنِ اتفاق سے کام جلد اور بآسانی بن گیا۔ ورنہ اس سے بھی زیادہ طوالت ممکن تھی؛

جہاں ضروریات اس قدر سادہ اور مختصر ہیں جیسے وہاں بادیے میں

حصّہ چہارم
باب بست و یکم

یہ طوالت و دقّت پیش آئی تو ترقّی یافتہ ممالک میں جہاں تجارت نہایت سرگرم اور وسیع ہوتی ہے۔ مبادلے کا سراسر نا قابل عمل ہونا ظاہر ہے۔

ب۔ دوم معیارِ نرخ کی عدم موجودگی۔ جبکہ بہت سی چیزوں کا براہِ راست مبادلہ ہو تو مختلف چیزوں کے حساب سے ایک ہی چیز کے کئی نرخ رہ سکتے ہیں اور جن کو اس فرق کا پتا چل جائے وہ بہت کچھ نفع کما سکتے ہیں۔ مبادلے میں کسی ایک چیز کا باقی کُل چیزوں کے حساب سے یکساں نرخ قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ ہر ایک چیز کا باقی کُل چیزوں کے حوالے سے نرخ دریافت کر کے ایسے کُل نرخوں کا مقابلہ کرنا اور اُس میں یکسانی پیدا کرنی کیا کچھ آسان کام ہے؟ حساب سے معلوم ہوگا کہ سَو چیزوں کے مبادلے میں پورے ۴۹۵۰ نرخوں پر غور کر کے ان سب میں تناسب پیدا کرنے پر کہیں ان چیزوں کے نرخ میں یکسانی قائم ہو سکتی ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ کسی ایک چیز کے بھی نرخ تبدیل ہونے سے باقی چیزوں کے نرخ کو از سرِ نو دریافت کرنا ضروری ہے ورنہ پھر وہی فرق پیدا ہو جائیگا۔ یہ بحث ذرا دقیق ہے ایک سادہ مثال سے اس کو واضح کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ چیزوں کے نرخ حسب ذیل ہیں اور کسی معیار کے نہ ہوتے ہوئے نرخوں میں ایسا خلافِ بحث نہ صرف ممکن بلکہ اغلب ہے۔

ایک من گیہوں = ۴ سیر گھی   ایک سیر گیہوں = ۲ سیر نمک
ایک سیر شکر = ۴ سیر نمک   ایک من " = ۲۰ سیر دودھ
ایک سیر گھی = ۴ سیر شکر   ایک سیر شکر = ۳ سیر دودھ
ایک من دودھ = ۵ سیر گھی   ایک سیر گھی = ۱۲ سیر نمک
ایک سیر شکر = ۴ سیر گیہوں   ایک سیر دودھ = ۳ سیر نمک

اس مثال پر غور کرنے سے واضح ہو گا کہ ہر چیز کے کئی کئی نرخ جاری ہیں اور چونکہ کوئی معیار مقرر نہیں جس سے سب نرخوں کا مقابلہ کیا جا سکے ۔ نرخوں کا فرق دریافت کرنا دشوار ہے ؛

ج۔ سوم دقت تسہیم اشیا بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان کے چھوٹے حصے ہو سکتے ہیں مثلاً غلہ ۔ دودھ یا کپڑے کی کوئی مقدار ۔ ایسی چیزوں کا ضروری حصہ مبادلے میں دینا آسان ہے لیکن بعض چیزیں حصوں میں تقسیم نہیں ہو سکتیں یا منقسم ہونے سے وہ ناکارہ ہو جاتی ہیں مثلاً جانور ۔ سیئے ہوئے کپڑے برتن کشتی ۔ گاڑی وغیرہ ۔ ایسی چیزوں کے مبادلے میں بڑی دقت پیش آتی ہے کہ اُن کا مالک اگر اُن سے کمتر قدر والی چیز معاوضے میں لے تو اس کو اپنی پوری چیز دینی پڑتی ہے مثلاً اگر ایک گاڑی کے معاوضہ تین گھوڑے ہوں لیکن صرف دو گھوڑے دستیاب ہو سکیں تو اُن کے معاوضے میں پوری گاڑی دینی ہو گی بقدر دو ثلث نہیں دی جا سکتی فرض کرو کہ ہم کو ایک ۱۲ آنے کا ریلوے ٹکٹ خریدنا ضروری ہے اور اس وقت روپے کے دام میسر نہ آ سکیں تو ہم کو مجبوراً ایک روپیہ ہی دینا پڑے گا ۔ یہ ممکن نہیں کہ روپیہ تراش کر بقدر ایک چہارم ہم بچالیں چنانچہ بعض ٹکٹ بابو عین عجلت کے وقت دام دینے سے انکار کر دیتے ہیں مضطرب مسافر سے بند ہے روپے وصول کر کے زائد دام خود ہضم کر جاتے اس لئے تجربہ کار مسافر اکثر روپے کے دام بھنا کر گھر سے لے جاتے ہیں ؛

حصّہ چہارم
باب بست و یکم

۲ - اوپر کی بحث سے ثابت ہوا کہ مبادلہ یعنی چیزوں کا چیزوں سے براہِ راست ادل بدل کرنا کاروبار کے واسطے نہایت دِقّت آمیز اور ناموزوں ہے لہٰذا مبادلے کے واسطے ایک تیسری چیز بطور آلہ ایجاد کی گئی جس کو اصطلاحاً زر کہتے ہیں گویا زر سے مراد ایسی کوئی چیز ہے جو بطورِ آلۂ مبادلہ استعمال ہو۔ یعنی جس کو ہر شخص بلا تامل اپنی چیز کے معاوضے میں قبول کر لے، اپنی چیز کو زر کے معاوضے میں دینا فروخت کہلاتا ہے اور زر کے معاوضے میں کوئی چیز لینے کو خرید کہتے ہیں، اس طرح ہر مبادلے کا عملِ واحد اب خرید و فروخت کے دو عملوں میں منقسم ہوگیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ خرید و فروخت فی نفسہٖ دو جداگانہ مبادلے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ان مبادلوں میں ایک وہ چیز شامل ہے جسکی مقبولیت عام ہے اور جس کو زر کہتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ واضح کرنا خالی از لطف نہ ہوگا، وہ یہ کہ ہر خرید میں ایک ماسبق فروخت اور ہر فروخت میں ایک مابعد خرید مضمر ہوتی ہے۔ یعنی جس روپے سے ہم کوئی چیز خریدتے ہیں وہ کوئی چیز پہلے فروخت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جب ہم کوئی چیز فروخت کرتے ہیں تو اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ آئندہ کبھی نہ کبھی ہم اس کی قیمت سے کوئی اور چیز خریدیں یہ ممکن ہے کہ مذکورالصّدر ہر دو عملوں کے درمیان بہت زمانہ گزر جائے لیکن یہ ترتیب بالا ان کا ظہور یقینی ہے۔ اس نکتے سے بھی زر کی اصلیت پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ زر محض ایک آلہ ہے جس نے بغرض سہولت مبادلے کو خرید و فروخت کے دو جداگانہ عملوں میں تقسیم کر دیا ہے ورنہ درحقیقت کل کاروبار کا منشا صرف مبادلہ ہے اور ہر خرید یا فروخت میں جداگانہ بھی مبادلہ مضمر ہے۔

زر کے کام

۳ - (۱) - زر کا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ وہ بطورِ آلۂ مبادلہ استعمال ہوتا ہے، اسی کی وساطت سے خرید و فروخت

ہوتی ہے۔ کاروبار چلتا ہے اپنی چیز کے معاوضے میں ہر شخص اس کو اس وجہ سے قبول کر لیتا ہے کہ اس کو معلوم ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کو اسی طرح اپنی چیزوں کے معاوضے میں بلا عذر قبول کر لیں گے بالفاظِ دیگر اپنی چیز لوگ اس وجہ سے بمعاوضہ روپیہ فروخت کر دیتے ہیں کہ ان کو یقین ہے کہ جب چاہیں گے اس روپے سے حسبِ دلخواہ چیز خرید سکیں گے؛

ب۔ جب زر کثرت سے خرید و فروخت میں استعمال ہونے لگا تو چیزوں کے نرخ کا مقابلہ ہوا۔ نہایت آسان ہو گیا اور ہر چیز کا ایک نرخ قائم ہو گیا یہ نہیں کہ کسی چیز کے حوالے سے نرخ کچھ ہو اور کسی سے کچھ جیسا کہ بحالتِ مبادلہ ممکن بلکہ اغلب تھا مثلاً بعد رواجِ زر چیزوں کے نرخ حسبِ ذیل ظاہر کئے جائیں گے؛

ایک روپیہ = ایک سیر گھی	ایک روپیہ = ۱۰ سیر گیہوں
ایک روپیہ = ۴ سیر شکر	ایک روپیہ = ۱۶ سیر نمک
ایک روپیہ = ۸ سیر دودھ	

اس مثال میں ایک معیار یعنی روپیہ معیّن ہونے سے فوراً تحقیق ہو گیا کہ ایک سیر گھی ۴ سیر شکر ۸ سیر دودھ ۱۰ سیر گیہوں اور ۱۶ سیر نمک ایک دوسرے کے ہم قدر ہیں۔ گویا اگر زر کے حوالے سے چیزوں کا نرخ معین کر کے ان کا مبادلہ بھی کیا جائے تو فرقِ نرخ وغیرہ باقی نہیں رہتا حاصلِ کلام یہ کہ زر کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ بطورِ معیارِ قدر استعمال ہوتا ہے؛

ج - زر خزینۃ القدر بھی کہلاتا ہے، اس کے یہ معنی ہیں بہت زیادہ قدر - زر کی چھوٹی سی مقدار میں جمع ہو جاتی ہے اور مروجہ زر میں یہ صفت بدرجۂ اعلیٰ پائی جاتی ہے - مثلاً سو اشرفیاں، جن کو بسہولت ہم جیب میں رکھ سکتے ہیں ہزار ہا من غلے یا ہزاروں گز کپڑے کی ہم قدر ہوتی ہیں ان سے اتنا لوہا یا پتھر خریدا جا سکتا ہے کہ اس کے اٹھانے کے واسطے صد ہا چھکڑے درکار ہوں دوسرے لحاظ سے بھی یہ صفت زر کے واسطے مخصوص ہے - مروجہ زر مثل سونا چاندی بمقابلہ بے شمار چیزوں کے بہت سا زیادہ دیرپا ہے - گویا سریع الزوال چیزوں میں تو قدر جلد زائل ہو جاتی ہے - لیکن زرسی دیرپا چیز میں قدر عرصۂ دراز تک برقرار رہتی ہے؛

اس میں شک نہیں کہ ہیرے جواہرات ایسی قیمتی چیزوں میں بھی ہر دو مذکورۂ بالا صفات پائی جاتی ہیں لیکن زر کو ان پر بھی فوقیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ مبادلے میں ان کا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا کہ زر کا ہوتا ہے؛

آگے چل کر بعنوان قدر زر ہم بالتفصیل واضح کریں گے کہ اگرچہ سونے کی شکل میں زر کی قدر بہت ثبات پذیر ہے لیکن پھر بھی اس میں نہایت آہستہ آہستہ تغیر یعنی کمی ظہور پذیر ہو رہی ہے لیکن اگر سونے کی بجائے کوئی اور چیز بطور زر مستعمل ہوتی تو غالباً اسکی قدر اور بھی زیادہ تغیر پذیر ہوتی - اس واقعے سے زر فلزی کے تحت میں بحث کی جائے گی یہاں صرف اشارہ کافی ہے؛

زر کی ضرورت واضح کرنے کے بعد اب ہم آئندہ دو بابوں میں زر کی قسموں سے بحث کریں گے؛

باب بست و دوم

زرِ فلزاتی

(۱) عمدہ زر کے خواص (۲) سکہ (۳) اصول اجرائے سکہ

عمدہ زر کے خواص

۱۔ یوں تو بہت سی چیزیں بطور زر استعمال ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں لیکن اس کام کے واسطے وہ چیزیں نہایت موزوں ہیں جن میں خواص ذیل موجود ہوں چنانچہ ان ہی خواص کی بدولت سونا چاندی اور تانبا کل ترقی یافتہ ممالک میں بالاتفاق زر کے واسطے منتخب کر لئے گئے ہیں اور صرف پسماندہ ملکوں میں ان کی بجائے اور چیزوں کا زر رائج ہے لیکن معاشی ترقی کے بعد سونے چاندی اور تانبے کے زر کا رواج وہاں بھی یقینی ہے۔

عمدہ زر کے خواص یہ ہیں:۔

ا۔ قدر ذاتی
ب۔ نقل پذیری
ج بے زوالی
د۔ ثبات قدر
ہ۔ یک جنسی
س۔ سہم پذیری
ص۔ شناخت پذیری

ا۔ عمدہ زر کی پہلی خاصیت یہ ہے کہ اس میں قدر ذاتی

موجود ہو یعنی جو چیز بطورِ زر استعمال ہو لوگ اُس کے بہت خواہشمند اور طالب ہوں چنانچہ ہر زمانے اور ملک میں وہی چیزیں بطورِ زر مستعمل پائی گئی ہیں جو عام طور پر پسند کی جاتی تھیں اور ایسا ہونا کچھ عجب نہیں اگر کوئی چیز عام پسند نہ ہو تو ہر شخص مبادلے میں اُس کو بلا عذر کیوں قبول کرنے لگا اور وہ زر کیونکر قرار پا سکتی تھی خصوصاً اُس وقت جب کہ لوگ اوّل اوّل باتفاق رائے چیزیں بطورِ زر رائج کرتے تھے قدرِ ذاتی کی صفت ناگزیر تھی البتہ ایک مرتبہ رائج ہو جانے کے بعد یہ ممکن ہے کہ لوگ اُس چیز کی قدرِ ذاتی کی چنداں پروا نہ کریں بلکہ قدرِ ذاتی غائب ہو جانے پر بھی رسم و رواج یا عادت کے اثر سے اس کو بطورِ زر رائج رکھیں چنانچہ کوڑی کسی زمانے میں بطورِ آرائش و زیور استعمال کی جاتی تھی اور پس ماندہ اقوام میں بہت پسندیدہ تھی۔ اسی قدرِ ذاتی کی بدولت بطورِ زر اس کا رواج شروع ہوا لیکن ہاں اور جب کہ وہ آرائش کے کام نہیں آتی تھی وہ مدتوں زر کے طور پر استعمال ہوا کی سونے چاندی اور تانبے نے بھی اپنی چمک دمک اور دیگر خوبیوں کی بدولت عہدِ قدیم ہی سے دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں ان کی کم و بیش قدر مانی گئی ہے اور علاوہ ان خوبیوں کے جن کی وجہ سے وہ زر کے واسطے بعد کو نہایت موزوں ثابت ہوئے ہیں محض اپنی قدرِ ذاتی کی بدولت

وہ قدیم ہی زمانے سے بطور زر استعمال ہوتے چلے آتے ہیں۔ آگے چل کر سکّے اور زر کاغذی کے بیان سے واضح ہوگا کہ معاشی ترقیات نے کیونکر قدرِ ذاتی کی اہمیت گھٹا دی اور زر کو بلا لحاظ قدرِ ذاتی کیونکر آلۂ مبادلہ بنا دیا۔ لیکن اس حالت میں بھی قدرِ ذاتی اور زر کے درمیان بذریعہ اعتبار رشتہ ضرور قائم ہے۔ مثلاً سو روپے کا نوٹ لو اس کی قدرِ ذاتی ردی کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں لیکن لوگ بلا تامل اس کو سو روپے کا ہم قدر مانتے ہیں کیونکہ ان کو اعتبار ہے کہ اس کے معاوضے میں سو روپے مل سکتے ہیں۔ گویا اس نوٹ اور سو روپے کے درمیان بذریعۂ اعتبار قریبی رشتہ قائم ہے اگر اعتبار اٹھ جائے تو نوٹ کی قدرِ ذاتی دو کوڑی بھی نہیں نکلے گی ؛

حاصل کلام یہ کہ جب کوئی چیز بطور زر رائج ہو تو اس وقت اس میں قدرِ ذاتی ہونی یقینی ہے البتہ رائج ہونے کے بعد اگر ذاتی قدر گھٹے یا غائب ہو جائے تب بھی رسم و عادت کے اثر سے اس کا جاری رہنا ممکن ہے۔ عمدہ زر وہ ہے جس کی قدرِ ذاتی ہمیشہ قائم رہے جیسا کہ سونا چاندی کہ ہمیشہ اس کی قدر مانی گئی ہے اور مانی جائے گی اور جیسا کہ ابھی واضح ہوگا بمقابلہ دوسری چیزوں کے ان کی قدر میں تغیر و تبدل بھی بہت کم ممکن ہے۔ اور یہ جو زرِ کاغذی رائج ہو چلا ہے اگرچہ اس میں قدرِ ذاتی نہیں لیکن بتوسطِ اعتبار اس کی قدر بھی سونے چاندی کی قدرِ ذاتی پر مبنی ہے ؛

ب۔ زر کی دوسری صفت نقل پذیری ہے یعنی یہ کہ اس کو بآسانی جگہ جگہ لے جا سکیں یہ اس حالت میں ممکن ہے جبکہ بلحاظِ قدر زر کا وزن اور حجم بہت

موزوں اور مناسب ہو۔ جن چیزوں کی بکثرت خرید و فروخت ہوتی ہے اُن کے ہم قدر زر کا وزن اور جسامت نہ تو اس قدر زیادہ ہو اور نہ اتنا کم کہ اس کو ساتھ لئے پھرنے میں دقت ہو صفت نقل پذیری کے لحاظ سے معمولاً تو چاندی نہایت موزوں ثابت ہوتی ہے لیکن جہاں زر کے وزن و جسامت کی زیادتی کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں سونا اور جہاں کمی کا خوف ہو وہاں تانبا استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں عام طور پر تو روپیہ چلتا ہے لیکن اگر زر کی کوئی بڑی مقدار ساتھ رکھنی ہو تو لوگ اشرفیاں لے جاتے ہیں۔ سوا سیر اشرفیاں تقریباً ایک من روپے کے ہم قدر ہوتی ہیں اور جسامت میں اس سے بھی زیادہ فرق ہوگا۔ آجکل چونکہ خرید و فروخت نہایت کثیر مقدار میں ہوتی ہے اکثر سونا بھی کام نہیں دیتا اور اسی نقل پذیری کی خاطر زر کاغذی جس کی تشریح ہم آئندہ کریں گے بکثرت استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن خدا کے کروڑہا بندے جو رات دن بمشکل سودا سلف خریدتے رہتے ہیں تانبے کے پیسے استعمال کرتے ہیں پیسے کا ہم قدر چاندی کا سکہ بمشکل چٹکی میں آسکتا ہے اور سونے کا تو بہت سوں کو خوردبین سے بھی نظر نہ آئے گا۔

حاصل کلام یہ کہ چند چھوٹی بڑی مقداروں میں سے ہر ایک کے واسطے زر کا وزن و جسامت نہایت موزوں ہونی چاہیئے تاکہ زر برتنے میں سہولت ہو۔ وزن کی از حد بیشی و کمی اور جسامت کی بہت زیادہ بڑائی چھٹائی

یکساں مفید اور تکلیف دہ ہوتی ہے غور کرنے سے واضح ہوگا کہ نقل پذیری کے لحاظ سے سونے چاندی اور تانبے کو اور بیشمار چیزوں پر فوقیت ضرور حاصل ہے ؛

زر کی نقل پذیری ایک اور لحاظ سے بھی اہم اور قابلِ توجّہ ہے۔ اگر زر بآسانی ایک مُلک سے دوسرے مُلک کو بھیجا جا سکے تو تمام دنیا میں اُسکی قدر یکساں رہے گی۔ کیونکہ جہاں بھی قدر چڑھے گی قانونِ طلب و رسد کے مطابق دوسرے مقامات سے زر آکر اس کو معمولی سطح پر اُتار دے گا۔ اس کے برعکس اگر زر کا دوسرے مُلکوں میں بھیجنا دشوار ہو تو زر کی قدر میں جگہ جگہ بہت فرق ممکن ہے۔ یہاں سہولت و دشواری سے مراد خاص طور پر مصارفِ آمد و رفت کی کمی بیشی ہے۔ اس لحاظ سے سونا بہت زیادہ نقل پذیر ہے اس کا وزن و جسامت تو بہت کم اور بمقابلۃً قدر بہت زیادہ ہوتی ہے اور دنیا کے دور سے دور حصّے میں بھیجنے کے مصارف بھی اس کی قدر کے ۲-۳ فی صدی سے نہیں بڑھ سکتے حالانکہ گیہوں کے مصارف ۵۰ فی صدی قیمت تک بڑھ سکتے ہیں چنانچہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ سونے کی قدر میں مساوات پائی جاتی ہے اور زر کی جو کہ معیارِ قیمت ہے ایسی ہی یکساں قدر ہونی چاہیئے ؛

اوپر نقل پذیری کے دو مفہوم بیان ہوئے اوّل بلحاظِ قدر، وزن و جسامت کی موزونی دوم بلحاظِ وزن و جسامت قدر کی از حد بیشی۔ پہلے کی رو سے تو سونا چاندی اور تانبا تینوں بغایت موزوں ہیں مگر

حصہ چہارم
باب دہم

دوسرے کی رو سے صرف سونا عمدہ ہے۔ اوّل قسم کی نقل پذیری روزمرہ کے کاروبار میں درکار ہے اور قسم دوم کی دور دراز مقامات کی تجارت میں مگر اپنے اپنے طور پر دونوں ضروری اور مفید ہیں۔

ج۔ بے زوالی زر کی تیسری صفت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زر بہت دیرپا ہونا چاہیئے نہ پانی یا کافور کی طرح وہ ہوا میں اڑ جائے۔ پھل ترکاری اور گوشت کی طرح سڑے۔ نہ غلّہ اور لکڑی کی طرح اس کو کیڑا لگے نہ لوہے کے مانند اس کو زنگ کھاوے وہ برسوں نہیں بلکہ صدیوں قائم رہے۔ ایسے زر کو لوگ جب تک چاہیں گے پاس رکھ سکیں گے اور اس کے خراب ہو جانے کے خوف سے ان کو خلاف مرضی خرید و فروخت میں عجلت نہیں کرنی پڑے گی اوّل تو زر خزینۃ القدر بھی قرار پا چکا ہے اور اس لحاظ سے اس کو بے زوال ہونا لازمی ہے۔ دوسرے اس صفت کا ثبات قدر سے نہایت قریبی تعلّق ہے جس کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں:-

د۔ ثبات قدر کی صفت بھی زر کے حق میں نہایت اہم ہے۔ سود کی بحث میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ زر اگرچہ سب چیزوں کی قیمت کا معیار ہے اور معیار ہمیشہ مقرر و غیر متبدّل ہوتا ہے لیکن خود زر کی قدر بھی بحیثیت مجموعی اور چیزوں کے مانند گھٹتی بڑھتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مقابلۃً اس کی قدر میں سب سے کم تغیّر و تبدّل ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے۔ مگر چونکہ ہم زر کو معیار جانتے ہیں قدر زر کے تغیّر و تبدّل کو بھی ہم ہمیشہ دوسری چیزوں کی قیمت کی تبدیلی پر محمول

کرتے ہیں۔ قدرِ زر کے تعین کا مسئلہ فی نفسہ اہم اور دقیق ہے۔ اور اس سے ہم آئندہ جداگانہ بحث کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر جتانا مقصود ہے کہ یوں تو جو چیز گراں ہوتی ہے اس کے حوالے سے زر کی قدر گھٹ جاتی ہے اور جو چیز ارزاں ہوتی ہے اس کے حوالے سے بڑھ جاتی ہے اور قدرِ زر کی ایسی تخفیف و اضافہ کا باعث خود دوسری چیز کی قلت و کثرت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری چیزوں کی مانند خود زر کی قلت و کثرت کا بھی اس کی قدر پر بعینہٖ یہی اثر پڑتا ہے یعنی زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹتی ہے اور مقدار گھٹنے سے اس کی قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ گویا قدرِ زر کے تغیر کے دو سبب ہوئے یا تو کسی دوسری چیز کی قلت و کثرت یا خود زر کی کمی بیشی۔ لیکن ان تغیرات میں ایک قابلِ توجہ فرق پایا جاتا ہے۔ بحالتِ اوّل زر کی قدر میں فرق صرف بحوالہ اُس ایک چیز یا چند چیزوں کے نظر آتا ہے جن کی رسد میں کمی بیشی ہو گئی ہو لیکن بحالتِ دوم قدرِ زر کا فرق عام ہوتا ہے اور اکثر چیزوں کے حوالے سے اس کا پتا چلتا ہے۔ حالتِ اوّل کو اشیائے متعلقہ کی گرانی و ارزانی سے تعبیر کرتے ہیں اور حالتِ دوم کو قدرِ زر کی کمی بیشی سے۔ قدرِ زر کی ان ہر دو تبدیلیوں کی حالت بعینہٖ ایسی ہے کہ کسی تالاب میں لہریں دوڑتی رہیں یا خود سطحِ آب پست و بلند ہو جائے۔ آخر الذکر تبدیلی کا پتا چلانا دشوار اور مہارت طلب ہے۔ اس کا ایک خاص طریق ہے جس کو انگریزی میں انڈکس نمبر کہتے ہیں۔ قدرِ زر کی جداگانہ بحث میں ہم اس کی بھی تشریح

کریں گے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ مذکور الصدر مفہوم میں زر کی قدر مرتقی یافتہ ملک میں گھٹ رہی ہے۔ لیکن نہایت آہستہ آہستہ کہ لوگ چونک نہ پڑیں ۔ زر کی قدر گھٹنے کا باعث صاف ظاہر ہے۔ ہر سال کانوں سے سونا چاندی نکلتا ہے اور اس کی جوں جوں مقدار بڑھتی ہے قانون طلب و رسد کے مطابق اُن کی قدر میں کم و بیش تخفیف ہوتی ہے زر کی قدر مدت سے مسلسل طور پر گھٹ رہی ہے مگر نہایت آہستہ آہستہ ان دونوں واقعوں کا باعث سونے کی صفت بے زوالی میں مضمر ہے چونکہ تقریباً سب سے زیادہ دیرپا چیز ہے اس کی جتنی مقدار حاصل ہوتی ہے قائم رہتی ہے۔ سمندر وغیرہ میں کچھ مقدار اگر ضائع ہوتی بھی ہے تو نسبتاً اتنی قلیل کہ قابل لحاظ نہیں۔ پس سونے کی مقدار برابر بڑھ رہی ہے اور باوجودیکہ اس کی طلب بھی بہ نسبت سابق زیادہ ہے اس کی قدر میں برابر تخفیف ہو رہی ہے تخفیف کی سست رفتاری کا باعث یہ ہے کہ سونا چونکہ ہزارہا سال سے برابر فراہم ہو رہا ہے اور بہت کم ضائع ہوتا ہے جمع ہوتے ہوتے اس کی مجموعی مقدار اس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ سالانہ اضافوں کا کل مقدار پر بہت کم اثر پڑتا ہے اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ دنیا میں بعض بڑی بڑی جھیلیں ہیں کہ اُن میں دریا کتنے ہی زور شور سے گرے لیکن پھر بھی اُنکی سطح آب بمشکل ایک آدھ انچ بلند ہو سکتی ہے اسکے برعکس اگر سونا بھی مثل غلہ برابر ضائع ہوتا رہتا تو اسکی اسقدر مقدار کثیر فراہم نہ ہو سکتی اور ہر سالانہ پیداوار کا اس کی مقدار اور قدر پر

حصہ دوم [illegible]
باب [illegible]

زبردست اثر پڑا کرتا، جیسا کہ گیہوں یا روئی کا حال ہے۔
ماحصل کلام یہ کہ اگرچہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں سونے کی مقدار بڑھتی جاتی ہے [illegible] کی قدر میں برابر تخفیف ہوتی ہے لیکن اس کی [illegible] نہایت [illegible] ہے۔ اسی وجہ سے معمولی کاروبار [illegible] کوئی نقصان نہیں کرتا۔ دس بیس سال کے عرصے [illegible] ہوجاتا ہے۔ سونے کے بجائے اگر [illegible] میں اور بھی بلا علت تغیر و تبدل ہوا کرتے اور ایسی حالت میں کاروبار کی حالت جس قدر ابتر اور خطرناک ہوتی ظاہر ہے۔

۲۔ یک جنسی سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ یکساں ہو۔ اس کی اصلی خوبی میں کوئی فرق ممکن نہ ہو۔ مثلاً سونا خواہ دنیا کی کسی کان سے نکلے اپنی خالص حالت میں ہمیشہ یکساں ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ مختلف کانوں کے خالص سونے کی خوبی میں کوئی فرق ہو۔ اس کے برعکس اور بہت سی بے شمار چیزیں ہیں۔ مثلاً گیہوں، روئی، اون جن کی خوبی میں بہت فرق کی گنجائش ہے۔ اس صفت سے زر میں بڑی خوبی یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ کل زر بلا دقت ہم قدر بن سکتا ہے اور اگر آمیزش کرکے زر کی قدرِ ذاتی گھٹائی جائے تو بآسانی اس کا پتا چل جاتا ہے۔ مثلاً کل روپیوں کی چاندی یا اشرفیوں کا سونا خوبی میں یکساں ہے اور اگر مصنوعی سکے بنا کر انکی خوبی اور قدرِ ذاتی گھٹائی جائے تو اس کا پتا چلانا کچھ دشوار نہیں ہوتا۔

۳۔ سہم پذیری سے مراد نہ صرف جسمانی تسہیم ہے بلکہ تسہیم قدر بھی۔ مثلاً ایک تولہ سونے کے خواہ کتنے ہی ٹکڑے کئے جائیں ہر ٹکڑے کی قیمت اس کے

وزن کی نسبت سے یکساں ہوگی اور کُل ٹکڑوں کی
مجموعی قدر اصلی بڑے یعنی تولہ بھر کے ٹکڑے
کے برابر [illegible] بہت سے ٹکڑے ہو جانے سے
[illegible] کی کمی واقع نہیں ہوتی اور نہایت
آسانی سے [illegible] بڑا ٹکڑا بن سکتے ہیں۔ اسکے
برعکس اور قیمتی چیزیں مثلاً ہیرے جواہرات
اگر چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر دیئے جائیں تو ان ٹکڑوں
کی قدر اُن کے وزن یا جسامت کی نسبت سے
بہت گھٹ جائے گی اور کُل ٹکڑوں کی مجموعی قیمت
اصلی ٹکڑے سے بہت کم ہوگی اور نہ اُن ٹکڑوں کو
جوڑ کر اصلی ٹکڑا بنانا ممکن ہوگا۔ سہم پذیری سے
زر میں یہ خوبی پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی چیز سے
مختلف قدر کے زر بآسانی تیّار ہو سکتے ہیں مثلاً
اشرفی و نصف اشرفی۔ روپیہ اٹھنّی چونّی اور دوانّی
مزید برآں ایک اشرفی اور دو نصف اشرفیاں،
ایک روپیہ اور دو اٹھنّی یا چار چونّی یا آٹھ دوانّی۔ یہ سب
ہم قدر بھی ہیں۔

(ص) شناخت پذیری زر کی ساتویں اور آخری
صفت ہے۔ جو چیز بطور زر استعمال ہو وہ اپنی چند
بدیہی خصوصیات کی وجہ سے اس قدر ممتاز ہو کہ فوراً
پہچان لی جائے اور مصنوعی چیزوں سے بلا دقّت
اس کی تمیز ہو سکے۔ مثلاً سونے کا رنگ وزن
اور چھنکار اس قدر مخصوص ہے کہ اس کے پرکھنے
میں عوام کو بھی دقّت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی سکّہ مصنوعی
ہوتا ہے تو ذرا غور سے دیکھنے پر پتا چل جاتا ہے۔

حصۂ چہارم
باب بیت و دوم

جہاں خرید و فروخت میں زر بسرعت دست بدست
گھومتا ہے لوگوں کو اتنی مہلت کہاں کہ اسکی شناخت پر
وقت صرف کریں شناخت پذیری سے ناقص اور
مصنوعی زر کے رواج کا خطرہ بہت کم ہو جاتا ہے۔
چونکہ مصنوعی زر کا رواج روکنے کے لیئے زر بشکل سکہ
استعمال کیا جاتا ہے شناخت پذیری کو بعض نے
نقش پذیری سے تعبیر کیا ہے یعنی کسی شے کی
یہ صفت کہ اس کو ڈھال کر یا اس پر نقش ابھار کر اس کا
سکہ بنا سکیں۔
سکے کے متعلق ضروری معلومات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۲ - اپنی خاص صفات کی بدولت سونے چاندی نے سکہ
آج سے مدتوں پہلے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور جہاں کہیں بھی
وہ کافی مقداریں دستیاب ہو سکے زر کے طور پر رائج ہونے لگے
لیکن دوران رواج میں انھوں نے کئی شکلیں بدلیں۔ اول اول ان کے
چھوٹے بڑے کھوٹے کھرے ٹکڑے بطور زر استعمال ہوئے۔
ہر خرید و فروخت کے وقت ان ٹکڑوں کا وزن اور مال جانچنا پڑتا تھا۔
اس طریق سے کاروبار میں جس قدر تاخیر اور دقت ہوتی ہوگی ظاہر
ہے چنانچہ اب تک چین کے بعض حصوں میں جہاں سونا چاندی
اسی طرح سے بطور زر رائج ہے تاجر کسوٹی اور کانٹا ساتھ ساتھ
لیئے پھرتے ہیں۔ اور ہر خرید و فروخت میں جانچ تول کر زر کی قدر
دریافت کرنی پڑتی ہے۔ اس طوالت اور دقت سے بچنے کے لیئے
یہ طریق ایجاد کیا گیا کہ سونے چاندی کے بہت سے ٹکڑے تیار
کیئے گئے جو بلحاظ وزن اور خوبی یکساں تھے گویا یہ سب ٹکڑے مساوی القدر
تھے اور شناخت کے لیئے ان پر کچھ مقررہ علامات بھی بنا دیئے گئے
نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے ٹکڑوں کو خرید و فروخت میں لوگ جانچے تولے بغیر

مقررہ قدر کے حساب سے لینے لگے۔ پس ماندہ ممالک میں ان کا اب تک رواج ہے۔ اور عجائب خانوں میں بھی بطور تاریخ سکے اُن کو دکھایا جاتا ہے۔ یہی بھونڈے ٹکڑے سکّے کی بنا تھے جو معاشی ترقیات کی بدولت آج یوں خوشنما نظر آتے ہیں۔ پس واضح ہوا کہ سکّے سے سونے چاندی تانبے یا کسی دھات کے ایسے ٹکڑے مراد ہیں جن کے مقررہ وزن اور خوبی کی تصدیق اُن کی خاص شکل اور ان نقش و نگار کی صفائی سے کی جائے جو انکی سطح پر بنا دئے جاتے ہیں۔

غور اور تجربے سے عمدہ زر کے مانند عمدہ سکّے کے بھی چند خواص قرار پا چکے ہیں جو درج ذیل ہیں

ا۔ سکّے کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کی نقل بنانی نہایت دشوار ہو تاکہ مصنوعی سکّوں کے رواج کا اندیشہ نہ رہے۔ سکّے پر نقش و نگار حتی الامکان نہایت نازک اور پیچیدہ ہونے چاہئیں جو از حد بیش قیمت مشین بغیر کسی طرح پر نہ بنائے جاسکیں اور جن کی پوری نقل اتارنی سخت سے سخت دشوار اور از حد مہارت طلب ہو۔ نقل تو لوگ ملکۂ وکٹوریا کے روپے کی بھی بنا لیتے تھے مگر اُس کے نقش و نگار پھر بھی دقیق اور اہتمام طلب تھے۔ جب سے اڈورڈ اور جارج کے سیدھے سادے نقش والے روپے چلے مصنوعی روپوں کا بہت رواج بڑھ رہا ہے۔

ب۔ سکّے کی شکل و صورت ایسی ہونی چاہیئے کہ اگر اسکا ذرا سا حصہ بھی گھس جائے یا تراشا جائے تو فوراً پتا چل جائے اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ لوگ اشرفی یا روپے میں سے چند رتی دھات تراش کر بہت کچھ کما لیں۔ اسی اندیشے سے اوّل تو سکّوں کی شکل بالعموم گول رکھی جاتی ہے۔ دوم اس کے ارد گرد کنارے کنارے

حصۂ چہارم
باب بست و دوم

نہایت باریک و یکساں خط اُبھار دیئے جاتے ہیں اور سطح کی ہر دو جانب کے نقش و نگار بھی اس اندیشے کو رد کر سکتے ہیں۔

ج۔ سکہ ایسا ہونا چاہیئے کہ استعمال سے بہت کم فرسودہ ہو۔ گول شکل چونکہ بہ نسبت کونے دار کے کم گھستی ہے اس غرض کے لیئے مفید ہے۔ مزید براں سونا چاندی زیادہ نرم ہیں اور ان کو حسبِ ضرورت مضبوط بنانے کے لیئے ان میں کچھ مقررہ حساب سے آمیزش کر دی جاتی ہے تاکہ دورانِ استعمال میں سکے جلد نہیں گھس سکتے۔

د۔ سکے کی شکل و جسامت موزوں ہونی چاہیئے۔ اگر موجودہ گول سکوں کے بجائے کونے دار استعمال کیئے جائیں تو اُن کو جیب و بیگ میں رکھنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اگر تانبے کی دونی یا چونی یا چاندی کا پیسہ بنایا جائے تو اُن کی جسامت کس قدر ناموزوں ہوگی۔ خاص جسامت کی موزونیت کے لحاظ سے مختلف مقدارِ قدر کے واسطے مختلف دھاتوں کے سکے بنائے گئے ہیں۔

ہ۔ دیکھنے میں بھی سکہ ہر لحاظ سے خوشنما ہونا چاہیئے تاکہ اس سے ساخت کا کمال ظاہر ہو۔ اس پر ضروری تاریخی معلومات مثلاً سنہ و مقامِ اجرا اور شاہِ وقت کا نام درج ہونا ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ بمقابلہ وکٹوریا کے روپے کے ایڈورڈ اور جارج کے روپے دیکھنے میں بھدے معلوم ہوتے ہیں۔ نہ معلوم کس مصلحت سے آخر الذکر روپے میں ملیسرز اختیار کیا گیا ہے کہ جس سے علاوہ دیگر خواص کے خوشنمائی پر حرف آتا ہے۔

اصولِ اجرائے سکہ

۴۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ سکے سے سونے چاندی وغیرہ کے

حصہ چہارم
بحث دوم

ایسے ٹکڑے مراد ہیں جن کے مقررہ وزن اور خوبی کی ان کی خاص شکل اور ان نقش و نگار سے تصدیق کی جائے جو ان کی سطح پر مہر جانب بنا دیئے جاتے ہیں۔ چند وجوہات کی بنا پر جن کی ہم ابھی تشریح کریں گے سکہ سازی سرکار نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے حتیٰ کہ اس کو دوسروں کے حق میں تعزیری جرم قرار دے دیا ہے۔ سرکار خود سکہ بناتی اور اس کی قدر معین کرتی ہے گویا ہر سکے کی دو قدریں ہوتی ہیں ایک وہ جو مقدار سونے یا چاندی کے مطابق ہو اس کو اصطلاحاً قدرِ فلزاتی کہتے ہیں دوسری وہ جو سرکار کی مقرر کردہ ہو اس کو اصطلاحاً قدرِ قانونی کہتے ہیں۔ بعض سکوں کی قدرِ فلزاتی اور قدرِ قانونی برابر ہوتی ہے۔ مثلاً اشرفی۔ ایسے سکے زرِ مستند کہلاتے ہیں اور بعض سکوں کی قدرِ فلزاتی قدرِ قانونی سے کم ہوتی ہے مثلاً روپیہ کہ اس میں چاندی دس آنے سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی لیکن اس کی قدرِ قانونی سولہ آنے مانی جاتی ہے ایسے سکے زرِ وضعی کہلاتے ہیں تیسری صورت یعنی قدرِ فلزاتی کا قدرِ قانونی سے زیادہ ہونا اس وجہ سے قابلِ لحاظ نہیں کہ ہر دو قدر کا ایسا تعلق سراسر لاحاصل اور لہٰذا غیر اغلب ہے۔ اگر کسی سکے کی قدرِ فلزاتی قدرِ قانونی سے زائد ہو تو اس کو لوگ محض ٹکڑے کے طور پر استعمال کریں گے وہ بطور سکہ اس وجہ سے رائج نہیں ہو سکتا کہ سکہ قدرِ قانونی کا پابند ہوتا ہے اور ایسی پابندی سے مالکان سکہ کو نقصان پہنچے گا سکے کے طور پر چلنے کے بجائے سونے چاندی کے معمولی ٹکڑوں کی مانند ان کی خرید و فروخت جاری ہو جائے گی گویا ایسے سکے ہی نہ رہیں گے۔ ایک دوسرے اصول کی رو سے بھی زر کی دو قسم قرار دی گئی ہیں۔ اول وہ زر جس کے ذریعے سے بڑی سے بڑی مقدار قدر ادا ہو سکے اور اس کی ادائی و قبولیت فریقین پر قانوناً لازم ہو مثلاً روپیہ اور اٹھنی کہ قانوناً دو روپے سے زائد ہر رقم ان کے ذریعے سے ادا ہونی چاہیئے نہ اُن کے

دینے سے کوئی انکار کرسکتا ہے اور نہ لینے سے۔ ایسے سکّے جو قانوناً ہر مقدار قدر کی ادائی کے واسطے معین ہوں اصطلاحاً زرِ قانونی کہلاتے ہیں تاکہ عوام کو روزمرّہ کے چھوٹے سودا سلف خریدنے میں سہولت ہو زرِ قانونی کے چھوٹے چھوٹے حصّے بھی رائج کر دیئے جاتے ہیں لیکن ایسے حصّے صرف قلیل مقدارِ قدر کی ادائی میں کام آتے ہیں اور ۔۔۔ قانون بڑی مقدار کی ادائی میں ان کا استعمال لازم نہیں۔ مثلاً چونّی دونّی اکنّی اور پیسہ یہ سب سکّے روپیہ کے چھوٹے حصّے ہیں اور از روئے قانون صرف دو روپے تک ان کے ذریعے سے ادا اور قبول کیئے جا سکتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں آخر الذکر قسم کے سکّے اصطلاحاً محدود زرِ قانونی کہلاتے ہیں۔

زرِ قانونی اور محدود زرِ قانونی کی تفریق کی مصلحت غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی پر ہزار روپیے قرض ہو اور روپیوں کے بجائے وہ پیسے ادا کرے تو قرض خواہ کو کس قدر دقّت اور خسارہ ہوگا۔ اس تفریق کی ضرورت محسوس ہونے کے قصّے میں بھی بڑا عجیب لطف ہے سنا ہے کہ انگلستان میں کسی بنک کے مخالفوں اور بدخواہوں نے اس کے دیوالہ نکلنے کا خوف لوگوں میں پیدا کر دیا جن کا روپیہ جمع تھا وہ سب ہجوم کر کے بنک پر ٹوٹ پڑے اور اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کرنے لگے جیسا کہ آگے چل کر واضح کیا جائے گا۔ بنک کا کُل کاروبار اعتبار پر مبنی ہے اور ایک ساتھ کُل رقم جمع شدہ واپس دینا دُنیا کے بہترین بنک کے قابو سے بھی باہر ہے۔ اس موقع پر بنک کو بھی ایک ترکیب خوب سوجھی اُس نے جلد سے جلد تانبے کے سکّے فراہم کر کے انبار کے انبار لگا دیئے اور اُن کو گن گن کر لوگوں کو رقمیں ادا کرنی شروع کیں ہفتہ بھر گزر گیا لیکن بمشکل ہزار پونڈ ادا ہو سکے۔ اس عرصے میں بے اعتباری کا طوفان فرو کر دیا گیا لوگوں پر بدخواہوں کی چال کھل گئی بنک سے رقموں کا مطالبہ بند ہو گیا اور اس طرح پر بنک کی جان بچی۔ لیکن اس واقعے سے لوگوں کو

بہت عبرت ہوئی اور چند ہی روز بعد زر میں قانوناً مذکورۃ الصدر تفریق قرار دے دی گئی ؛

تقریباً ہر ترقی یافتہ اور خود حکمران ملک میں زرِ قانونی زرِ مستند پایا جاتا ہے۔ یعنی جو سکہ بڑی رقموں کی ادائی میں کام آتا ہے اس کی قدرِ فلزاتی اور قدرِ قانونی تقریباً برابر ہوتی ہے حتیٰ کہ عوام سرکاری دارالضرب میں ساخت کے قلیل مصارف ادا کرنے پر اپنے سونے چاندی کے سکے تیار کرا سکتے ہیں اگر سکے کے ہر دو مذکورہ بالا قدروں میں کچھ فرق ہوتا ہے تو صرف مصارفِ ساخت کے برابر۔ یعنی بمقدارِ مصارفِ ساخت قدرِ فلزاتی قدرِ قانونی سے کم ہوتی ہے۔ عوام کو سرکاری دارالضرب میں سکہ تیار کرانے کی اجازت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب قدرِ فلزاتی قدرِ قانونی سے کم ہو جائے (اگرچہ اس قسم کی کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی کم تر ممکن ہے) تو لوگ بکثرت سکے ڈھلواتے ہیں حتیٰ کہ سونے چاندی کی قلت سے قدرِ فلزاتی بڑھ کر قدرِ قانونی کے برابر آ لگتی ہے۔ غرضکہ زر کی بڑی مقدار جو بشکلِ زرِ قانونی رائج ہے اس کی قدرِ فلزاتی اور قدرِ قانونی مساوی ہوتی ہے۔ البتہ محدود زرِ قانونی جس کی مجموعی مقدار بھی مقابلۃً بہت کم ہوتی ہے بشکلِ زرِ وضعی جاری ہے اور اس کی خاص غرض وزن و جسامتِ سکہ کی موزونیت ہوتی ہے۔ لیکن بعض ملکوں میں جن کو ترقی یافتہ اقوام کی سرپرستی حاصل ہے اب تک زرِ وضعی کو زرِ قانونی قرار دے رکھا ہے مثلاً ہندوستان کا روپیہ زرِ وضعی ہے۔ اس کی چاندی دس آنے سے زیادہ قیمتی نہیں لیکن اس کی قدرِ قانونی سولہ آنے ہے اور یہی روپیہ زرِ قانونی بھی ہے کہ زر کی مقدارِ کثیر اسی شکل میں موجود ہے۔ معاشئین زرِ وضعی کو بطورِ زرِ قانونی رائج کرنا سرکار کے حق میں باعثِ ننگ و عار قرار دیتے ہیں اُن کا قول ہے کہ سکے کی اصلی غرض و منشا اس امر کی تصدیق ہے کہ اُس کے ہم قدر سونا یا چاندی اس میں موجود ہے جب کہ لوگ

زری تصدیق بیاعتبار داراں تو کمتر قدر کے سونے یا چاندی کو سکے کا بمقدار ... مثلاً ... ہوتا ہی اور ظاہر نہیں تو اور کیا ہے بمقدار فرق قدر قانونی و قدر فلزاتی - سرکار کو ایسے سکے بنانے میں نفع ضرور ہوتا ہے مثلاً روپیہ کی ساخت میں تخمیناً ۱۳ فی صدی منافع شامل ہے - لیکن روشن خیال حکومتیں ایسے منافع کو جائز نہیں سمجھتیں یہی منافع لوگوں کو مصنوعی سکے بنانے کی ترغیب دیتے اور خود اس جرم کا محرک بن جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ سیاسی انقلابات کی بدولت ایسے زر کی قدر قانونی اڑ جائے تو صرف قدر فلزاتی باقی رہ جاتی ہے بمقدار فرق ہر دو قدر کل ملک کا مفلس ہو جانا ظاہر ہے ؎

حاصل کلام یہ کہ اخلاقی و نیز معاشی لحاظ سے زر قانونی زر مستند ہونا لازمی ہے البتہ محدود زر قانونی کا زر وضعی ہونا مضائقہ نہیں بلکہ اکثر سہولت افزا ہوتا ہے سکے کے متعلق اب صرف ایک بحث باقی ہے وہ یہ کہ ہر ملک میں سکہ سازی کا حق سرکار نے اپنے لیئے کیوں مخصوص کر رکھا ہے اور چیزوں کی مانند سکہ بنانے کی بھی کارخانوں کو اجازت کیوں نہیں دی جاتی اس تخصیص کا باعث سکے کے خواص میں مضمر ہے اور بے شمار چیزیں تو برتنے کی خاطر خریدی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ہم خریدتے وقت اُن کی خوب اچھی طرح پر تحقیق کر لیتے ہیں لیکن زر بحیثیت ایک آلۂ مبادلہ ہے یعنی اکثر اس کا استعمال سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دوسروں کو دے کر اس معاوضے میں ہم ضروری سامان خریدیں اور اگر زر کی قدر از روئے قانون مقرر ہو تو سب زر ہماری نظر میں یکساں ہے - خواہ اُس کی قدر فلزاتی قدر قانونی سے کم ہو یا زیادہ - اور چوں کہ خرید میں سب سے کم قیمت دینا خریدار کے حق میں مفید ہے - وہ ناقص یعنی کمتر قدر فلزاتی والے سکوں میں قیمت ادا کرے گا - اور چونکہ ایسے سکے زر قانونی ہوں گے

حصہ چہارم
باب دوم

قدرِ قانونی کے حساب سے اُن کو قبول کرنا فروشندہ پر لازم ہوگا اور جب اس کی باری آئے گی تو وہ بھی ایسے ہی ناقص سکے دوسروں کو قیمت میں دے گا اور دوسرا اُن کو قبول کرنے پر اسی طرح مجبور ہوگا جس سے ناقص سکوں کا رواج بہت پھیل جائے گا۔ عمدہ سکوں کی حالت یعنی جن کی قدرِ فلزاتی و قدرِ قانونی برابر ہو۔ اس کے برعکس ہوگی۔ اول تو کاروبار میں چلانے کے بجائے بطورِ خزینۃ القدر لوگ اُن کو جمع کرکے رکھیں گے یعنی جب کہ عمدہ اور ناقص سکے رائج ہوں تو عمدہ اندوختوں میں جا کر یں ہو جاتے اور ناقص رواج پاتے ہیں۔ دوم لوگ عمدہ سکوں کے ناقص بنا بنا کر بہت منافع کما سکتے ہیں۔ سوم آگے چل کر واضح ہوگا کہ تجارت بین الاقوام میں کسی ملک کے زر کو دوسرے ممالک قدرِ فلزاتی کے حساب سے قبول کرتے ہیں۔ وہ قدرِ قانونی کیوں ماننے لگے۔ پس عمدہ سکے چھنٹ چھنٹ کر بیرونِ ملک سے چلے جاتے اور ناقص رہ جاتے ہیں۔ سکوں کا یہ خاصہ کہ ان میں سے عمدہ غائب ہو جاتے اور ناقص رواج پاتے ہیں۔ اس کے اولین محقق کے نام سے تعبیر پا کر قانون گرشیم کہلاتا ہے۔ اس قانون کا عملدرآمد عام مشاہدہ ہے۔ جب سرکار نئے نئے روپیوں یا اشرفیوں کی کوئی مقدار جاری کرتی ہے تو وہ سب بہت جلد غائب ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی پرانے روپے زیادہ نظر آنے لگتے ہیں اشرفی چونکہ زرِ مستند ہے اور روپیہ زرِ علامتی ہندوستان میں اشرفیاں اس قدر غائب ہو رہی ہیں کہ دوسرے ملک والوں کو تعجب اور انگلستان والوں کو شکایت ہے۔

آخر یہ اشرفیاں کہاں جاتی ہیں؟ کچھ تو لوگ جمع کرتے ہیں اور جبکہ اشرفی کی قدرِ فلزاتی بحسابِ روپیہ اُس کی قدرِ قانونی سے بڑھ جاتی ہے تو لوگ اُس کو بطورِ سونا فروخت کرتے اور گلا گلا کر اُس کا زیور تیار کراتے ہیں۔ اشرفی کی قدرِ قانونی ۱۵ روپے ہے لیکن وہ

حصہ چہارم
باب ...

دار سے پہلے سے زیادہ کو فوقیت ہوتی رہتی ہے :

اور پچھلی بحث سے یہ واضح ہوا کہ بلحاظ مصنوعات سکے کی حالت بالکل نرالی ہے عام طور پر جو مال عمدہ ہوتا ہے وہی رواج پاتا ہے اور اور اس کے بنانے والے کارخانوں کو عروج و منافع حاصل ہوتا ہے لیکن سکے ناقص ہو کر بہت زیادہ رواج پکڑتے ہیں اور انکے بنانے والوں کو بہت ترقی اور منافع ملتا ہے۔ عمدہ سکے غائب بھی بہت جلد ہو جاتے ہیں اور ان کے بنانے والے دوسروں کے آگے سر بسر احمق بنتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں اگر سکہ سازی کی اجازت کارخانوں کو مل جائے تو یقیناً چند ہی روز میں کل زر نہایت ناقص ہو جائے اور بعض ممالک میں ایسا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ اگر کہا جائے کہ سرکار کارخانوں کے بنے ہوئے سکوں کی جانچ پڑتال کرتی رہے تو یہ طریق نہایت طوالت و دقت طلب ہوگا اور پھر بھی ناقص سکوں کا اجرا بند ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس سے ہزار درجہ بہتر یہ ہے کہ مقررہ وزن اور خوبی کے سکے سرکار خود اپنی نگرانی اور اہتمام سے تیار کرائے اور سکہ سازی عوام کے حق میں تعزیری جرم قرار دیدے :

چنانچہ مدت ہوئی کہ ہر ملک میں سکہ سازی خاص حق شاہی قرار دے دیا گیا اور اب سرکار کے اہتمام سے دار الضرب میں سکے ڈھلتے ہیں :

جہاں زر مستند رائج ہے سرکاری دار الضرب میں عام لوگ ضروری مصارف ادا کرنے پر اپنے سونے چاندی کے سکے تیار کرا سکتے ہیں لیکن جہاں زر وضعی کا رواج ہے جیسا کہ ہندوستان میں عوام کو سکہ بنانے کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سکہ سازی سے معقول منافع ہوتا ہے اور اگر اجازت عام ہو جائے تو ملک بھر کا سونا چاندی سکہ ہی سکہ ہو جائے اور کثرت سکہ سے

حصۂ چہارم
باب ستم

جو دقتیں پیش آئیں وہ آگے چل کر قدر زر کے تحت میں بیان ہونگی عوام کو سرکاری دار الضرب میں سکہ بنوانے کی اجازت ہونے نہ ہونے کا طریق علی الترتیب آزاد سکہ سازی اور مخصوص سکہ سازی کہلاتا ہے۔ انگلستان میں پہلا طریق رائج ہے اور ہندوستان میں آخر الذکر۔

بابِ بست و سوم

زرِ کاغذی

(۱) زرِ کاغذی کا رواج (۲) زرِ کاغذی کے اقسام
(۳) زرِ کاغذی کی خوبیاں (۴) زرِ کاغذی کے نقائص

زرِ کاغذی کا رواج

۱- بظاہر کس قدر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ دو دو انگل کاغذ کے پرزے اور یوں بکثرت زر کے طور پر مستعمل ہوں، تمام ترقی یافتہ ملکوں میں زرِ کاغذی کا بہت رواج پایا جاتا ہے چنانچہ ہندوستان میں بھی کروڑہا روپیوں کے ہم قدر سرکاری نوٹ کاروبار میں بلا تکلف چل رہے ہیں اس واقعے سے زر کی ایک بڑی خاصیت کا پتا چلتا ہے جس سے اس سے قبل بھی جا بجا حوالہ دیا جا چکا ہے اگر کاغذ کے ٹکڑوں پر چند من گیہوں، شکر، نمک یا روئی لکھ دیں تو کیا کوئی ان کو ان چیزوں کی بجائے قبول کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں تو کھانے پینے کے کام آتی ہیں اور کاغذ کے ٹکڑے اس لحاظ سے سراسر ناکارہ ہیں۔ نیز اگر سونے چاندی کے سکے محض آرائش میں بطور زیور استعمال ہوتے اور مبادلے میں ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تو زرِ مسکوک کی بجائے زرِ کاغذی کا چلنا جو آرائش کے واسطے ناکارہ ہے محال تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر کاروبار میں زر محض ایک آلۂ مبادلہ شمار کیا جاتا ہے گویا خود زر سے سوائے اس کے اور کوئی کام لینا مقصود نہیں کہ اس کے ذریعے سے دیگر بے شمار ضروریات حاصل کی جاویں۔ پس زر محض ایک حکم نامہ ہے کہ اس کے پیش کرنے پر

باب ۲ دوم

ہر قسم کا سامان دستیاب ہوتا ہے اور سب لوگوں نے اس حکمنامے کی تعمیل اپنے اوپر واجب قرار دے دی ہے اور جب زر محض ایک واجب التعمیل حکم نامہ قرار پایا کہ اس کے پیش کرنے والے کو لوگ اشیائے مطلوبہ مہیا کردیں تو خواہ یہ حکم نامہ دھات کے ٹکڑے پر منقوش ہو یا کاغذ پر تحریر ہو اس کی تعمیل ہر حالت میں یکساں ہونی چاہیئے چنانچہ جب تحقیق ہوگیا کہ سو روپیہ اور سو روپے والے نوٹ دونوں کا عمل مبادلے میں یکساں ہے تو ان میں کوئی تفریق نہیں رہی بلکہ بوجہ سہولت نوٹ کو ترجیح حاصل ہوگئی۔ واضح ہو کہ زر کے رواج میں رسم و عادات کو بہت بڑا دخل ہے۔ کسی زمانے میں جب نوٹ نئے نئے جاری ہوئے تو لوگ ان کو قبول کرنے میں پس و پیش کرتے تھے مگر آج یہ حالت ہے کہ کاروبار میں روپیہ سے بھی پیش پیش نظر آتے ہیں گوناگوں سہولتوں کی بدولت مصارفِ سفر کے واسطے تو گویا وہ مخصوص ہوگئے ہیں۔ اسی طرح ہر کمی خرچ کے خیال سے لوگ منی آرڈر کی بجائے نوٹ رجسٹری یا بیمہ کرا کے ذریعہ بہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے لوگ زرِ کاغذی سے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ آلۂ مبادلہ کے علاوہ خزینۃ القدر کے طور پر بھی کام میں لانے لگتے ہیں۔ چنانچہ یورپ اور امریکا میں دولتمندوں کا لاکھوں روپیہ قیمتی اندوختہ اکثر نوٹوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہوتا ہے جس کو وہ بآسانی اپنے ساتھ دستی بیگ میں ہر کہیں لے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی لوگ زر بشکلِ نوٹ پس انداز کرنے لگے ہیں۔ المختصر زرِ کاغذی کے رواج کی کثرت و وسعت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کیسے دھوکے میں مبتلا ہیں۔ کاغذ کے ذرا ذرا سے بے قیمت ٹکڑوں کے معاوضے میں خوشی خوشی لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا قیمتی سامان دیدیتے ہیں اور چند کاغذی پرزوں کے مالک بن کر اپنے آپ کو کروڑپتی شمار کرنے لگتے ہیں۔ زرِ کاغذی کا روز افزوں رواج تو مسلم ہے۔ اب ذیل میں زرِ کاغذی کے اقسام کی خوبیاں اور نقص

بیان کئے جاتے ہیں :-

۲- زر کاغذی کے اقسام ذیل سے واضح ہوگا کہ وہ اوّل اوّل زر فلزاتی کا محض نمائندہ تھا مگر بتدریج اس کا رواج اور اعتبار اس قدر بڑھا کہ بذات خود زر بن بیٹھا :-

۱- نیابتی زر کاغذی گویا اس زر فلزاتی کی رسید ہوتی ہے جو کسی بنک میں یا ساہوکار کے پاس جمع کیا جائے کسی زمانے میں لوگ اپنا اندوختہ چوری وغیرہ کے خوف سے دوسروں کے پاس رکھ دیتے تھے اور اُن کو کچھ فیس بھی بطور معاوضۂ نگرانی دیتے تھے حالانکہ آج کل جو لوگ کچھ زر بنک میں داخل کرتے ہیں اُن کو خود بنک سود دیتا ہے - اس فرق کا باعث صاف ظاہر ہے پہلے زمانے میں جمع شدہ زر کی صرف نگہداشت کی جاتی تھی اور اب اس سے کاروبار چلانا بھی نہایت سہل ہے اس زمانے میں سُنار خاص طور پر دوسروں کے اندوختوں کی نگہداشت کیا کرتے تھے - اس غرض کے لیئے انھوں نے مضبوط تہ خانے بنوا رکھے تھے اور چوکیداروں کو بھی ملازم رکھتے تھے کُل مصارف ادا کرنے پر بھی فیس نگہداشت سے اُن کو کچھ نہ کچھ بچ رہتا ہو گا ورنہ ایسی ذمہ داری وہ اپنے سر کیوں لینے لگے جو شخص اس طور پر اپنا زر جمع کرتا تھا اُس کو رسید دی جاتی تھی - بنکوں کا رواج ہونے سے نگہداشت اندوختہ کا کام سُناروں کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن ایسا نمائندہ زر کاغذی بعض ممالک میں اب تک رائج ہے چنانچہ امریکا میں لوگ اپنا زر مسکوک سرکاری خزانے میں داخل کر کے اس کی باضابطہ رسید لے لیتے ہیں اور یہ رسید

مثل زرِ چلتی ہے کسی کو اس کے قبول کرنے میں عذر نہیں ہوتا اس رسید کا پیش کنندہ ہر وقت سرکاری خزانے سے زرِ مندرجہ وصول کرنے کا مجاز رہتا ہے سونے چاندی کے سکوں کی بڑی بڑی مقدار کس قدر وزنی ہوتی ہے اور ان کے مقابل ان سرکاری رسیدوں کا استعمال کس قدر آسان ہے۔ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء کو امریکہ میں ایسی بے شمار رسیدیں بقدر دو ارب ساڑھے پینتیس کروڑ [illegible] جاری تھیں ان رسیدوں کو جدا جدا **پروانۂ طلا و نقرہ** اور مجموعی طور پر **نیابتی زرِ کاغذی** کہتے ہیں۔

ب۔ اعتباری زرِ کاغذی وہ نوٹ کہلاتے ہیں جن کو سرکار یا کوئی بینک اس وعدے پر جاری کرے کہ ان کے پیش کنندہ کو بوقتِ مطالبہ فوراً زرِ فلزاتی بقدر مندرجہ نوٹ ادا کر دیا جائے گا گویا وہ ادائی زرِ فلزاتی کے تحریری وعدے ہیں اور ان کے پیش کنندہ جب چاہیں وعدے کی تکمیل کرا لیں۔ ایسے نوٹوں کے رواج کی بنا نوٹ جاری کرنے والے کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر عوام کو اس کے وعدے پر پورا بھروسہ ہوگا تو لوگ بلا تامل ایسے نوٹ مثل زر استعمال کرنے لگیں گے۔ تکمیل وعدہ کی بھی کسی کو جلدی نہ ہوگی اور بہت سے نوٹ برسوں گھومیں گے اور ان کو پیش کر کے زرِ فلزاتی کا مطالبہ کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔ کثرتِ استعمال سے اوّل تو لوگ اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس سالہا سال نوٹ رکھے رہیں مگر ان کے بھنانے کا دل میں خیال تک نہیں گزرتا۔ مزید براں لوگ خود آپس میں

نوٹوں کا زرِ فلزاتی ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں جس طرح کہ روپے کے بیچے ملتے ہیں نوٹ کے روپے بھی اسی طرح ملنے لگے ہیں۔ مدتوں تک نوٹ جاری کرنے والے سے ادائی زرِ فلزاتی کا مطالبہ نہ کرنے سے ایک نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ نوٹ جاری کرنے والے کو کل نوٹوں کے ہم قدر زرِ فلزاتی موجود رکھنا نہیں پڑتا بلکہ صرف ایک مناسب جزو مثلاً تیس یا چالیس فی صدی کفایت کرتا ہے؛

فرض کرو کہ دس کروڑ روپے کے قیمتی نوٹ جاری کیئے جائیں۔ اب چونکہ یہ کل نوٹ ایک ہی وقت پیش نہیں ہو سکتے اور بہت سے مدتوں واپس نہ آئیں گے دس کروڑ کی بجائے تخمیناً تین چار کروڑ روپے موجود رکھنا مطالبات ادائی پورے کرنے کے واسطے کافی ہوگا۔ اس طرح پر گویا محض اعتبار کی بنا پر تین چار کروڑ روپے سے دس کروڑ کا کام چل سکتا ہے۔ واضح ہو کہ اعتبار میں اضافۂ دولت کی بہت قابلیت ہے۔ اس واقعے کی ہم آئندہ بھی تشریح کریں گے۔ یہاں مجمل اشارہ کافی ہے؛

بعض ممالک میں تو سرکار نے سکے کی مانند نوٹ جاری کرنا بھی اپنے واسطے مخصوص کر لیا ہے اور کہیں یہ کام بپابندی قوانین بنکوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں نوٹ سرکار کی طرف سے جاری ہوتے ہیں اور ولایت میں انگلستان بنک نوٹ جاری کرتا ہے البتہ سرکاری قوانین کی پابندی اس پر لازم ہے؛

زرِ فلزاتی کی جو مقدار ادائی نوٹ کے واسطے موجود

رکھی جائے اصطلاحاً سرمایۂ محفوظِ زرِ کاغذی کہلاتی ہے زرِ کاغذی اور اُس کے سرمایۂ محفوظ کی مقدار میں کیا نسبت رکھنی چاہیئے ایک نہایت دشوار اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اور اس کا جواب ہر ملک کی معاشی حالت سے متعلق ہے۔ یہ طویل بحث بنک اور زرِ کاغذی کی ایک جداگانہ کتاب کے واسطے موزوں ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

واضح ہو کہ اعتباری زرِ کاغذی کو بدل پذیری زرِ کاغذی بھی اس لیئے کہتے ہیں کہ مطالبہ کرنے پر زرِ فلزاتی بقدرِ مندرجۂ نوٹ فوراً مِل سکتا ہے حالانکہ بعض زرِ کاغذی میں یہ صفت مفقود ہوتی ہے چنانچہ ایسی قسم ذیل میں بیان کی جاتی ہے:-

ج - رسمی زرِ کاغذی سب سے زیادہ عجیب زر ہے۔ نہ تو وہ جمع شدہ زرِ فلزاتی کی رسید ہوتی ہے اور نہ ادائی زرِ فلزاتی کا وعدہ سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ دو دو اُنگل کے بے قیمت پرزے بذاتِ خود زر شمار ہوتے ہیں اور بیش قدر فلزاتی کی مانند چلتے ہیں۔ گویا کسی کاغذ کے ٹکڑے پر روپیہ چھاپ دیا اور وہ زرِ کاغذی بن کر رائج ہو گیا۔ یہی وہ زر ہے جو حیثیت زرِ کاغذی کہلاتا ہے۔ اس کو انتہائی قسم کا زرِ وضعی سمجھنا چاہیئے کہ اس کی قدرِ قانونی قدرِ کاغذی سے صد ہا گنی زیادہ ہو۔ حیرت ہو گی کہ لوگ ایسا زر کیونکر قبول کر لیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ آجکل عام بیداری کے زمانے میں محض قانون کے زور سے ایسے زر کا اجرا بالجبر محال ہے۔ لیکن بعض حالتوں میں عوام برضا و رغبت ایسا زر قبول کر لیتے ہیں جب زرِ فلزاتی کی قلت ہو اور کاروبار کے واسطے زیادہ زر درکار ہو تو ایسی کمی

زرِ کاغذی سے پوری کی جا سکتی ہے ۔ کچھ رسم و عادت کی بدولت اور کچھ قانونِ گرشم کے عمل سے اب ایسا زر بلا تکلف مدتوں تک رائج رہ سکتا ہے چنانچہ بعض دور اُفتادہ مقامات میں وہ اب تک جاری ہے ۔

اسی طرح پر اگر کوئی مُلک جنگ میں مصروف ہو اور مصارفِ جنگ بیرونی ممالک کو زرِ فلزاتی قدرِ فلزاتی کے حساب سے ادا کیا جائے تو اندرونِ مُلک میں زر کی قلت نمودار ہونی اغلب ہے ۔ مزید براں اندرونِ مُلک مصارفِ جنگ کے واسطے بھی زر درکار ہوگا ۔ ایسی حالت کچھ وطن پرستی کے جوش میں اور کچھ مجبوری کے خیال سے لوگ زرِ کاغذی قبول کرنے لگتے ہیں چنانچہ اس طرح پر روس امریکہ اور فرانس میں زرِ کاغذی رائج ہو چکا ہے ۔ ایک مرتبہ انگلستان پر بھی ایسا نازک وقت آن پڑا تھا ۔ ۱۷۹۷ء سے ۱۸۱۹ء تک نوٹوں کی ادائی قانوناً بند کر دی گئی گویا اعتباری زرِ کاغذی رسمی زرِ کاغذی رہ گیا ۔ لیکن چونکہ رسمی زرِ کاغذی انتہائی درجے کا زرِ وضعی اور ابتر ترین قسم کا زر ہوتا ہے ۔ روشن خیال حکومتیں اسکو پسند نہیں کر سکتیں اور اگر بحالتِ مجبوری اس کو کبھی جاری بھی کرتی ہیں تو مالی حالت بہتر ہونے پر جلد سے جلد اس کو زرِ فلزاتی میں تبدیل کر دیتی ہیں ۔ بہرحال رسمی زرِ کاغذی متعدد ممالک میں جاری رہ چکا ہے اور بعض میں اب تک بھی ہے ۔ نیز تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ اگر زرِ فلزاتی کی قلت ہو اور زرِ کاغذی سے صرف یہ کمی پوری ہو اور بس تو زرِ کاغذی قدرِ قانونی کے حساب سے چل سکتا ہے لیکن اُس کی مقدار جتنی بڑھے گی اس کی قدر بھی قدرِ قانونی سے

گھٹنے کی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ہم ابھی مضرتوں کے تحت میں بحث کریں گے۔

رسمی زرِ کاغذی کو غیر بدل پذیری زرِ کاغذی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پیش کنندہ سے زرِ فلزاتی اقدرِ مندرجہ ادا کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا جاتا اور نہ کوئی ایسی ذمہ داری لی جاتی ہے۔ اعتباری زرِ کاغذی کی مانند رسمی زرِ کاغذی بھی یا تو سرکار بطور خود جاری کرتی ہے یا بنکوں کے ذریعے سے۔ نیز واضح ہو کہ رسمی زرِ کاغذی کبھی تو شروع ہی سے علانیہ اس حیثیت سے جاری کیا جاتا ہے اور کبھی اعتباری زرِ کاغذی بھی جاری کنندہ کی مجبوریوں سے غیر بدل پذیر ہو کر مدتِ دراز یا قلیل کے واسطے اس درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ نیز بعض رسمی زرِ کاغذی صرف وقتِ معینہ تک غیر بدل پذیر ہوتا ہے جس کے گزرنے کے بعد سرکار بتدریج اس کو زرِ فلزاتی میں تبدیل کرنا شروع کر دیتی ہے اور بعض رسمی زرِ کاغذی ہمیشہ جاری رکھنا مقصود ہوتا ہے رسمی زرِ کاغذی میں زرِ وضعی کی خرابیاں بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں البتہ اگر حالات موزوں میں مناسب مقدار جاری کی جائے تو قدرِ قانونی کے حساب سے اس کا چلنا دشوار نہیں لیکن بصورتِ دیگر رسمی زرِ کاغذی کی قدرِ اصلی قدرِ قانونی سے بدرجہا گھٹ جانی یقینی ہے۔

زرِ کاغذی کی خوبیاں

۳۔ اگرچہ سونا نہایت بیش قیمت دھات ہے لیکن آجکل کاروبار کی مقدار اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر خرید و فروخت میں سونے کے سکے بھی ادا کیے جائیں تو اُن کا وزن نہایت دقت طلب اور تکلیف دہ ہوگا۔ صرف لندن کے صرافے لمبارڈ اسٹریٹ میں اوسطاً تین کروڑ پونڈ یعنی تیس کروڑ روپے روزانہ کا لین دین ہوتا ہے اور ہر ملک کے کاروباری مرکز میں ایسے

بہت سے صرافے قائم ہیں۔ اب اگر وہ سب کے سب [illegible]
کئے جائیں تو صرف لندن کے صرافخے میں تخمیناً [illegible]
سے روزانہ کاروبار ہوتا ہے اور چاندی سے [illegible]
تیس ہزار من ہوگا۔ اگر سالوں تک [illegible]
منتقل کرنے پڑیں تو کاروبار چل [illegible]
[illegible] میں عمدہ زر کے مذکورۂ اوصاف [illegible]
بیش قیمت ہوتی کہ [illegible]
کم رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہیرے جواہرات [illegible] سے زیادہ
قیمتی ہوتے ہیں لیکن بوجوہات مذکورہ بالا وہ استعمال نہیں ہو سکتے
بعض دھاتیں بھی مثلاً ریڈیم و پلیٹینم [illegible] سے زیادہ قیمت رکھتی
ہیں لیکن چند تولوں سے زیادہ اب تک [illegible] نہیں ہو سکیں اور
بحیثیت زر ان کا حال بھی کم و بیش جواہرات کا سا ہے۔ [illegible] سکوں کی
گرانباری سے بچنے کے لئے چند در چند طریق ایجاد کئے گئے
ان میں سے ایک خاص تو زر کاغذی ہے اور باقی دو یعنی ہنڈی و چیک
علے الترتیب مبادلات خارجہ اور بنک کے تحت میں آئندہ بیان
کئے جائیں گے ؛

زر کاغذی کے ہلکے پن کے کیا کہنے۔ دو انگل کے پرزے پر
چاہے جتنی بڑی مقدار زر چھاپ دیجئے۔ دس دس ہزار کے دس
ہندوستانی نوٹ لے کر ایک لاکھ روپے چھوٹے سے چرمی بٹوے
میں رکھ لیجئے اور بلاتکلف ساتھ لئے پھریئے۔ گویا دس روپے بھر بھی
بار نہیں۔ چنانچہ نوٹوں کے رواج کا ایک بڑا باعث ان کا ہلکا پن
ہے۔ ولایت میں سونے کے سکے بہ نسبت نوٹ بہت کم کام آتے
ہیں۔ ورنہ اکثر بڑے بڑے لین دین نوٹوں کی شکل میں تکمیل پاتے ہیں۔
حاصل کلام یہ کہ آج کل کے کثیر المقدار کاروبار کے واسطے سونے
کے سکے بھی نہایت گراں بار ہیں۔ اور زر کاغذی کا ہلکا پن اس کے رواج کا

حصہ چہارم
باب سوم

ایک بڑا سبب ہے۔

زرِ کاغذی کی خوبی کے متعلق ایک یہ بحث بھی نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے کہ آیا اس سے دولت میں بھی کوئی حقیقی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں بظاہر تو یہ خیال کہ کاغذ کے ٹکڑوں پر زر کی بڑی بڑی مقدار چھاپ کر دولت پیدا کی جا سکتی ہے سراسر لغو اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن غور اور مشاہدے کے بعد معاملہ اس کے برعکس نظر آئے گا۔ زرِ کاغذی سے دولت میں ایک حد تک اضافہ ضرور ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ زرِ کاغذی کی کوئی مقدار جاری کر کے ہم دولت میں حسبِ دلخواہ اضافہ کر سکیں۔ زرِ کاغذی کا اجرا نہایت دشوار معاشی فن ہے جس میں بہت کم لوگوں کو مہارتِ تامہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے اصول دقیق اور پیچیدہ ہیں اور ان کے عملدرآمد کے واسطے جید وسعتِ معلومات اور باقاعدہ ضروری ہے۔ اجرائے زرِ کاغذی کے اصول سے یہاں مفصل بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں سے یہ جتانا مقصود ہے کہ زرِ کاغذی سے دولت میں کیونکر اضافہ ممکن ہے۔ نیز آگے چل کر نقائص کے تحت میں واضح ہوگا کہ کس حالت میں زرِ کاغذی اضافۂ دولت سے معذور ہو سکتا ہے۔

اعتباری زرِ کاغذی کا رواج آج کل ہر ملک میں بڑھا ہوا ہے اور یہ ابھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ اس میں زرِ کاغذی کی بیشترین خوبیاں اور کمترین نقص پائے جاتے ہیں۔ ہلکے پن کی خوبی تو سب قسم کے زرِ کاغذی میں عام ہے۔ رہا اضافۂ دولت کا، نیابتی زرِ کاغذی سے تو صرف بوجہ ہلکے پن کے لین دین میں سہولت ہوتی ہے۔ دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ہم قدر زرِ مسکوک سرکاری خزانے میں بیکار پڑا رہتا ہے۔

رسمی زرِ کاغذی انتہائی درجے کا زرِ وضعی ہے اور اس کے کل نقائص بدرجۂ اولیٰ اس میں موجود ہیں اس کے اجرا میں اگر پوری پوری احتیاط برتی جائے جو نہایت دشوار ہے تو بطور زرِ فلزاتی اس کا رواج ممکن ہے اور اس طرح پر زرِ کاغذی کی جتنی مقدار رائج

بحث چہارم

وہ گویا دولت میں اضافہ شمار ہوگی لیکن ذراسی بے احتیاطی سے اس کی قدر میں بیحد تخفیف ہونی اغلب ہے۔ اس واقعے سے نقصانات [illegible] قسمت میں ہم ابھی پھر بحث کریں گے۔ یہاں یہ جتانا مقصود ہے کہ رسمی زرِ کاغذی کا استعمال بہت احتیاط طلب اور خطرناک ہے، اس سے اضافۂ دولت ممکن ہے لیکن ایسے اضافے کا ثبات نہایت دشوار ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد زرِ کاغذی کی قدر میں اس قدر تخفیف ہوتی ہے کہ کُل اضافہ غائب ہوجاتا ہے اور عوام طرح طرح کی مالی دقتوں میں مبتلا ہو کر تباہ ہوجاتے ہیں اور ملک کی حالت درست کرنی دشوار ہوجاتی ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ نیابتی زرِ کاغذی سے تو دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور رسمی زرِ کاغذی سے جو اضافہ ہوتا ہے وہ دیرپا کم ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس اعتباری زرِ کاغذی سے دولت میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور وہ مقابلۃً دیرپا بھی ہے۔

اعتباری زرِ کاغذی کی مذکورالصدر خوبی کا باعث درحقیقت وہ میانہ روی ہے جو اس کے اجرا میں اختیار کی جاتی ہے نہ تو نیابتی زرِ کاغذی کے مانند اس کا ہم قدر زرِ فلزاتی بغرضِ ادائی ہر وقت موجود رکھا جاتا ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ بیکار پڑا رہے اور نہ رسمی زرِ کاغذی کی طرح وہ بغیر کسی سرمایۂ محفوظ کے جاری کیا جاتا ہے کہ زرِ فلزاتی سے اس کی ادائی ممکن نہ ہو اور ذراسی کثرت سے اس کی قدر بے حد گھٹ جائے بلکہ اعتباری زرِ کاغذی میں زرِ فلزاتی بقدرِ مندرجہ بوقتِ مطالبہ فوراً ادا کرنیکا وعدہ ہوتا ہے اور جب کہ زرِ کاغذی جاری کرنے والے پر لوگوں کو پورا اعتبار ہوتا ہے تو اس وعدے کی تکمیل کی کسی کو عجلت نہیں ہوتی مدتوں لوگ نوٹ آپس میں برتتے اور بھناتے رہتے ہیں اور عرصے بعد سرکاری خزانے یا بنک میں بغرضِ ادائے زرِ فلزاتی پیش کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ کُل جاری شدہ نوٹوں کی مجموعی قدر کا صرف ایک مناسب حصّہ بشکل زرِ فلزاتی بغرضِ ادائی موجود رکھنا کافی ہوتا ہے۔ مثلاً دس کروڑ روپے کے نوٹ

جاری کیے جائیں تو ان میں سے صرف تھوڑے تھوڑے ایک وقت میں ادائی زرِ فلزاتی کے واسطے پیش کیے جائیں گے اور ہر وقت تخمیناً ۳۰-۴۰ فی صدی زرِ فلزاتی بطور سرمایۂ محفوظ موجود رکھنا ادائی کے واسطے کافی ہوگا گویا اس طرح دس کرور روپیہ سے بذریعہ اجرائے زرِ کاغذی دس کرور کا کام نکلے گا۔ اور دولت میں بقدر دس کرور اضافہ ہو جائے گا۔ نیز جب تک یہ یقین ہے کہ وقت آنے پر ادائی بشکل زرِ فلزاتی یقینی ہوگی ان کی قدر میں تخفیف محال ہوگی۔ البتہ اگر کسی اہم انقلاب کی وجہ سے نوٹ جاری کرنے والے کا اعتبار گھٹ جائے تو قدر میں تخفیف ہونی اغلب ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ مدت ہائے دراز تک اعتباری زرِ کاغذی مثل زرِ فلزاتی مقررہ قدر کے حساب سے جاری رہتا ہے اور اس کا باعث وہی اعتبار اور یقینی ادائی زرِ فلزاتی ہے۔

سنہ ۱۸۷۰ء کی مشہور جنگ فرانس و جرمنی میں فرانس بہت زیر بار ہوا۔ اوّل تو بہت سا زرِ فلزاتی غیر ممالک کو چلا گیا جہاں سے سامان جنگ خریدا جاتا تھا۔ دوم ایک رقم کثیر جرمنی کو بطور تاوان دینی پڑی۔ زر کی بہت قلت ہوگئی بالآخر فرانس نے بقدر ایک ارب روپیہ کے اندرون ملک زرِ کاغذی رائج کیا تب کہیں کام چلا اب اگر یہ رقم کثیر فرانس کسی دوسرے ملک سے قرض لیتا تو اس حالت میں اس کو کم از کم ۵ فی صدی کے حساب سے پانچ کرور سالانہ سود دینا پڑتا۔ اوّل تو زر کی قلت تھی۔ دوم قوم بیدار تھی اور اپنے نفع نقصان کو خوب سمجھتی تھی زرِ کاغذی کے اجرا میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور جوں جوں مالی حالت سدھرتی گئی زرِ کاغذی بھی زرِ فلزاتی میں تبدیل ہوتا گیا حتیٰ کہ اس کی مقدار گھٹتے گھٹتے رسمی زرِ کاغذی کے بجائے وہ اعتباری زرِ کاغذی بن گیا یعنی زرِ فلزاتی کی کثرت سے ایسے نوٹوں کی ادائی پورے طور پر یقینی ہوگئی۔ فرانس کی طرح دیگر ترقی یافتہ ممالک نے بھی مالی دقتوں کی حالت میں زرِ کاغذی سے فوری اضافۂ دولت کا کام لیا ہے مگر بعد کو حالت بہتر ہوتے ہی زرِ کاغذی کی مقدار گھٹا کر اور

زرِ فلزاتی کی بڑھا کر ان میں اتنا [illegible] ہے کہ [illegible] کاغذی [illegible]
بھی غیر اعتباری بن گیا۔

جزیرہ گرنسی کے گورنر نے اس [illegible] جزیرہ [illegible] ایک بازار تیار کرانا چاہا لیکن خزانہ کی [illegible] اس نے ساڑھے چار ہزار روپے [illegible] قرار دے دیا اور جو لوگ بازار بنا رہے تھے ان کو اجرت میں وہی نوٹ دے دیئے جب بازار تیار ہو گیا تو اس کی آمدنی سے [illegible] سال میں وہ کل نوٹ زرِ فلزاتی میں ادا کر دیئے گئے اور اس طرح پر بظاہر ایک پیسہ صرف ہوئے بغیر ایک بڑی جائداد بن گئی۔

زرِ کاغذی کا رواج ہر ترقی یافتہ ملک میں پھیلا ہوا ہے فرانس میں تخمیناً پانچ ارب روپے قیمتی زرِ فلزاتی سے کاروبار چلتا ہے اور انگلستان میں صرف دو ارب ہے اور طرفہ یہ کہ انگلستان کا کاروبار فرانس سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ علاوہ کاروباری طریق اخلاقات کے اس فرق کا باعث زرِ کاغذی کا رواج بھی ہے۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ صرف اعتباری زرِ کاغذی کے ذریعے سے برطانیۂ عظمیٰ اور آئرلینڈ میں زرِ نقد پچاس کروڑ بڑھا لیا گیا ہے۔ اور اس پر رقم کثیر بطور سود حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ جتانا بے محل نہ ہوگا کہ زرِ کاغذی صحیح طور پر رائج کرنا بعید دشوار کام ہے۔ اس کے اصول و طریق کی تفصیل نہایت پیچیدہ اور طویل ہے۔ خود ماہرین میں بھی بہت اختلافِ رائے پھیلا ہوا ہے۔ ہم نے چند خاص اصولوں کا حسبِ موقع مجملاً ذکر کر دیا ہے مفصل بحث کی موجودہ کتاب میں گنجائش نہیں۔ اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب موزوں ہوگی۔

زرِ کاغذی کے نقائص

۴۔ زرِ کاغذی کے نقائص کی طرف اس سے قبل بھی جا بجا اشارہ کیا جا چکا ہے یہاں اُن کو یکجا پیش کیا جاتا ہے:۔

پرچہ ۳

نمبر ۱
پیپر سوم

ا۔ زرِ کاغذی کی قدر از حد ضعیف البنیان ہے۔ اگر سرکار مالی دقتوں میں مبتلا ہو کر نیا تجی یا اعتباری زرِ کاغذی کو زرِ فلزاتی میں ادا کرنے سے مدت دراز تک معذور ہو جائے یا نا سمجھی کے انتخاب سے موجودہ زرِ کاغذی غیر مروج قرار دے دیا جائے تو لوگوں کے پاس دو دو کوڑی کے کاغذی پرزوں کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا۔ گویا زرِ کاغذی کی قدر سراسر قانونی ہے اور وہ حکومت کی خوش حالی اور اس کے استحکام پر سرتاپا منحصر ہے۔ زرِ کاغذی کی قدرِ کاغذی تو ناقابلِ لحاظ ہے اسکے برعکس زرِ فلزاتی میں علاوہ قدرِ قانونی کے قدرِ فلزاتی بھی ہوتی ہے زرِ مستند کے غیر مروج قرار پانے سے تو اس کی قدر میں بہت کم فرق پڑے گا لیکن زرِ وضعی بھی غیر مروج ہونیکے بعد کچھ نہ کچھ قدرِ فلزاتی قائم رکھ سکے گا۔ زرِ کاغذی کی طرح وہ بھی سراسر بے قدر نہ ہو جائے گا۔ سونا چاندی ہی دھاتیں علاوہ زر کے اور بہت سے مصنوعات میں بھی کام آتی ہیں اور اگر بطور زر ان کا استعمال ترک بھی ہو جائے تو ان کی قدر میں کوئی انتہائی فرق نمودار نہ ہوگا قدر گھٹے گی ضرور مگر بہت زیادہ نہیں۔

ب۔ زرِ کاغذی کی قدر سراسر محدود اور مقامی ہوتی ہے زر کی قدرِ قانونی تو صرف سلطنتِ متعلقہ کے اندر اندر قبول کی جاتی ہے۔ زرِ فلزاتی دوسرے ممالک میں بجائے قدرِ قانونی قدرِ فلزاتی کے حساب سے چلتا ہے لیکن بلا تکلف چل سکتا ہے۔ اس کے برعکس چونکہ زرِ کاغذی کی قدر سراسر قانونی ہوتی ہے اور قدرِ کاغذی کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس لیئے زرِ کاغذی دوسرے ممالک میں

نہیں چل سکتا۔

ب۔ واضح ہو کہ بعض زرِ کاغذی جن کی ادائی بشکلِ زرِ فلزاتی بالکل یقینی ہو دیگر ممالک میں بھی چند روز تک رواج پاتا ہے۔ مثلاً انگلستان بنک کے نوٹ دیگر ممالک میں بھی قبول کر لئے جاتے ہیں لیکن زر جلد اپنے ملک میں پہنچ جاتے ہیں۔ مدت تک اور کثرت سے وہ دوسرے ممالک میں رائج نہیں ہو سکتے اور رسمی زرِ کاغذی تو بیرونِ ملک محض کاغذی پرزہ رہ جاتا ہے۔

ج۔ قدرِ زر کے تحت میں آگے چل کر واضح ہوگا کہ اگر زرِ فلزاتی خواہ وہ زرِ مستندی ہی کیوں نہ ہو کاروباری ضروریات سے زیادہ مقدار میں جاری کر دیا جائے تو اس کی قدر میں تخفیف ہو جائے گی پس جب زرِ کاغذی جس کی اصل رضعی ہے، ضرورت سے زیادہ مقدار میں جاری کیا جائے تو اس کی قدر کے اس سے کہیں زیادہ گھٹنے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ زرِ فلزاتی تو دھاتوں کی رسد پر منحصر ہے اور دھاتوں کی رسد محدود ہے۔ نیابتی زرِ کاغذی بھی زرِ فلزاتی کا پورا پابند ہے۔ اور اعتباری زرِ کاغذی کے اضافے پر بھی ضروری سرمایۂ محفوظ کی حد قائم ہے لیکن رسمی زرِ کاغذی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ گورنمنٹ جس قدر چاہے چھاپ کر جاری کر دے۔ تجربے سے بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر رسمی زرِ کاغذی کی بھی مقدار مناسب حدود کے اندر اندر رکھی جائے تو بلا دقت قدرِ قانونی کے حساب سے وہ چل سکتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۷۹۷ء سے سنہ ۱۸۱۹ء تک بنک انگلستان کے نوٹوں کی ادائی بشکلِ زرِ فلزاتی بند رہی اور بلا تخفیفِ قدرِ قانونی

اس عرصے تک وہ بطور رسمی زرِ کاغذی جاری رہے۔ بنک فرانس کے نوٹ جو رسمی زرِ کاغذی ہیں اور قدرِ قانونی کے حساب سے بلا تکلف جاری ہیں تو وجہ یہ ہے کہ جاری کرنے والے ماہرین مالیات ہیں نیز اُن کی مقدار نہایت مناسب رکھی ہے۔ لیکن رسمی زرِ کاغذی کی تاریخ نہایت افسوسناک واقعات سے لبریز ہے جن کو پڑھ پڑھ کر آج عبرت و ہدایت حاصل کی جا رہی ہے جب کہ رسمی زرِ کاغذی اوّل اوّل رائج ہوا تو اس کے اصول کا نہ پورا پورا علم تھا اور نہ اس کے عمل کا طریقہ۔ تجربہ ایسے زر سے ابتدا ہی سے میں چونکہ واسطے کاغذ چھپوانے اور کوئی زحمت ہی نہ تھی۔ کبھی تو مالی ضروریات کے دباؤ سے اور کبھی حرص و طمع کے اثر سے رسمی زرِ کاغذی مقدار مناسب سے بہت زیادہ رائج کر دیا گیا جس کا نتیجہ از حد تخفیفِ قدر نکلا۔ مثلاً عام طور پر فرانس جس میں سے خستہ حال ہو کر اٹھارھویں صدی کے آخر میں فرانس نے رسمی زرِ کاغذی جاری کیا جو ضرورت سے بیس گنا زیادہ تھا۔ اب اگر زرِ فلزاتی کی بھی اتنی زیادہ از ضرورت مقدار جاری کی جاتی تو اس کی قدر میں یقیناً تخفیف پیدا ہو جاتی اور پھر رسمی زرِ کاغذی کے تو کہنے ہی کیا ہیں اس کی قدر میں اس قدر تخفیف ہوئی کہ فروری ۱۷۹۶ء میں ایک جوڑا جوتا ڈھائی ہزار روپے والے زرِ کاغذی کو فروخت ہوا۔

جب کہ زرِ کاغذی کی قدر میں تخفیف نمودار ہوتی ہے اور زرِ فلزاتی کی سابق قدر بحال رہتی ہے تو دونوں کی قدرِ قانونی مساوی ہوتی ہے۔ قانون گریشم کے مطابق

زرِ فلزاتی جو کہ بہتر زر ہے غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے اور زرِ کاغذی جو کہ بدتر زر ہے ہر طرف گردش کرتا ہے۔ بالآخر کاروبار میں زرِ فلزاتی اور زرِ کاغذی کی قیمتوں میں باوجودیکہ وہ مساوی القدر ہیں فرق نمودار ہو جاتا ہے۔ مثلاً بیس روپے قیمتِ قانونی والا زرِ کاغذی جو اصلیت میں قدرِ قانونی اسی زرِ فلزاتی کا ہم مقدار مانا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تمام چیزوں کے دو نرخ قرار پا جاتے ہیں یعنی اب زرِ کاغذی کے لحاظ سے گراں فروخت ہوتی ہیں اور بحساب زرِ فلزاتی بنسبت ارزاں مثلاً اگر قیمت زرِ کاغذی میں ادا کی تو بیس روپے قیمتِ قانونی والا زرِ کاغذی طلب کیا جائے گا اور اگر زرِ فلزاتی میں تو صرف پانچ روپے کافی ہوں گے۔ روس، امریکہ اور فرانس کو شروع شروع میں زرِ کاغذی کی تخفیفِ قدر کا جو تلخ تجربہ اٹھانا پڑا وہ تاریخِ زرِ کاغذی میں اب تک بطورِ عبرت و ہدایت پیش کیا جاتا ہے۔

جب کہ زرِ کاغذی کی قدر میں تخفیف نمودار ہو تو ثابت ہوا کہ ضرورت سے زیادہ مقدار رائج ہے پس مزید اجرا کو فوراً بند کر کے زرِ کاغذی کی مقدار گھٹانے کی فکر کرنی چاہیئے اور اس کا آسان طریق یہ ہے کہ زرِ کاغذی جوں جوں سرکاری خزانے میں آئے ضایع کر دیا جائے حتیٰ کہ زرِ کاغذی اور زرِ فلزاتی کی قدر برابر آ جائے، اس طریق سے زرِ کاغذی کی مقدار گھٹانے میں سرکار کو فوری نقصان ضرور برداشت کرنا پڑے گا اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ سرکاری مصارف سے زیادہ ہو۔

اگر ضرورت سے زائد زرِ کاغذی کا رواج بحال

رکھا جائے تو تخفیفِ قدر کی بدولت ملک ایسے بھنور میں پھنس جائے گا۔ اس سے کاروبار کی کشتی صحیح سلامت نکالنی دشوار ہو جائیگی اور اجرائے زرِ کاغذی سے ملک کو جو فوری نفع پہنچا ہوگا اُس سے بدرجہا زیادہ مضرت آخر میں اُٹھانی پڑے گی۔

مقدارِ زر کا تعین ہر ملک کی ضروریات اور معاشی حالت سے متعلق ہے اس کا کوئی عام اصول قرار دینا محال ہے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مقدار ضرورت کے ہم پلہ ہو زیادہ نہ ہو۔

باب بست و چہارم

تجارت بین الاقوام

(۱) قوم کا معاشی مفہوم (۲) تجارت بین الاقوام اور اُس کی صورتیں (۳) قدر و قیمت بین الاقوام (۴) اقسام تجارت (۵) آزاد تجارت (۶) تجارت باصول (۷) تفریق اقوام (۸) زراعت اور صنعت و حرفت (۹) قوم کے معاشی وسائل اور اُن کا استعمال (۱۰) طریق تامین کی تفصیل (۱۱) محصول تامین محصول مال۔

قوم کا معاشی مفہوم

۱۔ تجارت بین الاقوام کی بحث میں سب سے اوّل قوم کا مفہوم تشریح طلب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ قوم میں وہ کُل گروہ داخل ہے جو کسی خطۂ زمین میں آباد ہو۔ ایک حکومت کے تابع ہو۔ اور اکثر ایک ہی زبان بولتا ہو۔ نیز اُس میں اگرچہ مذہب اور رسم و رواج کا یکساں ہونا لازمی نہیں مگر اغلب ضرور ہے۔ اس مُلکی۔ سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی یکسانیت کا معاشی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنت اور اصل قوم کے درمیان از حد انتقال پذیر ہوتا ہے۔ حدودِ قوم کے اندر اندر بہ تلاش روزگار مزدور بلا دقت گھومتے ہیں اور لوگوں کو شغل اصل میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا۔ قوم کی مذکورۃ الصدر تعریف مثبت ہے اور اسی سے منفی نتائج نکالے گئے ہیں جو قوموں کے مابین حدِ فاصل کا کام دیتے ہیں یعنی جبکہ دو گروہ میں مذکورۂ بالا یکسانیت مفقود ہو مثلاً دور اُفتادہ خطوں میں آباد ہوں۔ مختلف زبانیں بولیں مختلف حکومتوں کے تابع ہوں اُنکے مذہب ورسم و رواج بھی جدا ہوں۔

حصۂ چہارم
باب بست و چہارم

تو اُن کے درمیان محنت و اصل مقابلۃً بڑی حد تک غیر انتقال پذیر ہوں گے۔ لہٰذا ایک قوم کے دو جداگانہ قوم شمار کئے جائیں گے پس واضح ہوا کہ از روئے معاشیات قوم سے مراد انسانوں کے ایسے گروہ ہیں جن کے درمیان ملکی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی یکسانیت کی بدولت محنت و اصل کافی طور پر انتقال پذیر ہوں۔ گویا ہر قوم کے مقابل باقی دیگر اقوام میں یکسانیت کی بجائے ملکی، سیاسی، مذہبی یا معاشرتی اختلاف پایا جاتا ہے۔ لہٰذا مابین اقوام محنت اور اصل بڑی حد تک غیر انتقال پذیر رہتے ہیں۔ واضح ہو کہ محنت و اصل کی انتقال پذیری و غیر انتقال پذیری جو قوم کی ترکیب اور تفریق کی معاشی علامات قرار دی جاتی ہیں وہ خود بہت کچھ غیر معین ہیں۔ اور ان دونوں میں صرف کمی بیشی یا مدارج کا فرق ہے اور بس۔ ورنہ تمام بیداری اور ذرائع آمد و رفت کی سہولت کی بدولت محنت و اصل کی انتقال پذیری مابین اقوام بھی [illegible] بڑھتی رہتی ہے اور ان کا قطعاً غیر انتقال پذیر ہونا محال ہے۔ اسی تدریج کی بدولت بعض حالتوں میں عملی لحاظ سے قوم کی تفریق بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ لیکن اصطلاحات کا عدمِ تعین تو کل علومِ تمدن اور خصوصاً معاشیات کی عام کمزوری ہے۔ بہرحال اگرچہ مذکورۂ بالا معاشی معیار بالکل معین اور قطعی نہیں تب بھی اکثر موجودہ اقوام پر وہ صادق آتے ہیں اور عملی طور پر شناخت و تفریقِ اقوام میں قابلِ قدر مدد دیتے ہیں۔

ماحصلِ کلام یہ کہ حدودِ قوم کے اندر محنت و اصل بلا تکلف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ان کی یہی انتقال پذیری گویا قوم کی معاشی شناخت مانی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس مابین اقوام محنت و اصل مقابلۃً کم تر نقل پذیر پائے جاتے ہیں جس کو غیر انتقال پذیری سے تعبیر کرتے ہیں۔ تفریقِ اقوام کی معاشی علامات اور بھی ہیں مثلاً احاطۂ قوم کے اندر اگر اجرت یا شرحِ سود میں کہیں

بقدر دس فی صدی اضافہ نمودار ہو تو اس سے مستفید ہونے کے لیئے محنت اور خصوصاً اصل فوراً وہاں جا پہنچتا ہے لیکن اگر حدود قوم کے باہر یعنی دوسری قوم میں اجرت و شرح سود بقدر ۲۰۰ فی صدی بھی زائد پائی جائے تو اصل اور خصوصاً محنت کو مذکور الصدر دقت آمیز اختلافات کی وجہ سے وہاں جانے میں تامل ہوگا اور بیشی شرح سے فائدہ اٹھانا منظور نظر آئے گا۔ لیکن واضح ہو کہ شاید ۵ فی صدی بیشی کے واسطے خود قوم کے اندر اندر ہی اصل انتقال گوارا کرے گا اور سو یا پچاس فی صدی اضافہ کے لیئے دوسری قوم میں بھی پہنچ جائے تو عجب نہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ محنت و اصل کی اصطلاحی انتقال پذیری میں صرف مدارج کا فرق ہے۔ یہ ہر دو صفات نہ قطعی ہیں نہ جداگانہ۔

قوم کے مذکورۂ بالا معاشی مفہوم سے واضح ہوا کہ محنت و اصل کا آزادانہ مقابلہ بیشتر ہر قوم کے اندر جدا جدا محدود ہے۔ اگرچہ قیام امن، توسیع ذرائع آمد و رفت، عام بیداری، گوناگوں معاشی ترقیات کی بدولت محنت و اصل دوسرے ملک اور قوموں میں بھی نسبتاً پہلے سے بہت زیادہ دورہ کرنے لگے ہیں۔ تاہم ان کی اندرون قوم اور بیرون قوم انتقال پذیری میں قابل لحاظ فرق قائم ہے اور بین الاقوام محنت و اصل کا مقابلہ ابھی تک ضعیف ضرور ہے۔ مقابلے کے قوی اور ضعیف ہونے کا نتیجہ جو ہونا چاہیئے موجود ہے۔ ہر قوم کے اندر اندر آزادانہ مقابلے کے دباؤ سے شرح اجرت و سود تقریباً یکساں ہے۔ لیکن اکثر اقوام میں بمقابل یکدگر اب تک مختلف شرحیں جاری ہیں۔ مقابلۂ بین الاقوام اس قدر قوی نہیں کہ ان کو بھی ہموار کر دے۔

المختصر ملکوں کے فاصلے اور آب و ہوا، حکومت، زبان، مذہب اور رسم و رواج کے اختلافات نے بنی نوعِ انسان کو متعدد

حصّۂ چہارم
اب بست و چہارم

اقوام میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر قوم میں محنت و اصل کے آزادانہ مقابلے سے اشرح اجرت و سود ایک ایک سطح پر قائم رہتے ہیں لیکن مزاحمت مقابلہ کی وجہ سے قوموں میں بمقابل یک دگر اب تک مختلف شرحیں جاری ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تالاب کے اندر دیواریں بنا کر پانی کی مختلف پست و بلند سطحیں قائم کر دی جائیں حالانکہ دیواروں کے بغیر کل پانی کی سطح ایک ہوتی ہے۔

تجارتِ بین الاقوام کی صورتیں

۲۔ ایک زمانہ تھا کہ تجارت ہر گاؤں اور قصبے تک جدا جدا محدود تھی یعنی کہ آس پاس کی بستیوں سے بھی چیزیں شاذ و نادر خریدی جاتی تھیں اور علیٰ ہذا مقامی پیداوار باہر بھیجنے کی بھی نوبت کم آتی تھی جو چیز درکار ہوتی خود اُس بستی میں تیار ہوتی اور جو چیز کہیں تیار ہوتی وہ اکثر وہیں صرف میں آجاتی تھی۔ آج تجارت کی وسعت کے کیا کہنے تمام دُنیا پر اس کا جال پھیلا نظر آتا ہے۔ بیشمار قسم کا اربوں من مال و سامان ریل اور جہاز شب و روز لئے پھرتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک اور بڑے بڑے شہروں کا تو ذکر کیا ہے ہندوستان دیہات کے کچے جھونپڑے میں بھی ناروے سویڈن یا جاپان کی بنی ہوئی دیاسلائی سے جرمنی یا آسٹریا کی لالٹین میں روس امریکہ یا برما کا تیل جلتا ہے تب کہیں اُجالا ہوتا ہے۔ شائد ہی دُنیا کا کوئی ایسا حصّہ ہو جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز ہر مہذب اور خوش حال آدمی کے گھر میں موجود نہ ہو چنانچہ ایک معزز میزبان نے اپنی تقریر مابعد دعوت میں موجودہ ترقیات کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ دُنیا میں کوئی قوم اور ملک ایسا نہ ہوگا جس نے اس دعوت میں کچھ نہ کچھ حصّہ نہ لیا ہو۔ گویا وسعتِ تجارت اور تقسیم عمل کی یہ نوبت آگئی ہے کہ خورونوش سی لابُد ضروریات کی بہم رسانی میں بھی تمام ممالک کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ پس بلحاظِ ضروریات گوناگوں تجارت کی عالمگیری صاف ظاہر ہے۔

غور اور مشاہدے سے واضح ہوگا کہ مختلف اقوام کے درمیان جو تجارت قائم ہے اس کی تین صورتیں ہیں، ان میں سے کوئی نہ کوئی صورت ہر ایسے ملک میں ضرور موجود ہوتی ہے جو تجارت بین الاقوام میں شریک ہو۔

۱۔ جب کسی ملک میں کوئی ضروری چیز پیدا نہ ہو سکے تو مجبوراً شئے مذکورہ دوسرے ملکوں سے منگانی پڑتی ہے۔ تجارت بین الاقوام کی یہ سب سے مقدم صورت ہے۔ مثلاً یہ طریق اختیار کئے بغیر امریکہ چاء اور کافی سے محروم رہتا۔ انگلستان کو انگور اور شراب میسر نہ آتی فرانس کو تانبا دستیاب نہ ہو سکتا۔ ہالینڈ کو عمارت کے واسطے پتھر نہ ملتا۔ غریب ناروے نمک کو ترستا۔ سوئٹزرلینڈ کوئلے کو محتاج رہتا اور منطقہ حارہ کے پھل اور مصالحے یورپ بھر کو نصیب نہ ہوتے۔

تجارت بین الاقوام کی اگر یہ صورت صرف تعیشات تک محدود ہوتی تو زیادہ مضائقہ نہ تھا لیکن غضب تو یہ ہے کہ ناگزیر ضروریات بھی اس میں داخل ہو رہی ہیں۔ اکثر یورپین ممالک میں آبادی بلحاظ رقبہ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ مقامی زرعی پیداوار کل آبادی کی خوراک کے واسطے سراسر ناکافی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ صنعت و حرفت میں اس قدر منہمک ہیں کہ رہی سہی زراعت پر بھی توجہ کم کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اپنی روٹی کے واسطے وہ دیگر ممالک کی زرعی پیداوار کے محتاج ہیں خود انگلستان کو ہر سال سوا چار ارب کا سامان خوراک دیگر ممالک سے خریدنا پڑتا ہے تب کہیں اس کا گذر ہوتا ہے۔ اگر سامان خوراک کی درآمد کسی طرح پر رک جائے تو انگلستان کو چند ہی روز میں روٹی کے لالے پڑ جائیں۔ لیکن انگلستان کے مقبوضات

تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تجارت بین الاقوام کا مال بیشتر انگریزی جہازوں میں آتا جاتا ہے اور نیز برطانوی بیڑا دنیا میں کسی دو بڑی بڑی سلطنتوں کے بیڑوں کی مجموعی طاقت سے بھی مسلمہ طور پر بڑھا ہوا ہی رہتا ہے۔ مگر انگلستان کے علاوہ اور یورپین ممالک بھی مقامی پیداوار سے کل آبادی کو غذا مہیا نہیں کر سکتے ہیں اور خوراک درآمد سے کام چلاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حالت فاقہ کشی سے بدرجہا بہتر ہے لیکن فی نفسہ کچھ کم اندیشہ ناک نہیں۔ غذا جیسی اولین اور ناگزیر ضرورت حتے الامکان مقامی پیداوار سے مہیا کرنی چاہیئے۔ سامان خوراک کی درآمد مدتوں تک خواہ کتنی ہی سہل اور مفید نظر آئے لیکن مآل اندیشی کے سخت منافی ہے۔ اور عجیب نہیں کہ کبھی نہ کبھی اسکا عبرت آموز خمیازہ بھگتنا پڑے۔

ب جب کسی ملک میں کوئی چیز پیدا تو ہو سکے مگر مصارف پیدائش بہت زیادہ پڑیں تو شئے مذکورہ ان ممالک سے منگالی جاتی ہے۔ جہاں وہ مقابلتاً ارزاں پیدا ہوتی ہو مثلاً فرانس چاہے تو خود مشین تیار کر سکتا ہے لیکن بیشتی مصارف کے خوف سے وہ اپنے واسطے مشین یا تو انگلستان سے خرید لیتا ہے یا امریکہ سے جہاں علاوہ لوہے اور کوئلے کی کثرت کے مشین بنانے کا خاص اہتمام بھی موجود ہے اور اس لیئے مشین ارزاں تیار ہوتی ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں سیسے کی اس قدر کانیں موجود ہیں کہ ان سے مقامی ضرورت پورے طور پر مہیا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کانیں عموماً بہت زیادہ گہری ہیں اور سیسے کے مصارف پیدائش بہت زیادہ ہونے یقینی ہیں۔ پس امریکہ سیسے کی بڑی بڑی مقدار

دوسرے ملکوں سے خریدنا اپنے حق میں مفید سمجھتا ہے۔
ج - امریکی ہر دو صورتوں میں درآمد والا ملک یعنی جو
دوسرے ملک سے سامان منگاتا ہے سامان درآمد تو
یا تو پیدا نہیں کر سکتا یا اگر کرے بھی تو اس قدر ارزاں نہیں
جتنا کہ برآمد والا ملک کرتا ہے۔ بہر صورت بلحاظ پیدائش
شئے زیر بحث درآمد والا ملک برآمد والے کے مقابلے میں
پس ماندہ ہے۔ تجارت بین الاقوام کی عام صورتیں تو
یہی دو ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ایک تیسری صورت بھی
پائی جاتی ہے جو بظاہر عجیب بلکہ خلاف عقل معلوم
ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کبھی کوئی ملک ایسی چیز بھی دوسرے
ملک سے منگانا اپنے حق میں مفید پاتا ہے جس کو
برآمد والے ملک کے مقابلے میں وہ خود ارزاں
پیدا کر سکے۔ اس واقعے کو ہم ایک نہایت سادہ
مثال سے سمجھاتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک دن میں
عمرو چار جوتے یا چھ ٹوپیاں تیار کر سکے اور زید ۲ جوتے
یا ۴ ٹوپیاں اس حالت میں اگرچہ عمرو ٹوپیاں بھی زیادہ
ارزاں تیار کر سکتا ہے مگر بہتر یہ ہوگا کہ وہ خود جوتے بنائے
اور ٹوپیاں بنانا زید کے سپرد کرے۔ اس میں اوّل تو
مجموعی پیداوار بڑھ جائے گی مثلاً اگر عمرو و زید جدا جدا جوتے
اور ٹوپیاں بنا دیں تو گویا ان دونوں کی دو روزہ مجموعی
پیداوار (۴ جوتے + ۶ ٹوپیاں) + (۲ جوتے + ۴ ٹوپیاں)
یعنی ۶ جوتے اور ۱۰ ٹوپیاں ہوں گی اور اگر عمرو دو روز تک
صرف جوتے بنائے اور زید ٹوپیاں تو مجموعی پیداوار
۸ جوتے اور ۸ ٹوپیاں ہوں گی۔ زید کے ۲ جوتے برابر
ہیں ۴ ٹوپی کے لہذا عمرو کے ۴ جوتے برابر ہیں زید کی

حصّہ چہارم
باب بست و چہارم

۶ ٹوپیوں کے اور عمرو زید کی ٹوپیاں یکساں ہیں پس مذکورۂ بالا ۲ جوتے اور ۱۰ ٹوپیاں برابر ہیں (۱۲+۱۰) ۲۲ ٹوپی کے اور ۸ جوتے ۸ ٹوپیاں برابر ہیں (۱۶ + ۸) ۲۴ ٹوپی کے گویا آخر الذکر مقدار اوّل الذکر سے بقدر ۲ ٹوپی کے بیش قدر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اگر اوّل عمرو و زید جدا جدا ایک ایک روز جوتے اور ٹوپیاں بنائیں اور پھر عمرو دو روز صرف جوتے بنائے اور زید صرف ٹوپیاں تو پیداوار بحالت دوم حالت اوّل سے بقدر دو ٹوپی زیادہ رہے گی۔

مذکورۂ بالا تقسیم عمل غالباً ہر دو فریق کے واسطے مفید ہوگا اور مضر کسی کے حق میں نہیں ہوسکتا۔ شرح مبادلہ تین طور پر قرار پا سکتا ہے یا تو چونکہ زید کے دو جوتے برابر ہیں ۴ ٹوپی کے عمرو اپنے ۴ جوتے کے مبادلے میں زید سے ۸ ٹوپی طلب کرے اس حالت میں زید کو نہ نفع ہے نہ نقصان مگر عمرو کو ۲ ٹوپی کا فائدہ ہے کیونکہ ایک روز میں اُس نے چار جوتے بنا کر ۸ ٹوپی سے بدل لیئے۔ حالانکہ خود صرف ۶ ٹوپی بنا سکتا تھا دوسری صورت یہ ہے کہ چونکہ عمرو کی ۶ ٹوپیاں برابر ہیں ۴ جوتوں کے۔ زید اپنی ۸ ٹوپی کے مبادلے میں عمرو سے ($\frac{۴\times۸}{۶}$) ۵ ۱/۳ جوتے طلب کرے اس حالت میں عمرو کو نہ فائدہ یا نقصان نہیں مگر زید کو ایک جوتے سے کچھ زیادہ کا فائدہ ہے وجہ یہ ہے کہ دو روز میں ۸ ٹوپیاں بنا کر اس نے ۵ ۱/۳ جوتے عمرو سے لیئے حالانکہ وہ خود چار ہی جوتے بنا سکتا ہے لیکن تیسری صورت اغلب ہے کہ منافع کسی نسبت سے باہم تقسیم کر لیا جائے مثلاً عمرو اپنے چار جوتوں کے

مبادلے میں بجائے ۸ کے صرف ۷ ٹوپی قبول کرے، اس حالت میں عمرو کو ایک ٹوپی کا نفع ہے۔ کیونکہ چار جوتوں کی بجائے وہ خود صرف ۶ ٹوپی بنا سکتا تھا۔ نیز زید کو ایک ٹوپی کی بچت رہی کیونکہ وہ خود آٹھ ٹوپیاں بجائے چار جوتے تیار کر سکتا تھا اور عمرو سے چار جوتے صرف ۷ ٹوپی کے عوض میں مل گئے گویا ایک ایک ٹوپی کا نفع دونوں کو حاصل ہوا:

یہاں تحقیق کی اس مقدار محنت کے متعلق جس کی پیداوار کا مقابلہ کیا جائے ایک نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کی مثال میں ہم نے عمرو اور زید کی ایک ایک دن کی محنت لیکر اس کی پیداوار کا لحاظ جوتے اور ٹوپی میں مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ عمرو کی محنت کی پیداوار زید سے بڑھی ہوئی ہے لیکن واضح ہو کہ عمرو اور زید کی محنت کی مقدار مساوی ہونی ضرور نہیں ہے زید کی محنت کی مقدار خواہ عمرو کی محنت کے مساوی ہو یا اس سے بھی زیادہ دونوں حالتوں میں وہی نتیجہ نکلے گا جو اوپر اخذ کیا گیا۔ البتہ زید کی محنت کی مقدار عمرو کی محنت سے اس قدر کم نہ ہونی چاہیئے کہ زید کی پیداوار کا اوسط عمرو کی پیداوار سے بڑھ جائے اور خود اصلی مفروضہ جس پر موجودہ مثال مبنی ہے کہ عمرو بمقابل زید جوتے اور ٹوپی ارزاں بناتا ہے، غائب ہو جائے:

حاصل کلام یہ کہ ارزاں پیدا کرنے والے فریق کی محنت کی جو مقدار لی جائے فریق ثانی کی مقدار محنت اس کے مساوی ہونی ضروری نہیں۔ خواہ وہ مساوی ہو یا زیادہ۔ اور وہ کم بھی ہو سکتی ہے لیکن نہ اتنی کہ فریق اول کے ارزاں پیدا کرنے کے اساسی مفروضے کو زائل کردے۔ اس مفروضے کے بحال رہتے ہوئے فریق ثانی کی مقدار محنت

حصۂ چہارم
باب بست و چہارم

خواہ کچھ بھی ہو ... برابر۔ زیادہ یا کم۔ مذکورۂ بالا نتائج ہر حالت پر صادق آئیں گے۔

عمرو زید کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ عمرو کو جوتہ اور ٹوپی دونوں چیزوں کے بنانے میں زید پر سبقت حاصل ہے۔ ایک روز میں عمرو نو جوتے یا چھ ٹوپی بناتا ہے اور زید صرف دو جوتے یا ۴ ٹوپی لیکن سبقت کے مدارج مختلف ہیں۔ جوتے میں تو بقدر سو فی صدی سبقت حاصل ہے اور ٹوپی میں صرف بقدر ۵۰ فی صدی یعنی جوتے زید کے مقابل میں چار بناتا ہے اور ٹوپی ۳ کے مقابل میں چھ پس مقابلۃً جوتے میں زیادہ سبقت حاصل ہے اور نیز ثابت ہوچکا ہے کہ عمرو کا جوتہ بنانا اور زید کا ٹوپی بنانا فریقین کے حق میں بہتر اور مفید ہے۔ ان دونوں واقعات سے ایک اہم معاشی قانون اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی فریق کو خواہ وہ کوئی فرد ہو یا قوم دوسرے فریق پر دو چیزوں کی پیدائش میں سبقت حاصل ہو لیکن مدارج سبقت مختلف ہوں تو جس چیز کی پیدائش میں مقابلۃً زیادہ سبقت حاصل ہو اس کو تو خود پیدا کرے اور دوسری چیز کی پیدائش باوجود سبقت کے فریق ثانی کے سپرد کردے۔ اس واقعے کو قانون موازنۂ مصارف کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عمرو کی دونوں چیزوں کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ عمرو کے ۹ جوتے ۶ ٹوپی کے ہم قدر ہوسکتے ہیں حالانکہ اتنی ہی محنت سے خود عمرو صرف ۶ ٹوپی تیار کرسکتا ہے پس ثابت ہوا کہ عمرو ٹوپی کے مقابلے میں جوتے زیادہ ارزاں تیار کرتا ہے۔ ایک ہی مقدار محنت سے عمرو ٹوپی کے مقابل بشکل جوتہ زیادہ قدر پیدا کرتا ہے۔ پس مقابلۃً عمرو کے

جوتے کے مصارف ٹوپی کے مصارف سے کم ہوئے اور اس لیئے کم مصارف والی ہی ارزاں چیز اسکو تیار کرنی چاہئیے پس قانون موازنۂ مصارف کا منشا یہ نکلا کہ جب کوئی دو چیزیں دو جگہ پیدا ہوں تو بطریق بالا انکے مصارف دریافت کیئے جائیں اور جو چیز جہاں کم سے کم مصارف سے پیدا ہو اسکو وہیں پیدا کیا جائے غور کرنے سے واضح ہوگا کہ جس طرح عمرو کے جوتے اور ٹوپی میں مقابلتہً جوتے کے مصارف کم ہیں اسی طرح پر زید کی ٹوپی کے مصارف بمقابل اسکے جوتے کے کم ہیں پس قانون موازنۂ مصارف کی رو سے عمرو کو جوتہ تیار کرنا چاہیئے اور زید کو ٹوپی۔ اس قانون کا عملدرآمد تو انفرادی مبادلوں میں موجود ہوتا ہے۔ البتہ تجارت بین الاقوام میں وہ بہت زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ کوئی کپڑا سینا اچھا جانتا ہے اور کھانا پکانا بھی مگر خود کپڑا سیئے اور باورچی ملازم رکھکر اپنا کھانا پکوائے تو غور کرنے سے واضح ہوگا کہ وہ اسی قانون موازنۂ مصارف پر عمل کر رہا ہے ؎

اوپر کی بحث سے واضح ہو گیا کہ کیونکر کوئی ملک ایسی چیز باہر سے منگا نا مفید پاتا ہے جسکو وہ خود زیادہ ارزاں پیدا کر سکتا ہے قانون موازنۂ مصارف جو اس حیرتناک واقعے کی بنا ہے۔ اس سے ایک ایسا ہی اور عجیب نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے جو کہ موجودہ نتیجے کا عکس سمجھنا چاہیئے یعنی جب کہ کوئی ملک دو چیزوں کی پیدائش میں پس ماندہ ہو لیکن مدارج پس ماندگی کے مختلف ہوں تو باوجود پس ماندگی اسکے واسطے وہ چیز پیدا کرنی مفید اور ممکن ہوگی جس میں پس ماندگی سب سے کم ہو مثلاً اوپر کی مثال میں زید جوتے بنانے میں عمرو سے بقدر ۵۰ فی صدی

پس ماندہ تھا یعنی چار کے مقابلے میں صرف ۲ جوتے بنا سکتا تھا اور ٹوپی بنانے میں بقدر ۳۳ فی صدی پس ماندہ تھا یعنی ۲ کے مقابل صرف ۔ ۱ ٹوپی تیار کرسکتا تھا۔ گویا متقابلۃً ٹوپی بنانے میں پس ماندگی کم تھی اس لئے اس کے حق میں ٹوپی بنانا ممکن اور مفید ثابت ہوا۔

تجارت بین الاقوام کی یہ تیسری صورت جو کہ قانون موازنۂ مصارف پر مبنی ہے اگرچہ پہلی دو صورتوں کی مانند عام نہیں لیکن محض علمی اور خیالی بھی نہیں ہے۔ بعض ممالک کی تجارت بین الاقوام میں یہ صورت صاف نظر آتی ہے۔ جزیرۂ کیوبا امریکہ کو شکر دیتا ہے اور اس سے گیہوں لیتا ہے۔ اگرچہ گیہوں کی پیدائش میں بھی اس کو امریکہ پر سبقت حاصل ہے۔ اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ فرض کرو جس مقدار گیہوں کی پیدائش کے واسطے امریکہ میں چار روز کی محنت درکار ہو کیوبا میں دو روز کی محنت کافی ہو۔ لیکن شکر کی جو مقدار امریکہ میں چار روز کی محنت سے پیدا ہو کیوبا میں اس کے واسطے صرف ایک روز کی محنت کافی ہو۔ اس حالت میں کیوبا صرف شکر تیار کرے گا کیونکہ یکروزہ پیداوار شکر کے مبادلے میں وہ امریکہ کی چار روزہ پیداوار گیہوں حاصل کرسکتا ہے جو خود کیوبا کے دو روزہ پیداوار کے مساوی ہے۔

گویا قانون موازنۂ مصارف کے عملدرآمد سے کیوبا بوساطت امریکہ یک روزہ پیداوار شکر کے مبادلے میں خود اپنی دو روزہ پیداوار گیہوں کی مقدار حاصل کرسکتا ہے۔

اسی طرح پر جزیرۂ جرسی میں اگرچہ بمقابل انگلستان گیہوں ارزاں پیدا ہوسکتے ہیں لیکن آلو اس سے بھی کہیں زیادہ ارزاں پیدا ہوتے ہیں۔ پس جزیرۂ مذکور خود آلو پیدا کرتا ہے اور گیہوں انگلستان سے خریدتا ہے۔

آسٹریلیا اور آئرلینڈ کے درمیان بھی بعض چیزوں کی تجارت میں قانون موازنۂ مصارف کا عملدرآمد بہت قوی اور واضح پایا جاتا ہے۔

حصہ چہارم
باب بست و چہارم

اب بخوبی واضح ہو گیا کہ اگر چند ممالک تجارت بین الاقوام میں شریک ہوں تو ان میں سے ہر ایک وہ چیز پیدا کرے گا جس کی پیدائش میں اس کو بمقابلہ باقی کل چیزوں کے دیگر ممالک پر سب سے زیادہ سبقت حاصل ہو یا سب سے کم پس ماندگی۔ یا یوں کہیے کہ مقابلۃً جس چیز کو وہ دیگر ممالک سے بحالت سبقت زیادہ ارزاں تیار کر سکے یا بحالت پس ماندگی کمتر گراں۔

قانون موازنۂ مصارف کے متعلق کچھ تشریح اور ضروری جاننا ہوتی ہے اوّل یہ کہ اس کے عملدرآمد میں سیدھا مبادلہ فرض کیا جاتا ہے اور مبادلے میں ہر فریق دوسرے کی چیز کی قدر کا تخمینہ اسقدر محنت سے کرتا ہے جو اس کو خود وہ چیز بنانے میں صرف کرنی پڑے۔ اور مبادلے میں اپنی چیز زیادہ سے زیادہ اس قدر دے سکتا ہو جو مذکورہ مقدار محنت سے وہ تیار کرے۔ اگر کوئی فریق اس سے زیادہ چیز یا سامان طلب کرے تو فریق ثانی سے مطلوبہ چیز خود تیار کر لے گا۔ یہ مصارف پیدائش بحوالۂ محنت شمار کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک روز کی محنت۔ بعض نے اس بحث میں مصارف بحوالۂ زر بھی شمار کئے ہیں۔ چنانچہ بغرض امتیاز دو جداگانہ اصطلاحیں بھی تجویز ہوئی ہیں۔ مصارف بحوالۂ محنت کو مصارف پیدائش اور مصارف بحوالۂ زر کو اخراجات پیدائش کہتے ہیں چند [illegible] وجوہات سے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں طریق اوّل قابل ترجیح خیال کیا جاتا ہے اور ہم نے بھی یہی اختیار کیا ہے۔ نیز یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ مصارف آمد و رفت اور محصول درآمد و برآمد اگر ادا کرنا بھی پڑے تو وہ اس قدر نہیں کہ فریقین کو قانون موازنۂ مصارف پر عمل کرنے سے جو منافع حاصل ہو اُس کو وہ غائب کر دے، خود قانون کے متعلق یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ چند چیزوں کی پیدائش میں دوسرے [illegible] ملک پر محض سبقت حاصل ہونا کافی نہیں۔ بلکہ اس سبقت میں کمی بیشی بھی ضروری ہے اگر سبقت سب چیزوں میں مساوی ہو تو قانون کا عملدرآمد نہ ہو سکے گا۔

حصۂ چہارم
باب بست و چہارم

مثلاً ایک روز میں عمرو چار جوتے یا چھ ٹوپیاں تیار کرے اور زید ۲ جوتے یا تین ٹوپیاں گویا عمرو کو جوتا اور ٹوپی دونوں کے بنانے میں زید پر بقدر سو فی صدی یکساں سبقت حاصل ہے اس صورت میں عمرو اور زید کا جدا جدا علی الترتیب جوتے اور ٹوپیاں بنانا یا ہر ایک کا دونوں چیزیں تیار کرنا یکساں ہے - ان کا باہمی مبادلہ نہ ضروری نہ مفید - حالانکہ اوپر کی مثال میں جبکہ عمرو کو جوتا بنانے میں بمقابلہ ٹوپی کے زیادہ سبقت حاصل تھی تو عمرو کے صرف جوتے اور زید کے ٹوپی بنانے سے فریقین کو فائدہ ہوسکتا تھا اور قانونِ مصارفِ متقابل کا پورا عمل نمودار ہوتا - اس واقعے سے بھی قانونِ موازنۂ مصارف کی ایک قابل قدر توضیح ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک ہی مقدارِ محنت سے ایک ہی مُلک میں مختلف چیزوں کی جو جو مقداریں پیدا ہوسکتی ہیں اُن کی قدر بحوالہ اُن ہی چیزوں کی اس مقدار کے جو کسی مقدارِ محنت سے دوسرے مُلک میں پیدا ہوں جدا جدا دریافت کرکے مقابلہ کیا جاتا ہے کہ کونسی چیز سب سے بیش قدر ہے اور چونکہ مقدارِ محنت مساوی ہے - ایسی ہی چیز سب سے ارزاں ہوگی گویا اس کے مصارفِ پیدائش مقابلۃً سب سے کم تر ہیں گے اور یہی چیز پیدا کرنا اُس مُلک کے حق میں مفید ہوگا؛

پس واضح ہوگیا کہ مصارف جن کا مقابلہ کیا جاتا ہے وہ ہوتے ہیں جو خود اُس مُلک کی مختلف پیداوار سے متعلق ہوں - یہ خیال کرنا کہ ایک ہی چیز کے دو مقامات میں جو مصارف پڑتے ہیں اُن کا مقابلہ کیا جاتا ہے سراسر غلط ہوگا اور مذکورۂ بالا توضیح کے بعد اب اس دقیق مغالطے کا اندیشہ نہیں رہنا چاہیئے؛

قدر و قیمت بین الاقوام

۲۳ - یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے کہ تجارتِ بین الاقوام میں چیزوں کی قدر کیونکر قرار پاتی ہے کس اصول کے مطابق مختلف چیزوں کی مختلف مقداروں کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے - بعض مصنفین نے اس کی تحقیق میں بظاہر بہت جاں کاہی اور عرق ریزی کی ہے - لیکن انکی کوشش پر

کوہ لندن اور کاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ پہلی دو صورتوں میں تو مبادلہ بیشتر قانون طلب و رسد کا تابع پایا جاتا ہے۔ مگر تیسری صورت میں مبادلے پر موازنۂ مصارف کی حد بھی قائم ہو جاتی ہے یعنی جب کہ ایک روز میں عمرو ۴ جوتے یا چھ ٹوپی اور زید ۲ جوتے یا ۸ ٹوپی تیار کرے تو گویا عمرو کے ۴ جوتے برابر ہیں زید کی ۸ ٹوپیوں کے اور جس مقدار محنت سے عمرو ۴ جوتے بناتا ہے اُسی سے وہ خود ۶ ٹوپی بنا سکتا ہے پس ۴ جوتوں کی قدر کم از کم ۶ ٹوپی اور زیادہ سے زیادہ آٹھ قرار پائے گی۔ بالفاظ دیگر ۴ جوتوں کی قدر میں ۲ ٹوپی کے اندر اندر کمی بیشی ہوتی رہے گی اور یہی ۲ ٹوپی عمرو کے ۴ جوتوں اور ۶ ٹوپی کے موازنۂ مصارف کے فرق کی حد ہیں۔ چھ ٹوپی سے کم عمرو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ ۴ جوتوں کی بجائے اتنی ٹوپیاں وہ خود تیار کر سکتا ہے اور آٹھ ٹوپیوں سے زیادہ زید گوارا نہیں کر سکتا کیونکہ آٹھ ٹوپیوں کی بجائے ۴ جوتے وہ خود بنا سکتا ہے۔ قانون طلب و رسد کے عمل سے غالباً کوئی ایسی شرح قرار پا جائے گی جس سے فریقین کو نفع ہو مثلاً ۴ جوتوں کے مبادلے میں ۷ ٹوپیاں اس صورت میں عمرو اور زید کو برابر ایک ٹوپی کا فائدہ ہوگا۔

واضح ہو کہ تجارت بین الاقوام میں نہ صرف دو بلکہ بہت سی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے اور نہ صرف دو بلکہ متعدد ممالک کے درمیان مبادلہ ہوتا ہے۔ اس پیچیدگی سے شرح مبادلہ پر جو اثر پڑتا ہے اس کی تفصیل دریافت کرنی تو محال ہے۔ البتہ اس قدر تحقیق ہے کہ شرح مبادلہ باتحتی قانون طلب و رسد موازنۂ مصارف کے حدود کے اندر رہتی ہے اور مبادلے کی پیچیدگیوں سے شرح میں اعتدال اور استحکام بھی ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ مصارف آمد و رفت اور محصول درآمد و برآمد جو مال اسباب فریقین پر عائد ہو کر تعین شرح مبادلہ پر قانون موازنۂ مصارف کے تحت میں اثر ڈالتے ہیں۔

چند مصنّفین نے اس بحث میں بڑی بڑی موشگافیاں دکھائی ہیں

اگرچہ اُن کی تحقیقات پر گوناگوں اعتراض بھی عائد ہوتے ہیں لیکن اگر اس کو بالکل صحیح مان لیا جائے تب بھی وہ کچھ زیادہ بارآور نہیں معلوم ہوتی اور بخوفِ طوالت و پریشانی اس کو کم از کم اس کتاب میں ترک کرنا ہی مناسب نظر آتا ہے ؛

قدر بین الاقوام کی مذکورالصدر بحث میں سید ھا مبادلہ فرض کیا گیا تھا اور مروجہ آلۂ مبادلہ یعنی زر کے استعمال کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا - بالفاظ دیگر اب تک تجارت بین الاقوام میں چیزوں کی قدر قرار پانے کا اصول دریافت کیا گیا - ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کیوں کر قرار پاتی ہے - قیمت بین الاقوام کی بحث بھی کچھ کم پیچیدہ اور طویل نہیں - یہاں پر اس کا سیدھا سادھا لُبِّ لباب پیش کرنا کافی ہوگا - اس سے قبل جتایا جا چکا ہے کہ زر محض ایک آلۂ مبادلہ ہے اور خرید و فروخت درحقیقت مبادلے کا ایک طویل مگر سہولت افزا طریق ہے - انسان کو درحقیقت جو چیز مطلوب ہے وہ طرح طرح کا سامان ہے جس سے احتیاجات رفع ہوں زر کو وہ محض اس لیئے قبول کر لیتا ہے کہ اس سے کل ضروریات حاصل ہو سکتی ہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی گروہ ہمیشہ سامان بیچ بیچ کر زر ہی زر لیتا رہے اور خود کچھ بھی نہ خریدے اور اگر وہ ایسا کر بھی سکے تو دوسرے گروہوں کے پاس اتنا زر کہاں کہ وہ ہمیشہ اُس کو دیتے رہیں، ہوتا یہ ہے کہ ہر گروہ اپنی پیداوار فروخت کر کے اوروں کی پیداوار خریدتا ہے گویا درحقیقت تو مبادلہ ہی جاری ہے - استعمال زر کی وجہ سے وہ خرید و فروخت میں تقسیم ہو کر کبھی کبھی نظر آنا دشوار ہو جاتا ہے - یہی حال مختلف قوموں کی تجارت کا ہے - جب دو ملکوں میں تجارت قائم ہوتی ہے تو وہ اپنی اپنی پیداوار ایک دوسرے کو بھیجتے رہتے ہیں - یہ نہیں کہ ایک ملک ہمیشہ سامان بھیجا کرے اور دوسرا زرِ قیمت - نہ تو درآمد والے ملک کے پاس لاتعداد سونا چاندی ہے کہ وہ یوں قیمت ادا کرتا رہے اور نہ برآمد والے ملک کو سونے چاندی کی ایسی لامحدود ضرورت کہ وہ نرا سونا اور چاندی ہی فراہم

حصۂ چہارم
باب بست و چہارم

تجارت۔ ایک زمانے میں بیشک یہ غلط خیال عام تھا کہ سامانِ برآمد کے معاوضے میں جہاں تک ممکن ہو سونا چاندی درآمد والے ملک سے لینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا یہ محض ایک سطحی مغالطہ ہے اس طور سے تجارت بین الاقوام کا قیام نہ تو ممکن نہ مفید ہے۔ جب سے آدم اسمتھ نے اس کی حقیقت کھولی ہے یہ معاشی مغالطہ بھی تاریخ میں ایک دلچسپ یادگار رہ گیا ہے۔ اور کچھ نہیں تجارت بین الاقوام کے چلنے کا ایک ہی طریق ہے وہ یہ کہ جو ممالک شریک ہونا چاہیں اپنی اپنی پیداوار کا مبادلہ کریں۔ سامانِ تجارت میں سونا چاندی بھی شامل ہوگا۔ اور مذکورۂ بالا اصول کے مطابق یہ بحیثیت قانونِ طلب و رسد نیز بہ پابندی قانونِ موازنۂ مصارف اس کی قدر قرار پائے گی۔

قدرِ زر کی بحث سے آگے چل کر واضح ہوگا کہ زر کی قدر بھی مثل دوسری چیزوں کے قانونِ طلب و رسد کی پابند ہے۔ زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹتی ہے اور مقدار گھٹنے سے قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب تجارت بین الاقوام میں چیزوں کی قیمت ایسی قرار پاتی ہے کہ اشیائے درآمد و برآمد کی قیمت دونوں ملکوں برابر ہو جائے۔ قیمت اشیائے درآمد یا برآمد میں گاہے گاہے تھوڑا سا فرق ممکن ہے جس کی اصلاح سونے کی وساطت سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً قیمت درآمد کی زائد مقدار بذریعہ سونے کے ادا کر دے یا قیمت برآمد کی زیادہ مقدار وصول کر لے اور بفرضِ محال اگر چند سال تک بھی قیمت اشیائے درآمد زائد رہے اور برآمد والا ملک یہ زائد قیمت بشکل طلا وصول کرے تو اضافہ سونے کی بدولت اس ملک میں زر کی قدر گھٹ جائے گی۔ گویا چیزیں گراں ہو جائیں گی اور سونا ادا کرنے والے ملک میں بوجہ کمی زر کی قدر بڑھ جائے گی یعنی چیزیں ارزاں ہو جائیں گی اور بالآخر ہر دو جانب کی تبدیلیاں مل کر ایسی ترکیب پائیں گی کہ قیمت اشیائے درآمد و برآمد قریب قریب مساوی ہو جانے سے کسی ملک کو سونا بھیجنے کی ضرورت

حصۂ چہارم
سببِ چہارم

بہت کم واقع ہوگی۔ چنانچہ آگے چل کر تجارت بین الاقوام کی تفصیل سے واضح ہوگا کہ قیمت درآمد و برآمد میں بالعموم ایسا توازن قائم رہتا ہے کہ سونے کی وصول یابی یا ادائی کی نوبت کم آتی ہے۔ اکثر مال کے بدلے مال یا زیادہ سے زیادہ خدمات پیش کی جاتی ہیں، زر محض حساب کتاب لکھنے میں بطورِ معیارِ قیمت کام دیتا ہے ورنہ قوموں کے درمیان بحیثیتِ مجموعی مبادلے کی تجارت ہوتی ہے۔

جہاں تک اس کتاب میں گنجائش ملی قدر و قیمت بین الاقوام کے مسائل کا خاکہ پیش کر دیا گیا۔ لیکن سچ پوچھیے تو مسائل مذکور اس قدر پیچیدہ ہیں کہ خود اُن کے محققین بھی کہیں کہیں حیران رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے علاوہ دیگر ممالک کے بیشتر مصنّفین نے یا تو سرے سے ان مسائل کو تسلیم نہیں کیا اور بلحاظ قدر و قیمت تجارت داخلی اور تجارت خارجہ میں اُنھوں نے خود ان مسائل کو غلط اور بے بنیاد ثابت کرنا چاہا اور جنھوں نے اُن کو صحیح بھی مانا اُن کو اس وجہ سے ناقابلِ التفات قرار دیا کہ وہ اس قدر غیر معمولی مفروضات پر مبنی ہیں کہ بعید از حقیقت ہو گئے ہیں۔ اس حالت میں کیونکر امید ہو سکتی ہے کہ اس کتاب میں جہاں مختصر بیان سے زیادہ کی گنجائش نہیں یہ مسائل صاف طور پر ذہن نشین کیے جا سکیں، طویل تفصیل نظر انداز کر کے صرف ایک سادہ خاکہ محض اس غرض سے پیش کر دیا گیا کہ کم از کم ان مسائل کا علم ہی ہو جائے، رہا ان کا سمجھنا اور جانچنا اس کے واسطے بہت کوشش اور تفصیلی بحث درکار ہے۔

اقسامِ تجارت

۴۔ تجارت کی دو قسمیں ہیں تجارتِ داخلہ جو قوم کے درمیان قائم ہو اور تجارتِ خارجہ جو دیگر اقوام سے جاری ہو۔ پس دو یا زیادہ ملکوں کی تجارتِ خارجہ کا مجموعی نام تجارتِ بین الاقوام سمجھنا چاہیے۔ تجارت خارجہ کی بھی دو مشہورِ عالم قسمیں ہیں، آزاد تجارت اور تجارتِ مامون، بحالتِ اوّل

[illegible]

حصۂ چہارم
بابِ بست و چہارم

کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہو سکے تو بلا تکلف اس کو منگا لیا جاتا ہے۔ ٹکس قائم کر کے اُس کی درآمد نہیں روکی جاتی اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہیں کی جاتی، حاصل کلام یہ کہ نہ کسی خاص اہتمام سے خارجی پیداوار کی درآمد بند کی جاتی ہے اور نہ ملکی پیداوار کی برآمد بڑھائی جاتی ہے۔ تجارت بین الاقوام کی مذکور الصدر تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی کے مطابق تجارت جاری رہتی ہے اور اس سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جاتی لیکن تجارت مامون کی حالت بالکل برعکس ہے۔ دیگر ممالک کی ارزاں پیداوار کی درآمد ٹکس کے ذریعے سے روک کر اپنے ہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ کچھ عرصے میں ملکی پیداوار بھی اسی قدر ارزاں ہو جائے اور خارجی پیداوار کی درآمد کی ضرورت ہی نہ رہے، محض تامین پر اکتفا نہ کر کے ملکی پیداوار کو سرکاری امداد بھی دی جاتی ہے تاکہ دیگر ممالک کی پیداوار پر بذریعۂ ارزانی غلبہ پانے سے اس کی برآمد بڑھے اور اپنے ہاں صنعت و حرفت کو اور بھی ترقی ہو۔ گویا ہر ملک حتی الوسع اپنی ہی صنعت و حرفت کو ترقی دے کر ملکی پیداوار سے قومی ضروریات مہیا کرتا ہے اور بشرطِ امکان دیگر ممالک کی صنعت و حرفت پر سبقت حاصل کر کے اپنی پیداوار کی برآمد بڑھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور صرف بحالتِ مجبوری ایسی چیزیں دوسرے ممالک سے خریدتا ہے جو اپنے ہاں پیدا ہونی بہت ہی دشوار ہوں۔ تجارتِ آزاد اور مامون کا یوں فرق سمجھنا چاہیئے کہ بحالتِ اوّل مبادلے کی موجودہ منفعت مقصود ہوتی ہے اور بحالتِ دوم معاشی ترقیات کے مستقبل فوائد مد نظر رہتے ہیں:

مدت سے مباحثہ جاری ہے کہ ان دونوں میں تجارتِ خارجہ کی کونسی قسم بہتر ہے تجارت آزاد یا تجارت مامون۔ اس مسئلے پر دو

زبردست گروہ قائم ہو گئے ہیں اور ہر ایک میں بڑے بڑے معتبر اور مستند معاشیین شامل ہیں۔ ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ تجارتِ آزاد ہر حالت میں ہر ملک کے حق میں مفید ہے۔ دوسرے گروہ کو اس پر اعتراض ہے۔ اُس کے خیال میں تجارتِ آزاد اوّل درجے کے ترقی یافتہ ممالک کے حق میں تو بیشک مفید ہے۔ مگر موجودہ پس ماندہ ممالک کے حق میں بلاشک سخت مضر ہے اور کافی ترقی حاصل کرنے تک ایسے ممالک کو تامینِ تجارت کی اشد ضرورت ہے۔ علمِ معاشیات میں کسی دوسرے شعبے پر اس کی نصف کتابیں بھی نہیں لکھی گئی ہیں جتنی کہ اس مبحث پر۔ اس کے متعلق ہزارہا نہیں تو صدہا تصنیفات ضرور موجود ہیں۔ ان سب کا مطالعہ نہ سہل ہے اور نہ ضروری۔ اُصول مختلف فیہ تو صرف چند ہیں۔ البتہ حمایت اور مخالفت کے جوش میں حریف کو قائل کرنے کی غرض سے ان پر طرح طرح کے رنگ چڑھائے گئے ہیں۔

بعض کتب ایسی منطقی دلائل سے لبریز ہیں جن کی عملی وقعت کچھ بھی نہیں۔ واقعات کو پس پشت ڈال کر اصول کی عجیب و غریب ترکیب سے کہیں اس طرح پر تائید و تردید نکالی گئی ہے جس طرح سے کہ ذہین وکیل قانونی باریکیوں سے اپنے کمزور معاملے کو بھی قوی کر دکھاتا ہے۔ لیکن جس مسئلے سے قوموں کی ترقی و تباہی وابستہ ہے وہاں منطقی دلائل اور نازک خیالیوں کی بجائے اصلی حالات و واقعات کہیں زیادہ تر توجہ طلب اور فیصلہ کن ہیں۔ جہاں تک غور کیا حامیانِ تجارتِ آزاد اصول کے پردے میں خیالی بحث مباحثے کی طرف مائل پائے جاتے ہیں اور تجارتِ مامون کے طرفدار حقیقت اور واقعات پر زور دیتے ہیں۔

تجارتِ آزاد کی بہت کچھ معاشی اور منطقی استدلال کے ساتھ منادی اور تلقین کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ اوّل اوّل تو کچھ ملکوں میں اس کا رواج نکلا مگر چند ہی سال کے تجربے کے بعد وہ ہر جگہ ترک کر دیا گیا اور ہر بیدار ملک نے تجارتِ مامون کا طریق کہیں زیادہ مفید پا کر اسی کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ

حصہ چہارم
باب چہارم

آج کل امریکہ جاپان اور اکثر یورپین ممالک میں تجارت ماموں قائم ہے۔ جرمنی اور امریکہ اس کے نمایاں مرکز ہیں اور ان کی صنعت و حرفت کی ترقیات بھی اظہر من الشمس ہیں۔ تجارت آزاد آج کل صرف انگلستان اور ہندوستان میں جاری ہے۔ انگلستان کی موجودہ حالت کو تو حامیان تامین بھی تجارت آزاد کے واسطے موزوں اور مناسب خیال کرتے ہیں۔ ہندوستان بہت سے لوگ اس کی معاشی سست رفتاری کا خاص باعث یہی تجارت آزاد قرار دیتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی تجارت تیس چالیس سال کے واسطے بھی ماموں کر دی جائے تو قدرت نے اس میں اس قدر معاشی ترقیات کے ذرائع ودیعت کر دیئے ہیں کہ صنعت و حرفت کی ترقی میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ آگے چل کر واضح ہوگا ان ہر دو طریق تجارت کی مضرت و منفعت عام اور قطعی نہیں بلکہ ہر ملک کے معاشی حالات پر منحصر ہے۔ ایک ہی چیز کسی کے حق میں سم قاتل اور کسی کے حق میں تریاق ہو سکتی ہے اور یہ خاصیت تجارت خارجہ میں بدرجہ اولیٰ پائی جاتی ہے تاہم اس مسئلے پر سخت اختلاف رائے قائم ہے۔

تجارت خارجہ کے ہر دو طریق کی جس جس انوکھے طور سے تائید اور تردید کی گئی ہے۔ ان سب کی تفصیل بوجہ طوالت یہاں موزوں نہ ہوگی اور اگر سچ پوچھیئے تو اصلی مسئلہ سمجھنے کے واسطے وہ ضروری بھی نہیں بلکہ اُن سے حیرانی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ حریفوں کو قائل معقول کرنے کے جوش میں عجیب عجیب نکات نکالے گئے ہیں۔ جو گو مخالف کو ساکت کردیں مگر مطمئن نہیں کر سکتے۔ ان کے مطالعے میں منطق سے مسلح ہو کر ذہن مصروف بیکار نظر آتے ہیں۔ ذیل میں اس مسئلے کے صرف کارآمد پہلوؤں پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ تفصیلی بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہوگی۔

تجارت آزاد

۵۔ تجارت آزاد کا مفہوم اوپر بیان ہو چکا ہے، نہ تو خارجی پیداوار پر وزنی ٹکس قائم کر کے اس کی درآمد روکی جائے تاکہ ملکی پیداوار میں

ترقی اور ارزانی نمودار ہو سکے اور نہ اس غرض کے لئے ملکی صنعت وحرفت کو سرکاری امداد دی جائے ۔ بلکہ تجارتِ خارجہ میں کسی طرح کی مزاحمت نہ کی جائے اور تجارتِ بین الاقوام مذکور الصدر تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی کے مطابق قائم ہو جائے تو بلا روک ٹوک اس کو جاری رہنے دے جس طرح کہ تجارتِ داخلہ میں سرکار دخل نہیں دیتی اسی طرح پر تجارتِ خارجہ میں بھی وہ الگ تھلگ رہے تا جر جہاں سے جو چیز چاہیں خریدیں اور جو قیمت قرار پائے ادا کریں، کاروبار میں مقابلہ جاری رہے اسی کے عمل سے خواہ کوئی فریق ترقی کرے خواہ تنزل، سرکار نہ اپنے ملک کی صنعت وحرفت کی خاص مالی امداد کرے اور نہ دوسرے ملکوں سے درآمد روک کر اُن کی صنعت وحرفت کو دبائے، سرکار کی ایسی مداخلت سے نفع کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضرت کا قوی اندیشہ ہے ۔ مثلاً سرکار خارجی ارزاں پیداوار پر ایسا وزنی ٹکس قائم کردے کہ اس کی درآمد رک جائے یا بہت گھٹ جائے تو پیداوارِ مذکور کی قیمت بوجہ قلتِ رسد بڑھنا یقینی ہے جس کی وجہ سے خریداران پر بہت بار پڑ جائے گا جو چیز نہایت ارزاں فروخت ہوتی تھی وہ نہایت گراں ہو جائے گی رہی اندرونی صنعت وحرفت ممکن ہے کہ باوجودِ تامین وہ حسبِ توقع ترقی کرے یا نہ کرے اور اگر کرے بھی تو اس کُل نقصان کی تلافی نہ کر سکے جو دورانِ تامین میں بوجہ گرانی خریداران کو برداشت کرنا پڑا ہو ۔ خود تامین کی ضرورت سے معلوم ہوتا ہے کہ صنعت وحرفت مذکور مُلک کے واسطے موزوں نہیں اور جو چیز بحالتِ مقابلہ پیدا ہوتی تھی وہ کہیں زیادہ مناسبِ حال تھی غرضکہ درآمد روکنے سے بذریعہ گرانی خریداروں کو تو نقصان پہنچنا یقینی ہے لیکن اوّل تو صنعت وحرفتِ مطلوبہ کی ترقی اور دوم نقصانِ خریداراں کی تلافی اغلب بھی نہیں اسکے علاوہ جیسا کہ قدر وقیمت بین الاقوام کے تحت میں بتایا جا چکا ہے اور آگے بھی واضح کیا جائیگا ۔ تجارتِ بین الاقوام سیدھا سادہ مبادلہ ہے یعنی چیزوں کے معاوضے میں چیزیں دیجاتی ہیں قیمت بشکلِ زر ادا کرنیکی نوبت کم آتی ہے اور اگر ایسا نہو تو اربوں روپے

سالانہ کی تجارتِ خارجہ چلنی کیونکر ممکن تھی۔ اگر خریدار ملک کے پاس گنجِ قارون بھی ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ اور فروشندہ ملک اس قدر سونا چاندی لے کر کیا کرتا۔ بہ قدر ازر جس قدر بڑھتی اُن کی قدر و قیمت بھی گھٹتی اور سونا چاندی زیور اور آرائش کی بعض منتخب ضروریات مہیا کرنے میں ورنہ بیشتر وہ بطورِ خزینۃ القدر استعمال ہوتے ہیں لہذا اُن کی مقدار جس قدر ضرورت سے زیادہ بڑھتی اُسی قدر وہ کم قدر ہونے لگتے اور فروشندہ ملک کو سراسر نقصان اُٹھانا پڑتا۔ اس انتہائی مثال سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ قیمتِ درآمد بشکل زر ادا کرنا نہ خریدار ملک کے واسطے ممکن اور نہ فروشندہ ملک کے حق میں مفید۔ بلکہ تجارتِ بین الاقوام میں پیداوار کا پیداوار سے مبادلہ ہوتا ہے اور جب کہ بذریعہ ٹکس کسی مُلک کی درآمد روکی جائے تو اُس مُلک کی برآمد بھی گھٹنی یقینی ہے تاکہ درآمد و برآمد میں توازن قائم رہے۔ اس صورت میں اگر ملکی صنعت و حرفت کی ترقی بھی ہوئی تو برآمد گھٹنے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ رہا دوسرا مُلک اُس کی پیداوار کی اس مُلک میں درآمد رُکنے سے اور اس مُلک کی پیداوار کی درآمد اس مُلک میں گھٹنے سے دوسرے مُلک کا بھی نقصان اُٹھانا یقینی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اگر خارجی ارزاں پیداوار جس کی درآمد روکی جائے بوجہ موافقتِ آب و ہوا دوسرے مُلک کے واسطے خاص طور پر موزوں ہو یا وہ قانونِ تکثیرِ حاصل کی پابند ہو تو اس طرزِ عمل سے فریقین کو نقصان پہنچنا اور بھی یقینی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اوّل تو ملکی صنعت و حرفت کا بذریعۂ تامین ترقی پکڑنا ہی بحث طلب ہے۔ دوم باوجودِ ترقی بھی مضرت کا اندیشہ غالب ہے سوم مضرت اُسی مُلک تک محدود نہیں بلکہ دوسرا مُلک بھی جو شاملِ تجارت ہے اُس کا مورد بنتا ہے۔ پس یوں زبردستی ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا اور جا بجا مداخلت سے کُل کاروبار کو درہم و برہم کر کے عوام کو دشواریوں میں مبتلا کرنا کہاں تک جائز اور مفید ہو سکتا ہے علیٰ ہذا مالی امداد دے کر

ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کا کامیاب ہونا دشوار ہے۔ امداد کا بر ملک پر اثر پڑنا تو بہر صورت یقینی ہے لیکن ممکن ہے کہ سہارا ملنے پر انفرادی کوشش سست پڑ جائے یا ترقی کی گنجائش ہی کم ہو اور امداد کا اصلی مطلب کافی طور پر حاصل نہ ہو سکے مزید براں ایسی امداد سے کاروبار میں رشک و حسد نمودار ہوگا اور امداد کے جا و بیجا مطالبات ہونے اغلب ہیں جن کے پورا کرنے نہ کرنے میں سراسر نقصان ہوگا۔

تجارتِ بین الاقوام قدرتی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے سے ہم کو وہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں جن کو یا تو ہم پیدا ہی نہیں کر سکتے یا پیدا بھی کریں تو اتنی ارزاں نہ کر سکیں اور اگر اتنی یا اس سے بڑھ کر بھی ارزاں پیدا کر سکیں تو اس وجہ سے نہ کریں کہ ہم مقابلۃً کمتر مصارف سے اُسکے ہمقدر دوسری چیز تیار کر سکتے ہیں جو ازروئے قانونِ موازنۂ مصارف ہمارے اور نیز فریقِ ثانی کے حق میں بھی مفید ہے۔ جیسا کہ مبادلے کا عام خاصہ ہے تجارت سے مجموعی افادے میں اضافہ ہوتا ہے اور فریقین کو کم و بیش نفع پہنچتا ہے جس کو اصطلاحاً **نفع المصرف** کہتے ہیں۔

پس ہر ایسے طرزِ عمل سے جو مبادلے سے مزاحم ہو افادے کا اضافہ بھی رُکتا ہے اور فریقین بھی نفع سے محروم ہوتے ہیں۔ غرضکہ اصولاً مبادلے میں مزاحمت مضر ہے اور تجارتِ بین الاقوام مبادلے کی ایک وسیع شکل ہے اور تامین تجارت مداخلت کی ایک اہم صورت پھر تجارتِ مامون اصولاً کس طرح پر جائز اور عملاً کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔ ملکی پیداوار کی مستقبل موہوم ترقی کے خیال سے دیدہ و دانستہ موجودہ نفع کی بجائے کُل متعلقین پر نقصان عائد کرنا حامیانِ تجارتِ آزاد کی نظر میں اس قدر خلافِ عقل و دانش ہے کہ وہ فریقِ ثانی کی سمجھ پر حیرت اور افسوس کرتے ہیں کہ ایسی صاف بات بھی ذہن میں نہیں آتی۔

تجارتِ آزاد کی تائید کا ایک سادہ خاکہ پیش کیا گیا۔ اس میں

حصّہ چہارم
بابِ بست چہارم

دو نکتے قابلِ توجہ ہیں جن سے ہم ابھی تجارتِ مامون کے تحت میں بحث کریں گے۔ اوّل یہ کہ مبادلے میں فریقین کا کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے خواہ ایک ہی قوم کے افراد ہوں خواہ مختلف اقوام۔ مبادلہ ہر حالت میں یکساں مفید ہے۔ دوم مبادلے کا موجودہ نفع تجارت کا مقصود قرار دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے تجارتِ بین الاقوام میں درآمد کو برآمد پر فوقیت دی جاتی ہے گویا اصل مقصود تو درآمد ہوتی ہے اور برآمد محض بطورِ معاوضہ دی جاتی ہے پس تجارتِ آزاد کا لبِّ لباب یہ ہے کہ جس طرح دو افراد باہم خرید و فروخت کرتے ہیں ایسے ہی مختلف اقوام آپس میں تجارت کرتی ہیں یہ مبادلہ فریقین میں ہر دو صورت مفید ہے اور سرکاری مداخلت یکساں ناجائز اور مضر ہوگی۔

تجارتِ مامون

۶۔ حامیانِ تجارتِ آزاد کے اُصول اس قدر معقول اور بدیہی معلوم ہوتے ہیں کہ اُن سے اختلاف کرنے والوں پر کم از کم دیوانہ ہونے کا شبہہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اوّل الذکر گروہ نے جھنجھلا کر کہیں اپنے حریفوں کی کم فہمی پر حیرت و افسوس ظاہر کیا ہے اور کہیں اُن کی تنگ دلی اور نازک خیالی کا مضحکہ اُڑایا ہے اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے منطقی دلائل اور بحث مباحثے میں بڑا کمال دکھایا ہے۔ لیکن جب فریقِ ثانی اپنے سیدھے سادے دلائل کے ساتھ واقعات کا عجیب و غریب مرقع پیش کرتا ہے تو غیر جانب داروں کو اُن سے اتفاقِ رائے کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

تجارتِ مامون کا مفہوم اوپر بھی بیان ہو چکا ہے۔ جو چیزیں بوجہ ارزانی دیگر ممالک سے آتی ہوں اُن پر ٹیکس قائم کرکے اُن کی درآمد روکنا تاکہ بوجہ قلت اُن کی قیمت مُلک میں بڑھ جائے اور ملکی صنعت و حرفت جو بحالتِ موجودہ دیگر ممالک سے مقابلہ نہیں کرسکتی اس تامین کے سہارے سے بتدریج ترقی کرلے حتّٰے کہ تامین سے مستغنی ہو جائے یا نیز صنعت و حرفت کو سرکاری امداد دینا تاکہ بذریعۂ ارزانی دوسرے ممالک پر

حصۂ چہارم
بابِ بست چہارم

وہ حاوی ہو جائے اور ملکی پیداوار کی برآمد میں اضافہ ہو۔ غرض کہ کسی نہ کسی طرح حتی الوسع ملکی پیداوار میں ترقی اور اضافہ ہو۔ درآمد تو صرف بحالتِ مجبوری گوارا کی جائے اور برآمد بڑھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے تاکہ معاشی تگ و دو میں اپنا ملک کسی سے پیچھے نظر نہ آئے۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ تجارتِ مامون کے اغراض و مقاصد تجارتِ آزاد کے بالکل برعکس ہیں جب کہ ایک ہی قوم کے افراد کے بجائے مختلف اقوام فریقِ مبادلہ ہوں تو مبادلے کے عام مسلّمہ فوائد مضرت کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعے کی ہم ابھی مزید تشریح کریں گے دوم مبادلے سے اگر بوقتِ موجودہ کچھ فائدہ حاصل ہوتا بھی ہے تو اس کی بجائے مستقبل معاشی ترقی ہزار درجہ قابلِ ترجیح شمار کی جاتی ہے اور اس ترقی کی وجہ سے نہ صرف موجودہ فوائد سے دست بردار ہونا پڑتا ہے بلکہ بشکل عارضی گرانی و سرکاری امداد مالی نقصان تک خوشی خوشی برداشت کر لیا جاتا ہے۔ گویا مبادلے میں جب کہ مختلف اقوام شریک ہوں تو معاشی حالات کے مطابق فریقین کو نفع اور نقصان پہنچنا دونوں ممکن ہیں اور تجارتِ بین الاقوام میں سرکاری نگرانی اور مداخلت اس لیے ضروری ہے کہ کہیں پس ماندہ ملک ترقی یافتہ فریق کے ہاتھوں تباہ و برباد نہ ہو جائے۔

نقطۂ نظر اقوام

۷۔ دنیا میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ ہر قوم کے بے شمار افراد جو طرح طرح کے تعلقات کی بدولت جمعیت قائم ہے وہ ایک ہی خطہ میں رہتے سہتے ہیں۔ ایک حکومت کے تابع ہوتے ہیں۔ نیز ان کا نسب ان کی زبان ان کے رسم و رواج بالعموم یکساں ہوتے ہیں ورنہ کم از کم مدتوں یکجا رہنے اور ملنے جلنے سے ان کے خیالات، عادات اخلاق اور طرزِ معاشرت میں ضرور یکرنگی پھیل جاتی ہے اور باوجود گوناگوں اختلافات کے پھر بھی ان میں ایک ایسی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کو ایک جداگانہ قوم کی شکل میں باہم مضبوط جکڑ دیتی ہے۔ لیکن جس طرح کروڑہا انسان

مل مل کر قومیں بن گئے۔ سب قومیں آپس میں متحد ہو کر ایک عالمگیر قوم نہ بن سکیں۔ ہر قوم ایک جداگانہ خطۂ زمین پر آباد ہے اکثر کے درمیان پہاڑ، سمندر، بُعدِ مسافت اور اختلافِ آب و ہوا سے، قدرتی حدود قائم ہیں۔ کہیں زبان، مذہب اور طرزِ معاشرت کا فرق قوموں کی علیحدگی کا باعث نظر آتا ہے اور کہیں قدیم تنازعات کی بنا پر جداگانہ قومیں بن گئیں جو تنازعات ختم ہونے پر بھی قائم رہیں۔

حاصل کلام یہ کہ افراد میں تو بشکلِ قوم جمعیت پیدا ہو گئی لیکن قوموں میں کوئی اس قسم کا اتحاد قائم نہیں ہوا کہ ان کو گھلا ملا کر ایک عالمگیر قوم بنا دیتا۔ ہر قوم اپنا جداگانہ وجود چاہتی ہے۔ اپنے عروج اور ترقی کی فکر میں لگی ہوئی ہے اپنا اقتدار بڑھانے میں مصروف ہے۔ دوسری قوموں پر سبقت حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے اور دوسروں کو اپنا ماتحت اور مطیع بنانے کی آرزو سے بے چین رہتی ہے اور موقع ملنے پر کبھی نہیں چوکتی۔ ہر روشن خیال اور حوصلہ مند فردِ قوم وطن پرستی کو فرضِ اولین قرار دیتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کی بہبودی کے منصوبے بھی تجویز ہوتے رہتے ہیں لیکن قومی منفعت کے مقابلے میں وہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ بظاہر ذرائع آمد و رفت کی سہولت و کثرت، اشاعتِ تعلیم اور عام بیداری کی بدولت تمام ممالکِ عالم میں بیگانگی گھٹ رہی ہے۔ بلکہ معاشی ترقیات نے ان کو نہایت قوی تعلقات سے مربوط کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ بین الاقوام معاشی تعلقات امن کے سب سے معتبر ضامن ہیں لیکن بار بار تجربہ ثابت کر رہا ہے کہ قوموں سے انانیت محو نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ جن اسباب سے بیگانگی گھٹتی اور تعلقات بڑھتے ہیں وہی اسباب رنگ بدل کر باہمی تنازعات اور جنگ کی بنا قرار پا جاتے ہیں۔ چنانچہ ترقی یافتہ اقوام میں ملک گیری سے کہیں بڑھ کر معاشی تسلط کی جدوجہد جاری ہے اور ذرائع آمد و رفت کی سہولت و عام بیداری سمندِ مقابلہ پر تازیانے کا کام

دے رہی ہے:
غرضکہ قوموں میں نفسی نفسی پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ نظامِ عالم ہی یوں قرار پایا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے افراد مِل جُل کر بشکل قوم رہیں اور ہر قوم اپنے اپنے بقا اور ترقی میں کوشاں رہے۔ جب کہ قومی بقا اور ترقی نصب العین اوّل قرار پایا تو حکومت کُل افرادِ قوم کے اعمال پر ضروری پابندی اور نگرانی قائم رکھتی ہے تاکہ یہ مقصد بدرجۂ اولیٰ پورا ہو اور اس کو کسی طرح پر مضرت نہ پہنچ سکے۔ اس مقصد کے واسطے اوّل معاشی استحکام لابُد ہے اور اس کے بعد فوجیں، بیڑے اور سامانِ حرب ضروری ہے جو معاشی استحکام بغیر میسّر آنے محال ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ہر قوم کو اپنا قیام اور عروج مطلوب ہے اور گوناگوں انقلابات کی بدولت معاشی استحکام اس کا سب سے کارگر آلہ ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ معاشی استحکام سے آخر کیا مُراد ہے۔ خدا نے ہر مُلک میں قسم قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں اور ہر قوم کو طرح طرح کی قابلیتیں عطا کی ہیں کُل قابلیتوں کو صرف کر کے کُل خداداد نعمتوں سے بدرجۂ اتم مفید ہونا اور اپنی ضروریات کے واسطے دوسری قوم کا کم سے کم محتاج ہونا اور بشرطِ امکان خود دوسروں کی ضروریات مہیا کرنا۔ اس کا نام معاشی استحکام ہے۔ ہر قوم ایک جسم ہے۔ اس میں بہت سے اعضا ہیں اور ہر عضو کا کام جداگانہ مخصوص ہے۔ اور جسم کی طاقت اور تندرستی جب ہی ممکن ہے کہ ہر عضو صحیح سالم رہ کر اپنا کام بطریقِ احسن سرانجام دے۔

ترقی یافتہ اور پیش رو قومیں اپنے موجودہ نفع کے خیال اور نیز مستقل رقابت کے اندیشے سے پس ماندہ مگر ہونہار اقوام کو اسقدر کثرت سے اور اتنی ارزاں چیزیں مہیا کر دیتی ہیں کہ باوجود مُلک میں ترقی صنعت وحرفت کی بےحد گنجائش ہونے کے اُن کو اپنی معاشی قوت بڑھانے کی نہ ضرورت محسوس ہو اور نہ کوئی سبیل نظر آئے کسی ایسی پیداوارِ خام کی بہم رسانی کہ جو ترقی یافتہ مُلک میں دستیاب نہ ہو سکے

اس غریب کے سپرد کر دی جاتی ہے اور وہ تیلی کے بیل کی طرح ایک ہی کام میں ہمیشہ چکر لگاتی رہتی ہے۔ پس جب کہ کوئی قوم پس ماندہ ہو مگر اُسکے افراد میں صنعت و حرفت کی قابلیت موجود ہو اور مُلک میں پیداوارِ خام بھی ہو تو ترقی یافتہ ممالک سے ارزاں مصنوعات کا سیلاب روکنے کے لیئے ٹکس درآمد کی ایک مضبوط اور بلند دیوار قائم کرنی اشد ضروری ہے۔ تاکہ اس ہونہار مُلک کی صنعت و حرفت جو ابھی عالمِ طفولیت میں ہے اس طرح محفوظ رہ کر کچھ عرصے میں اتنی ترقی کر لے کہ دیگر ممالک سے مقابلہ کر سکے اُس وقت دیوارِ ٹکس منہدم کر دینے میں کچھ پس و پیش نہ کرنا چاہیئے اور قیامِ ٹکس کے دوران میں بوجہ گرانی افرادِ قوم کو مالی بار بھی برداشت کرنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں صنعت و حرفت کی ترقی سے مُلک کو جو نفع حاصل ہوگا وہ اُس کی کہیں بڑھ کر تلافی کر دے گا اور اگر صنعت و حرفتِ زیرِ بحث اس قدر ترقی نہ کر سکے کہ دیگر ممالک کا مقابلہ برداشت کرے۔ لیکن قومی قیام اور تحفظ کے واسطے اشد ضروری ہو۔ مثلاً آلات و سامانِ حرب جہاز وغیرہ تو ٹکس درآمد کی دائمی دیوار قائم رکھ کر ایسی مصنوعات خود ہی تیار کرنی چاہئیں اِن چیزوں کے واسطے دوسری قوموں کا محتاج ہونا اپنے گلے میں رسّی ڈالنا ہے پس قوم خوشی خوشی ایسی گرانی کا بار اُٹھا لے گی۔ کیونکہ مال قوم کی حفاظت پر قربان ہے اور ارزانی کے لالچ سے قومی حکومت اور آزادی معرضِ خطر میں ڈالنا کونسی بدبخت قوم گوارا کرے گی۔

حاصل کلام یہ کہ اپنا اپنا قیام اور عروج مطلوب ہے جسکی بدولت اقوامِ عالم میں تنازع للبقا جاری ہے، کامیابی کے واسطے معاشی استحکام لابُد ہے اور ہونہار ممالک کو ترقی یافتہ مُلک کے مقابل بغیر ٹکس معاشی استحکام میسر آنا محال ہے ٹکسِ درآمد بعض حالتوں میں صرف چند روزہ ہوں گے اور بعض میں دیرپا۔ لیکن قوم کے حق میں بہرصورت ناگزیر اور مفید ہیں۔ گویا قوم کا عروج و اقتدار تامین تجارت سے وابستہ ہے۔

حصۂ چہارم
باب بست و چہارم

واضح ہو کہ تجارت آزاد کے سرگرم حامی خاص طور پر اہالی انگلستان ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر تجارت بین الاقوام کی تاریخ سے واضح ہوگا غیر معمولی جد و جہد حسن اتفاقات اور نیز چند صدیوں تک طریق تامین تجارت سے مدد لے کر انگلستان نے اپنا معاشی استحکام درجۂ کمال کو پہنچا لیا ہے اسکی مصنوعات نہ صرف ملکی ضروریات مہیا کرتی ہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی بکثرت جاتی ہیں۔ خاص طور پر اسی درآمد کو روکنے کے لیئے اوّل اوّل اکثر ممالک کو تامین تجارت کی ضرورت محسوس ہوئی غالباً اب تعجب نہ ہوگا کہ تجارت آزاد کے حامی ایسی تامین تجارت پر تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں جو مقامی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی خاطر سے جاری کی جائے۔ لیکن جن مصنوعات کا جنگ سے قریبی تعلق ہے مثلاً آلات و سامان حرب اور جہاز وغیرہ اور نیز جن کی خود ان کو بھی ضرورت ہے ان کے واسطے تامین تجارت نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں اور اس پر خود بھی عمل کرتے رہتے ہیں۔

زراعت اور صنعت و حرفت

۸ صنعت و حرفت کا معاشی حالت پر جو اثر پڑتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ یورپ کے کسی ملک کا ایشیا کے کسی ملک سے مقابلہ کرنا کافی ہے اور فرق کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ صنعت و حرفت میں اس قدر چیزیں اتنے طریقوں سے تیار ہوتی ہیں کہ ہر قسم کی قابلیت اور مذاق کا آدمی اپنے حسب حال کوئی شعبہ منتخب کر کے اس میں کما حقہ کمال پیدا کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ زراعت کی طرح جسمانی طاقت اور معمولی سمجھ کے علاوہ اور قابلیتوں کی کوئی پرسش نہ ہو گویا صنعت و حرفت میں انسانوں کی بیشمار قابلیتیں بطریق احسن کام آ سکتی ہیں۔ اس کا پیداوار پر جو اثر پڑتا ہے ظاہر ہے۔ خصوصاً کلوں کی بدولت جو صنعت و حرفت کا جز بھی ہیں اور نتیجہ بھی قوت پیداوار اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ایک کل چلانے والا صناع دس طاقتور ہل چلانے والے کاشتکاروں

پیدا کرتا ہے ؛

جس طرح انسانوں کی خداداد قابلیتیں صنعت و حرفت میں رنگ دکھاتی ہیں۔ زمین کی بے شمار قسم کی پیداوار بھی صنعت و حرفت ہی میں کام آسکتی ہیں۔ کاشتکاروں کی ضروریات اور پیداوار تو محتاجِ زندگی تک محدود تھیں لیکن جب صنعت و حرفت کا دور دورہ ہوا تو نہ ضروریات کا شمار رہا نہ پیداوار کا جو چیزیں صدیوں نامعلوم رہیں آج اُن سے دنیا واقف ہے جو چیزیں پہلے قوموں میں روزمرہ جلائی جاتی تھیں یا جلائی جاتی تھیں گھوڑوں پر پھینک دی جاتی تھیں آج لوگ اُن سے طرح طرح کے کام لیتے اور آرام پاتے ہیں جو چیزیں مدتوں وبالِ جان بنی رہیں آج اُن سے ملک مالا مال بن رہے ہیں ؛

حاصل کلام یہ کہ صنعت و حرفت میں کُل خداداد نعمتیں۔ خواہ وہ انسانی قابلیتیں ہوں خواہ زمین کی پیداوار بدرجۂ اعلٰی کام آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ صناع قومیں دنیا کی سرتاج بنی ہوئی ہیں ؛

قوم کی پستی اور عروج بے شمار اسباب پر منحصر ہے اور بیشتر اہم اسباب دماغی معاشرتی سیاسی اور معاشی حالت سے وابستہ ہیں۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ جس قوم کا عام پیشہ زراعت ہو وہ کم از کم بحالتِ موجودہ ان ترقی یافتہ اقوام کا رتبہ نہیں پاسکتی جن کی فوقیت صنعت و حرفت کی خوبیوں پر مبنی ہے۔ اس بحث سے زراعت کو فضول یا ناقابلِ التفات قرار دینا مقصود نہیں بلکہ ایک اہم فرق جتانا منظور ہے جس کی صحت پر عالمگیر مشاہدات شاہد ہیں ۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ زراعت سب سے قدیم پیشہ ہے صنعت و حرفت اسی سے پیدا ہوئی اور اب بھی بیشتر اسی پر قائم ہے زراعت سے ناگزیر ضروریات حاصل ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے وہ سب پیشوں پر اب بھی مقدم ہے حتی الوسع ہر قوم کو اپنی زراعت بحال رکھنی چاہیئے تاکہ زرعی پیداوار خام کے واسطے جو کہ صنعت و حرفت کی بنا ہے وہ دوسری قوموں کی محتاج

نذر ہے۔ زراعت کی یہ خوبیاں اور ضرورتیں سب تسلیم ہیں لیکن پھر بھی صنعت و حرفت کو دیگر لحاظ سے اس پر فوقیت حاصل ہونا عجب نہیں ؛

یہ امر بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں کہ تجارتِ خارجہ کا قیام بہت سے اسباب پر منحصر ہے اگر فریقِ ثانی کسی وجہ سے پیداوارِ خام زراعتی ملک سے لینا ترک کر دے یا کوئی جنگ چھڑ جائے جس کے خطرے اور پیش بندی سے کسی بیدار اور مآل اندیش قوم کو غافل نہ رہنا چاہیئے تو زراعتی ملک کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہوگی نہ تو اُس کو اپنی اس پیداوارِ خام کا کوئی مصرف نظر آئے گا جو دوسرے ملک کو جاتی تھی اور نہ اُس کو وہ مصنوعات میسر آئیں گی جن کا وہ بے حد عادی ہو چکا ہے۔ چنانچہ کئی مرتبہ ایسا واقع ہوا ہے کہ دو ملکوں میں جنگ چھڑی جو ملک صرف پیداوارِ خام مہیا کرتا اور مصنوعات دیگر ممالک سے خریدتا تھا اُس کی کم بختی آ گئی سوئی پنسل اور دیا سلائی تک کو محتاج ہو گیا۔ ایسی پس ماندہ قوم بھلا جنگ میں کیا عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بعض ممالک پر بڑے بڑے نازک وقت گزر گئے مصیبتیں آئیں زحمتیں ہوئیں۔ لیکن اس گوشمالی سے ہمیشہ کے واسطے ایسی عبرت ہوئی کہ جنگ پیامِ بیداری و عروج ثابت ہوئی۔ فوراً ملکی صنعت و حرفت کو حتی الوسع ترقی دینے کی دُھن ہو گئی۔ سو سو طرح ایثار کیے تکلیفیں اُٹھائیں لیکن جب تک ملکی صنعت و حرفت کو زندہ نہ کر لیا دم نہ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی دنیا کی زندہ اور معزز قوموں میں شمار ہونے لگیں آگے چل کر تجارتِ خارجہ کی تاریخ میں ایسے واقعات اکثر نظر سے گزریں گے ؛

مصنوعات کی درآمد پر اکتفا کرنے سے ایک عظیم الشان نقصان یہ بھی پہنچتا ہے کہ بے شمار قسم کی پیداوارِ خام جو بوجہ وزن دار یا سریع الزوال ہونے کے زیادہ مقدار میں دیگر ممالک بھی نہ جا سکے۔

مثلاً لوہا۔ پتھر۔ لکڑی۔ خوشبودار پھول یا ایسے قدرتی اسباب جن سے صنعت و حرفت میں بڑے بڑے کام نکل سکیں۔ مثلاً آبشار۔ دریا۔ پہاڑیاں یہ سب بیکار رہ جاتے ہیں اور زراعتی قوم ایسے لوگوں کی خدمات سے محروم رہ جاتی ہے جن میں قدرت نے اسقدر قابلیت ودیعت کی تھی کہ اگر موقع ملتا تو وہ اپنے کو بڑے سے بڑے موجد اور صنّاع ثابت کر کے مُلک کو مالا مال کر دکھاتے۔ چنانچہ ہم مقدمے اور کارکردگی کے بحث میں جتا چکے ہیں کہ مُلک میں صنعت و حرفت کی پس ماندگی اور صنعتی تعلیم کی قلت سے بہت سی بیش بہا پیداوارِ خام اور لاجواب خداداد الطبعی اوکس مپرسی کے ہاتھوں ضائع اور برباد ہو رہی ہے۔

پیداوارِ خام کی برآمد کے متعلق ایک اور نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں وہ کچھ اہم نہیں معلوم ہوتا۔ بعض پیداوارِ خام ایسی ہیں کہ عام طور پر صنعت و حرفت کی ترقی کے واسطے لابدی ہیں۔ مثلاً لوہا۔ پیتل۔ تانبا جن سے مشین بنے کوئلہ اور مٹی کا تیل جن سے انجن چلے۔ خاص قسم کی لکڑیاں جن سے اعلے درجے کا فرنیچر بنے۔ یہ چیزیں دیر پا نہیں ہیں ان کو خاص طور پر محفوظ اور مصئون رکھنا چاہیئے تاکہ خدا اگر کبھی دن پھیرے تو ان سے پورا پورا کام لیا جاسکے اور دوسروں کا محتاج بننا نہ پڑے اُن کی مقدار خواہ کتنی ہی کثیر ہو پھر بھی محدود ہوتی ہے۔ اور قومی معاملات میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ پس ایسی پیداوارِ خام کے بدلے میں مصنوعات لینا ایسا ہے جیسا کہ پارس پتھر کے بدلے میں سونا لینا۔

برآمد پیداوارِ خام اور درآمد مصنوعات کے متعلق صرف ایک اور نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ زراعت قانونِ تقلیل حاصل کی پیرو ہے۔ اور زرعی پیداوار جس سے خوراک

حاصل ہو۔ اس کی طلب بھی غیر تغیر پذیر ہے ۔ اس کے برعکس مصنوعات قانونِ تحتیرِ حاصل کے پابند ہوتے ہیں اور اُن کی طلب تغیر پذیر ہوتی ہے جس سے مُلک سے سامان خوراک کی برآمد ہو وہاں اسکی گرانی کا بار سب پر پڑنا لابُد ہے ۔ حالانکہ مُلک کو نفع بشکل لگان مقابلۃً بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور جن مصنوعات کی درآمد ہوتی ہے وہ اکثر داخل تنعّمات ہیں یعنی اُن سے اس قدر عام اور ناگزیر ضروریات مہیا نہیں ہوتیں جتنی کہ سامانِ خوراک سے گویا خوراک کی گرانی کا بار تو بلا استثنا سب پر پڑتا ہے ۔ لیکن اضافۂ لگان ایک خاص گروہ کی جیب میں جاتا ہے اور ارزانی مصنوعات کا لطف بھی وہی اُٹھا سکتے ہیں جن کے پلّے چار پیسے ہوں نتیجہ یہ ہے کہ ہزارہا غریبوں کو برآمدِ سامانِ خوراک کی بدولت پیٹ پالنا دشوار ہو جاتا ہے جو مُلک سامانِ خوراک لے اور مصنوعات دے اُس کی حالت برعکس ہے اوّل تو قانونِ موازنۂ مصارف کی رو سے اس کو سامانِ خوراک ارزاں پڑتا ہے اور سامانِ خوراک کا ناگزیر ضروریات میں نمبر اوّل ہے گویا اس کی ارزانی سے تمام لوگ بلا استثنا مستفید ہوتے ہیں اور مصنوعات کی ارزانی کا جدا لطف اُٹھاتے ہیں ۔ گویا جس مُلک سے سامانِ خوراک کی برآمد ہو وہاں ایک بڑی جماعت کو گرانی خوراک سے زیر بار ہونا پڑتا ہے ۔ اور خاص خاص گروہ اضافۂ لگان اور ارزانی مصنوعات کا لطف اُٹھاتے ہیں ۔ حالانکہ جس مُلک سے مصنوعات کی برآمد ہو ۔ وہاں خوراک اور مصنوعات دونوں کی ارزانی سب کے واسطے عام ہوتی ہے ؛

اس سے قبل واضح کیا جاچکا ہے کہ اگر کوئی زراعت پر قناعت کرے اور تجارتِ خارجہ جاری نہ کرے یا اگر جاری کرے تو وقتِ مناسب پر مصنوعات کی درآمد نہ روکے اور ملکی صنعت وحرفت کو ترقّی نہ دے تو اس کا کیا کیا حشر ہو گا ۔ ماسبق بحث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر

کوئی ملک صرف صنعت و حرفت میں مصروف رہے اور دوسرے ملکوں سے پیداوارِ خام اور سامان خوراک لے تو اس کی حالت زراعت والے ملک سے بہتر ہوگی۔ لیکن اس ملک کو بھی ایک بڑا خطرہ باقی رہے گا جس کا لحاظ بہت ضروری ہے پیداوارِ خام تو کل صنعت و حرفت کی بنا ٹھیری اور خوراک کا لوازمات زندگی میں سب سے اوّل نمبر ہے۔ اب اگر خدانخواستہ جنگ یا اور کسی اسباب سے ان چیزوں کی درآمد رک جائے تو پھر ایسے ملک کی حالت نہایت اندیشہ ناک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انگلستان کی بیشتر معاشی حالت اسی ملک کی سی ہے اور انھیں خطروں کے لحاظ سے اوّل تو اس نے اپنا بیڑا نہایت زبردست بنا رکھا ہے دوم راستوں پر اکثر موقع کے بندرگاہ اور آبنائے اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں۔ سوم اکثر زرعی ممالک پر اپنی حکومت یا کم از کم اپنا اثر اور رسوخ قائم کر رکھا ہے ان بندوبستوں کے ہوتے ہوئے پیداوارِ خام اور سامان خوراک کی درآمد رکنے کا خطرہ خیالِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بایں ہمہ موجودہ جنگ یورپ میں انگلستان کو خوراک اور پیداوارِ خام کی رسد میں کیسی کیسی دقتیں پیش آئیں دیگر ممالک اس قدر جرأت نہیں کرتے پیداوارِ خام وہ باہر سے لیتے ضرور ہیں لیکن ملکی ذرائع کو بھی بنظر احتیاط برقرار اور محفوظ رکھتے ہیں۔

اوپر کی تفصیلی بحث سے تجارتِ خارجہ کے کُل ضروری پہلو واضح ہونے کے بعد اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ کسی قوم کے واسطے اس سے بڑھ کر کوئی خوش قسمتی نہیں کہ وہ اپنی بیشتر ضروریات خود مہیا کر سکے۔ ملک میں پیداوارِ خام کی بھی کثرت ہو اور صنعت و حرفت بھی اتنی ترقی یافتہ ہو کہ بہ آسانی مصنوعات دستیاب ہو جائیں اس قوم کی حالت ایک نہایت توانا تندرست اور کمائو شخص کی سی ہوگی

جو اپنے قوتِ بازو پر ہمیشہ بھروسہ کر سکے اور لازماً کسی کا دست نگر نہ ہو بلکہ اڑے وقت خود دوسروں کی دست گیری کر سکے اور لوگوں میں عزت وقعت کی زندگی بسر کرے ٭

قوم کے معاشی وسائل اور اُن کا استعمال

۹ - قومی مفاد اور عروج کا نصب العین جو ہم نے اوپر پیش کیا اور اُس کے حصول کے جو جو معاشی طریق بتائے اُن کا فی نفسہٖ بجا اور درست ہونا دُنیا بھر میں مسلّم ہے اس راہ پر چل کر بعض قومیں منزلِ مقصود تک پہنچ چکی ہیں - مثلاً سب سے اوّل انگلستان اس کے بعد امریکہ جرمنی اور فرانس - بعض آزاد اور مآل اندیش قومیں اب بھی اس راہ سے منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہی ہیں بالخصوص جاپان جہاں ملکی صنعت وحرفت کی ترقی کا خیال بسرعت قوت پکڑ رہا اور ہر طرف پھیل رہا ہے لیکن یہ خیال سراسر غلط ہوگا کہ ہر قوم اس راہ پر چل کر قومیت کا نصب العین حاصل کر سکتی ہے - اس کامیابی کیواسطے چند شرائط لازمی ہیں جن کی تکمیل کہیں کہیں قوموں کی کوشش کی منتظر ہے اور کہیں قوموں کی قدرت سے تقریباً باہر ہے وہ قومیں شرائط مذکور پورا کرنے سے معذور ہیں - لہٰذا قومی نصب العین اُن کو صرف بدرجۂ ادنیٰ میسّر آسکتا ہے ، دُنیا کے ملکوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ بعض کا رقبہ مختصر ہے - آبادی تھوڑی ہے - پیداوارِ خام کی قلت ہے یا جو کچھ پیداوارِ خام ہے وہ صرف معدودے چند قسم کی ہے - مثلاً ڈنمارک - بلجیم - سوئٹزرلینڈ - پرتگال - یونان - ہالینڈ - ناروے اور سویڈن - اگر یہ ملک اپنی کُل ضروریات خود مہیا کرنے کی کوشش کریں تو نتیجہ نقصان اور ناکامی ہوگا ان کے حق میں بہت سے مصنوعات کی مستقل درآمد اور پیداوارِ خام کی برآمد ناگزیر ہے تو کیا عجب ہے لیکن اس پر بھی جس صنعت وحرفت کی ترقی کا موقع دیکھتے ہیں بذریعہ تامین تجارت اس کی غور وپرداخت میں جان کھپا رہے ہیں اور جس قدر مصنوعات خود تیار کر سکیں اُن کو غنیمت سمجھتے ہیں لیکن بعض ملک ایسے بھی

نظر آئیں گے جن کو بجائے خود ایک دنیا سمجھنا بیجا نہ ہوگا۔ مثلاً امریکہ یا ہندوستان کیسے کیسے رقبے کتنی بڑی بڑی آبادیاں پیداوار خام کی بے شمار قسمیں اور کثیر مقدار۔ دریا۔ پہاڑ۔ میدان مختلف آب و ہوا۔ غرض کہ طرح طرح کے قدرتی اسباب موجود ہیں۔ یہ وہ ملک ہیں کہ جن کو قومی نصب العین حاصل کرنے کے واسطے معاشی اسباب خاطر خواہ میسر ہیں۔ امریکہ کی معاشی ترقی ہر طرف ضرب المثل ہے اور ہندوستان صرف موقع کا منتظر ہے۔ متوسط درجے کے ملک بھی حتی الوسع معاشی استحکام اور صنعت و حرفت کی ترقی میں برابر مصروف ہیں جرمنی اور فرانس نے باوجود چھوٹے چھوٹے ملک ہونے کے کیا کچھ نہیں کر دکھایا۔ خطۂ حارہ کے زرخیز مگر غیر آباد ملک مثلاً افریقہ کے حق میں تجارت آزاد بہت زیادہ مفید ہے ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے اسباب مہیا ہونے میں وہاں ابھی وقت درکار ہے اور اس دوران میں پیداوار خام جس کی کثرت ہے باہر بھیج کر دولت بڑھانا اور مصنوعات منگا کر ترقی کی اُمنگ پیدا کرنا اس کے لیئے سب سے بہتر ہے۔ رہے غیر آباد ریگستان اور برفستان وہاں معاشی ترقیات کا خیال ہی عبث ہے؛

تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک کا عام پیشہ زراعت ہو اور پیداوار خام کی کثرت ہو تو اول اول مصنوعات کی درآمد اور پیداوار خام کی برآمد ایسے ملک کے حق میں پیام رحمت اور تازیانۂ ترقی ثابت ہوگی ایسی حالت میں تجارت آزاد نہ صرف جائز بلکہ ناگزیر ہے کچھ عرصے بعد ملک میں عام حرکت نمودار ہوگی اور وہ اپنے قدموں پر خود کھڑا ہونے کی کوشش شروع کرے تو عجب نہیں۔ اس دوران برآمد پیداوار خام کی بدولت کچھ اصل پس انداز ہو چکا ہوگا مصنوعات کے استعمال سے معاشی ترقی کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی غور اور مشاہدے سے زراعت کے ساتھ صنعت و حرفت کو بھی ملک میں ترقی دینے کے

فائدے کچھ کچھ نظر آنے لگے ہوں گے اور مصنوعات تیار کرنے کے بُرے بھلے آلات اور تھوڑی بہت مہارت بھی حاصل ہوگئی ہوگی۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ اس کو تامین تجارت سے محروم رکھنا سراسر نادانی یا ظلم ہوگا۔ یہ وقت آجانے کے بعد جتنی بھی تاخیر ہوگی ترقی کی دقتیں بڑھیں گی! چنانچہ بعض قوموں کو تو ہر قسم کے لامحدود ایثار کرنے پڑے تب کہیں یہ موقع نصیب ہوا۔ البتہ منفعت مابعد نے اس ایثار کی تلافی بدرجۂ اولیٰ ضرور کردی اور جلد کردی۔

اب صرف یہ سوال باقی ہے کہ تامینِ تجارت کب تک قائم رکھنی چاہیئے۔ جواب صاف ہے۔ جب تک کہ تجارتِ آزاد سے تامین کی غرض و غایت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ باقی رہے خواہ دوران تامین مختصر ہو یا وسیع اس کو اُس وقت تک ہرگز ترک نہ کرنا چاہیئے جب تک اصلی اغراض و مقاصد اجازت نہ دیں اور اُن کی ہم اوپر تشریح کر چکے ہیں۔

طریق تامین کی تفصیل

۱۰۔ تامین کی ضرورت اب خوب واضح ہوگئی، ترقی یافتہ ممالک کے مصنوعات ترقی طلب ممالک میں داخل ہوکر نہایت ارزاں بکثرت فروخت ہوتے ہیں اور آخر الذکر ممالک بوجہ موجودہ پس ماندگی کے اس قدر ارزاں مصنوعات تیار کرنے سے معذور ہیں۔ عوام سے اسقدر مآل اندیشی کی توقع عبث ہے کہ وہ خود بخود ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی غرض سے مستقل طور پر ارزاں مصنوعات کے مقابل گراں خریدیں اور جب ملکی مصنوعات فروخت ہوسکنے کی بوجہ موجودہ گرانی سردست کوئی امید نہ ہو تو لوگ صنعت و حرفت جاری کر کے اپنا اصل معرض خطر میں ڈالنا کیوں گوارا کرنے لگے۔ گویا ارزاں مصنوعات کی درآمد ملکی صنعت و حرفت کے قیام و ترقی سے مزاحم ہوتی ہے پس گورنمنٹ کو جو کہ عوام کی نمائندہ اور ملکی بہبودی کی محافظ ہے کوئی ایسا طریق اختیار کرنا پڑتا ہے کہ درآمد مصنوعات کا تباہ کن اثر زائل ہوجائے پہلا طریق تو یہ ہے کہ مصنوعات کی درآمد پر ٹکس قائم کردیا جائے تاکہ

ان کی قیمت میں اس قدر اضافہ ہو جائے کہ ملکی مصنوعات ان کا اپنے
بازار میں مقابلہ کر سکیں یعنی وہ بھی ملکی مصنوعات کے برابر گراں ہو جائیں
تا آنکہ لوگ اپنے ملک کی چیزیں خریدنے پر مائل نہ ہوں اور صنعت و حرفت
قائم کرنے والوں کو بھی کاروبار نہ چلنے اور راس المال ضائع ہونے کا اندیشہ
نہ رہے۔ اس ٹکس کا بشکل گرانی مصنوعات عوام پر بار ضرور پڑے گا۔
لیکن اوّل تو ملکی صنعت و حرفت کچھ عرصے میں ترقی کریں گی تو مصنوعات
خود ارزاں ہو جائیں گی۔ دوسرے نہ دیگر ممالک کے مقابلے کا خوف
رہے گا اور نہ ٹکس کی ضرورت۔ گویا ٹکس محض ایک عارضی بار ہوگا
جس کے معاوضے میں صنعت و حرفت کے قیام سے دائمی
رفاہ الحالی ہاتھ آئے گی اور اگر ٹکس کا بار مدت دراز تک بھی برداشت
کرنا پڑے اور مصنوعات قومی تحفظ کے واسطے ضروری ہوں تو انکو
بخوشی برداشت کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ فوج اور بیڑوں
کے مصارف برداشت کیئے جاتے ہیں، قیام ٹکس کے متعلق
اس قدر ہدایت ضروری ہے کہ اُن کو کم مقدار میں جاری کر کے بتدریج
بڑھانا چاہیئے کہ مصنوعات کی درآمد رُکنے یا یکایک گرانی بڑھ جانے
سے لوگ گھبرا نہ اُٹھیں اور ٹکس ناقابل برداشت محسوس نہ ہونے لگے
جوں جوں درآمد بتدریج رُکے گی ملکی مصنوعات بازار پر قبضہ کریں گی
اور لوگ گرانی بھی کم محسوس کریں گے حتّٰی کہ ملکی صنعت و حرفت میں کافی
تامین حاصل ہو جانے کے بعد ملکی ضروریات مہیا کر سکنے کی قابلیت
بھی پیدا ہو جائے گی۔ قیام صنعت و حرفت کے چند در چند فوائد جب
لوگ آنکھوں سے دیکھیں گے تو گرانی کی ذرّہ برابر بھی پروا نہ کریں گے
اور کچھ عرصے بعد ارزانی خود بخود عود کر آئے گی۔ یا نہ بھی کرے گی تو
صنعت و حرفت زیر بحث سے دوسرے قسم کے اہم فوائد حاصل
ہوں گے جو بارِ گرانی کی بدرجۂ اولیٰ تلافی کر دیں گے؛
ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کا دوسرا طریق یہ بھی ہے کہ

حصّہ چہارم
باب بست وچہارم

سرکار کی طرف سے کسی مقررہ اصول کے مطابق مالی امداد ملے۔ چنانچہ امریکہ۔ فرانس۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ اور جاپان میں آج کل یہ طریق بھی رائج ہے۔ مثلاً کسی صنعت وحرفت جاری کرنے والوں کو ایک معیّن شرح منافع کی سرکار کی جانب سے ضمانت مل جائے کہ اگر کاروباری منافع شرح معین سے کم رہے تو سرکار اپنی طرف سے اس کمی کو پورا کردے گی۔ اسکو اصطلاحاً **طریق ضمانت منافع** کہتے ہیں خود ہماری سرکار نے جب ولایت کی کمپنیوں کو ہندوستان میں ریل بنانے کے ٹھیکے دئے تو علاوہ اور طرح طرح کی رعایتوں کے طریق مذکور کے مطابق بالعموم ۵ فی صدی منافع کی اپنی طرف سے ضمانت کی تھی اور کروڑہا روپیہ اس مد میں مدّتوں ادا بھی کرنا پڑا تب کہیں ریلیں جاری ہوئیں۔ امریکہ اور میکسیکو میں بھی یہ طریق مروّج ہے۔ کہیں کہیں مثلاً رومانیا اور ہنگری میں صنعت وحرفت کی دستگیری کی نیّت سے اُن کو ٹکس سے مستثنیٰ کردیا جاتا ہے یا کم از کم شرح ٹکس میں معقول تخفیف کردی جاتی ہے سوم مصنوعات کی برآمد بڑھانے کی غرض سے کرائیہ آمد ورفت مال میں خاص رعایت کی جاتی ہے اور چہارم برآمد پر علانیہ کسی شرح معیّن سے سرکاری امداد ملتی ہے۔ مثلاً اگر ایک لاکھ مصنوعات یا ایک لاکھ من پیداوار کی برآمد ہو تو کارخانوں کو سرکار کی طرف سے ۳ ر فی چیز یا ۲ ر فی من کے حساب سے امداد ملے گی تاکہ دوسرے ملکوں کے بازار میں وہاں کی مصنوعات وپیداوار سے مقابلہ کرنے میں مدد ملے گویا یہ دوسرے ملکوں کے حملہ کرنے کا طریق ہے اور برآمد کی بدولت ملکی صنعت وحرفت کو جو ترقی ہوتی ہے اُس سے سرکاری صرف کی بدرجۂ اولیٰ تلافی ہو جاتی ہے چنانچہ جرمنی فرانس اور آسٹریا نے یوں ہی برآمد پر امداد دے کر اپنے مُلک میں شکرسازی کو اس قدر ترقی دی کہ اب تمام دُنیا کا بازار انھیں تین ملکوں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اچھا سے اچھا نیشکر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ان ملکوں کی شکر کے سامنے ہندوستانی شکر کا

پہنچنا محال نظر آرہا ہے۔

حامیانِ تجارتِ آزاد ٹکس در آمد اور سرکاری امداد صنعت وحرفت کے مذکورۂ بالا نتائج سے اُصولاً تو متفق ہیں یعنی ایسے نتائج کا ظہور پذیر ہونا تسلیم کرتے ہیں لیکن ٹکس اور امداد کے عملاً پھر بھی مخالف ہیں۔ مخالفت کی وجہ یہ قرار دی جاتی ہے کہ اصولاً طریقِ تامین جیسا ہونا چاہیئے عملاً ویسا قائم کرنا نہ صرف دشوار بلکہ محال اور ناممکن ہے کیسی صنعت وحرفت کی موجودہ حالت سے مستقبل قریب وبعید کا صحیح اندازہ کرنا تامین کے نقصانات اور منفعت کا ٹھیک ٹھیک موازنہ کرنا اس قدر دشوار ہے کہ اس میں ہمیشہ غلطی ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے جبکہ حکومت اور کاروبار میں ایسے قریبی تعلقات ہوں گے تو خوف ہے کہ سیاست پر انفرادی اغراض ومقاصد کا رنگ چڑھے، ہر طرف سے جابجا تامین کا مطالبہ شروع ہوا اور رعایت وجانب داری سے حکمرانی میں ابتری نمودار ہو۔ چنانچہ مثال کے طور پر امریکہ کی حالت پیش کی جاتی ہے جہاں آئے دن مختلف طبقے اپنی غرض کے موافق تامین کی تائید اور مخالفت کرتے اور بعض وقت گورنمنٹ کو حیرانی میں ڈال دیتے ہیں خصوصاً جمہوری حکومتوں کو جو عوام کی تائید پر قائم ہوتی ہیں اس معاملے میں خاص دقت پیش آتی ہے۔ سب کے مطالبات پورے کر کے سب کو خوش کرنا تو محال ہے لیکن فریقِ غالب کے خلافِ رائے عمل کرنے کی بھی جرأت کم کی جاتی ہے اور کاروبار میں ذاتی منفعت کو عوام کی بہبودی پر قربان کرنا معلوم۔ اگر تامین کی آڑ میں قابو یافتہ فرقے اپنے اپنے مطالب براری کی کوشش کریں جس سے عوام کو بجائے کسی نفع کے نقصان پہنچے تو عجب نہیں۔ حامیانِ تامین کے خیال میں یہ خطرہ اگر سراسر بے بنیاد نہیں تو مبالغہ آمیز ضرور ہے۔ تجربے سے ثابت ہو رہا ہے کہ باوجود مختلف فرقوں کی خودغرضانہ کوششوں کے عام بیداری کی بدولت صحیح اصول پر قائم رہ کر تامین جاری کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ

حصۂ چہارم
باب بست چہارم

اس طریق سے ملکوں کو برابر نفع پہنچ رہا ہے ؎

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ تامین روشن خیالی کے منافی ہے۔ اس میں بہت خود غرضی اور تنگ دلی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا حقیقی منشا قومی قیام اور ترقی ہے اور یہ قدرت کے عالمگیر قانون [illegible] کے عین مطابق ہے اپنے وجود کا تحفظ اور ترقی کی کوشش خود قدرت نے ہر ایک پر عائد کر دی ہے اپنی ہستی دوسروں کی خاطر خاک میں ملانا انفرادی طور پر عمدہ ایثار بھی لیکن بہ حیثیت القوم اس پر عملدرآمد ہونا نہ ممکن نہ مفید ؎

محصول تامین و محصول مال

۱۱۔ جو ملک تامین تجارت کے پابند ہیں ان میں درآمد برآمد پر ٹکس قائم ہونا تو ضروری ہے لیکن تعجب ہوگا جن ممالک میں تجارت آزاد کا رواج ہے وہاں بھی ایسے ٹکس موجود ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟ کیا اس سے آخر الذکر ممالک کے قول و فعل میں تضاد لازم آتا ہے نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ٹکس درآمد و برآمد کی دو قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا فعل جداگانہ اور مختلف ہے درآمد پر ٹکس قائم کرنے سے کبھی تو گرانی بڑھا کر درآمد کا روکنا مقصود ہوتا ہے تاکہ ملکی صنعت و حرفت کو زیادہ ترقی یافتہ حریفوں کے مقابلے سے امان ملے اور ٹکس کی آڑ میں وہ اپنی حالت سنبھال کر آزادانہ مقابلے کے قابل بن جائے یا اس قابل نہ بھی بن سکے تو ملکی مصالح کے لحاظ سے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ یہ ٹکس گویا تامین تجارت کا آلہ ہوتا ہے۔ اسکو اصطلاحاً محصول تامین کہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ درآمد جس قدر زیادہ بند ہوگی اسیقدر محصول تامین کامیاب شمار کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا مقصد ہی درآمد روکنا ہے اور بس۔ لیکن درآمد پر ٹکس قائم کرنے کا مقصد کبھی محض آمدنی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ آمدنی جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر ایسا ٹکس کامیاب قرار پائے گا اور ٹکس کی مزاحمت سے درآمد جس قدر کم رکے گی اسی قدر آمدنی زیادہ حاصل ہوگی۔ پس ایسے ٹکس کی بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ

سے حتی الامکان درآمد کم رہے اور آمدنی بہت زیادہ رہے - یہی وہ عکس ہے جو آزاد تجارت والے ممالک میں بھی رائج ہے اسکو اصطلاحاً محصول مال کہتے ہیں غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ محصول تامین اور محصول مال کی غرض مختلف اور اُن کے معیار کامیابی بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہیں - قسم اول کی غرض ملکی صنعت وحرفت کو ترقی دینا ہے درآمد جس قدر زیادہ بند ہو اور آمدنی جس قدر کم ہاتھ آئے اتنا ہی محصول تامین کامیاب سمجھنا چاہیئے - اس کے برخلاف قسم دوم کا مقصد محض مالی منفعت ہے - درآمد جس قدر کم رہے اور آمدنی جس قدر کثیر رہے اتنا ہی محصول مال زیادہ کامیاب مانا جاتا ہے - گویا وہی نتیجہ ایک کی کامیابی اور دوسرے کی ناکامیابی شمار ہوتا ہے ؂

محصول تامین کی ضرورت اور مواقع اوپر کی بحث سے اظہر من الشمس ہیں محصول مال کی غرض خود اُس کے نام سے مترشح ہوتی ہے - یعنی آمدنی حاصل کرنا - اب صرف غور طلب امر یہ ہے کہ کن صورتوں میں محصول مال قائم کرنا چاہیئے اور اس کی کامیابی کن شرائط کی پابند ہے اول تو جس جنس کی درآمد پر محصول قائم کیا جائے اس کی طلب تغیر پذیر ہونی چاہیئے تاکہ قیمت کے اضافے سے طلب بہت زیادہ گھٹ جانے کا اندیشہ برآمد والے ملک کو دامنگیر رہے اور تخفیف طلب کے خوف سے وہ حتی الوسع قیمت بڑھانے سے محترز رہے اور کاروبار جاری رکھنے کی خاطر بشرط امکان محصول کا بار خود ہی برداشت کرے - بذریعۂ اضافۂ قیمت اس کا بار خریداروں پر منتقل کر کے اپنے کاروبار کو معرض خطر میں نہ ڈالے، دوم یہی ملک جو محصول قائم کرے اشیائے زیر بحث کا اکیلا یا سب سے بڑا خریدار ہو تاکہ برآمد والے ملک کا کاروبار اس ملک کی درآمد پر بیشتر منحصر ہو اور دیگر ممالک کی طلب کاروبار کو موجودہ پیمانے پر جاری نہ رکھ سکے ایسی حالت میں برآمد والا ملک درآمد والے کا پاس خاطر بلکہ نازبرداری جس قدر بھی کرے عجب نہیں ؂

جب کہ ہر دو مذکورۂ بالا صورتیں یکجا ہوں تو درآمد پر محصول مال بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہو سکتا ہے۔ یعنی درآمد بھی کم رُک سکے گی، آمدنی بھی زیادہ ملے گی اور لطف یہ کہ محصول کا جزو اعظم دوسرے ملک کی جیب سے ادا ہوگا اور قیمت نہ بڑھنے کی وجہ سے اپنے ملک پر اس کا بار بہت کم پڑیگا۔ لیکن اگر شرط اوّل پوری نہ ہو یعنی طلب تغیر پذیر ہونے کی بجائے غیر تغیر پذیر ہو۔ یا اضافۂ قیمت پر بھی اس میں کوئی قابل لحاظ تخفیف نہ ہو تو برآمد والے ملک کی جرأت بڑھے گی اور وہ قیمت میں اضافہ کر کے محصول کا بیشتر بار خود محصول قائم کرنے والے ملک پر ڈال دے تو عجب نہیں، درآمد والے ملک کو آمدنی تو اب بھی حاصل ہوگی لیکن خود اپنی جیب سے اسی طرح اگر دوسری شرط غائب ہو یعنی محصول قائم کرنے والا ملک شئے زیر بحث کا سب سے بڑا خریدار نہ ہو بلکہ اور ممالک میں بھی اس کی کافی مانگ ہو اور اگر ملک اوّل الذکر خریداری ترک کر دے تب بھی کاروبار کو کوئی مضرت نہ پہنچے تو اس صورت میں شئے زیر بحث کی درآمد محصول والے ملک میں بند ہو جائیگی اور دیگر ممالک میں جاری رہے گی۔ جب درآمد رُکی تو پھر آمدنی کیسی گویا محصول مال کی غرض و غایت فوت ہو جائے گی اور اگر ہر دو شرائط ایک ساتھ مفقود ہوں تو پھر برآمد والے ملک کی چڑھ بنے گی اس کو فروخت کیطرف سے پورا اطمینان حاصل ہوگا اور شرط اوّل پوری نہ ہونے کی حالت میں وہ قیمت جس قدر بڑھا سکتا تھا اس سے بھی زیادہ بڑھانا اب اس کے واسطے سہل ہوگا۔

کون نہیں جانتا کہ اب ہر دو شرائط کا بہ تمام و کمال پورا ہونا غیر اغلب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محصول مال برآمد اور درآمد والے دونوں ملک ملکر ادا کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کبھی ایک ملک پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ کبھی دوسرے پر۔ بار کی کمی بیشی گوناگوں اسباب و حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن دو خاص اسباب وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ یعنی طلب کی تغیر پذیری یا غیر تغیر پذیری اور طلب کا محصول والے ملک تک محدود ہونا

یا عام ہونا:

جبکہ محصول مال کا بار دونوں ملکوں پر پڑے تو درآمد والے ملک میں وہ جس قدر قیمت میں اضافہ کرے گا اُسی قدر محصول تامین کا کام دے گا۔ مثلاً فرض کرو کہ ولایت کے کپڑے پر ہندوستان میں دس فی صدی محصول درآمد قائم کیا جائے۔ غالباً نہ تو کپڑے کی قیمت میں یک دم دس فی صدی اضافہ ہوگا اور نہ قیمتِ سابق برقرار رہے گی۔ اضافہ ضرور ہوگا مگر تخفیفِ طلب کے خوف سے دس فی صدی سے کم۔ فرض کرو کہ قیمت میں پانچ فی صدی اضافہ نمودار ہو تو گویا محصول کا بار دونوں ملکوں پر مساوی آپڑے گا اور کپڑا بننے والے ہندوستانی کارخانوں کو بقدر پانچ فی صدی سہارا مل جائے گا۔ اس اضافہ شدہ قیمت پر کپڑا تیار کرنے کا اُن کے واسطے زیادہ دشوار نہ ہوگا۔ بتدریج اُن کا کام چلنے لگے گا اور ہندوستان کے بازار میں بہ نسبت سابق سُدیشی کپڑے کو ولایتی سے مقابلہ کرنا آسان ہوگا اور بمصداق ہم خرما و ہم ثواب ایک ہی محصول سے مال اور تامین کی دونوں غرضیں ایک ایک حد تک حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کارخانوں پر بھی اگر دہ فی صدی ٹکس قائم کر دیا جائے تو تامین کی آڑ غائب ہو جائیگی۔ اور ولایتی کپڑے سے مقابلہ کرنے میں پھر وہی زک اُٹھانی پڑے گی اور سدیشی کپڑے کی ترقی امید موہوم بن کر رہ جائے گی۔ واضح ہو کہ محصول درآمد کے برابر کسی چیز کی ملکی پیداوار پر بھی محصول قائم کر دیا جائے تاکہ محصول درآمد سے ملک کو تامین حاصل نہ ہو سکے تو محصول آخر الذکر اصطلاحاً محصول متوازن کہلائے گا۔ چنانچہ ہندوستان میں سُدیشی کپڑے پر ایسا محصول مدت سے قائم ہے۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر تجارتِ خارجہ کی سرگزشت میں واضح کریں گے واقعہ یہ ہے کہ ولایتی کپڑا ہندوستان پر بجد مسلط ہے۔ غریب وامیر بلا تکلف اس کو پہنتے ہیں۔ کثرتِ استعمالِ مشین اور پیدائش بہ پیمانۂ کبیر کی بدولت کپڑا نہایت ارزاں تیار ہوتا ہے۔ ارزانی سے طلب کی تغیر پذیری

گھٹا رکھی ہے۔ یعنی قیمت بڑھنے پر بھی طلب میں کمی نہیں ہوتی۔ ولایتی کپڑے پر محصول درآمد سب سے کم یعنی صرف ۳½ فی صدی رکھا گیا ہے اور وہ بھی بصد اصرار و بادلِ نخواستہ۔ بحالتِ موجودہ اس قلیل محصول کو خریداروں پر منتقل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور خریدار بھی اضافۂ قیمت کا کوئی قابلِ لحاظ بار محسوس نہیں کرتے۔ خیر قیمت میں جو کچھ بھی تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے اس سے کپڑا بننے والے ہندوستانی کارخانوں کو کچھ تو سہارا مل ہی سکتا تھا نہ ملنے سے تو بقدر ایک فی صدی تامین ملتی بھی غنیمت ہے لیکن اتنا موقع بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ سودیشی کپڑے پر بھی ۳½ فی صدی محصول متوازن وصول کیا جاتا ہے۔ اگر سودیشی کپڑا اس بار ہی سے سبکدوش کردیا جاتا تب بھی وہ اپنے پیروں پر سنبھل سکتا اور یوں قدم قدم پر لڑکھڑا کر نہ گرتا لیکن جبکہ حکومت عوام کے ہاتھ میں ہو اور وزراء ذی اقتدار تجار سے آوردہ ہوں تو ہندوستانی تجارتِ خارجیہ کی کنجی لنکاشائر مانچسٹر اور لورپول والوں کے ہاتھ میں رہنا کیا عجب ہے اور ہندوستان کا اپنی صنعت و حرفت میں انگلستان سے مدد چاہنا بظاہر ہاتھی سے گنے چوسنے نہیں تو اور کیا ہے لیکن ترقی صنعت و حرفت کا مسئلہ آج کل سرکارِ ہند کے زیر غور ہے اور امید ہے کہ نتیجہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ کچھ مصارفِ جنگ سے دب کر اور کچھ ہندوستانیوں کی خوشنودی کے خیال سے ولایتی کپڑے پر ۱۹۱۷ء میں محصول درآمد ۷½ فی صدی کر دیا گیا۔ لیکن سودیشی کپڑے پر سابق محصول متوازن ۳½ فی صدی اب بھی برقرار رہا۔ گویا سودیشی کپڑے کو بقدر ۴ فی صدی تامین حاصل ہوگئی لیکن ولایت کے کارخانے والوں میں اس محصول درآمد کے خلاف سخت جوش پھیلا ہوا ہے ان کا جوش کچھ بچوں کی ضد یا کڑھی کا ابال نہیں ہوتا۔ دیکھئے آئندہ اس محصول کا کیا حشر ہو۔

خیر ہندوستان کی تجارتِ خارجیہ تو ایک ضمنی بحث تھی محض مثال سے واقعات کا ذکر چھڑ گیا۔ دراصل بحث یہ تھی کہ محصول کی دو قسمیں ہیں محصول تامین اور محصول مال۔ بالعموم محصول دوم ایک حد تک محصول اول کا بھی کام

دیتا ہے۔ تجارتِ آزاد کے حامی محصولِ تامین اور نیز جو محصول بڑی حد تک تامین کا کام دے اس کے سخت مخالف ہیں۔ البتہ خاص خاص حالتوں میں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ایسا محصولِ مال جو بہ جہۂ اعلیٰ اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہو سکے گوارا کرتے ہیں۔ لیکن اصولاً اس کو بھی خالی از خطر نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ان کو قوی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کن پیچیدہ اسباب کے ذریعے سے جن کے سلجھانے سے وہ خود بھی اپنے کو معذور قرار دیتے ہیں محصول قائم کرنے والے مُلک کو نقصان پہنچ جانے جس خطرے کا پتہ چل سکا ہے وہ یہ ہے کہ شاید اس ملک کی برآمد گھٹ جاوے۔ یہ نتیجہ ممکن ضرور ہے۔ لیکن اس قدر یقینی نہیں کہ قطعاً محصولِ مال سے دست کشی اختیار کر لی جائے۔

جس طرح کہ محصول درآمد پر قائم کیا جاتا ہے اسی طرح برآمد پر بھی جاری ہو سکتا ہے۔ برآمد پر محصولِ تامین قائم کرنے کی ہم نے یہ غرض قرار دی تھی کہ ایسی پیداوارِ خام جس کا ترقیِ صنعت و حرفت سے نہایت قریبی اور عام تعلق ہو۔ عرصے تک محفوظ رہ سکے اور تجارت کی رو میں جلد نہ بہ جائے چنانچہ اسی مصلحت سے ۱۹۰۱ء سے انگلستان میں کوئلے کی برآمد پر محصول جاری ہے۔ لیکن محصولِ مال کا مقصد وہی مالی منفعت ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ درآمد کی مانند برآمد پر محصولِ مال کن کن حالتوں میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے اور کب اس کے قائم کرنے سے احتراز مناسب ہے۔ کامیابی کی دو شرطیں ہیں اول یہ کہ جس چیز پر محصول برآمد قائم کیا جائے اس کی طلب غیر تغیر پذیر ہو تاکہ اضافۂ قیمت سے اس کی طلب میں تخفیف نہ ہو اور محصول کا بار خریداروں پر منتقل ہو سکے دوم یہ کہ شئے زیرِ بحث سوائے محصول والے ملک کے کہیں اور پیدا نہ ہوتی ہو تاکہ سب مُلک اس سے خریدنے پر مجبور ہوں اور بحالتِ اضافہ قیمت اس سے خریداری ترک نہ کر سکیں۔

ہندوستانی پیداوار میں مشرقی بنگال کا جوٹ جو کہ ایک اعلیٰ قسم کا سن ہوتا ہے ان شرائط کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ اس پر محصول برآمد

حصۂ چہارم
باب بست و چہارم

قائم کیا جائے تو ضرور مالی منفعت ہو سکتی ہے جوٹ کے بعد چاول کا نمبر ہے اور اس پر کچھ محصول برآمد قائم بھی ہے۔ سال گزشتہ ۱۹۱۶ء سے جوٹ پر بھی محصول برآمد قائم ہو گیا۔ اس تبدیلی کا خاص باعث بھی مصارف جنگ کا بار سمجھنا چاہیئے ؛

غور کرنے سے واضح ہو گا کہ در آمد کے محصول مال کی دو شرائط برآمد والے کی دو شرائط کے بالکل برعکس ہیں بحالت اوّل تو طلب تغیر پذیر ہونی چاہیئے اور خریدار صرف وہی ملک واحد جو محصول درآمد قائم کرے۔ بحالت دوم طلب غیر تغیر پذیر ہونی چاہیئے اور پیدائش صرف اس ملک کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے جو محصول برآمد جاری کرے ؛

باب بست وپنجم

مبادلات خارجہ

(۱) دادوستد بین الاقوام کی مدیں (۲) توازن درآمد وبرآمد اور توازن دادوستد (۳) ہنڈی کی تشریح (۴) ہنڈی کے نرخ کے اُصول (۵) ہنڈی دلّال (۶) مطالبات خارجہ کی ادائی کے طریقے۔

دادوستد بین الاقوام

۱۔ آج کل ذرائع آمد ورفت کی سہولت قیام امن وامان عام بیداری اور ترقیات کاروبار کی بدولت دور دراز ملکوں میں بھی مغائرت اور کشیدگی گھٹ کر بہت زیادہ میل جول پیدا ہوگیا ہے اور اسی وجہ سے آپس میں طرح طرح کا لین دین جاری ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ملکوں میں سے ہر ایک کا دوسروں پر اور ہر ایک پر دوسروں کا کچھ نہ کچھ مطالبہ عائد ہوتا رہتا ہے۔ ملکوں کے باہم جو مطالبات نمودار ہوتے ہیں اس کی چند صورتیں ہیں جن کی ذیل میں مختصر تشریح کی جاتی ہے:-

۱۔ تجارت یعنی سامان کی درآمد برآمد۔ اگرچہ انگلستان اور ہندوستان کے سوا کُل ترقی یافتہ ممالک میں تجارت خارجہ طریق تامین پر جاری ہے۔ تاہم جو پیداوار خام ملکی مصنوعات کی ضرورت سے زائد ہو اور دوسرے ملکوں میں درکار ہو یا جو مصنوعات غیر اختیاری دشواریوں کی وجہ سے ملک میں تیار ہو ہی نہ سکیں اور جن کو دوسرے ملکوں سے منگائے بغیر

چارہ نہ ہو اُن کی برآمد و درآمد بکثرت جاری رہتی ہے مزید برآں محصول تامین عائد کرنے سے اکثر مصنوعات متعلقہ کی درآمد گھٹانا مقصود ہوتا ہے۔ شاذ و نادر درآمد قطعاً بند کی جاتی ہے تاکہ بیرونی تقابلے کے خدشے سے ترقی کا حرج نہ ہونے پائے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اگرچہ تامینِ تجارت اکثر ملکوں کا مسلک ہوگیا ہے۔ پھر بھی قوموں کے درمیان بہت کچھ تجارت جاری ہے اور رہے گی ہر ملک کی برآمد سے اس کے مطالبات دوسرے خریدار ملکوں پر عائد ہوتے ہیں اور درآمد سے دوسرے فروشندہ ممالک کے اس پر قوموں کے درمیان لین دین کا سب سے عام اور اہم سلسلہ یہی برآمد و درآمد اشیا سمجھنا چاہیئے۔

ب۔ **قرض خارجہ**۔ ترقی یافتہ ملک آپس میں قرض بھی دیتے لیتے رہتے ہیں۔ فرض کرو سرکار ہند کو سردست پچیس کروڑ روپیہ درکار ہے۔ یہ رقم بطورِ قرضہ عوام سے وصول کی جاسکتی ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ غالباً پانچ پانچ سو یا ہزار ہزار روپے کے بہت سے تمسک بقدر پچیس کروڑ روپے چھپوائے جائیں گے جو کوئی سرکار کو قرض دینا چاہے وہ بطورِ رسید ان تمسکات کو لے کر سرکار کو روپیہ دے سکتا ہے۔ رقم مندرجۂ تمسک پر اُس کے پیش کنندہ کو ہر سال سرکاری خزانے سے بشرح معین سود ملتا رہتا ہے۔ ادائی قرض کے واسطے سرکار وقت مقرر کرے یا نہ کرے یہ اُس کی مرضی پر منحصر ہے لوگ اس بات کی زیادہ پروا بھی نہیں کرتے۔ جب تک تمسک اُن کے پاس ہے اُن کو اس طرح پر سود ملتا رہے گا جیسے کہ کسی ریاست یا تجارت سے آمدنی حاصل ہوتی ہے اور جب تمسک والا اپنا روپیہ واپس لینا چاہے تو وہ اُس کو دوسرے کے ہاتھ اس طرح پر فروخت

کر سکتا ہے جیسے کہ کوئی ملک و جائداد۔ اب گویا نیا خریدار سرکار کا قرض خواہ بن جائے گا اور سود اُس کو ملنے لگے گا۔ رقم مندرجۂ تمسک قیمت متعارفہ کہلاتی ہے لیکن بعد کو خرید و فروخت میں ایسے تمسکوں کی قیمت ان کی بازاری شرح سود کی نسبت سے قرار پاتی ہے۔ فرض کرو کہ پانچسو روپئے کے تمسک پر سود بشرح ۴ فی صدی وصول ہوا۔ اب اگر سود کی بازاری شرح ۵ فی صدی ہے تو اس تمسک کی قیمت گھٹ کر صرف چار سو روپیہ رہ جائے گی اور اگر شرح بازاری صرف ۳ فی صدی ہے تو اس کی قیمت بڑھ کر تقریباً ۶۶۶ ہو جائے گی۔ بہر حال قیمت جو کچھ بھی قرار پائے لیکن تمسک دار چاہے تو اپنا روپیہ کم و بیش وصول کر سکتا ہے پھر کسی کو کیا فکر کہ سرکار کب قرض ادا کرے گی تمسکات کی حقیقت بالکل ایک ایسی جائداد کی ہے جس سے بلا درد سر ایک مستقل آمدنی وصول ہوتی رہے جب تک حکومت قائم ہے تمسک دار کی آمدنی بھی بحال ہے چونکہ اس صورت میں آمدنی مستقل ہے اور اُس کی وصولیابی میں برائے نام بھی دقت نہیں اٹھانی پڑتی بہت سے لوگ ریاست یا کاروبار کے بکھیڑے سے بچنے کے لئے ایسے تمسک خرید کر سرکار کے قرضخواہ بن جاتے ہیں وقت معینہ پر سرکاری خزانے گئے اور اپنا سود وصول کر لائے اللہ اللہ خیر صلاح۔ اگر اصل روپیہ واپس لینا مقصود ہوا تو خود یا کسی دلّال کی معرفت جب چاہا تمسک دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ یا تو قیمت کچھ کم ملی یا زیادہ۔ یہ اُس وقت کے حالات پر منحصر ہے اور وہ کونسی چیز ہے جس کی قیمت میں کمی بیشی نہیں ہوتی رہتی۔ یہ تغیر قیمت کچھ تمسک ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ سب چیزوں کو اسطے

حصّۂ چہارم
باب بست و پنجم

عام ہے:۔

رفتہ رفتہ حکومتوں کا اعتبار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ نہ صرف اُس کی رعایا بلکہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی ایسے تمسک خرید کر غیر حکومتوں کے قرض خواہ بننے میں کوئی تامل نہیں کرتے چنانچہ سرکار ہند کو ایسے **قرض عامہ** بیشتر انگلستان سے وصول ہوتے رہے ہیں ہندوستان میں بہت سوں کے پاس تو روپیہ نہیں اور جس کے پاس ہے وہ ان جدید طریق وقواعد سے ناواقف بتلائیے بھی تو اُن کے دل میں سو سو طرح کے شکوک اور اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے قرض عامہ میں ہندوستانیوں کا حصّہ بہت کم ہے اور اُس کے سود کی بڑی مقدار بیرونِ ملک تمسک داروں کی جیب میں مدت سے جارہی ہے۔ اب لوگوں میں کچھ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ سرکار کو قرض دینا تحفظِ اصل کی ایک عمدہ ترکیب ہے اور ہندوستانی تمسک داروں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے قرض عامہ کی مجموعی مقدار چار ارب ساڑھے چودہ کروڑ کے قریب تھی جس میں سے صرف ایک ارب چالیس کروڑ ہندوستان سے وصول ہوا اور باقی انگلستان سے جب سے یورپ میں جنگ چھڑی ہے ہندوستان بھی سرکار برطانیہ کو قرض دے رہا ہے۔ قرض دہندوں میں ہندوستانی بھی بکثرت شریک ہیں۔ جنگ ختم ہونے پر تحقیق ہوگا کہ ہندوستان نے انگلستان کو کس قدر قرضہ دیا مزید براں ۱۹۱۸ء میں یہ بھی قرار پایا کہ علاوہ راجہ مہاراجہ اور عوام کی امداد کے بقدر ڈیڑھ ارب روپیہ مصارف جنگ ہندوستان کے خزانے سے ادا ہوں گے۔ بس اس کل قرضہ کا بار خود ہندوستان کے محاصل پر پڑے گا۔

حاصل کلام یہ کہ سرکار کو قرض دینے کا رواج ہر ترقی یافتہ ملک میں بکثرت رائج ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں کے قرض عامّہ میں بھی لوگ بشوق شریک ہوتے ہیں اور معزز حکومتوں کے تمسّک اب ہر کہیں فروخت ہو سکتے ہیں۔ لوگ ایسے تمسّک خرید کر غیر حکومتوں کے قرض خواہ بننے میں ذرا تامّل نہیں کرتے۔ رہا یہ سوال کہ سرکار قرض کیوں لیتی ہے۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کی تفصیل مالیات میں پیش ہو سکتی ہے۔ البتہ اس قدر صاف ظاہر ہے کہ سرکار اُسی وقت قرض لے گی جب کہ اس کو اندرون ملک یا بیرون ملک کوئی ضرورت پیش آئے اور کافی روپیہ اُس کے پاس موجود نہ ہو ایسی ضرورت کا باعث خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ قلّت محاصل۔ ملکی اصلاح و ترقی یا جنگ۔ بالعموم ادائی قرض کا پہلے سے وقت معیّن نہیں کیا جاتا۔ جب سرکار کی مالی حالت سدھرے اس کو قرض ادا کرنے کا اختیار ہے اور اس سے قبل قرض خواہ کو وہ صرف سود ادا کرنے کی ذمّہ دار ہے اور بس بعض بعض ممالک میں قرض عامّہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب اُسکی ادائی مدّتوں ممکن نظر نہیں آتی اور مقدار سود بجائے خود ایک کثیر رقم بن گئی ہے خصوصًا موجودہ جنگ میں جو سلطنتیں شریک ہیں اُن کا قرض عامّہ اعداد و شمار سے باہر نکل جائے تو عجب نہیں اور اس قرض کا سود بجائے خود سرکاری خزانے پر ایک بڑا بار ہوگا۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں کُل سلطنتوں کے قرض عامہ کی مجموعی مقدار ۱۹۶ ارب روپیے بحساب عہ فی پونڈ تخمینہ کی گئی تھی جس میں سے خاص خاص کی مقدار

حصۂ چہارم
بابِ بستوپنجم

حسب ذیل ہے:

روس ۱۴ ارب ۴۰ کروڑ	فرانس ۱۹ ارب ۸۰ کروڑ
آسٹریا ۱۱ ارب ۴۰ ”	جرمنی ۱۵ ارب
انگلستان ۱۰ ارب ۸۰ کروڑ	اٹلی ۸ ارب ۴۰ کروڑ
ہندوستان ۴ ارب ۲۰ ”	امریکہ ۸ ارب ۴۰ ”

مزید جنگ یورپ کی بدولت ایسے قرضوں کی مجموعی مقدار تیس ارب پونڈ سے بھی بڑھ گئی یعنی بحساب ۱۵ فی پونڈ ۵ کھرب کے قریب سمجھنا چاہیئے:

محض اس خیال سے کہ اب تک ہمارے ملک میں **قرض عامہ** سے لوگ کم واقف ہیں اس کے متعلق چند ابتدائی باتیں سیدھے سادھے طور پر بیان کردی گئیں ورنہ فی نفسہٖ یہ ایک نہایت دقیق اور بحث طلب مسئلہ ہے جس کی تفصیل سے مالیات کی ضخیم کتابیں لبریز ہیں یہاں پر ہم کو تو قرض عامہ کا مبادلات خارجہ سے تعلق دکھانا مقصود ہے جس کو اب پیش کرتے ہیں جب کوئی ملک قرض عامہ حاصل کرنے کی غرض سے رقعے جاری کرے اور دوسرا ملک ایسے رقعے خرید خرید کر ملک اول کو قرض دے تو اُس وقت اس کارروائی کا اثر بعینہٖ ایسا نظر آئے گا کہ گویا رقعات کوئی مصنوعات ہیں جن کی قرض گیر ملک سے برآمد ہو کر قرض دہندہ ملک میں درآمد ہوتی ہے اور زر قرض گویا ان مصنوعات کی قیمت ہے جو دوسرا ملک پہلے کو ادا کرتا ہے۔ گویا جب کہ قرض عامہ کی کوئی مقدار دوسرے ملک سے وصول ہو تو اس کا فوری اثر قرض گیر ملک کے حق میں قیمت برآمد اور قرض دہندہ کے حق میں قیمت درآمد کا سا ہوتا ہے، رقعات گویا مصنوعات تجارت ہیں اور قرض اُن کی قیمت۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء کی مشہور جنگ فرانس وجرمنی میں جب فرانس کو رقم کثیر بطور تاوان جنگ جرمنی کو ادا کرنی پڑی تو ایسے ہی رقعے جاری کر کے بہت سا قرض عامہ خود جرمنی سے حاصل کر کے تاوان ادا کردیا:

ج۔ قرض عامہ کا سود جو دوسرے ملکوں کو ادا کرنا پڑے

اب سمجھ لیجیے یہ رقم البتہ قرض گیر ملک قرض دہندہ ملک کو سال بسال ادا کرتا ہے گویا کہ یہ خراج ہے جو پہلا ملک دوسرے کو نذر کرتا ہے اس خراج کی بنیاد یہی قرض ہے جو دوسرے ملک نے پہلے کو دیا ہے مثلاً ہندوستان کے قرض عامہ کا جزو اعظم انگریزوں سے وصول ہوا چنانچہ ۱۶ کروڑ ۱۵ لاکھ سے زائد روپیہ صرف ایک سال ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہندوستان نے انگلستان کو محض بطور سود قرض عامہ ادا کیا ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد ۱۸۵۸ء سے پڑی جب کہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر فرو کرنے کے کل مصارف ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لے کر ہندوستان کے نام لکھ دی گئی۔ اور اس روز سے آج تک برابر ایک رقم کثیر بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کر رہا ہے ذرا خیال تو کرو کہ گذشتہ نصف صدی میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا۔ یورپ اور امریکہ میں چونکہ دولت کی کثرت ہے وہاں کے باشندے اولوالعزم ہیں اور وہاں کی سلطنتوں کا رعب و داب بھی دنیا پر قائم ہے یہ لوگ قرض عامہ دینے میں بڑے مرد ہیں۔ اس کے برعکس ترکی، مصر، فارس خاص طور سے قرض لینے پر مجبور ہیں اور قرض دہندہ ملکوں کے ہاتھ میں ایسے ہی بے بس ہو رہے ہیں جیسے کہ ہمارے یہاں مہاجن کے پنجے میں مسلمان زمیندار سود نہ صرف مالی بار ہے بلکہ قرض کا دباؤ ان کی طاقت و اقتدار کو اس طرح سلب کر رہا ہے جیسے کہ جونک کسی کا خون چوس چوس کر اس کو بیحال کر دیتی ہے۔

د۔ ادائے قرض عامہ اگر کوئی حکومت چاہتی ہے کہ قرض عامہ جو دوسرے ملک سے وصول ہوا ہے ادا کر دے تا کہ اس کے

سود دینا پڑے تو ادائی قرض کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں خواہ سرکار اپنے خزانے سے ادا کر کے دوسرے ملک سے اپنے کُل رقعے خرید لے یا اُس ملک کے عوام ایسا کریں بہرصورت جب قرض عامہ دوسرے ملک کو ادا کیا جائے تو اُس کا اثر قرضدار اور قرض خواہ ملک پر بعینہ وہی پڑے گا جو اُس کے سود کا پڑتا تھا یعنی قرض کی رقم اوّل الذکر ملک اپنی جیب سے آخرالذکر ملک کو اس طرح ادا کرے گا کہ گویا خراج پیش کیا۔ حالانکہ قرض لیتے وقت یہ رقم قرض گیر ملک کے حق میں قیمت درآمد کی سی نظر آتی تھی؛

(۲) شغل اصل خارجہ قرض عامہ میں شریک ہونا تو شغل اصل کی ایک خاص صورت ہے اس کے علاوہ اور طرح طرح کے کاروبار میں بھی یورپ والے دور دراز ملکوں میں بےشمار دولت لگائے بیٹھے ہیں اور بہت کچھ منافع اٹھا رہے ہیں۔ ایشیا میں جہاں کہیں بھی معاشی ترقیات نظر آتی ہیں وہ بیشتر یورپ کے اصل سے قائم ہیں اور اُن کے منافع سے سونے چاندی کے دریا ایشیا سے یورپ کو بہہ رہے ہیں۔ ایک انگلستان کو لو اس کا اصل تمام صفحۂ عالم پر پھیلا ہوا ہے اور منافع کمانے میں مصروف ہے اور اصل کے طفیل انگلستان تقریباً ۲ ارب چالیس کروڑ روپے بطور سود و منافع دوسرے ملکوں سے ہر سال وصول کر رہا ہے؛

(۳) کرایۂ باربرداری۔ ملکوں ملکوں سامان لیئے پھرنے کا کرایہ اس ملک کو وصول ہوتا ہے جس کے جہاز برداری میں کام آئیں اور اُس ملک سے وصول ہوتا ہے جہاں سامان جائے۔ دُنیا کی تمام سلطنتوں میں اس وقت خواہ جنگی خواہ تجارتی سب سے زیادہ جہاز انگلستان کے پاس ہیں۔ چنانچہ اس کا

حصۂ چہارم
باب پنجم

بیڑا ابھی سب سے زیادہ طاقتور مانا جاتا ہے اور تجارت بین الاقوام میں بیشتر مال و سامان انگلستان ہی کے جہاز جگہ جگہ لیجاتے ہیں چنانچہ تجارتی مال لے جانے کے بدلے میں انگلستان دوسرے ملکوں سے ایک ارب ۳۲ کروڑ روپیہ سال وصول کرتا ہے امریکہ اور فرانس کے پاس تجارت خارجہ کے واسطے کافی جہاز نہیں اُن کے مال کا ایک معقول حصہ دوسرے ملکوں کے جہازمیں آجاتا ہے اور بطور کرایہ اُن کو علی الترتیب تقریباً ۶۰ کروڑ اور ۲۴ کروڑ روپے سالانہ دوسرے ملکوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

یہاں پر درآمد و برآمد کے متعلق ایک نکتہ جتانا ضروری ہے جو بظاہر معمّا سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر تمام دنیا کی تجارت خارجہ پیش نظر رکھی جائے تو بظاہر درآمد و برآمد کی مقدار اور نیز اُن کی قیمت برابر برابر ہونی چاہیئے کیونکہ بحیثیت مجموعی ملکوں کی جو کچھ برآمد ہے وہی اُن کی درآمد ہے نہ آسمان سے سامان برسے نہ زمین اس کو نگلے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آمد و رفت میں خراب اور گم ہونے سے درآمد کی مقدار برآمد سے کچھ کم رہتی ہے یعنی جتنا مال روانہ ہوتا ہے اُس سے کم منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ کچھ راستے میں ضائع ہوجاتا ہے مگر اسکے برعکس درآمد کی قیمت برآمد سے ہمیشہ بڑھی رہتی ہے جیسا کہ ۱۹۰۷ء میں تمام ممالک کی برآمد کی مجموعی قیمت ۳۸ ارب ۸۰ کروڑ اور درآمد کی قیمت چالیس ارب بیس کروڑ روپے تخمینہ کی گئی تھی آخر برآمد کے مقابل درآمد کی قیمت میں ۲ ارب چالیس کروڑ روپے کا اضافہ کہاں سے نمودار ہوا بات یہ ہے کہ مقام برآمد میں صرف مال کی قیمت جاتی ہے اور مقام درآمد میں پہنچ کر قیمت میں کرایۂ باربرداری بھی شامل ہوجاتا ہے اور

۲ ارب ۴۰ کروڑ کی زائد رقم بھی کرایہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ص۔ ملازمت و محنت خارجہ۔ اگر کسی ملک کے باشندے دوسرے ملکوں میں جاجا کر محنت مزدوری اور ملازمت کریں لیکن جو کچھ کمائیں اُس کا کوئی حصہ اپنے ملک کو بھیجتے رہیں یہ بھی آمدنی ملک کی ایک صورت ہے۔ مثلاً سلطنت برطانیہ میں بیش قرار تنخواہ اور معزز عہدے زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں اور انگریز ایشیا اور افریقہ میں چند در چند مصلحتوں اور مجبوریوں سے توطن اختیار نہیں کرتے اور انگلستان کو اپنا ملجا و ماوا مانتے ہیں چنانچہ صرف ہندوستان سے انگریزی عہدہ داروں کو کچھ کم بارہ کروڑ روپے سنہ ۱۳-۱۹۱۱ء میں بطور تنخواہ و پنشن وغیرہ ادا کیا گیا ہے جس کا ایک معقول حصہ ولایت پہنچا جہاں اُن کا خاندان مقیم ہے۔ اسی طرح پر آئرلینڈ کے باشندے جو امریکہ میں محنت مزدوری کرتے ہیں اگرچہ وہاں توطن اختیار کر چکے ہیں پھر بھی اپنے اعزا اور قدیم وطن کے واسطے بہت کچھ آئرلینڈ کو بھیجتے رہتے ہیں۔

ط۔ قیام خارجہ۔ مذکورہ بالا طریق کے برعکس اگر کسی ملک کے باشندے دوسرے ملک میں جاجا کر رہیں اور اپنے ملک سے منگا منگا کر روپیہ خرچ کر دیں تو آخر الذکر ملک کو اس طرح بھی معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ دولتمند لوگ سیر و سیاحت اور تفریح کے لیے پُر فضا مقامات میں جا کر مہینوں اور برسوں رہتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں گھر سے منگا لیتے ہیں اس ذریعے سے فرانس۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کو باہر والوں خصوصاً انگلستان روس اور امریکہ کے باشندوں سے بہت کچھ وصول ہوتا رہتا ہے۔ دیگر ممالک کے سیاح تخمیناً ۱۲ کروڑ روپے سوئٹزرلینڈ میں اور ۲۱ کروڑ اٹلی میں ۴۲ کروڑ فرانس میں گھر سے لا کر صرف

دفتہ چہارم
باب بست و پنجم

کر جاتے ہیں صرف امریکہ کے باشندے تقریباً ۱۶ کروڑ روپیہ ہر سال گھر سے لے کر سیر و سیاحت میں اُڑا آتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہوگا کہ یورپ اور امریکہ کے سیاحوں کا روپیہ ضائع جاتا ہے۔ سیر و سیاحت سے وہ بڑے بڑے کام نکلتے ہیں جن کے سامنے ان مصارف کی کچھ حقیقت نہیں ۔

ع۔ تاوان جنگ۔ آمدنی کی ایک غیر معمولی مد تاوان جنگ بھی ہے مثلاً ۱۸۷۰ء کی مشہور جنگ میں فرانس نے ۳ ارب روپیہ جرمنی کو بطور تاوان ادا کیا۔ اتنی رقم کثیرہ کا سونا دینا آسان نہ تھا اور اگر فرانس دیتا بھی تو خود نرا کھوکھلا رہ جاتا۔ اس نے رقعے جاری کرکے یہ رقم خود جرمنی کے باشندوں سے مقررہ شرح سود پر قرض لی اور جرمنی حکومت کو ادا کر دی گویا خود جرمنی کے باشندوں نے اپنی حکومت کو فرانس کی طرف سے تاوان ادا کر دیا۔ اور خود فرانس کے قرض خواہ بن کر اس سے سود کی رقم کثیر وصول کرنے لگے حتیٰ کہ فرانس نے رقعے خرید خرید کر قرض چکا دیا۔ اس سے پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ دوسرے ملک سے قرض لینے کا فوری اثر وہی ہوتا ہے جو برآمد کی قیمت وصول کرنے کا۔ جب فرانس نے مذکورۂ بالا طریق سے تاوان ادا کیا تو اس نے گویا جرمنوں کے ہاتھ اپنے رقعے فروخت کرکے ان کی قیمت جرمن حکومت کے حوالے کر دی۔ البتہ بعد کو قرض کا سود اور بوقت ادائی خود قرض مالی بار ضرور ثابت ہوگا۔ علیٰ ہذا جنگ یورپ کی بابتہ اتحادیوں نے جرمنی سے بقدر گیارہ ارب تیس کروڑ پونڈ تاوان جنگ کا مطالبہ کیا ہے جرمنی صرف ایک ارب پچاس کروڑ پونڈ پیش کر رہا ہے۔ دیکھیے کس قدر تاوان کیوں کر ادا ہو۔

توازن درآمد و برآمد اور توازن دادوستد

۲۔ مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہوا کہ قوموں کے درمیان دادوستد کی متعدد مدیں جاری ہیں اور بین الاقوام لین دین اُسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب کہ ہر ملک کی مجموعی مقدار دادوستد میں توازن برقرار رہے یعنی بقدر دوسرے ملکوں کا اس پر مطالبہ ہو اسی قدر اس کا دوسرے ملکوں پر بھی ہو۔ البتہ ہر دو مطالبات کی مدوں کا مختلف ہونا ممکن بلکہ اغلب ہے اگر دادوستد کی مقداروں میں توازن نہ رہے تو دو حالتیں ممکن ہیں۔ اوّل یہ کہ مقدارِ مطالبہ مقدارِ واجب الادا سے کم ہو یا بالفاظ دیگر مقدار دوم اوّل سے زائد ہو تو ملک کی حالت بعینہ ایسی ہوگی کہ جیسے کسی کا خرچ زیادہ ہو اور آمدنی کم اگر دوالہ آج نہ نکلا تو کل ضرور نکل جائے گا۔ اس صورت میں یا تو مطالبات بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے یا مقدارِ واجب الادا گھٹائی جائے یا ہر دو تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں تاکہ دادوستد میں توازن قائم ہو جائے ورنہ ایک نہ ایک روز دوالہ نکلنے سے بین الاقوام لین دین خود بہت کم ہو جائے گا۔ فریق ثانی کی طرف سے مذکورۂ بالا تبدیلیاں درآمد و برآمد کی مدوں میں بہ آسانی نمودار ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔

دوسری حالت یہ کہ مقدارِ مطالبہ مقدارِ واجب الادا سے زیادہ ہو۔ گو مفید ہی لیکن چند روز سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اس حالت میں فریق ثانی جس پر اس کا مطالبہ زیادہ ہے اور جس کا مطالبہ اس پر کم ہے حسب طریق بالا یا تو جلد اپنے لین دین کی اصلاح کر کے دادوستد میں توازن قائم کر دیگا یا اس کے دوالہ نکل جانے سے خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔

حاصل کلام یہ کہ کسی ملک کے دادوستد میں عرصے تک کوئی بڑا فرق قائم رہنا ممکن نہیں۔ یہاں ایک اور نکتہ صاف کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تجارت بین الاقوام کی لڑی میں تمام ترقی یافتہ ملک اس طرح سے گند ھے ہوئے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک کا باقی کُل سے لین دین جاری ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ دادوستد کی حالت مختلف ہے۔ ایک ملک کا دوسرے پر بمقابلہ رقم واجب الادا کے مطالبہ کم ہے اور تیسرے پر زیادہ ۔ یہیں ملک ۔ اوّل ملک ۔ سوم اپنا اپنا

زائد مطالبہ ملک دوم کے حق میں منتقل کر کے اپنے داد و ستد میں توازن قائم کر لے گا اور اگر کہیں ملک دوم پر ملک سوم کا زائد مطالبہ ہوا تو اس ترکیب سے ان دونوں کے مابین بھی داد و ستد میں توازن نمودار ہو جائے گا۔ اس فرضی مثال سے ایک ایسا طریق ذہن نشین ہوتا ہے جس پر ہر طرف عملدر آمد جاری ہے۔ یوں ہی مطالبات اور رقوم واجب الادا کے ملک بہ ملک منتقل ہونے سے داد و ستد میں توازن بحال ہوتا رہتا ہے۔ ہم نے بغرض سہولت تین فریق شمار کیئے۔ یہی طریق زیادہ فریقوں کے درمیان بھی جاری ہو سکتا ہے اور ہے۔ صرف اسکا عملدرآمد زیادہ پیچیدہ ہوگا ؛

گزشتہ بحث سے واضح ہوا کہ کسی ملک کے داد و ستد کی صحیح حالت دریافت کرنے کے واسطے اول خرچ اور آمدنی خارجہ کی بہت سی مدیں دوم کل دیگر ممالک سے لین دین کے تعلقات پیش نظر رکھنے ضروری ہیں ورنہ اگر صرف ایک ملک سے لین دین کے تعلقات مدنظر رکھے جائیں تو آمد و خرچ کی کل مدیں شمار کرنے پر بھی داد و ستد کا صحیح اندازہ ہونا محال ہے اور اگر مزید برآں سب مدیں نظر انداز کر کے صرف ایک قدیم اور اہم مد یعنی درآمد و برآمد پر اکتفا کیا جائے تو داد و ستد کی حالت یقیناً خلاف واقعہ نظر آئے گی ؛

ایسی تنگ نظری میں بہت ممکن ہے کہ جس ملک کا مطالبہ زیادہ معلوم ہو در حقیقت اس کی رقم واجب الادا زیادہ ہو یا جس کی رقم واجب الادا زیادہ معلوم ہو در حقیقت اس کے مطالبات بڑھے ہوئے ہوں ؛

حاصل کلام یہ کہ ملک کی داد و ستد کی حالت سمجھنے کے لیئے بہت احتیاط اور وسعت نظر درکار ہے۔ ذیل کی چند مثالوں سے مذکورۂ بالا اصول کی بخوبی تصدیق ہو جائے گی ؛

اول انگلستان کی درآمد و برآمد کو لیجیئے اس کے سہ سالہ اعداد

حسب ذیل ہیں:-

سنہ	درآمد	برآمد
۱۹۱۰	۸ ارب ۶۱ کروڑ	۶ ارب ۴۵ کروڑ
۱۹۱۱	۸ ارب ۶۵ کروڑ	۶ ارب ۸۱ کروڑ
۱۹۱۲	۹ ارب ۴۸ کروڑ	۷ ارب ۳۰ کروڑ
	۲۶ ارب ۷۴ کروڑ	۲۰ ارب ۵۶ کروڑ

اعداد بالا سے واضح ہوگا کہ صرف تین سال کے اندر انگلستان کی درآمد برآمد سے بقدر ۶ ارب ۱۸ کروڑ روپیہ زیادہ رہی۔ کیا کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ رقم زائد انگلستان نے بشکل زر فلزاتی ادا کی ہوگی نہیں کیوں کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ انگلستان میں کل زر فلزاتی بقدر ۲ ارب روپیہ رائج ہے۔ اگر زر نہیں تو اس کی بجائے سونا دیا ہوگا۔ لیکن اس دوران میں سونے کی درآمد بھی برآمد سے بڑھی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ علاوہ تجارت کے جو متعدد مدیں لین دین کی اوپر بیان کی گئی ہیں اُن ہی کے ذریعے سے انگلستان درآمد کی زائد قیمت ادا کرتا ہے یہی حال فرانس کا ہے، اس کی درآمد بھی برآمد سے گزشتہ پانچ سال میں اوسطاً ۶۰ کروڑ سالانہ بڑھی رہی اور لطف یہ ہے کہ پھر بھی ہر سال دوسرے ملکوں سے بقدر ۲۰ کروڑ روپیہ وصول ہوتا رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاوہ برآمد کے دیگر مدوں سے فرانس کا مطالبہ دوسرے ملکوں پر تقریباً ۸۰ کروڑ روپیہ سالانہ رہا۔ خود ہندوستان کی تجارت خارجہ پر غور کیجئے کہ کچھ عرصے سے ہندوستان کی برآمد درآمد سے اوسطاً بقدر ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ سالانہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان کو یہ رقم زائد وصول بھی ہوتی ہے۔ دوسری مدوں کے ذریعے سے جو انگلستان کے مطالبات ہندوستان پر عائد ہوتے ہیں مثلاً سود قرض عامہ انگریزی عہدہ داروں کی تنخواہ اور پنشن سب مل ملا کر ۲۶ کروڑ روپیہ سالانہ سے زائد ہو جاتے ہیں انگریز ان مطالبات کو اصطلاحاً مطالبات وطن (انگلستان) کہتے ہیں۔ ہندوستان کی برآمد کی زائد قیمت

ان ہی مطالبات کی ادائی میں صرف ہو جاتی ہے بلکہ زائد ۶ کروڑ جو واجب الادا رہتا ہے خود انگلستان سے قرض عامہ لے لے کر ادا کیا گیا ہے اس طریق ادائی کی ہم اس سے قبل دو مرتبہ تشریح بھی کر چکے ہیں سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۲ء تک تخمیناً بقدر ۹ کروڑ روپیہ سالانہ ہندوستان کے قرض عامہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا کچھ تو مطالبات وطن کی ادائی میں کام آیا اور باقی ہندوستان کو وصول ہوتا رہا۔ ممکن ہے کہ لوگ اس کو برآمد کی زائد قیمت سمجھتے رہے ہوں۔ حالانکہ یہ قرض تھا جس کا سود برابر دیا جا رہا ہے اور بوقت ادائی یہ قرض خود بھی بار ثابت ہوگا۔ یہ ہندوستان والوں کی عام شکایت ہے کہ مطالبات وطن ہندوستان کو لیے جا رہی ہیں۔ اس معرکۃ الآرا مسئلے کی مفصل بحث ایک جداگانہ کتاب معیشت الہند میں زیادہ موزوں ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر جتانا کافی ہے کہ یہ شکایت مبالغہ آمیز بھی اور ہے۔ لیکن سراسر بے بنیاد بھی نہیں۔ بار ضرور ہے لیکن نہ اس قدر جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔

اب ایک ایسی مثال لیجیے کہ کئی ملک ملکر مطالبات اور رقوم واجب الادا آپس میں منتقل کر کے داد و ستد میں توازن پیدا کریں۔ امریکہ چین اور انگلستان کے مابین خاص طور سے یہ طریق مستعمل ہے۔ امریکہ چین سے ریشم اور چاء بہت خریدتا ہے لیکن خود اس کے ہاتھ بہت کم سامان فروخت کرتا ہے۔ گویا چین اور امریکہ کے درمیان چین کا مطالبہ رقم واجب الادا سے بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح امریکہ اور انگلستان کے درمیان امریکہ کا مطالبہ رقم واجب الادا سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعینہ یہی حال انگلستان کا چین کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کا مطالبہ رقم واجب الادا پر غالب ہے۔ پس امریکہ اپنا زائد مطالبہ انگلستان سے چین منتقل کر دیتا ہے جو انگلستان کے زائد مطالبے کی تلافی کر کے تینوں کی داد و ستد میں کم و بیش توازن پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک مشہور مثال ہے۔ لیکن یہ طریق اور ملکوں کے درمیان بھی جاری ہے۔

حصۂ چہارم
باب بست و پنجم

کسی زمانے میں جب کہ تجارت ہی قوموں کے درمیان لین دین کا ذریعہ تھی اور دوسری مدیں نہ مستعمل تھیں، درآمد برآمد داد و ستد کے مترادف خیال کی جاتی تھی اور توازن درآمد و برآمد کی وہی اہمیت تھی جو اب توازن داد و ستد سے منسوب کی جاتی ہے بلکہ توازن داد و ستد کی اصطلاح ہی رائج نہ تھی، ایک زمانے تک یہ اصول درست رہا لیکن جب داد و ستد کے جدید ذرائع جاری ہوئے تو درآمد و برآمد اور داد و ستد میں فرق نمودار ہو گیا اور پہلی مد دوسری مد کا صرف ایک جزو قرار پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درآمد و برآمد کا توازن تو کچھ قابل لحاظ نہیں رہا۔ بلکہ اس مد میں فرق عام ہو گیا۔ البتہ داد و ستد کا توازن بہت اہم قرار پا گیا۔ واضح ہو کہ توازن درآمد و برآمد اور توازن داد و ستد کو علی الترتیب توازن تجارت اور توازن حسابات بھی کہتے ہیں۔

بین الاقوامی تشریح

مندرجہ بالا کے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ قوموں کے درمیان لین دین کی مدیں کیا کیا ہیں۔ کیونکر ایک قوم کے مطالبات دوسری قوم پر قائم ہوتے ہیں اور قوم واجب الادا کسی قوم کے ذمے کس طرح عائد ہوئی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ ہر قوم کی داد و ستد یعنی رقوم واجب الادا اور مطالبات میں کم و بیش توازن قائم رہنا ضروری ہے ورنہ کچھ عرصے میں لین دین کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے یقینی ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ قوموں کے درمیان حساب چکانے کا طریقہ کیا ہے۔ کوئی قوم اپنے مطالبات دوسروں سے کیونکر وصول کرتی ہے اور رقوم واجب الادا دوسروں کو کس طرح ادا کی جاتی ہیں گویا بین الاقوام لین دین کی کل کیونکر چلتی ہے۔ یہ بحث چھیڑنے سے قبل ہنڈی کی تشریح ضروری ہے کیونکہ ہنڈی کو طریق مذکور کا رکن اعظم قرار دیا جاتا ہے۔

فرض کرو کہ کوئی سوداگر ہندوستان سے روئی انگلستان کے کسی تاجر کو روانہ کرے۔ انگلستان کا تاجر روئی کی قیمت پیشگی تو بھیجنے سے رہا بلکہ روئی وصول ہو جانے کے بعد ہی وہ قیمت ادا کرے گا تو نتیجہ یہ ہے کہ

اس کی خواہش یہ ہوگی کہ اپنی گرہ سے ادا کرنے کی بجائے خود ... کرکے اس کی قیمت میں سے ہندوستانی سوداگر کی رقم ادا کرے۔ لیکن ہندوستانی سوداگر یہ کیونکر گوارا کرے گا کہ مال بھیجنے کے بعد وہ قیمت سے مہینوں محروم رہے، آخر اس کو بھی تو کاروبار چلانے کے واسطے روپے کی ضرورت ہے۔ مگر اتنا سب تاجر بخوبی سمجھتے ہیں کہ قیمت کی پیشگی ادائی تو درکنار اگر مال وصول ہوتے ہی قیمت طلب کی جائے تو بھی تجارت میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور زوال تجارت سے سب تاجروں کو نقصان پہنچنا صاف ظاہر ہے۔ خصوصاً تجارت بین الاقوام کی ترقی کے واسطے خریدار کو اتنی مہلت ملنی ضروری ہے کہ مال فروخت کرکے قیمت ادا کرسکے۔ لیکن پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فروشندہ قیمت ملنے کا مہینوں انتظار کرے تو اپنا کاروبار چلانے کے واسطے روپیہ کس کے گھر سے لائے۔ بظاہر تو یہ مسئلہ لاینحل سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک نہایت سادہ طریق سے فروشندہ اور خریدار دونوں کے مقصد پورے ہو جاتے ہیں:

جب ہندوستانی سوداگر روئی جہاز پر لادے گا تو مالکان جہاز کی طرف سے اس کو ایک باضابطہ رسید ملے گی کہ اس قدر مال انگلستان کے فلاں تاجر کے نام وصول پایا۔ یہ رسید اصطلاحاً حوالہ نامہ کہلاتی ہے۔ مبادا راستے میں جہاز کا کوئی حادثہ پیش آئے اور روئی ضائع ہو جائے۔ سوداگر کسی معتبر بیمہ کمپنی کے ہاتھوں اس کی ضمانت بھی ادا کردے گا، بطور اقرار نامہ و رسید فیس ضمانت سوداگر کو کمپنی مذکور کی طرف سے باضابطہ پروانہ ضمانت دے دیا جائے گا۔ سوداگر مذکور انگلستان کے تاجر کے نام ایک ہنڈی لکھے گا کہ میں نے جو فلاں چیز تمہارے ہاتھ فروخت کی ہے اس کی مقررہ قیمت تمہیں فلاں تاریخ کو مجھے ادا کرنی ہوگی۔ اس ہنڈی کے ساتھ حوالہ نامہ اور پروانہ ضمانت منسلک کرکے بذریعہ ڈاک انگلستان کے تاجر کے پاس بھیج دے گا جو حوالہ نامہ اور پروانہ ضمانت سے اپنا اطمینان

کرکے ہنڈی پر لفظ قبول اور اپنے دستخط ثبت کرکے اس کو ہندوستانی سوداگر کے پاس واپس کردے گا جب ہنڈی قبول ہوکر انگلستان سے واپس آجائے گی تو ہندوستانی سوداگر اس کو بآسانی دوسروں کے ہاتھ فروخت کرکے اپنی قیمت جلد وصول کرلے گا۔ دوسرے لوگ اس ہنڈی کو کیوں خریدیں گے اس کی وجہ ابھی آگے چل کر واضح ہوگی۔ ہنڈی فروخت کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کی پشت پر خریدار کا نام لکھ کر فروشندہ اپنے دستخط ثبت کردے گا نئے خریدار کو انگلستان کے تاجر سے رقم مندرجہ وصول کرنے کا ایسا ہی حق ہوگا جیسا کہ ہنڈی لکھنے والے کو ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہنڈی لکھنے والے کے بعد بہت سے ہاتھوں میں گزر کر آخری لینے والے کے پاس تک پہنچتی ہے۔ ہنڈی گویا کہ ایک رقم وصول کرنے کا حق ہے جو اسی طرح خرید وفروخت ہوتا رہتا ہے جیسے کہ اور ملک یا جائداد حتےٰ کہ اس کی ادائی کا وقت آپہنچے اور وہ ختم ہوجائے اگر وہ شخص جس کے نام ہنڈی لکھی گئی ہو وقت معیّنہ پر رقم مندرجہ ادا کرنے سے انکار کرے تو قانوناً ہنڈی مذکور کا ہر ایک خریدار اپنے ماسبق فروشندہ سے رقم وصول کرنے کا مستحق ہے۔ حتّٰی کہ خود ہنڈی لکھنے والے سے رقم وصول ہوجائے۔ لیکن اگر ہنڈی ادائی کے واسطے وقت معیّنہ کے بعد پیش کی جائے اور جس کے نام ہنڈی ہو وہ اس کے ادا کرنے سے انکار کرے تو کل ماسبق فریق بری الذّمہ شمار ہوں گے اور تاخیر کنندہ کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ہنڈی کے متعلق چند اصطلاحات بتانے بیجا نہ ہوں گی جو شخص ہنڈی جاری کرے وہ لکھنے والا جو اس کو خریدے وہ رکھنے والا اور جسکے نام ہنڈی لکھی گئی ہے وہ لینے والا کہلاتا ہے ہنڈی کی خرید وفروخت میں جو فریقین کے نام پشت پر لکھے جاتے ہیں اس طریق کو اصطلاحاً توقیع کہتے ہیں۔ ہنڈی لینے والا جو بطور اقرار پہلے پہل لفظ قبول اور اپنے دستخط لکھتا ہے اسکو اصطلاحاً قبولیت یا قبولنا کہتے ہیں بوقت پیشی ہنڈی کی رقم ادا کرنا ہنڈی پٹانا اور ادائی سے انکار کرنا ہنڈی لوٹانا کہلاتا ہے۔

بالعموم ہنڈی تاریخ تحریر یا تاریخ قبولیت کے کچھ عرصے مثلاً ۳ یا ۶ ماہ بعد وقت معیّنہ پر واجب الادا ہوتی ہیں۔ اُن کو میعادی ہنڈی کہتے ہیں اور بلحاظ شمار ابتدا میعاد اُن کی دو قسمیں ہیں، بعد تحریر اور بعد قبولیت مثلاً ہنڈی ۳ ماہ بعد تحریر یا ۶ ماہ بعد قبولیت گویا ان ہنڈیوں کے نام میں سے نظر اختصار لفظ واجب الادا قبل لفظ بعد حذف کردیا جاتا ہے۔ بعض بعض ہنڈیاں بلاتعین وقت پیش ہوتے ہی ادا کرنی پڑتی ہیں، اُن کو درشنی ہنڈی یا عند الطلب ہنڈی کہتے ہیں اور یہ بہت کچھ چیک کے مشابہ ہوتی ہیں لیکن ازروئے رسم و رواج کاروبار ہر قسم کی ہنڈی پٹانے کے واسطے وقت معیّنہ کے بعد تین روز کی مہلت ضرور ملتی ہے جو اصطلاحاً رعایتی دن کہلاتے ہیں :

حاصل کلام یہ کہ جب عمرو زید کے ہاتھ کچھ مال فروخت کرتا ہے تو اُس کے نام ایک ہنڈی لکھتا ہے کہ بابت خرید فلاں مال کے میری اس قدر رقم تمہارے ذمّے فلاں تاریخ کو واجب الادا ہے۔ زید اس لفظ پر قبول اور اپنے دستخط لکھ کر ادائی کا اقرار کرلیتا ہے عمرو اس ہنڈی کو بکر کے ہاتھ فروخت کرکے اپنا روپیہ تو جلد وصول کرلیتا ہے مگر زید روپیے کو معیّنہ وقت پر ادا کرتا ہے اور بکر کو بھی اس ہنڈی کے خریدنے سے خاص فائدہ اور سہولت ہوتی ہے جس کی ابھی تشریح کی جاتی ہے :

فرض کرو کہ ہندوستان کے سوداگر انگلستان والوں کو ایک کروڑ کا غلّہ فروخت کریں اور انگلستان کے تاجر ہندوستان والوں کو ایک کروڑ روپے کا قیمتی سامان بھیجیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان اور انگلستان میں فروشندہ اور خریدار تاجر وہی ایک نہیں ہوسکتے بلکہ ہر ملک میں دو دو جداگانہ گروہ ہوں گے یعنی فروشندہ جدا اور خریدار جدا۔ تو کیا ہندوستان کے غلّہ فروش انگلستان کے خریداروں سے اور انگلستان کے سامان فروش ہندوستان کے خریداروں سے اپنا اپنا ایک ایک کروڑ مطالبہ بشکل زر جہاز میں لدوا کر منگائیں گے۔ گویا ایک کروڑ روپیہ ہندوستان سے

ولایت جائے اور ایک کروڑ ولایت سے ہندوستان آئے اس میں تو بہت طوالت اور وقت صرف ہوگا اس کے برعکس یہ طریق کس قدر سہل اور کم خرچ ہے کہ ہندوستان کے فروشندوں نے جو ہنڈیاں انگلستان کے خریداروں کے نام لکھی ہیں ہندوستان کے خریدار اپنے ہم وطن فروشندوں کو اُن کی قیمت ادا کر کے خرید لیں اور وہی ہنڈیاں بذریعۂ ڈاک انگلستان کے فروشندوں کے نام بھیج دیں تاکہ وہ اپنے ہم وطن خریداروں سے اپنی رقم وصول کر لیں گویا ہندوستان اور انگلستان کے خریدار ایک دوسرے کی طرف سے علی الترتیب ہندوستان اور انگلستان کے خریدار فروشندوں کے مطالبات ادا کر دیں اس طرح پر چاروں فریق کا حساب بھی صاف ہو جائے گا اور دونوں ملکوں میں سے کسی کو بھی ایک پیسہ بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس کی سادہ مثال یوں سمجھو کہ عمر زید کا اور بکر خالد کا بقدر مساوی قرض دار ہو اور عمر بکر کی جانب سے خالد کو قرض ادا کر دے اور بکر عمر کی طرف سے زید کو روپیہ دے دے۔

ایک دوسری مثال لو۔ فرض کرو کہ امریکہ چین سے دس لاکھ روپے کی چاء خریدے اور خود اُس کے ہاتھ کچھ فروخت نہ کرے۔ اب تو غالباً اُس کو ۱۰ لاکھ قیمت جہازوں پر لاد کر بھیجنی ہوگی مگر نہیں۔ غالباً انگلستان نے چین کو مصنوعات بھیجی ہوں گی اور امریکہ انگلستان سے چین کے نام ہنڈیاں خرید کر بھیج دے گا تاکہ جن لوگوں نے امریکہ کے ہاتھ چائے فروخت کی تھی وہ اُس کی قیمت اُن لوگوں سے وصول کریں جنہوں نے انگلستان کے مصنوعات منگائی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ امریکہ انگلستان کو ہنڈیوں کی قیمت کیونکر ادا کرے گا کیا اس کو بجائے چین کے اب انگلستان کو دس لاکھ روپے روانہ کرنا نہ پڑے گا۔ اس کا جواب صاف ہے۔ امریکہ اور انگلستان کے درمیان بکثرت درآمد و برآمد جاری رہی ہے اور ان ہنڈیوں کی قیمت امریکہ بآسانی بذریعۂ سامان ادا کر سکے گا جو انگلستان جاتا رہتا ہے۔ اس طرح پر ایک پیسہ استعمال کیے بغیر لاکھوں روپے کا حساب تینوں ملکوں میں بیباق

حصۂ چہارم
باب بست و پنجم

ہو جائے گا۔

غرض سہولت ہم نے نہایت سادہ مثالیں پیش کی ہیں مگر تجارتی اور قرضہ کتنے ہی گوناگوں اور عمل ادائی کیسا ہی پیچ در پیچ کیوں نہ ہو بین الاقوام حسابات اسی طریق سے صاف ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں بیان کیا گیا۔

اگر ہنڈی کا رواج نہ ہوتا تو ہر ملک سے درآمد کی قیمت جاتی اور برآمد کی آتی رہتی اور جبکہ تجارت کی مقدار کروڑہا نہیں بلکہ اربوں روپے ہو تو قیمت کی ایسی آمد و رفت میں جو دقتیں اور نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ ہنڈی کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ تجارت بین الاقوام بظاہر تو خرید و فروخت میں منقسم معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت بحیثیت مجموعی وہ مبادلے پر مبنی ہے اور زر محض بطورِ معیارِ قیمت استعمال ہوتا ہے نہ کہ بطورِ آلۂ مبادلہ۔ کہنے کو تو درآمد برآمد کی قیمت بہت کچھ ہے لیکن غور کیجئے تو مال کا مال سے براہِ راست مبادلہ جاری ہے۔ بطورِ آلۂ مبادلہ زر استعمال کرنے کی نوبت شاذ و نادر آتی ہے یعنی عملاً قیمت بہت کم ادا کرنی پڑتی ہے۔

۴۔ ہنڈی کے نرخ کے اصول نہایت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہیں اسی وجہ سے ہنڈی کا کاروبار از حد دشوار فن خیال کیا جاتا ہے ہنڈی کے اصول و فن پر جداگانہ ضخیم کتابیں موجود ہیں اور کئی ایک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں نرخ ہنڈی کے متعلق نہایت ابتدائی اور سلیس اصول مختصراً درج کرنا کافی ہوگا مفصل بیان کے واسطے ایک جداگانہ کتاب ناگزیر ہے۔ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ زر کی قدرِ قانونی صرف ملک کے اندر اندر مانی جاتی ہے، ملک سے باہر زر قدرِ طلائی کے حساب سے چلتا ہے۔ چنانچہ مختلف ممالک میں جو طلائی سکے بطورِ زرِ قانونی رائج ہیں ان کے سونے کا حساب کر کے شرح مبادلہ قرار دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک ملک کے سکے میں ایک تولہ دوسرے کے میں ۹ ماشے تیسرے میں ۸ اور چوتھے سکے میں ۴ اور ۳ ماشے سونا ہو تو ان چاروں

ملکوں کے سکوں میں شرحِ مبادلہ ایک، دو، تین اور چار ہوگی۔ طلائی زر استعمال کرنے والے ملکوں کے باہم تو زرِ قانونی کی شرحِ مبادلہ مستقل طور پر مقرر رہ سکتی ہے اور رہے۔ لیکن جن ملکوں میں نقرئی سکے بطور زرِ قانونی رائج ہیں۔ مثلاً ہندوستان و چین اُن کے اور اوّل الذکر ملکوں کے درمیان زرِ قانونی کی مستقل شرحِ مبادلہ قائم کرنی دشوار ہے۔ ایک طرف تو سونا مستعمل ہے اور دوسری طرف چاندی۔ اور ان دونوں دھاتوں کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے مدت سے چاندی روز بروز ارزاں ہو رہی ہے اور بمعیار چاندی سونے کی قدر میں معقول اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر کبھی ۲۴ تولہ چاندی ایک تولہ سونے کی ہم قدر تھی تو اب ۳۶ تولے ہم قدر نظر آتی ہے پس اگر ایک ملک میں طلائی سکہ رائج ہو اور دوسرے میں نقرئی تو ایسے دو ملکوں کے درمیان زرِ قانونی کی شرحِ مبادلہ ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے چنانچہ انیسویں صدی تک شرحِ مبادلہ دس روپے اور ایک پونڈ تھی۔ لیکن چاندی ارزاں ہونے کی بدولت انیسویں صدی کے آخر میں شرح انیس روپے اور ایک پونڈ ہو گئی۔ بڑے عجیب و غریب اہتمام سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بیسویں صدی کے اوائل سے آجتک ۱۵ روپے اور ایک پونڈ کی شرحِ مبادلہ قائم رکھی گئی۔ اس اہتمام کی تفصیل ایک جداگانہ کتاب معیشت الہند میں زیادہ موزوں ہوگی۔ لیکن چین کے ساتھ زرِ قانونی کی شرحِ مبادلہ اب تک غیر معین ہے اور سونے چاندی کی قدر میں بحوالۂ یک دگر جو تغیر ہوتا ہے شرح بھی اسی کے مطابقت کرتی ہے۔ البتہ چین و ہندوستان کے درمیان شرحِ مبادلہ اسی طرح پر مقرر ہو سکتی ہے جیسا کہ ممالک یورپ میں، وجہ صاف ظاہر ہے، دونوں جگہ نقرئی سکے بطور زرِ قانونی رائج ہیں اور اُن کی قدر فلزاتی کی نسبت سے باہمی قدر اسی طرح قرار پاتی ہے جیسے کہ آخر الذکر ملکوں میں طلائی سکوں کی۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ مختلف ملک کے زرِ قانونی میں، جبکہ وہ طلائی ہوں یا اُن میں سے ایک نقرئی ہو، شرحِ مبادلہ کیونکر قرار پاتی ہے۔ یہاں پر

مفصّل بحث کی تو گنجائش نہیں۔ ہم صرف ایک سادہ خاکہ ان اُصول کا پیش کرتے ہیں جن کی رو سے شرحِ مبادلہ یعنی ہنڈی کی قیمت میں کمی بیشی نمودار ہوسکتی ہے۔ ہنڈی کی قیمت میں بھی جو اضافہ و تخفیف ہوتی رہتی ہے اس کے عام باعث تین ہیں، اوّل ہنڈی کی طلب و رسد کی حالت، دوم ہنڈی کا وقتِ ادائی، سوم دوسرے ملک کے زرِ قانونی کا نقرئی ہونا چوتھا باعث یعنی خطرۂ جنگ نہایت قوی الاثر مگر بہت غیر معمولی شمار کیا جاتا ہے:

تغیرِ قیمتِ ہنڈی کے پہلے باعث یعنے طلب و رسد ہنڈی کو لیجیئے۔ اگر ہندوستان کے صرّافے میں انگلستان کے نام دس لاکھ روپے کی ہنڈی برائے فروخت موجود ہیں اور خریدار بھی صرف دس لاکھ روپے کی ہنڈیوں کے خواہاں ہیں تو ہنڈیوں کی قیمت زرِ قانونی کی مقررہ شرحِ مبادلہ کے مطابق قرار پائے گی۔ ۱۵ روپے فی پونڈ کی شرح سے ۱۰۰ پونڈ کی ہنڈی ۱۵۰۰ روپے کو فروخت ہوگی۔ ہنڈی کی قیمت بشرحِ مبادلہ زرِ قانونی قرار پانا اصطلاحاً مساواتِ مبادلہ کہلاتا ہے۔ اور ایسی قیمت کو **قیمتِ مساوات** کہہ سکتے ہیں:

لیکن مساواتِ طلب و رسد کے علاوہ دو اور حالتیں بھی ممکن ہیں یعنی یا تو ہنڈیوں کی رسد طلب سے کم ہو یا زیادہ مثلاً لوگ دس لاکھ روپے کی ہنڈیوں کے خریدار ہوں لیکن صرف نو لاکھ کی ہنڈیاں دستیاب ہوں ایسی صورت میں ہنڈیوں کے خریداروں میں مقابلہ آپڑے گا اور ہر کوئی ہنڈیوں کی خرید میں عجلت کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہنڈی سے محروم رہیں گے اُن کو زرِ واجب الادا بشکل طلا روانہ کرنا پڑیگا۔ اور کرائیہ جہاز و فیس ضمانت وغیرہ سے زیر باری ہوگی فرض کرو کہ بقدر سو پونڈ طلا انگلستان بھیجنے کے مصارف پچاس روپے ہیں۔ جب کہ طلا بھیجنے کی دقّت و مصارف سے بچنے کے لیئے ہر خریدار ہنڈی خریدنے کی کوشش کرے گا تو ۱۰۰ پونڈ کی ہنڈی کی قیمت ۱۵۰۰ روپے سے بڑھ کر ۱۵۵۰ پچاس کے

قریب قریب آ جائے گی لیکن اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی ورنہ پھر لوگ سونا بھیجنا شروع کر دیں گے اور ہنڈی کو کوئی بھی نہ خریدے گا ہنڈی تو اُسی وقت تک خرید نا مفید ہے جب کہ اُس کی قیمت ۱۵ سو پچاس سے کم ہو۔ اگر قیمت ۱۵ سو پچاس تک بڑھ جاوے تو سونا خرید کر بھیجنا۔ یا ہنڈی۔ دونوں برابر ہیں اور بفرض محال قیمت اگر اس سے زیادہ بڑھے تو پھر لوگ سونا خرید کر بھیج دیں گے۔ ہنڈی کو کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے گا ہنڈی کی خرید و فروخت کا خاص مطلب آمد و رفت زر کے مصارف بچانا ہوتا ہے۔ اور جب بٹا یا بڑھوتری مقامات زر سے تجاوز کرے تو زر کی آمد و رفت خود بخود جاری ہو جائے گی پس ثابت ہوا کہ بحالت قلت رسد ہنڈی کی قیمت میں بقدر سونا بھیجنے کے مصارف کے برابر اضافہ ممکن ہے۔

اس کے برعکس اگر دس لاکھ کی ہنڈیاں موجود ہوں لیکن لوگ صرف نو لاکھ کی خریدنا چاہیں تو ہنڈی بھیجنے والوں میں مقابلہ نمودار ہو گا جن کی ہنڈی نہ بکیگی اُن کو بہت دقت اور مصارف برداشت کر کے سونا منگانا پڑے گا اور چونکہ ۱۰۰ پونڈ کے بقدر سونا منگانے کے مصارف بھی ۵۰ روپے ہوں گے وہ دقت سے بچنے کے لئے ۱۰۰ پونڈ کی ہنڈی بجائے ۱۵ سو کے پچاس روپے کم پر ۱۴۵۰ تک فروخت کرنا غنیمت سمجھیں گے لیکن اس سے بھی کم قیمت پر ہنڈی بیچنے کے مقابل سونا منگانا زیادہ مفید ہو گا اس لیئے قیمت میں مزید تخفیف کی گنجائش نہیں گویا بحالت کثرت رسد بھی ہنڈی کی قیمت میں بقدر سونا منگانے کے مصارف کی برابر تخفیف ممکن ہے؛

ہنڈی کی قیمت میں رسد کی کمی بیشی یا طلب کے غلبے اور ضعف سے جو اضافہ اور تخفیف نمودار ہو اُس کو اصطلاحًا بڑھوتری اور بٹے سے تعبیر کرتے ہیں اور اُن کی مذکورۂ بالا حدود یعنی مصارف آمد و رفت طلا اصطلاحًا مقامات زر کہلاتے ہیں۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ بڑھوتری اور بٹا حدود بالا کے اندر اندر رہتا ہے ان تک پہنچنے کے بعد سونے کی درآمد برآمد

حصۂ چہارم
ابتدائے پنجم

شروع ہو جاتی ہے۔ المختصر رسد و طلب کی تغیرات سے ہنڈی کی قیمت میں مقامات زیر تک بڑھوتری یا بٹا قائم رہ سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ بڑھوتری اور بٹا یہ دونوں تبدیلیاں مساوات مبادلہ زائل ہونے سے قیمت مساوات میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ حالتِ اوّل کو اصطلاحاً مبادلۂ فوقِ مساوات اور دوم کو مبادلۂ تحتِ مساوات بھی کہتے ہیں؛

جبکہ کثرتِ رسد کی وجہ سے ہندوستان کی ہنڈی انگلستان کے نام بٹے سے فروخت ہو تو یہ علامت انگلستان سے ہندوستان سونا آنے کی سمجھی جاتی ہے اور ایسی حالت ہندوستان کے حق میں اصطلاحاً مبادلۂ موافق سے تعبیر کی جاتی ہے، اس کے برعکس اگر قلتِ رسد کی وجہ سے ہندوستان کی ہنڈی انگلستان کے نام بڑھوتری سے بکے تو یہ علامت ہندوستان سے انگلستان سونا جانے کی ہے، اس حالت کو اصطلاحاً ہندوستان کے حق میں مبادلۂ ناموافق کہتے ہیں۔ مبادلۂ موافق اس امر کی دلیل ہے کہ اس ملک کے مطالبات رقومِ واجب الادا سے زیادہ ہیں اور مبادلۂ ناموافق سے رقومِ واجب الادا کی زیادتی ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحالتِ اوّل سونے کی درآمد ہوتی ہے اور بحالتِ ثانی برآمد۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ جن دو ملکوں کے درمیان مبادلہ جاری ہو اگر ان میں سے کسی ایک کے حق میں مبادلہ موافق ہوگا تو لازماً دوسرے کے حق میں ناموافق ہوگا یا ایک کے حق میں ناموافق ہو تو دوسرے کے حق میں موافق ضرور ہوگا۔ فریقین کے مبادلے کی حالت ترازو کے دو پلڑوں کی سی سمجھنی چاہیئے ایک پلڑے کے جھکنے سے دوسرا اُٹھتا اور اُٹھنے سے جھکتا ہے۔ ہر دو تبدیلیاں لازم و ملزوم ہیں۔ ہنڈی کی قیمت پر طلب و رسد کا اثر تو دریافت کر چکے اب دیکھنا یہ ہے کہ وقتِ ادائی کے قریب و بعید ہونے سے قیمت میں کیا فرق نمودار ہوتا ہے؛

بہ لحاظِ وقتِ ادائی ہنڈی کی دو قسمیں بیان ہو چکی ہیں۔ ان میں سے درشنی یا عند الطلب ہنڈی تو ایک قسم کا چک سمجھنی چاہیئے۔ اگر فرق ہے تو

صرف اس قدر کہ چیک صرف بنک کے نام لکھا جاتا ہے اور ایسی ہنڈی تاجر کے نام۔ دوسرے چیک فوراً ادا کر دیا جاتا ہے اور ہنڈی کے لینے والے کو اس کے پٹانے میں کاروباری رواج کے بموجب تین رعایتی دن کی مہلت ملتی ہے لیکن ہنڈی کا اصلی منشا یہ ہے کہ لینے والے کو روپے کی ادائی کے لئے چند ماہ کی مہلت ملے اور لکھنے والا اس کو جب چاہے فروخت کر کے روپیہ وصول کر لے پس اکثر ہنڈیاں میعادی ہوتی ہیں اور اسی کو ٹھیٹ ہنڈی سمجھنا چاہیئے۔

طلب و رسد کی مذکورالصدر بحث میں ہنڈیاں عندالطلب فرض کی گئیں ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنڈی کے میعادی ہونے سے اُس کی قیمت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہاں اس نکتے کا بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈی اُسی وقت تک میعادی شمار ہوگی جب تک کہ اُس کی ادائی کا وقت کچھ دور ہو۔ مثلاً دو تین ماہ جب میعادی شمار ہوگی پٹانے کا وقت قریب آ پہنچے تو اُس کی حیثیت بھی درشنی یا عندالطلب ہنڈی کی سی ہو جائے گی۔

فرض کرو کہ ہندوستان میں انگلستان کے نام سو پونڈ کی ہنڈی میعادی تین ماہ برائے فروخت موجود ہے گویا لکھنے والا یا رکھنے والا آج سے تین ماہ بعد لینے والے سے پٹا سکے گا ہنڈی اس صورت میں اگر فروخت کیجائے تو خریدار اس شرح سود سے جو اس وقت انگلستان میں مروّج ہے اسکی قیمت پر بٹا کاٹ لے گا۔ مثلاً وہاں شرح سود ۴ فی صدی ہو تو سو پونڈ پر تین ماہ کا سود ایک پونڈ ہوا۔ پس وہ سو پونڈ کی ہنڈی میعادی تین ماہ کی قیمت جب کہ انگلستان میں شرح سود ۴ فی صدی ہو اُس وقت ۹۹ پونڈ قرار دیگا۔ اور لہذا اس کی قیمت بجائے پندرہ سو روپے دینے کے ۱۵ روپے ہمقدر ایک پونڈ منہا کر کے صرف ۱۴۸۵ روپے دے گا۔ فروشندہ اس قیمت کو اس وجہ سے قبول کر لے گا کہ اُس کو روپیہ نقد مل رہا ہے ورنہ تین ماہ انتظار کرنا پڑتا۔ اور بحالتِ انتظار اگر ایک پونڈ موجودہ قیمت سے زائد بھی ملتا تو وہ وہی سود ہوتا جو خریدار اس وقت منہا کرتا ہے۔ خریدار کا بھی عذر یہی ہے کہ

وہ تو قیمت اس وقت ادا کر رہا ہے اور اُس کو ہنڈی کہیں تین ماہ بعد سپٹے گی پس اس دوران میں رکھنے والے کو کچھ سود ضرور ملنا چاہیئے۔ اور اس کی شرح وہ ہوگی جو لینے والے کے مُلک میں رائج ہو کیونکہ فرض کرو کہ خریدار ایسی ہنڈی اپنے قرض خواہ کو بھیجے (اور ہنڈی خریدنے کا مقصد بھی بالعموم یہی ہوتا ہے) تو قرض خواہ کو کہیں تین ماہ بعد ہنڈی سپٹے گی۔ حالانکہ قرض اُسی وقت ادا ہونا چاہیئے۔ پس قرض خواہ اس دوران تاخیر میں بشرح مروجہ قرض پر سود لگا لے گا اگر ہنڈی عندالطلب ہوتی تو قرض فوراً ادا ہو جاتا۔ تو گویا ہنڈی کے میعادی ہونے سے اس کے خریدار کو کچھ زائد رقم بطور سود ادا کرنی پڑے۔ پس یہ رقم ہنڈی کی قیمت سے منہا ہونی چاہیئے اور یہ چونکہ قرض خواہ جو ہنڈی لینے والے کے مُلک میں مقیم ہے اپنے ہاں کی شرح سے سود لگائے گا خریدار بھی وہیں کی شرح سود سے بٹا کاٹے گا۔

حاصل کلام یہ کہ اگر مبادلے میں مساوات ہو یعنی طلب و رسد کے برابر ہونے سے بٹا کٹے نہ بڑھوتری ملے تو ۱۰۰ پونڈ کی عندالطلب ہنڈی ۱۵۰۰ سو روپے کو اور تین ماہ میعادی ہنڈی جب کہ لینے والے کے مُلک میں شرح سود ۴ فی صدی ہو۔ بعد منہائی پندرہ روپے ہمقدار ایک پونڈ ۱۴۸۵ سو روپے کو فروخت ہوگی۔ پس واضح ہو کہ میعادی ہنڈی کی قیمت سے اس مُلک کی شرح سود سے جہاں وہ واجب الادا ہو کیوں کر اور کس لیئے بٹا کاٹا جاتا ہے اس کے علاوہ میعادی ہنڈی کی قیمت میں ایک اور تخفیف ہونی بھی یقینی ہے۔ میعادی ہنڈی تو کچھ مدت میں سپٹتی ہے۔ اگر اس دوران میں لکھنے والے یا لینے والے کا دیوالہ نکل جائے تو رکھنے والا پھر رقم کس سے وصول کرے گا۔ وہ تو کہیں کا بھی نہ رہے گا گویا میعادی ہنڈی میں روپیہ ضائع ہونے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ پس کچھ فی صدی بطور مطالبات خطر قیمت میں سے ضرور منہا کیا جائے گا مثلاً اوپر کی مثال میں سو پونڈ کی میعادی ہنڈی بٹا کٹنے پر ۱۴ سو ۸۵ روپے کی ہوئی

حصۂ چہارم
باب بست وپنجم

پندرہ روپے بطورِ مطالبات خطر منہا ہونے پر اُس کی قیمت صرف ۱۴۸۵ روپے رہجائے تو عجب نہیں - اگر ہنڈی لکھنے والے یا لینے والے یا دونوں کا اعتبار بڑھا ہوا ہے تو مطالبات خطر کی شرح بہت ادنی ہوگی اور اگر اعتبار گھٹا ہوا ہے تو بہت اعلی - یہ وجہ ہے کہ مستند تاجروں کی ہنڈیاں بمقابلہ دوسروں کے زیادہ قیمت کو فروخت ہوتی ہیں اور اگر ایسی ہنڈی رسد و طلب میں بھی کمی بیشی ہو تو حسب حالات بڑھوتری یا مزید بٹے سے شرحِ مبادلہ میں مزید تبدیلی نمودار ہوگی طلب و رسد اور میعادی ہنڈی سے شرح مبادلہ میں جو جو فرق نمودار ہوتے ہیں اُن کو ہنڈی کے کاروبار کے ماہر بآسانی جدا جدا دریافت کرلیتے ہیں لیکن یہاں اس کی تشریح کی گنجائش نظر نہیں آتی - قیمتِ ہنڈی یا شرح مبادلہ میں جو تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں ان کے دو باعث تو بیان ہو چکے یعنی ہنڈی کی طلب و رسد اور اس کی میعاد ادائی - اب تیسرا باعث ایسے دو ملکوں سے متعلق ہے جن میں سے ایک کا زرِ قانونی طلائی ہو اور دوسرے کا نقرئی - اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ اگر دونوں ملکوں میں زرِ قانونی طلائی ہو تو سکوں کی مقدارِ طلا کے حساب سے ان کی شرح مبادلہ مستقل طور پر مقرر ہوجاتی ہے - لیکن چونکہ چاندی سونے کی قدر بمعیار یکدیگر گھٹتی بڑھتی ہے اس لیئے نقرئی اور طلائی سکوں کی شرح مبادلہ مستقل نہیں رہ سکتی بلکہ قدرِ فلزاتی کے بموجب اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے - اُنیسویں صدی کے آخری نصف کے دوران میں روپے اور پونڈ کی شرحِ مبادلہ بہت تغیر پذیر رہی - ۱۲-۱۳ روپے پونڈ سے لیکر ۱۸-۱۹ روپے پونڈ تک مبادلہ ہوتا رہا ہے - بالآخر بیسویں صدی کے شروع میں ایک ایسا عجیب و غریب بندوبست کیا گیا جس کی بدولت آج تک شرح مبادلہ ۱۵ روپے پونڈ قائم ہے اور امید ہے کہ مدت تک قائم رہے گی مگر چین اور یورپ یا امریکہ کے درمیان اب تک زرِ قانونی کے علے الترتیب نقرئی اور طلائی ہونے سے شرحِ مبادلہ بہت غیر معین رہتی ہے اور اس

حصۂ چہارم باب بست و پنجم

عدم تعلق سے کاروبار میں گونا گوں ہرج واقع ہوتا ہے جس کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں ؛

اب تغیر قیمت کا چوتھا باعث لیجیئے اگر کہیں جنگ چھڑنے کی کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو فریقین میں عجیب سراسیمگی پھیل جاتی ہے ہر ایک ہنڈی رکھنے والا یا رکھنے والا اس کو جلد سے جلد فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے غنیمت سمجھتا ہے اسکے برعکس قرضدار مطمئن ہو جاتے ہیں - اُن کو ادائی قرض سے بچنے کے لیئے اچھا موقع نظر آنے لگتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ایسے وقت میں لوگ بکثرت ہنڈی فروخت کرنا چاہتے ہیں اور خریدار عنقا ہو جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہنڈی کی قیمت بہت گھٹ جاتی ہے - اگر دس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ فی صدی بٹا لگ جائے تو عجب نہیں ؛

بعض لوگ اس امید پر کہ جنگ ٹل جائے گی ہمت کرکے سستی سستی ہنڈیاں خرید ڈالتے ہیں اور اگر خوش قسمتی سے جنگ رفت گزشت ہو جائے تو پھر اُن کے گھرے ہیں ہنڈی کی پوری پوری قیمت وصول کرکے خوب نفع اُٹھاتے ہیں - لیکن اگر جنگ چھڑ جائے اور اُن کا روپیہ سب خاک میں مل جائے تو عجب نہیں - ایسے وقت ہنڈیاں خریدنے میں بجید منافع ملنا ممکن ہے لیکن کل رقم ضائع ہو جانے کا اندیشہ بھی کافی قوی ہے اور منافع کی بڑی مقدار گویا محض مطالبات خطر شمار ہوتی ہے اور کچھ نہیں ؛

اوپر کے بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ہنڈی کیا چیز ہے مختلف اقوام کے زر قانونی کی شرح مبادلہ کیوں کر قرار پاتی ہے - ہنڈی کی قیمت یا شرح مبادلہ میں جو بلا توقف تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس کے چار باعث ہو سکتے ہیں جو کبھی تنہا اور کبھی مل جل کر اپنا اپنا اثر دکھاتے ہیں ؛

دلال ہنڈی

۵ - ہنڈیوں کی خرید و فروخت بذات خود نہایت تخصیص طلب تجارت ہے - بڑے بڑے ذہین لوگ عمریں صرف کرکے کہیں اس کاروبار میں مہارت اور تجربہ حاصل کرتے ہیں اُن کو اصطلاحاً ہنڈی دلال کہتے ہیں - ہم نے

ہنڈی کی بہترین قسم تمثیلاً پیش کی ہے اس کے علاوہ ہنڈی کی قسمیں اور بھی ہیں جن میں سے بعض نزی دھوکے کی ٹٹی ہوتی ہیں۔ دلّالوں کے علاوہ بہت کم لوگ بھلی بُری ہنڈی میں تمیز کر سکتے ہیں۔ مزید براں ہنڈی کا نرخ دریافت کرنا بہت دشوار ہے، یہ کام بھی دلّالوں ہی کے بس کا ہے۔ یہ لوگ بالعموم اپنی دیانت داری کے واسطے مشہور ہوتے ہیں۔ اور یہی شہرت اُن کے کاروبار کی ترقی کا باعث ہوتی ہے وہ اپنے گاہکوں کو دھوکا بہت کم دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہنڈی کی تجارت کے بڑے بڑے بازار ہیں جن کو اصطلاحاً "صرافہ" کہتے ہیں۔ یہاں پر کروڑہا روپے کی خرید و فروخت ہر روز ہوتی ہے۔ دلّال ایک ہاتھ سے ہنڈی خریدتے اور دوسرے سے فروخت کرتے ہیں۔ ہنڈی کے کاروبار میں یہ لوگ بشکل بٹّا و بڑھوتری بہت کچھ کما لیتے ہیں جس کو اصطلاحاً پھروتا بھی کہتے ہیں۔

مطالبات خارجیہ کی ادائی کے طریق

۶۔ قوموں کے درمیان حساب چکانے میں ہنڈی بہت کام آتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اوّل اس کی تشریح ضروری سمجھی۔ اب ہم بین الاقوام داد و ستد کی تکمیل کے مروّجہ طریقوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ بصراحت معلوم ہو جائے کہ قوموں کے درمیان مطالبات کیونکر وصول ہوتے ہیں اور رقوم واجب الادا کیونکر ادا کی جاتی ہیں۔

ا۔ جیساکہ اوپر کے بیان سے بخوبی ظاہر ہے۔ قوموں کے بلّام وصول یابیِ مطالبات اور ادائیِ قرض کے واسطے ہنڈی بہت مستعمل ہے، ترقی یافتہ ممالک میں شاید ہی کوئی چیز اس قدر جلد بک سکتی ہو جتنی کہ ہنڈی، کروڑہا روپے کی ہنڈیاں تجارتی مرکزوں کے صرافوں میں ہر ہفتے معمولاً خرید و فروخت ہوتی رہتی ہیں۔

ب۔ صرافوں میں علاوہ ہنڈی کے اور بھی طرح طرح کے حصّے اور رقعے بکتے ہیں۔ لندن کا صرافہ دنیا میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے، وہاں ایک تاریخ میں جو ہنڈیاں حصّے اور رقعے

حصۂ چہارم
باب بست و نہم

برائے فروخت موجود تھے اُن کی قیمت تقریباً ایک ارب پچاس
کروڑ روپے سالانہ ہوتی تھی اور بہت سے صرافے
دنیا بھر میں قائم ہیں۔ خدا جانے اُن سب کے کاروبار کی مجموعی مقدار
کیا ہوگی؟

اگر دو ملکوں میں سے ایک کے تمام ہنڈیاں [illegible] تو
دوسرے ملک کے قرضدار کسی تیسرے ملک کے نام کی
ہنڈیاں خرید کر دوسرے ملک کو دے دیں گے تاکہ دوسرے
ملک سے ہنڈیاں بھنا کر اپنا مطالبہ جو دوسرے ملک پر ہو
سے وصول کر لے۔ انگلستان، امریکہ اور [illegible] اقوام
میں وصول یابی و ادائی کا یہی طریقہ مشہور و مروج ہے۔ اس مثال
کی تشریح اس سے قبل بھی دوسری جگہ کی جا چکی ہے۔ اصطلاحاً
یہ طریق ادائی مثلثی کہلاتا ہے۔

(ج) اگر ہنڈیاں دستیاب نہ ہوں یا [illegible] اور ضرورت ہو کہ دوسرے
ملک کو رقم بھیجی جائے تو ایک طریق یہ بھی ہے کہ کسی بنک کو جو بیوپار
کرتا ہو رقم مذکور مع کمیشن ادا کر دی جائے اور وہ دوسرے ملک
یا اپنی ہی شاخ سے جو دوسرے ملک میں قائم ہو چٹھی لکھ دے
کہ فلاں شخص کو یا فلاں شخص کو [illegible] اس قدر
روپیہ ادا کر دیا جائے۔ اس کاروبار [illegible]
[illegible] ایجنٹ کو
[illegible] دنیا کے اکثر ممالک میں یا تو
اپنی شاخیں قائم رکھتی ہیں یا دوسرے بنکوں سے حساب رکھتے
ہیں۔ جو لوگ خرید و فروخت ہنڈی کے بکھیڑے میں پڑنا پسند
نہیں کرتے انھیں کی معرفت ہندوستان سے دوسرے ملکوں
کو روپیہ بھیجتے ہیں۔ خصوصاً جو ہندوستانی طلبہ انگلستان میں
مقیم ہیں اُن کو خرچ اسی طرح بھیجا جاتا ہے۔

بنک کی چٹھی تو ڈاک میں جاتی ہے۔ اگر روپیہ بہت جلد بھیجنا مقصود ہو تو بنک کی چٹھی خریدنے کی بجائے انتقالِ تار برقی خریدنا چاہیئے یعنی کچھ زیادہ کمیشن ادا کرنے پر ادائی زر کی ہدایت ڈاک کی بجائے بذریعۂ تار بھیج دی جائے گی۔

(د) جب کسی ملک کی برآمد زرعی پیداوار ہو اور درآمد مصنوعات ہوں تو باوجود ہنڈیاں مستعمل ہونے کے مذکورۂ بالا طریق کے مطابق بنکوں کی ضمانت ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ درآمد مصنوعات تو بارہ مہینے آتی رہتی ہیں۔ لوگوں کو اُن کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ہنڈی کے جویاں رہتے ہیں لیکن زرعی پیداوار کی برآمد بیشتر سال میں دو مرتبہ فصل کے موقع پر ہوتی ہے اور اُسی وقت ہنڈیاں لکھی جاتی ہیں۔ گویا ہنڈیوں کی طلب تو سال بھر رہتی ہے۔ اور رسد دو موقعوں پر نمودار ہوتی ہے۔ پس ایسے وقت جب کہ لوگ ہنڈی کی تلاش میں ہوں اور وہ دستیاب نہ ہو سکیں تو کوئی بنک جو ایسا کاروبار کرے دوسرے ملک کے کسی بنک کے نام جس سے وہ حساب و کتاب رکھتا ہے چٹھی لکھ دے گا جس کو اصطلاحاً سادہ ہنڈی یا اعتباری ہنڈی بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہنڈی کسی مال کی خرید و فروخت پر مبنی نہیں۔ لوگ بنک سے سادہ ہنڈی خرید خرید کر اپنے قرضخواہوں کے پاس بھیجتے رہیں گے جو اُن کو اس بنک سے پٹالیں گے جن کے نام وہ لکھی گئی ہیں۔ بنک آخر الذکر ان ہنڈیوں کی رقم اوّل الذکر کے نام بطور قرض لکھتا رہے گا۔ جب فصل کے موقع پر ہنڈیوں کی کثرت ہو گی تو بنک اوّل اُن کو خرید کر بنک دوم کے پاس بھیج دے گا جو اُن کی مندرجہ رقم ہنڈی کے لینے والوں سے وصول کر لے گا۔ بنک اوّل سادہ ہنڈی پر بٹہ ہوتری لگائے گا اور خریدتے وقت ہنڈیوں پر بٹہ کاٹے گا جو کچھ اس شرح پر منافع حاصل ہو گا

اس میں دونوں بنک شریک ہو جائیں گے :

(۲) اگر ہنڈی بنک کی چٹھی یا سادہ ہنڈی کچھ بھی نہ ملے اور رقم کی مقدار بہت زیادہ ہو تو مجبوراً سونا یا دیگر قانونی شے مبادلہ معین بھیجا جاسکتا ہے لیکن اس میں اخراجات کچھ زیادہ پڑیں گے اور تیاری در روانگی ارسال کا درد سر بھی اٹھانا پڑے گا۔

(۳) اگر رقم واجب الادا بہت زیادہ ہو اور ہنڈی وغیرہ نہ مل سکے تو اس صورت میں سونا بھیجنے کی بجائے بہتر یہ ہوگا کہ قرض خواہ ملک ہی سے قرض عامہ وصول کیا جائے اس طرح پر قرض کے سود سے تو زیر بار ہونا پڑے گا لیکن ادائی قرض سے کچھ عرصے کے واسطے مہلت ضرور مل جائے گی۔ چنانچہ جرمنی کو تاوان جنگ ادا کرنے میں فرانس نے یہی طریق اختیار کیا تھا اور سونا بھیجنے کے مقابلے میں مفید بھی یہی ہے۔

سچ پوچھئے تو مبادلات خارجہ کی بحث ازحد پیچیدہ اور طوالت طلب ہے اس پر عبور حاصل کرنا آسان نہیں۔ انگریزی میں اس مبحث پر اب تک معدودے چند کتابیں لکھی جا سکی ہیں اور جو کچھ بھی ہیں ان میں جا بجا معمے نظر آتے ہیں۔ مبادلۂ خارجہ کی گتھی سلجھانے کے لئے اصولی معلومات کافی نہیں اس کے واسطے کاروباری تجربے کے ناخن درکار ہیں۔ اور کیوں نہ ہو خود یہ بحث اصولی کی بجائے عملی معاشیات سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے۔ کل تفصیل و نکات ایک جداگانہ کتاب میں بیان ہو سکتے ہیں ہم نے یہاں ایک سادہ خاکہ پیش کر دیا اور بس۔

باب بست و ششم

بنک

(۱) بنک کا ماضی و حال [illegible] کی تشریح [illegible] کا اچھا
(۲) [illegible] بڑے بڑے بنک اور کارخانوں کے حصے

[illegible] معاشی ترقیات کے سامنے
میں [illegible] لوگ اپنا اندوختہ
زمین [illegible] ایک جا [illegible]
[illegible] روپیہ تجارت
میں [illegible]
[illegible] سے سود لیا جاتا تھا
آج کل کی طرح بطور اصل زر سے کام لینے کے موقعے اگرچہ اصل میں بھی تھے
تو بہت کم [illegible] قرض کا زیادہ تر [illegible] یا فضول خرچ لوگ کھانے پینے [illegible]
کے لئے قرض لیا کرتے تھے۔ قرض لے کر کاروبار جاری کرنے کا رواج بھی
کم تھا۔ تاہم مہاجن ساہوکار بطور خود قرض دیا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا روپیہ
مارا بھی جاتا تھا۔ مگر [illegible] سود لیتے اس قدر تھے کہ
سب نقصان کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرض ذلت و افلاس کی علامت
شمار ہوتا تھا جب کہ لوگوں کا اندوختہ بیکار زمین میں دفن پڑا رہے اور
شرح سود اس قدر اعلیٰ ہو کہ جب تک کسی کی جان پر نہ بن آئے یا کوئی
دیدہ و دانستہ اپنی تباہی نہ چاہے قرض لینے کا نام نہ لے تو پھر ایسی حالت
میں بھلا کیا معاشی ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر عوام کے اندوختے جن کی

حصۂ چہارم
باب بست و ششم

بھی جو قدر ارکروڑوں بلکہ اربوں روپے سے کم نہیں بطور اصل کاروبار میں کام آئیں اور شرح سود اس قدر معتدل ہو کہ قرض کے روپے سے کاروبار چلانے میں بھی منافع مل سکے تو پھر دیکھئے کہ چند ہی روز میں ملک کی حالت کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف کاروبار کی چہل پہل، ترقی کے امکانات اور مرفہ الحالی کا سماں نظر آنے لگے گا۔

کسی زمانے میں لوگ اپنا اندوختہ بشکل طلا امانتاً ساہوکاروں کے پاس رکھ دیا کرتے تھے اور نگہداشت کے معاوضے کے طور پر اس کو کچھ ماہانہ یا سالانہ فیس بھی دیا کرتے تھے لیکن جب ساہوکاروں نے دیکھا کہ مدتوں لوگوں کا اندوختہ پڑا رہتا ہے اور اس کے مطالبہ کی نوبت نہیں آتی تو ان کو خیال ہوا کہ اگر ایسے اندوختوں کے ایک حصے کو محفوظ رکھ کر باقی سے کچھ کام لیا جائے یعنی کم از کم معتبر لوگوں کو قرض دے دیا جائے تو جمع کنندوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ سب ایک ساتھ تو اپنا اندوختہ مانگنے سے رہے۔ گاہے گاہے جب کوئی کچھ واپس مانگے گا تو حصۂ محفوظ میں سے اس کو ادا کرنا مشکل نہ ہوگا۔ پس جبکہ بحالت موجودہ جمع کنندوں کو ان کا اندوختہ بوقت مطالبہ ایک کمتر مقدار محفوظ میں سے ادا کرنا ممکن ہے تو پھر ان کو اس سے کیا سروکار کہ کل اندوختے ہر وقت موجود رہتے ہیں یا ان کی مجموعی مقدار کا صرف ایک جزو محفوظ ہے اور باقی سود پر دیا ہوا ہے۔ بلکہ جب قرض پر سود ملے گا تو جمع کنندوں سے فیس نگہداشت لینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی اور بلا معاوضہ ان کے اندوختوں کی نگرانی ہو سکے گی بلکہ اگر وہ صبر سے کام لیں تو سود قرض سے ایک حصہ الثالث ان کو دینا بھی ممکن ہے گویا اگر اندوختوں کا ایک حصہ قرض پر دیا جانے لگے تو جمع کنندہ باقی ماندہ حصۂ محفوظ میں سے اپنا اندوختہ جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں اور فریقین کا اس میں فائدہ بھی ہے۔ قرض کا سود کچھ ساہوکار لیں اور کچھ جمع کنندوں کو دیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ان کو اندوختہ روزمرہ درکار نہیں تو پھر اس کو بخیال واپسی مدتوں بیکار پڑا رہنا

حصّہ چہارم
باب بست و ہشتم

سرمایہ غیر ضروری بلکہ باعثِ نقصان نظر آیا۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ اگر ایک مناسب مقدار محفوظ رکھی جائے تو جمع کنندوں کے مطالبات بلا دقت پورے ہو سکتے ہیں پس سب کو یہ تجویز پسند آئی اور زر کے کاروبار کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بنکوں کا رواج نکلا ایک طرف لوگ ان میں خوشی خوشی آمدنی جمع کرنے لگے دوسری طرف مناسب شرح سود پر معتبر لوگوں کو قرض ملنا شروع ہوا۔ روپے کی کثرت سے کاروبار میں جان پڑی منافع میں تین فریق حصّہ دار بن گئے یعنی اوّل وہ جس نے قرض لے کر کاروبار چلایا، دوم بنک جس نے روپیہ فراہم کر کے قرض دیا۔ سوم جمع کنندے جنھوں نے اپنے اندوختے بنک میں جمع کیئے۔ یہ تین فریق ملے تب کہیں عوام کے اندوختے کام آئے۔ اس تثلیث کا ہر فریق ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے تقسیمِ منافع کا کسی کو افسوس یا حسد نہیں ہوتا بلکہ موجودہ تقسیمِ عمل سب کو اپنے اپنے حق میں مفید نظر آتا ہے۔ یہی بنکوں کے لین دین کی ابتدا ہے جس میں اب اس قدر باریکیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ بنکوں کا حساب کتاب سمجھنا بھی ایک جداگانہ معاشی فن مانا جاتا ہے اور بہت کم لوگوں کو اس میں مہارت اور تبحر حاصل ہوتا ہے۔ یہ جو اخباروں میں ہر روز بڑے بڑے صرافوں کی طرف سے زر کے مختصر نرخ نامے شائع ہوتے ہیں دیکھنے میں تو ان میں صرف بنکوں کے سود مبادلاتِ خارجیہ اور سرکاری رقعوں کی شرح درج ہوتی ہے۔ لیکن ان کا سمجھنا کیا کوئی آسان کام ہے اچھے اچھے چکرا جاتے ہیں اور لطف یہ کہ اس چھوٹے سے نرخ نامے میں دنیا بھر کی مالی حالت جھلکتی ہے جس کے سمجھنے نہ سمجھنے پر کروڑہا روپے کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں تو عجب نہیں۔ عوام کو تو یہ نرخ نامہ محض ایک معمّا یا بیکار اندراج نظر آتا ہے لیکن جو لوگ زر کا کاروبار کرتے ہیں وہ ہر صبح کو اس نرخ نامے کا ایسی ہی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں جیسے کہ رؤساء فہرستِ خطابات کا یا امیدوارانِ کونسل اعلانِ انتخابات کا۔ زر کا کاروبار چلانے میں یہ نرخ نامے اسی قدر مفید اور ناگزیر ہیں جیسے کہ جہاز رانی میں قطب نما اور مقیاس الہوا جس سے جہاز کے رخ اور موسم کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ بنک کا کام

حصّہ چہارم باب بست و ششم

چلا نے سکے ۔ اسکے اس قدر مہارت اور قابلیت مخصوص درکار ہے کہ کارگزار ڈائرکٹر بڑی تلاش وجستجو بلکہ خوش قسمتی سے ملتا ہے ۔ انگلستان بنک کا ڈائرکٹر اپنے عہدے کی اہمیت اور ذمہ داری کے لحاظ سے برطانیۂ عظمیٰ کے وزیر اعظم کے ہم پلہ مانا جاتا ہے ۔ اس بنک کا کاروبار سمجھانے کے لیئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے ۔ لیکن اتنا جان لینا ضروری ہے کہ تمام دنیا کے کاروبار زر کی کل ہی اس بنک کی حیثیت اس بائلر کی سی ہے جو انجن کے ذریعے سے تمام کل کو چلائے یوں تو دنیا میں بنک اور بھی بڑے بڑے ہیں مگر کاروبار زر میں اس کا سا اقتدار اور اثر کسی کو بھی نصیب نہیں امریکہ والوں کو خاص طور سے رشک ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کاروبار زر کا مرکز لندن کی بجائے نیو یارک بن جائے جو قدرتی اور اکتسابی فوقیتیں انگلستان کو حاصل ہیں وہ امریکہ میں مہیا کرنی بہت دشوار نظر آتی ہیں اور مدتوں لندن کو کسی رقیب سے اندیشہ نہیں ؛

بنک کا طریق کاروبار سمجھنا جس قدر دشوار ہے اُتنا ہی آسان بھی ہے ۔ اگر تفصیل سنیئے تو حیران رہ جائے ۔ اور اگر اجمال پر نظر کیجیئے تو بات نہایت صاف ہے ۔ جس طرح کہ لوگ اور بے شمار چیزوں کی تجارت کرتے ہیں بنک زر کی تجارت کرتے ہیں ۔ تاجر تو چیزیں خرید خرید کر بیچتے ہیں اور بنک زر امانتاً لے کر قرض دیتے ہیں ، تاجروں کا فائدہ اس میں ہے کہ چیزیں ارزاں خریدیں اور گراں فروخت کریں ۔ بنکوں کا منافع یہ ہے کہ زر کم شرح سود پر امانتاً لیں اور زیادہ شرح سود پر قرض دیں ، بہت سی چیزوں کی مدتوں سے خرید جاری ہے ۔ لیکن معاشی ترقیات کی بدولت آج کل زر کی گرم بازاری سب سے بڑھی ہوئی ہے اگر کل چیزوں کی تجارت جسم ہے تو زر کو اس کا خون بلکہ روح سمجھنا چاہیئے اور جب کاروبار میں تاجر اگر زر نہیں تو پھر بنک بغیر کیونکر کام چل سکتا ہے بنک کا کاروبار میں آج وہ رتبہ ہے کہ اس کی حالت ملک کی معاشی حالت کا آئینہ سمجھی جاتی ہے ؛

بنک کی تشریح ۲ ۔ زر کاغذی کے تحت میں مختصر اً نوٹ سے بحث کی جا چکی ہے

جس سے واضح ہوگا کہ اجراۓ نوٹ کے اصول کیا ہیں اور نوٹ کے ذریعے سے دولت میں کیوں کر اضافہ ممکن ہے (۲۲) نوٹ کا کاروبار یا تو خود سرکار اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے جیسا کہ ہندوستان کا حال ہے یا بطورِ خاص کسی بنک کے سپرد کر دیتی ہے اور اس پر قوانین و ضوابط کی پابندی عائد کر کے اپنی نگرانی قائم رکھتی ہے مثلاً انگلستان بنک کو نوٹ جاری کرنے کی خاص اجازت حاصل ہے ؛

لیکن عام بنکوں میں چیک کا کاروبار ہوتا ہے جو کسی طرح نوٹ سے کم نہیں ؛ چیک سے بھی انتقالِ رقوم میں بےحد سہولت ہوتی ہے اور اس سے بھی دولت میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے ؛

بنک کے حساب و کتاب کی تفصیل سے تو ہم آگے چل کر بحث کریں گے یہاں صرف چیک کی نوعیت اور اس کا کام سمجھانے کے لیے ہم ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ کچھ لوگ اپنا روپیہ اگر بنک میں جمع کریں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنا کل روپیہ ایک ساتھ اور یکایک واپس نہیں لیں گے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ زرِ جمع شدہ کی دو مدیں ہوتی ہیں مثلاً امانت اور قرض۔ زرِ امانت واپس لینے کے واسطے حسبِ قرارداد ایک ہفتہ یا ایک ماہ یا تین یا چھ ماہ قبل واپس لینے کی بنک کو اطلاع دینی پڑتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ بنک زرِ امانت باطمینان کاروبار میں لگائے رکھتا ہے اور اطلاع ملنے پر ضروری مقدار کاروبار سے نکال کر واپسی کے واسطے مہیا کر لیتا ہے اور وقت آنے پر ادا کر دیتا ہے۔ زرِ امانت واپس لینے کے واسطے چونکہ کچھ عرصے قبل اطلاع دینی شرط ہے۔ اس سے بطورِ شغلِ اصل کاروبار میں خوب کام لیا جاتا ہے۔ جو کچھ بطورِ سود بنک کو حاصل ہو اس کا ایک حصّہ زرِ امانت جمع کرنے والے کو بھی دیا جاتا ہے اور اطلاع کی میعاد جس قدر وسیع ہو زرِ امانت زیادہ مستقل کاروبار میں لگ سکتا ہے سود بھی زیادہ ہاتھ آئے گا اور جمع کنندہ کو بھی متقابلۃً بشرحِ اعلیٰ دیا جائے گا۔ مثلاً زرِ امانت ایک ہفتہ جمع کنندوں کو اگر بشرحِ نصف فی صدی سود دیا جائے تو زرِ امانت یک ماہ

یا سہ ماہ یا شش ماہ پر ایک ڈیڑھ اور دو فی صدی تک دیا جائے گا۔ روپیہ جمع کرنے کی دوسری مد مدِ رواں کہلاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جمع شدہ واپس لینے کے واسطے پہلے سے کوئی اطلاع دینی ضروری نہیں جب وقت جتنا چاہیں روپیہ لے سکتے ہیں چونکہ زرِ رواں کی مقدارِ کثیر ادائی کے واسطے ہر وقت تیار رکھنی پڑتی ہے اور اس کو کاروبار میں لگانا خلافِ احتیاط ہے۔ جمع کنندوں کو بھی اس پر کوئی سود نہیں دیا جاتا۔ مدِ امانت میں تو جمع کنندوں کو سود کا بھی لالچ ہوتا ہے لیکن مدِ رواں میں بھی لوگ بکثرت روپیہ اس وجہ سے جمع کرتے ہیں کہ اول تو اس کی نگہداشت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں دوم بنک مفت خزانچی کا کام دیتا ہے اور روپے کے لین دین میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

روپیہ واپس لینے کا قاعدہ یہ ہے کہ جمع کنندوں کو بنک سے فارموں کی کتابیں ملتی ہیں جن کی باقاعدہ خانہ پری کر کے حسبِ ضرورت زر واپس لی جا سکتی ہے، یہی فارم چک کہلاتے ہیں گویا چک جمع کنندوں کی طرف سے بنک کے نام ایک حکم ہوتا ہے کہ ہمارے حساب میں سے فلاں رقم ہم کو یا فلاں شخص کو یا حاملِ ہذا کو ادا کر دو۔ بنک چک لکھنے والے کی تحریر اور دستخط سے اس کی صحت کا اطمینان کر کے اور چک کی پشت پر روپیہ لینے والے کے دستخط کرا کر رقمِ مندرجہ ادا کرتا اور چک بطورِ رسید رکھ لیتا ہے اب جمع کنندہ کی سہولت کا اندازہ کیجئے اس کو صرف ایک چکوں کی کتاب رکھنی پڑتی ہے اور جب جتنا روپیہ لینا یا کسی کو دینا منظور ہوا فوراً بنک کے نام چک لکھ دیا اور کام بن گیا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ بنک زرِ امانت تو اس لالچ سے لیتے ہیں کہ اس سے کاروبار چلا کر سود پاتے ہیں جس کا ایک حصہ جمع کنندہ کو دے کر باقی خود اڑاتے ہیں مگر زرِ رواں تو سوا بیکار پڑے رہنے یا واپس ہونے کے اور کسی کام آتا ہی نہیں اور نہ اس پر بنک کو کچھ سود ملتا ہے پھر وہ اس کا دردِ سر اپنے ذمے کیوں لیتا ہے۔ ذیل کی تفصیل سے واضح ہو گا کہ زرِ رواں بھی کل

بشکلِ نقد رکھنا نہیں پڑتا بلکہ اس کا کوئی حصہ مطالباتِ واپسی پوری کرنیکے واسطے کافی ثابت ہوتا ہے اور باقی کو بطورِ اصل کاروبار میں لگا کر سود پانا ممکن ہے اور جیسا کہ زرِ رواں پر جمع کنندہ کو سود نہیں ملتا کل بنک کی گرہ میں رہتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ کل زرِ امانت زیادہ مستقل کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اس پر سود بھی بشرح اعلیٰ ملتا ہے لیکن اس کا ایک حصہ جمع کنندہ کو نکل جاتا ہے اور زرِ رواں کا صرف ایک حصہ کام میں آسکتا ہے اور اس کی بشرح سود بھی ادا ہوتی ہے لیکن جمع کنندہ کو کوئی حصہ نہیں ملتا؛

حاصلِ کلام یہ کہ بنک کو زرِ امانت کی طرح زرِ رواں سے بھی کچھ نہ کچھ سود ملتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جمع کنندہ سے کوئی معاوضہ لیئے بغیر وہ زرِ رواں کی نگہداشت کرتا ہے اور بطور خزانچی وصول و ادائی کی خدمت سرانجام دیتا ہے؛

زرِ امانت کا بطورِ اصل کاروبار میں لگانا تو سمجھ میں آسکتا ہے کیوں کہ اسکی واپسی کیواسطے کچھ مہلت دیجاتی ہے لیکن زرِ رواں جسکا جمع کنندہ کی طرف سے ہر وقت مطالبہ ہوسکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے کسطرح کاروبار میں پھنسایا جاسکتا ہے اسکو تو ہمیشہ نقد تیار رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ زرِ رواں کا صرف ایک حصہ بشکل نقد ہر وقت موجود رہتا ہے اور باقی کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے البتہ لگاتے ایسے کاروبار میں ہیں کہ زر کی علیحدگی جلد سے جلد ممکن ہو چنانچہ اس واقعے کو ہم بنک کے چیک کے تحت میں مزید تشریح کریں گے یہاں پر صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ زرِ رواں کا صرف ایک حصہ کیوں کر مطالباتِ واپسی پورے کرسکتا اور کرتا ہے؛

کسی ملک میں بنک کا رواج ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنا اپنا اندوختہ بنک میں رکھیں، جن لوگوں کو بطورِ خود کاروبار چلانا منظور نہ ہو وہ تو اپنا روپیہ بطورِ امانت جمع کرتے ہیں تاکہ سود بھی ملتا رہے مگر جو لوگ کاروبار میں مصروف ہیں وہ بھی اپنا نقد بنک ہی میں بمدِ زرِ رواں رکھتے ہیں۔ بنک بلا معاوضہ انکا خزانچی بن جاتا ہے اور بذریعۂ چک ادائی وصول یابی رقوم میں بعید سہولت ہوتی ہے اوّل ایک سادہ مثال لو۔ فرض کرو کہ کسی شہر میں صرف ایک بنک ہے

اور وہاں کے تاجر بمد روال اپنی اپنی طرف سے کافی رقمیں جمع کردیں، اب ان میں سے کوئی اپنے پاس سے کسی کو نقد رقم ادا نہیں کرے گا۔ بلکہ جب کوئی کسی کو کچھ دینا چاہے گا اُس کے لیئے چیک لکھ دے گا جس کے پیش کرنے پر رقم مندرجہ بنک ادا کردے گا۔ لیکن بنک سے زر نقد لینے کی نوبت کم آئے گی۔ ان تاجروں میں سے جن کی بنک میں مد روال قائم ہے جب کوئی کسی کے لیئے چیک لکھے گا تو رقم مندرجہ ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل کردی جائیگی لیکن چیک لکھنے والے کی طرف سے ادائی اور چیک پانے والے کی طرف سے وصولیابی بنک کے حساب و کتاب میں درج کردیجائیگی اور یہ سب تحریری کارروائی ہوگی بنک کے زر نقد پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ صرف رقم مندرجۂ چیک اس کے لکھنے والے کے حساب سے خارج ہوکر اُس کے پانے والے کے حساب میں درج ہوجائے گی اس طرح پر یہ کل تاجر آپس میں لاکھوں روپے کی تجارت کرتے ہیں مگر بہت کم زر نقد استعمال کرنے کی نوبت آئے گی صرف چیکوں کی رقمیں بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے اُدھر گھومتی رہیں گی ؎

اب اگر بنک بجائے ایک کے دو ہوں الف اور ب اور کچھ تاجر اپنا حساب ایک بنک میں رکھیں اور کچھ دوسرے میں مگر سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کاروبار کریں تو ایک ہی بنک والوں کی چیکیں تو جب تفصیل بالا ادا اور وصول ہوتی رہیں گی لیکن اگر ایک بنک کا گاہک دوسرے بنک والے کے لیئے چیک لکھے تب بھی وہی طریق برتا جائے گا الف بنک کے گاہک دوسرے بنک والوں کے لیئے اپنے بنک الف کے نام چیک لکھیں گے جن کو پانے والے یعنی ب بنک کے گاہک براہ راست الف بنک کو بھیجنے کی بجائے اپنے ب بنک کے پاس بھیج دیں گے۔ اسی طرح پر ب بنک کے گاہک اپنے بنک ب کے نام الف بنک والوں کے لیئے چیک لکھیں گے جن کو پانے والے الف بنک کے گاہک ب بنک کے پاس بھیجنے کی بجائے اپنے بنک الف کو بھیج دیں گے۔

گویا الف بنک کے پاس ب بنک کے نام اور ب بنک کے پاس الف بنک کے نام بہت سی چک جمع ہو جائیں گی تب اُن چک کی مجموعی رقموں کا موازنہ ہو کر جس بنک کی جتنی رقم زائد نکلے گی وہ دوسرے بنک سے لے سکتا ہے لیکن چوں کہ بنکوں کا باہمی حساب وکتاب برابر جاری رہتا ہے کبھی ایک کی رقم زائد نکلتی ہے کبھی دوسرے کی۔ بغرض صفائی حساب رقوم واجب الوصول اور واجب الادا کا مقابلہ تو وقتاً فوقتاً اوقاتِ معینہ پر ہوتا رہتا ہے لیکن ادائی زرِ نقد کی نوبت بنکوں کے درمیان بہت کم آتی ہے ایسی رقمیں بھی آپس کے حساب کتاب میں درج ہو کر خود بخود زائل ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ اگر کبھی کسی بنک کا مطالبہ معمول سے زیادہ بڑھ جائے اور دوسرے بنک کو اس میں سے کچھ ادا کرنا پڑے تو عجب نہیں لیکن ایسا بہت کم واقع ہوتا ہے۔ رہا چک لکھنے والوں اور پانے والوں کا حساب ہر ایک کی طرف سے جتنے چک ادا ہوتے ہیں اور اس کو جتنے وصول ہوتے ہیں سب اُس کے حساب میں درج ہوتے رہتے ہیں اور ادائی اور وصول یابی کا موازنہ کرنے پر فوراً آ جاتا یا جا سکتا ہے کہ فلاں گاہک کا اتنا روپیہ مدِ رواں میں باقی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں بیسیوں بنک جاری ہیں۔ دو بنکوں کا آپس میں چک کا کاروبار چلانا تو خیر آسان تھا مگر جب بنکوں کی تعداد زیادہ ہو تو ایسے کاروبار میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہو سکتا ہے چودہ بنکوں کے درمیان $\frac{14 \times 13}{2}$ یعنی ۹۱ لین دین کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں اور پچاس بنکوں کے باہم ۱۲۲۵ تعلقات ممکن ہیں اتنے تعلقات کا جدا جدا حساب کس قدر دشوار اور طوالت طلب ہوگا۔ لیکن اگر افراد کی طرح متعدد بنک بھی اپنا ایک مرکزی بنک قائم کریں تو اُن کے لین دین میں بھی بذریعۂ چک وہی سہولت ہو سکتی ہے جو کہ ایک ہی بنک کے گاہکوں کو آپس کے لین دین میں حاصل ہے۔ چکوں کا حساب کرنے پر جو بنک جس دوسرے بنک کو جس قدر ادا کرنا چاہیے اس کے لیے مرکزی بنک کے نام چک لکھ دے اور جس طرح عوام کی طرف سے معمولاً

حصۂ چہارم
باب بست و ہشتم

بنک کا حساب و کتاب اپنے رجسٹروں میں درج کرتے ہیں مرکزی بنک معمولی بنکوں کی طرف سے اپنے ہاں درج کرے گا عمل وہی ایک موٹا فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہاں چک لکھنے والے اور پانے والے عوام ہیں اور یہاں بنک۔ بلحاظ طریقِ کاروبار معمولی بنک اور مرکزی بنک میں کوئی فرق نہیں۔

چنانچہ لندن کی مشہور سڑک لمبارڈ سٹریٹ میں ایک مکان ہے جہاں ہر روز ۲۶ بڑے بڑے بنکوں کے گماشتے جمع ہو کر تمام بنکوں کا باہمی حساب کتاب طے کرتے ہیں ایسے مقامات اصطلاحاً حساب گھر کہلاتے ہیں۔ ہر ترقی یافتہ ملک کے کاروباری مرکزوں میں ایسے حساب گھر قائم ہیں اور بنکوں کا کاروبار ان کے بغیر چلنا محال ہے۔ انگلستان میں لندن کے علاوہ مانچسٹر میں دوسرا حساب گھر موجود ہے۔

مذکورۂ بالا چھبیس بنکوں میں سے ہر بنک کے گماشتے باقی پچیس بنکوں کے نام جتنے چک ہوتے ہیں پہلے ہی بلندے بنا کر لاتے ہیں۔ چکوں کے نمبر تاریخ رقوم وغیرہ کی یادداشت علیحدہ تیار کر کے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ہر بنک کو باقی پچیس بنکوں سے اپنے نام کی چک کے پچیس بلندے مل جاتے ہیں اپنے دیئے ہوئے بلندوں کی رقوم کا لیئے ہوئے بلندوں کی رقموں سے مقابلہ کرنے پر بآسانی دریافت ہو جاتا ہے کہ کس بنک کو کس قدر دینا ہے اور کس سے کس قدر لینا۔ اسی کے مطابق زائد رقوم کے چک انگلستان بنک کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں جو ان سب بنکوں کے واسطے بطورِ مرکزی بنک کام کرتا ہے۔ اس طریق سے تخمیناً ساٹھ کروڑ روپے کا لین دین ایک پیسہ لئے بغیر ہر روز انجام پاتا ہے جس سرعت اور سہولت سے حساب گھروں میں کام ہوتا ہے وہ بجائے خود کچھ کم عجیب نہیں اور اس کام میں شریک ہونے کے واسطے بہت محنت اور مہارت درکار ہے۔ گماشتوں کو اس قدر محنت کرنی پڑتی ہے کہ اکثر ضعفِ دماغ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان چھبیس کے علاوہ باقی جتنے بنک ہیں

حصّۂ چہارم باب بست و ششم

وہ انھیں کو اپنا ایجنٹ بناکر حساب گھر میں اپنا کاروبار چلاتے ہیں لیکن تجویز ہے کہ اُن کو بھی بطورِ خود شریک ہونے کی اجازت ملنی چاہیئے۔کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس سہولت سے محروم رکھے جائیں۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ زرِ رواں کا اگرچہ اصلی مقصد تو چک ادا کرنا ہے لیکن چوں کہ ہر شخص اپنا زرِ رواں بنک ہی میں رکھنا پسند کرتا ہے ادائی زر کی نوبت کم آتی ہے بیشتر رقوم مندرجۂ چک صرف بنک کے رجسٹروں میں لکھنے والوں کے حساب سے خارج ہوکر پانے والوں کے حساب میں درج ہو جاتی ہیں اور چوں کہ ہر شخص چک لکھتا اور پاتا ہے رقوم مندرجہ خود بخود زائل ہوتی رہتی ہیں۔اگر زرِ رواں میں سے کبھی نقد ادا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت جب کہ جمع کنندہ خود لینا چاہے یا کسی ایسے شخص کیلئے چک لکھے جس کو نقد درکار ہو یا جو بنک میں حساب نہ رکھتا ہو۔لیکن چوں کہ ایسے موقع کم پیش آتے ہیں لہٰذا زرِ رواں کا صرف ایک حصّہ مطالبات ادائی پوری کرنے کے واسطے کافی ہوتا ہے اور باقی بطورِ اصل کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے مگر اس شرط پر کہ اس کے کاروبار سے علیحدگی جلد سے جلد ممکن ہو تاکہ اگر کوئی ایسا وقت آپڑے کہ بہت سے چکوں کی رقمیں نقد طلب کی جائیں تو زرِ رواں کا یہ حصّہ کاروبار سے ہٹ کر فوراً ادائی کے واسطے آموجود ہو ورنہ اگر خدانخواستہ بنک چک ادا کرنے سے معذور رہے تو فوراً اُس کو دیوالیہ قرار دے دیا جائے گا اور دیوالہ نکلتے ہی سارا کھیل بگڑ جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بنک لوگوں سے بمدِ امانت و بمدِ زرِ رواں روپیہ لیتا ہے۔ مدِ اوّل میں جمع کرنے والوں کو کچھ سود بھی ملتا ہے۔مدِ دوم میں جمع کرنے والوں کو یہ فائدہ ہے کہ بنک بطورِ اُن کے خزانچی کے کام کرتا ہے اور ادائی و وصول یابی رقوم میں بنک کے ذریعے سے بعید سہولت ہوتی ہے۔بنک امانت کا کل اندوختہ اور نیز مدِ زرِ رواں کا ایک جزو طرح طرح کے کاروبار میں لگاکر خوب سود وصول کرتا ہے۔لیکن چوں کہ دوسروں کا روپیہ ہے اور محض معتبر سمجھ کر لوگوں نے بنک کو دیا ہے شغلِ اصل میں بے حد احتیاط شرط ہے۔

نہ تو روپیہ مارے جانے کا اندیشہ ہونا چاہیئے اور نہ اُس کے کاروبار سے جدا ہونے میں زیادہ دیر لگنی چاہیئے۔

چک کی صرف ہم کو ایک کارگزاری اور دکھانی باقی ہے جو معاشیات کے عجائبات میں کسی سے کم نہیں۔ شغلِ اصل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مال و جائداد کی ضمانت پر معتبر لوگوں کو روپیہ قرض دیا جائے لیکن اکثر لوگ بنک سے قرض لے کر اس کو مدِ رواں میں جمع رکھتے ہیں یعنی بنک کے قرضداروں کو مقدارِ قرض تک بنک کے نام چک لکھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے گویا کہ انھوں نے بنک کی مدِ رواں میں اس قدر روپیہ جمع کر دیا ہے۔ اس ترکیب سے دوگونہ تعلقات نمودار ہو جاتے ہیں۔ اوّل تو بنک اُس شخص کو قرض دیتا ہے، دوم وہ شخص زرِ قرض بنک ہی کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ اُس کو بطور خزانچی رکھے گویا خود قرض دینے والا ہی زرِ قرض کا محافظ قرار پاتا ہے۔ اب قرضدار اگر اپنے ہی نام چک لکھ کر کوئی رقم وصول کرنا چاہے یا کسی ایسے شخص کے نام لکھے جس کو زرِ نقد درکار ہو یا جو کسی بنک میں حساب نہ رکھتا ہو تب تو بنک کو کچھ زرِ نقد ادا کرنا پڑے گا ورنہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ چک یا تو اُن لوگوں کے لیئے لکھے جاتے ہیں جن کا خود اس بنک سے حساب ہو یا جو کسی دوسرے بنک سے حساب رکھتے ہوں۔ بصورتِ اوّل چک براہِ راست اسی بنک کے پاس پہنچ جاتا ہے جس نے قرض دیا اور زرِ نقد ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے، صرف رقم کا رجسٹروں میں اندراج ہو جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر چکِ مذکور بنکوں کے باہمی لین دین کے حساب میں شامل ہو جائے گا جیسا کہ معمول ہے، اگر دوسرے بنک کے نام ایسا ہی اُس کے قرضدار کا لکھا ہوا چک پہلے بنک کے پاس پہنچے تو یہ دونوں ایک دوسرے کو زائل کر دیں گے۔ کوئی بنک بھی کسی دوسرے کو کچھ ادا نہ کرے گا۔ صرف اپنے اپنے رجسٹروں میں اپنے نام والے چک کی رقم قرضدار کے حساب سے خارج کر کے دوسرے بنک کے

نام والے چیک کی رقم اپنے گاہک کے حساب میں درج کرلیں گے اور اگر دوسرے بنک کے نام ایسا چیک پہلے بنک کو نہ ملتا تو بھی لین دین کی مجموعی رقموں میں اس چیک کی قیمت ایسی ہوگی جیسی کہ جھاڑے میں ایک سینٹ اور بہت ممکن ہے کہ پہلے بنک کی دوسرے پر زائد رقم نکلے جس سے اس چیک کی ادائی ہوجائے اور اگر بفرض محال اس چیک کی رقم دوسرے بنک کو ادا کرنی بھی ضروری ہوئی تو مرکزی بنک رقم مندرجۂ چیک بنک اوّل کے حساب سے خارج کرکے بنکِ دوم کے حساب میں درج کردے گا۔ زرِ نقد کے ادا کرنے کی پھر بھی نوبت نہ آئے گی، حاصل کلام یہ کہ بنک زرِ نقد کی بجائے صرف چیک لکھنے کا حق دے کر دوسرے لوگوں کو قرض دیتے اور خود اُن کے خزانچی بن جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ بنک کُل زرِ قرض دینے کا ذمہ کرتا ہے۔ لیکن چوں کہ بالعموم قرض دار بذریعۂ چیک زرِ قرض وصول کرتا ہے بنک کو زرِ نقد ادا کرنے کی کم نوبت آتی ہے۔ قرض کی رقمیں بہ بیشتر رجسٹروں میں گھومتی رہتی ہیں حتّٰی کہ کچھ عرصے میں بنک کو قرض دار سے قرض وصول ہوجاتا ہے۔ اور اُس وقت اگر قرض دار کے لکھے ہوئے چیک کا زرِ نقد بھی ادا کرنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنک زرِ نقد کی بجائے بیشتر اپنا اعتبار قرض دیتے ہیں۔ قرض دار بنک کے نام جو چیک لکھتے ہیں وہ یا تو اُس بنک کے پاس واپس آجاتے ہیں یا بنکوں کے باہمی حساب میں غائب ہوجاتے ہیں، زرِ نقد ادا کرنے کی نوبت مدتوں نہیں آتی حتّٰی کہ قرض دار سے قرض بھی وصول ہوجاتا ہے، اگر بنک صرف زرِ نقد قرض دیتے تو اُن کی حیثیت محض دلّال کی سی ہوتی کہ کچھ لوگوں سے روپیہ لیتے اور کچھ کو سود پر قرض دیتے۔ سود میں سے خود کچھ بطور کمیشن کاٹ کر باقی روپے والوں کو دے دیتے لیکن زرِ نقد سے کہیں زیادہ بنکوں کا اعتبار قرض پر چلتا ہے اور ایسے قرض کی مقدار کروڑوں اور اربوں روپے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنکوں کی رقموں کے سمجھنے میں عوام کو دھوکا ہوتا ہے۔ مثلاً برطانیۂ عظمیٰ کے بنکوں میں

جمع شدہ رقموں کی مقدار تیرہ ارب پچاس کروڑ سے زیادہ دکھائی جاتی ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عوام نے اس قدر زر نقد بنکوں میں جمع کر رکھا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس رقم کا ایک بڑا حصہ وہ قرض ہوں گے جو بظاہر زر نقد معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اعتبار سے زیادہ کچھ نہیں اور جنکا بشکل زر نقد کوئی وجود نہیں۔

اس کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ بنک ملک کے بہت زیادہ اندوختوں کو بطریق احسن کام میں لاتے ہیں اور ایک ایک روپے سے دس دس روپے کا کام لے کر طرح طرح سے کاروبار کی ترقی میں ناگزیر مدد دیتے ہیں جس ملک میں عمدہ بنک جاری نہ ہوں وہاں کی معاشی ترقی کی رفتار نہایت سست ہونی لازمی ہے۔

چک کا مختصر حال اوپر بیان ہوا ذیل میں بنک کا ایک چٹھا پیش کیا جاتا ہے جس سے بنک کے کاروبار کی ایک جھلک نظر آجائیگی۔ رہی بنک کی تفصیل یہ وہ دریا نہیں جو کوزے میں بند ہوسکے۔

بنک کا چٹھا ۳۔ چٹھا ایک مجمل فرد حساب و کتاب ہوتا ہے جس میں جانب راست تو وہ کل رقوم درج ہوتی ہیں جو بنک کو لوگوں سے وصول ہوتی ہیں اور جو اُس کو واجب الادا ہوں اور جانب چپ وہ جو کہ بنک نے دوسروں کو دی ہوں اور جو اُس کو واجب الوصول ہوں یا کہ جو اُس کے پاس موجود ہوں گویا جانب راست بنک کی رقم واجب الادا دکھائی جاتی ہے اور جانب چپ بنک کا اثاثہ اور رقوم واجب الوصول، ذیل میں ہم نمونۃً ایک چٹھا پیش کرتے ہیں:۔

	لاکھ		لاکھ
اصل وصول شدہ	۱۸	نقد بدست	۴۳
اندوختہ	۱۰	قرض عند الطلب و اطلاع قریب	۳۰
زر بمد امانت	۱۵۰	خرید ہنڈیات اور قرض بضمانت	۱۵۰
زر بمد رواں	۱۰۰	خنثل اصل	۵۰
بمد نفع نقصان	۲	بنک گھر	۷
	۲۸۰		۲۸۰

اب اس چٹھے کی مختصر تشریح سنیئے اوّل یہ بتانا ضروری ہے کہ جن لوگوں کا

بنک سے تعلق ہوتا ہے اُن کی دو قسمیں ہیں ایک شیئر کا یا حصہ داران بنک دوسرے بنک کے گاہک جب بنک جاری کرنا مقصود ہوتا ہے تو کچھ لوگ سب سے پہلے ایک رقم اپنی طرف سے مہیا کر کے بنک کی بنیاد ڈالتے ہیں یہی وہ رقم ہے جو بنک کا اصل کہلاتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ بنک کو معتبر سمجھیں اور جو لوگ بنک سے لین دین کریں ان کو اطمینان رہے کہ بنک کے پاس اس قدر اصل موجود ہے کہ اگر کبھی بنک کو نقصان پہنچے یا اس کا دیوالہ بھی نکل جائے تو لوگوں کی رقمیں اس اصل سے وصول ہو جائیں گی۔ گویا اصل سے عوام کی نظر میں بنک کی وقعت اور اعتبار قائم ہوتا ہے۔

اصل مہیا کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ کبھی تو چند لوگ مل کر بطور خود جمع کر دیتے ہیں اور کبھی بنک کے نام سے حصے فروخت کیئے جاتے ہیں جن کی قیمت سے اصل کی مطلوبہ رقم حاصل ہو جاتی ہے جو لوگ اصل بطور خود جمع کریں یا حصے خریدیں وہ شیئر کا یا حصہ داران بنک کہلاتے ہیں اور ان ہی کو بنک کا مالک سمجھنا چاہیئے۔ کل مصارف ادا کرنے پر جو کچھ منافع بچتا ہے ان ہی میں تقسیم ہو جاتا ہے اور وہ اُن کے کاروبار کا منافع شمار ہوتا ہے۔

اوّل چٹھا مندرجۂ بالا کی جانب راست والی رقوم واجب الادا پر نظر ڈالیئے ۱۰ لاکھ اصل وہی رقم ہے جو شیئر کا یا حصہ داران بنک نے مہیا کی ہے اور جس کو بنک کا سنگِ بنیاد کہنا بجا نہ ہوگا، یہ دس لاکھ اندوختہ کہاں سے آیا۔ بات یہ ہے کہ جب بنک کامیابی سے چلتا ہے اور شرح منافع اعلیٰ ہوتی ہے تو مالکان بنک کل منافع لینے کی بجائے ایک مناسب مقدار پر قناعت کرتے ہیں اور باقی کو بچا بچا کر بمد اندوختہ جمع کرتے رہتے ہیں، اصل کی طرح اندوختہ بھی انھیں کی ملک ہوتا ہے اور اس سے بھی بنک کا رسوخ اور اعتبار بڑھتا ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ اصل بنک قائم ہوتے وقت مہیا کیا جاتا ہے اور اندوختہ بنک کے

منافع سے پس انداز ہو جاتا ہے اندوختے سے بنک کی مالی حیثیت بھی عمدہ نظر آنے لگتی ہے اور بنک کی سرسبزی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مزید برآں اندوختہ بھی دوسری مدوں کے روپے کی مانند کاروبار میں لگا رہتا ہے اور مالکوں کو اس سے آمدنی حاصل ہوتی ہے، یہ نہیں کہ وہ بیکار پڑا رہتا ہو۔ اس کو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق سمجھنا چاہیئے اور جن بنکوں کے پاس اندوختہ ہو وہ بہت خوش قسمت خیال کیئے جاتے ہیں، ۲ لاکھ مد نفع و نقصان سے مُراد وہ رقم ہے جو کُل مصارف ادا کرنے کے بعد لبطور منافع مالکوں کو بچے لیکن چونکہ اس میں کبھی زائد بچنے کی بجائے اُلٹی کمی پڑنے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے اس لیئے اس کو محض نفعے کی بجائے نفع و نقصان سے تعبیر کرتے ہیں اس مد میں جو رقم دکھائی جائے وہ صرف اس زمانے سے متعلق ہوتی ہے جس کی بابت کاروبار کا چٹھا شائع کیا جائے مثلاً ہر ششماہی یا سہ ماہی کے بعد؛

پس معلوم ہوا کہ تین رقمیں یعنی ۱۸ لاکھ اصل ۱۰ لاکھ اندوختہ اور ۲ لاکھ نفع و نقصان کُل ۳۰ لاکھ شرکا کا یا حصّہ داران بنک کی ملک ہے۔ لیکن تعجّب ہوگا کہ جب یہی لوگ مالکانِ بنک ٹھیرے تو پھر اس رقم کو بنک کی طرف سے واجب الادا شمار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں تو ادا کرنے اور پانے والے وہی لوگ ہیں بھلا کوئی اپنا دین دار خود کیوں کر ہو سکتا ہے اور خود اپنے کو ادا کرنا کیا معنی؟ اس میں شک نہیں کہ اس رقم کے دین دار اور لین دار وہی لوگ یعنی مالکان بنک ہیں لیکن بغرض صفائی حساب اُن کی دونوں حیثیتیں علٰحدہ رکھی جاتی ہیں۔ گویا کہ بنک حصّہ داروں سے کوئی جدا چیز ہے اور جو کچھ اُن سے لیتا ہے اُس کی واپسی کا ذمّہ دار ہے؛

اصل کے ساتھ وصول شدہ کی تشریح اس وجہ سے ضروری ہے کہ عوام کو دھوکا دینے کے لیئے بعض بنک اصل کی مد میں کوئی بڑی رقم شائع کر دیتے ہیں جس سے اصل کی مقدارِ کلی مُراد ہوتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت حصّہ داروں سے صرف اس مقدار کا نصف یا تہائی چوتھائی وصول کیا جاتا ہے۔

مثلاً بیس لاکھ روپے قیمت والے چار چار سو روپے کے پانچ ہزار حصّے اس شرط پر فروخت کیئے جائیں کہ خریداروں کو ۲ سو روپے حصّہ تو خریدتے وقت ادا کرنے پڑیں گے اور باقی باقساطِ معین عند الطّلب تو اس صورت میں بنک کا اصل کلی ۲۰ لاکھ شائع کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ صرف ۱۰ لاکھ اصل موجود ہے۔ لہٰذا اصل کے ساتھ وصول شدہ کی تصریح قانوناً لازمی قرار دے دی گئی ؛

یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کہنے کو تو بنک نے (۲۰-۲۸۰) ۲۷۸ لاکھ روپے کا کاروبار کر کے کہیں دو لاکھ کمایا گویا شرحِ منافع ½ فی صدی کے قریب رہی لیکن مالکانِ بنک کو یہ کُل منافع ۱۰ لاکھ اصل پر وصول ہوا۔ گویا اُن کے نزدیک منافع ۲۰ فی صدی سے بھی زیادہ ہے۔ ملاپس بنک کی کامیابی کے دو بڑے راز معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل اعتبار، دوم کاروبار میں کم منافع لینا جب بنک پر اعتبار کر کے لوگوں نے اپنا (۱۵۰ + ۱۰۰) ۲۵۰ لاکھ روپیہ بمدِ امانت و تدرواں بنک کے سپرد کر دیا تو اُس کو بھی کاروبار میں لگا کر ذرا سا صرف ½ فی صدی منافع لے کر بنک نے اپنے ۱۰ لاکھ اصل پر ۲ لاکھ منافع کما لیا ؛

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ جانبِ راست تین رقمیں یعنی اصل، اندوختہ اور نفع نقصان جن کی مجموعی تعداد ۳۰ لاکھ ہوتی ہے خود مالکانِ بنک کو بنک کی طرف سے واجب الادا ہیں۔ اب باقی دو رقمیں لیجئے۔ ۱۵۰ لاکھ بمدِ امانت اور ۱۰۰ لاکھ بمدِ رواں، ان دونوں مدوں کا مفہوم اوپر بیان ہو چکا ہے یہاں پر صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ ان رقموں کا مالک وہ دوسرا گروہ ہوتا ہے جس میں بنک کے گاہک شامل ہیں گویا گاہک وہ لوگ ہیں جو بنک کے مالک تو نہ ہوں لیکن اس سے لین دین رکھتے ہوں۔ اس میں اپنا روپیہ جمع کریں یا اُس سے کچھ روپیہ قرض لیں ؛

رقوم واجب الادا کی تو تشریح کی جا چکی۔ اب جانبِ چپ رقوم اثاثہ و رقوم واجب الوصول پر نظر ڈالیئے بنکوں کو اپنے نام کے چک فوراً ادا کرنے کے واسطے ہر وقت تیار رہنا ضروری ہے ورنہ وہ اگر کبھی ایک چک

حصۂ چہارم
باب بستم

ادا کرنے سے بھی معذور ہو تو اُن کو مرادِ مالیہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا اور سے کاروبار شروع کیا جاتا ہے تو تعجب نہیں ہے۔ ۳۳ لاکھ بہ صورت نقد وہ رقم ہے جو ادائی چک کے خیال سے احتیاطاً ہر وقت بشکل زر موجود رکھی جاتی ہے۔ قرض عند الطلب یا اطلاع قریب کی ۱۰ لاکھ رقم غالباً دلالوں کو اس شرط پر قرض دی گئی ہوگی کہ بنک جب چاہے فوراً یا صرف دو ایک روز کی اطلاع دے کر اپنا قرض واپس لے لے۔ چونکہ دلال اس رقم قرض سے ہنڈی کی تجارت کرتے ہیں اور ہنڈیاں ہر وقت فروخت ہو سکتی ہیں اُن کو اس قدر جلد قرض واپس کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، مزید براں اس سخت شرط کی رعایت سے اُن کو سود بھی کم دینا پڑتا ہے۔ اس دس لاکھ رقم کی حالت بھی قریب قریب زرِ نقد کی سی ہے۔ پس نقد بہ صورت اور قرض عند الطلب یا اطلاعِ قریب کی دونوں رقمیں مجموعی طور پر سرمایۂ محفوظ کہلاتی ہیں۔ اس سرمایے سے مُراد وہ رقم ہے جو چک ادا کرنے کے واسطے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ سرمایۂ محفوظ سے کچھ روپیہ، جو روزمرّہ کے چک ادا کرنے کے واسطے باہر رہتا ہے، بنک کا گلّہ کہلاتا ہے۔ انگریزی داں ناظرین کے واسطے یہاں ایک نکتہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اکثر بنکوں کے حساب میں دو اصطلاحیں نظر آتی ہیں ایک ریزرو فنڈ جس کو ریسیٹ بھی کہتے ہیں اور دوسری محض ریزرو۔ واضح ہو کہ ریزرو فنڈ یا ریسیٹ سے مُراد اندوختہ ہے اور ریزرو سے سرمایۂ محفوظ۔ گلّہ جس کو انگریزی اصطلاح میں ٹِل منی کہتے ہیں سرمایۂ محفوظ کا ایک جزو ہوتا ہے جو روزمرّہ کام آتا ہے باقی رقم احتیاطاً آڑے وقت کے لیئے محفوظ رکھی جاتی ہے تیسری مد کو چھوڑ کر آخری دو مدوں کو پہلے سمجھانا مناسب معلوم ہوتا ہے تبدیل اصل کی ۵۰ لاکھ وہ رقم ہے جس سے کارخانوں کے حصّے یا سرکاری رقعے خریدے گئے اُن پر بمقدارِ معیّن سود وصول ہوتا رہتا ہے اور بوقتِ ضرورت یہ بھی فروخت ہو سکتے ہیں، بنک گھر کا ۷ لاکھ روپیہ بنک کی زمین اور عمارت اور سامان کی قیمت ہے اب

بٹہ کٹی ہنڈیوں اور قرض بضمانت کی سب سے بڑی مدد لیجئے جس میں ۵۰ لاکھ روپیہ لگا ہوا ہے۔

بنک بٹہ کاٹ کر ہنڈیاں خرید تے ہیں اور چونکہ ہنڈیاں ہر وقت فروخت ہو سکتی ہیں ان کی تجارت بھی بنکوں کو بہت مرغوب ہے۔ مالی ضمانت لے کر معتبر لوگوں کو روپیہ بھی قرض دیا جاتا لیکن عجیب وغریب طریق سے یعنی بنک قرض خواہوں کو اپنے نام بمقدار قرض صرف چک لکھنے کا حق دے دیتے ہیں جن کو زرِ نقد میں ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے حتے کہ زر قرض وصول ہو جاتا ہے۔ ایسے قرضداروں کا چک لوگ اس وجہ سے لیتے ہیں کہ وہ معتبر بنک کے نام لکھا ہوتا ہے اور بنک سے چک کا زرِ نقد لینے کی عجلت نہیں گویا کہ بنک قرض خواہوں کو صرف اپنا اعتبار قرض دے دیتے ہیں جو کہ زرِ نقد کا کام دیتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک نہایت عجیب اور پیچیدہ طریق لین دین کا ہے جو غور کیئے بغیر سمجھ میں آنا دشوار ہے۔ بنک کے قرض کی ہم اس سے قبل بھی چک کے تحت میں تشریح کر چکے ہیں۔

اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بنک خواہ دلالوں کو عند الطلب قرض دے یا دوسرے لوگوں کو میعادی قرض دے یا بٹہ کاٹ کر ہنڈی خریدے بہرصورت زرِ نقد دینے کی بجائے وہ صرف چک لکھنے کا حق دے دیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ ہوتے ہی رقم بنک کے چٹھے میں جانب چپ یا خرید ہنڈی کی مد میں شامل ہو جاتی ہے۔ گویا کہ بنک نے زرِ نقد ادا کیا اور جانب راست بھی وہ مقدار اں شمار ہو جاتی ہے گویا کہ پانے والے نے زرِ نقد بنک میں جمع کیا۔ حالانکہ درحقیقت اُس وقت نہ کوئی زرِ نقد دیا جاتا ہے اور نہ جمع کیا جاتا ہے صرف اندراج ہی اندراج ہے لیکن بنک کے اعتبار سے بھی زرِ نقد ہی کا سا کام نکلتا ہے اور مدتوں یہ رقمیں محض فرضی رہتی ہیں حتے کہ قرض دار اپنا قرض بنک کو ادا کر دے یا ہنڈی پٹ جائے یا فروخت کر دی جائے۔

مندرجۂ بالا چٹھے میں رقوم واجب الادا اور واجب الوصول حسب ذیل

نظر آتی ہیں:-

	لاکھ		لاکھ
شرکا یا حصہ داران	۳۰	نقد بدست	۴۳
گاہک	۲۵۰	شغل اصل	۵۰
		بنک گھر	۷
		قرض گاہکوں کو	۱۸۰
	۲۸۰		۲۸۰

گاہکوں کو ۲۵۰ لاکھ واجب الادا ہے گویا کہ یہ کُل رقم انھوں نے بنک میں جمع کی ہے لیکن ساتھ ہی ۱۸۰ لاکھ اُن سے بنک کو واجب الوصول بھی ہے گویا کہ بنک نے یہ کُل رقم اُن کو قرض دی ہے لیکن بنک قرض بشکل زرِ نقد کم دیتا ہے اور رقم قرض ہر دو جانب درج کر دیتا ہے گویا کہ کُل رقم بنک نے بشکل زرِ نقد دی اور قرض گیر نے وہی رقم بنک میں بمد روپیہ جمع کر دی پس معلوم ہوا کہ بمدِ امانت و سوال ۲۵۰ لاکھ کی جو رقم دکھا دی گئی ہے اس میں سے صرف (۲۵۰ – ۱۸۰) ۷۰ لاکھ تو نقد جمع کی گئی ہے اور باقی ۱۸۰ لاکھ وہ رقم ہے جو بنک نے قرض دے کر دونوں جانب درج کر دی سوائے اعتبار کے اُس وقت تک اس رقم کا کوئی وجود نہیں جب تک کہ وہ قرض داروں سے وصول نہ ہو جائے یا ہنڈیاں نہ پٹ جائیں کیسے تعجب کی بات ہے کہ بنک کے پاس کُل (۳۰ + ۷۰) ۱۰۰ لاکھ روپیہ بشکل زرِ نقد موجود ہے، ۴۳ لاکھ تو بطورِ نقد بدست بیکار پڑا رہتا ہے، ۷ لاکھ بنک گھر کی قیمت ہے اور صرف ۵۰ لاکھ کاروبار میں لگتا ہے لیکن اس سے (۱۸۰ + ۵۰) ۲۳۰ لاکھ کا کام نکلتا ہے اور دو لاکھ منافع حاصل ہوتا ہے جو کہ ۱۸ لاکھ اصل پر حصہ داروں میں بشرح ۱۱ فی صدی تقسیم ہوگا یا اگر حصہ دار کچھ کم منافع مثلاً ۸ فی صدی لینا قبول کریں تو باقی رقم اندوختے میں شامل ہو جائے گی اور وہ بھی حصہ داروں ہی کی ملک ہے گاہکوں کو مدِ امانت کی رقم پر جو سود دیا گیا ہوگا وہ اس دو لاکھ کے منافع سے خارج ہے۔

نوٹ چک ہنڈی یا سرکاری رقعے اور کارخانوں کے حصے

۴۔ نوٹ کیا ہے؟ سرکار یا کسی کی طرف سے تحریری وعدہ کہ اس کا حامل جب چاہے نوٹ کے معاوضے میں رقم مندرجہ نقد یعنی بشکل زر فلزاتی وصول کر لے جب کہ لوگوں کو وعدے پر اعتبار ہوتا ہے تو زر فلزاتی کی مانند نوٹ بلا تکلف لین دین میں چلتا ہے اور مدتوں تک معاوضے میں زر نقد کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ نوٹ کے انتقال میں توقیع کی ضرورت نہیں ہوتی ہے تاہم زیادہ قیمتی نوٹوں کی پشت پر صرف دینے والے کے دستخط کرا لیے جاتے ہیں، نوٹ کی حالت قریب قریب سکے کی سی ہے یعنی کہ اس کو ابتدائی قسم کا زر وضعی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر کچھ سود نہیں ملتا۔ لہذا لوگ صرف بقدر ضرورت نوٹ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ باقی کسی بنک میں بمد امانت داخل کر کے ان پر سود وصول کرتے ہیں۔ نوٹ میں سہل اور معین رقوم درج ہوتی ہیں۔ مثلاً پانچ دس پچاس اور سو روپے جب کہ کسی کو بہت سی رقمیں ادا کرنی پڑتی ہوں تو ان کی مقداریں بھی مختلف ہوں گی مثلاً ۷۔ ۱۱ یا ۱۲ روپے ۹ آنے ۲ پائی۔ ایسی رقموں کی ادائی بذریعہ نوٹ دقت طلب ہے یعنی کچھ نوٹ اور کچھ زر فلزاتی دینا ضروری ہے پس روزمرہ کے خرچ کے نوٹ بھی لوگ بنک میں بطور رواں جمع کرنا پسند کرتے ہیں تاکہ جتنی رقم درکار ہوئی اسی کا چک بنک کے نام لکھ دیا اور چک پانے والے نے رقم مندرجہ بنک سے وصول کر لی۔ انہیں بھی ہر ترقی یافتہ ملک میں نوٹوں کی بڑی تعداد [illegible]

چک بنک کے نام ایک تحریری حکم ہے جو اس کے لکھنے والے کی طرف سے رقم مندرجہ اس کے حامل کو ادا کرے۔ کبھی حامل کا نام درج کر دیا جاتا ہے اور کبھی نہیں پہلی قسم کا چک اصطلاحاً نام جوگ اور دوسری قسم کا دھنی جوگ کہلاتا ہے۔ اگر لکھنے والا اور بنک جس کے نام چک لکھا جائے پورے طور پر معتبر ہو تو چک نوٹ کے ہم پلہ ہو جاتا ہے اگر فرق ہے تو صرف اس قدر چک کی رقمیں نوٹوں کی مانند معین نہیں، ہر ایک رقم چک میں درج کی جا سکتی ہے لیکن ہر شخص اور بنک کی حالت سے پورا پورا واقف ہونا نہایت دشوار ہے ممکن ہے کہ چک لکھنے والے کا بنک میں اب کچھ جمع نہ ہو یا رقم مندرجہ چک اس کی جمع کردہ رقم سے زیادہ ہو یا بنک کا

دلوا نکل جائے، بہرصورت چک پانے والے کو بہت دقت اور حیرانی اُٹھانی پڑے گی پس چک اُسی ملک میں چل سکتا ہے جہاں عوام بیدار و روشن خیال ہوں اور کاروبار میں ایمان داری برتیں۔ چک کی انھیں کمزوریوں کی وجہ سے اس کو زرِ قانونی قرار نہیں دیا جاتا یعنی کوئی لین دار چک لینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اگر وہ چاہے تو رقم واجب الوصول زرِ قانونی میں طلب کرسکتا ہے۔ چوں کہ نوٹ سرکار یا باجازت سرکار کوئی معتبر بنک جاری کرتا ہے اُن کو زرِ قانونی کا رتبہ حاصل ہے۔ پس چک نوٹ کی مانند بطورِ زر نہیں چلتا۔ اگر خرچ کی ضرورت ہو تو چک پانے والا بنک سے رقم مندرجہ بشکلِ زرِ قانونی وصول کرے گا ورنہ چک بمدِ امانت یا رواں اپنے بنک میں جمع کردے گا اور بوقت ضرورت اپنے لیئے نیا چک لکھ کر جتنی رقم درکار ہوگی بنک سے لیتا رہے گا یا دوسرے کے لیئے چک لکھ کر بنک سے اس کو زر دلوادے گا۔ چک کی قمیں بیشتر بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے اُدھر گھومتی رہتی ہیں اُن کو بشکلِ زرِ نقد ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور چک بہت کم مثلِ نوٹ دست بدست گھومتا ہے ؛

ہنڈی کسی شخص کی طرف سے جس کو لکھنے والا کہتے ہیں دوسرے شخص کے نام جو پانے والا کہلاتا ہے ایک تحریر ہوتی ہے کہ فلاں رقم شخص اول الذکر کی آخر الذکر پر واجب الوصول ہے شخص دوم اس پر لفظِ قبول اور اپنے دستخط لکھ کر اس کی تصدیق کردیتا ہے۔ ہنڈی میں اکثر اُس مال کی قیمت درج ہوتی ہے جو لکھنے والا پانے والے کے ہاتھ فروخت کرے۔ اب اگر لکھنے والا چاہے تو وقتِ معینہ پر رقم مندرجہ خود وصول کرے یا اس سے قبل بطریقِ توقیع وہ کسی دوسرے کے ہاتھ ہنڈی فروخت کرکے اپنے دام جلد وصول کرلے ہنڈی کا خریدار رکھنے والا کہلاتا ہے اور اُس کو بھی لکھنے والے کی طرح پانے والے سے رقمِ مندرجہ وصول کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے ؛

ہنڈی عند الطلب اور چک یکساں ہیں اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ

چک صرف بنک کے نام لکھا جاتا ہے اور ہنڈی تجار کے نام بھی لکھی جاتی ہے۔ میعادی ہنڈی پر البتّہ سود ملتا ہے لیکن قبل از وقت ادائی فروخت کرنے پر اُن کی رقم مندرجہ میں سے بٹّہ کٹ کر قیمت ملتی ہے۔ ہنڈی کی اصلی غرض میعادی ہنڈی سے بدرجۂ اولیٰ پوری ہوتی ہے اور اسی قسم کی ہنڈیاں بہت زیادہ رائج ہیں۔

قرضِ عامّہ کے سرکاری تمسّک اور کارخانوں کے حصّے آج کل مثل ملک و جائداد بکثرت فروخت ہوتے ہیں اُن کے مالکوں کو سود بشرح معیّن یا غیر معیّن ملتا ہے اور جو لوگ کاروبار یا ریاست کے بکھیڑوں میں پڑنا پسند نہ کریں وہ ایسی چیزوں میں اپنا روپیہ لگا کر آمدنی کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔

حساب گھروں اور صرّافوں میں جا کر دیکھئے تو خدا کی قدرت نظر آئے گی کہنے کو تو اربوں روپے کا روزانہ کاروبار ہوتا ہے مگر وہاں کاغذ کے پرزوں کے سوائے ایک پیسہ نظر آئے تو ہمارا ذمہ۔ آج کل کے کل طریق کاروبار اعتبار پر ہیں اگر اعتبار اُٹھ جائے تو وہ تلاطم برپا ہو کہ دیکھا چاہیئے مگر چونکہ اعتبار میں سب کا فائدہ ہے طرح طرح کے رسم و رواج اور قوانین سے ایسی مضبوط بنیاد کی ہے کہ اعتبار بہت مستحکم نظر آتا ہے حتّٰی کہ موجودہ جنگ یورپ بھی اس کو کوئی قابلِ لحاظ صدمہ نہیں پہنچا سکی اس کا رسوخ دنیا میں برابر قائم ہے۔

بابِ بست و ہفتم

قدرِ زر و مسئلۂ گرانی

(۱) زر کے کام (۲) قیمتِ اشیا اور قدرِ زر کا تعلق (۳) انڈکس نمبر (۴) مسئلۂ مقدارِ زر (۵) چاندی سونے کی قدر و قیمت (۶) رسد و طلبِ زر (۷) اضافۂ مقدارِ زر کے نتائج (۸) سونے کی پیداوار

زر کے کام

۱۔ اس سے قبل بھی جابجا زر کا بیان آچکا ہے۔ یہاں زر کے متعلق سب سے پیچیدہ اور نازک بحث یعنی مسئلۂ قدرِ زر پیش کرنا مقصود ہے۔ اس غرض کے لیے اوّل زر کے کاموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ زر سے چار کام متعلق مانے جاتے ہیں۔ سب سے اوّل وہ آلۂ مبادلہ ہے یعنی اس کے وسیلے سے خرید و فروخت ہوتی ہے۔ دوم وہ معیارِ قدر ہے یعنی اس کے حوالے سے چیزوں کی باہمی قدر مقرر ہوتی ہے۔ سوم وہ خزینۃ القدر ہے یعنی لوگ اس کو بطورِ اندوختہ محفوظ رکھتے ہیں۔ چہارم مستقبل داد و ستد بھی اسی کے حوالے سے بوقتِ حاضر قرار پاتے ہیں۔ مثلاً ملازموں کی تنخواہ مکانات کا کرایہ زمینوں کا لگان پہلے ہی سے چھ ماہ یا سال کے واسطے بشکلِ یک رقم معین کر دیا جاتا ہے۔ جب سے معاشی ترقیات کی بدولت، کاروبار میں اعتبار کا دخل بڑھا چوتھے کام کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ پس ماندہ ممالک میں بیشتر کاروبار عین وقت پر نقد ہوتا ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں اعتبار کا وہ زور بندھا ہے کہ کروڑوں بلکہ اربوں روپے کے لین دین پہلے ہی سے سالہا سال مستقبل کے واسطے قرار پا جاتے ہیں

گویا کہ زر کی قدر معین ہے کہ وقت گزرنے سے اس میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوتا اور اس کی جو قدر آج ہے دو چار۔ دس پانچ سال بعد بھی وہی رہیگی اور لہذا زر کی مستقبل داد وستد موجودہ قدر کے بموجب اس وقت قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں اس وقت جو قدر ہے آئندہ برقرار رہے گی نہ اسمیں اضافہ ہوگا نہ تخفیف۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ زر کے پہلے کام کے واسطے اسمیں مقبولیت کی صفت لابد ہے یعنی اگر لوگ بخوشی کسی چیز کو مبادلے میں قبول کرنے لگیں تو وہ من حیث زر آلۂ مبادلہ کا کام دے گی۔ اور جب کل چیزیں بمعاوضۂ زر خرید و فروخت ہونے لگیں تو ان کی باہمی قدر بھی بوسیلۂ زر قرار پائے گی مثلاً اگر سیر بھر گھی چار سیر شکر دس سیر گیہوں اور ۱۶ سیر نمک کی جدا جدا قیمت ایک روپیہ ہو تو یہ سب چیزیں آپس میں ہمقدر شمار ہوں گی۔ پس ثابت ہوا کہ زر آلۂ مبادلہ کا کام کرتے کرتے معیار قدر کا کام دینے لگتا ہے اور ان دونوں کاموں کے واسطے اس میں مقبولیت کی صفت ناگزیر ہے۔ سونا جس کی مقبولیت عالمگیر ہے بطریق احسن ان دونوں کاموں کو سرانجام دے رہا ہے۔ اب رہے زر کے باقی دو کام کہ وہ خزینۃ القدر بھی بنتا ہے اور اس کے حوالے سے مدتوں پہلے بے شمار مستقبل داد وستد قرار پاتے ہیں ان کے واسطے زر میں ثبات قدر کی صفت درکار ہے یعنی اس کی قدر ہمیشہ یکساں رہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نمودار نہ ہو ایک روپے کی قدر آج بھی وہی ہو جو دس بیس سال قبل تھی اور آئندہ بھی وہی برقرار رہے۔

ذیل کی تفصیل سے واضح ہوگا کہ اگرچہ مقابلتہً زر طلائی میں ثبات قدر کی صفت بدرجۂ اعلیٰ پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی اس کی قدر کو کامل ثبات حاصل نہیں اس میں رد و بدل ممکن ہے بلکہ عرصے سے مسلسل تخفیف جاری ہے۔ البتہ یہ غنیمت ہے کہ تبدیلی اس قدر آہستگی سے عمل میں آتی ہے کہ کہیں سال ہا سال بعد اس کا اثر قابل لحاظ محسوس ہوتا ہے۔ پس بلحاظ دو چار سال کے تو زر طلائی کو ثابت القدر شمار کرنا کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن

دس بیس برس کے عرصے میں اس کی قدر پر عدم ثبات کا نقص ضرور عائد ہوتا ہے اور اس میں تغیر نمایاں ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ مسلّم ہے کہ زر طلا کو جس حد تک بھی ثباتِ قدر حاصل ہے کسی دوسری چیز کو اتنا بھی حاصل ہونا دشوار ہے۔

قیمت اشیا اور قدرِ زر کا تعلق

۴۔ اصطلاح قدر کا مفہوم اس سے قبل مسئلۂ قیمت کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ کسی چیز کی قدر سے مراد دوسری چیزوں کی وہ مقداریں ہیں جو اس کے مبادلے میں دستیاب ہو سکیں مثلاً اگر دس سیر گیہوں چھ سیر دودھ چار سیر شکر اور سیر بھر گھی کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو سکے تو یہ سب آپس میں ایک دوسرے کی قدر شمار ہوں گے۔ لیکن زر کی وہ مقدار جو مبادلے میں لی دی جائے اصطلاحاً اس چیز کی قیمت کہلائے گی مثلاً اگر مذکورۂ بالا اشیا میں سے ہر ایک کا ایک روپے سے مبادلہ ہو سکے تو روپیہ انہیں سے ہر ایک کی قیمت شمار ہوگا۔ گویا کسی چیز کی قیمت اس کی وہ قدر ہے جو معیارِ زر قرار پائے جب کہ کسی چیز کا زر سے مبادلہ ہو۔ زر تو اس چیز کی قیمت کہلایا، لیکن وہ چیز بحوالۂ زر کیا کہلانی چاہیئے، اس کو بھی اصطلاحاً قدرِ زر سے تعبیر کریں گے۔ مثلاً اگر گیہوں کا نرخ ۴ روپے من ہو تو ۴ روپے ایک من کی قیمت کہلائیں گے اور ایک من چار روپے کی قدر شمار ہوگا اب قیمتِ اشیا اور قدرِ زر کے تعلق پر غور کیجیئے۔ جب چیزیں ارزاں ہوں گی یعنی اُن کی جو پہلے قیمت مقرر تھی وہ قیمت گھٹے گی تو زر کی قدر میں اضافہ ہوگا اس کے برعکس جب چیزیں گراں ہوں یعنی اُن کی قیمت میں اضافہ ہو تو زر کی قدر گھٹ جائے گی۔ اوپر کی مثال میں ایک من گیہوں کی قیمت ۴ روپے اور ۴ روپے کی قدر ایک من گیہوں تھے ۔ فرض کرو کہ گیہوں ارزاں ہو کر ۴ روپے کی بجائے ۳ روپے من فروخت ہونے لگیں تو اب تین روپے کی وہی قدر ہوئی جو پہلے ۴ روپے کی تھی یعنی ایک من گیہوں اور موجودہ چار روپے کی قدر بجائے ایک من کے ۱⅓ من ہوگی۔ گویا ارزانی کی بدولت قدرِ زر میں ۳۳ فی صدی اضافہ نمودار ہو گیا۔ اور اگر گیہوں گراں ہو کر ۵ روپے من فروخت ہوں تو موجودہ ۵ روپے

سابق ۴ روپے کے ہم قدر ہوں گے اور موجودہ ۴ روپے کی قدر ۱۶ من یعنی ۳۲ سیر گیہوں رہ جائیں گے گویا کہ گرانی کے ہاتھوں قدر زر ۲۰ فی صدی گھٹ جائے گی پس ثابت ہوا کہ قیمت اشیا اور قدر زر کے باہم نسبت معکوس قائم ہے ایک کے گھٹنے بڑھنے سے دوسری میں اضافہ و تخفیف پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں گویا ایک ترازو کے دو پلڑے ہیں ایک کے جھکنے سے دوسرے کا چڑھنا لازمی ہے اور چڑھنے سے جھکنا۔

آج کل بے شمار چیزوں کی خرید و فروخت جاری ہے اُن کی قیمتوں میں لگاتار عارضی اور دیرپا تغیر و تبدل ہوتے رہتے ہیں کبھی ارزانی یا گرانی صرف چند روز یا ہفتوں کے لیے نمودار ہوتی ہے تو کبھی برسوں قائم رہتی ہے اور پھر یہ نہیں کہ ایک وقت کل چیزوں کی قیمت میں ایک سی ہی تبدیلی نمودار ہو بلکہ سینکڑوں ارزاں ہوتی ہیں تو ہزاروں گراں اور سینکڑوں گراں تو ہزاروں ارزاں۔ غرض کہ قیمت اشیا کی تبدیلیاں حد حساب سے باہر ہیں۔ اور ہر ایسی تبدیلی سے قدر زر میں تبدیلی معکوس لازم آتی ہے گویا گرانی و ارزانی سے قدر زر میں بھی بے شمار تخفیف اور اضافے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ایک چیز کے جداگانہ حوالے سے قدر زر کی حالت مختلف نظر آئے گی کہیں اضافہ اور کہیں تخفیف اور پھر اُن کے بے شمار مدارج اور جب چیزیں کثیر التعداد ہوں تو قدر زر کی مجموعی حالت کا پتہ چلانا اہتمام طلب ہے۔ قدر زر کے تخمینہ کرنے کا طریق ہم مختصراً بیان کرتے ہیں:۔

۳۔ کسی معاملے کے متعلق اعداد و شمار فراہم کر کے اُن کے اوسط اور تخمینے نکالنا اور معاشی قوانین و اصول اُن کے ذریعے سے تحقیق کرانا یا جانچنا ایک نہایت وسیع اور مہارت طلب معاشی فن ہے جس کو انگریزی میں اسٹےٹسٹکس کہتے ہیں۔ اس کا اُردو نام علم الاعداد ناموزوں نہ ہوگا۔

اس کام کے واسطے کل ترقی یافتہ ممالک میں خاص محکمے قائم ہیں، قیمت، اجرت، پیداوار درآمد، برآمد اور ایسے ہی کل ضروری معاملات کے متعلق اعداد و شمار تیار کرا کے محفوظ رکھے جاتے ہیں اور پھر اُن سے

کام لے کر نہایت ضروری اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں یوں تو مدت سے یہ کام تھوڑا بہت جاری ہے لیکن تھوڑا عرصہ ہوا کہ پورے انتظام کے ساتھ ایک جدا محکمہ قائم کر دیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً عوام کی آگاہی کے واسطے اپنی تحقیقات کی مفصل رپورٹ شائع کرتا رہتا ہے۔ اس فن کے بہت سے اصول و قواعد ہیں اور ان میں سے اکثر تفصیل طلب ہیں چنانچہ ان کے متعلق جو ضخیم کتابیں موجود ہیں بوجہ قلت گنجائش ہم ان کے تذکرہ بیان سے مجبور ہیں۔ یہاں پر صرف ایک خاص چیز انڈکس نمبر کی تشریح مقصود ہے جس کے ذریعے سے ہر قسم کی تبدیلیوں کا آسانی پتا چل جاتا ہے۔ اس کے بنانے کے اصول تو بھی بجائے خود بہت کچھ بحث طلب ہیں جن کو ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ یہاں پر انڈکس نمبر کی ایک سادہ مثال پیش کی جاتی ہے جس میں قدر زر کا مجموعی تغیر و تبدل صاف نظر آ جائے گا۔

فرض کرو ہم کو یہ دریافت کرنا مقصود ہے کہ گزشتہ ۱۵ سال کے اندر قدر زر میں کیا تغیر نمودار ہوئی۔ بطریق ذیل ایک انڈکس نمبر تیار کرنے پر یہ امر قابل اطمینان حد تک تحقیق ہو جائے گا۔ چند ایسی چیزیں جن کی طلب عام ہے مثلاً گیہوں، روئی، شکر، نمک، گوشت، گھی لو۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ان کی قیمت کا جو اوسط رہا ہو اس کو ۱۰۰۔۔۔۱۰۰ فرض کرو اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں انکی قیمتوں کا جدا جدا اوسط لو سنہ ۱۹۱۰ء کی قیمتوں کے اوسط کا سنہ ۱۹۱۵ء کے اوسطوں سے مقابلہ کرو اور چونکہ اوسط اول الذکر ۱۰۰۔۔۔۱۰۰ فرض کیے جا چکے ہیں آخر الذکر اوسطوں کو ان کے حوالے سے بطریق فی صدی ظاہر کرو مثلاً گیہوں کی قیمت کا اوسط سنہ ۱۹۰۰ء میں ۴ روپیہ من تھا جو کہ ۱۰۰ فرض کر لیا گیا تو اگر گیہوں کی قیمت کا اوسط سنہ ۱۹۱۰ء میں ۵ روپیہ من ہو تو حوالہ پہلے اوسط کے دوسرا اوسط ۱۲۵ فی صدی شمار ہوگا اور اگر سنہ ۱۹۱۵ء میں اوسط ۳ روپیہ من رہ جائے تو وہ ۷۵ فی صدی دکھایا جائے گا۔ یہی طریق دوسری چیزوں کے اوسطوں کے مقابلے میں برتا جائے گا۔ فرض کرو

حصۂ چہارم
باب بست ہفتم

کہ نتیجہ حسب ذیل ہی نکلے:۔

	سنہ۹۱۰ء	سنہ۱۹۱۵ء
گیہوں	۱۰۰	۱۳۰
روئی	۱۰۰	۱۴۰
شکر	۱۰۰	۱۲۵
نمک	۱۰۰	۹۰
گوشت	۱۰۰	۹۵
گھی	۱۰۰	۱۲۰
	۶۰۰	۷۰۰

دونوں سال کے اوسطوں کے مجموعوں کا مقابلہ کرنے سے واضح ہوگا کہ قیمت میں بقدر (۷/۶ - ۱) ۱/۶ یا ۱۶ ۲/۳ فی صدی اضافہ ہوگیا اور قدر روپے میں (۱ - ۶/۷) ۱/۷ یا ۱۴ ۲/۷ فی صدی تخفیف ہوگئی؛

لیکن صاف ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا اشیاء میں مقابلۃً بعض کی طلب زیادہ ہے اور بعض کی کم۔ مثلاً گیہوں دس لاکھ روپے کے فروخت ہوں روئی ۷ لاکھ کی۔ شکر۔ گھی۔ گوشت۔ اور نمک علی الترتیب ۵۔ ۴۔ ۳۔ اور ایک لاکھ کے۔ ان کی قیمتوں کی باہمی نسبت اُن کا **وزن** کہلاتی ہے۔ مثلاً نمک ایک لاکھ کا فروخت ہوا۔ اب اگر اس کا وزن ایک فرض کیا جائے تو گیہوں۔ روئی۔ شکر۔ گھی اور گوشت کے وزن علی الترتیب ۱۰۔ ۷۔ ۵۔ ۴ اور ۳ ہوگئے۔ اب ان میں سے ہر ایک کے وزن کو اُس کے سنہ۱۹۱۵ء کی قیمت کے اوسط سے ضرب دو اور حاصل ضربوں کے مجموعے کو ان وزنوں کے حاصل جمع سے تقسیم کردو تو حاصل تقسیم سنہ۱۹۱۵ء کی قیمتوں کا مجموعی اوسط ہوگا۔ اور یہ اوسط پہلی مثال کے اوسط سے زیادہ صحیح ہوگا۔

	سنہ ۱۹۱[illegible]ء	وزن	حاصل ضرب
گیہوں	۱۳۰	۱۰	۱۳۰۰
روئی	۱۴۰	۷	۹۸۰
شکر	۱۲۵	۵	۶۲۵
نمک	۹۰	۱	۹۰
گوشت	۹۵	۳	۲۸۵
گھی	۱۲۰	۴	۴۸۰
		۳۰	۳۷۶۰

۱۰۰ کی بجائے قیمت اب $\frac{۳۷۶۰}{۳۰}$ یا ۱۲۵ ہوگئی گویا اس میں ۲۵ فی صدی اضافہ ہوا لیں قدر روپے میں ۲۰ فی صدی تخفیف ہوگئی :-

مثال دوم میں وزن سے کام لیا گیا لہذا اس کی مجموعی اوسط اصطلاحاً وزن شدہ اور مثال اوّل کے غیر وزن شدہ اوسط کہلاتے ہیں ان اوسطوں کو بغرض یاد دہانی ہم پھر پیش کرتے ہیں :-

مطابق غیر وزن شدہ اوسط اضافۂ قیمت ۱۶$\frac{۲}{۳}$ تخفیف قدر روپیہ ۱۴$\frac{۲}{۷}$ فی صدی۔

مطابق وزن شدہ اوسط - اضافۂ قیمت ۲۵ تخفیف قدر روپیہ ۲۰ فی صدی بھی اوسط زیادہ صحیح مانے جاتے ہیں :-

یہ تو انڈکس نمبر کی ایک سادہ مثال ہے ان کے بنانے میں بہت کچھ احتیاطیں اور قاعدے برتے جاتے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اوّل تو جن چیزوں کے اعداد و شمار لیئے جائیں ان کا انتخاب دوم اعداد و شمار معلوم کرنے کے ذرائع، سوم جس وقت کے متعلق اعداد و شمار لیئے جائیں اُس کا تعین چہارم اُن کے اوسط نکالنے کے طریق اور ایسے بہت سے مسائل ہیں جن کا لحاظ کرنا ضروری بھی اور دشوار بھی، بہر حال عمدہ انڈکس نمبر تیار کرنا دشوار کام ضرور ہے لیکن جب کوئی ایسا انڈکس نمبر تیار ہو جاتا ہے تو اُس سے اگر مکمل طور پر نہیں تو کم از کم نہایت قابلِ اطمینان حد تک

چہارم بیست و ہفتم

شدید مطلوبہ کا صاف پتہ چل جاتا ہے۔ آج کل اجرت، قیمت، عمر، امراض وغیرہ کے متعلق انڈکس نمبر شائع کیئے جاتے ہیں:

۴۔ بہرحال قیمت اشیا میں جو کچھ کمی بیشی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے برعکس قدر زر میں جو اضافہ اور تخفیف ہوتی ہے انڈکس نمبر کے ذریعے سے اس کا مجموعی اوسط دریافت ہوسکتا ہے، جیسا کہ ابھی مثال دوم میں اضافۂ قیمت کا اوسط ۲۵ فی صدی اور لہٰذا قدرِ زر کی تخفیف کا اوسط ۲۰ فی صدی نکلا۔ یوں فرداً فرداً چیزیں گراں بھی ہوتی رہتی ہیں اور ارزاں بھی لیکن تحقیق طور پر معلوم ہوا کہ بحیثیت مجموعی ہر ملک میں گرانی بڑھ رہی ہے اور زر کی قدر گھٹتی جاتی ہے۔ اب ایک دشوار سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس عام تبدیلی کے اسباب کیا ہیں۔ اس مسئلے پر بہت ردّ وقدح اور موشگافیاں ہوچکی ہیں، موجودہ عالمگیر گرانی کے اسباب چند در چند ہیں جن میں سے اکثر ہندوستانی گرانی کے تحت میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے یہاں پر ان میں سے صرف ایک یعنی مقدارِ زر کا اثر واضح کرنا مطلوب ہے۔ چونکہ زر معیارِ قدر کہلاتا ہے اور ہر معیار مقرر و معین ہوتا ہے لہٰذا گز کی لمبائی یا من کے وزن کی مانند زر کی قدر بھی ہم معین خیال کرتے ہیں لیکن یہ ایک مغالطہ ہے، غور کرو تو معلوم ہوگا کہ منجملہ اُن بے شمار چیزوں کے جن کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے زر بھی ایک چیز ہے اس میں فرق صرف اس قدر ہے کہ لوگ مبادلے میں اس کو بلا عذر و حجت قبول کرلیتے ہیں لیکن قدر و قیمت زر کی بھی اسی طرح قانونِ طلب و رسد کی پابند ہے جیسے اور کل چیزوں کی یعنی زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹتی ہے اور مقدار گھٹنے سے قدر بڑھتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی ملک کے زر کی مقدار دوگنی سہ گنی کردیجائے تو اس کی قدر میں بیّن تخفیف مثلاً ۲۰×۲۰ فی صدی نمایاں ہوگی۔ چنانچہ زر کی تاریخ میں ایسے مستند واقعات موجود ہیں کہ ادھر زر کی مقدار بڑھی اُدھر اُس کی قدر گھٹی یعنی کثرتِ زر گرانی کا باعث ہوجاتی ہے۔ اس پیچیدہ واقع کی ایک سادہ مثال یہ سمجھنی چاہیئے کہ کسی شخص کے پاس روپیہ جتنا

زیادہ ہوتا ہے اس کی نظر میں روپے کی قدر کم ہو جاتی ہے اور چیزیں خریدنے میں بطور قیمت روپے کی زیادہ مقدار ادا کرنے میں اس کو کوئی بار محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کی یہی حالت ہے۔ وہاں چیزوں کے نرخ بھی اعلیٰ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قحط پڑ رہا ہے اور پھر لوگ بکثرت ان کو خرید بھی سکتے ہیں گویا کہ وہ ارزاں ہیں، اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں چیزوں کے نرخ مقابلۃً ادنیٰ بھی ہوں تو لوگ اُن سے محروم رہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی زندگی ہم کو اپنے قدر زر کے معیار سے نہایت گراں مایہ نظر آتی ہے لیکن ان ممالک کے باشندے اس کو سبک محسوس کرتے ہیں وجہ وہی ہے کہ اُن کی نظر میں زر کی قدر کم ہے اور کم ہونے کا باعث زر کی کثرت ہے۔

یہ واقعہ کہ زر کی مقدار گھٹنے بڑھنے سے اس کی قدر میں کمی بیشی ہوتی ہے اصطلاحاً مسئلۂ مقدار زر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدر زر کا گھٹنا بڑھنا تو عام مشاہدہ ہے لیکن زر چوں کہ معیار قدر مانا جاتا ہے زر کی قدر معین خیال کر کے لوگ ہر ایک تبدیلی چیزوں کی قیمت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک درخت گز بھر بلند ہے اور کچھ عرصے بعد ناپ میں وہ دو گز نکلے تو اس تبدیلی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو گز اپنی سابق حالت پر قائم ہے اور درخت کی بلندی دوگنی ہو گئی یا درخت کی بلندی تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی صرف گز سکڑ کر نصف لمبا رہ گیا اور جو بلندی پہلے ایک گز معلوم ہوتی تھی اب دو گز معلوم ہونے لگی۔ ایسے ہی فرض کرو کسی شخص کا وزن من بھر ہے اب اگر من تو وہی چالیس سیر وزنی رہے لیکن اس شخص کا وزن دو من نکلے تو یقیناً اس کے وزن میں یک چند اضافہ ہو گیا ہو گا لیکن اگر خود من گھٹ کر صرف ۲۰ سیر وزنی ہو جائے تو بھی وہ شخص دو من وزنی معلوم ہو گا اگرچہ اُس کے وزن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا صرف معیار وزن گھٹ گیا۔ لمبائی اور وزن کے معیار تو معین ہیں گز حقیقۃً ۳۶ انچ لانبا ہو گا اور من ۴۰ سیر وزنی لیکن اگر یہ ممکن ہو کہ گز کبھی

حصۂ چہارم
باب بست وہفتم

پھیل کر ۴۰ انچ ہو جائے اور کبھی سکڑ کر صرف ۳۰ انچ رہ جائے تو پھر چیزوں کی لمبائی میں جو فرق نمودار ہو اُس کا اصلی باعث دریافت کرنا کس قدر دشوار ہوگا، معیارِ قدر یعنی زر کا بعینہ یہی حال ہے ارزانی یا گرانی کبھی تو قیمتِ اشیا کے تغیر و تبدل سے نمودار ہوتی ہے اور کبھی محض قدرِ زر کے گھٹنے بڑھنے سے۔ مثلاً کسی چیز کی رسد طلب سے بہت گھٹ بڑھ جائے تو وہ علی الترتیب گراں اور ارزاں فروخت ہوگی لیکن کبھی زر کی کثرت و قلت سے خود زر کی قدر میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چیزیں ارزاں و گراں ہوگئیں۔ چونکہ قیمت اشیا اور قدرِ زر میں نسبت معکوس ہے کسی ایک کی تبدیلی سے دوسرے میں بھی تبدیلی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن یہ دریافت کرنا کہ تبدیلی درحقیقت کس جانب سے نمودار ہوئی دشوار کام ہے۔ زر چونکہ معیار ہے اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے اضافہ و تخفیفِ قیمت کو لوگ عموماً چیزوں کی قلت و کثرت کا نتیجہ قرار دے دیتے ہیں حالانکہ خود اس معیار میں بھی ربر کی طرح گھٹنے بڑھنے کی خاصیت موجود ہے جو اس کی قلت و کثرت سے جو اُس کی قدر میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہے اُس کی وجہ سے چیزیں ارزاں اور گراں فروخت ہوتی نظر آتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ارزانی و گرانی کا باعث کبھی قیمتِ اشیا میں حصر ہوتا ہے اور کبھی قدرِ زر میں۔

زرعی پیداوار ضرور قانونِ تقلیلِ حاصل کی تابع ہے اور مصنوعات قانونِ تکثیرِ حاصل کی پیروی کرتی ہیں۔ کبھی تو یہ چیزیں بوجہ قلت کے بہت بیش قیمت ہو جاتی ہیں مثلاً غلہ یا روئی کی فصل ماری جائے اور ان کا قحط پڑے یا جنگ کی وجہ سے کسی خاص چیز کی طلب بہت بڑھ جائے یا مصنوعات کی تیاری رُک جائے۔ چنانچہ آج کل روئی چمڑے اور رنگ کی علی الترتیب یہی حالت نظر آتی ہے اور کبھی چیزوں کی رسد میں کوئی تخفیف نہیں ہوتی اور نہ طلب میں کوئی خاص اضافہ اور پھر بھی عام طور پر اُن کی قیمتیں چڑھنے لگتی ہیں اور لطف یہ کہ لوگ اُن کو ایسی ہی

حصۂ چہارم
باب بست و ہفتم

سہولت سے خرید تے رہتے ہیں کہ گویا وہ ارزاں ہیں یہ علامت کثرت زر کی ہے اور زر کی قدر گھٹنے سے چیزوں کی گرانی کا دھوکا ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں یہی حالت پھیلی ہوئی ہے؛

اگر غور کرو تو زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹنے کا واقعہ قانونِ طلب و رسد کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ لیکن اس کو سُن کر لوگ اس وجہ سے چونکتے ہیں کہ وہ زر کو معیارِ قدر جانتے ہیں اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے مگر زر ایک عجیب معیار ہے کہ خود بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اوّل اوّل اس واقعے کے سمجھنے میں لوگوں کو طرح طرح کے اُلجھن اور شکوک محسوس ہوئے۔ لیکن جب زر کو بھی بجائے معیار کے ایک معمولی چیز کی حیثیت سے دیکھا تو اس کی قدر کو بھی قانونِ طلب و رسد کا پابند پایا اور مزید براں تجربے سے ثابت ہوا کہ جب کسی ملک کے زر کی مقدار بڑھی اس کی قدر میں کمی و بیش تخفیف بشکلِ عام اضافۂ قیمت ضرور نمودار ہوئی چنانچہ اصولاً اور عملاً مقدارِ زر کا مسئلہ تحقیق ہو گیا اور اب وہ مسلّم شمار ہوتا ہے؛

چاندی سونے کی قدر و قیمت

۵۔ چاندی اور بالخصوص سونے کی قدر و قیمت بہت مستقل مانی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان دھاتوں کو بطور زر استعمال کرنے کا ایک خاص سبب اُنکی ثباتِ قدر و قیمت ہے۔ لیکن غور اور مشاہدے سے واضح ہو گا کہ اگرچہ بمقابلہ اور چیزوں کے اُن کی قدر و قیمت میں کمتر تغیر ہوتا ہے تاہم کامل ثبات اُن کو بھی میسّر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بیسیوں صدی سے دُنیا میں چاندی سونا فراہم ہوتا چلا آتا ہے۔ یہ دونوں دھاتیں بجد دیرپا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی مقدار کثیر جمع ہو چکی ہے اور ہر سال کانوں سے جو نئی مقدار نکلتی ہے وہ موجودہ ذخیرے کا نہایت قلیل جزو ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ دو تین فی صدی، پس سالانہ رسد کا اُن کی مجموعی مقدار پر کوئی قابلِ لحاظ اثر نہیں پڑتا لیکن مثل مشہور ہے قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔ دس بیس سال کے عرصے میں ان سالانہ اضافوں کی مجموعی مقدار اچھی خاصی

ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طلب بھی بڑھنی ضروری ہے۔ لیکن تجربے سے ثابت ہوا کہ رسد کا پلہ پھر بھی بھاری رہتا ہے چنانچہ قانونِ رسد وطلب کے مطابق ان دونوں دھاتوں کی قدر وقیمت میں تخفیف ہو رہی ہے مگر کم و بیش بتدریج چنانچہ چاندی کی آج جو قدر ہے امریکہ دریافت ہونے کے وقت وہ اُس کی چھ گنی تھی اور انقلاب فرانس تک وہ سہ گنی رہی لیکن ایک طرف تو امریکہ اور آسٹریلیا کی نئی کانوں سے اس کی بڑی بڑی مقدار نکلنی شروع ہوئی اور دوسری طرف اکثر ممالک نے اس کو بطور زرِ قانونی استعمال کرنا ترک کر دیا۔ گویا اس کی مقدار بڑھی اور طلب میں خاص کمی ہوئی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی قدر میں عرصے سے مسلسل تخفیف جاری ہے۔
چاندی کی طرح سونے کی بھی امریکہ اور آسٹریلیا میں نئی نئی کانیں نکلیں۔ سونے کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا لیکن نہ اس قدر جتنا کہ چاندی میں۔ دوم یہ کہ چاندی ترک کر کے اکثر ممالک نے سونا بطور زرِ قانونی رائج کیا گویا سونے کی مقدار بڑھی لیکن چاندی سے کم اور ساتھ ہی سونے کی طلب میں بھی خاص اضافہ ہوا۔ پس قدر تو سونے کی بھی گھٹی لیکن نہ اس قدر جتنی کہ چاندی کی۔ پندرہ بیس برس کے اندر اوسطاً دس بارہ فی صدی تخفیف ہوتی رہتی ہے؛
ترقی یافتہ ممالک میں زرِ مستند بطور زرِ قانونی رائج ہے یعنی وہاں کے زر کی قدرِ فلزاتی اور قدرِ قانونی برابر ہوتی ہے۔ پس ایسے ممالک میں زر اور طلا کا بشرحِ معین مبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں قانون ہے کہ جو شخص ایک اونس سونا دار الضرب میں داخل کرے اُس کو مبادلے میں ہمیشہ تین پونڈ، ۱۷ شلنگ ۱۰½ پنس ملیں گے اس سے بہت سوں کو مغالطہ ہوتا ہے کہ سونے کی قیمت مقرر ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی اور ایک معنی میں یہ خیال صحیح بھی ہے لیکن اس تقرر قیمت کا درحقیقت مفہوم یہ ہے کہ سکوں میں بحساب ۳ پونڈ، ۱۷ شلنگ ۱۰½ پنس فی اونس سونا صرف ہوتا ہے پس اگر کوئی چاہے تو سونا دیکر اس کے

حصہ چہارم
باب بست و ہفتم

ہم قدر سکّے نے لے، ۳ پونڈ، ۱۷ شلنگ ۱۰½ پنس کو ایک اونس سونے کی قیمت کی بجائے اُس کے سکّے سمجھنا زیادہ قرینِ حقیقت ہوگا۔ پس جہاں زرِ مستند رائج ہے وہاں سونے اور سکّے میں بہت قریبی تعلق ہے جو کوئی چاہے اپنے سونے کے ہم وزن سکّے تیار کرا سکتا ہے مصارفِ سکّہ سازی برائے نام ہوں گے اس صورت میں سونے اور زر کی قدر ایک سطح پر رہتی ہے اور مقدارِ طلا بڑھنے کا زر کی قدر پر براہِ راست وہی اثر پڑتا ہے جو مقدارِ زر بڑھنے کا اور اس کی وجہ وہی سونے کے ہم قدر سکّے بنوانے کی سہولت ہے۔

سونے کے صرف سکّے ہی نہیں ڈھلتے بلکہ اس سے بے شمار کام لئے جاتے ہیں جو حسبِ ذیل چار مدوں میں ترتیب پا سکتے ہیں دفینہ۔ زیور و سامان سکّے اور بنکوں کا سرمایہ محفوظ سونے کے پہلے دو مصرف اس کی قدر کو گھٹنے سے روکتے ہیں لیکن سونا سکّے بن کر اکثر اپنی اور زر کی قدر کم کر دیتا ہے اور سرمایۂ محفوظ میں پہنچ کر تو وہ زر کی مقدار اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ دونوں کی قدریں کم و بیش تخفیف ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

پس ماندہ ممالک میں اب تک سونے کی بڑی بڑی مقداریں بطورِ دفینہ رکھنے کا رواج ہے جس کے وجوہات کی بحث سے ہم اس وقت معذور ہیں یہاں صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ اس رواج سے اضافۂ رسد کا اثر ضعیف ہو جاتا ہے سونے کی مقدار جو کان سے نکلتی ہے وہ پھر زمین میں دفن کر دی جاتی ہے اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا گویا کہ وہ مقدار پیدا ہی نہیں ہوئی۔ البتہ جب کبھی سونا دفینوں سے نکلے گا تو اس کا نتیجہ ضرور بشکل اضافۂ رسد نظر آئے گا۔ سونے کا زیور اور سامان بھی بکثرت تیار ہوتا ہے، اس کا اثر اضافۂ طلب ہے جو سونے کی قدر گھٹنے سے روکتا ہے مشرقی ممالک میں خاص طور سے سونا بطورِ دفینہ و زیور استعمال ہوتا ہے، یورپ اور امریکہ والے سونے کو

حصّہ چہارم باب بست وہشتم

دفینوں میں نہیں ڈالتے لیکن اس سے زیور اور سامان ضرور تیار کرتے ہیں، ان دونوں استعمالوں نے رسد گھٹا کر اور طلب بڑھا کر سونے کی قدر بہت کچھ سنبھال رکھی ہے، اگر سونے سے یہ کام نہ لیئے جاتے تو اس کی قدر بہت زیادہ گھٹ چکی ہوتی جب ہی امریکہ میں نئی کانوں سے سونا نکلنا شروع ہوا کیپ آف گوڈ ہوپ ہو کر یورپ وامریکہ سے ہندوستان آنے کا راستہ دریافت ہوا۔ ان دھاتوں کی ہندوستان میں بہت مانگ تھی اور ان سے بیشتر وہی دو کام لیئے جاتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے پس مدتوں یورپ والے امریکہ سے دھاتیں ہندوستان بھیجتے اور ہندوستان کی پیداوار معاوضے میں لیتے رہے اگر نئے سونے چاندی کی ایک مقدار کثیر ہندوستان یوں جذب نہ کرتا تو یورپ وامریکہ میں اس کی قدر خدا جانے کس قدر کم ہو جاتی، طلا جذب کرنے کی خاصیت اب تک ہندوستان میں نمایاں ہے، تخمینہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان گزشتہ ۲۰ برس کے اندر ہندوستان نے بشکل دفینہ وزر وسامان تقریباً دو ارب روپیہ قیمتی سونا جذب کیا اور یہ مقدار اسی عرصے میں نکلے ہوئے سونے کی مجموعی مقدار کی ۱۵ فی صدی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیداوار کا کس قدر حصّہ اس طرح پر کل ممالک میں جذب ہو جاتا ہوگا۔ تخمینہ کیا گیا کہ سنہ ۱۹۰۷ء میں سالانہ پیداوار کا ایک تہائی سونا صرف زیور اور سامان میں صرف ہوا اور دفینے جدا رہے ایک اور تخمینے سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان گزشتہ ۲۱ سال میں امریکہ۔ یورپ اور ہندوستان میں جس قدر سونا بڑھا اُس میں سے ۲/۵ دفینوں اور زیور میں جذب ہو گیا، باقی سکوں اور سرمایۂ محفوظ میں کام آیا؛

رسد و طلب زر

۶۔ سونا صرف ہونے کی دو مدیں یعنی دفینہ اور زیور و سامان سونے کی رسد کا اثر ضعیف کر کے اور طلب بڑھا کر اس کی قدر میں تخفیف ہونے سے روکتی ہیں۔ لیکن اس کے باقی دو مصرف یعنی زر اور سرمایۂ محفوظ کا سونے

اور خود زر کی قدر پر کیا اثر پڑتا ہے اس کی اب ہم تشریح کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جن کو کاروبار چلانے کے واسطے زر درکار ہے سونے کے سکے سرکاری دارالضرب میں ڈھلوا لیتے ہیں۔ یعنی سونا داخل کر کے بشرح معین سکے لے لیتے ہیں۔ مثلاً انگلستان میں ایک اونس سونے کے ۳ پونڈ ۷ اشلنگ ۱۰½ پینس ملتے ہیں جب کاروبار کی گرم بازاری ہوتی ہے خرید و فروخت کے واسطے زیادہ زر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور سونے کی ایک مقدار زر کی شکل اختیار کر لیتی ہے؛

مقدار زر بڑھنے کی ایک شکل تو اوپر بیان ہوئی۔ لیکن جب سے بنک قائم ہوئے اور نوٹ اور چک نے رواج پایا اضافۂ زر میں بے حد سہولت ہو گئی صرف بقدر ۲۰ × ۲۰ فی صدی سونا بطور سرمائیہ محفوظ رکھا اور نوٹ یا چک جاری کر دیئے اور اُن کے اجرا کا وہی اثر پڑتا ہے جو خود زر فلزاتی کے بڑھنے کا، اس طرح پر سونے سے دو چند سہ چند مقدار زر کا کام لیا جاتا ہے۔ اس واقعے کی ہم اس سے قبل تشریح کر چکے ہیں جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔ نہایت معتبر تخمینوں سے پتہ چلتا ہے کہ محض اعتبار نے زر کی مقدار سہ چند چہار چند بڑھا رکھی ہے یعنی سرمائیہ محفوظ کا ایک روپیہ تین چار کا کام دے رہا ہے۔ اور تخمینہ کیا گیا ہے کہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں ۱۱۳ ارب روپے قیمتی سونا یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں بطور سرمائیہ محفوظ موجود تھا، اس سے اضافۂ زر کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ اگر چک اور نوٹ کے ذریعے سے زر کی مقدار نہ بڑھائی جاتی تو غالباً زر فلزاتی موجودہ کاروبار چلانے کے واسطے ناکافی ثابت ہوتا اور باوجود ہزار اضافے کے اگر اس کی قلت رہتی ہے اور قدر میں اضافہ ہوتا تو عجب نہ تھا؛

تخمینہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں صرف انگلستان۔ فرانس جرمنی امریکہ اور ہندوستان کے حساب گھروں میں تقریباً سوا سات کھرب روپے کا لین دین طے ہوا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کاروبار کس وسیع پیمانے پر چل رہا ہے۔ بنک کے بیان میں واضح ہو چکا ہے کہ

حساب گھروں میں ایک پیسہ ادا اور وصول کرنے کی نوبت نہیں آتی سب دادوستد چیک کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ محض اعتبار کی بنا پر بنک تھوڑے سے سرمائے محفوظ سے کیسے بڑے بڑے کام لے رہے ہیں اور اگر یہ طریق اختیار نہ کیا جاتا تو زرِ فلزاتی کی اس قدر زیادہ مقدار درکار ہوتی کہ اُس کا مہیا ہونا دشوار تھا اور اس کی کثرت سے قدر گھٹنے کا تو ذکر ہی کیا ہے اور جب زر کی کافی مقدار دستیاب نہ ہوتی تو کاروبار کو موجودہ عروج میسر آنا محال تھا اور بفرض محال اگر کافی مقدار موجود بھی ہوتی تو اس قدر کثیر مقدار میں زرِ فلزاتی کا استعمال نہایت تکلیف دہ بلکہ کاروبار میں حارج ثابت ہوتا۔ اب اس معاشی مقولے کا مفہوم سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ کاروبار کی موجودہ ترقی کا راز اعتبار میں مضمر ہے۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ زر کی مقدار بشکل سکہ اس قدر بڑھنی محال تھی جتنی کہ بوجہ کثرت اس کی قدر گھٹ سکتی تھی۔ صرف جدید طریق اعتبار سے نوٹ اور چیک کے ذریعے سے اضافۂ زر کی گنجائش اس قدر بڑھا دی ہے کہ باوجودِ جذبِ طلا و ترقیِ کاروبار زر کی قدر میں بوجہ کثرت بتدریج تخفیف ہو رہی ہے۔

مذکورۂ بالا دو صورتوں کے علاوہ اضافۂ زر کی ایک صورت اور بھی ہے زر جس قدر جلد جلد دست بدست پھرے گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ گویا اس کی مقدار زیادہ ہے مثلاً کوئی ریل گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان آتے جاتے دن میں دو مرتبہ گزرے۔ اب اگر اس کی رفتار دوگنی کر دی جائے اور دو مرتبہ کی بجائے دن میں وہ چار مرتبہ گزرنے لگے تو نتیجہ وہی نکلیگا کہ گویا ایک کی بجائے دو ریل گاڑی چلتی ہیں۔ بعینہ یہی حال زر کا سمجھنا چاہیئے کاروبار میں زر کی گردش جس قدر تیز ہوگی اسی قدر وہ زیادہ مقدار کا کام سرانجام دے گا اس کے برعکس اگر زر مدتوں جا بجا پڑا رہے اور اس سے کاروبار میں کام نہ لیا جائے تو اس کا وہی اثر محسوس ہوگا جیسا کہ مقدار گھٹنے کا۔ زر کی جلد جلد گردش کرنے کی حالت اصطلاحاً کارکردگیِ زر سے تعبیر کی جاتی ہے

زر میں جس قدر کارکردگی اعلیٰ ہوگی اُس سے اُسی قدر بڑی مقدار کا کام نکلے گا گویا کارکردگیٔ زر سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو زر کی مقدار بڑھانے سے ۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ اضافۂ زر کی تین صورتیں ہیں، سونے کی نئی نئی مقدار زر کی شکل میں لائی جائے۔ اعتبار کی بنا پر نوٹ اور چیک کے ذریعے سے زر کی مقدار بڑھائی جائے اور زر کی کارکردگی کو ترقی دے کر وہی نتیجہ حاصل کیا جائے جو زر کی مقدار بڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔

رسدِ زر کی تین صورتیں تو معلوم ہوگئیں اب طلبِ زر کی مدوں کو لیجیے، زر کا پہلا کام آلۂ مبادلہ ہے یعنی اس کی وساطت سے خرید و فروخت ہوتی ہے پس کسی ملک میں جس قدر آبادی زیادہ ہوگی اور جس قدر کاروبار بکثرت جاری ہوگا اسی قدر زر کی زیادہ مقدار درکار ہوگی۔ اب تک کوئی ایسا اصول اور طریق دریافت نہ ہو سکا کہ کسی ملک کے واسطے زر کی جس قدر مقدار مناسب ہو ٹھیک اندازہ کرکے اُس کو مقرر کیا جا سکے جب خرید و فروخت کے واسطے زر کی موجودہ مقدار ناکافی ثابت ہوتی ہے تو لوگ اس کی مقدار بڑھانی شروع کر دیتے ہیں اور خصوصاً نوٹ اور چیک کے ذریعے سے بوجہ سہولت و فوری منفعت کبھی کبھی زر کی مقدار حدِ اعتدال سے بہت زیادہ بڑھا دی جاتی ہے، اسی اندیشے سے اجرائے زر کا قدم پر خاص قانونی نگرانی رکھی جاتی ہے، زر خزینۃ القدر کا بھی کام دیتا ہے یعنی لوگ اس کو بطور اندوختہ محفوظ رکھتے ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے ایسا کل زر بقدر اپنے مجموعے کے موجودہ زر کی مقدار گھٹا دیتا ہے یعنی جب تک وہ کام میں نہ لایا جائے زر کی قدر پر اس کی موجودگی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً ہندوستان میں کُل پچاس کروڑ روپیہ موجود ہو جس میں سے ۲۰ کروڑ مدفون ہو اور تیس کروڑ کاروبار میں چلتا ہو۔ روپے کی قدر پر اس تیس کروڑ کا اثر پڑے گا۔ باقی بیس کروڑ جب تک مدفون ہے بلحاظ اس اثر کے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ البتہ جب وہ دفینوں سے نکلے گا تو ضرور اُس

قدر روپے پر اپنا اثر ڈالے گا مشرقی ممالک میں اب تک زر سے خاص طور پر خزینۃ القدر کا کام لیا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں زر کی مقدار کثیر دفینوں میں مقید ہے اور ہوتی رہتی ہے البتہ اب کچھ عرصے سے لوگوں میں شوق پیدا ہوا ہے کہ اپنے اندوختوں کو بنک میں داخل کریں یا بطور خرید حصص کاروبار میں لگادیں، جوں جوں زر دفینوں سے باہر آئیگا اس کی مقدار بڑھیگی اور قدر میں کم و بیش تخفیف ہوگی۔

زر کی رسد و طلب کی مختصر تشریح کے بعد اب یہ جتانا مقصود ہے کہ زر کی قدر بھی مثل اور چیزوں کی قدر کے رسد و طلب کے باہمی تعلق سے قرار پاتی ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر اضافۂ رسد کے بعد زر کی قدر گھٹے۔ اگر رسد کے ساتھ ساتھ طلب میں بھی برابر یا زیادہ اضافہ ہو تو گھٹنے کی بجائے یا تو قدر زیادہ برقرار رہے گی یا اُلٹی اور بڑھ جائے گی، اس کے برعکس اگر رسد برقرار رہے لیکن طلب میں کسی وجہ سے کمی آجائے تب بھی قدر میں تخفیف ہوجائیگی۔ چنانچہ زر کی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ کاروبار کے عروج کے ساتھ زر کی مقدار بھی بڑھی لیکن اس کی قدر میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اُلٹا اضافہ ہوا۔ لیکن جب کاروبار میں تنزل ہوا تو خود بخود بغیر مزید اضافے کے موجودہ زر کی قدر گھٹنے لگی۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی جتایا جاچکا ہے اگر صرف زر فلزاتی سے کام لیا جاتا تو موجودہ کاروبار چلانے کے لیئے وہ کافی نہ ہوسکتا اور باوجود ہزار اضافہ پھر بھی زر کی قدر بڑھی چڑھی رہتی۔ لیکن خدا بھلا کرے زرِ کاغذی کا کہ اس نے اضافۂ زر کی بہت گنجائش پیدا کردی، چونکہ زرِ کاغذی کا اجرا سہل بھی ہے اور مفید بھی لوگ اس کی مقدار بڑھانے میں حدِ اعتدال سے گزر جاتے تھے لیکن اب ایسی قانونی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں کہ اس کا اجرا مناسب حدود کے اندر رہتا ہے پھر بھی رسد و طلب زر میں بالعموم ایسی نسبت رکھی جاتی ہے کہ رسد طلب کا نہ صرف ساتھ دے بلکہ کچھ پیش پیش رہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر کی قدر میں مسلسل مگر بتدریج تخفیف ہورہی ہے اور بحیثیتِ مجموعی ایسی تخفیف ملک کے حق میں

مفید ہے چنانچہ اس واقعے سے ہم ابھی آگے چل کر بحث کریں گے۔

اب تک ہم نے زرِ طلائی سے بحث کی اور زرِ قانونی کو زرِ مستند مانا۔ یورپ اور امریکہ میں تو زر کی حالت انھیں مفروضات کے مطابق ہے لیکن ایشیا کے ممالک میں اب تک زرِ نقرئی اور وہ بھی زرِ مستند نہیں بلکہ زرِ وضعی بطور زرِ قانونی رائج ہے، خود ہندوستان کا زرِ قانونی چاندی کا روپیہ ہے جو سراسر زرِ وضعی ہے اس کی قدرِ فلزاتی قدرِ قانونی سے ایک ثلث گھٹی رہتی ہے یا یوں کہئیے کہ قدرِ فلزاتی سے قدرِ قانونی ایک نصف زیادہ رہتی ہے جیسے انگلستان کا زرِ مستند بشرحِ معین سونے کے مبادلے میں مل سکتا ہے یعنی ایک اونس کے بدلے ۳ پونڈ، ۱۷ شلنگ ۱۰½ پینس ہر وقت دارالضرب سے لیے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں چاندی اور روپے کا بشرحِ معین مبادلہ نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ وہی روپے کا زرِ وضعی ہونا ہے۔ روپوں کے حساب سے بھی چاندی کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ چاندی عوام کے ہاتھوں زیور اور سامان میں کام آتی ہے۔ روپے سے اُس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں، عوام اپنی چاندی کے روپے نہیں ڈھلوا سکتے۔ روپے کا اجرا قطعاً سرکار کے ہاتھ میں ہے، وہ جب ضرورت دیکھتی ہے نئے روپے ڈھال کر دے دیتی ہے جب چاہتی ہے نہیں دیتی، زرِ مستند کے اضافے میں جس قدر اختیار عوام کو دیگر ممالک میں ہے زرِ وضعی کے اضافے میں ہندوستان میں نہیں ہے اُن ممالک میں سکہ سازی آزاد ہے اور ہمارے ہاں مخصوص۔ اگر ہندوستان میں بھی سکہ سازی آزاد کر دی جائے تو کل لوگ اپنی اپنی چاندی کے روپے ڈھلوا لیں حتی کہ روپوں کی قدر اس قدر گھٹے کہ قدرِ قانونی اور قدرِ فلزاتی میں کوئی فرق نہ رہے، اگرچہ زرِ فلزاتی کا اضافہ بالکل سرکار کے اختیار میں ہے اور زرِ وضعی کے ساتھ ایسا اہتمام لابُد ہے لیکن نوٹ اور چیک کے ذریعے سے یہاں بھی زر کی مقدار میں معقول اضافہ ہو رہا ہے اور روپے کی قدر میں تخفیف ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں جو گرانی

حصّہ چہارم
باب بست وہفتم

پھیل رہی ہے اُس کے اسباب و نتائج سے ہم آگے چل کر جداگانہ بحث کریں گے یہاں صرف ہندوستان کے زر کی مثال سے چاندی اور زرِ نقرئی کا تعلق دکھانا مقصود تھا۔ چین کا زرِ قانونی بھی نقرئی ہے اور وہ بھی غالباً زرِ وضعی ہے، یورپ اور امریکہ میں زرِ نقرئی محض بطورِ محدود زرِ قانونی رائج ہے ؂

اضافۂ مقدارِ زر کے نتائج

۶- یہ تو تحقیق ہو گیا کہ مثل اور چیزوں کی قدر کے زر کی قدر بھی قانونِ رسد و طلب کے تابع ہے، رسد و طلبِ زر کی مدیں بھی مختصراً واضح کردی گئیں نیز معلوم ہوا کہ زر کی رسد بالعموم طلب سے کچھ پیش پیش رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر کی قدر میں عرصے سے مسلسل مگر بتدریج تخفیف ہو رہی ہے اور بحیثیت مجموعی چیزوں کی قیمت بڑھتی معلوم ہوتی ہے کہ گویا گرانی پھیل رہی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زر کی مقدار اس قدر بڑھانا کہ اُس کی قدر گھٹنے لگے اور چیزوں کی قیمت چڑھ جائے آیا ملک کے حق میں مضر ہے یا مفید۔ بظاہر تو یہ طریق سراسر عبث ہے بلکہ خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ روپے کی مقدار دوگنی کرنے سے اُس کی قدر صرف نصف رہ جائے تو اُس کے یہ معنی ہوے کہ جو کام پہلے ایک روپے سے نکلتا تھا اب دو سے نکلے گا اور سوائے اس کے کہ لوگوں کو اتنے ہی کاروبار میں زر کی دوگنی مقدار برتنی پڑے اور کیا فائدہ ہوگا بلکہ دو چند زر کی گراں باری سے لوگوں کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچے گی۔ بیشک اگر زر کی طلب اس قدر محدود اور معین ہو کہ مقدار دوگنی کرنے سے زر کی قدر نصف رہ جائے تو ایسا اضافہ فضول بلکہ مضر ہوگا۔ لیکن اصلی حالت اس مفروضے کے خلاف ہے۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں کچھ کاروبار روپیہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نیم جاں پڑے رہتے ہیں لیکن جوں ہی روپے کی افراط ہوتی ہے وہ اسی طرح پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کہ بارش ہونے سے خشک درخت پھوٹ نکلتے ہیں۔ ایسا بہت کم ممکن ہے کہ ترقیِ کاروبار کی گنجائش بالکل ختم ہو جائے اور زر کی طلب میں اضافہ قطعاً

ممکن نہ ہو، اکثر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ زر کی جدید مقدار میں سے ایک بڑا حصہ تو نئے نئے کاروبار جاری کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور کچھ باقی رہ کر تخفیفِ قدر کا باعث ہوتا ہے، اس کی مثال بعینہ یوں سمجھنی چاہیئے کہ بارش کا زیادہ تر پانی تو زمین میں جذب ہو کر نباتات اُگاتا ہے اور کچھ سطحِ زمین پر بہتا پھرتا ہے۔ لیکن اگر زر کی مقدار بے حد وحساب بڑھا دیجائے تو اس کی کثرت سے کاروبار کا وہی حشر ہوگا جو پانی کے سیلاب سے زراعت کا ہوتا ہے پس کاروبار کی حالت دیکھ کر اس کے مطابق زر کی مقدار بڑھانی چاہیئے اور بڑھائی جاتی ہے، زر میسر نہ آنے کی وجہ سے جو جو کاروبار رُکے پڑے تھے وہ بھی جاری ہو جاتے ہیں اور اکثر قدر زر میں بھی تھوڑی بہت تخفیف نمودار ہو جاتی ہے۔ اگر اضافۂ زر میں بہت زیادہ احتیاط برتی جائے تو شاید قدر میں تخفیف نہ ہو یا بہت کم ہو لیکن جب سے نوٹ اور چیک سے زر کا اضافہ نہایت سہل بنا دیا ہے زر کی رسد طلب سے دو قدم آگے چلتی ہے اور قدر میں تخفیف ہوتی رہتی ہے مگر بتدریج نہ کہ بہت زیادہ اور دفعتہً تاکہ غیر معمولی گرانی سے عوام میں بے اطمینانی اور کاروبار میں ابتری نہ پھیلے۔ حاصلِ کلام یہ کہ زر کی مقدار بڑھنے سے ترقی یافتہ ممالک میں بالعموم دو اثر نمودار ہوتے ہیں نئے نئے کاروبار چلنے سے کاروبار ترقی پاتے ہیں اور قدرِ زر میں معتدل تخفیف ہو جاتی ہے۔ یہ قدر کی تخفیف بشرطیکہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرے اور اس قدر زیادہ نہ ہو کہ ناقابلِ برداشت بن کر کاروبار کو درہم و برہم کر دے معاشی ترقیات کی معاون ہے اور بحیثیت مجموعی عوام کے حق میں مفید چنانچہ اب ہم اسی واقعے کی تشریح کرتے ہیں ؛

اگر کسی شخص کو ایسے چار روپے دیئے جائیں جن کی قدر گھٹ کر سابق ۲ روپے کے برابر رہ گئی ہو اور پھر ایک ایسا روپیہ دیا جائے جسکی قدر بڑھ کر سابق ۲ روپے کے برابر رہ گئی ہو تو اگرچہ یہ ۴ روپے اور ایک روپیہ ہم قدر ہوں گے یعنی اُن کے مبادلے میں برابر برابر چیز مل سکے گی

اور درحقیقت لوگوں کو زر کی قدر سے غرض ہے نہ کہ مقدار سے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ہم روپے ملنے سے دل کو جو خوشی حاصل ہو گی ایک روپیہ ملنے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ کچھ طبیعت کا خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ زر ملتے وقت قدر کا تو کچھ خیال نہیں رہتا صرف مقدار کا فوری اثر محسوس ہوتا ہے۔ سکوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہاتھ آتی ہے پانے والا اُسی قدر اپنے کو دولتمند خیال کرنے لگتا ہے اگرچہ چیزیں گراں ہوں لیکن مزدور کو اجرت میں زر کی زیادہ مقدار ملے اور چیزیں ارزاں ہوں لیکن اجرت کی مقدار کم ہو اور دونوں حالتوں میں اجرتِ صحیحہ برابر ہو تو اجرتِ متعارف کی کمی بیشی کا مزدور کی ہمت اور کوشش پر ضرور اثر پڑے گا اور مقابلۃً بحالت اول وہ زیادہ خوش وخرم نظر آئے گا۔ اگرچہ زر کی قدر کم ہے لیکن اس کی مقدار کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو زیادہ آمدنی والا خیال کرے گا اور اس کے برعکس بحالتِ دوم اُس کو مقدار کی کمی کی وجہ سے آمدنی کم نظر آئے گی حالانکہ زیادتی قدر کی وجہ سے اس کی مالی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ اگرچہ قدر نظر انداز کر کے مقدار زر سے آمدنی کا تخمینہ کرنا محض مغالطہ ہے لیکن اس کا اثر عوام کی ہمت اور کوشش پر اس قدر گہرا پڑتا ہے کہ اس کا لحاظ کرنا اشد ضروری ہے۔ جب زر کی قدر گھٹتی ہے تو اول قیمت اور کچھ عرصے بعد اجرت۔ لگان۔ کرایہ ان سب مدوں میں اضافہ نمودار ہونے لگتا ہے اور ان کے مالک خیال کرتے ہیں کہ انکی آمدنی بڑھ رہی ہے اور وہ زیادہ دولت مند ہوتے جاتے ہیں۔ ہر طرف اطمینان اور کاروباری گرمجوشی نظر آنے لگتی ہے۔ اضافۂ قیمت سے کارخانہ داروں اور تاجروں میں کاروبار کا جوش پھیلتا ہے۔ زیادتی اجرت متعارف سے مزدوروں کے دل بڑھتے ہیں۔ بیشی لگان سے زمیندار یا کاشتکار نہال ہوتے ہیں ہم نے مانا کہ قدر گھٹنے کی حالت میں مقدار زر کے اضافے کو اضافۂ آمدنی شمار کرنا سراسر دھوکا سہی لیکن یہ دھوکا عام طبیعتوں میں اس قدر جاگزیں ہے اور کاروباری حالت پر اس کا اس قدر گہرا اثر پڑتا ہے کہ اس کا پیدا ہونا

[illegible]

ملک کے حق میں مفید ہے۔ چنانچہ تجربہ سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ خواہ قدرِ زر بڑھے
لیکن صرف مقدارِ زر بڑھنے سے لوگ اپنی آمدنی میں اضافہ خیال کرنے لگتے ہیں اور
خوشی خوشی کاروبار میں زیادہ توجہ اور تندہی سے مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو گرانی
اضافہ مقدارِ زر کی بدولت ہو پہلے اُس کا اثر کاروبار پر بہت موافق پڑتا ہے۔ آمدنی کی زیادتی
کے خیال میں لوگ گرانی کی پروا نہیں کرتے اور اپنے کو خوش حال تصور کرنے لگتے ہیں
اور بزعمِ خود زیادہ دولت مند بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کثرتِ زر کی پیدا کی ہوئی
گرانی بجائے بار محسوس ہونے کے سمندِ دولت اندوزی پر تازیانہ کا کام کرتی ہے۔
چنانچہ کثرتِ زر گرانی اور معاشی ترقیات کچھ لازم و ملزوم سی پائی جاتی ہیں گویا مقدارِ زر
بڑھنے اور قدر گھٹنے سے کاروباری طبقوں میں ایک نئی روح پھونک جاتی ہے۔
وہ قیمتیں۔ اُجرت۔ لگان اور کرایہ بڑھا کر تخفیفِ زر کی خاصی تلافی کر لیتے ہیں اور
مزید براں مقدارِ زر بڑھنے سے ایسے ہی خوش ہوتے ہیں کہ گویا اُن کی آمدنی میں کوئی حقیقی اضافہ
ہوا۔ لیکن اس حالت میں دو طبقے ضرور نقصان میں رہتے ہیں۔ اوّل تو قرضخواہ مثلاً اگر قرض ادا
کرتے وقت قرض دینے کے وقت کے مقابلے میں زر کی قدر ۲۰ فیصدی کم ہو جائے تو قرضدار سو روپے
کی شکل میں صرف ۸۰ روپیہ ادا کرتا ہے۔ اور قرض خواہ کو ہر سیکڑے پر اپنے دیئے ہوئے
سے بیس روپے کم ملتے ہیں۔ لیکن یہ صورت اُس وقت پیش آتی ہے جب کہ قرض
متعدد سال بعد ادا کیا جائے۔ قرض خواہ صرف زر کی مساوی مقدار پانے کا مستحق ہوتا ہے
قدر کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ آج کل سود اس غیر اختیاری نقصان کی تلافی بھی شمار ہو سکتا
ہے۔ دوم تخفیفِ قدرِ زر سے اُن لوگوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے جن کی آمدنی مقرر ہو مثلاً
ملازم پیشہ لوگ کہ اُن کی تنخواہیں مقرر ہیں اُن کو حسبِ استحقاق ترقیاں ضرور ملتی ہیں لیکن قیمت
و اُجرت وغیرہ کی مانند تخفیفِ قدرِ زر کے لحاظ سے اُن کی تنخواہوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں
کیا جاتا۔ ایک تو یوں ہی معیارِ زندگی اعلیٰ ہونے کی وجہ سے مصارف بڑھ گئے ہیں۔ دوم قدرِ
زر بھی گھٹ رہی ہے، گرانی ہر طرف مسلط ہے لیکن ان کی تنخواہوں کی مقدارِ زر مثلاً جیسے
پچاس ہو۔ یا ہزار روپیہ مقرر ہے۔ اب گذر ہو تو کیسے ہو۔ تنخواہ تو بڑھنے سے رہی بالآخر
رشوت کا دستِ غیب چلنا شروع ہو جاتا ہے، دیندار لوگوں میں عام شکایت ہے کہ بدنیتی
کی بدولت دنیا سے خیر و برکت اُٹھ گئی کسی زمانے میں چھوٹی چھوٹی تنخواہوں والے کنبہ پالتے

تھے۔ اور اب بڑی بڑی تنخواہوں والے بلا امکان رشوت لیتے ہیں۔ مگر پورا نہیں پڑتا۔ اُن کی شکایت بالکل بجا ہے۔ اور اُن کی توجیہ کو بھولی بھالی سہی لیکن پاکیزہ دلوں کو تسکین ضرور دیدیتی ہے ٭

حاصل کلام یہ کہ مقدارِ زر کا اضافہ اور اُس کی قدر کی تخفیف بشرطیکہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرے معاشی ترقیات اور تمام عرصۂ انتقال کو معاون ثابت ہوتی ہے۔ صرف جن طبقوں کی آمدنی کی مقدار زر معین ہو ان کو گرانی کم و بیش زیر بار ضرور کرتی ہے۔ طرح طرح کی ترکیبوں سے وہ بھی اپنے نقصان کی تلافی کر ہی لیتے ہیں۔ اب تک ہم نے جس گرانی کے نتائج دکھائے وہ وہ گرانی ہے جو کثرتِ زر سے پیدا ہو۔ اگر گرانی قلت پیداوار سے بشکل قحط نمودار ہو تو عوام کے حق میں مضر بلکہ تباہ کن ثابت ہوگی۔ ریل جہاز اور تار نے کرۂ ارض کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ اکثر پیداوار ملک در ملک پھرتی ہے اور دنیا کے گوشے گوشے کی حالت سب پر عیاں رہتی ہے۔ اب کسی خاص ملک میں تو قحط کا اندیشہ باقی نہیں رہا البتہ عالمگیر قحط اس سے خدا محفوظ رکھے ٭

سونے کی پیداوار

(۷) میکسیکو۔ کناڈا۔ برازل۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ ٹرانسوال۔ آسٹریلیا کیلی فورنیا اور سائبریا میں خاص طور پر سونا نکلتا ہے۔ ہندوستان میں ریاست میسور میں سونے کی کان ہے تخمینہ کیا جاتا ہے کہ جب سے امریکہ کا پتہ چلا یعنی ۱۴۹۳ء سے لے کر ۱۹۱۲ء تک تقریباً ساڑھے پینتالیس ارب روپے قیمتی سونا دنیا بھر میں نکل چکا ہے جن میں سے تقریباً اکیس ارب روپے کا سونا صرف گزشتہ ۲۲ سال میں یعنی ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان دستیاب ہوا گزشتہ چند سالوں سے اوسطاً سوا اور ڈیڑھ ارب روپے کے درمیان ہر سال کانوں سے سونا نکل رہا ہے اور یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ کل دنیا میں جس قدر سونا موجود ہے۔ اس کا دسواں حصہ ہندوستان میں ہے اور کل موجودہ چاندی کا پانچواں حصہ لیکن علاوہ زر کے ہندوستان میں سونے چاندی سے دفینوں زیور اور سامان کا بھی کام بکثرت لیا جاتا ہے ۔

حصۂ پنجم
بابِ بست و ہشتم

حصۂ پنجم

بابِ بست و ہشتم

صرفِ دولت

(۱) صرف کا مفہوم (۲) صرف کے مباحث (۳) نفعِ المصرف
(۴) افادۂ اتم (۵) معیارِ زندگی (۶) مسئلہ آبادی

صرف کا مفہوم

۱۔ دولت اور اس کی پیدائش کا مفہوم ۔ عاملین پیدائش دولت ۔ زمین ، محنت ، اصل اور تنظیم دولت کی تقسیم بہ شکل لگان ۔ اجرت ۔ سود ۔ اور منافع اور مبادلۂ دولت کا قدیم و جدید طریق ۔ دولت کے متعلق یہ سب باتیں تو اوپر بیان ہو چکیں ۔ بس اب صرف دولت کی بحث باقی ہے ۔ اوّل ہم صرف کا مفہوم واضح کرتے ہیں ۔ پیدائش دولت کے مفہوم میں بتایا جا چکا ہے کہ انسان کو تخلیق پر برائے نام بھی قدرت حاصل نہیں ۔ وہ کسی چیز کو نیست سے ہست نہیں کرتا ۔ البتہ چیزوں کا مقام یا ان کی ترکیب یا ہیئت ان کی شکل بدل کر ان کو اپنے واسطے کار آمد بنا لیتا ہے ۔ گویا چیزوں میں قدرت نے جو افادہ ودیعت کیا ہے اس پر اپنی دسترس بڑھاتا ہے اور بس ۔ اس اجمال کی تفصیل اوپر موجود ہے اب صرف دولت کے مفہوم کو لیجیئے ۔ صرف سے مراد کسی چیز کو نیست کرنا نہیں بلکہ اس افادے سے کام لینا ہے جو کسی چیز میں موجود ہو اور جس پر بذریعہ عمل پیدائش دسترس حاصل کی جا چکی ہو انسان کے ہر دو عمل کو چیزوں کے افادے سے سروکار ہے ۔ پیدائش سے افادہ ہاتھ آتا ہے اور صرف میں وہ اپنا کام پورا کرتا ہے ۔ یعنی اس سے احتیاجات رفع ہوتی ہیں ۔ ہر شخص پائدار اور دیر پا چیز کو پسند کرتا ہے ۔

حصۂ پنجم
باب بست و ہشتم

جس سے عرصۂ دراز تک افادہ حاصل ہوتا رہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ صرف کا مقصود کسی چیز کے افادے سے کام لینا ہے۔ خود چیز کا نیست کرنا نہ تو مفید اور نہ ممکن۔ البتہ حسب قوانین قدرت کبھی تو صرف میں آتے ہی چیزوں کی شکل بدل جاتی ہے۔ مثلاً غلہ پھل ترکاری جلانے کا تیل اور لکڑی کہ ان میں سے ہر ایک چیز ادھر استعمال میں آئی ادھر اس کی شکل بدلی اور بہت سی چیزیں ایک شکل میں قائم رہ کر مدت تک صرف میں آتی رہتی ہیں۔ حتی کہ کہنہ فرسودہ ہوتے ہوتے وہ از کار رفتہ ہو جائیں۔ مثلاً لکڑی پتھر اور لوہے وغیرہ کا سامان۔ لیکن واضح ہو کہ اول تو جلد یا دیر میں چیزوں کی صرف شکل بدل جاتی ہے۔ نیست ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوتی۔ دوم تغیر شکل بھی کچھ صرف پر منحصر نہیں بلکہ اکثر چیزیں پڑے پڑے صرف میں آئے بغیر ہی قدرتی اسباب کے اثر سے شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔

پس جس طرح پیدائش دولت کا منشا چیزوں کے افادے کو قابو میں لانا ہے۔ اسی طرح صرف دولت سے مقصود اس افادے کا احتیاجات رفع کرنا ہے۔ کبھی ان کا مقام بدل دیتے ہیں۔ کبھی ان کو نئے نئے طریق سے توڑتے جوڑتے ہیں اور کبھی بمعاونت قوانین قدرت ان کی شکل بھی بدل دیتے ہیں۔ لیکن اس سب الٹ پلٹ کا منشا صرف اسقدر ہے کہ چیزوں میں قدرت نے جو افادہ ودیعت کر دیا ہے ہم اس پر بدرجۂ اتم قابو پا کر اس سے پورا پورا کام لیں یعنی اپنی احتیاجات پوری کریں اور عملِ پیدائش و صرفِ دولت کا یہی لبِ لباب ہے۔

یہ تو معلوم ہوا کہ صرف دولت سے مراد چیزوں کے افادے سے احتیاجات رفع کرنا ہے۔ اب صرف کے متعلق ایک نکتہ اور باقی ہے۔ مصنوعات کی تیاری میں جو پیداوار خام کام آتی ہے وہ بھی صرف میں شمار ہوتی ہے۔ مثلاً کپڑا بننے میں اُون یا روئی صرف ہوتی ہے کتاب چھپنے میں کاغذ صرف ہوتا ہے۔ انجن چلانے میں تیل اور کوئلہ صرف ہوتا ہے۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ چیزوں کا ایسا صرف عمل پیدائش کا جزو ہے یعنی یہ چیزیں صرف ہو ہو کر اس چیز کی پیدائش میں مدد دیتی ہیں۔ جو کہ اصل مقصود ہے۔ پس ایسی ابتدائی درمیانی چیزوں کے صرف کو جو بالآخر انتہائی مطلوبہ چیز تیار کریں صرف پیدا آور کہتے ہیں اور انتہائی مطلوبہ چیز کا تیار ہو کر انسان کے کام آنا محض صرف کہلاتا ہے اور سچ پوچھئے تو احتیاج بھی اسی صرف سے رفع ہوتی ہے مثلاً جوتے کی تیاری میں چمڑے سوت لوہے

حصۂ پنجم
باب بست و ہفتم

در پاپوش کا کام آنا صرف پیدا آور ہے اور خود جوتے کا پہنا جانا محض صرف شمار ہوگا۔ مذکورہ چاروں چیزیں صرف میں آکر جوتے کی پیدائش میں مدد دیتی ہیں اور جوتا صرف ہونے پر ایک احتیاج رفع ہوتی ہے جب لوگ اُس کو پہنتے ہیں تو پاؤں زمین کی نمی۔ سردی سے اور گرمی سے محفوظ رہتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ جو چیز براہ راست ہماری احتیاج رفع کرے اس کا استعمال تو صرف کہلاتا ہے اور جو چیزیں ایسی چیز بنانے میں کام آئیں اُن کا استعمال صرف پیدا آور کہلاتا ہے۔

صرف کے مباحث

۲۔ احتیاجات تسکین پذیر و غیر تسکین پذیر ضروریات تنعمات طلب تغیر پذیر و غیر تغیر پذیر قوانین تکثیر و تقلیل افادہ۔ افادۂ کلی و افادۂ مختتم اور مسائل نفع المصرف و افادۂ ختم یہ سب مباحث کہ جو منظر موزونیت موقع قدر و قیمت کے تحت میں بیان ہو چکے ہیں دراصل صرف دولت سے متعلق ہیں۔ ان میں سے مسئلۂ نفع المصرف و افادۂ ختم کو از سرِ نو ہم یہاں بالتفصیل بیان کرتے ہیں باقی کا محض حوالہ کافی ہوگا۔

نفع المصرف

۳۔ جب ہم کوئی چیز خریدنا چاہتے ہیں تو اُس کی زیادہ سے زیادہ قیمت اپنے ذہن میں معیّن کر لیتے ہیں۔ اگر فروشندہ اس قیمت تک رضامند ہو جاتا ہے تو چیز خرید لیتے ہیں۔ ورنہ نہیں خریدنے کی حالت میں اکثر جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ اس زیادہ سے زیادہ قیمت سے کم ہوتی ہے جو کہ خریدار ادا کرنے پر آمادہ ہو اوّل الذکر قیمت کا آخر الذکر قیمت سے زائد حصّہ اصطلاحاً نفع المصرف کہلاتا ہے۔ فرض کرو ہم کوئی چیز زیادہ سے زیادہ پانچ روپے تک خریدنے پر آمادہ ہوں لیکن وہ ہم کو ۸/۸ میں مل جائے تو اس خرید میں ہم کو جو بقدر آٹھ آنے بچ رہے یہی نفع المصرف کا معیار ہے۔ بنظر اظہارِ حقیقت ضمناً یہ نکتہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معیار بالعموم معیّن ہوتے ہیں۔ لیکن یہ معیار غیر معیّن ہے۔ غریب آدمی کے نزدیک آٹھ آنے کی جو قدر ہے امیر آدمی کی نظر میں ۸/ کی قدر اُس کی عشر عشیر بھی نہیں۔ گویا اگر غریب اور امیر دونوں کو بقدر آٹھ آٹھ آنے نفع المصرف حاصل ہو تو اس معیار کی ظاہری مساوات سے دھوکا نہ کھانا چاہئیے۔ اس حالت میں غریب کو بمقابل امیر کہیں زیادہ نفع المصرف حاصل ہوگا۔ مثلاً اگر غریب کی نظر میں آٹھ آنے کی وہی قدر ہو جو امیر کے نزدیک پانچ روپے کی تو غریب کا مذکورہ بالا آٹھ آنے کا نفع المصرف امیر کے آٹھ آنے والے نفع المصرف کا دس گنا ہوگا۔

حالانکہ دونوں کے معیار برابر آٹھ آٹھ آنے ہیں، یہ نکتہ اسی عام مشاہدے کی تشریح ہے کہ اگر غریب کو دو چار روپے بھی کسی سودے میں بچت ہوتی ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا حالانکہ امرا سو پچاس روپئے کے فائدے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ۔
واضح ہو کہ بعض چیزوں کے خریدنے میں ہم کو خاص طور پر بہت زیادہ نفع المصرف حاصل ہوتا ہے ۔ بالفاظ دیگر ان کی جو قیمت ہم ادا کرتے ہیں وہ اس سے بہت کم ہے ۔ جو ہم گوارا کر سکتے تھے، پانی نمک اور دیاسلائی عمدہ مثالیں ہیں ؛

مسئلہ قدر و قیمت کے تحت میں قانون تقلیل افادہ ۔ افادۂ کلّی ۔ افادۂ مختتم اور نفع المصرف کے متعلق جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کو اس موقع پر ریفیو ریڈ کرنا ضروری ہے اس سے معلوم ہوگا کہ مقدار خرید بڑھنے سے نفع المصرف بھی بڑھتا ہے اور اس کے گھٹنے سے گھٹتا ہے، بخوف طوالت اس بحث کو یہاں نہیں دُہرایا صرف حوالے پر اکتفا کیا گیا ۔

ذیل کی بحث سے واضح ہوگا کہ چیزوں کی گرانی اور ارزانی کا خریداروں کے نفع المصرف پر کیا کیا اثر پڑتا ہے ۔ بغرض سہولت و صفائی بیان ہم اول فرض کرتے ہیں کہ کسی چیز پر محصول قائم کیا جاتا ہے اور اسی کی برابر قیمت رسد میں اضافہ نمودار ہو جاتا ہے ۔ گویا چیزیں گراں ہو جاتی ہیں دوم کسی چیز کی پیدائش پر سرکاری امداد ملتی ہے اور اس کے حساب سے قیمت رسد بھی گھٹ جاتی ہے یعنی چیزیں ارزاں ہو جاتی ہیں بالفاظ مختصر جب کہ محصول کی برابر قیمت رسد بڑھ جائے اور سرکاری امداد کی برابر گھٹ جائے تو ایسے محصول اور سرکاری امداد کا خریداروں کے نفع المصرف پر کیا اثر پڑیگا اس باقاعدہ اضافے اور تخفیف قیمت کی مثال سے عام گرانی اور ارزانی اشیا کا نفع المصرف پر اثر بہت واضح ہو جائیگا اور در اصل اسی مسئلے کی توضیح مقصود ہے ؛

اوّل ایسی چیزیں لیجئے جو کہ قانون استقرار حاصل کی پابند ہیں ۔ خواہ ان کی تھوڑی مقدار پیدا کیجائے یا بہت زیادہ ۔ مصارف پیدائش کی نسبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور بحالت مقابلہ چھوٹی اور بڑی مقداروں کے واسطے قیمت رسد وہی ایک رہتی ہے ۔
فرض کرو کہ ایک ہزار چیزیں فروخت ہوں ۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کل چیزوں کا نفع المصرف مساوی نہیں ہو سکتا بعض کا بہت زیادہ ہوگا اور بعض کا کم مسئلہ قدر و قیمت کی بحث میں بحوالۂ بالا مقامات دیکھنے کے بعد یہ نکتہ بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ مثلاً ان چیزوں

حصہ پنجم باب بست و ہفتم

کا جداگانہ نفع المصرف حسب ذیل ہو:-

تعداد اشیاء	نفع المصرف فی شے	مجموعی نفع المصرف
۱۵۰	۴ روپے	۶۰۰
۲۵۰	۲ روپے	۵۰۰
۳۰۰	۱ روپیہ	۳۰۰
۲۰۰	۱۲ آنہ	۱۵۰
۱۰۰	۸ آنہ	۵۰
۱۰۰۰		۱۶۰۰

فرض کرو کہ ان ہزار چیزوں پر ایک روپیہ فی چیز محصول قائم کیا جائے اور اس کی وجہ سے قیمت و رسد میں بھی ایک روپیہ فی چیز اضافہ نمودار ہو تو صاف ظاہر ہے کہ ۱۰۰ اور ۲۰۰ چیزوں کی خریداری جن پر نفع المصرف آٹھ آنے اور ۱۲ آنے فی شئے حاصل ہوتا ہے بالکل بند ہو جائے گی، ۳۰۰ کی خریداری بحال رہے گی لیکن چونکہ نفع المصرف کی مقدار ایک روپیہ فی شئے ہے اور اتنا ہی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ پس ان کا نفع المصرف بالکل غائب ہو جائے گا۔ رہیں ۲۵۰ اور ۱۵۰ چیزیں ان پر اب بھی البتہ ایک روپیہ اور تین روپے نفع المصرف حاصل ہوتا رہے گا۔ گویا محصول قائم ہو جانے کے بعد (۱۰۰+۲۰۰) تین سو چیزوں کی خریداری رک جائے گی اور صرف (۳۰۰ + ۲۵۰ + ۱۵۰) سات سو کی بحال رہے گی۔ ان پر سرکار کو بحساب ایک روپیہ فی شئے سات سو روپے بطور محصول دستیاب ہوگا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ خریداروں کا نفع المصرف ضائع ہو جائیگا۔ یعنی ۱۰۰ اور ۲۰۰ چیزوں کا نفع المصرف (۵۰ + ۱۵۰) ۲۰۰ روپے، ۳۰۰ چیزوں کا ۳۰۰ روپے اور ۲۵۰ و ۱۵۰ چیزوں کے نفع المصرف میں سے ۲۵۰ اور ۱۵۰ روپے کل بقدر (۵۰+۱۵۰+۳۰۰+۲۵۰+۱۵۰) ۹۰۰ روپے نفع المصرف ضائع ہوگا۔ گویا محصول کی بدولت سرکار کو صرف ۷۰۰ روپے آمدنی حاصل ہوئی اور خریدار ۹۰۰ روپے نفع المصرف سے محروم ہو گئے۔ اب اگر

باب بست وہفتم

محصول بغیر چیز کا نرخ خود بڑھایا جائے تو اسی طرح فروشندوں کو ۱۰۰ روپیہ زائد ملے گا اور خریداروں کے ہاتھ سے ۹۰ روپے کے قریب نفع المصرف نکل جائے گا۔

مثال بغیر اس واقعے کی مختصر تشریح یوں کی جا سکتی ہے قیمت بڑھنے پر کچھ چیزوں کی خریداری ترک ہو جائے گی۔ کیونکہ ان کا نفع المصرف اضافۂ قیمت سے کم ہوگا۔ ایسی چیزوں کے کل نفع المصرف سے خریدار محروم ہو جائیں گے اور جبکہ خریداری رک جائے گی تو فریق ثانی کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے گا بعض چیزوں کا نفع المصرف، اضافۂ قیمت کے برابر برابر ہوگا ان کی خریداری تو بحال رہے گی لیکن کل نفع المصرف فریق ثانی کی طرف منتقل ہو کر خریداروں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ البتہ کچھ چیزوں کا نفع المصرف اضافۂ قیمت سے زیادہ ہوگا۔ ان کی خرید و فروخت سے بقدر اضافۂ قیمت نفع المصرف فریق ثانی کے قبضے میں آجائے گا اور باقی خریداروں کے پاس رہے گا پس مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ فریق ثانی کو خواہ وہ بحالت قیام محصول سرکار ہو یا بحالت اضافۂ قیمت فروشندہ جس قدر رقم بطور محصول یا اضافۂ قیمت وصول ہوگی اس سے زیادہ رقم کا قیمتی نفع المصرف خریداروں کے ہاتھ سے نکل جائے گا گویا اول الذکر فریق کو جس قدر نفع حاصل ہوگا آخر الذکر کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچے گا۔

قیمت رسد کے بڑھنے کا نفع المصرف پر جو اثر پڑتا ہے وہ اوپر محصول کی مثال سے واضح ہو چکا ہے۔ اب اس کے برعکس دیکھنا یہ ہے کہ قیمت رسد کے گھٹنے سے نفع المصرف میں کیا فرق پڑتا ہے اس تحقیق میں بھی بغرض سہولت وصفائی بیان ہم فرض کرتے ہیں کہ چیزوں کی پیداوار پر سرکاری امداد ملے اور بقدر امداد قیمت رسد میں بھی تخفیف ہو جائے مثلاً کوئی چیز دس روپے کو فروخت ہوتی ہو۔ لیکن جب سرکار کی طرف سے فی چیز ایک روپیہ مدد ملنے لگے تو اس کی قیمت رسد گھٹ کر صرف نو روپے رہ جائے گی۔

فرض کرو کہ ایک ہزار چیزیں دس روپے فی چیز کے حساب سے

فروخت ہوں۔ قانون تقلیل افادہ کی بحث میں واضح کیا جاچکا ہے کہ کسی
مقدار یا تعداد اشیا کی قیمت ہمیشہ افادۂ مختتم کے مساوی ہوتی ہے
یا اس سے کم۔ افادۂ مختتم سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس امر میں سراسر
خریدار کا نقصان ہے پس ان ہزار چیزوں میں کچھ تو مثلاً ۸ سو ایسی ہوں گی
جن پہ تھوڑا بہت نفع المصرف حاصل ہوتا ہے یعنی جو دس روپے کی بجائے
بارہ بلکہ پندرہ تک فروخت ہوجائیں۔ اور باقی دو سو وہ ہیں جن کا
افادہ دس روپے قیمت کے مساوی ہے یعنی جو دس سے زیادہ پر
فروخت نہ ہوتیں اور جن کے خریداروں کو کوئی قابل لحاظ نفع المصرف
نہیں ملتا۔ ان ہی دو سو چیزوں کا افادہ تو اصطلاحاً افادۂ مختتم کہلاتا ہے اور
کل چیزوں کی قیمت اُسی کے برابر قرار پاتی ہے اب اگر قیمتِ رسد گھٹ کر
لعہ رہ جائے تو غالباً ایک ہزار کی بجائے بارہ سو چیزیں فروخت ہوں گی۔
اس کے یہ معنی یہ ہوئے کہ ان جدید دو سو چیزوں کا افادہ دس روپے
سے تو یقیناً کم ہے اور اسی وجہ سے وہ بہ نرخ دس روپے نہیں خریدی جاتی
تھیں لیکن چونکہ وہ لعہ کے نرخ سے خریدی گئیں لہٰذا صاف ظاہر ہے
کہ یا تو ان کا افادہ لعہ کے برابر ہے یا اس سے کچھ تھوڑا سا زیادہ۔ اب
اگر قیمت اور بھی گھٹ کر صرف نو روپے رہ جائے تو غالباً ڈیڑھ ہزار چیزیں
فروخت ہوں گی۔ ان جدید تین سو چیزوں کا افادہ لعہ سے تو یقیناً کم ہے
لیکن وہ یا تو لعہ کے مساوی ہے یا اُس سے کچھ یوں ہی سا زیادہ۔ حاصل کلام
یہ کہ ایک ہزار چیزوں کا افادۂ مختتم عـہ ہے بارہ سو کا لعہ اور ڈیڑھ ہزار کا
لعہ گویا ہزار کے بعد دو سو کا افادہ لعہ ہے اور اُن کے بعد تین سو کا صرف
لعہ۔ جبکہ سرکار ایک روپیہ فی چیز امداد دے اور قیمتِ رسد دس روپے
سے گھٹ کر لعہ فی چیز ہوجائے ایسی حالت میں ہمارے مفروضے کی رو
سے بجائے ایک ہزار کے ڈیڑھ ہزار چیزیں فروخت ہوں گی اور سرکار کو
بھی ایک روپیہ فی چیز کے حساب سے ڈیڑھ ہزار روپیہ بطور امداد دینا پڑیگا۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ اس امداد اور تخفیف قیمت کی بدولت خریداروں کے

نفع المصرف میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے، پہلے ایک ہزار کے خریداروں کو تو صریحاً ایک ہزار روپے کے ہم قدر مزید نفع المصرف حاصل ہوگا جبکہ وہ ہزار چیزیں دس روپے کے نرخ سے خریدتے تھے اور اب لعہ کے نرخ سے لیتے ہیں تو اُن کے نفع المصرف میں بمقدار ایک ہزار اضافہ صاف ظاہر ہے۔ لیکن ہزار کے بعد دو سو چیزوں کے خریداروں کو صرف ۸ر فی چیز کے حساب سے بقدر سو روپیہ نفع المصرف ملے گا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لعہ کے نرخ سے ۲ سو چیزیں خرید سکتے تھے لیکن اب وہ اُن کو لعہ کے نرخ سے مل گئیں۔ اور سو روپے کے ہم قدر نفع المصرف حاصل ہوا۔ حالانکہ سرکار کو اُن دو سو چیزوں پر بھی دو سو روپے امداد دینی پڑی۔ گویا سرکار کی گرہ سے تو دو سو روپے گئے اور خریداروں کو صرف بقدر سو روپیہ نفع المصرف ملا۔ اب باقی تین سو چیزوں کے خریداروں کو لیجئے۔ ہمارے مفروضے کے مطابق وہ لعہ سے زیادہ قیمت پر یہ چیزیں نہ خریدتے گویا ان میں سے اکثر چیزوں کا افادہ لعہ کے برابر ہے۔ ان پر کچھ نفع المصرف نہیں ملتا۔ پس جب قیمت علہ سے گھٹ کر لعہ ہو جائے اور یہ تین سو چیزیں بھی فروخت ہوسکیں تو ان پر کچھ نفع المصرف نمودار نہ ہوگا اور ہوگا بھی تو نہایت کم۔ گویا سرکار کو تو ان پر بھی مثل دوسری چیزوں کے بحساب عہ فی چیز تین سو روپے بطور امداد دینا پڑا لیکن خریداروں کو بہت ہی کم نفع المصرف میسر ہوا۔ حاصل کلام یہ کہ سرکار کو تو ڈیڑھ ہزار روپیہ بطور امداد دینا پڑا لیکن خریداروں کے نفع المصرف میں تخمیناً ۱۱-۱۲ سو روپے کے ہم قدر اضافہ ہوا اور بس یہی واقعہ جو مثال سے بالتفصیل واضح کیا گیا مختصراً یوں بیان ہوسکتا ہے کہ سرکاری امداد سے جب بقدر امداد قیمت گھٹے اور چیزوں کی خرید بڑھے تو اُن چیزوں پر جو قبل امداد بھی خریدی جاتی تھیں خریداروں کو اسی قدر زائد نفع المصرف حاصل ہوگا جتنی امداد کہ سرکار چیزوں کے واسطے دے لیکن جو چیزیں کہ بوجہ تخفیف قیمت بعد امداد خریدی جائیں اُن پر سرکار جس قدر امداد دے گی اس سے کم مزید نفع المصرف خریداران کے

ہاتھ آئے گا۔ اب اگر فروشندے بغیر امداد بطورِ خود قیمت رسد گھٹائیں تب بھی اُن کے اور خریداروں سے مابین وہی نتائج ظہور پذیر ہوں گے جتنی قیمت میں جس قدر مجموعی تخفیف ہو گی نفع المصرف میں اس کے مقابل اضافہ کم ہو گا؛

اوپر کی بحث کا ماحصل یہ نکلا اگر کسی چیز کی پیدائش قانونِ استقرار حاصل کی پابند ہو اُس پر محصول قائم کیا جائے اور بقدرِ محصول اس کی قیمتِ رسد میں اضافہ نمودار ہو تو اس طرح سے سرکار کو جو آمدنی حاصل ہو گی اُس سے کہیں زیادہ خریداروں کا نفع المصرف ضائع اور برباد ہو جائے گا۔ اگر کارخانے بطورِ خود قیمت بڑھادیں تو اُن کی حیثیت محصول لینے والی سرکار کی سی ہو گی اور اُن کے اور خریداروں کے مابین وہی نتائج پیدا ہوں گے جو اوپر بیان ہوئے اسی طرح اگر سرکار امداد دے اور بقدرِ امداد قیمت رسد میں تخفیف ہو جائے تو اس طرح پر سرکار جس قدر امداد میں صرف کرے گی۔ خریداروں کے نفع المصرف میں اس سے کم اضافہ ہو سکے گا نیز اگر قیمتِ رسد میں بطورِ خود تخفیف کر دی جائے تو مجموعی تخفیف کی مقدار اضافۂ نفع المصرف سے زیادہ رہے گی گویا جب کہ پیداوار قانونِ استقرار حاصل کی پیرو ہو تو:۔

ا۔ ایسے محصول سے جو کہ بشکل اضافۂ قیمت نمودار ہو سرکار کو جس قدر آمدنی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ خریداروں کے نفع المصرف میں کمی آجاتی ہے؛

ب۔ ایسی سرکاری امداد میں جو تخفیف قیمت کا باعث ہو سرکار کو جس قدر صرف کرنا پڑتا ہے خریداروں کے نفع المصرف میں اس سے کم اضافہ ہوتا ہے؛

پس عملی نتیجہ یہ نکلا کہ جو چیز قانونِ استقرار حاصل کے ماتحت ہو اس پر ایسا محصول عائد کرنا قیمت رسد میں ہم قدر اضافہ کردے یا اُس کو سرکاری امداد دینا تاکہ قیمت میں ہم قدر تخفیف ہو جائے مضر یا کمتر مفید ہے بحالتِ اوّل

حصۂ پنجم
باب بست و ششم

تو سرکار کو جس قدر آمدنی ہوتی ہے۔ خریداروں کے نفع المصرف کا اس سے نہیں زیادہ نقصان ہو جاتا ہے اور بحالتِ دوم سرکار جس قدر خرچ کرتی ہے خریداروں کے نفع المصرف میں اتنا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ اس سے کم رہتا ہے ؛

محصول اور سرکاری امداد کی مثال لے کر اب اضافہ و تخفیف قیمت کا ایسی چیزوں کے نفع المصرف پر اثر دریافت کرنا مقصود ہے جو قانون تقلیل حاصل کی پابند ہوں کئی طرح پر یہ تحقیق سرانجام پا سکتی ہے۔ لیکن یہاں سب سے سادہ اور مختصر طریق اختیار کیا جاتا ہے۔ جبکہ محصول قائم ہونے سے قیمت میں اضافہ ہو تو چیزوں کی خریدیں اور لہذا پیداوار میں ضرور تخفیف ہوگی۔ اور چونکہ قانونِ تقلیل حاصل پیدائش پر مسلط ہے۔ مقدارِ پیداوار گھٹنے سے مصارفِ پیدائش میں ضرور تخفیف ہوگی نتیجہ یہ ہے کہ محصول قائم ہونے کے بعد قیمت میں جو اضافہ ہوگا وہ مقدارِ محصول سے کم ہوگا اور اس کمی کا باعث وہی تخفیفِ مصارف پیدائش ہے جو قانون تقلیل حاصل کی بدولت مقدار پیداوار گھٹنے سے نمودار ہوئی۔ اس حالت میں تین نتیجے ممکن ہیں اگر قانونِ مذکور کا عمل ضعیف ہے گویا مقدار پیداوار بہت زیادہ گھٹے تب کہیں مصارفِ پیدائش میں تھوڑی سی تخفیف ہو سکے تو سرکاری آمدنی کے مقابل زیادہ نفع المصرف ضائع ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس قدر زیادہ نہیں جتنا کہ قانونِ استقرار حاصل کی صورت میں ہوتا۔ اعتدالی حالت میں ممکن ہے کہ سرکاری آمدنی اور ضائع شدہ نفع المصرف برابر ہیں یا بہت تھوڑا فرق رہے۔ لیکن اگر قانونِ تقلیل حاصل کا عمل بہت قوی ہوتا کہ تھوڑی سی مقدار پیداوار گھٹنے سے مصارفِ پیدائش میں بہت بڑی تخفیف ہو جائے تو اس صورت میں سرکاری آمدنی کے مقابل بہت کم نفع المصرف ضائع ہوگا۔ گویا قیامِ محصول کی یہ سب سے بہتر صورت ہے۔ سرکار کو تو معقول آمدنی ہوتی ہے اور خریداروں کا بہت کم نفع المصرف ضائع ہوتا ہے ؛

حصۂ پنجم
باب ہشتم

لیکن سرکاری امداد کی حالت بالکل برعکس ہے۔ قیمت گھٹنے سے چیزوں کی خرید اور لہذا پیداوار بڑھے گی۔ لیکن قانون تقلیل حاصل کے مطابق مقدار پیداوار بڑھنے سے مصارف پیدائش میں اضافہ ہوگا۔ لہذا سرکاری امداد کی بدولت قیمت میں جو تخفیف ہوگی وہ اتنی نہ ہوسکے گی جتنی کہ قانون استقرار حاصل کی صورت میں ہوتی۔ اس فرق کا باعث وہی مصارف پیدائش کا اضافہ ہے۔ لیکن اس سے قبل واضح کیا جاچکا ہے کہ قانون استقرار حاصل کی حالت میں بھی سرکار امداد میں جس قدر صرف کرے اس کے برابر نہیں بلکہ اس سے کم نفع المصرف بڑھ سکتا ہے پس قانون تقلیل حاصل کی صورت میں تو سرکاری امداد کے مقابل نفع المصرف میں اور بھی بہت کم اضافہ ہوگا اور مذکورۂ بالا تینوں صورتوں میں جب کہ قانون تقلیل حاصل کا عمل ضعیف معتدل یا قوی ہو۔ علے الترتیب نفع المصرف میں بہت کم اضافہ ہوسکے گا۔ پس واضح ہوا کہ سرکاری امداد کی یہ سب سے ناموزوں صورت ہے۔ سرکار تو بہت کچھ خرچ کرے اور خریداروں کے نفع المصرف میں بہت کم اضافہ ہو جیسا کہ ہم تمہید میں واضح کرچکے ہیں۔ بحث میں سہولت بیشک ضروری اور مفید ہے مگر حد اعتدال تک۔ جو سہولت غور وفکر کی ضرورت نہ چھوڑے وہ دماغ کے واسطے مضر اور مقصد تعلیم کے منافی ہے۔ قانون تقلیل حاصل کی مذکورۂ بالا بحث اعدادی مثالوں کے ذریعے سے اور بھی سہل ہوسکتی تھی اگرچہ طویل بھی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ہم نے قصداً صرف مختصر مگر صاف بیان پر اکتفا کیا ہے۔ اور یہی طریق ذیل میں قانون تکثیر حاصل کے ساتھ برتا ہے۔ ناظرین سوچ سمجھ کر خود ہی مثالیں تیار کریں تو مباحث بھی بدرجۂ اولیٰ ذہن نشین ہوجائیں گے اور دماغی نشوونما پر بھی ایسی کوشش کا نہایت مفید اثر پڑے گا۔

اب تیسری حالت کو لیجئے یعنی جبکہ پیداوار قانون تکثیر حاصل کی تابع ہو محصول قائم ہونے سے جو قیمت بڑھے گی اور چیزوں کی خرید کم

ہونے سے جو پیداوار گھٹے گی تو مصارفِ پیدائش بھی مقابلۃً ضرور بڑھ جائیں گے گویا قیمت میں محصول کی مقدار سے زیادہ اضافہ نمودار ہوگا۔ قانونِ استقرارِ حاصل کی بحث میں واضح ہوچکا ہے کہ جب قیمت میں مقدارِ محصول کے مساوی بھی اضافہ نمودار ہو تو سرکاری آمدنی سے بڑھ کر نفع المصرف ضائع ہوجاتا ہے پس اس حالت میں جبکہ قیمت مقدارِ محصول سے بھی بڑھ جائے۔ سرکاری آمدنی کے مقابل کہیں زیادہ نفع المصرف سے خریدار محروم ہوجائیں گے گویا محصول قائم کرنے کیلئے یہ سب سے ناموزوں حالت ہے لیکن اس کے برعکس اگر ایسی پیداوار پر سرکار امداد دے، تو قیمت گھٹنے پر جو خریداور لہذا پیداوار میں اضافہ ہوگا تو بمعاونت قانونِ تکثیرِ حاصل مصارفِ پیدائش میں شرحِ امداد سے کہیں زیادہ تخفیف ہوسکے گی۔ بالخصوص اگر قانون کا عمل قوی ہے تو قیمت میں اس قدر کمی ہوجائے گی کہ سرکار کو امداد میں جس قدر صرف کرنا پڑے اُس سے کہیں زیادہ نفع المصرف خریداروں کو حاصل ہوگا۔ گویا سرکاری امداد کے واسطے یہ حالت از حد موزوں ہے۔

اوپر کی کل بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے:۔

الف۔ بحالتِ عملِ قانونِ استقرارِ حاصل محصول سے جس قدر آمدنی ہوگی اُس سے زیادہ نفع المصرف ضائع ہوگا اور امداد پر جس قدر صرف ہوگا نفع المصرف میں اُس سے کم اضافہ ہوسکیگا۔

ب۔ بحالتِ عملِ قانونِ تقلیلِ حاصل محصول سے جس قدر آمدنی حاصل ہوگی نفع المصرف میں اُس سے کم تخفیف ہوگی۔ گویا محصول لگانے کی یہ سب سے موزوں صورت ہے اور سرکاری امداد پر جس قدر صرف ہوگا نفع المصرف میں اس سے بہت کم اضافہ ہوسکے گا۔ گویا سرکاری امداد کے واسطے یہ سب سے ناموزوں حالت ہے۔

ج۔ بحالتِ عملِ قانونِ تکثیرِ حاصل محصول سے جس قدر آمدنی

ہوگی اُس سے بہت زیادہ تخفیف نفع المصرف میں نمودار ہوجائیگی
گویا محصول کے واسطے یہ ازحد ناموزوں حالت ہے۔ اس کے
برعکس سرکاری امداد پر جس قدر صرف ہوگا نفع المصرف میں
اس سے بہت زیادہ اضافہ ہوسکے گا۔ گویا سرکاری امداد کیواسطے
بغایت موزوں حالت ہے ؛

تینوں مندرجۂ بالا صورتوں میں اگر محصول یا امداد کے بغیر قیمت رسد میں بطور خود اضافہ یا تخفیف کی جائے تو فروشندوں اور خریداروں کے باہم وہی نتائج ظہور پذیر ہوں گے جو سرکار اور خریداروں کے باہم واضح کئے گئے۔ خریداروں کا فریق تو وہی رہے گا۔ صرف فریق ثانی بجائے سرکار کے فروشندے بن جائیں گے ؛

خاتمے پر ایک نکتے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اوپر کی کل بحث میں بغرض سہولت و اختصار ہم نے فریقین یعنی سرکار اور خریداروں کے معیار افادے کو یکساں مان لیا ہے۔ یعنی یہ فرض کرلیا ہے کہ مثلاً عہ/ یا ۸/ کا ہم مقدار اضافہ سب کی نظر میں مساوی ہے مالی حالت کے فرق کی وجہ سے جو معیار افادہ بدل جاتا ہے اور غریب آدمی کا ۴/ کا ہم قدر افادہ امیر کے عہ/ کے ہم قدر افادے سے بڑھ جاتا ہے سو اس تفاوت کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ اگر کیا جائے تو پھر متعدد دقیق مگر دلچسپ و مفید نتائج نکلیں گے جن کی تفصیل بخوف طوالت ترک کی جاتی ہے لیکن جن کا استخراج کچھ دشوار نہیں۔ شائق ناظرین اگر چاہیں تو خود غور کرکے ایسے علمی نتائج اخذ کرسکتے ہیں۔ کم از کم اس نکتے کا خیال رکھنا ضروری ہے اس کو نظر انداز کرنے سے حالاتِ واقعی اور نتائج علمی میں بُعد بلکہ تضاد پیدا ہوجائے تو عجب نہیں۔ علم المعیشت بالخاصہ وسعتِ نظر کا خواستگار ہے اگرچہ وہ سہولت کم کردے لیکن اس سے صحت میں ضرور قابل قدر اضافہ ہوگا ؛

نفع المصرف معاشیات میں ایک نازک مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں اس کے متعلق تازہ ترین

حصّۂ پنجم
باب بیست و ہفتم

تحقیقات کا ماحصل مختصر اور سیدھے سادے طور پر پیش کر دیا گیا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ اس مسئلے کو روز افزوں توجہ حاصل ہوگی اور علم المعیشت کی ترقی کے واسطے ابھی اس شعبے میں بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔

افادۂ اتم

۴ اس سے قبل افادے کا مفہوم اسکی قسمیں مثلاً افادۂ مختتم و افادۂ کلی اور نیز قوانین تکثیر افادہ و تقلیل افادہ بیان ہو چکے ہیں یہاں پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ افادۂ کلی کی مقدار کیونکر بڑھتی ہے۔ اس کا اضافہ کس کس طرح ممکن ہے۔ انگریزی میں تو افادۂ کلی کی سب سے بڑی قابل حصول مقدار کا ایک جداگانہ نام رائج ہے۔ لیکن ہم کوئی نئی اصطلاح بڑھانے کی بجائے اس کو افادۂ اتم سے تعبیر کرنا بہتر سمجھتے ہیں پس افادۂ اتم سے افادۂ کلی کی وہ بڑی سے بڑی مقدار مراد ہے جو کسی چیز سے حاصل ہو سکے۔

جا بجا یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ مبادلہ یا خرید و فروخت سے ہر فریق کے افادۂ کلی میں کیونکر اضافہ ہوتا ہے مثلاً جب کہ دو شخص آپس میں گھوڑے اور سائکل کا مبادلہ کریں تو صاف ظاہر ہے کہ ہر فریق کی نظر میں دوسرے کی چیز کا افادہ بڑھا ہوا ہے۔ گھوڑا دینے والے کو سائکل میں زیادہ افادہ نظر آتا ہے اور سائکل دینے والے کو گھوڑے میں اگر ایسا نہ ہوتا تو مبادلہ ہی کیوں عمل میں آتا۔ پس مبادلے سے قبل ان دو چیزوں کا جو کچھ افادۂ کلی تھا بعد مبادلہ وہ ضرور تھوڑا بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ یہ ایک مسلمہ معاشی مسئلہ ہے کہ مبادلے سے اشیائے متبادلہ کے افادۂ کلی کی مقداریں بڑھ جاتی ہیں اگر سیدھے سادے مبادلے کی بجائے خرید و فروخت کو لیجئے تو مبادلۂ زر کے توسل ہونے سے اس کی اس خاصیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا صرف عمل ذرا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی براہ راست چیزیں لینے دینے کی بجائے زر کے وسیلے سے اُن کو لیتے دیتے ہیں اور خرید و فروخت میں بھی ہر فریق کا افادۂ کلی اس طرح بڑھتا ہے جیسے کہ مبادلے میں۔

افادۂ کلی کے اضافے کا طریق تو دریافت ہو گیا کہ وہ مبادلہ ہے اب تحقیق طلب یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کو افادۂ اتم کیونکر حاصل ہوتا ہے اور کس حالت میں فریقین کے افادہائے کلی کی مجموعی مقدار سب سے بڑی

حصۂ پنجم
باب بست ونہم

جو بہ حیثیت اولیٰ افادۂ اتم کہلانے کی مستحق ہوگی۔ گویا افادۂ اتم کے دو مفہوم ہوئے
کسی ایک فریق کے افادۂ کلی کی سب سے بڑی مقدار یا ہر دو فریق کے
افادہ ہائے کلی کی سب سے بڑی مجموعی مقدار۔ افادۂ اتم حسب موقع ہر دو
مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ مفہوم مقصود واضح کر دیا گیا ہے۔ ہر دو مفہوم کا فرق ظاہر
کرنے کے علاوہ یہ بتا دینا بھی برمحل ہوگا کہ اس بحث کا اصل مقصود افادۂ اتم
ہے۔ یعنی ہر دو فریق کے افادہ ہائے کلی کی سب سے بڑی مجموعی مقدار۔

فرض کرو لوگ ۵ر کے نرخ سے صرف ہزار چیزیں خریدنے پر
آمادہ ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں تو غالباً ان میں سے بہت سی چیزوں کا افادہ
خریداروں کی نظر میں ۵ر سے زیادہ ہوگا۔ افادے کی یہ زائد مقدار نفع المصرف
کہلائے گی۔ بعض کا افادہ ۵ر کے مساوی بھی ہو تو عجب نہیں۔ اس افادے
کو افادۂ مختتم سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن لوگ جو ہزار سے زائد چیزیں نہیں
خریدتے تو معلوم ہوا کہ ہزار کے بعد والی چیزوں کا افادہ قانون تقلیل افادہ
کے بموجب ان کی نظر میں ۵ر سے کم ہے۔ گویا ہزار چیزیں خریدنے سے
جس قدر افادہ حاصل ہوا وہ افادے کی سب سے بڑی قابل الحصول
مقدار ہے۔ اصطلاحاً ہزار چیزوں کا افادہ افادۂ اتم کہلائے گا۔ ہزار
کے بعد کوئی چیز بہ نرخ ۵ر خریدنے سے افادے کی موجودہ مقدار
میں اضافہ ہونے کی بجائے الٹی تخفیف ہوگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ
ہزار پر خریداری بند کر دیتے ہیں۔ اصطلاحی زبان میں اس واقع کو مختصراً
یوں بیان کر سکتے ہیں کہ لوگ افادۂ اتم کی حد تک چیزوں کی خریداری بند
کرتے ہیں اور اسی حد کا اصطلاحی نام افادۂ مختتم ہے۔ اب اگر فروشندے
بھی صرف ایک ہزار چیزیں ۵ر کے نرخ سے فروخت کرنے کو تیار ہوں
یعنی ان کو بھی اسی مقدار کی فروخت سے افادۂ اتم حاصل ہو تو یہ حالت
اصطلاحاً توازن طلب و رسد کہلائے گی اور فریقین کے افادوں کی
مجموعی مقدار سب قابل حصول مقداروں سے بڑھی رہے گی کیونکہ اگر
فروشندے ہزار سے کم مثلاً صرف ۵سو چیزیں فروخت کرنے پر رضامند

حصّۂ پنجم
بابِ پنجم

ہوتے تو اُن کو تو افادۂ اتم حاصل ہو جاتا لیکن خریداروں کو حاصل نہ ہوتا کیونکہ وہ ہزار چیزیں خریدنا چاہتے تھے اور ۸۰۰ چیزوں کے افادے سے وہ محروم رہتے۔ اس کے برعکس اگر فروشندے ہزار سے زیادہ مثلاً ۱۲۰۰ چیزیں فروخت کرنے کے خواہشمند ہوتے تو خریداروں کو تو ایک ہزار خریدنے سے افادۂ اتم حاصل ہو جاتا لیکن فروشندے ۲ سو کے افادے سے محروم رہتے۔ حاصل کلام یہ کہ توازنِ طلب و رسد کی حالت میں دونوں فریق کو افادۂ اتم حاصل ہو جاتا ہے اور لہٰذا ان کی مجموعی مقدار سب سے زیادہ رہتی ہے اور یہ درجۂ اولیٰ افادۂ اتم کہلاتی ہے اور عدم توازن کی حالت میں کسی ایک فریق کو افادۂ اتم حاصل ہوتا ہے اور دوسرے کو نہیں اس لیے مجموعی مقدار گھٹی رہتی ہے۔ پس اب اس معاشی مقولے کا سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ توازنِ طلب و رسد کی حالت میں افادۂ اتم حاصل ہوتا ہے۔ دوسری حالت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ اسی مقولے میں افادۂ اتم میں فریقین کے افادوں کا مجموعہ شمار کیا جاتا ہے صرف کسی ایک فریق کے افادۂ اتم سے بحث نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک قیمتِ طلب رسد سے بڑھی رہتی ہے خرید و فروخت جاری رہتی ہے حتیٰ کہ یہ دونوں قیمتیں برابر آ لگیں۔ فروشندے کو جو زیادہ سے زیادہ قیمت خریدار دے سکیں اور جو کم از کم قیمت فروشندے لے سکیں وہ مقدار مساوی ہوں اس کے بعد اگر قیمتِ طلب قیمتِ رسد سے گھٹی تو لازماً خریداری بند ہو جائے گی۔ اب اگر وہ زیادہ سے زیادہ مقداریں جو اس قیمت پر فریقین خریدنا اور فروخت کرنا چاہیں مساوی ہو جائیں تو یہی حالتِ توازنِ طلب و رسد سمجھنی چاہیے اور جب کہ ایک ہی زیادہ سے زیادہ مقدار کی قیمتِ طلب و قیمتِ رسد بھی مساوی ہو جائیں تو فریقین میں ہر ایک کو افادۂ اتم حاصل ہوگا اور اُن کی مجموعی مقدار بدرجۂ اولیٰ افادۂ اتم شمار ہوگی اور یہی آخر الذکر افادۂ اتم اس بحث کا مقصود ہے۔

حصۂ پنجم
باب بست و ہشتم

جب کہ لوگوں کو کاروبار میں کامل آزادی حاصل ہو جیسی کہ آج کل ہے ۔ جو چیز چاہیں اور جس قیمت پہ چاہیں فروخت کریں تو بیشک توازن طلب و رسد کی حالت میں فریقین کو جس قدر افادۂ کلی حاصل ہوتا ہے وہی افادۂ اتم ہے ۔ اس خاص حالت میں یہ معاشی مقولہ بالکل بجا اور درست ہے لیکن وسعت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر اس آزادی کو خوشی یا جبراً چند اصول کا پابند کر دیا جائے تو توازن طلب و رسد سے جو قدر افادۂ کلی حاصل ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ افادۂ اتم حاصل ہونا ممکن ہے ۔ البتہ یہ سوال کہ ایسا طریق عملدرآمد کہاں تک ممکن اور قرین مصلحت ہے اس کا جواب آسان نہیں اور نہ اس بحث کو چھیڑنے کا یہاں موقع ہے صرف مجوزہ طریق کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھائے دیتے ہیں کہ اس پر عملدرآمد کرنے میں اور بھی بہت سے پہلو پیش نظر رکھنے ضروری ہیں جن کی طویل تفصیل اشتراک اور مالیات کے مباحث میں تلاش کرنی چاہیئے ۔

اوّل توازن طلب و رسد کو لیجئے فرض کیجئے کہ ہزار چیزیں اور صرف ہزار ہی روپے کے نرخ سے خرید و فروخت ہو سکیں ۔ اب اگر کسی وجہ سے ان چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہے یعنی اُن کی قیمت میں معقول اضافہ ہو جانے سے بھی طلب میں کوئی قابلِ لحاظ کمی واقع نہ ہو ۔ اگر خریدار خوش حال ہیں اور چیزیں بنانے والے غریب لوگ ہیں اور وہ متفق ہو کر چیزوں کی قیمت سے لے لیں تو توازن درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ نئی شرح سے لوگ غالباً نو سو سے زیادہ چیزیں نہ خریدیں گے اور بنانے والے بارہ سو تک فروخت کرنے پر آمادہ ہوں گے لیکن یہ جدید نو سو روپے خوش حال خریداروں کی جیب سے نکل کر غریب فروشندوں کے ہاتھ آئیں گے اُن کے افادے میں زمین آسمان کا فرق پڑ جائے گا ۔ ایک روپے کا جو افادہ امیر کی نظر میں ہوگا غریب کو اُس کا چند در چند نظر آئیگا ۔ گویا یہ نو سو روپے غریب لوگوں میں پہنچ کر امیروں کے معیار سے کئی ہزار روپے

کے برابر افادہ دیں گے خصوصاً اگر پیداوار قانونِ تقلیل حاصل کی پیرو ہوئی تو ہزار کی بجائے نو سو چیزیں بننے سے مصارف میں کمی آکر فروشندوں کو نو سو کے علاوہ کچھ اور بھی بچت ہو سکے گی۔ قانونِ تکثیر حاصل کی صورت میں نتیجہ برعکس ہوگا یعنی اضافۂ مصارف کی بدولت بچت نو سو سے بھی کم رہے گی۔ حاصل کلام یہ کہ اگر چیزیں بنانے والے غریب لوگ ہوں اور خریدار امیر اور چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہو تو قیمت میں اضافہ ہونے سے خواہ طلب و رسد کا توازن غائب ہو جائے لیکن فریقین کے افادے کی مجموعی مقدار بڑھ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر فروشندے خوشحال ہیں اور خریدار غریب اور فریقِ اوّل بلا لحاظ توازنِ طلب و رسد کے اپنا نقصان کر کے بھی چیزیں ارزاں فروخت کرے تو فریقین کے افادے کی مجموعی مقدار ضرور بڑھ جائے گی قیمت گھٹنے سے طلب کم و بیش ضرور بڑھے گی۔ اب اگر پیداوار قانونِ تقلیل حاصل کی پابند ہے تو فروشندوں کو سخت دقت کا سامنا ہوگا۔ ایک طرف تو قیمت گھٹی اور دوسری طرف مصارف بڑھ گئے لیکن اگر قانونِ تکثیر حاصل کا دور دورہ ہوا تو پھر کیا کہنا۔ تخفیفِ قیمت سے اگر فروشندوں کو کچھ نقصان بھی برداشت کرنا پڑا تو تخفیفِ مصارف اُس کی کم و بیش تلافی کرتی رہے گی۔ امیر فروشندے تو کم خسارہ اُٹھائیں گے لیکن غریب خریدار مالا مال ہو جائیں گے۔ اشتراک کا ایک اساسی اصول ہے کہ اگر امرا کی دولت غربا میں تقسیم کر دی جائے تو مجموعی افادے کی مقدار بہت کچھ بڑھ سکتی ہے اسی انتقالِ دولت کی دو شکلیں اوپر بیان ہوئیں اور اسی اصول کے مجموعی افادے میں اضافہ ہوگا۔

اب آزادیِ خرید و فروخت کو لیجئے۔ اگر لوگ خود خیال کر کے یا کسی قانون کی مجبوری سے اپنی دولت اس طرح پر صرف کریں کہ غریب لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو تو اس صورت میں دولت کا مجموعی افادہ بہت بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر صرفِ دولت سے امیر طبقے کی آمدنی میں اسی قدر

حصۂ پنجم
باب بست و ہفتم

بلکہ اُس سے زیادہ بھی اضافہ ہو تو افادے کا مجموعہ اوّل الذکر مجموعے سے ضرور کم رہے گا امیر آدمی کو ع رٹنے سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی کہ غریب کو ایک آنہ ملنے سے یعنی غریب کو ایک آنہ دینے سے جسقدر افادہ بڑھتا ہے امیر کو ع رد دینے سے نہیں بڑھتا اکثر رحم دل لوگ جہاں تک ممکن ہوتا ہے خاص خیال کر کے غریب مزدور سے کام کراتے ہیں غریب دُکاندار سے سامان خریدتے ہیں۔

افادۂ اتم بڑھانے کی جو دو صورتیں اوپر بیان ہوئیں اُن میں ایک گروہ خوش حال فرض کیا گیا اور دوسرا غریب۔ لیکن اگر سب لوگوں کی مالی حالت یکساں مان لی جائے تب بھی افادۂ اتم کے اضافے کی دو صورتیں قابل توجہ ہیں:

جو لوگ ایسی چیزیں خریدتے ہیں جن کی پیدا وار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے وہ اُس کی طلب بڑھا کر اُس کو گراں بناتے ہیں۔ گویا سب کی آمدنی کے افادے کی مقدار گھٹاتے ہیں۔ اُس کے برعکس جو لوگ قانون تکثیر حاصل کے پیرو چیزیں خریدتے ہیں وہ اُن کی طلب بڑھا کر قیمت گھٹاتے اور سب کی آمدنی کے افادے میں اضافہ کر دیتے ہیں گویا ہم اپنی دولت صرف کر کے چیزوں کی گرانی اور ارزانی بڑھا سکتے ہیں اور عوام کی دولت کا افادہ گھٹانا بڑھانا بہت کچھ افراد کی خرید و فروخت پر منحصر ہے جہاں تک ہو سکے اوّل قسم کی چیزوں سے دست کش رہنا چاہیئے اور قسم دوم کو صرف میں لانا چاہیئے اس میں سب کا فائدہ ہے۔

اگر عوام مذکورۂ بالا ہدایت پر کاربند نہ ہوں تو سرکار اُن کو ایک حد تک کاربند بنا کر افادے میں معقول اضافہ کر سکتی ہے۔ طریق یہ ہے کہ قانون تقلیل حاصل والی چیزوں پر ٹکس یا محصول قائم کر دے اور قانون تکثیر حاصل والی چیزوں کو مالی امداد دے۔ نفع المصرف کی بحث میں واضح ہو چکا ہے کہ عوام کے حق میں بحیثیت مجموعی یہ ترکیب مفید ہو گی:

حصۂ پنجم
بابِ بست و ششم

واضح ہو کہ عوام کے افادے کی مجموعی مقدار بڑھانے کی جو تجاویز اوپر بیان کی گئیں وہ ازحد سادہ ہیں۔ اُن کو پیش کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ افادۂ اتم جیسے اہم مسئلے پر خیالات دوڑانے کی راہیں سوجھائی جائیں۔ ایسی تجاویز کو قابلِ عمل قرار دینا گورکھ دھندے سلجھانے اور بھول بھلیّوں کا پتہ لگانے سے کم نہیں۔ مالیات اور اشتراک کی بڑی ضخیم ضخیم کتابیں اس قسم کی تجاویز اور اُن کی نکتہ چینیوں سے لبریز ہیں۔ گو اس مسئلے کا کوئی قطعی حل دشوار بلکہ محال ہے لیکن تحقیقات سے جن اُصول کا پتہ لگا ہے اُن پر عملدرآمد ہونے سے یقیناً عوام کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ گو تشریح کی گنجائش نہ تھی لیکن کم از کم اس مسئلے کا حوالہ دینا یہاں ضروری معلوم ہوا۔

معیارِ زندگی

۵۔ اس مسئلے پر بھی ازحد اختلافِ رائے پھیلا ہوا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے زندگی کا کونسا معیار بہتر ہے۔ آیا ہم کو چند سیدھی سادھی ضروریات پر قناعت کرنا اچھا ہوگا یا دُنیا کی نعمتوں اور تعیّشات سے دل بھر کر لطف اُٹھانا چاہیئے۔ حکما کے ایک طبقے نے تو نفس پروری اور عشرت پرستی کو زندگی کی غرض و غایت قرار دے دیا اور دوسرے نے نفس کشی اور ریاضت کو زندگی کا اعلیٰ مقصد ٹھیرایا۔ سچ پوچھیئے تو یہ دونوں فرقے افراط و تفریط میں جا پھنسے۔ خدا کی بے شمار عطیّات سے خواہ مخواہ دست کش رہنا بھی کفرانِ نعمت ہے اور تمام عمر تن پروری کی نذر کر دینا اور بھی گمراہی ہے۔ دُنیا کی لذّتوں کا لطف اُٹھانا اور پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار ہی لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق یہی ہے۔ اور مذہبی اور اخلاقی پہلو سے قطعِ نظر کر کے یہی طریقِ اعتدال معاشی نقطۂ نظر سے اصولاً اور تجربۃً بہترین ثابت ہو رہا ہے۔ اگر لوگ صرف چند محتاجِ زندگی پر قناعت کر بیٹھتے مثلاً سیدھا سادھا کھانا موٹا جھوٹا کپڑا چھوٹے اور کچے جھونپڑے، تو سب کی حالت گویا موجودہ پس ماندہ قوموں کی سی ہوتی۔ یا یوں کہو کہ وہ اپنی صدیوں پہلی حالت پر قائم رہتے اور موجودہ ترقی کا دیکھنا نصیب

حصہ پنجم
باب بست و ہشتم

نہ ہوتا جب لوگ تھوڑے پر قانع ہوتے تو پیدا بھی تھوڑا ہی کرتے اور ہر قسم کی قدرتی نعمتیں اور انسانی قوتیں یوں ہی بیکار پڑے پڑے ضائع ہو جاتیں اور انسان جس دولت پرستی اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیں تب بھی تمدن اور معاشرت کی حالت ضرور ابتر ہو جائے گی۔ انسان کی بے اعتنائیوں سے دولت تباہ ہو جائے گی اور انسانی زندگی خود اس کے حق میں وبال جان بن جائے گی۔ یورپ اور امریکہ میں [illegible] دولت پرستی [illegible] لوگوں نے خور و نوش [illegible] کی بجائے زیست پرستی [illegible] اپنا مسلک بنا رکھا ہے۔ اور ان کی زندگی کسی طرح بھی قابل رشک نظر نہیں آتی۔ اگرچہ تعین دشوار ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس قوم میں دولت کی حالت افراط کی سی ہے اس کی قلت اور کثرت دونوں مضرت رساں ہیں۔ دولت اس قدر ہونی چاہیئے کہ لوگ اعلیٰ اخلاق و عادات قائم رکھ کر زندگی کا لطف اٹھا سکیں نہ دولت کو ترسیں نہ اس کے ڈھیر میں نہ اس سے نفرت کریں نہ اس کو پوجیں۔ دولت کے صحیح مصرف میں کوتاہی نہ کریں اور بیجا طور پر برباد نہ کر سکیں جب کہ اربوں روپیہ شراب اور آوارگی کی سی آتش جہاں سوز کے مشتعل کرنے پر صرف ہو تو ایسی دولت کے ہونے سے نہ ہونا اچھا ہے۔

ہماری احتیاجات میں باہم مقابلہ جاری ہے یعنی وہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ کوئی شخص بہت معمولی لباس پہنتا ہے لیکن کھانا بہت عمدہ کھاتا ہے کوئی عمدہ لباس کا شوقین ہے اور اس کا کھانا بہت سادہ ہوتا ہے۔ کوئی شخص کھانے پہننے میں بہت کم صرف کرتا ہے لیکن کسی خاص شوق کی چیز مثلاً کتابوں گھوڑوں عمارتوں یا رفاہ عام کے کاموں پر دولت لٹاتا ہے۔ غرض کہ ہر شخص اپنی چند در چند احتیاجات کے رفع کرنے میں بعض پر بہت زیادہ صرف کرنا پسند کرتا ہے اور بعض پر کم احتیاجات کے مراتب قرار دینے میں بہت احتیاط شرط ہے کیونکہ اس سے بے حد فائدہ اور مضرت پہنچنا ممکن ہے مثلاً لوگ خور و نوش اور لباس و مکانات میں

حصۂ پنجم
باب بست و ہفتم

صرف بقدرِ ضرورت کرکے اشاعت تعلیم حفظان صحت اور درستی اخلاق پر دل کھول کر دولت لٹادیں تو ملک میں ترقی کے سرچشمے جاری ہوجائیں۔ اس کے برعکس اگر محض نمائش اور آرائش کی چیزوں پر لٹو رہیں بیش قیمت خوراک لباس اور سامان پر اپنی کمائی ضائع کریں اور وسائل ترقی کی طرف سے بے خبر رہیں تو چند ہی روز بعد پچھتانا بھی عجب نہ ہوگا۔ جو لوگ ہندستان کے معیارِ زندگی میں ترقی دکھا کر افزائش دولت ثابت کرنا چاہتے ہیں اُن کو مراتب احتیاجات پر توجہ دلانا ضروری ہے، عام مشاہدہ ہے کہ لوگ لباس اور سامان آرائش کے واسطے جو یورپ کی مصنوعات بکثرت خریدتے ہیں تو یہ مصارف دیگر احتیاجات کے رفع ہونے میں اکثر حارج ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ احتیاجات قابلِ فوقیت ہیں۔ اگر ہمارے نوجوان کروڑہا روپیہ فینسی جرابوں۔ رومال۔ ٹائیوں خوشبودار صابونوں اور جوتوں میں برباد نہ کریں تو نہ صرف ان کے بلکہ اُن کے خاندانوں کے بہت سے بگڑے کام بن جائیں۔ ہماری طالب علمانہ زندگی ہماری مالی حیثیت سے زیادہ بیش خرچ ہے۔ اور اُس سے تعلیم کی اشد ضرورت اشاعت میں بڑا حرج ہو رہا ہے ہمارے طالب علمانہ مصارف میں کفایت کی ضرور گنجائش موجود ہے اور اس اندوختے کے واسطے بہت سے اعلیٰ مصرف منتظر ہیں یہی حال متوسط درجے والوں کا ہے ہر شخص اپنے مصارف پر غور کرے۔ اکثر کو محسوس ہوگا کہ بحالتِ موجودہ احتیاجات کے مراتب قابلِ اعتراض ہیں اکثر اعلیٰ احتیاجات کو پسِ پشت ڈال کر ادر گرد و نواح سے متاثر ہو کر ادنیٰ خواہشات کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں تفصیل کی تو گنجائش نہیں لیکن مجملاً اتنا اشارہ ضروری ہے کہ بحالتِ موجودہ صحت کے بعد تعلیم کا نمبر ہونا چاہئے اور ایسے مصارف جو صحت و اخلاق کو برباد کر رہے ہیں اور بدقسمتی کا ہے روز افزوں تسلط پا رہے ہیں جلد سے جلد ترک کر دیئے جائیں۔ مخصوصاً تمباکو اور شراب کے رواج کی روک تمام بہت عجلت طلب اور ضروری ہے اور زیبائش جسمانی اور آرائش مکانات کے واسطے جو ولایتی مصنوعات خریدے جاتے ہیں

حصۂ پنجم
باب بست و ہشتم

وہ بھی ہماری مالی حالت کے لحاظ سے قبل از وقت ہیں ابھی ہم کو افلاس سے پیچھا چھڑانا ہے۔ جب مالی حالت مستقل طور پر عمدہ ہوجائے تب ان چیزوں کا موقع اور لطف ہوگا۔ بحالت موجودہ تو اُن کا استعمال گویا گھر پھونک تماشا دیکھنا ہے۔

واضح ہو کہ خرچ چلانے کے چار ذریعے ہو سکتے ہیں۔ یا تو انسان خود اپنی قوتِ بازو سے کافی روپیہ کمائے۔ یا اُس کے پاس بزرگوں کا کچھ اندوختہ ہو یا وہ چوری کرے یا بھیک مانگے ہونہار اور ترقی پذیر قومیں خاندان یا افراد خود پیدا کر کے زندگی کا لطف اُٹھاتے ہیں ایسی حالت میں وہ عام ترقی کا بھی باعث بن جاتے ہیں اور اعلیٰ معیارِ زندگی اُن کے واسطے ہر طرح پر مناسب اور موزوں ہے۔ پست ہمت، ناعاقبت اندیش لوگ خود تو کمانے سے رہے جو کچھ بزرگوں کا اندوختہ ملتا ہے اُس کو بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی چند روزہ عیش و عشرت کی خاطر خاک میں ملا کر مدتوں کیواسطے افلاس و نکبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں بہت سے لوگ جو یہ نہیں سمجھتے کہ جتنی چادر ہو اُتنے ہی پیر پھیلانے چاہئیں خواہ آمدنی کم ہو لیکن اُنکے دل میں ہر چیز کا شوق موج زن رہتا ہے ایسے لوگ بالآخر چوری پر اُتر آتے ہیں خواہ وہ دھوکوں سے قرض لیں یا رات کو نقب زنی کریں۔ یا دن دہاڑے عہدوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر رشوت لیں۔ اگر اپنی خواہشات کے غلام بننے کی بجائے اپنے نفس کو قابو میں رکھتے تو یہ نوبت نہ آتی۔

حاصل کلام یہ کہ لذاتِ دُنیا سے لطف اُٹھانے میں مضائقہ نہیں بلکہ زندگی کا معاشی معیار اعلیٰ ہونا بھی ترقی کا خاص باعث اور اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ بشرطیکہ تن پروری زندگی کے دیگر اعلیٰ مقاصد کو دل سے محو نہ کردے، عیش و عشرت مخربِ اخلاق و صحت نہ ہوں۔ سب احتیاجات حسبِ مراتب رفع ہوتی رہیں یہ نہیں کہ چند احتیاجات تو بدرجۂ اعلیٰ پوری ہوں اور دیگر بدرجۂ ادنیٰ جیسا کہ ہندوستان کے سفید پوشوں کا حال ہے اور سب سے بڑی شرط یہ بھی ہے کہ انسان جس قدر خرچ کرے اس سے زیادہ

حصۂ پنجم باب بست و ششم

کیا ئے بھی حقیقی خوش حالی کی علامت یہ ہے کہ زندگی کا معیار اعلیٰ رکھنے پر بھی لوگ اپنی آمدنی میں سے پس انداز کرتے رہیں ورنہ بزرگوں کا اندوختہ خاک میں ملاکر یا کسی مہذب یا غیر مہذب طور پر چوری کر کے یا بھیک مانگ کر اگر چند روزہ لطف اٹھایا تو سمجھ دار اور غیرت مندوں کی نظر میں وہ فاقہ کشی سے بدتر ہے اور ایسے لوگوں کا انجام اکثر عبرتناک ہوتا ہے۔

اکثر لوگ ہندوستان میں ولایتی عطر، صابون، ٹائی، کالر، فینسی جراب وچھڑی، رومال عینک، سگریٹ اور شراب جیسی تعیشات کی فروخت بڑھتی دیکھ کر خوش اور مطمئن ہوتے ہیں ایسے معیار زندگی کے اعلیٰ ہونے کو خوش حالی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حالانکہ دہ دیکھتے ہیں کہ اس معیار زندگی کے حصول ملک وجائداد قرق و نیلام ہو رہی ہیں چوری اور بھیک عجب عجب بھیس بدل کر ہر طرف رواج پا رہے ہیں۔ اخلاق مائل بہ پستی اور ترقی کے سرچشمے الٹے مسدود ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کا موجودہ معیار زندگی باوجود دیگر ممالک سے مقابلتہً ادنیٰ ہونے کے یہاں کی مالی حالت پر بڑا بار ہے اس کی مثال بعینہ اُس جام شراب کی سی ہے جو چند لمحوں کے سرور کی خاطر کوئی جیب خالی کر کے خریدے اور جس کا خمار بالآخر اُس کو بیدرد جہاں مضمحل کردے، ممکن ہے کہ خدا وہ دن بھی لائے جب کہ ہم کو صحیح مفہوم کے مطابق خوش حالی نصیب ہو اور تب ہی معیار زندگی بلند کرنے کا لطف ہے۔ ابھی ہم کو بہت کچھ محنت اور صرف کر کے ملک میں تعلیم پھیلانا ہے۔ صنعت و حرفت سنبھالنا ہے، ایسے عظیم الشان کام پیش ہوتے ہوئے ہم کو تن آسانی کا موقع کیونکر مل سکتا ہے۔ ابھی ہم کو ترقی کا کھیت بونا ہے فصل کاٹنے کا کیا ذکر ہے۔ اس وقت ہر کسی کو لازم ہے۔ کہ تا [illegible] سے کام لے کر اپنی احتیاجات کے مراتب پر غور کرے اور اپنے خرچ کی مدوں کو جانچے۔ فرد حساب میں اکثر بے جا

اور خلافِ مصلحت اخراجات نظر پڑیں گے ضبط سے کام لے کر اُن کو جلد سے جلد ترک کردے۔ اور جو کچھ پس انداز ہو اُس کو بہتر احتیاجات کے رفع کرنے میں صرف کرے۔ ایک دن آئے گا کہ دولت ملک میں اسطرح بڑھے گی جیسے کھیت میں غلّہ اُگتا ہے۔ درخت میں پھل آتے ہیں سب ترقی یافتہ ملک اسی راہ پر چل کر منزل مقصود تک پہنچے ہیں۔ جاپان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور جب خدا ہندوستان کو بھی یہ دن دکھائے گا تو ہم یا ہماری آئندہ نسلیں دوسرے ملک والوں کی طرح زندگی کا لطف اُٹھائیں گی۔

ہماری قطعی رائے ہے کہ ہندوستان میں بہت سی تعیشات کا استعمال قبل از وقت اور اسی لیئے بربادکن ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کی مانند محنت اور خرچ کر کے ذرائع پیداوار بڑھائے بغیر اُنکا سا لطف اُٹھالیں۔ یعنی کھیت بوئے بغیر فصل کاٹیں درخت لگائے بغیر پھل پائیں۔ ابھی ہم کو ازحد محنت و خرچ طلب اہتمام درپیش ہے تعلیم پھیلانا ہے۔ صنعت و حرفت میں دوبارہ جان ڈالنا ہے اور مہذب زندگی کے دیگر شعبوں کو اصلاح اور ترقی دینا ہے۔ تعیشات سے لطف اُٹھانے کے واسطے اس وقت نہ ہمارے پہلو میں دل ہونا چاہیئے اور نہ ہمارے پاس وقت اور روپیہ ہے ہم کو تو ایثار اور جفاکشی کی کٹھن منزل درپیش ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ بھی ہے۔ ترقی پذیر اور ہونہار قوموں کی زندگی کا حالی مرحوم نے جو سادہ مگر پُر اثر خاکہ کھینچا ہے اور ہم کو جو دلسوزی سے ہدایت کی ہے اُس کو یہاں پیش کرنا بےمحل نہ ہوگا۔ وَاللہُ

سنتے ہو سامعین باتمکیں سنتے ہو حاضرین صدر نشیں
جو ہیں دُنیا میں قوم کے ہمدرد بندۂ قوم اُن کے ہیں زن و مرد
باپ کی ہے دعا یہ بہر پسر قوم کی میں بناؤں اس کو سپر
ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد قوم پر سے نثار ہو اولاد

بھائی آپس میں کرتے ہیں پیمان — تو اگر مال دے تو میں دوں جان
قوم کی خاطر اُن کے ہیں سب کام — خواہ انہیں سفر ہو خواہ مقام
سینکڑوں گلرخ اور مہ پارے — لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے
جان اپنی لیئے ہتھیلی پر — ق کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر
گو سفر میں اُٹھائے رنج کمال — کر دیا پر وطن کو مالا مال
اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں — ہموطن فائدے اُٹھاتے ہیں
کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری — ذخل اور خرچ جنکے ہیں بھاری
اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم — مبحثِ حکمت و ادب قائم
نت نئے کھلتے ہیں دواخانے — بنتے ہیں سینکڑوں شفاخانے
ہیں اب اُن کے گواہ حُبِّ وطن — در و دیوار پیرس و لندن
کہتے دنیا کا جن کو باغ جناں — ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں
کام ہیں سب بشر کے ہموطنو! — تم سے بھی ہو سکیں تو مرد بنو
چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ — بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ
قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں — رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں
قافلوں سے اگر ملا چاہو — ملک اور قوم کا بھلا چاہو
گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار — زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا — اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جن پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو — واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی — جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ — کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر — ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر
اُن کی عزت تمھاری عزت ہے — اُن کی ذلت تمھاری ذلت ہے
قوم کا مبتذل ہے جو انساں — بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز — ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

عزتِ قوم چاہتے ہو اگر — جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور — اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دَور آئے گا — بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات — یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

المختصر یہ وقت ملک میں علم و ہنر، صنعت و حرفت، بیداری اور آزادی پھیلانے کا ہے اور ان کاموں میں جس قدر بھی صرف کیا جائے کم ہے۔ تن پروری اور عشرت پرستی ہمارے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ البتہ جب خدا یہ سب کام پورے کرا دے گا تو ہمارا ملک بھی رشکِ جناں بن جائے گا۔ اور اس وقت معیارِ زندگی بلند کرنے کا بھی موقع اور لطف ہوگا۔ بالفعل ہم پر لازم ہے کہ نہایت ایثار کے ساتھ از حد سادہ طور پر زندگی بسر کر کے جو کچھ بن پڑے ملک کی خدمت میں بے دریغ صرف کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ روز فیشن کا بھوت سر پر سوار رہنے کے بعد برادرانِ وطن میں سادہ زندگی اور عالی حوصلگی کا مبارک رجحان پیدا ہو چلا ہے۔ اَللّٰھمّ زِدْ فَزِدْ۔

۶۔ چونکہ یہ کتاب بالخصوص ہندوستانی ناظرین کے واسطے مقصود ہے اصولی بحث کے تحت میں ہندوستان کی معاشی حالت کا بے ساختہ ذکر چھڑ جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ بیان کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ مختصراً ابھی بتایا جا چکا ہے کہ معیارِ زندگی کا بلند ہونا ترقی کا باعث بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ خواہ مخواہ معیارِ زندگی پست رکھنا گویا ترقی سے دست بردار ہونا ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے یہاں معیارِ زندگی بڑھانا قبل از وقت نظر آتا ہے اور اس سے مسائل ترقی اُلٹے مسدود ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن یورپ اور امریکہ میں زندگی کا

معیارِ زیست بلند ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے جو چیزیں کبھی امرا کے تعیشات میں شمار ہوتی تھیں وہ اب غربا کی ضروریات میں داخل ہیں دوسرے ممالک بھی اپنی اپنی بساط کے موافق افزائش دولت کی کوشش میں سرگرم ہیں۔ علم کے زور سے قدرت کے مادی خزانے کھول کھول کر زندگی کا لطف بڑھایا۔ تہذیبِ جدید کا عالمگیر رجحان نظر آرہا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مرفہ الحالی کی کوئی حد بھی ہے۔ آبادی اور وسائل پیداوار یا بالفاظِ دیگر طلب و رسدِ دولت کا موازنہ کرنے پر کیا انجام قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ آیا جس قدر انسان دولت چاہے ترقی کا پیدا کرتا رہے گا۔ یا پیداوار محدود ہے اور کبھی ایسی نوبت بھی آئے گی کہ انسان کو بوجہ قلتِ پیداوار اپنی ضروریات روکنی اور گھٹانی پڑیں گی۔ یہ سوال اصطلاحاً مسئلۂ آبادی کہلاتا ہے اور معاشیات کے ایک مشہور عالم مالتھس نے اس سے خاص طور پر بحث کی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق جدید ترین تحقیقات کا مختصر خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

ہماری اکثر ضروریات براہِ راست یا بواسطہ زمین سے حاصل ہوتی ہیں۔ زمین کی مقدار محدود ہے۔ اور اُس کی پیداآوری قانونِ تقلیلِ حاصل کی پابند ہے۔ آدمی سے آدمی پیدا ہوتا ہے اور جس سُرعت سے اور جس حد تک آبادی ترقی کر سکتی ہے۔ زمین کی پیداوار کو اُس کا ساتھ دینا دشوار ہے یعنی اندیشہ ہے کہ کچھ عرصے بعد آبادی اس قدر بڑھ جائے گی کہ سب کے واسطے زمین کافی ضروریات مہیا نہ کر سکے گی۔ اور اُس وقت بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔ گزشتہ چار صدی کے اندر ایک طرف تو دو برِاعظم امریکہ۔ آسٹریلیا اور نیز چند نئے جزائر دریافت ہوئے دوسری طرف ریل اور دخانی جہازوں کی ایجاد کی بدولت دور دراز سفر میں بے حد سہولت ہو گئی۔ قدیم ممالک کے لوگ نئے نئے ملکوں میں جاکر آباد ہونے شروع ہوئے اور اُن ممالک کی پیداوار

حصّہ پنجم
باب بست و ہفتم

قدیم ملکوں میں آنے لگی ۔ جدید مقامات دریافت ہونے اور دور اُفتادہ ممالک کے درمیان آمد و رفت کے سہل ذرائع قائم ہونے سے عرصے کے واسطے آبادی کا مسئلہ حسبِ دل خواہ طے ہو گیا اور یہ خطرہ کہ آبادی از حد بڑھ جانے کی وجہ سے ضروریات دستیاب ہونی دشوار ہوں گی، تا ہنوز پیش نہیں آ سکتا ۔ لیکن آئندہ نئے نئے ممالک دریافت ہونے کی اب بہت کم امید باقی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزیرے ملیں تو ملیں ورنہ غالباً امریکہ یا آسٹریلیا جیسا کوئی برِ اعظم اب نامعلوم نہیں رہا گویا زمین کے رقبے میں اب کوئی بڑا اضافہ نہ ہو سکے گا ایجادات بھی منتہائے کمال کو پہنچ چکے اور اگر اُن کا سلسلہ جاری رہا بھی تو جیسا انقلاب دخانی انجن نے کر دکھایا آئندہ ایسا ہونا دشوار ہے ۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ جو خطرہ اور اندیشہ مسئلہ آبادی میں مضمر ہے یعنی ضروریات دستیاب نہ ہونا وہ صرف ملتوی ہو گیا ہے ۔ ہمیشہ کے واسطے رفع نہیں ہوا ۔ اور اب نہیں تو ہزار سال بعد اس کا وقوع ممکن ہے ۔ اگر سچ پوچھیے تو مستقبل بعید کے متعلق رائے قائم کرنا اندھیرے میں تیر چلانا ہے ۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اب سے پانچ سو یا ہزار سال میں دنیا کو کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی ۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آبادی کبھی اس قدر نہ بڑھے گی کہ ضروریات ملنے میں دقت ہو افزونی آبادی پر جو خاص خاص بندشیں قائم ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں :-

ا ۔ دولت مند طبقوں میں بچے کم پیدا ہوتے ہیں ثانیاً تعیشات کا اثر مضر پڑتا ہے آبادی کے اضافے میں غربا اور متوسط الحال لوگوں کا سب سے بڑا حصہ ہے ۔ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دولت مندی پھیلنے سے اضافۂ آبادی کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے ۔

ب ۔ تعلیم کا حال بھی دولت مندی کا سا ہے دماغی محنت

حصۂ پنجم
باب بست و ہشتم

کی کثرت سے نفسانی خواہشیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ اور تعلیم یافتہ فرقے کی ایک جماعت کو شادی سے رغبت ہی نہیں رہتی اشاعت تعلیم سے بھی افزونی آبادی کی روک تھام ہو رہی ہے۔

ج۔ ترقی یافتہ ممالک میں مستورات کو آزادی کی ایسی ہوا لگی ہے کہ وہ بیوی اور ماں کے فرائض انجام دینے کی بجائے گھر اور بال بچوں کے جنجال سے بچ کر مردوں کی طرح سیاست اور انتظام ممالک میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ تعلیم اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ایسی مستورات کی تعداد بڑھ رہی ہے جو شادی نہ کرکے اور دوسری طرح طرح کی ترکیبوں سے بچی رہتی ہیں۔

د۔ معیار زندگی بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے بہت سوں کو کنبہ پالنا دشوار ہے غریب اور ادنیٰ طبقوں کے بچے چھوٹی ہی عمر سے کچھ نہ کچھ کمانے لگتے ہیں۔ اُن کے مصارف نہایت کم ہوتے ہیں اور وہ جلد شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس خوشحال اور اعلےٰ طبقوں میں بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت پر بہت کچھ صرف کرنا پڑتا ہے حتّٰے کہ وہ جوان ہو کر خود کمانے کھانے کے قابل ہو جائیں۔ اسی وجہ سے آبرودار فرقے شادی میں دیر کرتے ہیں۔ اور جب تک کنبہ پالنے کی استطاعت نہ ہو وہ اولاد کی ذمہ داری اپنے سر باندھنا نہیں چاہتے۔ نیز جدید طریقوں سے کام لے کر وہ اولاد کی پیدائش بھی حسب دلخواہ محدود کر دیتے ہیں اور بالعموم بڑے کنبے سے بچتے ہیں۔

۲۔ نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر گرکنبہ پروری کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیئے لوگ ناجائز تعلقات سے دل کی ہوس نکالتے ہیں اور ایسے طریقے بکثرت رائج ہو رہے ہیں کہ اولاد پیدا نہ ہو۔ اس رواج کا ایک بڑا باعث پردہ داری کی بے مصلحت ہے ؛

۳۔ ہر ایک طبیب اور ڈاکٹر شاہد ہے کہ لوگوں میں ایسی عادات بد بکثرت بڑھ رہی ہیں کہ جن سے قوت مردمی زائل یا ضعیف ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اسکول۔ کالج اور کارخانوں میں جہاں مختلف عمر کے لڑکے یک جا کام کرتے ہیں ایسی عادات کا بڑا زور ہے بدچلنی کے باعث (؟) ایسے امراض بھی بہ نسبت سابق اب بہت پھیل رہے ہیں جو انسان کو نہ صرف نکما بلکہ زندہ درگور بنا دیتے ہیں اور چونکہ وہ متعدی ہیں بہت سے ناکردہ گناہ اُن کا شکار ہو جاتے ہیں اور آئندہ معصوم نسلیں بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوتی چلی جاتی ہیں ضعف، نامردی اور سوزاک و آتشک سے امراض خبیثہ ہر طرف شعلۂ آتش کی طرح پھیل رہے ہیں اب تک تو ڈاکٹر لوگ اظہارِ حقیقت سے شرماتے تھے۔ لیکن اب تنگ آکر انھوں نے موجودہ شرمناک حالت کا اعلان شروع کر دیا ہے اور حال ہی میں اکثر ممالک کے متعلق چند مستند رپورٹیں شائع ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں — اگر کچھ روز اور غفلت کی گئی تو ان عادات ملعونہ اور امراضِ خبیثہ کی آتشِ جہاں سوز نسلِ انسان کو جھلس کر تمام کر دے گی ؛

مذکورۂ بالا اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ پیدائش اولاد کی رفتار یورپ اور امریکہ میں روز بروز سست ہوتی جاتی ہے۔ خصوصاً فرانس کی حالت تو اس قدر نازک ہوگئی ہے کہ وہاں آبادی بڑھانے کی خاص تجاویز پر غور ہو رہا ہے اور یہ کوئی خیالی بات نہیں بلکہ اعداد و شمار اس پر شاہد ہیں۔

ص۔ کون سی ایسی مبارک صدی گزری ہے جس میں دو چار جنگیں نہ ہوئی ہوں اور تیر کمان چھوڑ تلوار، بندوق کے زمانے تک بھی لڑائی میں لوگ مقابلتہً بہت ضائع ہوتے تھے۔ لیکن خدا سائینس کا بھلا کرے جب سے مشین گن ہاؤٹزر اور بمب ایجاد ہوئے میدان میں سپاہی یوں گرتے ہیں جیسے کہ غلے کے کھیت کٹتے ہیں۔ پھر آتش باری اور فاقوں سے بے شمار عوام الگ برباد ہوتے ہیں۔ موجودہ جنگ میں ضائع شدہ اور مجروح سپاہیوں کی مقدار ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے اور فوجوں کی بھرتی برابر جاری ہے۔ تسخیر شدہ اور مفتوحہ مقامات میں جس قدر عوام تباہ ہوئے ہوں گے اُن کا کوئی حساب نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جنگ میں سب سے بڑی تعداد توانا تندرست نوجوانوں کی کام آتی ہے۔ بچے بڈھے اور بیوہ عورتیں بچ بھی رہیں تو کیا۔ جنگوں میں جو آبادی سے تخفیف ہوتی رہتی ہے اور اُس کے آئندہ اضافے میں جس قدر ہرج ہوتا ہے اظہرمن الشمس ہے۔ وبائیں، امراض، زلزلے اور طوفان اور حادثات۔ غرض کہ چند در چند کارکن قدرت کی طرف سے موجود ہیں جو آبادی کی اسی طرح کاٹ چھانٹ

کرتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ مالی درختوں کو قلم کرتا ہے
اور یہ حاملین اجل ایسے زبردست ہیں کہ انسان کا ان
کے سامنے کچھ بس نہیں چلتا اور وہ انسان کو یوں پکڑ
لے جاتے ہیں جیسے کہ چوہے کو بلی دبوچتی ہے۔
ع۔ انسان کی عمر طبعی گھٹ رہی ہے اور بہ نسبت سابق
وہ جلد رخصت ہوکر دوسروں کے واسطے دنیا میں
جگہ خالی کردیتا ہے۔ پس واضح ہوا کہ آبادی حد سے
زیادہ بڑھنے اور ضروریات کے میسر نہ آنے کا خدشہ
خلاف قرآن ہے۔ جو خدا پیدا کرتا ہے وہی سب
کی ضروریات کا کفیل ہے۔

اصول معاشیات کا بیان ختم ہوتا ہے اب صرف آخری نکتہ باقی ہے کہ اگر کل پہلوؤں پر غور کرکے بنی نوع انسان اپنی زندگی کے واسطے بہترین معاشی اصول دریافت کرنا چاہے تو اسکی ہدایت کے واسطے اللہ جل شانہٗ نے دریائے حکمت کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ قرآن پاک میں معاشی زندگی کے متعلق بہت سی ہدایتیں موجود ہیں اور صدہا سال کا تجربہ بھی آج انھیں ہدایات کا مونہ نظر آتا ہے۔ ہم صرف ایک آیت شریفہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہو ہذا:-

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

تمت

اصول معاشیات

ضمیمۂ اصطلاحات

Absolute Economics	معاشیات مطلق
Abstinence Theory	مسئلۂ اجتناب
Abstract Economics	معاشیات مجرد
Accept (a bill)	سکارنا
Acceptance	سکار
Acceptor	سکارو
Allowance	الاؤنس۔ بھتہ
Annuity	سالیانہ
Applied Economics	معاشیات عملی
Applicability	تطبیق
Application	انطباق
Apprentice System	طریق کارآموزی
Artisan	دستکار
Art of Economics	فن معاشیات
Assumptions	مفروضات
Balances	فاضلات

Balance of trade	توازن تجارت
Bank	بنک
Bearer Bond	دست گرداں تمسک
Bill of Exchange	ہنڈی
Bill after date	ہنڈی بعد تحریر
Bill after sight	ہنڈی بعد نگار
Bill at sight	درشنی ہنڈی
Bill of credit	اعتباری ہنڈی
Bill of Lading	لداؤ پرچہ
Bill on Demand	عند الطلب ہنڈی
Bill holder	ہنڈیارا
Bimetallism	فلزینیت
Blank Bill	کوری ہنڈی
Bond	تمسک
Capital	اصل سرمایہ
Capitalism	اصل شاہی
Capitalist	اصل دار۔ سرمایہ دار
Cash a bill	ہنڈی بھنانا
Cash in hand	نقد بدست
Cheque	چک
Circulating Capital	اصل دائر
Clearing House	حساب گھر
Cognisibility	شناخت پذیری
Cognate Sciences	علوم متجانسہ
Competition	مقابلہ۔ مسابقت

Complementary Industries	صنائع تکمیلی
Composite Demand	طلب مجموعی
Composite Supply	رسد مجموعی
Concrete Economics	معاشیات مقرون
Consumer	مصرف
Consumer's surplus	توفیر المصرف
Consumption of Wealth	صرف دولت
Contract	معاہدہ
Contraction of Demand	بست طلب
Cooperation	امداد باہمی
Cosmopolitanism	عمومیت
Cosmopolitan Economics	معاشیات عامہ۔معاشیات عالمی
Credit	اعتبار
Currency	زر
Days of grace	رعایتی دن
Deflation of Currency	رفع انتفاخ زر
Demand	طلب
Depreciation charges	مطالبات فرسودگی
Difference of Exchange	پھروت
Direct Tax	محصول بلا واسطہ
Discount	بٹہ
Dishonour a bill	ہنڈی لوٹانا
Distribution of Wealth	تقسیم دولت
Disutility	اعدام افادہ
Dividend	مقسوم

Division of labour	تقسیم عمل
Divisibility	جزء پذیری
Doctrines	قضیے
Draw a bill	ہنڈی لکھنا
Drawee	ہنڈی لینے والا
Drawer	ہنڈی لکھنے والا
Earnings of Management	اجرت تنظیم
Economics	معاشیات
Efficiency	کارکردگی۔ کارگزاری
Efficient Demand	طلب کامل
Elasticity	بست وکشاد۔ لچک
Employer	آجر
Endorsement	تحریر ظہری
Equilibrium	توازن
Ethics	اخلاقیات
Exchange	مبادلہ
Exchangibility	مبادلہ پذیری۔ مبادلیت
Exchange above par	مبادلہ فوق مساوات
Exchange below par	مبادلہ تحت مساوات
Expenses	مصارف
Exploitation	استحصال
Export	برآمد
Extension of Demand	کشاد طلب
External Economies	کفایات خارجی
Face Value	قیمت مرقومہ

Fixed Capital	اصل قائم
Foreign Exchanges	مبادلات خارجہ
Free Trade	آزاد تجارت
Functions of Money	فعل زر
Gold Certificate	پروانۂ طلا
Gross Interest	سود خام
Homogeniety	یک جنسی
Honor a bill	ہنڈی پٹانا
Import	درآمد
Incidence of Taxation	ورود محصول۔ تقدیۂ محصول
Indestructibility	غیر فنا پذیری
Indirect Tax	محصول بالواسطہ
Inflation of Currency	انتفاخ زر
Insatiable Wants	احتیاجات غیر تسکین پذیر
Inscribed Bond	درج شدہ تمسک
Insurance	بیمہ
Internal Economics	کفایات داخلی
International Trade	تجارت بین الاقوام
Interest	سود
Intrinsic Value	قدر ذاتی
Joint Demand	طلب مشترک
Joint Product	پیداوار مشترک
Joint Stock	سرمایۂ مشترک
Joint Supply	رسد مشترک
Labour	محنت

Laissez Faire	اصول غیر مداخلت
Land	زمین
Law of Constant Return	قانون استقرار حاصل
Law of Diminishing Return	قانون تقلیل حاصل
Law of Diminishing Utility	قانون تقلیل افادہ
Law of Increasing Return	قانون تکثیر حاصل
Legal Tender	زر قانونی
Legal Value	قدر قانونی
Loan at call	قرضۂ عند الطلب
Loan at short notice	قرضۂ قلیل المدت
Localisation of Industries	تخصیص صنائع
Long Bill	میعادی ہنڈی
Luxuries	تعیشات تنعمات
Margin of Cultivation	اختتام کاشت
Market	بازار
Maximum Utility	افادۂ اتم
Medium of Exchange	ذریعۂ مبادلہ
Mercantilism	تجاریت
Mercantilists	تجاریئین
Metallic Value	قدر فلزی
Method	طریق
Mobility	نقل پذیری
Money	زر
Money Quotations	نرخنامۂ زر
Monometallism	فلزیت

Monopoly	اجارہ
Moral Sciences	علوم عمرانی۔عمرانیات
Multiple Tax	محصول مرکب
National Economics	معاشیات قومی
Necessaries	ضروریات
Negotiable Securities	تمسکات قابل بیع وشرے
Net Interest	سود خالص
Nominal Wages	اجرت متعارفہ
Normal	معمولی
Normative Economics	معاشیات معیاری
Object of Tax	شئے محصول
Overdraw	بیش براری
Paper Currency	زر کاغذی
Parity of Exchange	مساوات مبادلہ
Par Value	قدر مساوی
Payable to bearer	دھنی جوگ
Payable to named person	نام جوگ
Payable to order	حکم جوگ
Payer of Tax	اداکنندۂ محصول
Perpetual Bond	دوامی تمسک
Physiocracy	فطرآئینی
Physiocrats	فطرآئین
Physiology	عضویات
Politics	سیاسیات
Portability	نقل پذیری

معاشیات ایجابی	Positive Economics
بڑھوتری	Premium
قیمت	Price
اصول افادۂ اتم	Principle of Maximum Utility
اصول بدل	Principle of Substitution
پیدائش دولت	Production of Wealth
پیداوار	Produce or Product
پیدآور	Productive
پیدآوری	Productivity
منافع	Profits
محصول متزائد	Progressive Taxation
محصول متناسب	Proportional Taxation
تامین تجارت	Protection of Trade
توقع پسندی	Prospectiveness
سرکاری قرضہ	Public Debt
مالیات	Public Finance
معاشیات نظری	Pure Economics
اجرت صحیحہ	Real Wages
معاشیات اضافی	Relative Economics
لگان	Rent
احتیاجات تسکین پذیر	Satiable Wants
جدول	Schedule
وسعت	Scope
مہارت	Skill
قرضۂ قلیل المدت	Short loan

Social Philosophy	فلسفۂ تمدن۔ فلسفۂ اجتماع
Social Sciences	علوم عمرانی۔ عمرانیات
Sociology	عمرانیات۔ اجتماعیات
Specialisation	تخصیص
Specialised	تخصیص طلب۔ تخصیص یافتہ
Specie point	نقطۂ زر
Stability of Value	ثبات قدر
Standard of life	معیار زندگی
Standard Money	زر مستند
Standard of Value	معیار قدر
Statistics	علم الاعداد
Stock Exchange	صرافہ
Store of Value	ذخیرۂ قدر
Strike	اسٹرائک۔ ہڑتال
Subject of Tax	مورد محصول
Subsidiary Industries	صنائع ذیلی
Supplementary Industries	صنائع ضمیمی
Supply	رسد
Surplus	سرحاصل
Surplus Produce	احصل زائد
Survival of the fittest	بقائے اصلح
Tax	ٹیکس۔ محصول
Temporary Bond	میعادی تمسک
Theory	مسئلہ
Till Money	گلہ

Token Money	زر وضعی
Trades Union	انجمن اتحاد مزدوراں
Unearned Increment	اضافۂ غیر مکتسب
Utility	افادہ
Value	قدر
Wages	اجرت
Wage Fund	اجرت فنڈ
Want	احتیاج
Wealth	دولت

تمت

غلط نامہ اصول معاشیات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۴	۱۵	ستبدال	استبدال	۲۲	۱۵	فطرآمنی	فطرآمیں
۷و۹و۱۰	۱۱و۱۴ ۲۳و۲	ٹھیٹر	تھیٹر	۲۳	۲۲	شعبہ	شعبے
۸	۱۴	گوے	گوبے	۲۴	۱۸	آرسے	آریا
۱۳	۶	بحث کے	بحث کی	۲۵	۳	جس میں سے	جرمنوں سے
۱۲	۱۳	لزوم کو سب	لزوم سب	۲۵	۴	دستیاب ہوتا ہے	دستیاب ہوتی ہے
۱۴	۱۹	شرط اوں	شرط اوں سے	۲۵	۵	مگد	مگرہم
۱۵	۳	مختلف درجوں سے	بمدارج مختلف	۲۶	۱۲	معاشیات کی	معاشیات کا
۱۶	۲	اپنی تعینات	انکی تعینات	۲۶	۱۷	اس میں خاص	اس میں ایک خاص
۱۶	۱۱	باقی ماندہ مختلف	تبدریج مختلف باقی ماندہ	۲۶	۱۹	صدی کے	صدی کی
۱۸	۴	میں کام لیا	میں خوب کام لیا	۲۸	۱۸	سلطنتوں کے	سلطنتوں کی
۱۸	۱۹	اسپٹے اسٹکس	اسٹیٹسٹکس	۳۱	۱۰	لبیر	بیٹر
۱۹	۷	پھلروں	پھلڑوں	۳۱	۱۹	کاشتکاروں	کاشتکاروں
۱۹	۲۵	مباحت	مباحث	۳۱	۲۳	منظور کرنے	منظور کی
۲۰	۱۸	پتہ چلنے	پتہ چلنے	۳۲	۲۲	ادا کرنے لگے	ادا کرنے لگی
۲۱	۱۰	سادے	سادے	۴۱	۱۲	سکانات	مکانات تھے
۲۱	۱۳	سرکار کی	سرکار کے	۴۴	۱۰	نکل پڑے	نکل پڑیں
۲۱	۲۰	ہونے لگا	ہونے لگی	۴۸	۵	دوسرے	دوسری
۲۱	۲۱	دوآمد غلے	درآمد غلہ	۴۹	۶	کاٹے و سمندر	کاٹے ، سمندر
۲۱	۲۲	برآمد غلے	برآمد غلہ	۵۰	۱۲	۹۰	۹۰

غلطنامہ اصول معاشیات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۵۰	۱۳	مدل کر	بدل کر	۸۴	۷	پڑتا	پڑتا ہے
۵۱	۳	ہیں	ہیں	۸۴	۱۵	پچھتائیگا	پچتائیگا
۵۱	۱۳	مبدء	مبداء	۸۴	۱۷	ہفتے وار ایک روزہ	ہفتے وار یک روزہ
۵۱	۱۵	وابستہ	وابستہ	۸۵	۲۴	شدت سردی	شدت سرط
۵۲	۱۸	ہیلہ	ہیلڑا	۸۶	۱۷	وسطی	وسطی
۵۶	۲۰	پہنی	اپنی	۸۷	۱۰	ہیں دیرا	ہیں برابر
۵۸	۱	ٹرنگ	ٹرنک	۸۷	۱۵	کہائے نہیں چکتے	کہائے بن نہیں پڑتا
۶۰	۱۵	نسبت معاف	نسبت معارف	۸۷	۲۰	کہ	کو
۶۲	۴	لگان شرح	لگان کی شرح	۸۸	۱۳	غیر ملکوں	گرم ملکوں
۶۵	حاشیہ	قلت حاصل	تفضیل حاصل	۹۰	۵	ادہورا	ادہوری
۶۵	۲۱	بجائے دو مرتبہ جوتنے کے	دو مرتبہ جوتنے	۹۰	۱۰	کم ہوتا ہے	کم ہوتی ہے
۶۵	۲۱	نزاع	نزاع	۹۴	۹	ولالت	ہدایت
۶۸	۱	لاورثی	لاوارث	۱۰۰	۷	آلات عمارت کارخانہ	آلات اور عمارت کارخانہ
۶۹	۲۲	زیادتی کرائے	زیادتی کرایہ	۱۰۳	۱۸	پووے	پورے
۷۰	۴	محبوری	مجبوری	۱۰۴	۷	پر ایک	پر عموماً ایک
۷۱	۶	زوال اسٹریٹ	وال اسٹریٹ	۱۰۵	۲۲	کمی مہارت	خامی مہارت
۷۳	۳	اسباز یادہ قدرتی	اسباب زیادہ تر قدرتی	۱۰۷	۹	پن بنتے ہیں	پنیں بنتی ہیں
۷۳	۸	تقسیم اضافے	تقسیم اضافہ	۱۰۷	۱۶	مستمر	آجر
۷۶	۲۳	یہی نہ	یہی نا	۱۱۱	۲۴	امالی جاتی	مالی جاتی
۷۸	۹	تو محنت	تو وہ محنت	۱۱۶ و ۱۱۸	۲۵ و ۴	حصے دار	حصہ دار
۷۵	۲۲	اصلاح ترقی	اصلاح و ترقی	۱۲۰	۷	پیداوار لگان کا	پیداوار اور لگان کا
۸۰	۲۵	یک جانا	بک جانا	۱۲۰	۹	فوگی	قومی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۱۳۹	۲	لگان کے اصل	لگان اصل	۱۹۲	۲۰	اخری	آخری
۱۳۹	۱۹	سمایاں	نمایاں	۱۹۵	۳	ہوگی	ہوگا
۱۴۴	۵	زمین کی	زمین کے	۱۹۷	۹	مردوروں	مزدوروں
۱۵۰	۲	نوجہ	توجہ	۱۹۷	۱۰	کامیاب	کامیاب بھی
۱۵۲	۹	اچھاخاسہ	اچھا خاصا	۱۹۸	۱۱	رہنے ہیں	رہتے ہیں
۱۵۴	۱۷	بجبوری	مجبوری	۲۰۰	۳	سائل	مسائل
۱۵۵	۲۱	دیوڑھی	ڈیوڑھی	۲۰۴	۲۲	مطالبے داروں	مطالبہ داروں
۱۵۶	۴	کرسکیں	کرسکے	۲۰۵	۲۲	ترسب	ترتیب
۱۵۷	۱۸	کام	کار	۲۰۷	۱	پرومیسری	پرامیسری
۱۶۰	۷	نقد اور روپے	نقد اور روپیہ	۲۰۷	۲	میں سود	میں سے سود
۱۶۱	۱	پیداداری	پیداآوری	۲۰۷	۹	لینا بھی پڑتا ہے	لینا پڑتا ہے
۱۶۱	۲۵	بیان	بیلن	۲۰۸	۴	چاہیے	چاہیے تو
۱۶۳	۲	کاگزاری	کارگزاری	۲۱۰	۱۸	غیرپیدا آور	غیرپیداآور
۱۶۵	۱	جز	جزو	۲۱۰	۱۸	غرض	قرض
۱۶۵	۳۰	ان ہیں	ان میں	۲۱۹	۲۰	پیداآور	پیدآور
۱۶۶	۱۴	جز	جزو	۲۱۹	۲۴	کانٹ	کاٹ
۱۶۷	۱۸	کی	کے	۲۲۱	×	پیداآور	پیدآور
۱۶۳	۱۶	تو	جو	۲۲۲	۱۴	بنیے	بنئے
۱۶۹	۲	مزکروں	مرکزوں	۲۲۲	۲۳	عرضہ	عرصہ
۱۸۶	۲۰	پیداآوری۔	پیداآوری	۲۲۳	۱۱	لیکن اس	لیکن یہ اس
۱۸۶	۲۴	۱۹/۳۰	۳۱۹/۳۰	۲۲۴	۸	حصے وار	حصہ دار
۱۸۷	۷	ہرتال	ہڑتال				
۱۸۸	۴	کیونکہ	کیونکر	۲۲۶	۲۵	اداکرکے	اداکرنے

غلط نامہ اصول معاشیات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۲۳۱	۹	سینکڑوں	سینکڑوں	۲۰۰	۲	ٹک	ٹاک
۲۳۱	۲۵	لندن بنک	بنک آف انگلینڈ	۲۰۴	۳	بطوروونہ	بطور ورثہ
۲۳۲	۵	ضروری اور کام	ضروری کام	۲۰۹	۳	اب تک	اب تک تو
۲۳۳	۳	یہ زمیندار	نہ یہ زمیندار	۲۸۵	۲	سے	کے
۲۳۴	۱۵	۱۰۰	۱۰۰۰	۲۸۷	۲۲	تھا	ہیں
۲۳۶	۱	اجر	آجر	۲۹۰	۷	ممبراں	ممبروں
۲۳۶	۲۱	مو	ہو	۲۹۱	۱۷	کو	کا
۲۳۷	۱۵	نقصان مقابلے	نقصان مقابلہ	۲۹۸	۲۰	کمی	کی
۲۴۰	۴	آبروں	آجروں	۳۰۱	۴	بناپرقرار دیا	بناقرار دیا
۲۴۶	۹	۴۰ جرعون	۴۱ جرعون	۳۰۳	x	پیداآورر	پیداآور
۲۴۶	۲۰	واصل	محنت واصل	۳۰۳	۱۷	استقال	استقلال
۲۴۷	۹	صدہا گنا	صدہا گنے	۳۰۷	x	پیداآوری	پیداآوری
۲۴۷	۱۴	کی طرح	کسی طرح	۳۰۹	۷	لعد	بعد
۲۴۷	۲۱	عاملین نسبت اعلی	عاملین کی نسبت اعلے	۳۱۲	x	پیداآور	پیداآور
۲۵۲	۶	قرار پاسکتی ہے	قرار پاسکتی ہے کہ	۳۱۵	۱۳	نہیں کرسکتا	نہیں سکتا
۲۵۷	۱۴	حرفت وتجارت	حرفت یا تجارت	۳۱۵	x	پیداآوری	پیداآوری
۲۶۳	۸	کے بحث مباحثے	کا بحث مباحثہ	۳۲۱	۶	صوبہ دار	صوبہ دار
۲۶۳	۱۰	اشتراکین	اشتراکیین	۳۲۱	x	پیداآور	پیداآور
۲۶۶	۹	قوتی	فوتی	۳۲۱	۱۳	پیداوارلگان	پیداوارتولگان
۲۶۹	۲۴	کہ آگے	کہ وہ آگے	۳۲۵	۲۱	غالباً کہ	غالباً
۲۷۲	۲۰	فرق	غرق	۳۲۶	۱۱	کے	کا
۲۷۳	۲۴	جاچنا	جانچنا	۳۳۳	۵	ہوئیں	ہوتی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۳۴۱	۱۴	اختاج	احتیاج	۴۰۱	۹	نہایت پسندیدہ	نہایت ناپسندیدہ
۳۴۳	۱۰	مقدار	مقداریں	۴۰۱	۱۰	دیکھتے ہیں	دیکھنے میں
۳۵۰	۶	پڑھنے	بڑھنے	۴۱۷	۲۷	کرجاتے	کرجاتے ہیں
۳۵۳	۱۹	کم توتغیر پذیر	کم توغیر تغیر پذیر	۴۲۵	۱۰	فوز	زر
۳۵۳	۲۴	غوز	غور	۴۳۶	۷	سکہ کے	سکہ کی
۳۵۴	۵	حاصل ہیں	حاصل ہوسکتے ہیں	۴۴۱	۹	جس سے	جس کا
۳۵۷	۳	متعلق	متعلق ہیں	۴۴۳	۲۰	وز	زر
۳۵۸	۲۲	بعد شکل	بعد وہ شکل	۴۴۷	۶	قدرفلزاتی	قدر فلزی
۳۶۴	۱۶	میں	ہیں	۴۵۰	۲۲	بڑا رہتا ہے	پڑا رہتا ہے
۳۶۵	۶	ایک	ایک	۴۵۰	۲۵	دسوار	دشوار
۳۶۹	۲۳	سے نہایت	سے وہ نہایت	۴۶۰	۲	ہون کے	ہوں گے
۳۷۲	۱۱	تو بسرط	تو صرف بشرط	۴۶۲	۱۶	سوڈن یا جاپان	سویڈن یا جاپان
۳۷۳	۵	جوزور دیا جائے	جو زر دیا جائے	۴۶۴	۲۱	مشس	مشینیں
۳۷۶	۲	ہے	ہے	۴۷۰	۱۶	کیوبا کے	کیوبا کی
۳۸۳	۱۵	اصلاح یہی ہے	اصلاح سہل یہی ہے	۴۷۳	۱۴	مثلاً آٹھ	مثلاً چار
۳۸۳	۲۰	۱۳ اور ۱۴ روپے	۱۶ اور ۱۷ روپے	۴۷۴	۱۰	سادہ	سادہ
۳۸۴	۲۰	متعلق	مطابق	۴۷۵	۱۵	ملکوں برابر	ملکوں میں برابر
۳۸۶	۲۱	کیا جائے گا	کی جائیگی	۴۷۶	۲	مبادلے کے	مبادلہ کی
۳۹۵	۱۲	چیزوں کے رسد	چیزوں کی رسد	۴۷۸	۱۸	زیادہ تر	زیادہ
۳۹۷	۱۰	چھکڑوں	چھکڑوں	۴۸۰	۷	خریداراں	خریداروں
۳۹۷	۱۲	مقابلے	مقابلے میں	۴۸۳	۱۵	نازک خیالی	تاریک خیالی
۴۰۰	۱۵	ارزاقی	ارزانی	۴۸۴	۶	افرادے	افراد کی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۴۸۴	۲۳	باہو	باوجود	۵۸۹	۹	قدر وقیمت	مسئلہ قدر وقیمت
۵۰۱	۱۵	تغیر پذیر	تغیر پذیر	۵۹۲	۱/۲	خود	بطور خود
۵۰۲	۱۱	خریدار [illegible]	خریدار نہو	۵۹۳	۱	تفقیل افادے	تقلیل افادہ
۵۰۲	۱۳	کویا	گویا	۵۹۹	۱۳	معیار افادے کو	معیار افادہ کو
۵۰۳	۱۰	کرنے کا	کرنا	۶۱۴	۱۶	پیدا آوری	پیدا آوری
۵۰۹	۲	وصول ہوا	وصول ہو				
۵۱۴	۲	سے ادا	سے رقم ادا				
۵۲۴	۲۰	نہ ہونگی	نہ ہونگے				
۵۲۸	۱۱	صدی تک	صدی کے وسط تک				
۵۲۸	۱۹	اسی کے	اسی کی				
۵۲۹	۱۰	ہنڈی	ہنڈیاں				
۵۳۳	۹	کرنی پڑے	کرنی پڑی				
۵۳۳	۱۷	۴ سو روپے	۴ سو ۸۵ روپے				
۵۳۳	۱۸	واضح ہو	واضح ہوا				
۵۳۸	۹	ہویاں	جویا				
۵۳۸	۲۴	ہندی	ہنڈی				
۵۴۲	۶	سگئے	گئے				
۵۵۸	۱	مد	مد				
۵۶۰	۱۷	بنگ	بنک				
۵۷۲	۱۴	حود	خود				
۵۷۷	۱۳	لے لیا	لے لیا				
۵۸۶	۲	کو	گو				
۵۸۸-۹	x	پیدا آور	پیدا آور				

تمت